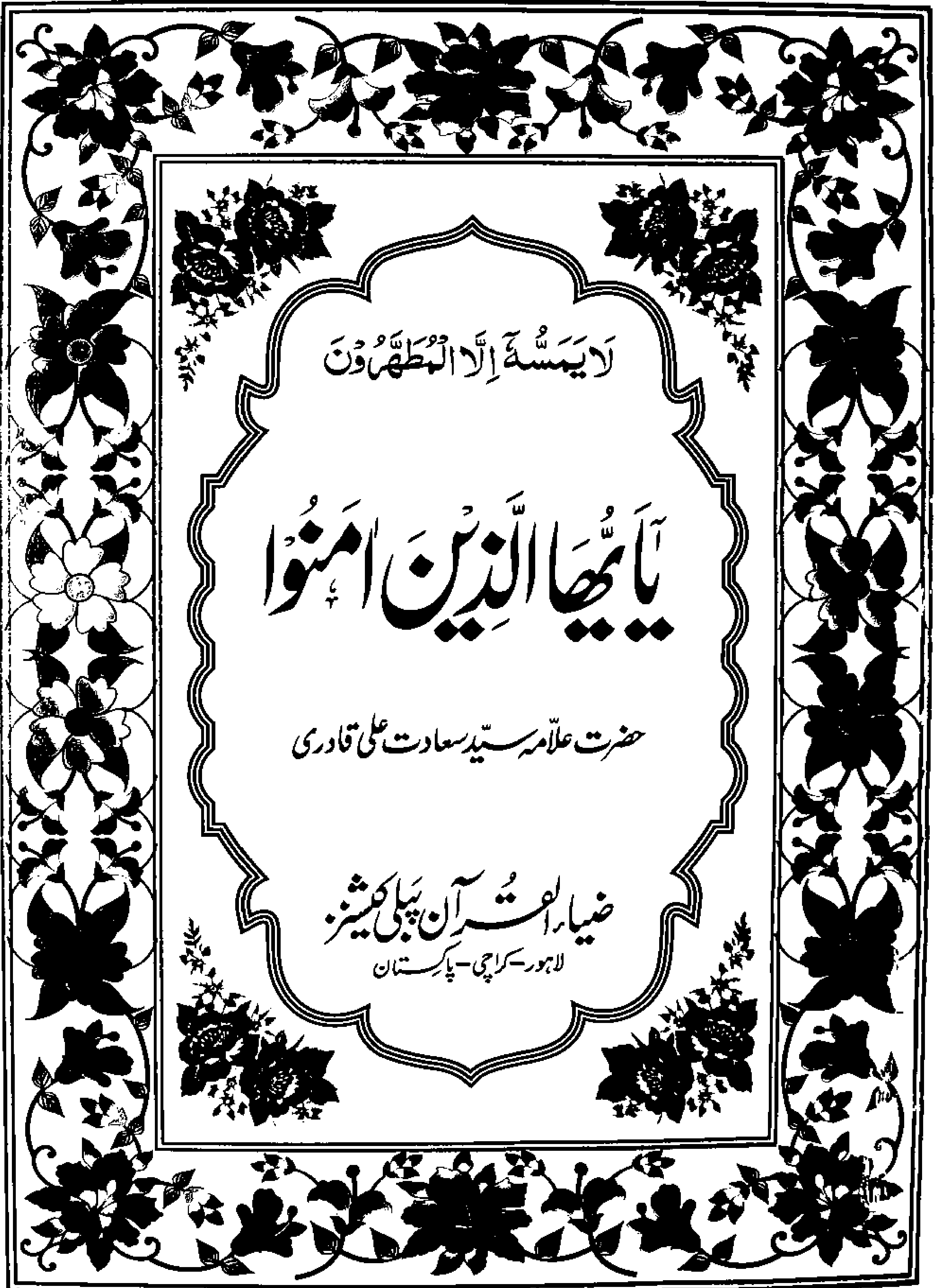

بسم اللہ الرحمن الرحیم
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
مبلغ اسلام
حضرت علامہ سید سعادت علی قادری
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان


لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ
يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
حضرت علامہ سیّد سعادت علی قادری
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

جلد اوّل

مبلّغِ اسلام

حضرت علامہ سیّد سعادت علی قادری

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ○ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	---------	یاایھاالذین آمنوا (جلد اول)
مصنف	---------	مبلغ اسلام علامہ سید سعادت علی القادری
اصلاح ونظر ثانی	---------	علامہ افتخار احمد چشتی
اہتمام	---------	صاحبزادہ سید عامر علی القادری۔
اشاعت	---------	دسمبر 2003ء
تعداد	---------	ایک ہزار
ناشر	---------	ضیاءالقرآن پبلی کیشنز، لاہور
کمپیوٹر کوڈ	---------	1Z143
ہدیہ	---------	-/400روپے

ملنے کے پتے

ضیاءالقرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-212011-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

آئینہ

ان شاء اللہ تعالیٰ ان دلچسپ مضامین کا بقیہ حصہ آپ جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

عرض ناشر

کتاب ذیشان قرآن مجید، بنی نوع انسان کی طرف خالق کائنات کا آخری جامع، کامل واکمل ضابطہ حیات اور پیام ہدایت ہے۔ جواس نے اپنے کمال فضل واحسان سے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کے قلب منیر پر نازل فرمایا۔ پھر اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے جن نفوس کو خیر و بھلائی اور اپنے قرب ومعرفت سے نوازنا ہوتا ہے انہیں قرآن کریم کی خدمت پر مامور فرمادیتا ہے۔ اگر ہم تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ہر دور میں کئی ایسے رجال کار نظر آتے ہیں جنہیں خلاق عالم نے بڑی فیاضی سے علمی، فکری اور تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا، انہوں نے اس بحر ناپید کنار میں خوب غواصی کی اور قسم قسم کے موتی چن کر انسانیت کی جملہ دینی ودنیوی حاجات وضروریات کا سامان کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔

جناب سید سعادت علی قادری مدظلہ عصر حاضر کے یگانہ روزگار، متبحر عالم دین ہیں۔ دینی وعلمی دنیا میں وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز کو پہلے بھی آپ کی متعدد کتب شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ قبلہ قادری صاحب نے فون پر مجھے بتایا کہ ''یاایھا الذین امنوا'' کی جلداول تیار ہو چکی ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ میں نے ہالینڈ میں آپ کے مکان پر خود حاضری دی اور مسودہ وصول کیا۔ جس محبت اور مہربانی کے ساتھ انہوں نے مجھے نوازا وہ ایک نہ بھولنے والی داستان ہے آپ کی شخصیت اور پیار بھرا انداز مجھے زندگی بھر یادرہے گا۔

قبلہ قادری صاحب نے مجھے ''یاایھا الذین امنوا'' کے چند پیراگراف پڑھ کر سنائے۔ موجود سامعین پر عجب کیفیت طاری ہوگئی۔ کیا حسین اور شگفتہ اسلوب بیان تھا۔ لفظ لفظ نور، حرف حرف سرور، جس کی رعنائی، چاشنی اور لذت سے یقیناً قرآن سے محبت رکھنے والا ہر قاری ضرور متاثر ہوگا۔ آپ نے بڑی عرق ریزی اور محبت وخلوص سے اُن تمام مسائل ومباحث پر دلآویز اور سلیس انداز میں محققانہ اظہار خیال کیا ہے۔ موصوف نے کتاب میں تقریباً وہ سب مضامین ومباحث لانے کا اہتمام کیا ہے جن سے کاروبار حیات میں ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ نیز عصر حاضر کے مسائل کو قرآن کی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے۔

ضیاء القرآن پبلی کیشنز یہ علمی شاہکار طبع کرنے کی سعادت حاصل ہونے پر بجا طور پر نازاں ہے۔

طالب دعا

محمد حفیظ البرکات شاہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، کراچی۔ پاکستان

تبصرہ ازقلم

حضرت العلام شیخ الاسلام ابوالحمزہ مولانا سید محمد مدنی اشرفی جیلانی زید مجدہ

جانشین مخدوم الملت حضور محدث اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ

کچھوچھا شریف، یوپی، انڈیا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ

الا لا آلآء الا الآء الا لہ

رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم ،کو چاہنا، ایمان ہے، اور سب سے زیادہ، چاہنا، کمال ایمان ہے- یہ ایک ایسی منصوص حقیقت ہے، جو ہر طرح کے شکوک وشبہات سے بالاتر ہے------ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے، کہ ابجد کے حساب سے ایمان کا جو عدد ہے، بعینہ وہی عدد ''حب محمد'' ﷺ کا بھی ہے- ایمان کا عدد ہے، ایک سو دو (۱۰۲) اور ایک سو دو ہی عدد ''حب محمد'' ﷺ کا بھی ہے------یوں ہی------یہ اتفاق بھی قابل دید ہے، کہ جو عدد، کفر، کا ہے، بعینہ وہی عدد ''هجر محمد'' ﷺ کا بھی ہے- کفر کا عدد ہے، تین سو (۳۰۰) اور ''هجر محمد'' ﷺ کا بھی عدد ہے، تین سو، هَجر کہتے ہیں قطع تعلق کر لینے کو------ الغرض نبی کی محبت ہی ایمان ہے، اور ایمان ہی نبی کی محبت ہے، لہذا وہ جھوٹے ہیں، جو نبی کریم ﷺ کی محبت کے مدعی ہیں مگر ایمان سے خالی ہیں، یوں ہی وہ بھی جھوٹے ہیں، جو ایمان کے مدعی ہیں، مگر نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی سچی محبت سے تہی دامن ہیں------- اسی طرح نبی کریم ﷺ سے، بے تعلق ہو جانے کا نام کفر ہے، لہذا یہ ممکن نہیں، کہ کوئی نبی کریم علیہ السلام سے بے تعلق ہو، وہ کافر نہ ہو، اور جو کافر ہو وہ نبی کریم علیہ السلام سے بے تعلق نہ ہو ------- اس مقام پر جس تعلق کا ذکر میں کر رہا ہوں، وہ وہی ہے جو صرف ایمان ہی سے حاصل ہوتا ہے، یونہی بے تعلقی سے مراد وہی ہے جو صرف کفر ہی کی پیداوار ہے------- یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے تعلق و بے تعلقی کو خود اپنے سے تعلق و بے تعلقی کا معیار قرار دیا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے، کہ نبی کریم علیہ السلام سے ایمانی تعلق پیدا کئے بغیر، رب تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا، محالات مجردہ سے ہے، اس لئے رب تبارک وتعالیٰ، جسے اپنا بنانا چاہتا ہے، پہلے اسے اپنے حبیب علیہ السلام کا بنا دیتا ہے، اور جسے اپنے سے دور رکھنا چاہتا ہے اسے اپنے حبیب علیہ السلام سے دور رکھتا ہے------- نبی کریم علیہ السلام سے ایمانی قربت، خود رب کریم سے قربت، اور نبی کریم علیہ السلام سے بے تعلقی والی دوری خود، رب اکرم سے دوری کا نشانِ جلی ہے،------- رب ذوالفضل العظیم کا، اپنے حبیب صاحب خلق

عظیم پر یہ فضل عظیم ہی تو ہے کہ اس نے آپ ﷺ کے آثار و منسوبات کو بھی بے مثال شرافت و کرامت سے نوازا ہے، خیر الانبیاء ﷺ سے جو چیز منسوب ہوگئی، وہ سراپا خیر بن گئی، نبی کا لایا ہوا دین، خیر الادیان، نبی پر نازل کی ہوئی کتاب، خیر الکتب، نبی کا شہر، خیر البلاد، نبی کا زمانہ، خیر القرون، وغیرہ وغیرہ۔ المختصر اس خیر مجسم سے، جسے نسبت ہوگئی، وہ سراپا صاحب خیر، اور بے مثال و بے نظیر ہوگیا------- پھر------- نبی کی امت، خیر امت کیوں نہ قرار پائے، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی عظمت وفضیلت، شرافت و کرامت، سربلندی و فیروز بختی، کو سمجھنے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ امم سابقہ کو ''یا یھا المساکین'' یعنی اے محتاجو، کہہ کر خطاب فرمانے والا رب قدیر، اپنے محبوب کی امت کو ''یا یھا الذین اٰمنوا'' اے ایمان والو، اے میرے محبوب کے غلاموں، اے دل کی سچائی کے ساتھ------- میرے حبیب کے دامن امن وسلامتی میں پناہ لینے والو، فرما کر، نہایت ہی مسرور کن، وجد آفریں، اور رحمت و رأفت بھرے انداز سے مخاطب فرماتا ہے، اس پیار بھرے، انداز تخاطب نے صرف یہی نہیں، کہ اہل ایمان کے لئے تکالیف شرعیہ کی بے پناہ سختیوں کو آسان تر بنا دیا۔ اور فرائض واجبات و موکدات کی بجا آوری نیز شرعی محرمات ومنہیات سے اجتناب کو بہت ہلکا کر دیا------- بلکہ------- شب وروز صرف خدا اور سول کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے والے پاکیزہ جذبات کے سوا، دیگر نفسانی وشیطانی خواہشات، سے دل مومن صادق کی تطہیر فرما کر اسے مجلّٰی ومصفّٰی کر دیا------- بلا تمثیل------- عرض کرتا ہوں، کہ ایک شفیق اور مہربان، ماں، جو دواؤں کی تلخی سے بخوبی واقف ہے، مگر اس کی افادیت بھی، اس کے پیش نظر ہے، کہ مریض بچے کی مہلک بیماری اسی سے دور ہوگی، جب وہ اپنے بچے کو، جس کی طبیعت دوا کی بے پناہ کڑواہٹ کے سبب، اسے پینے کے لئے، آمادہ نہیں ہوتی، دوا پلانا چاہتی ہے، تو اپنی سخت کلامی اور ترش روئی کا مظاہرہ نہیں کرتی، بلکہ ایسے پیار بھرے انداز میں، بچے کو چمکارتے ہوئے، اس کو سمجھاتی ہے کہ بچہ دوا کی تلخی کے باوجود اپنی ماں کی رضا اور بیماری سے شفاء کے تصور میں ایسا کھو جاتا ہے، کہ خوشی خوشی، تلخ گھونٹ گلے کے نیچے اتار لیتا ہے------- یہی حال تکالیف شرعیہ کا ہے، ان سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا، کچھ آسان نہیں، نجانے کن کن دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے، کیسی کیسی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، نفسانی خواہشات سے ہر وقت برسر پیکار رہنا پڑتا ہے، رات دن، خارجی دشمن شیطان، اور داخلی دشمن، نفس امارہ، کے خطرناک حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے------- ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا'' کے پیار بھرے، انداز تخاطب نے، تکالیف شرعیہ کی ساری ظاہری، تلخیوں کو، ایک کیف آور، مٹھاس میں تبدیل کر دیا------- اس مقام پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے، کہ قرآن کریم میں اٹھاسی ۸۸ مقامات پر ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا'' کہہ کر خطاب فرمایا گیا ہے، اسم الٰہی ''حلیم'' کے بھی عدد، اٹھاسی ہی ہیں۔ حلیم کہتے ہیں بردبار اور درگزر کرنے والے کو، رب کریم نے اپنے اسم مبارک کی تجلی، جس پر ڈال دی وہ بھی بردبار اور درگزر کرنے والا ہوگیا------- قرآن کریم میں اسم الٰہی ''حلیم'' کے عدد اٹھاسی، کی تعداد کے مطابق ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا'' کے ارشاد سے، یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ مومنین ہی اس، اسم الٰہی کے خاص مظاہر ہیں، جو حلم وعقل کو اپنا، قوت بازو بنا کر، آزمائشوں کی اس

کائنات میں کامیابی وخوش بختی کے سایہ میں، نہایت ہی سُبک روی کے ساتھ، رواں دواں ہیں،-------- میں نے حلم کے ساتھ عقل کواس لئے جوڑ دیا ہے کہ انسانوں کے لئے بغیر عقل کے حلم کا وجود ناممکن ہے، جو جتنا ہی بڑا عاقل ہوگا، وہ اتنا ہی بڑا حلیم بھی ہوگا، تواب اسم حلیم کا سایہ جس پر ہوگا، اس کا عاقل ہونا بھی ضروری ہے، یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ حقیقی معنوں میں، عاقل کہلانے کا حقدار وہی ہے جو ایمان والا ہے-------- میں نے اپنے مذکورہ بالا معروضات میں، کمال اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، اشاروں اور کنایوں میں جو کچھ کہا ہے، یقیناً قارئین کرام ان کو مفصل ومدلل دیکھنا چاہیں گے، ان سے میری عرض ہے کہ وہ اپنے ذہن وفکر کے سارے دریچوں کو کھول کر، آ جائیں اور عہد حاضر کی اس انپی، آپ مثال تصنیف کا مطالعہ کریں، جس کا نام ہی ہے،

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا''

یہ ایک ایسے فاضل جلیل کا شاہکار ہے-

☆ جو درجنوں، نفع بخش، نادرالوجود کتابوں کا مصنف ہے-

☆ جس کی دینی، تبلیغی، اصلاحی، روحانی، خدمات جلیلہ، ناقابل فراموش ہیں-

☆ جس کا، ظاہر آداب شریعت سے آراستہ اور باطن، اسرار طریقت کا حامل ہے-

☆ جو چمنستان مسعودی کا وہ گلِ سرسبد، سعادت آثار ہے، جس کی مہک نے بے شمار لوگوں کے دلوں کے غنچوں کو کھلا دیا ہے اور یورپ، امریکہ، افریقہ وایشیاء کے نجانے کتنے شہروں کی گلیوں اور کوچوں کو بسا دیا ہے-

☆ جس کا دماغ، عالِم اور دل صوفی ہے-

☆ جو ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ'' کا سچا مصداق ہے-

☆ جو علم وفضل کے بحر بیکراں، حضرت غزالی دوراں علامہ سید احمد شاہ کاظمی قدس سرہ کی درسگاہ علم ومعرفت اور تربیت گاہ قلب وروح کا فیض یافتہ ہے-

☆ جس کی پہلودار شخصیت اپنی مخلصانہ، خدمات کے چمکتے ہوئے اثرات ہر جگہ ڈالتی رہی، خواہ وہ ملکی سیاست ہو،---- یا----- دینی قیادت، درس وتدریس کی مسند ہو-----یا-----ارشاد وتبلیغ کا اسٹیج، دینی اداروں کا قیام ہو-----یا-----دینی جماعتوں کی تشکیل-----یا مساجد کی تعمیر

☆ جس کی حق گوئی، خداترسی، اور پارسائی نے اسے اس شعر کا مصداق بنا دیا ہے-

ہو محفل یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　　رزم حق وباطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

☆ جو اپنوں کے لئے نہایت، متواضع، منکسر المزاج، پیکر رافت اور اخلاق ومروت کا سرچشمہ ہے-

☆ جس کو لوگ مبلغ اسلام حضرت علامہ سید سعادت علی قادری (دامت برکاتہم العالیہ) کے نام سے

جانتے، پہچانتے ہیں۔

یقین جانیئے، حضرت علامہ موصوف نے، جب، مجھ سے اپنے اس علمی شاہکار پر تبصرہ کرنے کا حکم فرمایا، تو میں اپنی علمی بے بضاعتی کے سبب سوچ میں پڑ گیا، سوئے ادبی کے خیال سے خاموش رہا، اور معذرت بھی نہ کر سکا، میرے ذہن وفکر پر تعمیل حکم کا جذبہ غالب ہوا، اور پھر میں نے، اس صحیفہ علم ودانش کو مطالعہ کے لئے حاصل کرلیا، اور خیال کیا، میں کیا، میرا تبصرہ کیا، مگر کتاب سے استفادے کا موقع کیوں ضائع کیا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ مصروفیات ومشاغل کی کثرت اور کتاب کی ضخامت کی وجہ سے کما حقہ استفادہ نہ کر سکا مگر، سرسری طور پر، مختلف مقامات سے جو پڑھا، اسی سے دل ودماغ کی کھڑکیاں کھل گئیں، ٹھوس مضامین، سلیس انداز بیان، جاندار اسلوب نگارش، ایسی خوبصورت، رواں دواں تحریر، کہ پڑھئے تو پڑھتے ہی چلے جایئے، کہیں رکنے کو جی نہ چاہے۔ ہر بات مدلل، ہر نصیحت دل میں اتر جانے والی، ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق، مجھے یقین ہے، کہ جب بھی کوئی اہل علم اس کتاب کے محاسن اور اس کے مختلف گوشوں، کی خوبیوں پر قلم اٹھائے گا، اور تفصیلی تبصرہ کرے گا، تو وہ تبصرہ، خود ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر لے گا، ویسے اس کتاب کا تعلق پڑھنے اور صرف پڑھنے سے ہے۔ اس کی حقیقی خوبیاں، قارئین کرام پر صرف پڑھنے ہی سے واضح ہوں گی، تبصرے تو صرف مبصرین کی طبعی جولانیت کی نشاندہی کرتے ہیں------شروع میں میں نے، اشاروں اور کنایوں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، میری سمجھ کے مطابق وہ اس کتاب کی روح اور اس کا نچوڑ ہیں------قارئین کرام کے ہاتھ میں جب پورا پیکر لطیف ہی آ گیا ہے تو اب کسی خلاصہ پر توجہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے------اس عظیم صحیفہ علم وآگہی کی ترتیب وتدوین پر میں، حضرت علامہ موصوف کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کر رہا ہوں، اور دعا گو ہوں، کہ مولیٰ تعالیٰ، علامہ موصوف کی صحت وعمر میں دن دونی، رات چوگنی برکت عطا فرمائے۔ اور ان کے سایہ علم وہدایت کو، ہمارے سروں پر دراز رکھے، آمین۔

يَا مُجِيبَ السَّآئِلِيْنَ بِحَقِّ طٰهٰ وَ يٰسٓ بِحُرْمَةِ سَيِّدِالْمُرْسَلِيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

طالب دعا

دستخط

نزیل، ہالینڈ

۶ جولائی ۱۹۹۸ء

تبصرہ از قلم

نبیرۂ اعلیٰ حضرت خلیفہ حضور مفتی اعظم ہند
حضرت علامہ محمد توصیف رضا خاں صاحب قادری رضوی

۷۸۶
۹۲

الحمد لولیہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہ وحبیبہ وعلیٰ الہٖ واصحابہ وبعد

حضرت علامہ سید سعادت علی صاحب قادری زید کرمہ کی ذات وخدمات اور مشاغلِ دینیہ محتاج تعارف نہیں ہیں، انہوں نے تحریری وتقریری میدان میں جونقوش چھوڑے ہیں وہ قوم مسلم کے لئے چراغِ رہنما ہیں، مولیٰ تعالیٰ موصوف کی عمر وخدمات میں برکتیں عطا فرمائے، تاکہ قوم مسلم ان سے مستفید و مستفیض ہوتی رہے۔

موصوف سے میری پہلی ملاقات دیارِ محبوب عالم غیوب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں، باب مجیدی کے اندر، خلیفہ سرکار اعلیٰ حضرت قدس سرہ یعنی ضیاء الملۃ والدین قطب مدینہ حضرت مخدومی ضیاء الدین مدنی علیہ الرحمۃ کے دولت کدہ میں ہوئی۔ میں اس وقت سے موصوف مدظلہ کی شرافتِ نفسی اور خلوص وللّٰہیت کا معترف ہوں۔ حضرت موصوف سے دوسری ملاقات ساؤتھ افریقہ (ڈربن) میں ہوئی، جہاں وہ تبلیغی دورے پر تشریف لے گئے تھے، اس کے بعد ہالینڈ میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان کی تصانیف میں ضخیم ترین تصنیف ''یاایھا الذین اٰمنوا'' کے بعض مقالات سے شرفیاب ہونے کا موقع ملا۔

سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے۔ ہر مقالہ میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ سورۂ البقرہ اور سورۃ الاحزاب کے بیشتر مقالوں کو پڑھنے کا موقع ملا، ہر مقابلہ میں مضامین کی کثرت، عنوانات کی ندرت اور قوتِ فقاہت داد چاہتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ آیتِ درود پر حضرت موصوف نے جو محنت فرمائی ہے وہ خود ہی ایک مستقل اور جامع کتاب ہے۔

میری دعا ہے، کہ مولیٰ تبارک وتعالیٰ موصوف کی اس خدمتِ دینیہ کو قبولیت کا شرف عطا فرمائے، اور عامۃ المسلمین کو اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی توفیق دے ساتھ ہی ساتھ اعمالِ صالحہ کی سعادت عطا فرمائے اور مصنف گرامی قدر کو اجر جمیل سے ہمکنار کرے، آمین۔

اس موقع سے مجھے حضرت سید صاحب کے اخ الاعز حضرت علامۃ الفہامہ سید شجاعت علی قادری علیہ رحمہ المولیٰ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کی یاد آرہی ہے جنہوں نے فتاویٰ رضویہ شریف کی ترتیب، تبویب اور تخریج کے لئے انتھک کوششیں کیں، اس کے لئے گراں قدر مقدمہ لکھا اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکہ امام احمد رضا بریلوی رضی اللہ عنہ الرحمٰن کی عبقری شخصیت اور تجدید دین سے متعلق ایک عظیم عربی مقالہ لکھا کر اہل عرب کے اذہان کو نہ صرف صاف کیا، بلکہ سیدنا امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت و

محبت کا سکہ ان کے دلوں پر بٹھایا، خداوند قدوس حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کی تربت پر رحمت ونور کی بارش برسائے، اور انہیں اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سیدنا و حبیبنا و مولانا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ و حزبہ اجمعین

برحمتک یا ارحم الراحمین

فقیر محمد توصیف رضا خاں غفرلہ

خادم مرکز اہلسنت بریلی شریف

مورخہ ۸ رنومبر ۱۹۹۹ء

تبصرہ ازقلم

بحرالعلوم علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی
شیخ الحدیث شمس العلوم گھوسی ضلع مئو، یوپی، ہند

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نحمدہ ونصلی علٰی حبیبہ الکریم

قرآنِ کریم کے ساتھ ہمیشہ سے اہلِ اسلام کا شغف غیر معمولی رہا ہے، اوراس کی صوری ومعنوی خدمات کا متنوع اور مختلف الاقسام سلسلہ ابتداء سے ہی جاری ہے، نقاشوں نے رنگ برنگے نقوش ونگار سے اس کے اوراق مزیّن کئے، کاتبوں نے چاندی، سونے، شنگرف اورزمرد سے اس کے الفاظ کے گلشن، جگمگائے اور خطاطوں نے اس کی آیات کے طغرے چمکائے اور دنیا میں شاید نثر کی یہ پہلی اورآخری کتاب ہے جس کی ادائیگی کے قواعد، لہجوں اور نغموں کے اصول مرتب ہوئے۔

جبکہ اہلِ علم نے اس کے بوقلموں علوم ومعارف کے چمن کھلائے، کسی نے اس کے علوم ومعارف کی، صرف فہرست تیار کی، تو کوئی اس میں مذکور مقامات کے جغرافئے بتاتا رہا، کسی نے اس میں مذکورواقعاتِ تاریخ کی ترتیب دی، تو کوئی اس کی فصاحت وبلاغت اورمعانی وبدیع کی رنگینیوں کا جلوہ بکھیرتا رہا، اور کتنے زندگی بھراس کے بصائر وعبر اور مصالح وحکم کے موتی جمع کرتے رہے، بہتوں نے صرف آیاتِ احکام کی تفسیریں لکھیں اور بہت حضرات آیات کا مقام ورود ان کا شانِ نزول بتاتے رہےاور بہتوں نے پورے قرآن عظیم کا تاویل وتفسیر کا فریضہ انجام دیا،

''مبلغِ اسلام حضرت علامہ سید سعادت علی قادری'' زیدمجدہ نے صرف ان آیتوں کی وضاحت کی ہے جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو'' بندۂ مؤمن'' کہہ کر خطاب کیا ہے، اس طرح آپ کی اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اجمال میں تفصیل اوروحدتِ موضوع میں کثرتِ مضامین کے جلوؤں کی حامل ہے، اورمصنفِ علاّم اہلِ قلم کی ہر دوخصوصیات کے جامع اورترجمان ہیں،

آپ نے اس موقر تالیف میں بندۂ مؤمن کی زندگی کے تمام شعبوں اوراس کی حیات کے جملہ احکام ومسائل کے ساتھ ساتھ متعلقہ امور پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے، جو دوضخیم جلدوں پر مشتمل ہےاورایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے   مؤمن کی یہ پہچان کہ گم ہیں اس میں آفاق

پوری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ میرے لئے بے حد مشکل تھا، صرف فہرستِ مضامین کے ایک حصہ پر ایک نظر ڈالی اوردو ایک جگہ سے کتاب کی جھلک دیکھی، یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ دنیائے سنیت کے کئی اعلام نے اس کتاب پر اپنی تائیدوتوثیق اورتصدیق وتوصیف کی مہریں ثبت فرمائی ہیں،

میری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک کتاب کوقبول فرمائے اورمقبولِ انام بنائے اورحضرت مصنف علام کو دارین میں جزادے، آمین۔فقط

عبدالمنان اعظمی۔۲۷/اپریل ۲۰۰۰ء

تبصرہ از قلم

علامہ محمد احمد مصباحی صاحب شیخ الادب الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور، انڈیا

بسمہ تعالیٰ وتقدس حامداومصلیا

حرفے برائے سعادت

حضرت مولانا سید سعادت علی قادری مدظلہ سے میرا غائبانہ تعارف ہے۔ قدرت نے انہیں ایک دردمند دل عطا فرمایا ہے جو امت مسلمہ کی خیر وفلاح کے لئے فکر مند رہتا ہے۔ اپنے دعوتی واصلاحی مزاج کے پیش نظر موصوف نے متعدد کتابیں لکھی ہیں اور برابر لکھ رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی ان کے دعوتی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ جن آیات کریمہ میں یاایھا الذین امنوا فرما کر خطاب آیا ہے یہ ان کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہے۔ یقیناً رب تعالیٰ نے اپنے ایماندار بندوں کو جن ہدایات وتعلیمات سے نوازا ہے وہ بہت اہم ہیں اور صدق ایمان کا تقاضا ہے کہ ان پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

عمل سے پہلے علم ضروری ہے اس لئے ان ہدایات کی توضیح وتشریح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مولانا نے قلم اٹھایا اور معارف کا ایک موج زن سمندر یا احکام واسرار کا ایک گنج گراں مایہ صفحات قرطاس پر رکھ دیا۔ میں نے جستہ جستہ کچھ اوراق دیکھے اور موصوف کے ناصحانہ، واعظانہ اور دل نشیں اسلوب اور تفہیمی جدوجہد سے متاثر ہوا۔

ایسی جلیل الشان قلمی وفکری کاوش مجھ جیسے بے مایہ وگمنام انسان کی تعریف وتعارف کی محتاج نہیں۔ صرف تعمیل کے تحت چند سطور لکھ دیں۔ خدا کرے یہ لوگوں کے لئے ذکر ہدایت ونجات ثابت ہو اور مقبول خدا ورسول ومقبول خواص وعوام ہو۔

محمد احمد مصباحی
استاذ جامعہ اشرفیہ مبارکپور
رکن المجمع الاسلامی مبارکپور

۹/ ربیع النور ۱۴۲۱ھ
۱۳/ جون ۲۰۰۰ء سہ شنبہ

تبصرہ از قلم

حضرت علامہ مفتی عبدالواجد قادری

مُبَسْمِلاً وَّ حَامِداً وَّ مُصَلِّیاً وَّ مُسَلِّماً

مبلغ اسلام حضرت علامہ سید سعادت علی صاحب قادری زید مجدہ کی نابغہ روزگار شخصیت مسلمانان برِ اعظم ایشیاء، افریقہ، یورپ اور جنوبی امریکہ کے لئے محتاج تعارف نہیں، چوتھائی صدی سے زائد یورپ وامریکہ اور افریقہ کے اندر اسلام وسنیت کی خدمات اور مسلمانوں کی جو اصلاحات انہوں نے اپنی حکمتِ عملی اور کمال تدبُر ودیانت سے کی اور رُشد وہدایت کے جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اس کا سکہ ہر موافق ومخالف کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت حق جل مجدہ نے سیادت وقیادت کے ساتھ ساتھ انہیں حسن بیان اور زور قلم کی دولت بے بہا سے بھی سرفراز وممتاز فرمایا ہے۔ جہاں ان کے زور خطابت اور سحر بیانی نے اسلامی کانفرنسوں، دینی اجتماعات اور اصلاحی محافل ومجالس میں تبحر علماء اسلام اور خطبائے عظام سے خراج تحسین حاصل کیا۔ وہیں ان کے رشحاتِ قلم نے مصنفین ومؤلفین کی دنیا میں پرانے مٹیریل سے جدید طرز تعمیر کا دلکش محل تعمیر کرلیا ہے...... وقت وماحول کی ضروریات کے مطابق ان کا اشہب قلم علمی وفکری توانائی اور عقل وخرد کے اسلحہ سے مرصّع ہوکر میدانِ جہاد میں کود پڑتا ہے اور ہر سر پھرے کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ جس کی شہادت کے لئے ان کی مایہ ناز تصنیف ''نام نہاد اسلامی انقلاب''ہی کافی ہے۔

دینِ متین کی مختلف دعوتوں کو دل نشین اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنا اور ناظرین کرام سے دادِ تحسین حاصل کرنا ان کے قلم زود رقم کی خاصیت ہے، چنانچہ یومُ الفرقان، تبلیغی کتاب، تیس راتیں، اچھا برتاؤ، مرض سے موت تک، مقالاتِ قادری (جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے) وغیرھا کتب مطبوعہ ان کے قلم فیض رقم سے نکلے ہوئے وہ جواہر پارے ہیں جو خواص کی نگاہوں کی زینت اور عامۃ المسلمین کے لئے رشد وہدایت کی ضمانت ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب مستطاب ''یٰۤاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا'' یوں تو ان کی درجنوں تصانیف میں سے ایک ہے لیکن غائر مطالعہ کے بعد یہ بات اظہر منَ الشمس ہوجاتی ہے کہ اس کے جمع وترتیب اور کثرتِ عناوین ومضامین میں فاضل مصنف کا خونِ جگر، نالہ شب اور آہِ سحر گاہی کا وہ دو آتشہ موجود ہے جو مخلص مطالعہ کنندگان کو حریم قدس تک پہنچانے کے لئے مچل رہا ہے اور اب یہ کتاب صرف ایک کتاب نہیں بلکہ ذریعہ نجات وفلاح بھی ہے۔ اس کتاب لاجواب کے بیشمار متنوع عنوانات اس کی مقبولیت وافادیت اور ہدایت ورہنمائی کی سنگ میل ہیں...... حضرت فاضل مصنف نے جن عنوان ومضمون پر قلم زرفشاں اٹھایا ہے اس کے ہر ایک گوشہ اور اس سے شاخ در شاخ نکلنے والے مختلف النوع مضامین کو کتاب وسنت اور قیاس مجتہدین واجماع امت

سے ایسا مرصع ومدلل کردیا ہے کہ اس کی کوئی جہت تشنہ نظر نہیں آتی۔

کتاب ہذا کو بغور پڑھنے کے بعد فاضل مصنف کی وُسعتِ نظر، کثرتِ مطالعہ، حضورِ ذہنی وفکری، استحضارِ مسائل، تصلُّب فی الدین اور عامۃُ المسلمین کی دینی خیر خواہی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

جس کی سطر سطر سے ایمان واسلام کے گلشن سدا بہار میں علم وعمل اور خلوص ووفا کے گلہائے رنگارنگ قطار اندر قطار دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں، عشق وعرفان کی تپتی ہوئی زمین پر قلم سعادت شعار نے اپنے خون جگر سے وہ گلکاریاں کی ہیں کہ اگر ناظرین سعادت مند میں عشق ووفائے الٰہی عزوجل اور محبت ورضائے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھوڑا سا جذبہ دروں بیدار ہوجائے تو وہ آناً فاناً حریمِ جمال تک پہنچ سکتے اور ایمان کی حرارت، عمل کی چاندنی کا پیکرِ محسوس بن سکتے ہیں۔

حضرت سید صاحب کی قلمی زبان اگرچہ منفرد لب ولہجہ کی حامل ہے لیکن علماء مفسرین کے اقوال کریمہ سے کہیں بھی انحراف واختلاف نظر نہیں آتا بلکہ معتمد علیہم مفسرینِ عظام کی تفسیروں کی وضاحت وبیان نہایت سہل اور عام فہم انداز میں فرمایا ہے۔ جو ان کے زورِ قلم اور قوت بیان کی امتیازی شان ہے۔

پوری کتاب کے مطالعہ سے میں مشرف نہیں ہوسکا پھر بھی جہاں تک مطالعہ کیا اس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ایمان وایقان، عشق وعرفان، خلوص ووفا، صبر ورضا، جذبہ اعمال صالحہ، اجتنابِ افعالِ قبیحہ اور محبتِ اولیاء، صحبتِ اصفیاء وغیرھا کی نہ صرف دعوت وتحریک ہے، بلکہ ناظرین باتمکین کے لئے ایک مخلص اور کامیاب رہنما ہے جو انہیں ہاتھ پکڑ کر منزلِ مقصود تک پہنچادینے کی ذمہ داری بھی لیتا ہے۔

میری دعا ہے کہ مولیٰ کریم جل مجدہ بطفیل حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام ناظرین مخلصین کو اس سے نفع تام حاصل کرنے کی توفیق رفیق عنایت فرمائے اور اس کتاب مستطاب کو ذریعہ فلاح ونجات، رافع درجات بنائے نیز حضرت مصنف زید مجدہ کو دارین میں اس کا صلہ جمیلہ اجر جزیلہ عطا فرمائے۔

آمین بجاہ حبیبه سید الانبیاء والمرسلین علیه وعلیهم الصلوٰة والسلام وعلیٰ اله وصحبه وابنه غوثنا الجیلانی امام الربانی قطب الصمدانی الشیخ عبدالقادر البغدادی وحزبه اجمعین برحمتک یاارحم الراحمین۔

عبدالواجد قادری غفرلہ
خادم "القرآن"
اسلامک فاؤنڈیشن نیدرلینڈ
(سابق صدر مفتی) ادارۂ شرعیہ، جامعہ رضویہ منظر الاسلام بلھند

۲۳ رجمل ۱۴۲۰ھ مطابق ۳ ستمبر ۱۹۹۹ء

تبصرہ از قلم

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد جان نعیمی زید مجدہ وحبہ
مہتمم دار العلوم مجددیہ نعیمیہ، ملیر، کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد، آج مورخہ ۱۰ جون ۱۹۹۸ء بروز سہ شنبہ، بعد نماز ظہر، حضرت مبلغ اسلام علامۃ الدھر مولانا سید سعادت علی القادری زید مجدہ، سے شرف ملاقات کو آپ کے دولت کدہ، واقع ایمسٹرڈم، حاضر ہوا۔

حضرت زید مجدہ نے اپنی تازہ تصنیف ''یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا'' کا مسودہ دکھایا، اور فرمایا، کہ کچھ بطور تبصرہ لکھیں۔ جبکہ دوسرے ہی دن میری وطن (کراچی) روانگی تھی، اور رات میں ایک دو پروگرام بھی تھے، یہ حضرت کی محبت اور خلوص ہے کہ مجھ جیسے، کم علم کو اتنا شرف بخشا، میں نے تعمیل حکم کا وعدہ کیا، اور رات ہی کو درج ذیل سطور لکھیں۔

کتاب کے مختلف مقامات نظر سے گزرے، فقیر اس نتیجہ پر پہنچا، کہ ایسی عظیم تصنیف اس موضوع پر، آج تک اردو زبان میں منظر عام پر نہیں آئی۔ حقیقت میں یہ کتاب ایسا انمول خزانہ ہے کہ جس سے پڑھنے والے کا دل راہ حق کا متلاشی بنتا ہے، اور اس قدر دل کش ہے، ایمان افروز اور روح پرور عنوان پر ہے، کہ اہل ایمان کے لئے یقیناً، فرح وسرور اور سرمایہ افتخار ثابت ہوگی۔

اس کتاب میں دلوں کے لئے روشنی، روحوں کی تازگی، اور فکر ونظر کی بالیدگی ملتی ہے، تفسیر قرآن، بالقرآن وسنت وفقہ و تاریخ اور تحقیق کے جملہ وسائل سے آراستہ ہے۔

ایسی عبرت انگیز کتاب کے لئے ایک ایسے صاحب قلم کی ضرورت تھی جو خود دل دردمند رکھتا ہو، اور جسے قرطاس وقلم کا طویل تجربہ بھی ہو۔ اس اعتبار سے حضرت مبلغ اسلام علامۃ الدھر، مولانا سید سعادت علی القادری مدظلہ العالی بہت موزوں ثابت ہوئے، یقیناً اتنی ضخیم کتاب کی تالیف وتصنیف میں جو محنت شاقہ کرنی پڑی ہوگی وہ ہر صاحب نظر پر عیاں ہے، رب تعالیٰ، حضرت زید مجدہٗ کو ان کی محنت ومشقت کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ نیز دارین کی سعادتوں سے ہمکنار فرمائے۔ اور اس تصنیف کو قارئین کے لئے ذریعہ رشد وہدایت بنائے، آمین۔ بجاہ سید المرسلین ﷺ

دستخط ----------

(حال نزیل، روٹرڈم، ہالینڈ)

مورخہ، ۱۴ صفر المظفر ۱۴۱۹ھ / ۱۰ جون ۱۹۹۸ء

تبصرہ از قلم

پروفیسر شاہ فرید الحق صاحب

نائب صدر، جمعیت العلماء پاکستان وورلڈ اسلامک مشن

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مولانا سید سعادت علی قادری ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے والد محترم حضرت علامہ مفتی سید مسعود علی قادری رحمتہ اللہ علیہ ایک مشہور عالمِ دین تھے وہ مدرسہ انوار العلوم میں عرصہ تک حضرت غزالی دوراں علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ درس وتدریس اور افتاء کے فرائض انجام دیتے رہے،

مولانا سید سعادت علی قادری کی شخصیت علماء اہلسنت میں جانی پہچانی ہے، اہل سنت کی تنظیم نو کے سلسلہ میں انہوں بڑی کاوش کی، جماعت اہلسنت پاکستان کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں، تقریر وتحریر میں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں، پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی انہوں نے تبلیغی فرائض انجام دیئے اور اب بھی وہ تبلیغی سلسلہ میں مختلف ممالک کا دورہ کرتے رہتے ہیں وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا'' ایک انوکھے عنوان کے ساتھ منظرِ عام پر آرہی ہے۔ عنوانات دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ مولانا نے اس کی ترتیب میں کافی عرق ریزی سے کام لیا ہے، انہوں نے یہ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا کہ حقیقتاً اور عملاً اسلام ایک مکمل دین، مکمل مذہب اور مکمل ضابطہ حیات ہے، قرآنی احکام سے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، اس میں شک نہیں، زندگی کے ہر گوشہ پر اسلامی اور قرآنی احکامات کے تحت، اپنے انداز سے انہوں نے بحث کی ہے، صرف زندگی ہی نہیں، مابعد کے حالات اور کوائف کو بھی مولانا نے قرآنی احکامات اور فرمودات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے تحت واشگاف الفاظ میں بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے، آمین

احقر، پروفیسر شاہ فرید الحق غفرلہ

تبصرہ از قلم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''ندائے ذوالجلال''

جناب پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ صاحب قادری زید علمہ و مجدہ

استاد شعبہ ارضیات جامعہ کراچی ...... جنرل سیکرٹری ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی

خطیب جامعہ مسجد طیبہ، لیاقت آباد کراچی

مورخہ ۲۱ شوال المکرم ۱۴۱۹ھ...... ۸ فروری ۱۹۹۹ء

-ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ

(البقرہ:۱۷۷)

ہاں اصلی نیکی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر

-فرمایا گیا:-

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۪ (البقرہ:۶۲)

جو سچے دل سے اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک کام کرے، اس کا ثواب اس کے رب کے پاس ہے-

-ارشاد ہوا:-

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

(المائدہ:۶۹)

جو سچے دل سے اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا اور اچھے کام کرے تو اسے نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ کچھ غم ہے-

-اہل ایمان کی مزید صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا-

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ

(التوبہ:۱۸)

جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے

نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں،

-اللہ ورسول کے منکر، باغی، انسانی شکل وشباہت کے باوجود انسان نہیں، بلکہ

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (انفال:۵۵)

بیشک سب جانوروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور ایمان نہیں لائے-

-جبکہ اہل ایمان مستحق اجروثواب ہیں-فرمایا گیا-

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ (آل عمران:۵۷)

اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے اللہ ان کا اجر بھرپور دے گا-

اللہ رب العزت جل مجدہ ان انسانوں کو جو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہیں، ''یایھا الذین منوا'' کے دلنواز خطاب سے، نوازتا ہے- جبکہ قرآن کریم تو تمام بنی نوع انسان کے لئے نازل کیا گیا، جو ہر متلاشی حق کے لئے سرچشمہ ہدایت اور نور رحمت ہے- اور یہ اعزاز صرف نبی آخر الزماں ﷺ کے غلاموں ہی کو بخشا گیا- اور یہ صدقہ ہے اس اعزاز کا جو اس نے اپنے پیارے محبوب علیہ السلام کو بخشا، کہ انہیں بھی ان کی خصوصی صفات کے ساتھ مخاطب کیا گیا، کہیں ''یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ'' کہیں ''یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ'' اور کبھی ''یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ'' تو کبھی ''طٰه''، ''یٰسٓ'' کے خطابات سے نوازا گیا- ''یَا مُحَمَّدُ'' کہہ کر کبھی نہ پکارا گیا- جبکہ انبیاء سابقین علیہم السلام میں سے کسی کو یہ شرف حاصل نہیں، کہ ان کے لئے ''یا آدم''، ''یا نوح''، ''یا ابراہیم''، ''یا موسیٰ''، یا عیسیٰ'' کے الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں- حضور علیہ السلام کے لئے، یہ انداز خطاب درحقیقت آپ سے انتہائی محبت کا اظہار، اور غلاموں کو آپ کے انتہائی ادب واحترام کی تعلیم ہے- جبکہ امت کو ''یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا'' سے مخاطب کرنا، امت کے لئے نہایت ہی فضل وکرم کی بارش ہے، جبکہ عام انسان اس خصوصی عنایت سے محروم ہیں، کہ ان سے خطاب کی نوعیت عمومی ہے- ارشاد ہوتا ہے-

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

(البقرہ:۲۱)

اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے-

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء:۱)

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا-

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ (الاعراف:۱۵۸)

(اے حبیب علیہ السلام آپ) فرما دیجئے - اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں، جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

بہرحال تقریباً نوے مقامات پر اہل ایمان کے لئے خصوصی خطاب، ان سے رب کریم کے خصوصی تعلق کا ثبوت ہے۔ اور بیس مقامات پر، عام انسانوں سے عمومی خطاب، انہیں اپنے سایہ رحمت میں پناہ لینے کی دعوت ہے، جبکہ کفار اور باغیوں سے اظہار بیزاری اور لاتعلقی کرتے ہوئے، انہیں صرف ایک مقام پر، بواسطہ نبی مکرم علیہ السلام مخاطب کیا گیا، ارشاد ہوا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَ
لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

(الکفرون)

فرما دیجئے، اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو جو میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجوں گا جو تم نے پوجا اور نہ تم پوجو گے جو میں نے پوجا، تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔

بہرحال، اللہ رب العزت جل مجدہ کا یہ خصوصی فضل ہے کہ اس نے، اپنے پیارے محبوب علیہ السلام کے غلاموں کو، قرآن کریم میں نوے مرتبہ براہ راست "یایھا الذین امنوا" اے ایمان والو، کہہ کر خطاب فرمایا- جبکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں، مومنین ومومنات کا خصوصی ذکر کیا گیا، ان تمام آیات میں ہمیں بشارتیں بھی دی گئی ہیں، نافرمانی اور حکم عدولی کی صورت میں عذاب وسزا سے ڈرایا گیا ہے- کہیں اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، تو کہیں تقوے کی دعوت دی جارہی ہے- معاشی و معاشرتی زندگی کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے، تو کچھ آیات ہیں، جن میں اپنے اور اپنے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کی دعوت دی جارہی ہے- کہیں دنیاوی عیش وعشرت سے دور رہنے کی تلقین کی گئی، اور دنیا کو متاع قلیل اور عارضی ووقتی ساز وسامان قرار دیا گیا- ان آیات مبارکہ میں عدل و انصاف، صداقت، امانت، دیانت، قناعت، محنت و مشقت، حقوق العباد کی ادائیگی، والدین کی اطاعت، اعزاء واقرباء سے محبت، چھوٹوں پر شفقت، انفاق فی سبیل اللہ، دینی و دنیوی ذمہ داریوں کی ادائیگی، فضول خرچی و بے راہ روی سے بچنے، حرام وحلال میں امتیاز کرنے، غرضیکہ زندگی کے ان تمام مسائل کو بیان کیا گیا، اور وہ تمام اصول بتائے گئے، جو زندگی کو پرسکون بنانے اور معاشرے میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں، جن کا مرکز ومرچشمہ نبی آخرالزماں ﷺ کی ذات مقدسہ ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ
ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب:۲۱)

بے شک تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، اس کے لئے جو اللہ اور قیامت

کے دن پر یقین رکھتا ہو، اور اللہ کا بکثرت ذکر کرتا ہو-

مبلغ اسلام علامہ سید سعادت علی قادری بن حضرت علامہ مفتی سید مسعود علی قادری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۷۳) نے " یاایھا الذین امنوا" سے شروع ہونے والی نوے آیات پر علیحدہ علیحدہ مقالات قلم بند کیے ہیں- اور اپنی خداداد صلاحیت سے، نہایت ہی مہارت کے ساتھ مذکورہ بالاعنوانات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے- الفاظ سہل، اردو سلیس استعمال کی گئی ہے-- جس سے ہر خاص و عام کے لئے استفادہ آسان ہو گیا ہے-- اور یہ کتاب ہر گھر، لائبریری اور مدرسہ کی ضرورت بن گئی ہے- کتاب کی سیٹنگ کے مخصوص انداز نے اس کو مزید مفید بنادیا ہے-

مصنف اپنے اس شاہکار کو تین ضخیم جلدوں میں مکمل کریں گے- جلد اول، سورہ بقرہ کی ۱۲ آیات، سورہ آل عمران کی ۷ آیات، سورہ النساء کی ۸ آیات، المائدہ کی ۱۴ آیات، الانفال کی ۴ آیات، التوبہ کی ۴ آیات، سورۃ الحج کی ایک اور سورۃ النور کی ۳ آیات پر مشتمل ہے- اس طرح یہ پہلی جلد ۵۹ مقالات پر مشتمل ہے-- جس میں تفصیل سے نہایت مفید عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے- ضخامت ۵۷۷ صفحات کی ہے- کتاب ان دنوں زیر طبع ہے، اللہ کرے جلد ہمارے ہاتھوں میں ہو-

علامہ موصوف نے جلد اول ہی کا مسودہ مجھے مطالعہ کے لئے دیا، نیز حکم دیا کہ میں اس کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کروں، جو میرے لئے نہایت مشکل کام ہے- کہ میرا قلم ابھی بہت پست ہے، نیز میں عمر، علم، تقویٰ، ہر اعتبار سے ہر طرح چھوٹا ہوں، اس لئے کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ میں حضرت کی اس عظیم تحریر پر کچھ تبصرہ کرسکوں- تاہم تعمیل حکم میں چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں-

مبلغ اسلام حضرت علامہ سید سعادت علی قادری، امریکہ وافریقہ، یورپ ومشرق وسطیٰ کے متعدد بار دورے کر چکے ہیں، آپ کا دائرہ کار بے حد وسیع ہے- شعلہ بیان مقرر ہیں- یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ سینکڑوں عنوانات پر، آپ کی تقاریر کیسٹس کی صورت میں محفوظ ہیں- نہایت پر اثر تحریر کے مالک ہیں- مقالات قادری ۳ جلدیں، تبلیغی کتاب ۲ جلدیں، وراثت انبیاء، اچھا برتاؤ، یوم الفرقان، مرض سے موت تک، نام نہاد اسلامی انقلاب، تمیں راتیں، دائمی استفادے کے لئے موجود ہیں-

آپ مبلغ ومصنف ہونے کے ساتھ بہترین منتظم بھی ہیں- آپ کی یہ صلاحیت اس وقت اجاگر ہوئی جب ۱۹۶۴ء میں آپ نے جماعت اہلسنت کی تنظیم کا آغاز کیا، آپ کی شب وروز محنت اور تنظیمی صلاحیت نے اس جماعت کو چند ہی دن میں ملک کی ایک مضبوط ومستحکم تنظیم بنادیا- جس سے عوام اہلسنت میں زبردست تنظیمی وسیاسی شعور پیدا ہوا، جس کا نتیجہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عظیم کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا-- وہ وقت راقم الحروف کی طالب علمی کا تھا- اسی دور میں علامہ موصوف کو میں نے ایک فعال قائد کی حیثیت میں پہچانا اور جوں جوں میں آپ کے قریب ہوتا گیا آپ کی صلاحیتیں مجھ پر اجاگر ہوتی گئیں- مغربی ممالک میں متعدد مذہبی اداروں کا قیام بھی آپ کی تنظیمی صلاحیت کا ثبوت ہے-

مولانا کی متعدد تصانیف کا انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے-- جس سے غیر مسلم بھی فائدہ حاصل

کرر ہے ہیں- زیر نظر کتاب ''یایھا الذین امنوا'' کی پہلی جلد ۵۹ مقالات پر پھیلی ہوئی ہے، جس کا پہلا ہی مقالہ نہایت ہی اہم موضوع ''ایمان'' پر لکھا گیا ہے-۔جس میں تفصیل سے حضرت علامہ نے ایمان اور اہل ایمان کی تعریف اور خصوصیات پر گفتگو کی، اسی مقالہ کے مطالعہ کے بعد قارئین کو کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے- اس مقالہ کے بعد مصنف نے ہر آیت کو علیحدہ موضوع بنا کر اس پر مبسوط بحث کی ہے- آیت کی تشریح کے لئے اول آیات قرآنی کو ماخذ بنایا گیا ہے- اس کے بعد صحاح ستہ کی مستند احادیث سے تشریح کی گئی ہے- ساتھ ہی مؤطا امام مالک اور مشکوٰۃ شریف سے بھی مدد حاصل کی گئی ہے- اس لحاظ سے یہ کتاب، نہ صرف منتخب آیات قرآنی بلکہ سینکڑوں آیات کی اور احادیث کی تفسیر و تشریح ہے- اس اعتبار سے احقر اگر ''یایھا الذین امنوا'' کی اس کتاب کو تفسیر قرار دے تو بے جا نہ ہوگا- کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے قرآنی آیات کا ترجمہ بھی خود ہی کیا ہے، اس طرح علامہ موصوف کو مفسرین و مترجمین کی فہرست میں شامل کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

حضرت علامہ سے میری گزارش ہے کہ اس کام کو جاری رکھا جائے اور اسی انداز پر بقیہ آیات قرآنی کی تفسیر کر کے ایک مکمل تفسیر کی شکل دے دی جائے، کہ ان ۳ جلدوں کے بعد غالباً ۴/۵ جلدوں میں یہ کام مکمل ہوسکتا ہے، جو بلاشبہ ایک مکمل اور عظیم کارنامہ ہوگا- کہ اس انداز تحریر میں اب تک میری نظر سے کوئی تفسیر نہیں گزری- آخر میں، میں حضرت علامہ کو اس عظیم کارنامہ پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس کتاب کو قبول فرمائے اور مقبول بنائے، آمین-

(دستخط ڈاکٹر مجید اللہ قادری)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش کش

الحمد للہ کہ مجھے والد گرامی کی یہ عظیم تصنیف پیش کرنے کا فخر حاصل ہو رہا ہے۔ کتاب کیسی اور کتنی مفید ہے، یہ تو آپ ہی فیصلہ کریں گے، میرے نزدیک یہ ایسے جملہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ عام طور پر کسی ایک کتاب میں مختلف انواع کے عنوانات ملنا، مشکل ہوتا ہے۔ جبکہ اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ اس میں آپ کو عبادات اور اس سے متعلق مسائل بھی ملیں گے، معاملات اور ان سے متعلق الجھنوں کا حل بھی، آپ اس میں پائیں گے۔ بعض ایسے مسائل جو عام طور پر نہ لکھے جاتے ہیں، نہ بیان کیے جاتے ہیں اور اسی لئے مجھ جیسے کم علم ان اہم مسائل سے ناواقف رہتے ہیں۔ مثلاً قصاص، دیت، رہن وغیرہ۔ اس کتاب میں ان عنوانات کو پڑھ کر آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور اسلامی نظام کی اہمیت و افادیت بھی واضح ہوگی۔ معاشرے میں عورتوں کا مقام، پردہ، نکاح وغیرہ جیسے عنوانات بھی آپ پڑھیں گے۔

اسلام کے متعلق ہمارے دور میں جو شکوک وشبہات نوجوانوں کے ذہنوں میں گھر کر چکے ہیں، اگر اس کتاب کا بغور مطالعہ کر لیا جائے، تو ہر قاری پکار اٹھے گا کہ ''اسلام سے بہتر نہ کوئی مذہب ہے، نہ دنیا کا قانون، اور اسلام ہی کا عطا کردہ ضابطہ حیات، انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن میں سامان طمانینت وسکون ہے، اسلامی قانون ہی ذریعہ امن وامان ہے''۔ اور اللہ کا دعویٰ حق ہے ''لا ریب فیه'' اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، شکوک وشبہات کا سبب ہماری کم علمی اور اسلام سے دوری ہے، جس کو اس کتاب کا مطالعہ ختم کرتا ہے، کہ یہ معلومات کا ایک خزینہ ہے۔

کتاب کا نام آپ کی خصوصی توجہ چاہتا ہے ''یاایھا الذین امنوا'' چودہ سو سالہ پرانا قرآنی جملہ ہے، لیکن مصنف نے اس کو کتاب کا نام بنا کر، جدت پسندی کا تمغہ حاصل کیا ہے، کہ اب تک اس نام کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری، اب تک جس نے یہ نام سنا، واہ واہ کی، کہ اس میں قرآنی جملہ ہونے کے باعث بلا کی کشش ہے، اور یقیناً برکت بھی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ اس نام ہی کی برکت سے یہ کتاب قبول عام حاصل کرے گی۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ، والد مکرم کی عمر دراز کرے، ان کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے، تا کہ ان کی یہ دینی خدمت تادیر جاری رہے۔ اور ہمیں جدید تقاضوں کے مطابق علمی ذخیرہ حاصل ہوتا رہے۔

طالب دعا خادم العلماء

صاحبزادہ سید عامر علی القادری

۱۱/اپریل ۱۹۹۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بنام"

ضیاء الامت

رحمۃ اللہ علیہ

مفسر القرآن شیخ الحدیث حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ جو، نہ میرے استاد تھے، نہ پیر، لیکن ہمیشہ میری عقیدت ومحبت کا مرکز رہے۔ جن کی تصانیف بالخصوص ضیاء القرآن اور ضیاء النبی سے میں ہمیشہ استفادہ کرتا ہوں۔ اللہ ان کی قبر کو مرکزِ انوار وتجلیات بنائے، اور ہمارے لئے ان کے فیوض و برکات جاری رکھے۔

فقیر سید سعادت علی القادری



”کتاب ایک نظر میں“

بحمداللہ ”یاایھا الذین امنوا“ کی پہلی جلد آپ کے پیش نظر ہے، دعا کیجئے کہ جلد ہی دوسری جلد بھی نظر نواز ہو سکے۔

یہ جلد سورہ البقرہ، ۱۲، مقالات، سورہ آل عمران، ۷، سورہ النساء، ۸، سورۃ المائدہ، ۱۶ پر مشتمل ہے۔ جن کی تائید و تشریح کے لئے سینکڑوں آیات و احادیث پیش کی گئی ہیں۔ اندازہ فرمائیے کتنا عظیم علمی ذخیرہ ہے، آپ کے ہاتھوں میں۔ جس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ آپ کو درج ذیل چند عنوانات سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

حلاوت ایمان، احترام رسول، اتحاد ملت، استعانت، صبر کی اہمیت، نماز کی عظمت، شہید کا مرتبہ، وما اُھل بہ لغیر اللہ، قصاص، دیت، وصیت، صیام، دین کامل، صدقہ، اخلاص، ربو وصدقہ کا فرق، سود کی لعنت سے بچنا، فتنہ وفساد کا انسداد، عورت کی گواہی، رہن، تیوضہ، خطرناک دشمن، مداہنت، غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت، تقویٰ، اعتصام بحبل اللہ، جماعت مبلغین، دینی تعلیم وتربیت، غصہ، محسنین، استغفار، سیر و سیاحت، گردش ایام، اسلام اللہ کی امانت ہے، نرمی، خوش کلامی، قساوت قلب، عفو و درگزر، مشورہ، مصاہرہ، عورت وراثت نہیں، غلام اور باندی، عائلی زندگی، اسراف، تجارت، خودکشی، قتل عزت، کبائر کی فہرست، مرد عورت کی برابری، اطاعت، بے بسوں کی حمایت، بے احتیاطی کا سد باب، نماز قصر، نماز خوف،

قیام بالقسط، ایفائے عہد، شکار کی ممانعت، شعائر اللہ کا احترام، باہمی تعاون، اکمال دین، ختم نبوت، حفاظت دین، عدل، توکل کی اہمیت، ہدایت کی اہمیت، موالات کی ممانعت، کلمہ کافی نہیں، اسلام میں رہبانیت نہیں، حرمت شراب، مومن کا امتحان، ترقی زدگان کے لئے، واقعہ ذبح بقرہ، اصلاح نفس، ایک بمقابلہ دو، نیکی میں دیر نہ کرو، خیانت، اموال و اولاد فتنہ ہیں، فراست، ثبات، جھگڑا نہ کرو، صلہ رحمی، غزوہ حنین، مشرکین نجس ہیں، پادریوں اور راہبوں کا حال، غزوہ تبوک، واقعہ ہجرت، ملت ابراہیم، ازلی دشمن، معاشرت کی اہمیت، استیذان، نظر بازی اور عریانیت، پردہ، زیب و زینت کا اظہار، حکم نکاح، مغربی تہذیب کی بدتہذیبی، جوڑے کا انتخاب، جہیز کی تلاش، عورتوں کی جسم فروشی، بچوں کے لئے اجازت طلب کرنا، بوڑھیوں کے لئے رعایت، بے تکلفی کی اجازت، ساتھ کھانا کھانا۔

مندرجہ بالا عنوانات کو ذہن میں رکھئے، پھر کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے لطف اندوز ہو جیئے۔ فقیر راقم الحروف یہ اعتراف کرتا ہے کہ صلاحیت کی کمی اور استعداد کی کمزوری کے باعث وہ کچھ تو نہ لکھا جا سکا، جس سے کتاب واقعی مفید ہوتی، اہم اور وقیع ہوتی، تاہم میری یہ کاوش، میری زندگی کا نچوڑ ہے۔ جسے میں نے محض تبلیغ و اشاعت دین کی غرض سے پیش کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس سے میرا یہ مقصد ایک حد تک پورا ہوتا ہے۔ رہی اس کی افادیت، تو یہ تو آپ کو کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ مرد و عورت، بوڑھوں اور جوانوں کے لئے کس قدر مفید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ متلاشیان علم کے لئے یہ ایک بہترین ذخیرہ ہے۔ مقررین و واعظین کے لئے ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ اصلاح و تزکیہ نفس کے لئے ایک دریا ہے، گویا ہر گھر کی ضرورت ہے اور ہر فرد کے لئے مفید ہے۔

میں شکر ادا کرتا ہوں اپنے رب کریم کا کہ اس نے بطفیل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم، مجھے اس کتاب کی ترتیب کی توفیق عطا فرمائی جو بلاشبہ میرے لئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ خدمت دین، آخرت میں میرے لئے ذریعہ نجات بنے گی۔ میں قارئین سے عرض گزار ہوں کہ وہ کتاب کے مطالعہ کے دوران میرے، میرے اہل خانہ و خاندان اور ان احباب کے لئے دعا کرتے رہیں جن کے تعاون سے یہ عظیم کام سرانجام پایا کہ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

فقیر سید سعادت علی القادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مقدمہ

مقالہ ا

ایمان کے معنی

ایقان، یقین کرنا، یہ لفظ، امن سے ماخوذ ہے، مقصد میں کامیابی کے لئے کسی ایسے ذریعہ پر یقین کرنا کہ ناکامی کا خوف وخطر نہ رہے، عام معنی کے اعتبار سے یقین کہلاتا ہے، جو انسان کے ہرارادے کی تکمیل کی بنیاد ہے، کہ انسان کسی کام کا ارادہ نہیں کرتا جب تک کہ اس میں کامیابی کے اسباب پراسے یقین نہ ہو۔ آپ ہرگز سفر کا ارادہ نہیں کرسکتے جب تک کہ آپ کو دولت ملنے، اپنی صحت اور سواری کا یقین نہ ہو، آپ ہرگز تجارت کا ارادہ نہیں کرتے، جب تک کہ ماحول، اس میں آپ کو کامیابی کا یقین نہ دلادے، گویا یقین انسان کے ہرعمل کی بنیاد ہے، پس اس کو انسان کے لئے اولین فرض، قرار دیا گیا، تاکہ وہ اپنی فلاح وبہبود کے لئے اقدام کرسکے،

ایمان، یقین کا تعلق، قلب یعنی دل سے ہے کہ دل میں جو خیالات وعقائد جگہ کرلیتے اور مستحکم ہوجاتے ہیں، انہی کو

یقین کہا جاتا ہے،لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے قلب کو ایسے خیالات کا خزینہ بنائے جو اس کے ارادوں کی تکمیل اور مقاصد کے حصول کا واقعی ذریعہ بن سکیں۔ اور ایسے خیالات سے پاک وصاف رکھے، جو اس کی ناکامی ونامرادی یا ذلت و خواری کا سبب ہوں،اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قلب کی پاکیزگی ہی کو ذریعہ کامیابی وکامرانی قرار دیا ہے،فرمایا،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس:۹۔۱۰)

بیشک کامیاب ہوا (وہ) جس نے اس (دل) کو پاک کرلیا،اور،تحقیق ناکام ہوا (وہ) جس نے اس (دل) کو گندگی سے آلودہ کرلیا۔

نیز فرمایا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ (الاعلیٰ:۱۴)

بیشک کامیاب ہوا (وہ) جس نے (دل کو) پاک کرلیا۔

اور دلوں کو پاک کرنے والے آقا ﷺ فرماتے ہیں:۔

اَلَا وَ اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وهِيَ الْقَلْبُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ

خبردار،اور بیشک انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو ٹھیک ہوگیا،تو تمام بدن ٹھیک ہوگیا،اور اگر وہ بگڑ گیا،تو تمام بدن بگڑ گیا،سنو،وہ دل ہے۔سنو!وہ دل ہے سنو وہ دل ہے۔

قرآن کریم!دل کی تین حالتیں یا تین قسمیں بیان فرماتا ہے۔

قلب آثم۔قلب سلیم۔قلب منیب

جو مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوئیں:۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ (البقرہ:۲۸۳)

اور گواہی نہ چھپاؤ،اور جو گواہی چھپائے،تو بیشک اس کا دل گناہ گار ہے۔

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (الشعراء:۸۹)

مگر جو،اللہ کے دربار میں قلب سلیم لے کر حاضر ہوا۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۝ (ق:۳۳)

جو رحمان سے،بے دیکھے،ڈرتا رہا،اور اللہ کی طرف،رجوع ہونے والا دل لے کر آیا۔

قلب آثم

وہ دل جو،ناکام ونامراد،ذلیل وخوار کرنے والے،عقائد وخیالات سے آلودہ اوہام کا مرکز ہو یعنی ایسے اقدام اور اعمال پر آمادہ کرے جو انسان کی ذلت وخواری کا باعث اور مقاصد میں ناکامی کا ذریعہ بنیں۔

قلب سلیم

وہ دل، جو برے خیالات، عقائد سے پاک وصاف اور ایسے یقین کا مرکز ہو جو انسان کو ایسے راستے کی رہنمائی اور رہبری کرے، جو اس کی کامیابی و کامرانی کی منزل کی طرف لے جائے اور مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ بنے۔

قلب منیب

وہ دل جس میں برے خیالات پیدا ہوں، تو وہ رد کر دے اور ایسے عقائد اور ایسا یقین پیدا کرے، جو ذریعہ فلاح و بہبود ہوں۔ یعنی دل میں اچھائی، برائی کا امتیاز ہو اور برائی کی طرف لے جانے والے خیالات کو مسترد کر دینے اور نیکی پر آمادہ کرنے والے عقائد و یقین کو پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔

انسان کے لئے، از خود، دشوار ہی نہیں بلکہ یہ ناممکن ہے، کہ وہ ایسے اسباب، ذرائع اور سہاروں کا انتخاب کرے اور ان پر یقین کرے جو اس کو کامیابی و کامرانی کی منزل تک پہنچا ئیں، یہ کام بغیر کسی رہبر و رہنما کے ممکن ہی نہیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک بچہ، زندگی بسر کرنے کے طریقے اپنے ماں باپ یا استاد کے بغیر نہیں سیکھ سکتا، یا کوئی نابینا، رہنما کے بغیر منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح کوئی انسان فلاح و بہبود کی منزل حاصل کرنے کے لئے یقینی اسباب و وسائل کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا فرمایا اور اپنے فضل و کرم سے اس کے لئے تمام لوازمات زندگی بھی مہیا فرمائے۔ لیکن اللہ کی کسی نعمت سے انسان اس وقت تک صحیح استفادہ نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس یقین و ایمان کی دولت نہ ہو، اور یہ دولت بھی دوسری نعمتوں کی طرح اللہ کے فضل و کرم سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ پس اللہ نے انسان کی یہ اہم ترین ضرورت پوری کرنے کے لئے اپنے انبیاء کرام، رُسُلِ عِظام علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ جاری فرمایا جو بلا واسطہ اللہ سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے، ہر اعتبار سے انسانوں سے افضل و ممتاز ہوتے ہیں اور وہ ایمان لانے اور یقین کرنے والی ایسی باتیں بتاتے ہیں جن سے انسان بآسانی اپنے ارادوں کی تکمیل اور مقاصد حاصل کرتا ہے۔ ان کو رہبر و رہنما تسلیم کر لینے والے انسان، انسانیت کی اقدار، عزت و عظمت کو پا لیتے ہیں اور اشرف المخلوقات کے بلند مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں، اسی لئے ایمان کی شرعی اعتبار سے مکمل تعریف یہ ہے۔

ایمان کی تعریف

هُوَالتَّصْدِيْقُ بِمَا جَآءَ بِهٖ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ تَعَالٰى اَىْ تَصدِيْقُ النَّبِيِّ بِالْقَلْبِ فِي جَمِيْعِ مَا عُلِمَ بِالضَّرُوْرَةِ مجيئُهٗ به مِن عِنْدِاللّٰهِ اِجْمَالًا

ایمان ان امور کی تصدیق کا نام ہے، جو اللہ کی طرف سے آئے، یعنی اجمالی طور پر دل سے نبی مکرم علیہ السلام کی تصدیق کرنا، ہر اس چیز میں جو آپ اللہ کی طرف سے لائے جس کا ثبوت آپ سے قطعی طور پر ہو۔

گویا ایمان کا اولین مرحلہ نبی کی تصدیق ہے، کہ ایمان کا داعی اول سوا نبی کے کوئی نہیں ''اٰمِنُوا بِاللّٰه'' کی صدا بلند کرنے والا، نبی کے علاوہ کون ہے۔ پس ایمان نبی ہی سے ملتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ نبی ہی ہمارے دل کو ''قلب آثم'' بننے سے

بچا کر ''قلب سلیم'' یا ''قلب منیب'' بناتا ہے۔خوب فرمایا علامہ اقبال نے۔

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

ایمان کا تعلق دل سے ہے کہ جس نے حضور نبی کریم علیہ السلام کے لائے ہوئے تمام امور کی تصدیق کر دی وہ مومن ہو گیا۔اور جس نے دل سے نہ مانا وہ مومن نہیں،جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ:۲۲)

یہ ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں (اللہ نے) ایمان ثبت فرما دیا،اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد فرمائی۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (المائدہ:۴۱)

اے رسول،آپ ان لوگوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں جو کفر میں تیزی سے دوڑتے ہیں،ان میں سے جنہوں نے اپنے منہ سے کہا،ہم ایمان لائے،حالانکہ ان کے دل مومن نہیں۔

طبقہ منافقین کی بنیاد،یہی کیفیت ہے،کہ وہ زبان سے تو ایمان کا اعلان کرتے ہیں،مسلمانوں کے ساتھ نمازوں میں بھی شریک ہوتے ہیں،لیکن دل سے ایمان نہیں لاتے۔جس کا حال اللہ خوب جانتا ہے۔اس نے اپنے حبیب علیہ الصلاۃ والسلام کو بھی اس کا علم دیا۔منافقوں کے نام تک بتا دیئے،تاکہ مسلمان ان کی سازشوں سے محفوظ رہیں۔اب اگرچہ عملی طور پر منافق موجود ہیں،لیکن ہم کسی کو شرعاً منافق نہیں کہہ سکتے،کیونکہ ہم کسی کے دل کا حال نہیں جان سکتے کہ دلوں کا حال اللہ رب العزت نے صرف اپنے محبوب ﷺ کو بتایا۔پس ہر کلمہ پڑھنے والا مسلمان ہی ہے،بشرطیکہ اس کی زبان یا عمل سے کوئی کفریہ بات یا کام ظاہر و ثابت نہ ہو۔

پس جو شخص زبان سے ایمان کا اقرار کرتا ہے،اس کے ایمان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔پھر یہ کہنے کا حق باقی نہیں رہتا کہ یہ شخص دل سے مومن نہیں۔کیونکہ شرعی احکام کا نفاذ تو زبان اور ظاہر حال پر ہوتا ہے،قلبی کیفیات پر نہیں۔کہ دل کا حال تو جاننے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا،حالانکہ وہ زور زور سے ان کے سامنے کلمہ پڑھ رہا تھا۔نبی مکرم علیہ الصلاۃ والسلام کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی،آپ نے اسامہ کو طلب فرمایا اور پوچھا،جب وہ شخص کلمہ پڑھ رہا تھا،تو تم نے اس کو کیوں قتل کر دیا۔اسامہ نے عرض کیا،یارسول اللہ اس نے میرے خوف سے اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا۔دل سے وہ ایمان نہ لایا تھا۔آپ نے فرمایا،اسامہ،کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔

حضرت امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اَلْاِيْمَانُ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ مَعْرِفَةٌ بِالْقَلْبِ

ایمان زبان سے اقرار اور دل سے پختہ یقین کرنے کو کہتے ہیں۔

چونکہ زبانی اقرار کے بغیر کسی کے ایمان کا پتہ نہیں چل سکتا، لہٰذا اسے ایمان کی شرط قرار دیا گیا- اکراہ اور مجبوری کی صورت میں اگر کسی نے زبانی اقرار نہ بھی کیا، تب بھی وہ عنداللہ مومن ہوگا- جیسے حضور علیہ السلام کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ ایک عرصہ تک اپنا ایمان ظاہر نہ کر سکے، کہ حالت مجبوری میں زبانی اقرار نہ کرنے پر کوئی مواخذہ نہیں- اللہ فرماتا ہے-

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النحل:۱۰۶)

جس نے ایمان لانے کے بعد، اللہ کے ساتھ کفر کیا (اس کے لئے دردناک عذاب ہے) مگر جس پر جبر کیا گیا، حالانکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے (اس سے کوئی مواخذہ نہیں) اور ہاں جس نے اپنے سینہ کو کفر پر کھول دیا (واقعی کافر ہو گیا) تو ان لوگوں پر اللہ کا غضب اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

ایمان کا ثبوت

اگرچہ ایمان کا تعلق قلب سے ہے، لیکن اس کے ثابت کرنے کے لئے زبان سے اقرار کرنا شرط ہے، کہ جو شخص زبان سے اقرار کئے بغیر مر گیا اس کو مؤمن نہیں کہا جا سکتا ہے، چاہے اس نے ساری زندگی نیک کام کئے ہوں- زمانہ جاہلیت میں عبداللہ بن جدعان نامی شخص کی نیکیاں بہت مشہور تھیں- ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم علیہ السلام سے اس کے متعلق دریافت کیا کہ کیا عبداللہ بن جدعان کو، اس کی نیکیوں کا ثواب ملے گا- آپ نے فرمایا نہیں، کیونکہ اس نے کبھی اللہ سے توبہ نہ کی- مگر ایسے لوگ جن کا ایمان لانا بصورت اقرار ثابت تو نہیں، لیکن وہ حضور علیہ السلام کے بہت قریب رہے بلکہ معاون و مددگار بھی رہے، علماء محققین کے نزدیک ان کا حال اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے- ہمارے لئے ان کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے بہتر خاموش رہنا ہے- جیسے حضور علیہ السلام کے چچا ابوطالب کا معاملہ ہے، کہ نبی کریم علیہ السلام کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اور تعاون صرف اعلان نبوت سے قبل ہی نہیں بلکہ بعد میں بھی، نیز حضور علیہ السلام کا ان سے بے حد محبت فرمانا روز روشن کی طرح واضح ہے- لیکن بہرحال ان کے ایمان قبول کرنے کا کوئی ثبوت موجود نہیں- پس مناسب یہی ہے کہ ان کے مومن یا کافر ہونے پر بحث نہ کی جائے- ان کے حال کو اللہ بہتر جاننے والا ہے- غرضیکہ زبانی اقرار، ایمان کی شرط ہے جس کے بغیر ثبوت ایمان کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی ہے شرح عقائد میں ہے-

وَذَهَبَ جَمْهُوْرُ الْمُحَقِّقِيْنَ اِلٰى اَنَّهٗ هُوَ التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَالْاِقْرَارُ شَرْطٌ لِاِجْرَاءِ الْاَحْكَامِ فِي الدُّنْيَا لِمَا اَنَّ تَصْدِيْقَ الْقَلْبِ اَمْرٌ بَاطِنٌ لَا بُدَّ مِن عَلَامَةٍ فَمَن صَدَّقَ بِقَلْبِهٖ وَلَم يُقِرَّ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ عِنْدَاللّٰهِ تَعَالٰى

جمہور محققین کا مذہب یہی ہے کہ ایمان، تصدیق بالقلب کا نام ہے اور زبانی اقرار صرف دنیاوی احکام جاری کرنے کے لئے شرط ہے، کیونکہ دل کی تصدیق، پوشیدہ معاملہ ہے- اس لئے لازمی طور پر اس کے لئے کوئی ظاہری علامت ہونا چاہئے، تو جو شخص دل سے (تمام ضروریات دین کی) تصدیق کرتا ہے، اور زبان سے اس نے (بوجہ مجبوری) اقرار نہ کیا، وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے۔ (شرح عقائد)

غرضیکہ، ایمان، تصدیق بالقلب کا نام ہے، اور زبان سے اقرار، اس کی شرط ہے، جس کے بغیر ایمان کا، اعلان و اظہار ممکن نہیں کہ یہی ذریعہ ہے شرعی احکام کے نفاذ کا، اور مومنین میں شمار کئے جانے کا - اب رہا معاملہ، اعمال کا، جن کے مجموعہ کا نام اسلام ہے - یہ نہ ایمان کا جز ہیں نہ ہی شرط - اس اعتبار سے کہ مومن کتنا ہی گناہگار، بدکار یا بدکردار ہو، بہرحال مومن رہے گا - اسے کافر نہیں کہا جائے گا - تاہم ایمان کا مقتضی یہی ہے کہ مومن، اللہ اور اس کے احکام کا پوری طرح پابند ہو - لیکن اعمال، عبادات، شریعت کی پابندی، ایمان کے بغیر قابل قبول نہیں - نہ ایسے شخص کو مؤمن و مسلم کہا جا سکتا ہے جو اللہ و رسول پر ایمان لانے کا اعلان کئے بغیر احکام اسلام کی پابندی کرتا ہو یا وہ ایمان کا دعویدار تو ہو لیکن نص قطعی سے ثابت شدہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو - مثلاً فرض عبادات میں سے کسی ایک کا انکار کرے - قرآن کی کسی آیت یا کسی حرف کا انکار کرے یا اس کے بیان کردہ احکام و واقعات میں سے کسی کا انکار کرے یا ان کو مشکوک جانے - حضور علیہ السلام کے فضائل و مناقب کا منکر ہو، یا آپ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہو - اللہ اور رسول ﷺ نے جن چیزوں کو حرام و حلال قرار دیا ان میں سے کسی حرام کو حلال اور حلال کو حرام جانتا ہو وغیرہ وغیرہ - کیونکہ ایمان تمام ضروریات دین کی تصدیق کا نام ہے اور کسی ایک چیز کے انکار سے کم یا ناقص نہیں بلکہ رخصت ہو جاتا ہے - بہرحال ایمان پر تمام اعمال کا دارومدار ہے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ، اعمال صالحہ کی تاکید یا اس کی جزاء کو بیان کرتے ہوئے، ایمان کی شرط ضرور لگائی ہے - ملاحظہ ہوں چند آیات -

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾ (النحل: ۹۷)

جو نیک کام کرے، مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مومن ہو تو ضرور ہم اسے زندہ رکھیں گے، پاکیزہ زندگی کے ساتھ اور ہم انہیں ضرور صلہ دیں گے ان کے بہترین کاموں کا جو وہ کرتے تھے -

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا (الکہف: ۸۸)

اور جو ایمان لایا اور اس نے نیک کام کئے، تو اس کا بدلہ بھلائی ہے، اور عنقریب ہم اسے اپنا ایسا حکم دیں گے، جس کی تعمیل آسان ہوگی -

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى (طٰہٰ: ۷۵)

اور جو اس (اللہ) کے پاس مومن ہو کر آئے کہ اس نے نیک کام کئے ہوں تو ایسے ہی لوگوں کے لئے بلند درجے ہیں -

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ (القصص: ۸۰)

اور ان لوگوں نے کہا، جنہیں علم دیا گیا، تم پر افسوس ہے اللہ کا ثواب بہت اچھا ہے - اس کے لئے جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کئے، اور یہ نعمت انہی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں -

ان آیات سے دونوں باتیں واضح ہیں کہ ایمان کا ثمرہ فائدہ اعمال صالحہ ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اعمال صالحہ ایمان ہی کے ذریعہ مفید و مقبول ہیں۔ بغیر ایمان کے اعمال کے پہاڑ بھی بنا دیئے جائیں تو راکھ ہیں، سراب ہیں، بیکار ہیں۔ فرمایا گیا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (الاعراف: ۷: ۱۴۷)

اور جنہوں نے ہماری آیتوں اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا، ان کے سب عمل ضائع ہو گئے۔ انہیں وہی بدلہ ملے گا جو وہ کرتے تھے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝ (ابراہیم: ۱۸)

اپنے رب کے منکروں کا حال ایسا ہے کہ ان کے اعمال راکھ کی طرح ہوں گے کہ اس پر تیز آندھی کے دن ہوا کا سخت جھونکا آیا، اپنی ساری کمائی (اعمال) میں سے کسی چیز پر بھی وہ قدرت نہ پاسکیں گے، یہی دور کی گمراہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (النور: ۳۹)

اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے (نیک) اعمال ہموار زمین میں چمکتے ہوئے ریت کی طرح ہیں۔ جسے، پیاسا پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے کچھ (بھی) نہ پایا، اور اس نے اپنے قریب اللہ کو پایا تو اللہ نے اس کا حساب پورا پورا کر دیا اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

ایمان کی اہمیت

ایمان، جسم ہے، اعمال زیور ہیں، زیور سے جسم کا حسن بڑھتا ہے، اعمال سے ایمان کا حسن چمکتا ہے، جسم نہیں تو زیور بیکار، ایمان، بیج ہے، اعمال، درخت، پتے، پھل ہیں، زمین میں بیج پڑتا ہے، تو درخت، پتوں، پھلوں کا فائدہ نصیب ہوتا ہے، بیج ہی نہیں، تو درخت، نہ پتے، نہ پھل اور نہ ہی ان کا فائدہ،

ایمان، نور ہے، اعمال سواری ہیں، جب انسان اعمال پر سوار ہو کر ایمان کے نور میں چلتا ہے تو راہ منزل نظر آتی ہے، کہ ہر سواری کے ساتھ، نور لازمی ہے، تاریک راستے میں بغیر نور کے ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں ملتا، اعمال کی سواری کتنی ہی مضبوط اور تیز رفتار کیوں نہ ہو ایمان کے نور کے بغیر منزل مقصود کی سمت بھی نہیں پاسکتی، پس ایسے لوگ جو ضروریات دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کر کے ایمان سے محروم ہو چکے کتنے ہی اعمال کریں، بظاہر کتنے ہی متقی نظر آئیں، کتنا ہی مقدس لبادہ پہن لیں، ان کے تمام اعمال راکھ ہیں، جنہیں، قیامت کی آندھی کا ایک جھونکا اڑا لے جائے گا اور وہ اپنی کمائی ہوئی دولت کو تلاش کرتے پھریں گے لیکن کچھ ان کے ہاتھ نہ لگے گا، انہوں نے تو یہ نیکیاں اس لئے کی تھیں کہ قیامت میں یہ پانی

بن کر ان کی پیاس بجھائیں گی، لیکن قیامت کے دن جب وہ ان کے قریب پہنچیں گے، تو یہ نیکیاں ریت ہوں گی اور یہ اسی طرح پیاسے تڑپتے رہیں گے کہ تمام اعمال کا دارومدار تو ایمان پر ہے جو غائب ہو چکا تھا، اب ان کے لئے کچھ باقی نہیں رہا جو ان کی نجات کا ذریعہ بن سکے، کتنا بڑا خسارہ ہے، اللہ محفوظ رکھے۔

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان بڑی دولت ہے، جس کی حفاظت ہر عزیز ترین چیز سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے اس کی حفاظت بھی بڑی مشکل ہے، کہ ہماری دوسری چیزوں کے ڈاکو، لٹیرے، ہم جیسے انسان ہی ہوتے ہیں، جن کا ہم مقابلہ، کر لیتے ہیں، ان سے اپنی عزت وآبرو، مال دولت بچانے کی کامیاب تدبیریں، ہمارے پاس ہوتی ہیں، ہم حفاظت کر لیتے ہیں لیکن ایمان کا دشمن بڑا ہی طاقتور، بڑا ہی مکار، اور چال باز ہے، جو سامنے سے کامیاب نہیں ہوتا، تو پیچھے سے حملہ کرتا ہے، ظاہر میں کامیاب نہیں ہوتا تو باطن کو قابو میں کرتا ہے، اسے برائی کو اچھائی بنانے، بے دینی کو دین بنانے، حرام کو حلال بنانے کا فن خوب آتا ہے، یہ رسول کی اہانت کو توحید کی عظمت بنا دیتا ہے، سنت کے انکار کو قرآن پر مکمل ایمان قرار دیتا ہے، حب اہلبیت کی آڑ میں بغض صحابہ کا بیج بوتا اور خلفائے ثلاثہ سے بدظن کرتا ہے، اور کہیں، عظمت صحابہ کے جذبہ میں اہلبیت اطہار پر تنقید، اور ان کی تنقیص پر اکساتا ہے، آئمہ مجتہدین کی تقلید کو، اللہ ورسول کی اطاعت سے بغاوت کا اعتقاد پیدا کرتا ہے، علماء، صوفیاء اولیاء و صالحین کی تنقیص اور ان سے متنفر کرنے کی کوششوں کو، دین کی عظیم خدمت، یقین دلاتا ہے، اعمال وکردار کو برباد کرنا، اس کا شیوہ ہے، عریانیت وفحاشی میں مبتلا کر دینا، اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے، بدتہذیبی وبداخلاقی اس کے نزدیک فیشن ہے، جدت پسندی (ماڈرن ازم) کا بھوت سوار کر دینا، اس کا آلہء تباہی و بربادی ہے، بڑا ہی ظالم ہے، کھلا دشمن ہے، اس سے مقابلہ ہمارے بس کی بات نہیں، اس سے بچنے کے لئے کسی، ایسے کے دامن میں پناہ لینا پڑتی ہے، جس نے علم وعمل کے ذریعہ، ریاض ومجاہدے کے ذریعہ، احکام شرع کی مکمل پابندی کے ذریعہ، بارگاہ قدس، میں قرب خاص حاصل کر لیا ہو، مقربین میں، اس کا شمار ہونے لگا ہو، ہر قسم کے خوف وحزن سے وہ آزاد ہو چکا ہو، وہ اللہ کا ایسا محبوب بن چکا ہو، کہ اس کے، کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، قدرت الٰہی کا مظہر بن گئے ہوں، وہ ایسا مستجاب الدعوات ہو، کہ مانگنے سے پہلے، اسے ملتا ہو، نامرادوں کو، بامراد کر دیتا ہو، بھکاریوں کی جھولیاں بھر دیتا ہو، اسی کے دامن سے وابستہ ہو کر، دولت ایمان کی حفاظت ممکن ہے، ورنہ خطرہ ہی خطرہ ہے، اور بقول حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ،

مَنْ لَّا شَيْخَ لَهٗ فَشَيْخُهُ الشَّيْطَانُ

جس کا کوئی شیخ نہیں اس کا شیخ شیطان ہو جاتا ہے

دشمن، شیخ بن جائے، تو سوچ لیجئے، انجام کیا ہوگا، ساری دولت لٹ جائے گی، راکھ ہو کر اڑ جائے گی، سراب کے سوا کچھ نہ رہے گا، اور بندہ پیاسا تڑپتا رہے گا۔

ایمان، نور ہے، شمع ہے، چراغ ہے، اس کا تیل اعمال صالحہ ہیں، جتنے اعمال صالحہ زیادہ ہوتے ہیں اتنی ہی ایمان کی روشنی زیادہ ہوتی ہے، مؤمن کے چہرے پر نور ایمان ہی کا ہوتا ہے، جو نمازوں کی پابندی کرنے، سچ بولنے، رزق حلال کھانے سے ظاہر ہوتا ہے، حضور علیہ السلام کا ایک ارشاد ملاحظہ ہو، جس سے ایمان کے لئے اعمال کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عَنْ اَبِی مَالِکٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، طہارت نصف ایمان ہے، اور الحمد للہ کہنا میزان کو بھر دیتا ہے، اور سبحان اللہ والحمد للہ، آسمان کی درمیانی فضا کو بھر دیتے ہیں۔

وَالصَّلٰوۃُ نُوْرٌ وَّالصَّدَقَۃُ بُرْھَانٌ وَّالصَّبْرُ ضِیَاءٌ وَالْقُرْآنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْا فَبَآئِعٌ نَّفْسَہٗ فَمُعْتِقُھَا اَوْ مُوْبِقُھَا (مسلم شریف)

نماز نور ہے، اور صدقہ کرنا دلیل ہے، اور صبر کرنا روشنی ہے، اور قرآن تیرے لئے یا تجھ پر حجت ہے ہر شخص جو صبح کرتا ہے، وہ اپنی جان کو فروخت کر دیتا ہے، یا اس کو آزاد کرا لیتا ہے، یا ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

حدیث مبارک کے آخری حصہ پر غور فرمایئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جب صبح کو اٹھ کر، اپنے کاروبارِ معیشت میں مصروف ہوتا ہے تو گویا، وہ اپنے آپ کو فروخت کرنے کے لئے بازار میں پہنچ جاتا ہے، جہاں اس کے دو خریدار ہوتے ہیں، رحمان اور شیطان، پس اگر اس کا ہر عمل اللہ اور اس کے احکام کے مطابق ہوتا ہے، اور سارا دن، اطاعت و فرمانبرداری میں گزرتا ہے، تو وہ بڑا خوش نصیب ہے، کہ اللہ نے اسے خریدا، اور وہ جہنم کی آگ سے آزاد ہو گیا، اور اگر وہ سارا دن، فریب، مکاری، بدکاری، جھوٹ، اور ان جیسے برے اعمال میں مبتلا رہا، تو گویا اس نے اپنے آپ کو شیطان کے سپرد کر دیا، اور اس نے، اسے ہلاک کر ڈالا، کہ شیطان جس پر قبضہ کرتا ہے، اسے بری طرح تباہ و برباد کر ڈالتا ہے، ایسے شخص میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا،

ایمان، درخت کی مانند ہے، میرے آقا ﷺ کے ارشاد کے مطابق، اس کی بہتّر یا اس سے بھی زیادہ شاخیں ہیں، گویا، بڑا ہی گھنا، سایہ دار، درخت ہے، جو مصیبت زدوں کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے، بے چین مسافر اس کے سایہ میں آ کر، منزل مقصود پا لیتے ہیں، تڑپتی ہوئی انسانیت کو یہاں سکون میسر آتا ہے، دنیا کی عزت اور آخرت میں نجات، اسی سایہ میں پناہ لینے والوں کو نصیب ہوتی ہے، عروج و بلندی کی ضمانت یہیں سے ملتی ہے، اس سایہ کا مقابلہ دنیا کے درختوں کے سایہ سے نہیں کیا جاتا، یہ صرف اسی کو نظر آتا، جو اس کی پناہ میں آ کر، راحت و سکون حاصل کرتا ہے، یہ سایہ، صرف دنیاوی زندگی ہی کی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں بلکہ آخرت میں بھی جہنم کی آگ سے آزادی کی ضمانت دیتا ہے، کہ مخبر صادق ﷺ کے ارشاد کے مطابق ''مومن یقیناً جنت میں داخل ہوگا، ایمان کے اس گھنے درخت کی، بہتّر شاخیں وہ اعمال ہیں، جن کی قرآن کریم نے بار، بار، تاکید کی، اور صاحب قرآن ﷺ نے، ان کی وضاحت فرمائی، اور عملی تعلیم بھی دی، جن کا خلاصہ، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اتباع ہے، جن کے بغیر، مومن ایسا ہی، جیسے بے شاخوں کا درخت، کہ اس پر نہ پھل آتے ہیں، نہ اس کا سایہ ہوتا ہے، اس کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے، تو اس کی قدر و منزلت بھی باقی نہیں رہتی، ایمان کی ان شاخوں کا ذکر حدیث

شریف میں ہے،

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّ سَبْعُوْنَ شُعْبَةً فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ (مسلم شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، کہ حضور ﷺ نے فرمایا، ایمان کی بہتر ۷۲ شاخیں ہیں، سب سے افضل کلمہ طیبہ کا اعتقاد، اور سب سے ادنیٰ راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا، اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے

حلاوت ایمان

ایمان اپنے اندر ایک لذت رکھتا ہے، مزا رکھتا ہے، جو بہت ہی میٹھا ہے، بہت ہی خوش ذائقہ ہے، لیکن اس کا پتہ جب ہی چلتا ہے، جب مؤمن مسلم بنے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع وفرمانبردار بندہ بن کر اسلام کے جملہ احکام کی تعمیل کرے، میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں۔

عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَاقَ طَعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ رَّضِیَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا (مسلم شریف)

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس نے ایمان کا مزا چکھ لیا، جو اللہ کی، ربوبیت اور اسلام کے دین کامل ہونے، اور محمد ﷺ کی رسالت پر راضی ہو گیا۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلٰثٌ مَّنْ كُنَّ فِیْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِیْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوٰىهُمَا وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَا یُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَ مَنْ یَّكْرَهُ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْكُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا یَكْرَهُ اَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا، جس شخص میں تین باتیں ہوں، وہ ایمان کی مٹھاس پالے گا، اللہ اور اس کا رسول، اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوں، جس شخص سے محبت کرے صرف اللہ ہی کے لئے کرے، کفر سے چھٹکارا، پالینے کے بعد، دوبارہ، کفر کی طرف لوٹنا، اسے آگ میں ڈالے جانے سے زیادہ ناپسند ہو۔ (مسلم شریف)

ایمان کی حلاوت و مٹھاس کا اندازہ کرنا ہو تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیجئے، پڑھیے، کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اور دیگر کئی صحابہ نے اپنے آقاؤں اور کفار کے کیسے کیسے مظالم جھیلے لیکن ظلم وستم کی تلخی، ان کے ایمان کی شیرینی کو رتی برابر متاثر نہ کر سکی، یہ حلاوت ایمان ہی کا اثر تھا کہ ان حضرات نے اپنا وطن چھوڑا، مال و دولت لٹایا، دشمنوں کا مقابلہ کیا، اللہ کی راہ میں گردنیں کٹائیں، لیکن کبھی

خدمت دین سے نہ اکتائے، ان پر جتنے زیادہ مصائب وآلام آتے، اتنا ہی زیادہ انہیں ایمان کا مزا آتا تھا، انہیں دین کا، بڑے سے بڑا کام آسان معلوم ہوتا تھا، دشوار گزار مراحل طے کرنا ان کے لئے سہل ہو جاتا تھا، یہ حلاوت ایمان ہی کا اثر تھا، کہ یہ نفوس قدسیہ، فاقے کر کے، خون کی ندیاں بہا کر، اسلام کی حفاظت میں کامیاب ہوئے، انہی کے ایثار وقربانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اسلام کے وارث ہیں، اور انہی کے نقش قدم پر چل کر، ہم اپنی آئندہ نسل کو اسلام کا وارث بنا سکتے ہیں، حلاوت ایمان ہو، تو کامیابی وکامرانی، مؤمن کا مقدر رہے، کہ وعدہ الٰہی ہے،

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (آل عمران: ۱۳۹)

اور سستی نہ کرو، اور غمگین نہ ہو، اور تم ہی غالب رہو گے، اگر (کامل) مؤمن ہو۔

غرضیکہ، ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور زبان سے اقرار اس کی شرط ہے، کہ جس کے بغیر بظاہر کسی کے مؤمن ہونے کا حکم نہیں دیا جا سکتا، اور اعمال، ایمان کا مقتضی ہیں، ثبوت ایمان کی دلیل ہیں، کمال ایمان کا ذریعہ ہیں، اگرچہ بغیر اعمال کے ایمان قابل قبول بھی ہے، اور جہنم کے دائمی عذاب سے نجات کا ذریعہ بھی، لیکن ایمان کا اصل مفاد تو یہ ہے، کہ مؤمن جہنم کی آگ کے قریب بھی نہ پہنچے، سیدھا جنت میں داخل ہو، اور یہ بظاہر اسی وقت ممکن ہے، جب مؤمن باعمل ہو، ویسے اللہ جس پر چاہے، فضل فرما دے، کہ وہ بخشنے والا، اور بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے،

ایمان، اجمالی طور پر امور دینیہ کے یقین کا نام ہے، جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، یعنی امور دینیہ کی تفصیل اور تمام اجزاء کا جاننا ضروری نہیں اگرچہ علم دین ایمان کے نور کو بڑھاتا اور اس کے فوائد میں اضافہ کرتا ہے، نیز اس سے اطاعت و فرمانبرداری میں سہولت اور لذت پیدا ہوتی ہے، ثواب زیادہ ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا کہ "عالم کی ایک نماز، جاہل کی ستر نمازوں کے برابر ہے" تاہم حضور علیہ السلام کی لائی ہوئی تمام باتوں پر اجمالی طور پر یقین کر لینا، کفر سے نجات کے لئے کافی ہے، اور یہ مقصد، دو جملوں پر مشتمل ایک کلمہ سے حاصل ہو جاتا ہے، جسے ہم کلمہ طیبہ کہتے ہیں۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں

یہ کلمہ پڑھا اور بندے کے دل میں ایمان کی شمع روشن ہوگئی، اس کی دنیا بدل گئی، ادائیں بدل گئیں، مقصد زندگی بدل گیا، رشتے بدل گئے، دوست دشمن، اور دشمن دوست ہو گئے، پہلے وہ بتوں کے سامنے سر رگڑتا تھا، اب اس کا یہ مقدس سر، مالک حقیقی کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکے گا، پہلے وہ اپنے نفس کی خواہشات کے حصول کے لئے زندگی گزارتا تھا، اب اس کی زندگی کا مقصد، اللہ اور اس کے رسول کی رضا ہو گیا، پہلے اس کے رشتوں کی بنیاد، خون پر تھی، اب اس کی رشتہ داری کی بنیاد اسلام پر ہوگئی، پہلے اس کے تعلقات اور عداوت کا معیار، دنیاوی فوائد اور دنیاوی نقصانات، تھا، اب اس کی دوستی بھی، اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے اور دشمنی بھی، ایمان زندگی میں یک لخت ایسا انقلاب پیدا کرتا ہے، جس کا ذریعہ کوئی دوسری تحریک یا نظریہ نہیں ہو سکتا،

ایمان، درحقیقت، اللہ اور بندے کے درمیان بواسطہ رسول ایک معاہدہ ہے، کہ بندہ، رسول کے سامنے اعلان

ایمان کر کے، اپنا سب کچھ رسول کو سونپ دیتا ہے، رسول اللہ سے اس کا سودا کرتے ہیں، رسول کی سفارش پر اللہ بندے کا مال خرید لیتا ہے اور بطور قیمت جنت کا وعدہ فرماتا ہے، رسول بندے کو سودا ہو جانے اور اس کے بدلے جنت ملنے کا مژدہ سناتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں، کہ،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۳۱ (الرعد:۳۱)

بیشک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ (الروم:۶)

اللہ نے وعدہ فرمایا، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

بس معاہدہ ہو گیا اب تم اس کی پابندی کرو، اور مطمئن رہو، کہ تمہیں قیمت ضرور ادا کی جائے گی کہ وعدہ کرنے والی وہ ذات ہے، جو نہ وعدہ خلافی کرے اور نہ ہی وعدہ خلافی کو پسند کرے، اب ساری ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے، کہ سودا بگڑنے نہ پائے، بڑا ہی قابل قدر سودا ہے، ایک تو اس لئے کہ مالک خود اپنی دی ہوئی چیزوں کو اپنے فضل و کرم سے خرید رہا ہے، ورنہ وہ تو ویسے ہی قادر ہے کہ دے کر جو چاہے واپس لے لے، دوسرے اس لئے کہ ان چیزوں کی قیمت ان کی حیثیت سے بہت زیادہ دی جارہی ہے، کہ یہ چیزیں تو ایک دن فنا اور ختم ہونے والی ہیں اور جنت اور اس کی تمام نعمتیں ہمیشہ، ہمیشہ کے لئے ہیں، کتنا بڑا فضل ہے اس کا، یہ کرم ہے رسول کا، کہ انہوں نے ایسا اچھا سودا کرایا، اگر درمیان میں رسول نہ ہوتے تو بندہ ذلیل و خوار ہی ہوتا رہتا، رسول کے اس کرم کو قرآن اس طرح بیان فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۱
(التوبہ:۱۱۱)

بیشک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے، ان کی جان و مال کو ان کے لئے، جنت کے بدلے میں خرید لیا، وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، پھر قتل کرتے ہیں، اور شہید کیے جاتے ہیں، وعدہ ہے اس پر سچا، توراۃ اور انجیل اور قرآن میں، اور کون ہے، اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا، تو تم خوش ہو جاؤ، اپنی اس بیع پر، جو تم نے بیع کی ہے اس سے، اور یہی بڑی کامیابی ہے،

ایمان قبول کرنا

ایمان، قبول کرنا، کتنا آسان، دو جملے کہے اور مؤمن ہو گئے، لیکن ذمہ داری کتنی بھاری، کہ اب بندہ اللہ کا ہو گیا، اس کی ہر چیز اللہ کی ہو گئی، جسم، جان، مال، عیال سب اللہ کی امانت ہے، یہ اس کا کرم ہے کہ سودا ہو جانے کے بعد بھی، ان چیزوں کے استعمال کی اس نے، اجازت دی، ان کو استعمال کر سکتے ہو، لیکن اس کی رضا کے مطابق، امانت میں کوئی خیانت نہ ہو، آنکھ سے وہ دیکھو، کان سے وہ سنو، جس کے دیکھنے، سننے کی مالک اجازت دے، دل میں وہ رکھو، جس کے رکھنے کی مالک

اجازت دے، ہاتھوں سے وہ چھوؤ، جس کے چھونے کی مالک اجازت دے، پیروں سے اس طرف جاؤ، جہاں جانے کی مالک اجازت دے، جسم کو اسی غذا سے پالو، جس کو مالک نے تمہارے لئے حلال کیا، پورا جسم امانت ہے، خیانت نہ ہونے پائے، اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہو، اگر گردن کٹانے کا موقع آ جائے، تو زندگی سے زیادہ موت پیاری معلوم ہو، مال کے ایثار کی ضرورت پڑے، تو جس کا ہے اس کی راہ میں، بے دریغ خرچ کرو، اہل وعیال کو بھی اپنی طرح، اللہ کا مطیع بناؤ، اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے ہیں، تو تمہارے ہیں، ورنہ ان سے کوئی رشتہ اور تعلق نہیں، اگر امانت میں خیانت نہ کی تو، سودا پکا ہے، جس نے تمہارا سب کچھ خریدا ہے وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا، اور اگر امانت میں خیانت کی تو بڑا ہی برا انجام ہوگا، کہ وہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا، اور جسے وہ پسند نہ کرے، اس کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے، سودا کینسل اور ٹھکانہ جہنم کی آگ، اللہ محفوظ رکھے، آمین۔

ایمان، کے اس معاہدے کو جن خوش نصیبوں نے پورا کیا، وہ یقیناً جنتی ہیں، اسی لئے حضور علیہ السلام نے بعض صحابہ کرام کو خصوصی طور پر جنتی فرمایا، اور قرآن کریم نے تمام ہی صحابہ سے اللہ کی رضا و خوشنودی کا اعلان فرمایا، اور اللہ اور حضور علیہ السلام کے ارشاد ہی کے مطابق ہم تمام، اولیاء وصالحین کے جنتی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، اور ان جنتیوں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان سے عقیدت ومحبت رکھتے اور ان کا فیض حاصل ہونے کا، کامل یقین کرتے ہیں، ہمارے نزدیک جنتیوں سے محبت وعقیدت، ان کے دامن سے وابستگی ہی، حصول جنت، اور کمال ایمان کا ذریعہ ہے۔

ایمان، حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم ہی کے واسطہ ووسیلہ سے نصیب ہوا، کہ انہی امور پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے، جو آپ لے کر آئے، جیسا کہ ہم ایمان کی تعریف کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایمان کی دعوت دینے والے بھی آپ ہی ہیں، ایمانیات کی تعلیم دینے والے بھی آپ ہی ہیں، آپ کے ان احسانات کا مقتضی یہ ہے، کہ ایمان کی تکمیل اور اس کا کمال بھی آپ ہی کے واسطہ ووسیلہ سے نصیب ہو، لہذا، قرآن کریم نے، رسول کی اتباع و پیروی کو، اللہ سے محبت کا ثبوت، اور، رسول کی اطاعت کو، اللہ کی اطاعت قرار دیا، اور خود، رسول نے اپنی محبت کو کمال ایمان کا ذریعہ بتایا، فرمایا گیا۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُم حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں، کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کو میری ذات، اپنے والدین، اور اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ (بخاری ومسلم)

ایک روایت میں مال کا بھی ذکر ہے، منشاء ارشاد یہ ہے، کہ عبادات اور دیگر جملہ احکام اسلام کی پابندی کے باوجود، اگر مؤمن کا دل حبِّ رسول سے خالی ہو، تو وہ نہ متقی ہے نہ زاہد، کہ قرب الٰہی کے تمام مراتب کا ذریعہ صرف حضور علیہ السلام کی محبت ہے، ایسی محبت جس کا مظاہرہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کیا، کہ غزوہ بدر میں، حضرت ابوبکر صدیق اپنے بیٹے

کو، اور حضرت حذیفہ اپنے باپ کو قتل کرنے کے لئے تلوار لہراتے، آگے بڑھے، اور حضرت عمر نے اپنے ماموں کو قتل کر ڈالا، یہ آقا سے محبت ہی کا مظاہرہ تھا، کہ غلاموں نے اپنا گھر، جائداد، دھن دولت، سب کچھ چھوڑا اور ہجرت کی، جب آقا کو دولت کی ضرورت پیش آئی، تو اپنے گھروں کا ساز و سامان تک لا کر قدموں میں رکھ دیا، جب آقا نے جان کی قربانی کا حکم دیا، تو گردنیں کٹانے میں ذرا، برابر بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی، کیونکہ صحابہ کرام، حضور علیہ السلام کی محبت ہی کو اصل ایمان اور جان ایمان سمجھتے تھے۔

مغز قرآں، روح ایماں، جان دیں،
ہست حب رحمۃ للعالمیں،

یہ شرف ایمان ہی کی معرفت نصیب ہوا، کہ رب نے، بندوں کو خصوصی خطاب سے نوازا، یہ قبولیتِ ایمان کا اعلان ہے، کہ جس پر ایمان لائے اس نے تمہیں، مؤمن کہہ دیا، گویا مؤمن مان لیا، یہ مژدۂ نجات ہے، کہ مقبول ایمان، یقیناً نجات کا ذریعہ ہے، یہ دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی کی خبر ہے، کہ ایمان کامیابی و کامرانی کا ذریعہ ہے، یہ محبوب کے غلاموں سے محبت خاص کی خوشخبری ہے، کہ اس سے پہلے کسی نبی کی امت کو اس خطاب سے نہ نوازا گیا، ہم پر یہ کرم خاص صرف نبی مکرم علیہ السلام کے طفیل ہوا،

اس خصوصی خطاب سے، دو، چار مرتبہ نہیں بلکہ اٹھاسی مرتبہ نوازا گیا، اس کے اول مخاطبین حضرات صحابہ کرام ہیں کہ انہی کو نزول قرآن کا دور نصیب ہوا، قیامت تک آنے والے امتیوں کے سر پر خطاب الٰہی کا یہ تاج، ان حضرات ہی کی وساطت سے ہے، جب بھی ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے یا اس کو سنتے ہیں، تو یہ جملہ ایک عجیب سرور پیدا کرتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی پکار، رہا ہے، نہایت ہی شفقت و محبت کے ساتھ، اپنے احکام کی تعمیل کی دعوت دے رہا ہے، اپنے سایہ رحمت میں پناہ لینے کی طرف بلا رہا ہے،

واضح رہے کہ یہ خطاب مومنین کو ہے، حضور نبی کریم علیہ السلام اس میں شامل نہیں، کہ آپ تو شمع ایمان ہیں، ہر مومن نے اپنے آپ کو نور ایمان سے آپ ہی کے ذریعہ چمکایا ہے، آپ منبع ایمان ہیں، کہ ہر مؤمن کو ایمان کا فیض آپ ہی سے نصیب ہوا، آپ اصل ایمان، روح ایمان ہیں کہ آپ ہی کی خبروں پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے، علاوہ ازیں جن آیات کا اس خطاب سے آغاز ہوتا ہے، وہ دو قسم کی ہیں، یا تو ان میں، غلاموں کو آقا کا ادب و احترام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، ظاہر ہے ان میں خود آقا شامل نہیں، اور یا، شرعی احکام بیان کئے گئے اور ان کی تعمیل کا حکم دیا گیا، ان میں بھی حضور علیہ السلام شامل نہیں، کیونکہ آپ تو معلم شریعت ہیں، اور تمام، احکام کو، اللہ کے عطا کردہ خصوصی، بے حد و انتہا علم کے ذریعہ پہلے ہی جانتے ہیں، اور ان کے علم کے ساتھ ہی آپ ان پر عمل پیرا بھی تھے۔ اس کا مقصد بعثت عام لوگوں کی طرح احکام شرع کا جاننا اور ان پر عمل کرنا نہیں، بلکہ آپ تو معلم بنا کر، اور انسانیت کے لئے اسوہ، نمونہ بنا کر مبعوث فرمائے گئے، جنہوں نے آپ کی تعلیمات پر یقین کیا، انہی کو آپ اللہ کی طرف سے ''اے ایمان والو'' کہہ کر پکارتے، اور اپنے اسوہ کاملہ پر عمل کی دعوت دیتے ہیں، اور مؤمن جو کچھ کرتا ہے اس کو رسول ہی کی اتباع و پیروی جان کر کرتا ہے ہم نماز اسی لئے پڑھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام

نے پڑھی اور اس کو اللہ کی پسندیدہ عبادت بتایا، ہمارا یہی یقین دیگر عبادات اور جملہ احکام شرعیہ کے متعلق ہے، مؤمنین اولین و کاملین حضرات صحابہ کرام کے اعمال سے ہمیں اسی یقین کی تعلیم ملتی، بطور مثال حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو،

عَنْ: عَرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ وَهُوَ يَطُوْفُ بِالْبَيْتِ لِلرُّكْنِ الْاَسْوَدِ اِنَّمَا اَنْتَ حَجَرٌ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ وَلَوْ لَا اِنِّيْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَبَّلَكَ مَا قَبَّلْتُكَ ثُمَّ قَبَّلَهٗ

عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طواف کعبہ کے دوران، حجر اسود، کو چومنے سے قبل فرمایا، کہ، تو ایک پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، اور اگر میں نے حضور علیہ السلام کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے ہرگز نہ چومتا، یہ فرمانے کے بعد آپ نے حجر اسود کو چوما۔

(مؤطا امام مالک)

غرضیکہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا" "اے ایمان والو" کا خطاب عام مؤمنین کے لئے ہے، اور حضور علیہ السلام، عام جیسے نہیں، لہٰذا اس کے خطاب میں آپ، شامل نہیں، رب نے اپنے محبوب کو دوسرے پیارے خطابات سے نوازا، مثلاً "یا ایھا النبی"، "یا ایھا المزمل"، "یا ایھا المدثر"، وغیرہ۔

ایمان، سے متعلق اس ضروری تفصیل کے بعد، ان آیات پر، ہمارے مقالات ملاحظہ ہوں، جن کا آغاز، اس مسحور کن جملے سے ہوتا ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا" "اے ایمان والو"

"اے اللہ ہمارے ایمان کی حفاظت فرما، اور حضور علیہ السلام سے ہمیں صحابہ جیسی محبت نصیب فرما" آمین

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”سورۃ البقرۃ“

مقالہ نمبر	آیات نمبر
2	104 تا 105
3	153 تا 157
4	172 تا 173
5	178 تا 182
6	183 تا 188
7	208 تا 209
8	254
9	264 تا 266
10	267 تا 277
11	278 تا 281
12	282 تا 283

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۲

البقرہ: ۱۰۴ تا ۱۰۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ
مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(البقرہ، ۱۰۴۔۱۰۵)

اے ایمان والو! (رسول کو) رَاعِنَا مت کہو، اور اُنْظُرْنَا کہو، اور خوب سن لو، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے،(اے ایمان والو!) کفر کرنے والے، اہل کتاب اور مشرک نہیں چاہتے، کہ تمہارے رب کی طرف سے،تم پر کوئی بھلائی نازل کی جائے، اور، اللہ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے، اور، اللہ بڑے فضل والا ہے۔

احترام رسول

سورہ بقرہ میں، قرآن کریم کی یہ پہلی آیت ہے، جس میں اہل ایمان کو خصوصی خطاب سے نوازا گیا ہے، اور اس

کا موضوع رسول کا ادب واحترام ہے، گویا مومنین کو، ان کی اول ترین ذمہ داری یہ بتائی جارہی ہے، کہ جس رسول نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچایا، اس پر عمل کا طریقہ سکھایا، تمہارے اعمال وعبادات کی ابتداء، اس کے ادب واحترام سے ہونا چاہئے، کہ بے ادبی وگستاخی، اللہ کو نہ اپنے لئے گوارا ہے اور نہ اپنے رسول کے لئے- ایسا شخص کتنا ہی زاہد ومتقی اور عبادت گزار ہو، مردودِ بارگاہ قرار پاتا ہے- یہ قانونِ الٰہی اتنا اہم ہے، کہ دیگر قوانین سے بہت پہلے، نبی اول آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے سے بھی پہلے، ابلیس کو رجیم، قرار دیتے ہوئے، اسی کا اعلان کیا گیا تھا-

آیت مذکورہ بالا میں، دوسرے شرعی احکام سے پہلے یہ حکم دینے کی حکمت، یہی ہوسکتی ہے، کہ شریعت کی پابندی کی طرف بڑھنے سے پہلے مؤمن کو اپنے دل میں رسول کا ادب واحترام پیدا کر لینا چاہیے، کہ اس کے بغیر کوئی عمل قابلِ قبول نہیں- اور نہ ہی، اس کے بغیر رضائے الٰہی کا حصول ممکن ہے- جو ہر مؤمن کی منزل مقصود ہے، نیز یہ حکم خصوصی طور پر اہلِ ایمان کے لئے ہے، کیونکہ ایمان درحقیقت رسول کی غلامی اختیار کر لینے کا نام ہے، اور غلاموں ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ آقا کا ادب واحترام کریں- یہ حکم ایسے مرحلہ پر دیا گیا، جہاں گستاخی یا توہین کا وقوع نہیں ہوا تھا، صرف شائبہ ہوتا تھا، اس ابتدائی مرحلہ ہی میں تنبیہ کردی گئی، کہ اگر مؤمن اس سے آگے بڑھا، تب تو اس کا ایمان ہی خطرے میں، پڑ جائے گا، اس حکم کے نزول کے وقت بات صرف اتنی سی تھی، کہ صحابی کبھی کبھی، حضور علیہ السلام کے ارشادات پر پوری توجہ نہ دیتے تھے، اور پھر آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ''راعنا'' کہا کرتے تھے، کہ اے اللہ کے رسول، ہماری رعایت کیجئے، بات سمجھ میں نہیں آئی، دوبارہ ارشاد فرمایئے، بس اتنی سی بات تھی کہ حکم نازل فرمایا گیا ''راعنا'' مت کہا کرو، ''انظرنا'' کہا کرو، اور رسول کی بات غور سے سنا کرو، جب رسول بات کررہے ہوں، تو تمہاری پوری توجہ ان کی طرف ہونا چاہیے، حالانکہ ''راعنا'' اہل عرب میں کسی کی توجہ طلب کرنے کے لئے عام طور پر استعمال ہوتا تھا، اس سے کسی کی توہین یا گستاخی مقصود نہ ہوتی تھی، لیکن اللہ نے اپنے رسول کے لیے اس لفظ کے استعمال کی ممانعت فرمائی، دووجہ سے-

وجہ اول

یہ کہ ''راعنا'' سے مطلوب رعایت ہے، اور رعایت اس کی جاتی ہے، جس کا رعایت کرنے والا محتاج ہو یا، اسے، اس کی خوشنودی مطلوب ہو، جبکہ رسول کا مقام یہ نہیں، عظمت رسول کا تقاضہ یہ ہے، کہ ہر امتی اپنے آپ کو رسول کی تعلیمات کا محتاج جانے، اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہے، کیونکہ رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ رضائے رسول ہے، نیز بعثتِ رسول کا مقصد ہی یہ ہے کہ امتی رسول کو اپنا آقا، حاکم تسلیم کریں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری کریں-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (النساء:٦٤)

اور ہم نے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اللہ کے حکم سے-

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء:٨٠)

جس نے رسول کی فرمانبرداری کی، تو بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا

پس رسول سے رعایت طلب کرنا، اس کی شان کے بھی منافی ہے اور رسول کے دربار میں تمہاری حیثیت کے بھی

خلاف، لہٰذا اگر ضرورت پیش آئے تو ''اُنظرنا'' کہہ دیا کرو، کہ یا رسول اللہ، ہم پر توجہ فرمایئے، کہ ہم آپ کی توجہ کے محتاج ہیں، طلب توجہ میں، رسول کی عظمت کا اعتراف اور ان کے دربار میں اپنے عجز وانکساری کا اظہار ہے، اور اللہ یہی پسند فرماتا ہے، کہ اس کے بندے، اس کے محبوب کا، اپنے آپ کو، محتاج جانیں، اور غلامانہ انداز میں رسول سے مخاطب ہوں، لہٰذا ''انظرنا'' کہنے کا حکم دیا گیا، جس میں اظہار ادب واحترام ہے، کہ یہی تقاضائے ایمان ہے، اور یہی کمال ایمان کا ذریعہ ہے، جہاں رسول کا ادب واحترام نہیں، وہاں ایمان بھی نہیں۔

وجہ دوم

یہ کہ، عربی میں تو "راعنا" کے معنیٰ'' ہماری رعایت کیجئے'' کے ہی ہیں، لیکن عبرانی زبان میں یہ لفظ بطور گالی استعمال ہوتا ہے، جب نبی مکرم علیہ السلام، مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے، جہاں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو عبرانی بولتے تھے، اور ان میں اکثر حضور علیہ السلام اور مسلمانوں کے دشمن ہی تھے، وہ کوئی نہ کوئی موقع آپ کی توہین کرنے اور گستاخی کرنے کا تلاش کرتے رہتے تھے، پس وہ بہت خوش ہوئے، جب انہوں نے صحابہ کو ''راعنا'' کہتے سنا، وہ بھی بار بار کہتے اور اس سے، ان کا مقصد اپنی زبان کے مطابق حضور علیہ السلام کو (العیاذ باللہ) احمق و بیوقوف، کہنا ہوتا تھا، جب وہ حضور کے دربار میں آتے اسی لفظ سے آپ کو مخاطب کرتے، اور آپس میں خوب خوش ہوتے، کہ کیسا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے، پس اللہ نے، اہل ایمان کو خطاب فرماتے ہوئے حکم دیا کہ تم یہ لفظ بولنا چھوڑ دو، کہ اس میں شائبہ توہین پیدا ہو گیا ہے۔

آپ غور فرمایئے، تعظیم رسول کے باب میں، کس قدر احتیاط کی تعلیم دی جارہی ہے، اسی حکم کی تعمیل میں، تقاضہ احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، علماء کرام نے، حضور علیہ السلام کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع قرار دیا ہے، جن میں کسی بھی اعتبار سے توہین کی جھلک بھی نظر آتی ہو، یا وہ الفاظ عام طور پر، ایک دوسرے کے لئے استعمال ہوتے ہوں، مثلاً، حضور علیہ السلام کو اپنا جیسا بشر کہنا، بڑا بھائی کہنا یا لکھنا، یا ان کی کسی بھی خوبی یا عادت کو، اپنی جیسی خوبی یا عادت قرار دینا، مثلاً یہ کہنا یا لکھنا، کہ حضور علیہ السلام ہماری طرح سوتے تھے، کھاتے پیتے تھے، جن چیزوں کے ہم محتاج ہیں وہ بھی محتاج تھے، یہ اور ان جیسے الفاظ کا استعمال اگر قصداً گستاخی یا شان رسالت مآب ﷺ کو گھٹانے کی نیت سے ہو، تب تو ایسے شخص کے مرتد ہونے میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں، اور بلا قصد کوئی ایسا لفظ زبان سے نکل جائے، تو توبہ لازم ہے ورنہ خطرۂ ایمان ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے، '' جو شخص حضور علیہ السلام کے لئے ایسا لفظ استعمال کرے، جس سے آپ کی تنقیص ہوتی ہو تو اس پر حد قَذَف جاری کی جائے''۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے ساری زندگی عشق رسول کے باعث مدینہ منورہ میں گزاری، اور حال یہ تھا کہ مدینہ کی گلیوں میں چلتے تو کنارے کنارے، بڑے ہی ڈر ڈر کے چلتے، اس کی وجہ یہ بیان فرماتے کہ مجھے خوف رہتا ہے کہ کہیں میرا پیر اس مقام پر نہ پڑ جائے، جہاں میرے آقا ﷺ کا قدم مبارک رکھا گیا ہو۔ آپ چلتے چلتے مدینہ کی دیواروں کو چوما کرتے اور فرماتے اس امید پر چومتا ہوں کہ شاید، کبھی حضور علیہ السلام کا دست مبارک یہاں لگا ہو گا۔ رفع حاجت کے لئے مدینہ منورہ سے باہر کافی دور جایا کرتے تھے، اس کوشش میں کہ وہ مقام ناپاک نہ ہو جہاں نبی مکرم کا قدم مبارک رکھا گیا ہو۔ اگر آپ کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو آپ جس حال میں ہوتے، مسئلہ بیان فرمادیتے تھے۔ لیکن

جب کوئی حدیث شریف سننے آتا تو آپ بہار ادب خصوصی اہتمام فرماتے، غسل کرتے، لباس تبدیل فرماتے، خوشبو لگاتے، خصوصی مسند پر رونق افروز ہوتے، پھر حدیث شریف بیان کرتے۔

غرضیکہ، اللہ تعالیٰ نے اس آیہ مبارکہ میں اپنے نبی کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی جن میں توہین کا کوئی شائبہ تک ہو، یہ آپ کی انتہائی تعظیم کی تعلیم ہے۔قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی آپ کی تعظیم کا حکم دیا گیا، چند آیات جن میں واضح طور پر یہ عنوان بیان کیا جارہا ہے، ملاحظہ ہوں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء:٦٥)

تو (اے محبوب) آپ کے رب کی قسم وہ لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم مانیں، آپ کو، ہر اس جھگڑے میں جو ان کے درمیان پیدا ہو، پھر نہ پائیں وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی ہر اس فیصلے سے، جو آپ نے کیا، اور بخوشی دل سے مان لیں۔

ایک واقعہ

اس آیہ مبارکہ کے نزول کا جو واقعہ مفسرین کرام نے بیان فرمایا ہے، اس کو بھی پڑھتے چلئے، ایمان تازہ ہوگا اور اندازہ ہوگا کہ صحابہ کرام کس طرح، آقائے کائنات ﷺ کا احترام کرتے تھے، واقعہ یہ پیش آیا۔

کہ ایک یہودی اور منافق کے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہوگیا، یہودی حق پر تھا اور جانتا تھا کہ حق، مسلمانوں کے رسول کے سوا کوئی نہیں دِلا سکتا، لہٰذا اس نے منافق سے کہا کہ اپنے رسول کے پاس چلو، ان سے فیصلہ کرالو، منافق بھی جانتا تھا کہ وہاں تو نہ رشوت چلے گی اور نہ ہی کوئی سفارش کام آئے گی، لہٰذا اس نے چاہا کہ یہودیوں کے عالم کعب ابن اشرف سے فیصلہ کرایا جائے، لیکن یہودی اس پر راضی نہ ہوا، بالآخر دونوں، حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور آپ نے پورا واقعہ سننے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا، لیکن منافق اس پر راضی نہ ہوا، اور یہودی کو لے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، دونوں نے اپنا ماجرا سنایا، لیکن یہودی نے بتا دیا کہ حضور علیہ السلام میرے حق میں فیصلہ فرما چکے ہیں۔حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، پھر تو میرا بھی فیصلہ وہی ہے جو حضور کا ہے۔منافق کی اب بھی تسلی نہ ہوئی اور وہ یہودی کو لے کر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، دونوں نے اپنا معاملہ پیش کیا، یہاں بھی یہودی نے بتایا، کہ حضور علیہ السلام میرے حق میں فیصلہ فرما چکے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اٹھتے ہی فرمایا ٹھہرو، میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں، آپ اندر تشریف لے گئے اور اپنی تلوار لے کر باہر آئے اور منافق کی گردن اڑا دی۔فرمایا جو اللہ کے رسول کا فیصلہ تسلیم نہیں کرتا، اس کے لئے عمر کا یہی فیصلہ ہے، اس واقعہ کے بعد آیت مذکورہ نازل ہوئی۔واضح رہے واقعہ پہلے پیش آیا، بعد میں اسی کے مطابق حکم نازل ہوا، گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تعمیل نہیں، بلکہ اپنے تقاضہ ایمان کی تکمیل کی، کہ تقاضا ایمان یہی ہے کہ رسول کی تعظیم اور ان کا احترام مومن کے قلب کی گہرائیوں میں اس قدر ہو، کہ کسی بھی طرح وہ رسول کی مخالفت برداشت نہ کر سکے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿٨﴾ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ أَصِيْلًا ﴿٩﴾ (الفتح:۸_۹)

بیشک ہم نے آپ کو، مشاہدہ فرمانے والا، اور خوشخبری سنانے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا، تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور رسول کی تعظیم کرو، اور ان کی توقیر کرو، اور اللہ کی پاکی بیان کرو صبح شام۔

اس آیت میں واضح الفاظ کے ساتھ رسول کی مدد کرنے اور ان کی توقیر یعنی تعظیم واحترام کا حکم دیا جارہا ہے کہ جو رسول، مبشر، خوشخبری دینے والا، نذیر، اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہے، تم پر اس کا یہ حق ہے کہ تم اس کا ادب واحترام کرو۔ رسول کو صرف ڈاکیہ کی طرح، اللہ کا پیغام پہنچادینے والا خیال نہ کرو وہ تو اللہ کا پیغامبر اور امت کا حاکم ہے۔ پس ہر امتی پر لازم ہے کہ اپنے ہر بڑے اور بزرگ سے زیادہ اور بہت زیادہ رسول کا احترام کرے، حتیٰ کہ رسول کے لیے کوئی ایسا لفظ بھی استعمال نہ کیا جائے جس میں گستاخی یا برابری کا شائبہ تک ہو۔ رسول کو اپنا جیسا کہنا بڑی ہی گستاخی ہے کہ ہم تو گناہوں اور برائیوں کا پلندہ ہیں، غلطیوں کا پتلا ہیں، ہوائے نفس کا شکار ہیں، جہالت، نادانی اور کمزوریوں کا مجسمہ ہیں۔ رسول ان تمام عیوب سے منزہ و پاک ہے۔ اس کے منصب نبوت کا تقاضا عصمت ہے کہ اگر وہ معصوم نہ ہو تو پورا دین مشکوک ومشتبہ ہو جائے گا۔ پس معصوم ہم جیسا کس طرح ہوسکتا ہے جسے رب بلا واسطہ علم عطا فرمائے، وہ ہم جیسا کس طرح ہوسکتا ہے۔ رسول کو اپنا جیسا کہنا یا سمجھنا عقلاً حماقت اور شرعاً گستاخی ہے۔ یہی اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم ہے۔ لہٰذا اے مسلمانو تم کفار ومشرکین اور منافقین کی طرح اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے آگے بڑھنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔ نبی کے دربار میں اونچی آوازوں اور بے تکلف انداز سے، اس طرح گفتگو نہ کرنا جس طرح تم آپس میں کرتے ہو۔ نبی سے ملاقات کرنا ہو اور وہ گھر میں تشریف رکھتے ہوں، تو بلانے یا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت نہیں، صبر سے انتظار کیا کرو یہاں تک کہ وہ خود باہر تشریف لے آئیں۔ سورۃ الحجرات کی آیات ملاحظہ ہوں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَ أَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿٢﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ أَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٣﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤﴾ وَ لَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥﴾ (الحجرات،۱\-۵)

اے ایمان والو! نہ آگے بڑھو، اللہ اور اس کے رسول سے، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! نبی کی آواز پر اپنی آوازیں بلند نہ کرو، ایک دوسرے کے

ساتھ تمہارے بلند آواز سے باتیں کرنے کی طرح (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے عمل ضائع ہو جائیں اور تمہیں شعور بھی نہ ہو، بیشک جو لوگ، اللہ کے رسول کے پاس اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پرکھ لیا ہے، تقویٰ کے لیے، ان کے لیے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔ بیشک جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں اکثر ناسمجھ ہیں۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ (خود) ان کی طرف باہر تشریف لے آتے، تو ضرور ان کے لیے بہت اچھا ہوتا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔

صحابہ اور تعمیل احکام

ان آیات کے ضمن میں کئی ایمان افروز باتیں قابل بیان ہیں جو انشاء المولیٰ اگلے صفحات پر ہم پیش کریں گے۔ یہاں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان احکام ربانی کی تعمیل کا حق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کس طرح ادا کیا، جو یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے مخاطبین اولین تھے۔ نیز صحابہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمارے اسلاف نے ہمارے لیے کیا نمونہ پیش کیا، جس کو ہم اختیار کر کے اللہ کے ان ارشادات پر عمل کر سکیں کہ قیامت تک پیدا ہونے والا ہر مومن اس خطاب میں شامل ہے۔

نبی کریم علیہ السلام جب مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو آپ کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا، تو وہ خود بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے میرے دو منزلہ مکان میں، اپنے لیے نیچے کی منزل پسند فرمائی، میں اور میری اہلیہ اوپر کی منزل میں تھے۔ ہم دونوں ساری رات نہ سو سکے اور ایک کونہ میں بیٹھے رہے، اس خوف سے کہ کہیں ہمارے چلنے سے، چھت کی مٹی جھڑے اور آپ کو تکلیف پہنچے۔ صبح کو میں نے حضور علیہ السلام سے گزارش کی کہ میرے آقا، آپ اوپر قیام فرمائیں، مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ ہم اوپر ہوں، اللہ کا رسول نیچے اور اس حال میں وحی نازل ہو رہی ہو، لیکن میرے آقا ﷺ نے فرمایا۔

اَنْ اَرْفَقُ بِنَا وَبِمَنْ یَّغْشَانَا اَنْ نَّکُوْنَ فِیْ سِفْلِ الْبَیْتِ

میرے لئے، اور ملاقات کیلئے آنے والوں کے لئے یہی آسان ہے کہ ہم نیچے والے حصہ میں رہیں

پھر ایک رات ایسا ہوا کہ ہمارے پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا، پانی بہنے لگا، میں نے اور میری اہلیہ نے، پانی جذب کرنے کے لیے اس پر لحاف ڈال دیا کہ کہیں یہ پانی نیچے نہ ٹپکنے لگے، اور حضور علیہ السلام کو تکلیف پہنچے۔ ہمارے پاس ایک ہی لحاف تھا، ہم دونوں نے ساری رات اسی طرح گزاری، صبح میں نے بہت اصرار کے ساتھ حضور علیہ السلام سے گزارش کی کہ آپ اوپر تشریف فرما ہوں، ہمارے لئے قابل برداشت نہیں کہ آپ نیچے رہیں اور ہم اوپر۔ پس میرے آقا ﷺ نے کرم فرمایا اور آپ اوپر کی منزل میں قیام پذیر ہو گئے۔

یہی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ ہم حضور علیہ السلام کے لئے رات کا کھانا بھیجا کرتے تھے، جب آپ کا بچا ہوا کھانا واپس آتا تو میں اور میری اہلیہ، حضور علیہ السلام کی انگلیوں کے نشان دیکھ کر اسی جگہ سے تبرکاً

کھاتے تھے- ایک دن ہم نے کھانا بھیجا، اس میں لہسن یا پیاز تھی، جب کھانا واپس آیا تو اس میں ہم نے آپ کی انگلیوں کے نشان نہ پائے- ہم دونوں پریشان ہو گئے، کہ آج نہ جانے کیوں حضور علیہ السلام نے کھانا تناول نہ فرمایا- میں گھبرایا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ، آپ پر میرے ماں باپ قربان، آج آپ نے کھانا تناول نہ فرمایا، آپ نے فرمایا مجھے اس کھانے میں اس بُوٹی کی بو آ گئی تھی، جسے میں نہیں کھا سکتا، کیونکہ میرے پاس جبرئیل وحی لے کر آتے ہیں، لیکن تم اسے کھاؤ، تمہارے لیے جائز ہے- حضرت ابوایوب فرماتے ہیں، اس دن کے بعد سے کبھی ہم نے کھانے میں پیاز یا لہسن استعمال نہ کیا-

۶ھ، احادیث و کتب سیرت میں حدیبیہ کا واقعہ موجود ہے- اہل مکہ کی طرف سے قبیلہ قریش کا نہایت معزز، معمر سردار عروہ بن مسعود ثقفی، بحیثیت سفیر، حضور علیہ السلام سے گفتگو کرنے کے بعد جب اپنی قوم میں واپس پہنچا تو اس نے دربار نبوی ﷺ کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا، اے میری قوم، واللہ، میں نے دیکھا کہ جب محمد (ﷺ) تھوکتے ہیں، تو وہ کسی نہ کسی صحابی کی ہتھیلی پر ہوتا ہے، جسے وہ اپنے چہرے اور کھال پر مل لیتا ہے- جب وہ کسی کام کا حکم دیتے ہیں تو سب کے سب تعمیل کے لیے دوڑتے ہیں- جب وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب وضو کا دُھوَن حاصل کرنے کے لئے، ایسے جھگڑتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ابھی تلواریں چلیں گی، جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو سب اس طرح خاموش ہو کر سنتے ہیں گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، اوران کے ساتھی ان کی اتنی تعظیم کرتے ہیں کہ کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتا- اے میری قوم، باللہ، میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی جا چکا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے درباریوں کو، اپنے بادشاہ کی اتنی تعظیم کرتے نہ دیکھا، جتنی تعظیم محمد (ﷺ) کے ساتھی ان کی کرتے ہیں-

عروہ بن مسعود ۹ھ میں مشرف باسلام ہوئے، اس وقت ان کی متعدد بیویاں تھیں- حضور علیہ السلام نے فرمایا، صرف چار رکھو باقی عورتوں کو علیحدہ کر دو- آپ نے حکم کی تعمیل کی، آپ حضور علیہ السلام سے اجازت لے کر، اپنے قبیلہ بنو ثقیف میں واپس تشریف لے گئے، اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے انکار کیا، فجر کے وقت اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر، آپ نے بلند آواز سے اذان دی، ایک ثقفی نے آپ کو تیر مارا، جس سے آپ شہید ہوئے، رضی اللہ عنہ-

حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دربار نبوی میں صحابہ کرام کی جو حالت بیان کی، وہ یہ سمجھ لینے کے لیے کافی ہے کہ صحابہ کرام نے کس طرح قرآن کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے، اپنے آقا ﷺ کے ادب واحترام کا حق ادا کیا ہے، جس کی نظیر صحابہ سے پہلے یا بعد، کسی بادشاہ، لیڈر یا حاکم کے دربار میں، نہ ملی اور نہ ہی مل سکتی ہے- حق یہ ہے کہ صرف صحابہ ہی نہیں، بلکہ امت کا ہر فرد، ہر دور میں، ادب رسول کے معاملہ میں ہمیشہ اس قدر جذبانی رہا ہے کہ ناموس رسالت پر اپنی جان قربان کر دینا اس کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے- جس کا مختلف ادوار میں عملی مظاہرہ ہوتا رہا ہے- خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں، صحابہ کرام نے سب سے زیادہ قربانیاں ناموس رسالت کے تحفظ ہی میں دیں، خلافت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی ایام تھے، سیاسی اعتبار سے دارالخلافہ کمزور تھا، لیکن آپ نے اس کی پروا کیے بغیر، ناموس

رسالت کے ڈاکوؤں سے مقابلہ کا اعلان فرمایا کہ مسلمان سیاسی حالات سے کمزور نہیں ہوتا، اس وقت واقعی کمزور ہو جاتا ہے جب اس کے دل میں عظمت رسول کی کمی واقع ہو جائے۔ جھوٹے مدعیان نبوت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقابلہ اور ان کی مکمل بیخ کنی کی بنیاد یہی عقیدہ اور ایمانی جذبہ تھا، آپ کے اس اقدام نے، نہ صرف اس ناموسِ رسالت کے تحفظ کا حق ادا کیا، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امت کے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا کیا، کہ ہر دور میں اہل ایمان، سنتِ صدیق پر عمل کرتے رہے، اور کرتے رہیں گے، اور اسی لئے اسلام باقی ہے۔

تعظیماً، ہاتھ پیر چومنا، کھڑا ہونا

صحابہ کرام کے جذبہ ادب واحترام کی یہ حالت تھی کہ وہ تعظیماً، حضور علیہ السلام کے ہاتھ پیر چومتے اور آپ کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔

عَنْ زِرَاعٍ وَكَانَ فِيْ وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ قَالَ لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَّوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ رِجْلَه

حضرت زراع بن عامر رضی اللہ عنہ راوی ہیں اور وہ وفد عبدالقیس میں تھے کہ جب ہم مدینہ منورہ آئے، تو ہم سب اپنی سواریاں ایک دوسرے سے آگے دوڑانے لگے، تا کہ ہم حضور علیہ السلام کے ہاتھ اور پیر (جلد پہنچ کر) چوم لیں۔ (ابوداؤد شریف)

صحابہ کے اس عمل میں ہمارے لئے نمونہ ہے، کہ ہم بھی اپنے والدین، اساتذہ، مشائخ، علماء، صالحین اور بزرگوں کے ہاتھ پیر چوم سکتے ہیں۔ یہ صحابہ کرام کی سنت ہے، جس پر عمل باعث برکت وثواب ہے، علماء نے لکھا ہے کہ بزرگوں کے ہاتھ پیر چومنا چاہئیں، مستحب ہے، اور پیروں کو ہاتھ لگا کر اپنے ہاتھ نہ چومے جائیں، بلکہ بزرگوں کے قدموں پر اپنا منہ رکھ کر چومنا چاہیئے، ایک اور حدیث ملاحظہ ہو جس سے حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضور علیہ السلام کے لئے ادباً، تعظیماً، کھڑا ہونا اور آپ کے ہاتھ چومنا ثابت ہوتا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَاَيْتُ اَحَدًا كَانَ اَشْبَهَ سَمْتًا وَّ هَدْيًا وَّ دَلًّا وَّ فِيْ رِوَايَةٍ حَدِيْثًا وَّ كَلَامًا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فَاطِمَةَ كَانَتْ اِذَا دَخَلَتْ عَلَيْهِ قَامَ اِلَيْهَا فَاَخَذَ بِيَدِهَا فَقَبَّلَهَا وَ اَجْلَسَهَا فِيْ مَجْلِسِهٖ وَكَانَ اِذَا دَخَلَ عَلَيْهَا قَامَتْ اِلَيْهِ فَاَخَذَتْ بِيَدِهٖ فَقَبَّلَتْهُ وَ اَجْلَسَتْهُ فِيْ مَجْلِسِهَا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عادت، اور صورت میں، ایک اور روایت میں ہے، بولنے اور گفتگو کرنے میں، حضور علیہ السلام کے ساتھ مشابہت رکھنے والا فاطمہ سے زیادہ کسی کو نہ دیکھا، جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتیں، تو آپ ان کے لئے کھڑے ہو جاتے، ان کا ہاتھ پکڑتے، اسے بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے تھے، اور جب حضور علیہ السلام، حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے جاتے، تو وہ کھڑی ہو جاتیں اور آپ کا ہاتھ پکڑتیں اور چومتی تھیں، اور اپنی جگہ

بٹھاتی تھیں۔ (ابوداؤد شریف)

گویا سرکار ﷺ بحیثیت باپ، بیٹی سے محبت وشفقت کا مظاہرہ فرمایا کرتے تھے، اور بیٹی بحیثیت امتیہ اپنے آقا ﷺ کے ادب واحترام کا حق ادا کرتی تھیں، کہ یقیناً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک حضور علیہ السلام کا باپ ہونا، اتنا بڑا اعزاز نہ تھا، جتنا آپ کا نبی اور رسول ہونا، پس آپ کا احترام بحیثیت نبی ورسول تھا۔ دیگر صحابہ کرام کا بھی حضور علیہ السلام کے لیے تعظیماً کھڑا ہونا، احادیث میں مذکور ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَجْلِسُ مَعَنَا فِی الْمَسْجِدِ یُحَدِّثُنَا فَاِذَا قَامَ قُمْنَا قِیَامًا حَتّٰی نَرٰہُ قَدْ دَخَلَ بَعْضَ بُیُوْتِ اَزْوَاجِہٖ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں، کہ نبی کریم علیہ السلام مسجد میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر گفتگو فرمایا کرتے تھے، پس جب آپ کھڑے ہوتے تو ہم بھی کھڑے ہوجاتے تھے، اور آپ کو دیکھتے رہتے تھے، یہاں تک کہ آپ ازواج مطہرات میں سے کسی کے گھر میں داخل ہوجاتے تھے۔ (مشکوۃ شریف)

حضور علیہ السلام کا ادب

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مجھ سے نبی کریم علیہ السلام کی شکل وصورت کے متعلق پوچھے تو میں کچھ نہیں بتا سکوں گا، کیونکہ میں آپ کے سامنے اپنی آنکھیں اوپر نہیں اٹھایا تا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ہمارے درمیان تشریف فرما ہوتے تھے لیکن ہم میں سے کسی کی جرأت نہ تھی کہ آپ کے چہرہ مبارک کو نظر بھر کر دیکھ سکے، سوائے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے، کہ یہ دونوں آپ کی طرف دیکھتے اور تبسم فرماتے تھے اور حضور علیہ السلام ان دونوں کو ملاحظہ فرماتے اور متبسم ہوتے تھے۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ ہے کہ معاہدہ حدیبیہ کے بعد جب ابوسفیان مدینہ منورہ آیا، تو سیدھا اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس پہنچا، بیٹی نے باپ کو برسوں کے بعد دیکھا تھا، کیونکہ وہ ہجرت مدینہ سے پہلے ہی اپنے شوہر کے ہمراہ مکہ سے حبشہ ہجرت کر گئی تھیں۔ حبشہ میں ان کا شوہر عبداللہ بن جحش مرتد ہو کر مر گیا، تو حضور علیہ السلام نے عمرو بن امیہ کے ذریعہ شاہ حبش نجاشی کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ ام حبیبہ کو آپ سے نکاح کا پیغام دے، نجاشی نے یہ خدمت انجام دی اور ام حبیبہ کا نکاح اسی کے دربار میں ہوا۔ چار ہزار درہم بطور مہر بھی نجاشی ہی نے ام حبیبہ کو ادا کیے۔ پھر آپ مدینہ تشریف لائیں، غرضیکہ باپ بیٹی کی ملاقات ایک عرصہ بعد ہوئی تھی لیکن ام حبیبہ کو احترام رسول کا اس قدر خیال تھا کہ جب ابوسفیان حضور علیہ السلام کے بستر پر بیٹھنے لگا، تو آپ نے فرمایا، اس پر سے اٹھ جاؤ کہ یہ بستر نبوت ہے۔ تم مشرک ہو، نجس ہو، اس پر بیٹھنے کے لائق نہیں۔ ابوسفیان کو بیٹی کا یہ رویہ اس قدر ناگوار گزرا کہ فوراً گھر سے نکل گیا لیکن آپ نے پرواہ نہ کی اور رسول ﷺ کے احترام میں فرق نہ آنے دیا۔

غرضیکہ، اللہ رب العزۃ نے اپنے محبوب علیہ السلام کی شان میں ایک لفظ "راعنا" استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی، جو عام لفظ تھا، مشکوک تھا، اس میں التباس تھا، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس ممانعت سے آپ کے ادب و

احترام کے پورے عنوان کو سمجھ لیا اور اس پر عمل کو انتہا کی ایسی حد تک پہنچایا کہ اس سے زیادہ کسی انسان کے لیے کسی انسان کی تعظیم کرنا ممکن ہی نہیں۔ حتیٰ کہ، دوست نے کبھی آپ کو، یار، کہہ کر نہ، پکارا، بیوی نے کبھی شوہر نہ کہا، بیٹی نے کبھی باپ کہہ کر نہ بلایا، چچا نے، بیٹا یا بھتیجا نہ کہا، سسر نے داماد نہ کہا، بڑوں نے نام سے نہ بلایا۔ سب نے یا رسول اللہ، یا نبی اللہ کہا، وہی کہا جو رب نے کہنا سکھایا، ایسا لفظ کبھی استعمال نہ کیا جو عام طور پر آپس میں ایک دوسرے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جب آپ نے کسی سے سوال کیا کہ کیا تم یہ جانتے ہو، تو جانتے ہوئے بھی یہی جواب دیا'' اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں'' جب کسی سے پوچھا، میں بڑا ہوں یا تم، تو یوں نہ کہا کہ میں بڑا ہوں، بلکہ یوں کہا،'' یا رسول اللہ بڑے آپ ہی ہیں، عمر میری زیادہ ہے۔ صرف احترام ہی نہ کیا بلکہ احترام میں بھی نہایت احتیاط سے کام لیا کہ خوف رہتا تھا، سرکار کی شان میں گستاخی نہ ہو جائے، گستاخی ہوئی، صرف اعمال ہی برباد نہ ہوں گے، ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

دیدہ دلیری

نہ جانے کس قدر دیدہ دلیر ہیں، وہ جو آقا ﷺ کی شان میں گستاخانہ لفظ بولتے ہیں، لکھتے ہیں۔ مثلاً وہ ہماری طرح بشر تھے، وہ ہماری ہی طرح عاجز و لاچار تھے، انہیں دیوار کے پیچھے تک کا علم نہ تھا، ان کی حیثیت ایک ڈاکیہ جیسی تھی (العیاذ باللہ) ہماری عادت نہیں کہ ہم کسی فرقہ کا ذکر کریں یا اس کے عقائد بیان کرنے میں اپنا وقت ضائع کریں، صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امت میں فقہی اعتبار سے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی چار مکتب ہیں۔ کوئی ایسی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی کہ ان مکاتب فکر کے علماء نے ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانا تو درکنار، کبھی کسی کو ضال و گمراہ یا بُرا ہی کہا ہو، یا اس فقہی تقسیم کی وجہ سے امت میں کسی قسم کا انتشار ہوا ہے۔ اس کے برعکس سب ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ بطور مثال حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب بغداد میں قیام پذیر تھے تو آپ فرماتے ہیں۔

> میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تبرک حاصل کرتا ہوں اور جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو میں دو رکعت نفل پڑھ کر ان کی قبر پر حاضر ہوتا ہوں، اور ان کے وسیلے سے اللہ سے دعا کرتا ہوں تو میری ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ (خیرات الحسان)

نیز علماء نے لکھا ہے کہ امام شافعی جب امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی مسجد میں نماز حنفی طریقے پر ادا کی، نہ رفع یدین کیا اور نہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھی۔ جب آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا، مجھے شرم آتی ہے کہ میں صاحب مزار کی مخالفت کروں۔

فقہی اختلاف شرعی احکام کے طریقہ تعمیل میں ہے، عقائد میں نہیں۔ مثلاً نماز میں رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، آمین آواز سے کہنا یا آہستہ کہنا، تراویح بیس، بارہ یا آٹھ پڑھنا، اسی طرح زکوٰۃ، حج کے بعض مسائل میں اختلاف، حدود و تعزیرات میں اختلاف، یہ اختلاف کبھی بھی امت میں انتشار و مخاصمت کا باعث نہ ہوا۔ اس میں نہ کفر و شرک کی دفعہ عائد ہوتی ہے اور نہ گمراہی و ضلالت کا فتویٰ لگایا جا سکتا ہے۔ ہاں اس قسم کا اختلاف گستاخی سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم کے کسی بھی حکم کا منکر، یقیناً کافر کہلائے گا، کہ مالک حقیقی کے احکام کا انکار بھی گستاخی ہے اور اللہ و رسول کا گستاخ بلاشبہ کافر ہے۔ پس ایک شخص

چاہے بظاہر کتنا ہی متقی و پرہیز گار ہو اور وہ تمام احکام قرآن وحدیث پر ایمان رکھتا ہو۔ بس صرف مثلاً، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا انکار کرتا ہے تو بتایئے آپ اسے کیا کہیں گے۔ اگر آپ تھوڑا بھی دین کا علم رکھتے ہیں تو فوراً آپ کا جواب یہی ہوگا کہ یہ شخص کافر ہے، مرتد ہے اور اگر وہ اسلامی حکومت کا باشندہ ہے تو اس پر ارتداد کی فرد جرم عائد ہوگی اور اسے اصول شریعت کے مطابق قتل کر دیا جائے گا۔ یہی حال نماز کے منکر، زکوٰۃ کے منکر، زنا، شراب، سود وغیرہ کو حلال و جائز جاننے والے کا ہے۔

غرضیکہ فقہی مکاتب فکر کا اختلاف امت کے لئے کبھی مضر نہ ہوا، نہ ہوسکتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اسی اختلاف کے متعلق فرمایا کہ ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے'' ہاں امت انتشار وافتراق، فرقہ بندی اور گروہ بندی میں اس وقت سے مبتلا ہوئی، جب سے گستاخی کا دروازہ کھلا، جس کے ذمہ دار وہ جاہل یا ضمیر و دین فروش لوگ ہیں جنہوں نے جبہ و دستار پہن کر امت کو دھوکہ دیا اور منبر رسول پر قابض ہو کر رسول ہی کی شان میں گستاخیاں شروع کر دیں۔ ان کے زبان و قلم بے عیب نبی پر عیوب و نقائص کے داغ لگانے میں مصروف ہو گئے۔ کسی نے میرے آقا ﷺ کی ختم نبوت پر ڈاکہ ڈالا تو کسی نے ان سے استمداد کرنے کو شرک قرار دیا، کوئی ان کے علم غیر متناہی کو محدود و ناقص ثابت کرنے کے درپے ہوا، کسی نے آپ کی تعریف و توصیف کے لئے منعقد کی جانے والی محافل میلاد کو بدعت ٹھہرایا، کسی کا سارا زور بیان و قلم (العیاذ باللہ) ان کو مردہ ثابت کرنے پر صرف ہوا، کسی نے ان کی شفاعت حقہ کا انکار کیا، کوئی احادیث کو مشکوک اور نا قابل عمل ثابت کرنے کے مشن پر لگا، حتیٰ کہ امت مسلمہ کو مشرک و بدعتی کہنا ایک عام بات ہوگئی جس نے یارسول اللہ کہہ دیا، وہ مشرک، جس نے روضہ مبارک یا کسی ولی وصالح کے مزار پر حاضر ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھالیے وہ مشرک، جس نے کسی ولی کے ایصال ثواب کے لئے جانور ذبح کیا، وہ مشرک، جس نے کسی کے قدموں کو چوما، وہ مشرک، جس نے کسی قبر کو بوسہ دیا وہ مشرک، جس نے محفل میلاد کی وہ بدعتی، جس نے صلوٰۃ وسلام پڑھا، وہ بدعتی، جس نے اپنے مُردوں کے ایصال ثواب کے لیے سویم، چہلم وغیرہ کیا وہ بدعتی، جس نے اذان کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے وہ بدعتی، جس نے محبت بھرے، پُر تعظیم الفاظ والا درود شریف مثلاً درود تاج وغیرہ کا ورد کیا وہ بدعتی، یقین جانئے شرک و بدعت کی اس مشین سے جاری ہونے والے ان فتووں کا اعتبار کیا جائے تو نہ کوئی مسلمان رہے اور نہ ہی اسلام۔

حادثہ یہ نہیں کہ ایسے سر پھرے پیدا ہوئے کہ مفید پودوں کے ساتھ زہریلے پودے، مفید جانوروں کے ساتھ زہریلے کیڑے پیدا کرنا، ستورِ قدرت ہے۔ حادثہ یہ ہے کہ جب گستاخان رسول کے زہر سے امت کو بچانے اور ان کی شر انگیزی سے باخبر کرنے کے لئے علماء ربانی سامنے آئے اور قرآن وحدیث سے انہوں نے ایسے لوگوں کو گمراہ یا مرتد ثابت کیا تو انہی پر فرقہ پرستی، فتنہ پردازی کا الزام لگایا جانے لگا۔ یعنی چراغ بجھانے کی کوشش کرنے والوں کو تحفظ دیا گیا اور تاریکی سے بچانے کے لئے چراغ کی حفاظت کرنے والوں کو مجرم قرار دیا گیا، کیسا عجب انصاف ہے۔ یقیناً ایسا ہی انصاف ہونا تھا کیونکہ منصف وہ بن بیٹھے جو خود دین کے علم میں زیرو ہیں۔ کسی یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ ہو کر، اپنے آپ کو اہل علم میں شمار کرنے لگے، یا دولت کے نشہ میں مست ہو کر خود فہمی کا شکار ہوئے۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی مریض کا غلط آپریشن کر دینے

ڈاکٹر سے، دوسرا ڈاکٹر مریض کی ہمدردی میں لڑ رہا ہے لیکن کیا کہیں گے، آپ ایسے رشتہ داروں کو جو ہمدردی کرنے والے ڈاکٹر کی حمایت کی بجائے، غلط آپریشن کرنے والے ڈاکٹر کا ساتھ دے رہے ہوں- یا تو جاہل کہیں گے یا اپنے عزیز مریض کا دشمن- یہی حال ان لوگوں کا ہے جو علماء حق کی حمایت کرنے اور ان کی بات پر یقین کرنے کی بجائے، گستاخان اسلام و رسول کی حمایت کرتے ہیں، یا تو جاہل ہیں یا وہ بھی اسلام اور رسول کے دشمن ہیں- ایسے لوگ عام طور پر اس غلط فہمی میں خود بھی مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کو کافر نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ پس خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ کہنا کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے، بڑی جہالت اور بڑا ہی غلط تصور ہے-

ذاتی طور پر، ہمارے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، جس سے آپ اس احمقانہ تصور کا اندازہ کر سکتے ہیں- ایک صاحب کی بیٹی کی شادی میں ہم مدعو تھے- یہ عزت افزائی بھی حاصل تھی کہ نکاح پڑھانے کی ذمہ داری بھی ہمیں سونپی گئی- شادی ایک بڑے ہوٹل میں تھی، ہم وقت پر پہنچ گئے- ابھی بارات کا انتظار ہو رہا تھا- ہمارے قریب ایک صاحب بیٹھے تھے جو ہمارے شناسا نکلے اور خیر خواہ بھی ثابت ہوئے- اللہ انہیں جزا دے، جو ہوا انہی کی وجہ سے ہوا- انہوں نے دوران گفتگو ہم سے پوچھا، کیا نکاح آپ پڑھائیں گے؟ ہم نے فخریہ انداز میں جواب دیا'' جی میرے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ یہ کام کرے، بولے لیکن آپ کو چکّر معلوم ہے- اب ہمارا ماتھا ٹھنکا اور ہم نے پریشان ہو کر پوچھا، بھائی بتایئے کیا چکّر ہے- وہ بولے، لڑکا اور اس کا سارا خاندان مرزائی ہے، صاحبزادی نے پسند کیا ہے۔ دونوں خاندان دولت مند ہیں- انہیں عقیدے وغیرہ کا کوئی پتہ نہیں- اب تو ہمیں پسینہ آ گیا- ہم نے کہا لیکن یہ معاملہ تو اسلام اور کفر کا ہے، عقیدے کا نہیں- چند منٹ غور کیا، کیا کرنا چاہیے- پھر انہی صاحب سے گزارش کی کہ ذرا آپ لڑکی کے باپ کو ہمارے پاس بلا لایئے۔ وہ بیچارے گئے اور بلا لائے- صاحب بہادر منہ میں پائپ دبائے ہوئے ہی، گویا ہوئے، فرمایئے، مولوی صاحب، کیا بات ہے- میں نے کہا جناب، سنا ہے دولہا مرزائی ہے، بولے ہاں وہ لوگ اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں- ہمیں اس سے کیا لینا- لڑکا اچھا ہے، بہت بڑی بزنس ہے، خاندان بھی ہماری ٹکر کا ہے- اس انداز گفتگو نے ہمیں بڑا ہی پریشان کر ڈالا- پھر بھی ہم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے کہا، جناب یہ سوچیے کہ آپ مسلمان ہیں- لڑکا اور اس کا خاندان کافر ہے- مرزائی تو کافر و مرتد ہوتے ہیں- اتنا کہنا غضب ہو گیا- صاحب بھنا کر بولے، مولانا یہ سب باتیں چھوڑیے، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ بھی ہماری طرح کلمہ پڑھتے ہیں اور کلمہ پڑھنے والا مسلمان ہوتا، آپ لوگ نہ جانے کیوں جس کو چاہتے کافر کہہ دیتے ہیں- ہم اونچی سوسائٹی کے لوگ مولویوں کے اس چکّر میں نہیں پڑتے- جب معاملہ اتنا دور پہنچ گیا تو مجھے کہنا پڑا- بھائی، میں بھی آپ کے چکّر میں نہیں پڑ سکتا- یہ کہہ کر میں چل دیا- پیچھے سے سنئے، سنئے کی آواز آتی رہی- اللہ خوش رکھے ان صاحب کو، وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لئے، اپنی گاڑی میں انہوں نے ہمیں گھر پہنچایا اور سارے راستہ ہماری تعریف کر کے ہمارا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے- اسی دن سے ہم نے اپنا اصول بنا لیا ہے کہ نکاح پڑھانے کی دعوت قبول کرنے سے پہلے ہی ہم طرفین کے متعلق تحقیق کر لیتے ہیں، بحمد اللہ، اس کے بعد سے اب تک ہمیں کوئی ایسا احمق نہیں ملا-

بہر حال یہ تصور بڑا ہی غلط ہے کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے- اگر ایسا ہوتا تو حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک کے سارے

منافق مسلمان کہلانے کا حق رکھتے، کہ وہ بھی تو کلمہ پڑھتے تھے، قرآن کریم سے ان کا کلمہ پڑھنا ثابت ہے۔ فرمایا گیا،

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ

جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں، تو کہتے ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک، ضرور آپ اللہ کے رسول ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا، منافق کتنے زبردست کلمہ گو تھے۔ پھر کیا ان کے کلمہ پڑھنے اور گواہی دینے کو تسلیم کیا گیا۔ تو یہ جاننے کے لیے، اس کے بعد کی آیات پر غور فرمایئے، ارشاد ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾

اور اللہ جانتا ہے یقیناً ضرور، آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بیشک منافق ضرور جھوٹے ہیں۔

رسول کی رسالت میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر کلمہ پڑھنے والے کو مسلمان اپنا سمجھ بیٹھیں۔ کیونکہ کچھ لوگ کلمہ کو صرف ڈھال بناتے ہیں اور اس کی آڑ میں وہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرتے اور ان میں انتشار و افتراق کے بیج بوتے ہیں۔ جیسا کہ منافقین کا حال تھا۔

اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾

(المنافقون، ۱-۲)

کہ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے، پھر انہوں نے (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا بے شک وہ بہت ہی برے کام کر رہے ہیں۔

ان کلمہ پڑھنے والوں کا انجام ملاحظہ کر لیجئے، ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ (النساء: ۱۴۵)

بیشک، منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور تو ان کے لئے کوئی مددگار ہرگز نہ پائے گا۔

منافقین کا ٹھکانہ جہنم کا سب سے نچلا درجہ ہوگا۔ جہاں کا عذاب کفار و مشرکین پر ہونے والے عذاب سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ اور جب انہیں جہنم میں بھیجا جا رہا ہوگا تو کوئی اللہ کا مقرب و محبوب بندہ یہ کہتے ہوئے ان کی مدد نہ کرے گا، کہ اے اللہ یہ بھی کلمہ پڑھتے تھے، لہٰذا ان پر بھی تو اپنا فضل و کرم فرما اور انہیں بھی نجات عطا فرما دے۔ پس اللہ نے ان لوگوں کے کلمہ پڑھنے کو مسترد فرما دیا، جو کلمہ پڑھنے کے ساتھ رسول کی لائی ہوئی ہر بات پر یقین نہ رکھتے ہوں اور رسول کے ادب و احترام کے پابند نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کو منافق کہیے، کافر، مشرک یا مرتد کہیے، بلاشبہ یہ سب جہنمی ہیں۔

اب ہم کسی کو منافق تو نہیں کہہ سکتے، کیونکہ نفاق کا تعلق قلب سے ہے جس کا حال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہاں اب کفار بھی موجود ہیں، مشرک بھی اور مرتد بھی اور مرتدین ہی کا گروہ سب سے زیادہ خطرناک گروہ ہے۔ جن سے مسلمانوں کے ایمان کو خطرہ رہتا ہے کہ یہ لوگ کلمہ پڑھتے ہیں، ان کی رشتہ داری اہل ایمان سے ہوتی ہے۔ پس

مسلمانوں کے لئے ان سے بچنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ کسی کا بیٹا مرتد ہو گیا تو ماں باپ کے لیے اس سے قطع تعلق کر لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کسی کا شوہر مرتد ہو گیا تو بیوی اسے خارج اسلام ماننے اور اس سے علیحدگی اختیار کرنے پر بمشکل ہی آمادہ ہوتی ہے اور سب سے بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ لوگ ہر کلمہ گو کو مسلمان تصور کرتے ہیں، لیکن اہلِ ایمان کے لیے یہ بڑی آزمائش ہے کہ اگر انہوں نے خونی رشتوں پر اسلام کے قائم کردہ رشتوں کو ترجیح دی اور اسی کو مسلمان جانا، جس کے اسلام کو اللہ اور اس کا رسول قبول کرتے ہیں، تو وہ اس آزمائش میں کامیاب رہے۔ اور اگر، جو لوگ قرآن وحدیث کے مطابق دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکے، ان سے رشتے قائم رکھے اور ان کے کفر میں شک کیا تو اللہ محفوظ رکھے، ایسا شخص آزمائش میں ناکام رہا۔ اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ کتب فقہ میں یہ اصولِ شریعت موجود ہے۔ **مَنْ شَكَّ فِيْ كُفْرِهٖ اَوْ عَذَابِهٖ فَقَدْ كَفَر** جس نے کسی کافر کے کفر یا مستحق عذاب ہونے میں شک کیا، تو اس نے بھی کفر کیا۔

شریعتِ مطہرہ نے ارتداد کی سزا قتل مقرر کی اور مرتد کو واجب القتل قرار دیا۔ جس کی حکمت یہی ہے کہ سانپ کو آبادی اور گھروں میں پہنچنے سے پہلے ہی کچل دیا جائے، تاکہ اس کا زہر لوگوں کی موت کا سبب نہ بن سکے۔ ارتداد ایمان کے لئے مہلک ترین زہر ہے، لہٰذا مرتد کو قتل کر دیا جائے تاکہ اس کے مہلک زہر سے اہل ایمان محفوظ رہ سکیں۔ اسی لئے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کو قتل کرایا۔ مسیلمہ کذاب اور اس کے گروہ کو قتل کرایا کہ یہ سب ارتداد کے سانپ تھے، مرتدین تھے۔ ہماری بد نصیبی یہ ہے کہ اس دور میں کوئی اسلامی حکومت نہیں۔ لہٰذا جو، جو چاہتا ہے بکتا ہے اور اپنا گروہ بنالیتا ہے۔ اس کا زہر، نہ جانے کس کس کو ڈس سکتا ہے۔ کوئی اس کا علاج تک کرنے والا نہیں۔ جب علماءِ حق اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہیں اور ان زہریلے سانپوں سے امت کو باخبر کرتے ہیں تو ان پر طرح طرح سے الزام تراشے جاتے ہیں۔ رجعت پسند، قدامت زدہ اور فرقہ پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ کم ہی خوش نصیب ہیں جو اپنے آپ کو اس زہر کی ہلاکت سے محفوظ رکھ پاتے ہیں، جبکہ اللہ اپنے بندوں کو اسی زہر سے بچانے کے لیے حکم دیتا ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝
(ھود:۱۱۳)

اور ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو جنہوں نے ظلم کیا، ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ پہنچے گی، اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا، پھر تمہاری کچھ مدد نہ کی جائے گی۔

یہ ظلم کرنے والے وہ نہیں جو کسی کو مارتے پیٹتے ہیں بلکہ یہ وہی زہریلے سانپ ہیں جو مرتد ہو کر خود تو جہنمی ہو گئے، اب دوسروں کو اس عذاب الٰہی میں مبتلا کرنے کی تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔ اللہ ان سے دور رہنے، قطع تعلق کر لینے کا حکم دیتا ہے تاکہ اہل ایمان جہنم کی آگ سے محفوظ رہیں۔ کیونکہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی بیماری اتنی تیزی سے نہیں لگتی جتنی تیزی سے بدعقیدگی کا مرض لگتا ہے، کہ بدعقیدہ لوگ زہر کو اس قدر میٹھا کر کے پلاتے ہیں کہ اس کی تلخی دب جاتی ہے اور پینے والا بڑے مزے لے کر اس کو پیتا رہتا ہے۔ پس ایسے لوگوں سے دور رہنے ہی میں عافیت ہے، خاص طور پر ایسے لوگوں کو تو بدعقیدہ لوگوں سے بہت بچنا اور دور رہنا چاہیے جو خود دینی معلومات سے پوری طرح واقف نہ ہوں۔ ایسے سادہ لوح لوگ

بہت جلدی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اسی لیے میرے آقا ﷺ تاکید فرماتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس ارشاد کے راوی ہیں۔

فَاِیَّاکُمْ وَ اِیَّاھُمْ لَا یُضِلُّوْنَکُمْ وَلَا یُفْتِنُوْنَکُمْ

بدعقیدہ لوگ نہ تم سے ملیں، نہ تم ان سے ملو، کہیں وہ تمہیں اپنی گمراہی میں مبتلا نہ کردیں۔

اتحادِ ملت

اتحادِ ملت، ایک بہت ہی پرکشش لفظ ہے۔ جس کے معنی ''تمام مسلمانوں کا ایک ہوجانا'' کئے جاتے ہیں۔ اور مسلمان ہر کلمہ گو کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مفہوم یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے سے یا طریقہ عبادات وغیرہ میں کسی ایک امام کے طریقے کی پابندی عائد کرنے سے امت میں اختلاف و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں مولویوں کی پھیلائی ہوئی، ان کو چھوڑیئے، سب کلمہ پڑھنے والے مسلمان ہیں، لہٰذا سب کو متحد و متفق ہونا چاہیے۔ اس معنی و مفہوم میں اتحادِ ملت کے علمبردار آپ کو دو قسم کے لوگ نظر آئیں گے، یا تو سیاسی لیڈر جو حصول اقتدار کے لئے یہ نعرہ لگاتے ہیں، جبکہ وہ خود اقتدار کی جنگ میں قوم کو جھونکتے ہیں اور سیاست کے میدان میں نہ جانے کتنے غریبوں کا خون بہانے کے مجرم ہوتے ہیں۔ انہیں قوم کا وہ انتشار و افتراق نظر نہیں آتا جو یہ خود پھیلاتے ہیں۔ آج تمام مسلم ممالک پر نظر ڈالیے، آپ کو مذہبی فرقے لڑتے ہوئے کہیں نظر نہ آئیں گے، سیاسی پارٹیاں ہی ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہی ہیں۔ ایک پارٹی اقتدار حاصل کر کے اپنے خلاف آواز اٹھانے والی پارٹی سے متعلق افراد کا قتلِ عام کرتی ہے۔ کوئی ان ظالموں کو قوم کا قاتل کہنے والا نہیں، کوئی ان کی زبان پکڑنے والا نہیں، کہ تم مذہبی فرقوں کے متحد ہونے کی ضرورت پر تو زور دیتے ہو، لیکن سیاست کے نام پر قوم کا خون بہاتے ہو، اور یا اس اتحادِ ملت کی باتیں ایسے لوگ کرتے ہیں جو دین سے بے بہرہ ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی انہیں نہ نماز کی پروا، نہ روزے کا خیال، نہ شریعت کے دیگر احکام کی پابندی کا احساس، بس انہوں نے صرف اتحاد کا نعرہ لگانا ہی مذہب کی بڑی خدمت سمجھ لیا ہے۔ لیجئے، حضور علیہ السلام کے ان ارشادات پر پہلے غور کیجئے، پھر ہم بتاتے ہیں اتحادِ ملت کیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ صَمَّاءُ بُکْمَاءُ عَمْیَاءُ مَنْ اَشْرَفَ لَھَا اِسْتَشْرَفَتْ لَہٗ وَ اِشْرَافُ اللِّسَانِ فِیْھَا کَوَقْعِ السَّیْفِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، عنقریب بہرے، گونگے اور اندھے فتنے ہوں گے جو ان کی طرف جھانکے گا، وہ اسے کھینچ لیں گے، اور ان میں زبان کھولنا، تلوار چلانے کی طرح ہوگا۔ (ابوداؤد)

یعنی امت میں فرقے پیدا ہوں گے اور ان سے تعلق رکھنے والے، حق سننے، بولنے اور دیکھنے سے بہرے، گونگے اور اندھے ہوں گے۔ گویا ان کا حال کفار و منافقین جیسا ہوگا، جن کے لئے فرمایا گیا:

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (البقرہ:۱۸)

بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، پس وہ (ہدایت کی طرف) نہیں لوٹیں گے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۷۱)

اور مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا، اس کی سی ہے، جو پکارے ایسے کو جو چیخ پکار کے سوا، کچھ نہ سنے- بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، تو وہ نہیں سمجھتے۔

آپ انہیں اتحاد ملت کے نام پر کتنا ہی سمجھانے کی کوشش کیجئے، ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی- نیز ان کا زہر اتنا مہلک ہے کہ اگر کوئی ان کے قریب بھی جائے تو اس کو بھی یہ اپنی طرح ہلاک و برباد کر دیتے ہیں- اور اگر ان کو راہِ ہدایت اختیار کرنے کی تبلیغ کی جائے تو یہ حق سن کر ایسے بھڑ پڑتے ہیں جیسے کسی نے ان میں تلوار چلادی، میرے آقا ﷺ نے یہ بھی بتادیا کہ یہ فتنے اور گروہ کتنے ہوں گے-

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنَ عَمْرُ وَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّصْنَعُ ذَالِكَ وَ اِنَّ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَ سَبْعِيْنَ مِلَّةً وَ تَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلٰثٍ وَّ سَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِيْ۔ (ترمذی شریف)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، میری امت بعینہ ان تمام برائیوں میں مبتلا ہوگی جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں سے بدکاری کا مرتکب ہوا تھا، تو میری امت میں بھی ایسا ہوگا، بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری امت تہتر ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، سوائے ایک فرقے کے سب دوزخ میں جائیں گے، صحابہ نے عرض کیا وہ کون لوگ ہوں گے، آپ نے فرمایا جو لوگ میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلیں گے۔

اور اللہ محفوظ رکھے، یہ فتنے اتنی تیزی سے پھیلیں گے، کہ میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں-

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَ يُمْسِيْ كَافِرًا وَ يُمْسِيْ مُؤْمِنًا وَ يُصْبِحُ كَافِرًا يَبِيْعُ دِيْنَهٗ بِعَرَضٍ مِّنَ الدُّنْيَا- (مسلم شریف)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، ان فتنوں سے پہلے نیکیاں کرلو، جو اندھیری رات کے حصوں کی طرح ہوں گے، جن میں آدمی صبح کو مومن اور شام کو کافر ہوگا، اور شام کو مومن اور صبح کو کافر ہو جائے گا- اپنے دین کو لوگ دنیاوی مال کے بدلے بیچ دیں گے-

حالات کا جائزہ لیجئے، پھر میرے آقا ﷺ کے ان ارشادات پر غور کیجئے، ایک ایک بات آپ کو وہی نظر آئے گی

جو میرے آقا، مخبر صادق ﷺ نے چودہ سو برس قبل فرمائی- یہ سب کچھ جاننے کے بعد فرمایئے، کیا تمام فرقوں کو اتحادِ ملت کے نام پر ختم کیا جا سکتا ہے، جبکہ امت کے آقا ﷺ خود ان کے وجود کی خبر دے رہے ہیں- اور کیا بہرے، گونگے اور اندھے امت میں انتشار وافتراق پیدا کرنے سے باز آ سکتے ہیں- نیز کیا جہنمیوں اور جنتیوں کا اتحاد ممکن ہے، ان تمام سوالات کا جواب نفی ہی میں ملتا ہے، تو آپ سوچیں گے کہ اتحادِ ملت کی کوششیں رائیگاں ہیں- انہیں چھوڑ دیا جائے نہیں ہرگز نہیں، اتحاد کی دولت تلاش کرنی چاہیے، اس میں بڑی برکت ہے- بس اس کا دائرہ کار متعین کر لیجئے- حق و باطل کا امتیاز برقرار رکھیے- باطل فرقوں کے اندر جھانک کر، ایمان کو خطرے میں ڈالنے کے بجائے، حق کی راہ پر چلنے والوں کو اتحاد کا پیغام دیجئے، پھول کی ان بکھری پتیوں کو، اللہ کی رسی میں پرو دیئے، یہی ملتِ حقہ ہے- انہیں متحد کر کے ایسا صحت مند بنا دیجئے کہ بہتر باطل فرقوں کا زہر ان پر اثر نہ کر سکے- گوشہ گوشہ میں ایسے سپاہیوں کو پھیلا دیجئے، جو ملتِ حقہ کو ملتِ باطلہ کے انتشار وافتراق کا شکار نہ ہونے دیں- تقریر وتحریر کے ذریعہ باطل پرستوں کے چہروں سے نقاب اٹھایئے اور حق پرستوں کو ان کے مکر وفریب سے بچایئے، یہی ہے، اتحادِ ملت، یہی ہے خدمتِ دین- باطل پرستوں سے خود بھی بچیئے، دوسروں کو بھی بچایئے-

بات بہت پھیل گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی گستاخی، بڑی گمراہی ہے، جس کا مرتکب باتفاقِ امت مرتد ہے- یہ گستاخی چاہے احکام شریعت کے انکار کی صورت میں ہو یا حضور علیہ السلام کی توہین اور ان کو ایک عام، اپنا جیسا انسان سمجھنے کی صورت میں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا سدباب کرتے ہوئے اہل ایمان کو اپنے پیارے محبوب علیہ السلام کے لئے، ایسا لفظ تک استعمال کرنے کی ممانعت فرما دی جس میں توہین وگستاخی کا شائبہ ہو اور اس سے دشمن کو خوشی حاصل ہوتی ہو- پس نبی مکرم علیہ السلام کا ادب واحترام اور آپ کی تعظیم ہی اصلِ ایمان، روح ایمان اور جان ایمان ہے- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اٰذٰی شَعْرَۃً مِّنْ شَعْرِیْ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ

جس نے میرے ایک بال کی بے ادبی کی اس پر بھی جنت حرام ہے

اسی لئے علماء امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آپ کی شان میں گستاخی کرنے والا مرتد ہے- علماء، جو حضور علیہ السلام کے وارث ہیں، عوام سے زیادہ ناموسِ رسالت کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں- وہ ہر شخص کے قول وعمل، تقریر وتحریر کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں- اس ڈاکٹر کی طرح جو عوام کی صحت کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے اور صحت کے لئے مفید ومضر چیزوں کی پہچان کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، یہ اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے، کبھی پانی کا تجزیہ کر کے لوگوں کو بتاتا ہے کہ اس میں بیکٹیریا ہے، کوئی بغیر ابالے پانی استعمال نہ کرے، اور کبھی سبزیوں، پھلوں کے متعلق کہتا ہے کہ یہ مضر صحت ہیں، ان کو استعمال نہ کیا جائے- اور ہر شخص اپنے جسم کی حفاظت کی خاطر اپنی مرغوب ترین چیز چھوڑنے کے لیے تیار رہتا ہے- اس لئے کہ جسم بہت پیارا اور اس کی صحت عزیز ہے- علماء بھی یہی کرتے ہیں کہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے، لوگوں کے اعمال واقوال کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور جہاں مضر ایمان بیکٹیریا پاتے ہیں، اس سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں اور اس زہر سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں- پس جسے ایمان عزیز ہوتا ہے وہ علماء کی بات تسلیم کر کے اپنے ایمان کی حفاظت کر لیتا ہے- پس

ایمان کو عزیز رکھیے اور اس کی حفاظت کے لئے علماء کی رہبری کو قبول کیجئے۔

انشاء اللہ، اس عنوان پر مزید گفتگو ہم سورۃ الحجرات کی آیات کے ذیل میں کریں گے۔ اللہ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے اور ایمان کے لٹیروں سے محفوظ رکھے۔

خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و با یزید اینجا

☆☆

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

☆☆

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

وَ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۳

البقرہ: ۱۵۳ تا ۱۵۷

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓىٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ (البقرہ: ۱۵۳۔۱۵۷)

اے ایمان والو! مدد چاہو، صبر اور نماز سے بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں، انہیں مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تمہیں شعور نہیں، اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، تھوڑے سے ڈر اور بھوک اور مال، جان اور پھلوں میں کمی سے، اور خوشخبری سنا دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچے تو کہیں بیشک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہی لوگ ہیں جن پر بکثرت درود ہے، ان کے رب کی

طرف سے اور وہی ہیں ہدایت والے۔

اے ایمان والو! مصیبت، غم واندوہ سے نہ کوئی بچا ہے، نہ بچ سکتا ہے کہ یہ انسان کی آزمائش کا ذریعہ ہے، جس کے لئے انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (الملک:۲)

جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تا کہ وہ تمہیں آزمائے، کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔

لیکن واویلا کرنے رونے، چیخنے، چلانے سے نہ مصیبت گھٹتی ہے، نہ ٹلتی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ مصیبت زدہ اپنے رب کریم کی طرف رجوع کرے۔ جس کا طریقہ مصیبت کو برداشت کرنا، صبر کرنا اور اس سے نجات کے لیے اللہ کے دربار میں حاضر ہونا، اپنی کمزوری اور بندگی کو ظاہر کرنا، رب کی قدرت وقوت کا عملی اقرار کرنا، یعنی نماز پڑھنا ہے۔ جب بندہ صبر واستقامت کے ساتھ اپنے بے چارگی ومجبوری کو تسلیم کرتا ہے، تو رب اس کا حامی وناصر بن جاتا ہے، ”بیشک اللہ، صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔

استقلال واستقامت کے ساتھ جو ایمان پر قائم رہتے، دین پر ڈٹے رہتے ہیں، حتی کہ اللہ کی راہ میں اپنی جانیں تک قربان کر دیتے ہیں، وہ تو بڑے ہی خوش نصیب ہیں کہ اس دنیا والوں سے حجاب اور پردے میں چلے جانے کے بعد بھی زندہ ہی ہیں، ایسے یقینی زندہ کہ تم انہیں نہ مردہ کہہ سکتے ہو، نہ سمجھ سکتے ہو، وہ زندہ ہیں، تمہارا شعور کمزور ہے کہ تم انہیں دیکھ نہیں رہے، محسوس نہیں کر رہے۔

اے ایمان والو! مصیبتوں سے نہ گھبراؤ کہ ہم مختلف قسم کی مصیبتوں سے تمہاری آزمائش کرتے ہیں۔ کبھی خوف کے ذریعہ کہ تم طاقتور دشمن کے ظلم وستم کے خوف میں مبتلا کر دیے جاتے ہو اور کبھی بھوک میں مبتلا کر دیے جاتے ہو۔ اس طرح کہ انفرادی یا قومی طور پر معاشی حالت کمزور اور تباہ ہونے لگتی ہے اور کبھی مال ودولت کے نقصان سے تمہاری آزمائش ہوتی ہے کہ تجارت میں خسارہ ہونے لگتا ہے یا چوری اور ڈکیتی کا وبال آجاتا ہے اور کبھی جانوں کے نقصان کا شکار ہوتے ہو کہ جوان بچے کی نعش تمہارے سامنے ہوتی ہے۔ اعزا واقارب کو اپنے ہاتھوں سے دفن کرنا پڑتا ہے اور کبھی ثمرات کا نقصان تمہارے اوپر غم واندوہ کا پہاڑ بن کر ٹوٹتا ہے کہ سیلاب، طوفان اور دوسری آسمانی آفات تمہاری ہری بھری کھیتیوں اور پھلوں سے لدے ہوئے باغوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔

ان تمام آزمائشوں اور مصیبتوں پر اگر تم تڑپ کر، اللہ ہی کو یاد کرتے ہو، تمہارے درد بھرے دل سے یہی صدا آتی ہے کہ بیشک ہم اللہ ہی کے لیے اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، تو تم خوش نصیب ہو، امتحان میں کامیاب ہو، رب رحیم کی رحمتیں، تمہیں اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں، مصیبتیں ٹل جاتی ہیں، اللہ کے فرشتے بھی تم پر رشک کرنے لگتے ہیں اور تم اللہ کے مقرب اور پیارے بن جاتے ہو۔

قرآن کریم، اہل ایمان کو مصائب وآلام سے نجات کا نسخہ کیمیا عطا فرما رہا ہے کہ مومن کو ایمان قبول کر لینے کے

بعد ہی زیب دیتا ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز، غم اور خوشی ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرے، اس کو پکارے، اسی سے مدد مانگے، جس سے اس نے اپنی زندگی کا سودا کیا ہے اور آخر کار اسی کے دربار میں حاضری کا اسے یقین کامل ہے۔ جب مومن اس نسخہ کیمیا پر عمل پیرا ہوتا ہے تو وہ ایک ایسا مضبوط پہاڑ بن جاتا ہے کہ بڑے بڑے طوفان اس سے ٹکرا کر گزر جاتے ہیں، لیکن اسے کوئی زک نہیں پہنچ پاتی - ہر طوفان کے گزرنے کے بعد وہ مزید چمکتا ہے، اس کے مراتب مزید بلند ہوتے، دنیا میں عزت و عظمت پاتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔

ان آیات میں جو مضامین بیان کیے جارہے ہیں، ان کی افادیت کے پیش نظر ہم ضروری تفصیل کے ساتھ انہیں بیان کرتے ہیں۔

استعانت، صبر، نماز، شہید، آزمائش

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

(البقرہ: ۱۵۳)

اے ایمان والو! مدد چاہو، صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

استعانت

استعانت، مدد چاہنا، انسان، دینی، دنیوی، روحانی، جسمانی، ہر شعبے میں حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی مدد کا محتاج ہے اس کا ایک لحہ بھی مدد کے بغیر گزرنا ناممکن ہے۔

ہمارا ایمان ہے، عقیدہ ہے کہ مستعان حقیقی صرف اور صرف اللہ ہے- ہر لحہ وہی ہمارا حامی و ناصر ہے- ہم اپنی نمازوں، دعاؤں اور ہر حال میں اعلان کرتے ہیں ''ایاک نستعین'' اے اللہ ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، لیکن اللہ ہی کا فیصلہ ہے کہ اس سے مدد حاصل کرنے کے لیے وسائل اور ذرائع تلاش کرو-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵

(المائدہ: ۳۵)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو، اور اس کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

خصوصی خطاب کے ساتھ اہل ایمان کو وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا گیا کہ ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ وسیلہ کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کیا جائے، اس کی مدد طلب کی جائے، خود ایمان بھی استعانت اور رضائے الٰہی کی طلب کا ایک وسیلہ ہی ہے یہی تعلیم دینے کے لئے، صبر اور نماز سے، استعانت کا حکم دیا گیا، کہ بندہ انہی کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے- دنیاوی امور میں بھی مسلمانوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا-

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(المائدہ: ۲)

اور تم نیکی و پرہیزگاری (کے کاموں) میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو، اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

حقیقی مددگار تو اللہ ہے، لیکن اس نے اپنے بندوں کو اپنی صفات کا مظہر بنایا، پس وہ چاہتا ہے کہ بندوں میں مدد کرنے کی صفت کو بھی ظاہر کرے، لہٰذا بندوں کو چاہیے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیا کریں، لیکن شکر اللہ ہی کا ادا کریں کہ حقیقت میں مدد اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کو وسیلہ بناؤ، شفا دینے والا اللہ ہی ہے۔ غربت و تنگدستی دور کرنے کے لئے امیروں، دولت مندوں کو وسیلہ بناؤ، دولت دینے والا اللہ ہی ہے۔ رزق حاصل کرنے کے لئے محنت و مشقت کرو، رازق اللہ ہی ہے۔ جہالت دور کرنے کے لئے عالموں، کتابوں کی مدد حاصل کرو، علم دینے والا اللہ ہی ہے۔ دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اسلحہ اور اسباب جنگ سے مدد لو، افرادی قوت اکٹھی کرو، لیکن فتح و کامرانی دینے والا اللہ ہی ہے۔ پس اسی کا شکر ادا کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔

غرضیکہ، اللہ سے مدد چاہنے کے لئے وسائل تلاش کرو کہ بغیر وسیلہ مدد ملنا ناممکن ہے، اگر تم وسیلے کا انکار بھی کرو، تب بھی اس سے مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھانے اور زبان ہلانے کا وسیلہ تو اختیار کرنا ہی پڑے گا۔ پس اچھے سے اچھا وسیلہ تلاش کرو تاکہ جلد سے جلد تمہیں مدد حاصل ہو۔

یہ وسیلہ اتنا اہم ہے کہ اس کی تعلیم عام کرنے اور بندوں میں اس کی عادت پیدا کرنے ہی کے لئے، اللہ نے بندوں کو ہر چیز، وسیلہ ہی سے عطا فرمائی۔ انسانوں کو اپنا پیغام پہنچانے کے لئے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اپنے محبوب علیہ السلام پر قرآن نازل فرمانے کے لئے جبریل علیہ السلام کا وسیلہ اختیار فرمایا، اپنے دین کی تبلیغ کے لئے اولیاء و علماء کو ذریعہ بنایا، دین غالب رکھنے کے لئے جہاد کا حکم دیا اور مجاہدین کو وسیلہ بنایا۔ جبکہ اللہ ان تمام ذرائع اور وسائل کے بغیر اپنی حکمتیں پوری فرمانے پر قادر ہے، کہ اس کی شان ہے۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝

(البقرہ، ۱۱۷)

ایجاد فرمانے والا ہے، آسمانوں اور زمین کا اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ فرماتا ہے، تو اس کے لئے یہی فرماتا ہے کہ ''ہوجا'' تو وہ فوراً ہوجاتی ہے۔

وہ قادر مطلق، ذرائع اور وسائل کا محتاج نہیں اس نے ان کو صرف بندوں پر ان کی اہمیت ظاہر کرنے اور ان کی تعلیم دینے کے لئے استعمال فرمایا، جب کہ اس نے اپنی بے شمار حکمتوں کو بغیر وسائل کے بھی پورا کر دکھایا۔ حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر وسیلے ہی کے بند کمرے میں بے موسم پھل عطا فرمائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، مرد کے وسیلے کے بغیر پیدا فرمایا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کی ضرورت کے مطابق، استادوں اور کتابوں کے بغیر علم عطا فرمایا۔ میرے آقا ﷺ کو ''علم الاولین والآخرین'' بغیر کسی واسطے ہی کے عطا فرمایا۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح سے واضح تر ہوجاتی ہے کہ، ''اللہ اپنی حکمتیں پوری فرمانے کے لئے ذرائع اور وسائل کا ہرگز ہرگز محتاج نہیں، پھر بھی اس نے اپنی بے شمار

نعمتیں، بندوں کو ذریعوں اور وسیلوں سے عطا فرمائیں۔ صرف اس لئے کہ بندۂ محتاج کے لئے، اللہ سے استعانت کے لئے ذریعہ و وسیلہ تلاش کرنے کا دروازہ کھول دیا جائے۔ نیز ہر بندے کو دنیا کے وسائل اور ذرائع کا محتاج بنا دیا جائے تا کہ اسے ہمہ وقت یہ احساس رہے کہ وہ ہمارا محتاج ہے، کہ یہی بندگی ہے اور یہی عبادت کی روح ہے۔

اسی تعلیم کے لئے اللہ نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو وسائل اختیار فرمانے کی اجازت دی۔ پس ان نفوسِ قدسیہ نے اللہ کے دیگر احکام کی طرح وسیلہ پر عمل کر کے دکھایا تا کہ امت کے لئے وسیلہ اختیار کرنا انبیاء کی سنت ہو جائے اور اہل ایمان کے اس عمل کو کوئی ناجائز و حرام یا شرک قرار نہ دے سکے۔ بطور مثال، چند انبیاء کرام علیہم السلام کا عمل ملاحظہ ہو۔

انبیاء کرام اور استعانت

قرآن کریم، سورہ یوسف، حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظر واپس دلانے کے لئے، حضرت یوسف علیہ السلام بھائیوں کو اپنا کرتہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں "اس کو میرے باپ کے چہرہ پر ڈال دینا نظر واپس آ جائے گی" کرتہ چہرے پر پڑا اور نظر واپس آ گئی۔ نظر بخشنے والا یقیناً اللہ ہی ہے، نبی کے کرتے کو صرف وسیلہ بنایا گیا۔

قرآن کریم، سورہ نمل، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے، بلقیس کا تخت منگانے کے لئے مدد طلب فرمائی اور جب آپ کے ایک خادم، اللہ کے ولی نے تخت حاضر کر دیا تو آپ نے اللہ ہی کا شکر ادا کیا۔

قرآن کریم، سورہ بقر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، خدمت دین کے لئے مدد طلب فرماتے ہوئے، قوم کو پکارتے ہیں، "کون ہے، اللہ کے لئے میری مدد کرنے والا"۔

قرآن کریم، سورہ بقر، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تابوت اور اس میں موجود تبرکات کی برکت سے، بنی اسرائیل کو، طالوت کی قیادت میں جالوت اور اس کے لشکر پر غلبہ عطا فرمایا گیا۔

قرآن کریم، سورہ آل عمران، حضرت مریم علیہا السلام کے پھلوں کی برکت سے، اللہ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور انہیں اولاد عطا فرمائی۔

قرآن کریم، سورہ انفال، میرے آقا ﷺ کی مدد کے لئے اللہ نے غزوہ بدر میں فرشتوں کا لشکر نازل فرمایا، جس کی مدد سے ۳۱۳ کمزور مسلمانوں کو طاقتور دشمن پر غلبہ حاصل ہوا۔

اختصار کے پیش نظر، ان چند واقعات پر اکتفاء کرتے ہوئے عرض ہے کہ ان تعلیمات ہی کے مطابق صحابہ، حضور علیہ السلام کے دربار میں استغاثہ کرتے اور دعا کی درخواست پیش کرتے۔ خود نبی مکرم علیہ السلام نے، اپنے وسیلہ سے دعا مانگنے کی تعلیم فرمائی۔ شفا شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضور علیہ السلام کے دربار میں ایک نابینا صحابی نے درخواست کی کہ یارسول اللہ، آپ دعا فرما دیں کہ اللہ مجھے بینائی عطا فرما دے۔ آپ نے فرمایا، جاؤ اس طرح دعا کرو۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیۡکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَّبِیِّ الرَّحۡمَةِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیۡ اَتَوَجَّهُ بِکَ اِلٰی رَبِّکَ اَنۡ یَّکۡشِفَ عَنۡ بَصَرِیۡ اَللّٰهُمَّ شَفِّعۡهُ لِیۡ

اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے دربار میں تیرے نبی رحمت کا وسیلہ لے کر حاضر ہوں

اے محمد ﷺ، میں آپ کے وسیلہ سے آپ کے رب سے مانگتا ہوں کہ وہ مجھے نظر عطا فرمادے۔ اے اللہ، اپنے محبوب علیہ السلام کو میرا شفیع بنادے۔ (مشکوٰۃ شریف)

صحابی نے دعا کی، اور اللہ نے اپنے حبیب علیہ السلام کے واسطہ و وسیلہ سے ان کی دعا کو قبول فرمایا کہ انہیں بینائی نصیب ہو گئی۔ اسی تعلیم کے مطابق ہم بھی دعا کرتے ہیں۔

فَسَہِّلْ یَا اِلٰہِیْ کُلَّ صَعْبٍ بِحُرْمَۃِ سَیِّدِ الْاَبْرَارِ سَہِّلْ

استعانت بالغیر

استعانت، صرف اللہ ہی سے کی جائے گی، لیکن اس کے لئے وسیلہ ضروری ہے اور اگر اس وسیلہ ہی کو، غیر اللہ سے استعانت کہا جائے تو یوں کہیے کہ استعانت باللہ کے لئے، استعانت بالغیر ضروری ہے۔ چاہے وہ صبر، نماز یا دوسرے اعمال صالحہ سے ہو یا عبادت الٰہی میں کمال حاصل کر لینے والے، اتقیا، صلحا، اولیاء، انبیاء، بالخصوص نبی رحمۃ ﷺ سے ہو۔ ان سے ہو جو زندہ ہیں یا ان سے ہو جو دنیا سے جا چکے، کیونکہ جن سے دعائی کرائی جاتی یا دعاؤں میں ان کا واسطہ و وسیلہ پیش کیا جاتا ہے ان میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جو اس دنیا سے چلے جانے، ہماری نظروں سے اوجھل ہو جانے کے باوجود بھی بلاشبہ، یقیناً زندہ ہے، اپنے جسموں کے ساتھ اپنی قبروں میں موجود و محفوظ ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے، جس کی روحانی قوت و طاقت، دنیا سے چلے جانے کے بعد، اور زیادہ کر دی گئی ہے۔ اب ان کی دیکھنے، سننے کی قوت میں اضافہ ہی ہوا ہے، کمی نہیں، کہ عام مومنین کی قوتوں میں بھی بعد موت اضافہ ہوتا ہے، تو مقربین، متقین اور صالحین کا کیا کہنا۔

اس مسئلے کی مزید تفصیل کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے، صرف ایک حدیث پیش کر کے ہم اپنا قلم روکتے ہیں کہ یہ واقعہ ہمارے ایمان کو تازہ اور ہمارے عقیدے کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

عَنْ اَبِی الْجَوْزَاءِ قَالَ قُحِطَ اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ قَحْطًا شَدِیْدًا فَشَكَوْا اِلٰی عَآئِشَةَ فَقَالَتْ اُنْظُرُوْا قَبْرَ النَّبِیِّ ﷺ فَاجْعَلُوْا مِنْهُ كُوًی اِلَی السَّمَآءِ حَتّٰی لَا یَكُوْنَ بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ السَّمَآءِ سَقْفٌ فَفَعَلُوْا فَمُطِرُوْا مَطَرًا حَتّٰی نَبَتَ الْعُشْبُ وَ سَمِنَتِ الْاِبِلُ حَتّٰی تَفَتَّقَتْ مِنَ الشَّحْمِ فَسُمِّیَ عَامُ الْفَتَقِ

ابوالجوزاء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، کہ ایک مرتبہ مدینہ کے لوگ سخت قحط میں مبتلا ہوئے، تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دربار میں حاضر ہو کر، دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا، حضور علیہ السلام کی قبر انور کی طرف دیکھو اور آسمان کی طرف ایک سوراخ کر دو کہ آپ کے اور آسمان کے درمیان چھت نہ رہے پس لوگوں نے ایسا ہی کیا، تو خوب بارش ہوئی کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہو گیا اور اونٹ اتنے موٹے ہو گئے کہ چربی کی وجہ سے پھٹنے لگے، پس اس سال کا نام ہی، پھٹنے کا سال ہو گیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

اللہ اکبر، اہل مدینہ تو اپنی ماں کے پاس دعا کرانے آئے تھے، انہوں نے خود دعا نہ کی بلکہ اس دربار عالی کی طرف

بھیجا جس کے وسیلے سے دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور طریقہ بھی کیا عجب بتایا۔

غرضیکہ، مسئلہ استعانت نہایت ہی واضح ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا، اس سے اس مسئلہ کی وضاحت مقصود نہیں بلکہ اپنا عقیدہ بیان کرنا مقصود ہے، کہ واضح کو کیا واضح کیا جائے۔ لیکن حیرت ہے ان لوگوں پر جنہوں نے خواہ مخواہ اس مسئلہ کو الجھا دیا اور ایسا الجھایا کہ مسلمانوں پر شرک کے فتوے لگانے لگے۔ جس کو دعا میں سرکار کا وسیلہ پیش کرتے سنا، بس فوراً، حرام حرام پکار اٹھے، جسے کسی ولی، بزرگ کی قبر پر روتے دیکھا، بت پرست مشرک کہہ ڈالا اور نہ جانے کیا، کیا کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے امت کو انتشار وافتراق میں مبتلا کر دیا۔ ایسے فتوے جاری کرنے کے بجائے ''ظن المؤمن خیرا'' پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں سے حسن ظن رکھا جاتا، ان کو افراط وتفریط سے بچانے کے لئے، ان کے اعمال کی حکمت ومصلحت کے ساتھ اصلاح کی جاتی، تو اس امت میں فرقہ بندی نام کی کوئی بیماری پیدا نہ ہو پاتی، لیکن برا ہو ان نام نہاد مصلحین کا، جنہوں نے مسلمانوں میں اصلاح کے نام پر تفرقہ پیدا کیا۔ انہیں صحابہ، تابعین، صالحین، اولیاء اور علماء سلف کی راہ سے ہٹا کر طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا کیا۔ اللہ ان فتنوں سے محفوظ رکھے۔

بہر حال استعانت، یعنی غیر اللہ سے مدد مانگنا، نہ حرام ہے، نہ کفر ہے، نہ شرک ہے بلکہ سنت الٰہیہ، سنت انبیاء ہے۔ اللہ، باوجود قدرت کے بغیر وسیلہ کے کچھ نہیں دیتا۔ وہ اپنے مقربین ومحبوبین کی اہمیت کی بقاء اور عام لوگوں کو ان کی احتیاج اور کمزوری کا احساس دلانے کے لئے وسیلہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے اس کے محبوبین کا دامن پکڑیں اور ان کے دربار کے بھکاری بنیں، پس یہی ہمارا عقیدہ ہے، اللہ اسی پر قائم رکھے۔ آمین

بہر حال، اللہ سے ''استعانت'' کے لئے، مدد مانگنے کے لئے غیر اللہ سے استعانت یا وسیلہ نبی مکرم علیہ السلام کی تعلیم، صحابہ، صلحاء واولیاء امت کا عمل ہے، اللہ ہمیں بھی اسی پر قائم رکھے۔ آمین

يَآ اَكْرَمَ الْخَلْقِ مَا لِىْ مَنْ اَلُوْذُبِهٖ
سِوَاكَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمَمِ

کیست جز تو ناصرم اے بہترین کائنات تا پناہ جویم بدور انقلاب وحادثات
اے پناہ جملہ عالم کون ہے تیرے سوا التجا جس سے کروں ہنگام غم وقت الم

صبر کا مفہوم

صبر کے معنی ہیں روکنا، یعنی اپنے نفس کو ان تمام باتوں سے روکنا جو مالک حقیقی اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کی مرضی کے خلاف ہوں۔ اس اعتبار سے صبر کے وہ معنی جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، غلط ہیں۔ یعنی کسی مصیبت پر، مجبوری یا کمزوری اور بے بسی کے عالم میں، غصہ وغضب اور انتقام سے رُکنا، یہ صبر نہیں، یہ تو بے بسی، کمزوری اور مجبوری ہی کہلائے گی۔ صبر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اللہ کی نعمتوں پر بھی صبر ہوتا ہے، مصیبتوں اور تکلیفوں پر بھی صبر ہوتا ہے۔

اللہ کی نعمتوں پر صبر یہ ہے کہ انسان نعمتوں کو اپنے نفس کی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہ بنائے۔ دولت ملے تو عیاش نہ بنے، علم وعقل ملے تو متکبر ومغرور نہ بنے۔ حکومت وطاقت ملے تو ظالم وجابر نہ بنے۔ صبر یہ ہے کہ دولت سے اپنی، اپنے

اعزاء و اقارب، اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرے، اپنے ملک سے غربت دور کرے اور علم و عقل سے اپنی اصلاح کرے- اپنے معاشرے سے جہالت کی لعنت کو دور کرے، حکومت و طاقت کے ذریعہ مظلوموں کا سہارا بنے، حق داروں کو ان کا حق دلائے- قوم کی فلاح و بہبود کی تدابیر کرے- یا یوں کہئے کہ نعمتوں پر صبر یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور شکر گزار بندہ بنے-

مصیبتوں پر صبر یہ ہے کہ انسان ان کے مقابلے میں ڈٹ جائے اور ان سے نجات کے لئے اللہ ہی کو پکارے- جو نقصان ہوا اس کو اللہ کی راہ میں قربانی سمجھے اور اس پر اجر کی دعا کرے- نیز یہ یقین رکھے کہ سب کچھ اللہ ہی کا دیا ہوا، دینے والا اس کو لینے پر بھی قادر ہے- اللہ کی نعمتیں، مال و دولت، اہل و عیال، حکومت و سلطنت، حتی کہ ہمارا جسم و جان سب اسی کی امانت ہیں- وہ جب تک چاہے اپنی نعمتوں کی ہم سے خدمت کرائے اور جب چاہے واپس لے لے، ہمارا قبضہ عارضی ہے، وقتی ہے، مالک حقیقی وہی ہے- اللہ کسی کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرتا، بلکہ صرف اپنی نعمت واپس لیتا ہے، اسی کی ہمیں تعلیم دی گئی کہ جب کوئی نعمت واپس لی جائے تو تم اپنے اعتقاد کو اپنی زبان پر اس طرح لاؤ، کہ ”بے شک ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں“- آج اللہ اپنی دی ہوئی نعمت مجھ سے واپس لے رہا ہے تو کیا ہوا، مجھے تو خود بھی اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، یہ مصیبتوں اور تکلیفوں پر صبر ہے-

اور ایک صبر ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری پر، کہ انسان اطاعت و فرمانبرداری پر ایسا جما رہے کہ دنیا کا عیش و آرام، لالچ، کسی کی محبت یا کسی کا خوف و ڈر، اسے اطاعت سے ذرا برابر بھی نہ ہٹا سکے- مؤذن نماز کے لئے پکارے تو آرام کا وقت ہو یا کاروبار کا، ٹی وی چل رہا ہو یا وی سی آر، بندہ مومن نماز کے لئے بھاگے- رمضان کا چاند نظر آئے، روزے کے اوقات میں ان تمام چیزوں کو حرام جانے، جنہیں اب شریعت نے حرام کر دیا جبکہ آج سے پہلے وہ حلال تھیں- زکوٰۃ فرض ہو تو مال کی ظاہری کمی کا احساس نہ ہو بلکہ برکت و حفاظت مال کا ذریعہ جانے اور غریبوں کا حق ادا کرے- حج فرض ہو تو مصروفیت، خرچ، وطن اور اہل و عیال کا چھوڑنا آڑے نہ آئے، بلکہ اللہ کی دعوت پر خوش ہو اور اس کے دربار میں حاضری کے لئے چل دے- جہاد کا موقع آئے تو دنیا کی محبت، اہل و عیال کی محبت کا خیال تک نہ ہو، بلکہ شہادت کے تصور میں مست، دین کی حفاظت کے لئے میدان جہاد میں کود پڑے- اسی طرح ہر موقع پر شریعت کی پابندی میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے- مثلاً بے نمازیوں یا غیر مسلموں میں گھرا ہوا ہو تو شرم اور جھجک کی وجہ سے نماز نہ چھوڑے- بدکردار معاشرہ، بری سوسائٹی، بندہ مومن کو دین کی پابندی سے نہ روکنے پائے، حرام کتنا ہی بن سنور کر سامنے آئے، لیکن یہ حلال ہی پر قناعت کرے- دولت کی ضرورت، سود کا مال کھانے پر مجبور نہ کر سکے- بھوک و پیاس، خنزیر و شراب کے استعمال پر آمادہ نہ کر پائے، نفس کی خواہش، زنا اور بدکاری پر مائل نہ کرنے پائے- یہ ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر صبر-

صبر کی اہمیت

صبر مجبوری نہیں بہادری ہے، کمزوری نہیں، طاقت ہے، بزدلی نہیں، دلیری ہے- اسی لئے حکم دیا گیا کہ جب اضطراب و بے چینی، تکلیف و مصیبت تمہیں کمزور بنا رہے ہوں تو ”صبر سے مدد حاصل کرو“ یہ تمہیں باہمت بنائے گا اور تم ہر قسم

کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لائق ہو جاؤ گے، تمہاری دشواریاں آسان ہو جائیں گی، تمہاری الجھنیں سلجھ جائیں گی، اپنوں کی نظروں میں باوقار ہو جاؤ گے، دشمنوں کو بارعب نظر آؤ گے، خوف و ڈر سے آزاد ہو جاؤ گے۔ طاقتور دشمن سے مقابلے، پہاڑوں سے ٹکرانے کی اپنے اندر ہمت پاؤ گے۔ جسمانی تکالیف ہوں یا روحانی، سب سے نجات کا ذریعہ صبر ہے۔ جسمانی امراض ہوں یا روحانی سب کی شفا کا ذریعہ صبر ہے۔ پس صبر ایک قوت ہے، ایک طاقت ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

(آل عمران: ۲۰۰)

اے ایمان والو! صبر کرو، اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے تیار رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

مملکت اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت مومنوں کی ذمہ داری ہے، اسی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے جہاد فرض کیا گیا ہے۔ لیکن اگر مسلمان دنیا کے عیش وعشرت، مال ودولت کے لالچ اور اہل عیال کی محبت میں گرفتار ہو کر دشمن کے خوف اور ڈر کا شکار ہو جائیں، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے تو وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر سکتے اور نہیں کر رہے، پس انہیں چاہئے کہ وہ اپنے اندر بھی صبر کی خوبی پیدا کریں اور اپنے بھائیوں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہا کریں، تو

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

(آل عمران: ۱۲۰)

اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگار رہو، تو ان کا فریب تمہیں، کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا، بیشک اللہ ان کے سب کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔

دشمن کتنا ہی مکار ہو، کتنا ہی طاقتور ہو، تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، اگر تاریخ اسلام پر آپ کی نظر ہے تو اللہ کے اس ارشاد کی صداقت کا آپ کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ غزوات پر نظر ڈالیے، بالخصوص غزوہ بدر کے واقعات پر غور کیجئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا منکرین زکوٰۃ اور مدعیان نبوت سے جہاد، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتوحات، پھر میدان کربلا میں گلستان نبوت کا اجڑنا، اس کے بعد متعدد مواقع پر اہل ایمان کی فتوحات، دلیری اور جرأت کے واقعات، سب واضح ثبوت ہیں کہ دشمن کا مکر وفریب، ان کی قوت وطاقت صابرین پر کبھی غالب نہ آ سکے۔ اسی لئے قرآن کریم جب انسان کے خسارے اور نقصان میں ہونے کا اعلان فرماتا ہے، تو ان اہل ایمان کو اس خسارے سے مستثنیٰ اور محفوظ قرار دیتا ہے، جو صالحین ہیں، حق پرستی اور صبر جن کا شعار ہے، غور فرمایئے سورہ العصر کے مضمون پر:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

(العصر)

قسم زمانہ کی، یقیناً انسان ضرور نقصان میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے، اور انہوں نے نیک کام کیے اور آپس میں، ایک دوسرے کو دین حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

صبر انسان کو بدکاری، شراب نوشی، جوئے بازی، ظلم وستم، غیض وغضب، حق تلفی، غرور وتکبر، حسد، کینہ اور دوسری برائیوں سے روکتا ہے۔ یہ انسان میں قناعت، محبت، شفقت، جذبہ محنت، حلم، بردباری، تواضع، انکساری، اطاعت و فرمانبرداری، دوسروں کی عزت، ہمدردی، ایثار وقربانی جیسی عظیم خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ گویا انسان کو زیور انسانیت سے آراستہ کرتا اور باوقار، محترم، معزز شخصیت بنادیتا ہے۔ اسی لئے اللہ نے اپنے تمام نبیوں کو نمونہ صبر بنایا، دیکھئے:

انبیاء کرام اور صبر

حضرت نوح علیہ السلام نے ایک صدی سے زیادہ اپنی قوم کے ظلم وستم پر صبر کیا، بیٹے کو اپنی آنکھوں سے غرق ہوتے دیکھا، صبر کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے، چہیتی بیوی اور ننھے بچے کو بیابان میں چھوڑ دینے کا حکم ہوا، کعبہ کی تعمیر کی دشوار ذمہ داری سونپی گئی، بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا، جو مالک نے کہا، کرتے رہے۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام، محبوب بیٹے یوسف علیہ السلام کی جدائی پر اعلان فرماتے ہیں

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۞ (یوسف:۱۸)

تو اب، صبر ہی اچھا ہے اور میں اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں، اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو۔

دوسرا بیٹا جدا ہوتا ہے، تو پھر اسی اعلان کا اعادہ فرماتے ہیں۔

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِیْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۞

(یوسف:۸۳)

تو اب (میرے لئے) صبر (ہی) ہے، قریب ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے، بیشک وہی سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔

اپنے غم واندوہ کا کسی سے شکوہ تک نہیں فرماتے بلکہ:

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞

(یوسف:۸۶)

انہوں نے فرمایا، میں اپنی پریشانی اور غم کی فریاد، اللہ ہی سے کرتا ہوں اور میں، اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی، مالی مصیبتیں برداشت کیں اور صبر کا ایسا نمونہ پیش کیا، کہ خود اللہ رب العزت نے تعریف فرمائی:

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۞ (ص:۴۴)

بیشک ہم نے انہیں (ایوب کو) صابر پایا، وہ کیا ہی اچھے بندے ہیں، بے شک وہ (ہماری طرف) بہت ہی رجوع کرنے والے ہیں۔

پیکرِصبر

غرضیکہ، اللہ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کوصبر کے زیور سے مزین فرمایا اور مبعوث ہونے کے بعدان نفوس قدسیہ نے ،اس کا خوب خوب مظاہرہ فرمایا- میرے آقا نبی آخرالزمان ﷺ اپنے تمام کمالات اورصفات میں ،انبیاء سابقین سے افضل واعلیٰ ہیں، لہٰذا صبر جیسا عظیم کمال بھی آپ میں اتنا نمایاں ہے کہ آپ، پیکرِصبر نظرآتے ہیں-نزول قرآن کی تئیس سالہ مدت کے دوران کئی بار اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس خوبی پر قائم رہنے کی تاکید فرمائی اور آپ ہرحال میں اس کو اپنائے رہے، چندآیات ملاحظہ ہوں-

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٤٨﴾ (الطور:۴۸)

اور(اے محبوب) آپ اپنے رب کے فیصلہ پرٹھہرے رہیں تو بیشک آپ ہماری حفاظت میں ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے جب آپ کھڑے ہوں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ (یونس:۱۰۹)

اور(اے محبوب) آپ اسی کی اتباع کیجئے، جوآپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اور(اے محبوب) آپ صبر کیجئے، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ فرمادے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:۳۵)

تو(اے محبوب) آپ صبر فرمائیں،جیسا صبر کیا ہمت والے رسولوں نے-

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ
مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾ (طٰہٰ:۱۳۰)

تو(اے محبوب ان کی باتوں پرصبر کیجئے ،اوراپنے رب کی حمد کے ساتھ،اس کی تسبیح کیجئے-سورج نکلنے سے پہلے اورسورج ڈوبنے سے پہلے اوررات کے کچھ اوقات میں اس کی تسبیح کیجئے اوردن کے کناروں میں،تاکہ آپ خوش رہیں-

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿١٠﴾ (المزمل:۱۰)

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿٧﴾ (المدثر:۷)

اور(اے محبوب) صبر کیجئے ،کافروں کی باتوں پر اورانہیں خوش اسلوبی کے ساتھ چھوڑ دیجئے اور(اے محبوب)اپنے رب کے لئے صبر فرمایئے۔

پس محبوب علیہ السلام نے ساری حیات مبارکہ،صبرورضا کے ساتھ بسر فرمائی، یتیمی کا صدمہ برداشت کیا، اعلان نبوت کے بعد اپنوں ،غیروں سب کی دشمنی کا مقابلہ کرتے رہے،اہل مکہ نے ظلم وستم کے سارے حربے استعمال کرڈالے-حتی کہ تین برس تک مکمل بائیکاٹ کیا-شعب ابی طالب میں محصور رکھا،اہل طائف نے پتھروں کی بوچھاڑ کی،جسم مبارک لہولہان کرڈالا،شفیق چچا ابوطالب اور رہمدرد رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی موت کا صدمہ پیش آیا،اپنے غلاموں کواپنی

نظروں سے مار کھاتے دیکھا لیکن کسی وقت بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ہجرت کا حکم ملا تو وطن عزیز، بالخصوص اللہ کا گھر چھوٹنے کا دکھ برداشت کیا، سفر کی صعوبتیں اٹھائیں، غار ثور میں تین راتیں بسر کیں، راستہ میں دشمن کا خوف رہا لیکن صبر ساتھی رہا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد چین اور سکون نہ تھا۔ ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کی ذمہ داریاں، ان کو پورا کرنے میں طرح طرح کی دشواریاں، اسی میں دشمن کی طرف سے سازشیں، مدینے پر حملے، لوٹ مار کے واقعات، منافقین کی چالیں، سب سے بیک وقت مقابلہ فرماتے ہیں۔ اسی دوران غزوہ بدر کا موقع آ جاتا ہے۔ چند جانثاروں کو لے کر، اس ذمہ داری کو بھی صبر و رضا کے ساتھ پورا فرماتے ہیں، پھر ایک ہی سال بعد غزوہ احد سامنے آیا، جہاں میرے آقا ﷺ نے بھرپور انداز پر صبر کا مظاہرہ فرمایا۔ یہاں جسمانی اذیت پہنچی، ستر جانثاروں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا، خاص طور پر وہ وقت کیسا صبر آزما تھا جب آپ کے محبوب چچا کا ناک کان بریدہ جسم مبارک آپ کے سامنے تھا۔ پیٹ چاک تھا جگر ٹکڑے ٹکڑے، جگہ جگہ، چبا پڑا تھا۔ یہاں جذبہ انتقام نے جوش مارا اور زبان مبارک سے نکلا ''اے چچا واللہ میں تمہارے بدلے ستر کافروں کو مثلہ کروں گا'' رب نے فوراً متنبہ فرمایا۔'' پیارے یہ جذبہ انتقام تمہیں زیب نہیں دیتا'' تمہارے اور تمہاری امت کے لیے، دشمن کو مثلہ کرنا جائز نہیں کہ تم انسانیت کی تذلیل و توہین کے لیے نہیں بلکہ اس کی عزت و عظمت بحال کرنے کے لیے مبعوث ہوئے ہو۔ ارشاد رب سنتے ہی جذبہ انتقام ایسا سرد پڑا کہ فتح مکہ کے بعد، جب قاتلِ حمزہ، وحشی اور ان کی توہین کرنے والی ہندہ اسلام کی پناہ میں آتے ہیں تو صرف اتنا فرمایا جاتا ہے'' کہ تم دونوں مجھے اپنا چہرہ نہ دکھانا، اس لیے نہیں کہ میرا جذبہ انتقام جوش مارنے لگتا ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ تمہیں دیکھ کر محبوب چچا کا مثلہ چہرہ سامنے آ جاتا ہے اور میں کبیدہ خاطر ہونے لگتا ہوں۔ مختصر یہ کہ آپ سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے آقا ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ صدمات اور غموں سے پُر تھا، لیکن کہیں دامن صبر نہ چھوٹنے پایا۔ آپ کے اس عمل نے ہی آپ کے صحابہ کو ایسا صابر بنایا کہ انہوں نے ہر قسم کے مصائب کو برداشت کیا اور اسلام کی جڑوں کو مضبوط کر کے ایسا تن آور درخت بنا دیا جو قیامت تک کے لیے ہر طوفان سے محفوظ ہے۔

یاد رکھئے، قوم پرلیڈر، راہنما کی باتوں اور تقریروں کا اثر اتنا نہیں ہوتا جتنا اس کے عمل کا۔ اگر قائد فاقہ کرنے والی قوم کے ساتھ فاقہ مست ہو کر اپنے مشن کا کام کرے، مصیبت زدوں کے ساتھ مصیبت میں مبتلا ہو اور اپنی ذمہ داری پوری کرتا رہے، تو قوم کا ہر فرد جانثار بن جاتا ہے اور قائد کے اشارے پر اپنی گردن کٹا دینے کے لیے، ہمہ وقت آمادہ رہتا ہے۔ نبی اکرم علیہ السلام کی یہی خوبی ہے جس نے غلاموں کو آپ کا جانثار بنایا، انہوں نے آپ کے صبر کو دیکھا تو وہ بھی، صبر کے ساتھ آپ کے مشن اور تحریک کے لیے قربانیاں دیتے رہے۔ گویا پیکر صبر و رضا آقا ﷺ کا ہر غلام، صابر اور نمونہ صبر بن گیا۔ اور قیامت تک آنے والی امت کو صبر کی دعوت دے گیا۔

صابرین کے لیے مژدہ کامیابی

صابرین کی زندگی بڑی ہی پر سکون اور پرامن ہو جاتی ہے۔ صابرین دشمن کی نگاہوں میں بھی باوقار اور بارعب ہو جاتے ہیں۔ صبر غیروں کو بھی اپنا بنا دیتا ہے کیونکہ '' اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے'' انہی صابرین کے لیے مختلف انداز سے مژدہ کامیابی و کامرانی سنایا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (بقرہ:۱۷۷)

اور صبر کرنے والے تکلیف اور سختی میں اور (کافروں) سے جنگ کے وقت، یہی لوگ ہیں، جنہوں نے سچ بولا، اور یہی لوگ ہیں، پرہیز گار (متقی)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (انفال:۴۶)

اور، اللہ، اور، اس کے رسول کی اطاعت کرو اور، آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (رعب ختم ہو جائے گا) اور، صبر کرو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا، اپنے رب کی رضا چاہنے کے لیے، اور نماز قائم کی اور ہمارے دیئے ہوئے رزق سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا۔

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (رعد:۲۲)

اور وہ نیکی کر کے برائی کو دفع کرتے رہے انہی کے لیے آخرت کا اچھا گھر ہے۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (رعد:۲۴)

تم پر سلامتی ہو، اس لئے کہ تم نے صبر کیا، تو کیا ہی اچھا ہے آخرت کا گھر۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ (القصص:۸۰)

اور ان لوگوں نے کہا جنہیں علم دیا گیا تم پر افسوس ہے، اللہ کا ثواب بہت اچھا ہے اس کے لیے جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے اور یہ (نعمت) انہی کو ملتی ہے، جو صبر کرنے والے ہیں۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ (حم السجدہ:۳۴)

اور نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کو دفع کرو بہترین طریقے سے، تو وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی وہ تمہارا دلی دوست بن جائے گا۔

وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (حم السجدہ، ۳۵)

اور یہ خوبی نہیں دی جاتی مگر صبر کرنے والوں کو اور، یہ خوبی نہیں دی جاتی مگر بڑے نصیب والے کو۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ:۴۳)

اور جو صبر کرے اور معاف کرے تو، یہ یقیناً ضرور ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر: ۱۰)

فرما دیجئے، اے میرے ایمان والے بندوں، اپنے رب سے ڈرتے رہو، ان کے لئے بہترین بدلہ ہے جنہوں نے دنیا میں نیکی کی اور اللہ کی زمین فراخ ہے۔ بیشک صبر کرنے والوں کو ان کا پورا اجر بغیر حساب دیا جائے گا۔

ان آیات پر غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ صابرین پر، اللہ کتنا کرم فرماتا ہے کہ صبر کرنے والے ہی ''متقی'' ہیں جو اللہ کے قرب اور محبوب بننے کا ذریعہ ہے۔ ''صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہے'' یعنی انہیں ہمہ وقت اللہ کی مدد حاصل رہتی ہے اور ہر حال میں ان پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ صابرین کے لیے مژدہ ہے کہ آخرت میں ان کے لیے بہترین گھر تیار ہے۔ ان پر اللہ کی طرف سے سلامتی کی خوشخبری دی جارہی ہے۔ اللہ کی طرف سے بہترین ثواب، ایمان کے کمال اور نیک اعمال کی لذت، ایک عظیم دولت، نعمت ہے، جو صابرین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ صبر دشمن کو بھی دوست بنا دیتا ہے۔ بلاشبہ صبر کرنا، لوگوں کو معاف کر دینا بڑی ہمت کا کام ہے، صبر کرنے والوں کو پورا پورا اجر دیا جائے گا۔

غرضیکہ صبر ایک بڑا کمال ہے، بڑی خوبی ہے۔ یہ عنوان نہایت ہی وسیع ہے بوجہ خوفِ طوالت اب ہم بلا تاخیر اپنا قلم روکتے ہیں جو کچھ لکھا گیا عمل کے لیے کافی ہے۔

نماز کی عظمت

مسلمان کا ہر عمل، جو شریعت کے مطابق ہو، اللہ کی عبادت ہے۔ حتیٰ کہ اس کا کھانا، پینا، سونا، تجارت کرنا، اہل و عیال کے لئے روزی تلاش کرنا، دوست واحباب سے ملنا جلنا، کسی بھوکے، پیاسے جانور تک کو کھانا کھلا دینا پانی پلا دینا، سب عبادت ہے۔ انسان عبد ہے جب وہ ایمان کے ساتھ عبدیت کا اظہار کرتا ہے تو اس کا ہر عمل معبود کے یہاں عبادت بن جاتا ہے۔ اور اس کو اجر وثواب دیا جاتا ہے۔ اس عبدیت کا عادی بنانے کے لیے اللہ نے کچھ ایسے مخصوص طریقے مقرر فرمائے جن میں عبد مصروف ہوتا ہے، تو ظاہری طور پر بھی معبود کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا نظر آتا ہے۔ روزہ، حج، زکوٰۃ، عبادت کے ظاہری طریقے ہیں۔ ان میں افضل ترین طریقہ نماز ہے جو ایسا پیارا طریقہ ہے کہ اس کے معنوی اثرات کا احساس تو صرف نمازی ہی کو ہوتا ہے لیکن اس کی ظاہری شکل وہیئت دیکھ کر غیروں کو بھی رشک آتا ہے۔ کہ کس طرح بندہ عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنے رب کے دربار میں حاضر ہے۔

قرآن کریم نے بڑے پیارے انداز میں اہل ایمان کو اس عبادت کی تاکید فرمائی اور سب سے زیادہ اسی کا ذکر فرمایا۔ یہاں نماز سے متعلق تمام آیات کا جمع کرنا تو ممکن نہیں، چند آیات ملاحظہ ہوں۔

پہلی ہی سورت، سورۃ البقرہ کی تیسری آیت ہے۔ متقین کی پہچان میں ان کا نمازی ہونا بھی شامل ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۟ (البقرہ:۳)

یہ قرآن پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے (ہماری راہ) میں خرچ کرتے ہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (البقرہ:۴۳)

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور، رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ (النساء:۱۰۳)

پس جب تم، نماز پوری کرلو، تو کھڑے بیٹھے اللہ کا ذکر کرو اور اپنے پہلوؤں پر (یعنی لیٹے ہوئے) پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو پھر نماز پڑھو۔ بیشک نماز ایمان والوں پر وقت مقرر کیا ہوا فریضہ ہے۔

نماز کامیابی اور اللہ کا رحم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الحج:۷۷)

اے ایمان والو، رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیک کام کرتے رہو، تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(النور:۵۶)

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رسول کی فرمانبرداری کرو تاکہ تم رحم کیے جاؤ۔

بے نمازی کو سزا بھگتنے کے لیے جہنم کے ان گڑھوں میں ڈالا جائے گا جن کا عذاب بہت سخت ہوگا۔ قرآن کریم نے ان گڑھوں کو "غی" اور "ویل" فرمایا ہے۔ (اللہ محفوظ رکھے)

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ

(مریم:۵۹)

تو ان کے بعد (ان کی جگہ) وہ ناخلف آئے جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو عنقریب وہ غی (جہنم کی وادی) میں جائیں گے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (الماعون:۴،۵)

تو خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔

کامیاب مسلمانوں کی خوبیاں گنواتے ہوئے نماز کو بھی ان کی ایک خوبی بتایا گیا۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ (المؤمنون:۹)

اور رجو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں

انسان کم حوصلہ (ھلوعا) پیدا کیا گیا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ مصیبت آتی ہے تو گھبرا جاتا ہے اور اللہ کی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں تو کنجوس بن جاتا ہے اور انہیں جمع کر کے رکھتا ہے، لیکن نمازی کی حالت یہ نہیں ہوتی۔

اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۙ﴿۲۲﴾ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآىٕمُوْنَ ۪ۙ﴿۲۳﴾ (المعارج:۲۳)

مگر وہ لوگ جو نمازی ہیں اور اپنی نماز پر ہمیشگی اختیار کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو جنتی بنانے والی خوبیوں میں نماز بھی شامل ہے۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ؕ (المعارج:۳۴)

اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰىۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾ (البقرہ:۲۳۸)

پابندی کرو، سب نمازوں کی اور درمیانی نماز کی، اور اللہ کے دربار میں ادب سے کھڑے ہو۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ؕ (اعلیٰ:۱۴،۱۵)

بیشک کامیاب ہوا، جو پاکیزہ ہو گیا، اور اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی۔

نماز کے فوائد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾ (العنکبوت:۴۵)

اور نماز قائم کرو، بیشک نماز روکتی ہے بے حیائی اور برائی سے، اور بیشک اللہ کا ذکر، ہر ذکر سے بہت بڑا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، جو تم کرتے ہو۔

انبیاء کرام اور نماز

قرآن کریم میں نوے مقامات پر نماز کا ذکر کیا گیا، ہم ان چند آیات پر اکتفاء کرتے ہیں۔ مزید اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے ہر رسول اور نبی کو اس کے ادا کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر کیا جاتا ہے۔ آپ رب کے حضور عرض کرتے ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖۗ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ (ابراہیم:۴۰)

اے رب مجھ کو اور میری اولاد کو، نماز کی پابندی کرنے والا بنا اے ہمارے رب، اور میری دعا قبول فرما لے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا۔

وَ كَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ۪ (مریم:۵۵)

وہ (اسماعیل) اپنے اہل وعیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔

حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت فرماتے ہیں-

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ (لقمان:۱۷)

اے میرے بیٹے، نماز کی پابندی کرتے رہنا-

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی تو ساتھ ہی یہ حکم بھی ہوا-

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ:۱۴)

میری یاد کے لیے نماز پڑھیے-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچپن ہی میں اپنی نبوت کے اعلان کے ساتھ بتاتے ہیں-

وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم:۳۱)

اور اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے-

لیکن پانچ نمازوں کی فرضیت صرف امت محمدیہ کی خصوصیت ہے- اس سے قبل کسی امت پر پانچ وقت کی نماز فرض نہ کی گئی، جیسا کہ میرے آقا ﷺ نے بتایا کہ حضرت آدم علیہ السلام صبح کی نماز پڑھتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام ظہر کی، حضرت سلیمان علیہ السلام عصر کی اور حضرت یعقوب علیہ السلام مغرب کی نماز پڑھا کرتے تھے- نیز حدیث معراج سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے صرف دو وقت کی نماز فرض کی تھی- لیکن وہ اس کی بھی پابندی نہ کر سکے- ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پانچوں نمازوں میں سے عشاء کی نماز ہم سے پہلے کسی پر فرض نہ ہوئی، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے ''عشاء کی نماز کو تاخیر سے پڑھا کرو، کیونکہ اس نماز کے ذریعہ تمہیں پچھلی امتوں پر فضیلت دی گئی ہے کہ تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز نہیں پڑھی''-

نماز قبل معراج

نماز کی فرضیت سفر معراج میں مشہور و معروف ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ نماز پڑھتے ہی نہ تھے- سورہ مزمل سے ثابت ہے کہ (ابتدا) حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام پر رات کی نماز فرض تھی- جو حضور ﷺ کی امامت میں صحابہ باجماعت ادا کرتے تھے- نیز حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز پہلی وحی کے ساتھ ہی فرض ہوگئی تھی جس کی تعلیم کے لیے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا، انہوں نے وضو کر کے دکھایا تو نبی کریم علیہ السلام نے بھی اسی طرح وضو فرمایا- اور پھر آپ نے جبرئیل کے ساتھ نماز ادا کی- نماز کے دیگر احکام اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی طرح تعلیم فرمائے، جس طرح دوسری بے شمار باتوں کا علم عطا فرمایا- حدیث میں یہ بھی ہے کہ اس رات کی نماز کے علاوہ حضور علیہ السلام اور صحابہ چاشت اور عصر کی نمازیں بھی پڑھتے تھے، اور ابتداء اسلام میں کفار کے خوف سے چھپ چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے-

ایک دن حضور علیہ السلام صحابہ کے ساتھ مکہ کی کسی گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک کفار کا ایک گروہ آ پہنچا اور انہوں نے نماز کی برائیاں کیں اور مسلمانوں سے لڑنے لگے- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اونٹ کی

ایک بڑی ہڈی ایک کافر کے سر پر دے ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا- یہ پہلا موقع تھا کہ ایک صحابی نے اسلام کے لیے کسی کافر کا خون بہایا-

ایک مرتبہ حضور علیہ السلام کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، ابوجہل اور اس کے ساتھی وہاں بیٹھے دیکھ رہے تھے کہ کسی کو شرارت سوجھی اور بولا، فلاں جگہ اونٹ ذبح ہوا ہے کوئی جائے اور اوجھڑی اٹھا لائے، اور جب محمد (ﷺ) سجدے میں جائیں تو ان کے سر پر ڈال دے- بد بخت عقبہ بن معیط گیا اور اوجھڑی لے آیا- جب آپ نے سجدہ کیا تو اس نے وہ اوجھڑی آپ کی پشت مبارک پر رکھ دی اور خوب ہنسے-تھوڑی ہی دیر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، جو ابھی بچی ہی تھیں، آ پہنچیں، ابا جان کی مدد کے لیے دوڑیں اور ننھے ہاتھوں سے یہ اوجھڑی ہٹائی-

ان کے علاوہ اور دیگر واقعات سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام، ابتدائے اسلام ہی سے نماز پڑھا کرتے تھے کبھی موقع ملتا تو کعبہ میں، ورنہ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں یا مکہ کی گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر- پھر واقعہ معراج تک تو مسلمانوں کو اتنی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ علی الاعلان کعبہ میں نماز پڑھتے تھے اور جب سفر معراج میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں تو باقاعدہ اوقات مقررہ پر کعبہ میں نماز پڑھی جانے لگی-

نماز کے متعلق چند احادیث

قرآن کریم کی چند آیات پر آپ نے غور کر لیا، اب اس سلسلے میں صاحب قرآن ﷺ کے چند فرمودات ملاحظہ ہوں، میرے آقا ﷺ نے فرمایا:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَرَاَيْتُمْ لَوْ اَنَّ نَهْرًا بِبَابِ اَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا هَلْ يَبْقٰى مِنْ دَرَنِهٖ شَیْءٌ قَالُوْا لَا يَبْقٰى مِنْ دَرَنِهٖ شَیْءٌ قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُوا اللّٰهُ بِهِنَّ الْخَطَايَا-

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا، بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ نہاتا ہو، کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہ جائے گا؟ صحابہ نے عرض کیا اس کا کچھ میل باقی نہ رہے گا- آپ نے فرمایا یہی پانچ نمازوں کی مثال ہے- اللہ ان کے ذریعے گناہ مٹا دیتا ہے- (بخاری و مسلم)

عن جابر رضی اللہ تعالی عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ بین العبد و بین الکفر ترک الصلوۃ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ بندے اور کفر کے درمیان حد فاصل صرف نماز ہے- (مسلم شریف)

عن بریدۃ قال قال رسول اللہ ﷺ العھد الذی بیننا و بینھم الصلوۃ فمن ترکہا فقد کفر

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، ہمارے اور کافروں کے درمیان نماز ہی کا عہد ہے، پس جس نے اس کو چھوڑا اس نے کافروں جیسا کام کیا۔ (ابن ماجہ)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ خَرَجَ زَمَنَ الشِّتَآءِ وَالْوَرَقُ یَتَھَافَتُ فَاَخَذَ بِغُصْنَیْنِ مِنْ شَجَرَۃٍ قَالَ فَجَعَلَ ذٰلِکَ الْوَرَقُ یَتَھَافَتُ قَالَ فَقَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ قُلْتُ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ لَیُصَلِّی الصَّلٰوۃَ یُرِیْدُبِھَا وَجْہَ اللّٰہِ فَتَھَافَتُ عَنْہُ ذُنُوْبُہٗ کَمَاتَھَافَتُ ھٰذَا الْوَرَقُ عَنْ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں جبکہ پتے جھڑ رہے تھے، حضور علیہ السلام باہر تشریف لے گئے (میں آپ کے ساتھ تھا) پس آپ نے ایک درخت کی دو ٹہنیاں پکڑیں (اور انہیں ہلایا) تو ان سے پتے جھڑنے لگے۔ آپ نے فرمایا، اے ابوذر، میں نے عرض کیا، جی یارسول اللہ، آپ نے فرمایا جب بندہ مسلم خالص اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے یہ پتے، اس درخت سے جھڑ رہے ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف)

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَ ھُمْ اَبْنَآءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَ ھُمْ اَبْنَآءُ عَشْرُ سِنِیْنَ وَفَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ ۔ (ابوداوَد)

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اس کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز کے لیے مارو اور ان کے بستر الگ الگ کر دو۔

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِوْ بْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّہٗ ذَکَرَ الصَّلٰوۃَ یَوْمًا فَقَالَ مَنْ حَافَظَ عَلَیْھَا کَانَتْ لَہٗ نُوْرًا وَ بُرْھَانًا وَ نَجَاۃً یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ مَنْ لَّمْ یُحَافِظْ عَلَیْھَا لَمْ تَکُنْ لَّہٗ نُوْرًا وَّلَا بُرْھَانًا وَلَا نَجَاۃً وَ کَانَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مَعَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ ھَامَانَ وَ اُبَیِّ بْنِ خَلَفٍ۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما، حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آپ نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، جس نے نماز کی پابندی کی تو نماز اس کے لیے ذریعہ نور، کمال ایمان کی دلیل اور سبب نجات ہوگی قیامت کے دن، اور جو نماز کی پابندی نہ کرے گا اس کے لیے نہ نور ہوگا، نہ دلیل ہوگی اور نہ نجات اور قیامت کے دن اس کا حشر قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ شَقِیْقٍ قَالَ کَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ لَا یَرَوْنَ شَیْئًا مِّنَ

الْاَعْمَالِ تَرْكُهٗ كُفْرٌ غَيْرِ الصَّلٰوةِ۔ (ترمذی شریف)

حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول ﷺ نماز کے سوا کسی عمل کے چھوڑنے کو کفر خیال نہ کرتے تھے۔

عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلّٰى سَجْدَتَيْنِ لَا يَسْهُوْ فِيْهِمَا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ (ترمذی شریف)

حضرت زید بن خالد جہنی نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس نے دو رکعت نماز، بغیر سہو کے ادا کی اللہ نے اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے۔

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلَّى الْعِشَآءَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَاَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ وَ مَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَاَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهٗ (مسلم شریف)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس نے نماز عشاء جماعت سے ادا کی، گویا اس نے نصف شب عبادت کی اور جس نے نماز فجر بھی جماعت سے ادا کی، گویا اس نے پوری رات عبادت میں گزاری۔

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ غَدَا اِلٰى صَلٰوةِ الصُّبْحِ غَدَا بِرَايَةِ الْاِيْمَانِ وَ مَنْ غَدَا اِلَى السُّوْقِ غَدَا بِرَايَةِ اِبْلِيْسَ۔ (ابن ماجہ)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام سے سنا کہ جو نماز فجر کے لئے چلا، وہ ایمان کا جھنڈا لے کر چلا اور جو بازار کی طرف (بلاضرورت) چلا وہ شیطان کا جھنڈا لے کر چلا۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَآءِ وَالصَّفِّ الْاَوَّلِ ثُمَّ لَمْ يَجِدُوْا اِلَّا اَنْ يَّسْتَهِمُوْا عَلَيْهِ لَاسْتَهَمُوْا وَ لَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي التَّهْجِيْرِ لَاسْتَبَقُوْا اِلَيْهِ وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَالصُّبْحِ لَاَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا (بخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر لوگ جان لیں کہ اذان اور صف اول میں کتنا ثواب ہے اور موقع نہ پائیں تو وہ اس کے لئے قرعہ اندازی کریں، اور اگر وہ نماز ظہر کا اجر جان لیں تو اس کی طرف سبقت کریں، اور اگر نماز فجر وعشاء کا ثواب جان لیں تو ان دونوں میں ضرور شریک ہوں، چاہے سرین کے بل گھسٹ کر آنا پڑے۔

نماز کے چند فوائد

نماز میں زکوٰۃ، روزہ، حج تمام عبادتوں کی روح موجود ہے۔ اس کی پابندی سے مسلمانوں میں نظم و نسق، باہمی محبت و

الفت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے- عام حالات میں بھی وقت کی پابندی کی عادت ہو جاتی ہے- ظاہری اور باطنی صفائی اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے-طبیعت شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مائل رہتی ہے- مال و دولت روزی اور روزگار میں برکت ہوتی ہے- بلاؤں اور مصیبتوں سے نجات حاصل ہوتی ہے-قلبی سکون وطمانیت کی نعمت ملتی ہے- چہرے پر نور ظاہر ہوتا ہے، دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت پیدا ہوتی ہے-غرضیکہ بے شمار دینی و دنیوی فائدے حاصل ہوتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ اس کو تمام عبادت پر اہمیت حاصل ہے،حتیٰ کہ مرد و عورت، جوان و بوڑھے،مسافر و مقیم،سب پر فرض ہے- روزہ صرف سال میں ایک مہینہ کا فرض ہے- اس میں بھی معافی کی صورتیں موجود ہیں- زکوٰۃ اور حج صرف دولت مند پر فرض ہے-لیکن نماز ہر ایک پر فرض ہے-صحت کی حالت میں بھی اور بیماری کی حالت میں بھی- کوئی کھڑے ہو کر ادا نہ کر سکے تو بیٹھ کر پڑھے، یہ بھی مشکل ہو تو اشاروں سے پڑھے،کوئی صورت معافی کی نہیں-تقوے کا کوئی مرتبہ، اللہ کے قرب کا کوئی مقام نماز کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا-لیکن افسوس کہ ہم ایسی اہم عبادت ہی سے سب سے زیادہ غافل رہتے ہیں، یہی ہمیں سب سے زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہے-حتیٰ کہ بہت لوگ ایسے ہیں جو رمضان میں روزے تو رکھتے ہیں، لیکن نماز نہیں پڑھتے ، نہ جانے کتنے مسلمان ایسے ہیں جن کا مدتوں سجدے میں سر نہیں جا پاتا-حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ”اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ“ یعنی گھروں میں نماز پڑھتے رہا کرو- وہ گھر جس میں نماز نہ پڑھی جائے، قبرستان کی طرح ہے اور گھر والے مُردوں کی طرح- آج ہمارے گھروں میں جھگڑے، بیماریاں نہ جانے کیا کیا الجھنیں ہیں- یقین کیجئے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ گھر والے بے نمازی ہیں، بے نمازی مسلمان نہایت ہی بدنصیب اور قابل نفرت ہے- اس میں اور کافر میں کوئی نشان امتیاز باقی نہیں رہتا، جس کو شیطان نے بے نمازی بنا دیا وہ شیطان کی سازشوں کا پوری طرح شکار ہو جاتا ہے، اس طرح کہ اسے ہر بُرے کام میں مزا آنے لگتا ہے- یہاں تک کہ اسے بُرائی کا احساس تک نہیں ہوتا اور اس کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ وہ بُرائی کو اچھائی یا اپنا کمال سمجھنے لگتا ہے، پس اللہ ہمیں نمازوں کی پابندی کی توفیق نصیب فرمائے-

شہید کا مرتبہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں شعور نہیں-

(البقرہ:۱۵۴)

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ (آل عمران:۱۶۹ تا ۱۷۱)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے، انہیں ہرگز مردہ مت سمجھو- بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں وہ خوش ہیں، اس پر جو انہیں اللہ نے اپنے فضل سے دیا، اور اپنے پچھلوں کے متعلق جو ابھی ان سے نہیں

ملے، یہ بشارت پا کر خوش ہوتے ہیں کہ ان پر (بھی) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ خوشیاں مناتے ہیں، اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر، اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

شہید کے معنی ہیں ''حاضر ہونا'' جو مسلمان بوقتِ ضرورت اسلام کی حفاظت کے لیے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر اپنی جان دینے کے لیے دشمنِ اسلام کے سامنے حاضر ہو گیا اور اپنی گردن کٹا دی، وہ شہید کہلاتا ہے۔ چونکہ اس نے کمالِ صبر، انتہائے صبر کا مظاہرہ کیا اور ثابت کر دکھایا کہ وہ صابر ہے۔ لہٰذا اللہ کا اس پر یہ کرم ہوا کہ اس کو اس فانی زندگی کے بدلے حیاتِ جاودانی ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی عطا فرما دی اور اس کے ایثار و قربانی کا اعتراف کرانے کے لئے زندوں پر پابندی لگا دی کہ وہ اس مقتولِ راہِ مولیٰ کو نہ زبان سے مردہ کہیں اور نہ ہی مردہ گمان کریں۔ عجیب بات ہے، جس کو ہماری نظروں کے سامنے قتل کیا گیا، ہم نے اس کا جنازہ پڑھا، ہم نے اس کو اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے، دوسرے مردوں کی طرح دفن کیا، پھر بھی ہم پر پابندی ہے کہ ہم اسے مردہ نہ کہیں، صرف یہی نہیں۔ بلکہ مردہ خیال بھی نہ کریں، کوئی عجب بات نہیں، جب تم اللہ پر ایمان لائے اور یہ بھی یقین کیا کہ زندگی اور موت دینے والا اللہ ہی ہے، تو جسے اللہ کے دشمنوں نے مار دیا اللہ نے اسے زندہ کر دیا، ایسا زندہ کہ اس کا جسم مٹی میں جا کر بھی محفوظ ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کو رزق بھی دیا جاتا ہے۔ دنیا والوں سے اس کا رابطہ بھی رہتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس کا چرچا بھی رہتا ہے، لیکن تمہیں نظر نہیں آتا۔ نظر کیوں نہیں آتا، اس لئے کہ تمہاری نظر محدود ہے۔ اس کائنات کی بہت سی مخلوق تمہیں نظر نہیں آتی۔ جن نظر نہیں آتے، فرشتے نظر نہیں آتے، تو کیا تم ان کے وجود کا انکار کر دو گے۔ اور جن کی قوتِ نظر کو اللہ نے زیادہ کیا ہے، انہیں جن بھی نظر آ جاتے ہیں، فرشتے بھی نظر آ جاتے ہیں، اسی طرح انہیں شہید بھی نظر آتے ہیں، وہ شہیدوں سے باتیں کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں، اولیاء اور صالحین کو نظر کی یہ قوت بخشی جاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ جب شہید زندہ ہے تو اس کے مال میں وراثت کیوں جاری ہوتی ہے، اس کی بیوہ سے نکاح کیوں جائز ہے۔ ایک تو اس لیے کہ شریعت کے احکام ظاہر حال پر نافذ ہوتے اور شہید کا ظاہر حال تو یہی ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں، دوسرے اس لیے کہ نئی اور بہتر چیز مل جانے کے بعد ہم بھی اپنی پرانی چیزوں کو تقسیم کر دیتے ہیں کہ اب وہ ہمارے لئے بیکار ہو جاتی ہیں۔ شہید اس دنیا سے جاتے ہی اللہ کے فضل و احسان سے جو عظیم نعمتیں حاصل کر لیتا ہے، ان کے مقابلے میں اس دنیا کی ان فانی نعمتوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اب نہ وہ اس مال کا محتاج رہا اور نہ اسے اس بیوی کی ضرورت رہی، لہٰذا یہ سب چیزیں ضرورت مندوں کو تقسیم کر دی جاتی ہیں۔

اس موقع پر یہ بات واضح کر دینا بھی مناسب ہے کہ شہید کا ترکہ تقسیم کر دیا جاتا ہے، اس کی بیوہ سے نکاح جائز ہے، جبکہ نبی کا ترکہ تقسیم نہیں ہوتا اور ان کی بیوہ سے نکاح کرنا بھی جائز نہیں۔ یہ اس لیے کہ حضور علیہ السلام نے خود ارشاد فرمایا کہ ''نبی کے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی بلکہ وہ امت کے لیے وقف ہوتا ہے'' اسی بناء پر خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کا چھوڑا ہوا ''فدک'' آپ کے اعزاء کے سپرد نہ کیا، بلکہ اس کی آمدنی بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا۔ یہ اس لیے کہ امت سے نبی کی انتہائی محبت ثابت ہو کہ نبی نے اپنے اعزاء، اقرباء کے لئے نہ کچھ جمع کیا اور نہ چھوڑا، جو

کچھ چھوڑا وہ بھی امت کو عطا فرما دیا اور نبی کی بیوہ سے نکاح جائز نہیں کہ یہی اس کی انتہائے عزت اور عظمت کا تقاضا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے نبی کی ازواج کو امت کی "مائیں" قرار دیا، تاہم امت سے پردے کا حکم باقی رکھا گیا کہ یہ بھی عزت و احترام کا ذریعہ ہے، گویا مقصود امت سے نبی کا احترام کرانا ہے۔

بہرحال شہید زندہ ہے، یا تو اس طرح کہ اس کا یہی جسم محفوظ رہتا ہے، اللہ کے حکم سے زمین اس کے جسم کو خراب نہیں کر پاتی جیسے نار نمرود، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بال تک نہ جلا سکی اور یا، اللہ شہید کو مثالی جسم عطا فرما دیتا ہے یا اس کی روح جنت کے پرندوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ علماء کرام نے یہ سب صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ حقیقت حال اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے۔ ہمیں اس کے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہم اس حکم کی تعمیل کے مکلف ہیں جو ہمیں دیا گیا یعنی" شہید کو نہ مردہ کہو اور نہ مردہ گمان کرو" پس ہمارا یہی ایمان ہے، یہی عقیدہ ہے اور ہمیں اس پر پورا پورا یقین ہے کہ اللہ کے ارشاد سے زیادہ یقین کے لائق اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔

شہید پر انعامات

اللہ شہید کو بے شمار انعامات سے نوازتا ہے۔ جس کا آغاز میدان جنگ سے یا اس وقت سے ہی ہو جاتا ہے، جب وہ اسلام کی حفاظت کے لیے دشمن کے مقابلہ پر آتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ شہادت جنت میں پہنچنے کی ایک سواری ہے، جونہی میں اس پر سوار ہوا جنت کا دروازہ میرے لیے کھلا ہوگا اور یہی حقیقت ہے۔ اسی لئے اللہ کے اس سپاہی کو نہ دشمن کی تعداد کی پرواہ ہوتی ہے نہ قوت و طاقت کی، اس کی نظریں ان چیزوں پر تو پڑتی ہی نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے جنت اس دنیا ہی میں نظر آ رہی ہے۔ شوق شہادت کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو، جو غزوہ احد میں پیش آیا۔

عَنْ جَابِرٍ رضی اللّٰه عنه قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ اُحُدٍ اَرَاَيْتَ اِنْ قُتِلْتُ فَاَيْنَ اَنَا قَالَ فِي الْجَنَّةِ فَاَلْقٰى تَمَرَاتٍ فِيْ يَدِهٖ ثُمَّ قَاتَلَ حَتّٰى قُتِلَ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ احد کی لڑائی کے دن ایک سپاہی نے نبی کریم ﷺ علیہ السلام سے عرض کیا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا، آپ نے فرمایا جنت میں (یہ سن کر) اس شخص نے اپنے ہاتھوں سے کھجوریں پھینکیں (جنہیں وہ کھا رہا تھا) میدان جنگ میں کود پڑا، خوب لڑا حتی کہ شہید ہو گیا (اور مراد کو پہنچا)

پھر شہید پر اللہ تعالیٰ اس وقت انعام فرماتا ہے، جب دشمن اس کو زخمی کرتا ہے، گردن کاٹتا ہے، کبھی اس کو مثلہ کرتا ہے، کبھی اس کی لاش کو گھوڑوں سے روندتا ہے۔ ظاہر ہے دیکھنے والے یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھتے ہیں کہ ہمارے بھائی کو کتنی تکلیف ہو رہی ہے، لیکن مخبر صادق ﷺ بتاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں مصیبتیں اٹھانے والے کو وہ تکلیف بالکل نہیں ہو رہی جس کا اندازہ تم اس کی ظاہری حالت سے لگا رہے ہو، اس پر تو اللہ کا خاص انعام ہے، اس کا تو یہ حال ہے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلشَّهِيْدُ لَا يَجِدُ اَلَمَ الْقَتْلِ اِلَّا كَمَا يَجِدُ اَحَدُكُمْ اَلَمَ الْقَرْصَةِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا شہید کو قتل کی صرف اتنی سی تکلیف محسوس ہوتی ہے جتنی تم میں سے کسی کو چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔(ترمذی شریف)

گویا جس طرح ایک مریض کا آپریشن کیا جاتا ہے تو اس کے مقام آپریشن کو دوا کے ذریعہ ایسا سُن کر دیا جاتا ہے کہ ہڈی تک کاٹ دی جاتی ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ شہید کا جسم سُن تو نہیں ہوتا لیکن اس پر اللہ اور اس کے رسول کے عشق کا نشہ اور جنت کا شوق ایسا طاری ہوتا ہے کہ اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ناز و نعم سے پالے ہوئے، نرم و نازک جسم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اور عشق و اشتیاق میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ اس کی نظیر قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں موجود ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کی عورتوں کے سامنے تشریف لائے تو وہ آپ کے نظارۂ حسن میں ایسی مست ہوئیں کہ انہوں نے پھلوں کے بجائے چھریوں سے اپنی انگلیوں کو کاٹ ڈالا اور انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ شہید پر اللہ تعالیٰ کا یہ انعام، ہمیں پیغام دے رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں سے نہ گھبراؤ، کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے، اپنے دین کے خادموں، سپاہیوں کے لیے ظاہری مصیبت کو راحت و رحمت میں تبدیل فرما دیتا ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کریم کے اس ارشاد کا "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا"۔

جس مؤمن نے اللہ کی راہ میں اپنی گردن تک کٹا دی، واقعی اس نے ایمان کی صورت میں اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کر دکھایا۔ اس سے زیادہ، اللہ کے خصوصی فضل و کرم کا کون مستحق ہے۔ مخبر صادق ﷺ بتاتے ہیں کہ اللہ اپنے اس جانثار کو کس طرح اپنے انعامات سے نوازتا ہے۔

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْ کَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لِلشَّھِیْدِ عِنْدَاللّٰہِ سِتُّ خِصَالٍ یُغْفَرُ لَہٗ فِیْ اَوَّلِ دُفْعَۃٍ وَ یُرٰی مَقْعَدَہٗ فِی الْجَنَّۃِ وَ یُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ یَاْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْاَکْبَرِ وَ یُوْضَعُ عَلٰی رَاْسِہٖ تَاجُ الْوَقَارِ اَلْیَاقُوْتَۃُ مِنْھَا خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا وَیُزَوَّجُ ثِنْتَیْنِ وَ سَبْعِیْنَ زَوْجَۃً مِّنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ وَ یُشَفَّعُ فِیْ سَبْعِیْنَ مِنْ اَقْرِبَائِہٖ۔

حضرت مقداد بن معدی کرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، شہید کیلئے اللہ کے پاس چھ خصوصی انعام ہیں۔ خون کا پہلا ہی قطرہ گرتے ہی اس کی مغفرت ہو جاتی ہے اور جنت میں اس کا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے اور اسے عذاب قبر سے محفوظ رکھا جائے گا، بڑی گھبراہٹ سے (قیامت کے دن) امن میں رہے گا، اس کے سر پر وقار کا ایسا تاج رکھا جائے گا، جس کا یاقوت، دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہوگا۔ اس کے نکاح میں بڑی آنکھوں والی بہتر (۷۲) خوبصورت حوریں دی جائیں گی، اور اس کے عزیزوں میں سے ستر افراد کے لیے اس کی شفاعت قبول کی جائے گی (ترمذی شریف)

شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اس کو بخش دیا جائے گا۔ ظاہر ہے جب بخشش ہوگی تو اس وقت جبکہ ہر شخص کو اپنے حساب و کتاب کی فکر ہوگی، شہید مطمئن ہوگا کہ وہ تو بغیر حساب و کتاب ہی کے نہ صرف جنتی ہو چکا ہے بلکہ جنت میں اپنا

ٹھکانہ بھی دیکھ چکا ہے- اب تو بس داخل ہونے کی دیر ہے- یہاں ایک اہم بات قابل توجہ یہ ہے کہ شہید پر ایک انعام یہ ہوگا کہ اس کی شفاعت اپنے عزیزوں کے لیے مقبول ہوگی، جن کی تعداد یہاں ستر فرمائی گئی، جبکہ ایک دوسری حدیث میں اسّی ۸۰ کی تعداد بیان کی گئی ہے- دونوں حدیثوں میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ تعداد بتانے کا مقصد یہ نہیں کہ صرف اتنے ہی افراد کے لیے شفاعت قبول ہوگی، یہ صرف ایک اندازہ ہے کہ شہید ۷۰ یا ۸۰ یا جتنوں کی اللہ چاہے شفاعت کرے گا اور اللہ قبول فرمائے گا- اصل بات قابل غور یہ ہے کہ شہید کو یہ حق کیوں دیا گیا، تو ایک تو اس لئے کہ یہ بھی دیگر اعزازات کی طرح ایک بڑا اعزاز ہے کہ شہید بہت سوں کی سفارش کر سکے گا- جس طرح ایک بادشاہ بطور اعزاز اپنے کسی مقرب و محبوب یا وزیر کو اپنی مملکت میں کچھ خصوصی اختیارات دے دیتا ہے، دوسرا یہ کہ شہید کے، اللہ کی راہ میں قتل ہونے سے، آخر اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی، بچوں اور دیگر اعزاء واقرباء اور احباب کو بھی تو کچھ تکلیف پہنچی، انہوں نے بھی تو اس پر صبر کیا اور یہ صدمہ برداشت کیا- پس ان کا بھی کچھ حق بنتا ہے کہ اس آزمائش پر صبر کا کچھ اجر وثواب انہیں بھی دیا جائے- پس جس کے ذریعہ تکلیف پہنچی اسی کے ذریعہ اجر بھی دیا جائے گا- جن کی تعداد عام طور پر مذکورہ بالا ہی ہوسکتی ہے جو میرے آقا ﷺ نے بیان فرمائی- گویا یہ بتایا گیا کہ شہید اپنے جملہ متعلقین کی بخشش کا وسیلہ بن جاتا ہے- میرے آقا ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے ایک طرف تو شہید کی عظمت کو ظاہر فرمایا اور دوسری طرف اس کے پسماندگان کی نہایت ہی احسن طریقے سے ہمت افزائی فرمائی، کہ جس خاندان کا فرد اللہ کی راہ میں شہید ہوا ہے، اس خاندان کے لوگ ہمت کریں، مزید جہاد میں حصہ لیں کہ ان کے شہداء، ان کے لئے بھی نجات کا ذریعہ ہیں- پس شہادت، اللہ کا ایسا عظیم انعام ہے کہ اس سے سر کٹانے والوں کے مراتب بھی بلند ہوتے ہیں اور اس پر صبر کرنے والے بھی اللہ کے خصوصی فضل وکرم کے مستحق قرار پاتے ہیں- اسی لئے صحابہ کرام، شہادت کی دعا کیا کرتے تھے اور ہر نیک مومن کے دل میں اس کی آرزو ہوتی ہے اور ہونا چاہیے کہ جس طرح ہم دنیا کی دوسری نعمتوں کے لیے تڑپتے اور اللہ سے دعائیں کرتے ہیں، اسی طرح شہادت کی تمنا کرنا اور اس کی دعا کرنا چاہیے، کہ یہ واقعی بڑی نعمت ہے، بڑا اعزاز ہے- اسی لئے میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ مَنْ لَقِیَ اللّٰهَ بِغَيْرِ اَثَرٍ مِّنْ جِهَادٍ لَقِیَ اللّٰهُ وَ فِيْهِ ثُلْمَةٌ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص اللہ سے ملے اور اس پر جہاد کا کوئی نشان نہ ہو، تو وہ نقصان ہی میں ہے- (ابن ماجہ)

شہید اور حقوق العباد

بلاشبہ شہادت گناہوں کو مٹا دیتی ہے، لیکن شہادت یا اس قسم کے دیگر اعمال جو گناہوں کی بخشش کا ذریعہ قرار دیئے گئے ہیں، صرف ان گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہوتے ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے- مثلاً نماز نہ پڑھنے کا گناہ، زکوٰۃ نہ دینے کا گناہ، حرام کھانے پینے کا گناہ، ایسے گناہوں کو حج مٹا دیتا ہے اور اگر شہادت نصیب ہو جائے تو یقیناً ان سے بھی بڑے بڑے گناہ بخش دیئے جائیں گے، لیکن وہ گناہ جن کا تعلق بندوں سے ہے وہ نہ کسی عمل سے بخشے جاتے ہیں اور نہ ہی ان کو اللہ

معاف کرتا ہے، جب تک کہ بندہ خود بندے کو معاف نہ کر دے، اور اگر کسی نے معاف نہ کیا، تو اسے اللہ حق تلفی کرنے والے کی نیکیوں سے اس کا حق دلائے گا، ایسے حقوق کو حقوق العباد کہا جاتا ہے، ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ شہید نے کتنی بڑی قربانی کی کہ اللہ کے لیے اپنی گردن تک کٹا دی، اور اللہ نے بھی اس کو پورا پورا اجر و ثواب عطا فرمایا اور اس کے مرتبوں کو بلند کیا۔ لیکن حقوق العباد اس سے معاف نہ ہوں گے۔ جب تک کہ اہل حق اس کو معاف نہ کر دیں۔ ملاحظہ فرمایئے میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ الْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ يُكَفِّرُ كُلَّ شَیْءٍ اِلَّا الدَّیْنَ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا، اللہ کی راہ میں مارا جانا تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے، سوائے قرض کے۔ (مسلم)

کسی سے قرض لے کر ادا نہ کرنا، اپنے مسلمان بھائی کی حق تلفی اور اس کا مال غصب کر کے اس کو تکلیف پہنچانا، شعبہ حقوق العباد کا ایک جرم ہے۔ جس کی معافی کا ذریعہ شہادت بھی نہ بن سکی، یہی حال تمام حقوق العباد کا ہے۔

شہید کی آرزو

شہادت کی لذت پالینے والا، شہید کی عظمت کو جان لینے والا، جنت میں جانے کے بعد بھی دنیا میں آنے اور بار بار اللہ کی راہ میں گردن کٹانے کی آرزو کرے گا۔ مخبر صادق ﷺ کی خبر ملاحظہ ہو۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَامِنْ اَحَدٍ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ اَنْ يَّرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا وَ لَهٗ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَیْئٍ اِلَّا الشَّهِيْدُ يَتَمَنّٰى اَنْ يَّرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جنت میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص دنیا میں، اس لالچ میں بھی آنا پسند نہ کرے گا کہ زمین کی ہر چیز اسے مل جائے مگر شہید، اس کی تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس جائے اور دس مرتبہ شہید کیا جائے کہ وہ شہادت کی عظمت جان چکا ہے۔
(بخاری و مسلم)

شہید کی قسمیں

شہید حقیقی، وہ لوگ جو جہاد میں اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، جیسے غزوہ بدر، غزوہ احد وغیرہ کے شہداء یا شہداء کربلا جو کافروں کے ہاتھوں نہیں بلکہ دشمنان اسلام کے ہاتھوں قتل ہوئے یا ہمارے دور میں کشمیر، افغانستان، ہندوستان وغیرہ کے مسلمان۔ شہید حقیقی کو نہ غسل دیا جاتا ہے، نہ کفن، وہ نماز جنازہ کے بعد اسی طرح خون میں لت پت دفن کر دیا جاتا ہے۔ جب وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا تو اس کے زخموں سے خون بہتا ہوگا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو فرشتوں نے غسل دیا کیونکہ وہ ناپاکی کی حالت ہی میں میدان جہاد میں آ گئے تھے، یہ غسل جنابت تھا، غسل موت نہیں، تو شہداء جب اللہ کے

دربار میں حاضر ہوں گے، ان کے جسموں سے خون بہتا ہوگا، جیسا کہ میرے آقا ﷺ نے بتایا۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا یُکْلَمُ اَحَدٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ یُّکْلَمُ فِیْ سَبِیْلِهٖ اِلَّا جَآءَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ جُرْحُهٗ یَثْعَبُ دَمًا اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالرِّیْحُ رِیْحُ الْمِسْکِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی کیا گیا، اور اللہ خوب جانتا ہے اس شخص کو، جو اس کی راہ میں زخمی کیا گیا، وہ اللہ کے دربار میں قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے زخموں سے خون جاری ہوگا جس کا رنگ خون جیسا ہی ہوگا، لیکن خوشبو مشک کی سی ہوگی۔ (بخاری و مسلم)

شہید حکمی، وہ لوگ ہیں جو اگرچہ بظاہر قتل نہیں کیے گئے، لیکن صاحب شریعت ﷺ نے اپنے رب کے عطا کردہ اختیار سے انہیں بھی، زمرہ شہداء میں شامل فرمایا، یہ آقا کی عطا ہے، جس غلام کو جو چاہیں دے دیں، آپ فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ مَالِکٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ فَصَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمَاتَ اَوْ قُتِلَ اَوْ وَقَصَهٗ فَرَسُهٗ اَوْ بَعِیْرُهٗ اَوْ لَدَغَتْهُ هَامَّةٌ اَوْ مَاتَ عَلٰی فِرَاشِهٖ بِاَیِّ حَتْفٍ شَآءَ اللّٰهُ فَاِنَّهٗ شَهِیْدٌ وَ اِنَّ لَهُ الْجَنَّةَ۔

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام کو فرماتے سنا، جو شخص اللہ کی راہ میں نکلا اور مر گیا یا مارا گیا، یا اس کے گھوڑے نے اس کو کچل ڈالا، یا اس کے اونٹ نے کچل دیا، یا کسی زہریلے جانور نے کاٹ لیا، یا اپنے بستر پر مر گیا، اللہ کی مرضی کے مطابق کسی بھی طرح مرا، وہ شہید ہے اور بیشک اس کے لیے جنت ہے۔ (ابوداؤد)

کتنے ہی صحابہ کرام ایسے ہیں، جو تمام غزوات میں شریک رہے، حضور علیہ السلام کے بعد بھی وہ اسلام کی حفاظت و اشاعت کے لیے دشمنوں سے لڑتے رہے اور جہاد کرتے رہے، انہیں میدان جنگ میں قتل ہونے کی آرزو ہی رہی۔ وقت آیا تو بستر پر موت آئی۔ حضرت عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ لشکر اسلام کے عظیم جرنیل ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک مصروف جہاد رہے۔ ۱۸ ہجری میں شام میں طاعون کی وبا پھیلی، اسی سے آپ کا وصال ہوا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، سیف اللہ، اللہ کی تلوار کہلاتے تھے، سو سے زیادہ جنگیں لڑیں، جسم مبارک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں تلوار یا نیزے کا نشان نہ ہو، لیکن میدان کارزار میں شہید ہونے کی آرزو ہی رہی۔ ۲۱ ہجری میں حمص میں بستر مرگ پر دنیا سے رخصت ہوئے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نوے برس کی طویل عمر پائی، غزوات میں بھی شریک ہوئے اور چاروں خلفاء کا دور پایا۔ ہر بڑی مہم کے سربراہ رہے۔ فاتح مصر مشہور ہوئے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں ۴۳ ہجری میں بیمار ہو کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہی حال بہت سے صحابہ کا رہا۔ لیکن آپ ان حضرات کو شہادت سے محروم ہرگز قرار نہیں دے سکتے، کہ نبی مکرم ﷺ نے شہید کا دائرہ اتنا وسیع فرمایا کہ اس میں یہ حضرات ہی نہیں، بلکہ ہر وہ مسلمان

داخل ہے جو شہادت کی آرزو رکھتا ہو- اور اسی آرزو میں مرجائے- طالب علم، طلب علم میں مرے، عالم دین، تبلیغ دین میں مرے، طاعون، ہیضہ اور دیگر وبائی امراض میں مبتلا ہو کر، کوئی مسلمان مرے- ڈوب کر مرنے والا، جل کر مرنے والا، آسمانی آفت میں مبتلا ہو کر مرنے والا، دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مرنے والا، عورت بچہ کی پیدائش کے دوران مر جائے، کنواری عورت مری یہ سب لوگ شہید ہی کے دائرہ میں شامل ہیں-

دائرۂ شہادت

حضور علیہ السلام نے اپنی محبوب امت کو عظمت شہادت سے سرفراز فرمانے کے لیے اس کا دائرہ کتنا وسیع فرمایا اس کا اندازہ درج ذیل چند ارشادات سے کیجئے-

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَتِیْکٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلشَّهَادَةُ سَبْعٌ سِوَی الْقَتْلِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَلْمَطْعُوْنُ شَهِیْدٌ وَّالْغَرِیْقُ شَهِیْدٌ وَّ صَاحِبُ ذَاتِ الْجَنْبِ شَهِیْدٌ وَالْمَبْطُوْنُ شَهِیْدٌ وَصَاحِبُ الْحَرِیْقِ شَهِیْدٌ وَّالَّذِیْ یَمُوْتُ تَحْتَ الْهَدْمِ شَهِیْدٌ وَالْمَرْاَةُ تَمُوْتُ بِجُمْعٍ شَهِیْدٌ-

حضرت جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے کے علاوہ بھی شہادت کے سات ذریعہ ہیں، طاعون سے مرنے والا شہید ہے، ڈوب کر مرنے والا شہید ہے، ذات الجنب کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے، ہیضہ سے مرنے والا شہید ہے، جل کر مرنے والا شہید ہے اور کسی چیز سے دب کر مرنے والا شہید ہے اور جو عورت بحالت زچگی مرے وہ بھی شہید ہے- (ابوداؤد)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَوْتُ غُرْبَةٍ شَهَادَةٌ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، سفر میں مرنا شہادت ہے- (ابن ماجہ)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَاتَ مَرِیْضًا مَاتَ شَهِیْدًا وَّ وُقِیَ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَ غُدِیَ وَ رِیْحَ عَلَیْهِ بِرِزْقِهٖ مِنَ الْجَنَّةِ-

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس کی موت حالت مرض میں ہو وہ شہید ہے، اور عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے اور اس کو جنت سے رزق دیا جاتا ہے، اور اس کو جنت کے رزق کی مہک سونگھائی جاتی ہے- (ابن ماجہ)

ہمارا ایمان ہے کہ نبی مکرم علیہ السلام نے جس کو جنتی فرما دیا وہ یقیناً جنتی ہے اور آپ جس کو شہید قرار دے دیں، وہ بلاشبہ شہید ہے- جن لوگوں کو حقیقی شہادت نصیب ہوئی بلاشبہ ان کے مراتب حکمی شہادت پانے والوں سے بہت بلند ہیں، اور ہونا بھی چاہئیں کہ انہوں نے تو بہت ہی بڑی قربانی دی ہے، لیکن ہم جیسے گناہگاروں کے لیے یہ مژدہ کیا کم ہے کہ ہماری بخشش

ومغفرت کا ایک سہارا موجود ہے، نیز حضور علیہ السلام کے یہ ارشادات ہمارے لئے صبر کو آسان بنانے کا ذریعہ ہیں، کہ کسی آفت ومصیبت میں مبتلا ہوکر ہمارے محبوب اعزاء واقرباء میں سے کسی کی موت واقع ہوتی ہے تو ہم اناللہ پڑھتے اور یہ یقین کر کے صبر کا اجر پالیتے ہیں کہ مرنے والا جنتی ہے، شہید ہے،

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میرے برادر خورد، مفتی سید شجاعت علی قادری رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ایک دینی سفر کے دوران جکارتہ میں ہوا، مجھے ہالینڈ میں اس کی اطلاع ملی، جس نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ شاید میں کسی عارضہ میں مبتلا ہوسکتا تھا، لیکن میرے ایک رفیق عالم دین نے مجھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مندرجہ بالا حدیث سنائی، سنتے ہی میری کیفیت بدل گئی، اب تک نڈھال تھا اور اب اچانک ایک سرور اور فخر سا محسوس کرنے لگا کہ مجھ گناہگار کا بھائی شہید ہوا ہے، ضرور اللہ اس کے صدقہ میں، اس کے وسیلے سے میری بھی بخشش فرمادے گا - یقین جانیئے، دین کا جاننا اور اس پر یقین کرنا، زندگی کے ہر مرحلہ کو آسان کردیتا ہے، کہ یہ دین دینِ رحمت ہے - اس کی کتاب قانونِ رحمت ہے، اس کا رسول نبی رحمت ہے، یہاں رحمت کے سوا کچھ نہیں - پس اس سے وابستگی ذریعہ راحت ہے، بہرحال میدان شہادت بہت وسیع ہے، کسی نہ کسی طرح ہر مومن یہ شرف پاسکتا ہے، حتیٰ کہ مذکورہ ذرائع میں سے کوئی ذریعہ اگر کسی کو نہ نصیب ہو تو اس کے لئے بھی مژدہ رحمت موجود ہے، وہ یہ کہ ہر مومن دل میں شہادت کی سچی تمنا اور تڑپ رکھے، اب وہ کسی بھی حال میں مرے گا شہید ہی کا مرتبہ پائے گا، کہ نبی رحمت ﷺ فرماتے ہیں۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَآءِ وَ اِنْ مَّاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جو شخص اللہ سے سچے دل سے شہادت طلب کرتا ہے، اللہ اس کو شہید کا مرتبہ عطا فرمادیتا ہے، اگرچہ وہ اپنے بستر پر مرے۔ (ابن ماجہ)

غرضیکہ شہادت ایسی عظمت ہے جو دنیا وآخرت کی عزت کا ذریعہ ہے، قرآن وحدیث نے اس کو حیات جاودانی کا ذریعہ بنایا، اس کے فضل وشرف نے اہل اسلام میں جوش جہاد پیدا کیا جو اسلام کی حفاظت اور عظمت کا ذریعہ بنا - اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اسلاف کرام، جذبہ شہادت میں مست ہوکر، اپنی گردنیں نہ کٹاتے تو آج ہم اسلام کے وارث نہ ہوتے اللہ ان حضرات کو ہماری طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ ایسی رسم ڈال گئے جس سے آج اسلام کا باغ سیراب ہو رہا ہے کہ ہر دور میں مسلمان اسلام کی حفاظت کے لئے گردنیں کٹاتے رہتے ہیں کہ

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

قاتل ومقتول جنت میں

ایک نہایت ہی پرلطف حدیث شریف پڑھئے اور سرور حاصل کیجئے -

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَضْحَكُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى

رَجُلَيْنِ يَقْتُلُ اَحَدُهُمَا الْاٰخَرَ يَدْخُلَانِ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُ هٰذَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلُ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَى الْقَاتِلِ فَيَسْتَشْهِدُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ایسے دو شخصوں پر ہنستا ہے جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے اور پھر دونوں جنت میں داخل ہوتے ہیں، ایک اللہ کی راہ میں جہاد کرتا اور قتل کر دیا جاتا ہے، پھر قاتل توبہ کر لیتا اور وہ بھی کسی جہاد میں شہید ہو جاتا ہے۔

(بخاری و مسلم)

کیسی عجیب لیکن پیاری بات ہے۔ قاتل و مقتول دونوں شہید، دونوں جنتی۔ دنیا میں ایک نے دوسرے کی جان لے لی اور اس جہان میں دونوں ایک جگہ یہ کرشمہ قدرت ہے جس پر قادر خود بھی ہنستا ہے، جیسا بھی ہنسنا اس کی شان کے لائق ہے۔ میرے آقا ﷺ نے وہ بات بیان فرمائی جو عام ذہن میں نہیں آتی۔ سوچئے یہ کیسے ہوا، بات بڑی آسان ہے۔ ایک نے رحمت کے دامن میں پناہ لی اور اسی کے اشارے پر جان دے دی، پھر قاتل کو کہیں پناہ نہ ملی تو وہ بھی اسی دامن سے وابستہ ہو گیا اور اس نے بھی اپنے مقتول کی طرح تعمیل کی اور جان دے دی۔ بس دونوں ہی شہید کہلائے۔ ایک جگہ پہنچ گئے۔ بطور مثال ابوجہل کے بیٹے عکرمہ، جنہوں نے اسلام کو سخت نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، غزوہ بدر سے لے کر فتح مکہ تک ہر جنگ میں مسلمانوں کے مقابلہ پر آئے، ایک وہ نہیں نہ جانے کتنوں کے قاتل تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے بعد صرف چار مردوں اور دو عورتوں کے لئے اعلان فرمایا تھا کہ یہ جہاں ملیں قتل کر دیے جائیں، ان میں عکرمہ بھی تھے۔ لیکن ان کا مقدر چمکا اور کسی نہ کسی طرح دامن رحمت میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نقصان کی تلافی کی فکر میں رہتے تھے، جو کفر کی طویل مدت میں کر چکے تھے۔ حالانکہ اسلام تو خود ہی ایسا زود اثر ہے کہ اس کا کلمہ ہی پڑھنے سے ماضی کے سارے داغ صاف ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے عکرمہ جیسے کتنے دشمن آن واحد میں صحابیت کے بلند درجے پر پہنچ گئے۔ یہ میرے آقا ﷺ کی ضیاء پاشی ہے کہ جو حلقہ بگوش اسلام ہوا وہ ایک نظر میں اس مقام پر پہنچے، جہاں ساری زندگی عبادت کرنے والے متقی اور زاہد نہیں پہنچ سکتے۔ بہرحال عکرمہ مسلمان ہوئے، دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ نبی مستجاب الدعوات ﷺ نے ان کے لئے دعائے مغفرت کی، تاہم وہ تلافی ماضی کی غرض سے اسلام کی ہر خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ صحابہ کبھی کبھی ان کو ابن عدو اللہ، اللہ کے دشمن کا بیٹا کہہ کر طعنہ زنی کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپ نے ایک خصوصی خطبہ ارشاد فرمایا، اور فرمایا کہ کسی کافر کی وجہ سے کسی مسلمان کا دل نہ دکھاؤ۔ یعنی ابوجہل کافر کا بیٹا اب تمہارا مسلمان بھائی ہے، اس کا دل کیوں دکھاتے ہو، سوچئے، ہے کوئی ایسا مذہب یا قانون جو اس طرح دشمنوں کو اپناتا ہو۔ اب حضرت عکرمہ ہر طرح اسلام کی خدمت کر رہے تھے، لیکن کافروں کو قتل کرنے اور خود مقتول ہونے کی تڑپ نے مضطرب کر رکھا تھا۔ موقع کے متلاشی رہتے تھے جو حضور علیہ السلام کی زندگی میں میسر نہ آ سکا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور خلافت آیا تو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ خوب جہاد کیا، اکثر جنگوں میں سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ بالآخر جنگ یرموک میں آپ کی آرزو پوری ہوئی اور شہید ہوئے۔ حالت کفر میں مسلمانوں کو شہید کرتے رہے اور اب خود شہید ہوئے۔

جنت میں شہیدوں کے ساتھ ہیں- زندہ ہیں، قدرت اپنے کرشمہ سازی پر مسکرا رہی ہے-

''اے اللہ، ہمیں بھی اپنی راہ میں شہید ہونے کا شرف نصیب فرما'' آمین

ابتلاء یا آزمائش

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، تھوڑے سے ڈر اور بھوک اور (تمہارے) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے، اور خوشخبری سنا دیجئے، ان صبر کرنے والوں کو کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچے، تو کہیں بیشک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں- وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے رحمتیں ہیں اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔ (البقرہ:۱۵۵ تا ۱۵۷)

ابتلاء و آزمائش مؤمن کا مقدر ہے کہ ہر ایمان والا کلمہ پڑھ کر اللہ سے سودا کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اللہ کا ہو گیا، اس کے بدلے اللہ کی طرف سے اسے جنت دی جائے گی-

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ ۭ (التوبہ:۱۱۱)

بیشک اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جان و مال کو، ان کے لئے جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے-

پس اللہ آزماتا ہے کہ کون اپنے وعدے پر قائم ہے، جس نے وعدہ سچا ثابت کر دکھایا وہ جنت کا ضرور مستحق ہوگا، پس مؤمن صرف ایمان کو ذریعہ جنت و نجات نہ سمجھے، بلکہ ہر قسم کی آزمائش کے لئے تیار رہے، اللہ کی سنت مبارکہ یہی ہے-

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ (العنکبوت:۲)

کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ وہ اتنا کہنے سے چھوڑ دیئے جائیں گے، کہ ہم ایمان لائے، اور وہ آزمائے نہ جائیں گے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (العنکبوت:۲، ۳)

اور بیشک ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو آزمایا تو، اللہ (اس آزمائش سے) ضرور ظاہر کر دے گا، ان لوگوں کو جو (اپنے وعدے میں) سچے ہیں، اور ضرور ظاہر کر دے گا ان لوگوں کو جو (اپنے وعدے میں) جھوٹے ہیں۔

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور علیہ السلام، کعبہ کے سایہ میں اپنی چادر سے تکیہ لگائے تشریف فرما تھے، کہ ہم خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم پر مصائب کی انتہا ہو گئی، کیوں نہیں آپ ہمارے لئے دعا فرما دیتے کہ ان مصائب سے اللہ ہمیں نجات عطا فرما دے- حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ مصیبتیں صرف

تم ہی نہیں برداشت کررہے، بلکہ تم سے پہلے کفار کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مومن کو پکڑتے، اس کے لئے گڑھا کھودتے اور اس میں اس کو کمر تک گاڑ دیتے تھے، پھر آری لاکر، اس کے سر پر چلائی جاتی اور کاٹ کر اس کے دو حصے کر دیئے جاتے۔ بعض پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتیں، ان کے گوشت اور ہڈیوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا جاتا، اس کے باوجود وہ مؤمن اپنے دین پر ثابت قدم رہتے۔ اے خباب، اللہ کی قسم یہ دین ہر طرف پھیلے گا، اس کے سایہ میں اتنا امن وامان ہوگا کہ صنعاء سے چل کر، ایک شخص حضر موت تک سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا،"ولکنکم تستعجلون"، لیکن تم جلد بازی سے کام لیتے ہو۔

انبیاء کرام اور ابتلاء

مومن کے لئے ابتلاء وآزمائش فیصلہ الٰہی ہے، جس سے گریز ممکن نہیں۔ اس کا آغاز انسان اول کی پیدائش ہی کے وقت سے ہوا کہ حضرت آدم کو آزمایا گیا، تمام ہی انبیاء اور ان کی امتوں پر ابتلاء کا وقت آتا رہا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا،

اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ (البقرہ:۱۲۴)

اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے، کئی باتوں سے آزمایا تو انہوں نے وہ سب پوری کر دیں۔ اللہ نے فرمایا، بیشک میں آپ کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں (ابراہیم نے کہا، اور میری اولاد سے (بھی) فرمایا، ظالموں کو میرا عہد نہیں پہنچتا۔

جن باتوں سے اللہ نے اپنے خلیل کو آزمایا، انہیں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا۔ خاص طور پر ذبح اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓـؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾ (الصفت:۱۰۶)

یقیناً، یہ کھلی آزمائش ہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدائش سے آخر وقت تک مختلف طریقے سے آزمائے جاتے رہے۔ فرمایا گیا:۔

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا۔ (طٰہٰ:۴۰)

(اے موسیٰ) آپ نے ایک شخص کو قتل کر دیا، تو ہم نے آپ کو غم سے نجات دی، اور ہم نے آپ کو (مختلف طریقوں سے) خوب اچھی طرح آزمایا۔

ان کی قوم بنی اسرائیل کے متعلق ارشاد ہوا۔

وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ (الاعراف:۱۴۱)

اور (اے بنی اسرائیل یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی کہ وہ تمہیں برا عذاب

دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیتے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے- اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔

علاوہ ازیں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کے واقعات، قوم عاد، قوم ثمود پر عذاب کا نازل ہونا، حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری، مال واولاد کا ہلاک ہو جانا، حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کا نگل جانا اور اسی قسم کے دیگر واقعات جو قرآن کریم نے بیان فرمائے، اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ابتلاء وآزمائش ہوتی ہے، ضرور ہوتی ہے- اللہ نے انبیاء ومرسلین کو آزمایا تاکہ امتیوں کے لیے ابتلاء وآزمائش سے گزرنا آسان ہو جائے اور سنت انبیاء قرار پائے- وہ اولیاء و صلحاء کو آزماتا ہے تاکہ ان کے مراتب بلند سے بلند تر ہوں- عام مومنین کو آزمایا جاتا ہے تاکہ ان کے گناہوں کی تلافی ہو، ذریعہ مغفرت ونجات ہو- باغیوں اور بدکرداروں کو آزمایا جاتا ہے تاکہ آنے والوں کے لئے درس عبرت مہیا ہو- دعا یہی کرنی چاہیے کہ اللہ ہمیں ہر آزمائش سے محفوظ رکھے کہ ہم کمزور ہیں، قوت برداشت نہیں رکھتے- آمین

حضور نبی آخرالزماں ﷺ ابتلاء وآزمائش میں مبتلا کئے گئے اور آپ کی آزمائش آپ کے بلند مرتبے کے مطابق ،انبیاء سابقین کی نسبت سب سے زیادہ ہوئی کہ زندگی کا ایک لمحہ بھی اس سے خالی نہ رہا- جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں مختصراً بیان کر آئے ہیں اور ان مصائب پر میرے آقا ﷺ کا جو ردعمل ہوتا تھا اس کا اندازہ، ابھی آپ حضرت خباب بن الارث رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے کر چکے ہیں- حضور علیہ السلام کے صدقہ میں آپ کی امت کو ''خیر امت'' کا بلند مرتبہ عطا فرمایا گیا- اور جس کا جتنا مرتبہ بلند ہوتا ہے اس کی آزمائش اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے- لیکن یہ صدقہ ہے، نبی رحمت ﷺ کا، کہ پچھلی امتوں کی نسبت ہماری آزمائش بہت کم رہی ہے- الحمد للہ، نہ ہم پر آسمان سے پتھر برسائے گئے، نہ ہماری آبادیوں کو پلٹا گیا، نہ ہمارے چہروں کو مسخ کیا گیا اور نہ ہماری نسلوں کو ختم کیا جائے گا، وعدہ ہے رب رحیم وکریم کا-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝

(الانفال:۳۳)

اور اللہ کی (شان) نہیں کہ انہیں عذاب دے، جبکہ (اے محبوب علیہ السلام) آپ ان میں موجود ہیں اور اللہ انہیں عذاب دینے والا نہیں، جبکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں۔

نیز ہمیں پہلے ہی مطلع کر دیا گیا کہ آزمائش آئے گی تاکہ ہم تیار رہیں، اور تسلی بھی دے دی کہ آزمائش کوئی بڑی نہ ہوگی ''بِشَیْءٍ'' تھوڑی سی، اور اس کا عرصہ بھی دراز نہ ہوگا، بلکہ

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (الم نشرح:۵،۶)

تو بیشک ہر دشواری کے ساتھ ہی آسانی ہے- یقیناً ہر دشواری کے ساتھ آسانی ہے-

ابتلاء وآزمائش کے شعبے بھی بتا دیئے، کبھی کسی ظالم کے خوف میں مبتلا کیے جاؤ گے، کبھی ''جوع'' یعنی معاشی حالت کی ابتری سے آزمائے جاؤ گے، کبھی مال واولاد کے نقصان کا غم ہوگا- اور جب تم ابتلاء وآزمائش کے دور میں بھی اللہ کو یاد کرتے رہو گے، اس کی رضا میں راضی ہو کر ہر آزمائش کو برداشت کرو گے تو تمہارے لیے اللہ کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت کا

مژدہ ہے، پس ابتلاء وآزمائش کا قانون قدرت ہم پر لاگو تو کیا گیا، لیکن نہایت ہی شفقت ومحبت اور نرمی کے ساتھ، یہ صدقہ ہے نبی رحمت ﷺ کا۔

ابتلاء ذریعہ اجر ہوتی ہے

اس سلسلے میں حضور علیہ السلام کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔ آپ نے مصائب وآلام کو ہمارے لئے ایک نعمت بنادیا اوران کو برداشت کرنا سہل وآسان کردیا۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ن الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَا یُصِیْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَّلَا وَصَبٍ وَّلَا هَمٍّ وَّلَا حُزْنٍ وَّلَا اَذًی وَّلَا غَمٍّ حَتّٰی الشَّوْکَةِ یُشَاکُهَا اِلَّا کَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَایَاهُ۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی رنج، کوئی دکھ، کوئی فکر، کوئی تکلیف، کوئی اذیت اور کوئی غم نہیں پہنچتا یہاں تک کہ کانٹا جواسے چبھے، مگر اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس کے گناہوں کو مٹادیتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّصَبْ مِنْهُ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے آزمائش میں مبتلا کردیتا ہے۔ (بخاری شریف)

نبی رحمت ﷺ نے ہمارے مصائب وآلام کو ہمارے لئے کتنا سہل فرمادیا، یہ بتا کر کہ ہماری ہر تکلیف، ہمارے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ اور ہمارے مراتب کی بلندی کا مژدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شب وروز کی پریشانیاں اور الجھنیں، جنہوں نے ہمیں بدحال کررکھا ہے اور ہر زبان پر جن کا شکوہ ہے، یہ سب اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات سے ناواقفی یا لاپرواہی کے باعث ہے۔ اگر ہم اپنی ہی خامی دور کرلیں اور اپنے مسائل کا علاج قرآن وحدیث میں تلاش کرنے کی صلاحیت پیدا کرلیں، یا کم از کم علماء دین سے رہبری اور رہنمائی حاصل کرنے کے عادی ہوجائیں۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ نہ تو علم دین حاصل کرنے کی کوئی اہمیت رہی اور نہ ہی علماء کی صحبت کی کوئی ضرورت، جب کہ سکون واطمینان حاصل کرنے کے صرف یہی دو ذریعے ہیں۔ آج ہمارے مسائل کوئی نئے نہیں۔ ہم سے پہلوں کو، ہم سے بہت زیادہ مصائب ومسائل کا سامنا تھا۔ معاشی مسائل بھی تھے، سیاسی بھی۔ دشمن کا خوف بھی تھا، ظلم وستم کا مقابلہ بھی۔ بیماریاں بھی تھیں، وبائیں بھی۔ لیکن وہ ہماری طرح نہ تڑپتے تھے نہ بے چین ہوتے تھے۔ رات کو سکون کی نیند بھی سوتے تھے، دن کو بے خوف وخطر اپنا رزق بھی کماتے تھے، صرف اس لئے کہ ان کے ہاتھ میں، قرآن وحدیث تھے جس سے رہبری حاصل کرکے وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کرلیتے تھے اور اس کی تعلیم کے مطابق وہ مصائب وآلام کو اپنے لئے اللہ کی رحمت جانتے اور صبر واستقامت کے ذریعہ اس رحمت کو حاصل کرتے تھے۔ ہم مزید حضور علیہ السلام کے چند ارشادات پیش کرتے ہیں۔ کیا عجب کسی مضطرب وبے چین بھائی بہن کے لئے حصولِ سکون کا باعث ہوجائے، تو ہمارے لئے بھی ذریعہ نجات ہوجائے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَ هُوَ يُوْعَكُ فَمَسِسْتُهٗ بِيَدِىْ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ لَتُوْعَكُ وَعْكًا شَدِيْدًا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اَجَلْ اِنِّىْ اُوْعَكُ كَمَا يُوْعَكُ رُجُلَانِ مِنْكُمْ قَالَ فَقُلْتُ ذَالِكَ لِاَنَّ لَكَ اَجْرَيْنِ فَقَالَ اَجَلْ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يُّصِيْبُهٗ اَذًى مِّنْ مَّرَضٍ فَمَا سِوَاهُ اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ بِهٖ سَيِّئَاتِهٖ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو شدید بخار تھا۔ میں نے جسم مبارک کو ہاتھ لگاتے ہوئے عرض کیا، یارسول اللہ آپ کو تو بہت سخت بخار ہے، آپ نے فرمایا مجھے اتنا بخار ہوتا ہے جتنا تم میں سے دو آدمیوں کو ہوتا ہے۔ تو میں نے عرض کیا، اس لئے کہ آپ کو اجر بھی دوگنا ملتا ہے، آپ نے فرمایا ہاں، پھر آپ نے فرمایا کہ مسلمان کو کسی مرض کی یا اس کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، مگر اللہ اس کے سبب اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، جیسے درخت سے پتے جھڑتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الزَّرْعِ لَا تَزَالُ الرِّيْحُ تَمِيْلُهٗ وَلَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ يُصِيْبُهُ الْبَلَآءُ وَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ شَجَرَةِ الْاَرْزَةِ لَا تَهْتَزُّ حَتّٰى تُسْتَحْصَدَ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، مومن کی مثال کھیتی جیسی ہے جس کو ہوا جھکاتی رہتی ہے اور مومن ہمیشہ مصائب میں مبتلا رہتا ہے۔ اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت جیسی ہے، وہ ہلتا نہیں بلکہ جڑ ہی سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اُمِّ السَّآئِبِ فَقَالَ مَالَكِ تُزَفْزِفِيْنَ قَالَتِ الْحُمّٰى لَا بَارَكَ اللّٰهُ فِيْهَا فَقَالَ لَا تَسُبِّى الْحُمّٰى فَاِنَّهَا تُذْهِبُ خَطَايَا بَنِىْ آدَمَ كَمَا يُذْهِبُ الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ام سائب کے یہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کیا بات ہے تم کپکپا کیوں رہی ہو، انہوں نے کہا بخار کی وجہ سے، اللہ اس میں برکت نہ دے۔ آپ نے فرمایا بخار کو برا نہ کہو کہ بخار گناہوں کو اسی طرح لے جاتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔ (مسلم شریف)

عَنْ سَعْدٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ اَىُّ النَّاسِ اَشَدُّ بَلَآءً قَالَ الْاَنْبِيَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلٰى حَسْبِ دِيْنِهٖ فَاِنْ كَانَ فِىْ دِيْنِهٖ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلَآءُهٗ وَ اِنْ كَانَ فِىْ دِيْنِهٖ رِقَّةٌ هُوِّنَ عَلَيْهِ فَمَا زَالَ كَذٰلِكَ حَتّٰى يَمْشِىَ عَلَى الْاَرْضِ مَالَهٗ ذَنْبٌ۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کون لوگ سخت بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہیں، تو آپ نے فرمایا (سب سے پہلے) انبیاء، پھر ان سے جو قریب ہیں، پھر ان کے بعد جو افضل ہیں۔ آدمی اپنے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے، اگر دین میں سخت ہے تو بلا بھی سخت ہوگی اور اگر دین میں کمزور ہے تو اس پر آسانی کی جاتی ہے، یہی سلسلہ ہمیشہ رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ زمین پر یوں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں رہتا۔ (ابن ماجہ)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا كَثُرَتْ ذُنُوْبُ الْعَبْدِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ مَا يُكَفِّرُهَا مِنَ الْعَمَلِ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ بِالْحُزْنِ لِيُكَفِّرَهَا۔

حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب بندے کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے عمل میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو گناہوں کا کفارہ بن سکے، تو اللہ اس کو غم اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ (مشکوٰۃ شریف)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوَدُّ اَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِيْنَ يُعْطٰى اَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، قیامت کے دن جب ان لوگوں پر انعام و اکرام کیا جائے جو دنیا میں مصائب و آلام برداشت کرتے رہے، تو وہ لوگ جو دنیا میں آرام و عافیت سے رہے، کہیں گے کاش دنیا میں ان کی کھالوں کو بھی قینچیوں سے کاٹ دیا جاتا (تاکہ آج ہمیں بھی ایسا ہی اجر ملتا) (ترمذی شریف)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ عُظْمَ الْجَزَآءِ مَعَ عُظْمِ الْبَلَآءِ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَّضِيَ فَلَهُ الرِّضَآءُ وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا، بے شک بڑا مرتبہ بڑی آزمائش کے ساتھ ہے اور بے شک اللہ جب کسی قوم سے محبت فرماتا ہے تو اس کو ابتلاء میں ڈال دیتا ہے، تو جو صبر و شکر کرتا ہے اللہ اس سے راضی ہوتا ہے اور جو بے صبری اور غصہ کرتا ہے، اس کے لئے اللہ کا غضب ہوتا ہے۔ (ابن ماجہ)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَزَالُ الْبَلَآءُ بِالْمُؤْمِنِ اَوِ الْمُؤْمِنَةِ فِيْ نَفْسِهٖ وَمَالِهٖ وَوَلَدِهٖ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَمَا عَلَيْهِ مِنْ خَطِيْئَةٍ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، کہ مسلمان مرد و عورت کے جان و مال اور اولاد میں ہمیشہ آزمائش رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا (ابتلاء و آزمائش کے ذریعہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں) (ابن ماجہ)

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ خَالِدِ ن السُّلَمِيُّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهٖ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ اَوْ فِيْ مَالِهٖ اَوْ فِيْ وَلَدِهٖ ثُمَّ صَبَّرَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ حَتّٰى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِيْ سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ

حضرت محمد بن خالد سلمی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ بندہ کے لئے علم الٰہی میں جب کوئی مرتبہ کمال مقدر ہوتا ہے، اور وہ اپنے عمل سے اس مقام کو حاصل نہیں کر پاتا تو اللہ اس کے جسم یا اس کے مال یا اس کی اولاد پر مصیبت ڈالتا ہے، پھر اس پر اس کو صبر عطا فرماتا ہے، یہاں تک کہ اسے اس مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے، جو اس کے لئے علم الٰہی میں مقدر تھا۔

(ابوداؤد)

سرکار کے ان ارشادات کو بار بار پڑھیے، دل و دماغ میں رچا بسا لیجیے، پھر دیکھیے زندگی میں کیسی بہار آتی ہے- اپنے آپ کو آپ صبر کا ایک پہاڑ پائیں گے، طوفان ٹکرائیں گے اور گزر جائیں گے- آپ اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں گے- آپ کو محسوس ہوگا کہ کوئی آپ کی مدد کر رہا ہے، کون ہے جو مدد کر رہا ہے، وہی جو وعدہ فرماتا ہے- بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے-

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ (البقرہ: ۲۱۴)

کیا تم خیال کر رہے ہو، کہ تم (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات (مصائب) نہیں گزریں گے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر گزر چکے، انہیں سختی اور مصیبت پہنچی اور وہ لرز اٹھے، یہاں تک کہ (اس زمانہ کا) رسول اور اس پر ایمان لانے والے کہہ اٹھے، کب آئے گی اللہ کی مدد- سن لو، یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے-

یہ نہ سوچو کہ ہم ایمان لاتے ہی، دنیا و آخرت میں اللہ کی رحمتوں کے مستحق ہو گئے، بلکہ جب تم نے اللہ کا بننے کا دعویٰ کیا ہے، تو اب اللہ بھی تمہیں آزما کر دیکھے گا کہ تم اپنے دعوے میں کس حد تک پختہ اور سچے ہو- اب تمہاری آزمائش صرف مصائب و آلام ہی کے ذریعہ نہیں بلکہ ہر طرح ہوگی، یہاں تک کہ اس کی نعمتیں بھی بسا اوقات تمہاری آزمائش کا ذریعہ بنیں گی- مصائب و آلام، راحت و آرام، ہر حال میں آزمائش ہوتی ہے-

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الزمر: ۴۹)

تو جب انسان کو، کوئی تکلیف پہنچتی ہے، تو ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اپنے پاس سے اسے کوئی نعمت عطا فرماتے ہیں تو کہتا ہے یہ تو مجھے صرف ایک علم کی وجہ سے ملی ہے- بلکہ (درحقیقت) یہ آزمائش

ہے، مگران کے اکثر لوگ نہیں جانتے-
نعمتوں کے حصول کا ذریعہ، اپنے علم، تدبیر یا محنت و مشقت کو سمجھنا ہی بڑی آزمائش ہے- اگر کسی دولت مند سے آپ کسی مذہبی یا دینی کام کے لئے کچھ مانگیں تو یا تو وہ دیتا ہی نہیں، اور اگر دیتا بھی ہے تو سخت ناگواری کے ساتھ، کیونکہ وہ اپنی اس دولت کو اللہ کا فضل نہیں بلکہ اپنی محنت یا عیاری کا نتیجہ سمجھتا ہے- یہی اس کی آزمائش ہے اللہ نعمتوں سے نواز کر آزماتا ہے، یہاں تک کہ مال و اولاد بھی آزمائش کا ذریعہ بنتی ہے-

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (انفال:۲۸)

اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (سب) آزمائش ہیں، اور بے شک اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے-
عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے والوں کو جب آپ دین سے لاپروا پائیں، مال و اولاد والوں کو جب آپ متکبر دیکھیں، اہل علم جب غرور میں مبتلا نظر آئیں، بس سمجھ لیجئے کہ ان لوگوں پر اللہ کا انعام، اس کی طرف سے ان کے امتحان و آزمائش کا ذریعہ بنا ہوا ہے اور ان کی لاپرواہی، ان کا تکبر و غرور انہیں امتحان میں ناکام بنا رہا ہے- یہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ انہیں ذلت و خواری کے گڑھے کی طرف لے جا رہی ہے- ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کیجئے اور ہو سکے تو انہیں سمجھائیے اور فلاح و بہبود کی راہ دکھانے کی کوشش کیجئے کہ انسان پر، اللہ کی نعمتوں کی صورت میں جو آزمائش آتی ہے وہ بڑی ہی خطرناک ہوتی ہے- اس کا ایمان کمزور کر دیتی، کیونکہ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ نعمتیں اس کا حق ہیں اور کبھی نہیں چھن سکتیں- پس جب کوئی نعمت چھنتی ہے اور اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کفریہ کلمات بکنے لگتا اور ایمان سے محروم ہو جاتا ہے- قرآن کریم اسی صورت حال کو بیان فرماتا-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (الحج:۱۱)

اور لوگوں میں کچھ وہ جو (دل جمعی کے بغیر گویا) کنارے پر (کھڑے) اللہ کی بندگی کرتے ہیں- پھر اگر اسے کوئی بھلائی (نعمت) نصیب ہو جاتی ہے، تو وہ اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش (مصیبت) پہنچے تو وہ اپنے منہ کے بل (دین سے) پلٹ جائے- اس نے دنیا و آخرت میں نقصان اٹھایا، یہی کھلا نقصان ہے-

آزمائش انسان کو فرعون بھی بنا دیتی ہے اور کافر بھی- کامیاب وہی ہے جس نے اس کو پہچان لیا اور نعمتوں کی حالت میں اللہ کا شکر ادا کیا اور مصیبتوں میں صبر کیا- صابرین، شاکرین ہی پر اللہ کی رحمت برستی ہے-
اے اللہ، ہمیں ابتلاء و آزمائش سے محفوظ فرما، نعمتوں پر شکر کی توفیق اور مصیبتوں پر صبر کی ہمت عطا فرما- آمین-

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۴

البقرہ ۲: ۱۷۲ تا ۱۷۳

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۝ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ (البقرہ ۲: ۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! کھاؤ، پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تم کو دیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو- اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے تم پر حرام کیا ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور، جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، تو جو (بھوک سے) بیتاب ہو جائے، جبکہ نافرمان نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے-

اے ایمان والو! اللہ کی عطا کردہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور اس کی نعمتوں پر اللہ ہی کا شکر ادا کرتے رہو، اگر تم واقعی اس کی عبادت کرتے ہو- کہ حرام و ناپاک غذا اور ناشکر کے ساتھ عبادت کا دعویٰ، متقی و پرہیزگار ہونے کا دعویٰ بڑا ہی مضحکہ خیز ہے، بے سود اور بے فائدہ ہے- اس کی پیدا کردہ بیشمار غذائیں تمہارے لئے حلال ہیں- صرف مردار، خون، خنزیر اور جس پر

بوقت ذبح اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے حرام ہیں- پھر تم پر تعجب ہے حلال کھانا چھوڑ کر تم حرام استعمال کرتے ہو- جب کہ اس میں بھی تمہارے لئے یہ سہولت دی گئی ہے کہ اگر حلال میسر نہ آئے اور جان کا خطرہ ہو تو جان بچانے کے لئے تم ضرورت کے مطابق حرام کھا سکتے ہو- اس صورت میں تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا، لیکن بوجہ مجبوری تم نے جو کچھ کھایا اس کو حلال نہ سمجھ لینا وہ حرام ہی ہے- لیکن اللہ اپنے فضل و کرم سے تم سے وعدہ فرماتا ہے کہ وہ تمہاری مجبوری کے سبب تمہیں بخش دے گا- وہ بہت ہی بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے-

طَیِّبٰت :- ایسی پاکیزہ چیزیں جو شرعاً حلال ہوں، حلال ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں- نیز طبعاً پسندیدہ ہوں-

حرام :- وہ چیزیں جن کا استعمال اللہ یا اس کے رسول ﷺ نے ممنوع قرار دیا ہو-

میتۃ :- وہ جانور اگرچہ حلال ہو، لیکن مردار ہو گیا ہو، خود مر جانے کی وجہ سے یا مار دیا گیا ہو، یا شریعت کے مطابق ذبح نہ کیا گیا ہو-

مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ :- جس جانور کو ذبح تو کیا گیا ہو لیکن بوقت ذبح اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو- بسم اللہ اللہ اکبر نہ کہا گیا ہو، بلکہ غیر اللہ، مثلاً کسی بُت، یا کسی شخص کا نام لیا گیا ہو-

اضطرار :- ایسی حالت جس میں جان جانے کا یقین ہو چکا ہو-

بَاغٍ :- جان بوجھ کر، اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا- بغاوت کرنے والا-

عَادٍ :- شریعت کی مخصوص اجازت کو بہانا بنا کر اس کا سہارا لے کر قوانین شریعت سے تجاوز کرنے والا-

آیات مذکورہ میں اہل ایمان کو جو احکام دیئے جا رہے ہیں وہ یہ ہیں- اللہ کی دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اللہ کا شکر ادا کرتے رہو، میتۃ، دم، خنزیر اور وہ جانور جس پر بوقت ذبح اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، تمہارے لئے حرام ہیں- اضطرار کی حالت میں جان بچانے کے لئے سب کچھ کھا سکتے ہیں- انہی احکام سے متعلق ہم ضروری باتیں عرض کرتے ہیں-

کھانا پینا

کھانا، پینا اگرچہ ایسا عمل ہے جس کا تعلق خالصاً انسان کے جسم اور خواہش نفس سے ہے- لہذا یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں انسان کو کلی آزادی ہونا چاہئے کہ وہ جو چاہے کھائے، پئے اس میں دینی مداخلت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی- یہ خیال ایسے ہی ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے جو یا تو دین سے بالکل آزاد ہیں اور یا دین کی وُسعت کا علم نہیں رکھتے- جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دین ایسے قانون الٰہی کا نام ہے جو انسان کی زندگی کے ہر عمل پر کنٹرول کرتا ہے اور ایسے اعمال کا حکم دیتا ہے جو اس کے لئے ہر اعتبار سے مفید ہوں- کھانا، پینا انسان کی زندگی کا نہایت ہی اہم عمل ہے، جس پر اس کے سارے کاموں کا دارومدار ہے کہ غذا ہی انسان کے جسم کو قوت و طاقت فراہم کرتی اور صحت مند رکھتی ہے اور اسی سے جسم مہلک امراض کا شکار ہوتا ہے- علاوہ ازیں غذا انسان کے اخلاق و کردار اور اس کے عادات و اطوار پر بھی اثر ڈالتی ہے- غذا کے مفید یا مضر ہونے کا علم اللہ سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے کہ وہی ہر چیز کا خالق ہے اور اسی نے انسان کو پیدا کیا- پس وہی یقینی طور پر جانتا ہے کہ کون سی چیز انسان

کے لئے مفید اور کون سی مضر ہے- لہذا اس نے مضر چیزوں کو انسان کے لئے حرام قرار دیا اور مفید کو حلال- دین پر عمل کرنے والے بڑے خوش نصیب ہیں کہ وہ کھانے پینے سے متعلق احکام کی تعمیل کر کے بے شمار جسمانی اور اخلاقی امراض سے محفوظ ہو جاتے ہیں- کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جو حرام کی گئی ہیں انسان کے لئے کسی نہ کسی اعتبار سے مضر ہیں- یہی وجہ ہے کہ ان کی حرمت صرف ہماری شریعت ہی میں نہیں ہے بلکہ ہم سے پہلی امتوں پر بھی وہ حرام تھیں- ہاں بعض چیزیں جو پچھلی امتوں پر بطور سزا حرام کی گئی تھیں وہ ہمارے لئے حلال کر دی گئیں-

علاوہ ازیں مومن کا حال عام انسانوں جیسا نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی طرح آزاد رہے جو چاہے کرے، جو چاہے کھائے پئے- مومن نے تو ایمان اختیار کر کے اللہ سے سودا کر لیا ہے- اب وہ اللہ اور اس کے رسول کا غلام ہے- غلام اپنے کسی عمل میں آزاد نہیں ہوتا- مومن آزاد نہیں، اس کا کھانا، پینا تو درکنار کھانے پینے کے اوقات حتی کہ سونا جاگنا بھی اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق ہوتا ہے- یہ غلامی نہیں تو اور کیا ہے کہ نماز کا وقت ہوتے ہی ہمیں اپنا ضروری سے ضروری کام چھوڑنا پڑتا ہے- فجر کا وقت ہوتے ہی میٹھی نیند زہر ہو جاتی اور آرام دہ بستر کاٹنے لگتا ہے- سال میں ایک ماہ کے لئے سونے، جاگنے، کھانے، پینے کے اوقات تبدیل ہو جاتے ہیں- حالت روزہ میں اپنی ہی بیوی کے قریب نہیں جا سکتے- کھانا ہوتے ہوئے شدید بھوک کے باوجود نہیں کھا سکتے- اسی طرح دین کے تمام احکام پر غور کیجئے، آپ کو وہ آزادی کہیں نہیں ملے گی جس کا تصور ایک بے دین کے ذہن میں ہوتا ہے- مومن ہرگز آزاد نہیں، وہ غلام ہوتا ہے اور غلامی ہی انسانیت ہے- اسی میں عزت وعظمت ہے، اسی سے راحت وسکون نصیب ہوتا ہے اور یہی ذریعہ نجات ہے- بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی غلامی آزادی ہے کہ ذلیل ترین غلام وہ ہے جو ہوا وہوس کا غلام ہو، کہ وہ کرے جو اس کا نفس کرائے- یہی غلامی انسان کو مجرم بناتی ہے، ظالم وجابر بناتی ہے، بدکردار وبداطوار بناتی ہے- نفس کی غلامی میں نہ انسانی اقدار کا تصور ہے نہ حقوق کی حد بندی اور نہ ہی اصول زندگی- یہاں اہمیت صرف اس چیز کی ہے جس سے ہوا وہوس کی تکمیل ہوتی ہے، یہاں نہ رشتوں کا پاس ہے نہ اپنے اور غیر کا امتیاز- نہ بڑے چھوٹے کا فرق، نہ کسی کے دکھ درد کا احساس، ہوا وہوس کے غلاموں کی اس دنیا میں انسان جانوروں سے بدتر نظر آتے ہیں- دین ایسی غلامی سے آزادی کی ضمانت ہے- یہ مظلوم کو ظالم سے آزادی دلاتا ہے- انسان کو مہذب بنا کر مجرم اور ظالم بننے سے بچاتا ہے- انسانی اقدار کی تعلیم دے کر انسان کو انسان کے کام آنا سکھاتا ہے- غمخواری، ہمدردی، باہمی الفت ومحبت کی لذت سے آشنا کرتا ہے- اسی لئے وہ انسان کے ہر عمل کی راہ متعین کرتا ہے، اصول زندگی فراہم کرتا ہے- تہذیب وتمدن کے طریقے بتاتا ہے- جرائم کی ذلت سے بچا کر باعزت زندگی مہیا کرتا ہے- دین انسان کو فطری تقاضوں سے محروم نہیں کرتا بلکہ ان کی تکمیل کا طریقہ سکھاتا ہے- یوں کہہ لیجئے کہ جھوٹے آقاؤں سے آزادی دلاتا اور مالک حقیقی کا غلام بناتا ہے، جو معراج انسانیت ہے-

کھانا، پینا ضرور انسان کا فطری تقاضہ ہے- لیکن کیا آپ ایسے شخص کو انسان کہیں گے جو اپنے اس تقاضہ کی تکمیل کے لئے آپ کے ہاتھ کا نوالہ چھین کر کھا جائے- اور اسی کو وہ آزادی کا نام دیدے- یا آپ کسی ایسے شخص کو انسان کہیں گے جو جانوروں کی طرح سڑک پر پڑی گندی اور سڑی چیزیں کھائے اور کہے میں آزاد ہوں- جو چاہوں کھاؤں کسی کو ٹوکنے کا کیا حق

ہے۔ پہلا شخص لٹیرا ڈاکو کہلائے گا اور دوسرا پاگل و دیوانہ۔ پس دین ہمارے کھانے پینے کے تقاضہ کی تکمیل پر ہرگز پابندی عائد نہیں کرتا۔ صرف لٹیرا ڈاکو یا پاگل و دیوانہ ہونے سے بچانا چاہتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ تم انسان ہو۔ لہٰذا اچھی چیزیں کھاؤ۔ تمہاری صحت نہایت اہم ہے لہٰذا مفید صحت غذائیں استعمال کرو۔ جو حلال ہے وہی مفید صحت ہے۔ اور جو حرام ہے وہ مضر صحت ہے، زہر ہے، اس سے بچو۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ﳲ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِؕ-اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ(۱۶۸) (البقرہ:۱۶۸)

اے لوگو، زمین کی ان چیزوں میں سے کھاؤ جو حلال وطیب ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

یہ شیطان ہی ہے جو دین سے دوری کو آزادی باور کراتا ہے۔ یہ شیطان ہی ہے جو حلال وحرام کا امتیاز ختم کراتا ہے وہی ہوائے نفس میں مبتلا کر کے دوسروں کا مال غصب کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہی دولت کی ہوس پیدا کر کے مکر وفریب سے اسے حاصل کرنے کے ڈھنگ سکھاتا ہے۔ اے لوگو، اس کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلو، وہ تمہارا دوست نہیں کھلا دشمن ہے۔ دشمن کا کام تو تباہ و برباد ہی کرنا ہوتا ہے۔ وہ تمہاری دنیا بھی برباد کر دے گا اور آخرت بھی۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ (الانعام:۱۱۸)

تو کھاؤ، اس (ذبیحہ) سے، جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔

تم نے کلمہ پڑھا ہے، ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، مومن کہلاتے ہو، مومن اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات پر یقین کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے۔ تو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو، تو حرام سے بچو، حلال کھاؤ۔ یہ حکم صرف تمہارے ہی لئے نہیں بلکہ ہم نے اپنے رسولوں تک کو اسی کا پابند رکھا۔

یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًاؕ-اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌؕ(۵۱)
(المومنون:۵۱)

اے رسولو، پاک چیزوں میں سے کھاؤ، اور نیک عمل کرتے رہو، بیشک میں تمہارے سب کاموں کو خوب جانتا ہوں۔

رسول اگرچہ معصوم ہوتا ہے، اس سے اس بات کا امکان ہی نہیں کہ وہ کوئی کام مرضی الٰہی کے خلاف کرے اور وہ اللہ کی مرضی کو اللہ کے عطا کردہ خصوصی علم سے جانتا ہے۔ اس کو جو بھی حکم دیا جاتا ہے وہ اس لئے کہ امت پر اس حکم کی اہمیت ظاہر کی جائے۔ پس حلال کھانے اور حرام سے بچنے کا حکم نہایت ہی اہم ہے۔ اس کی تعمیل میں ذرا بھی لاپرواہی نہ ہونے پائے، ورنہ تمہاری ساری طاعات وعبادات رائیگاں ہو جائیں گی۔ قرب الٰہی کے حصول کی ابتداء حلال سے ہی ہوتی ہے۔ دنیاوی برکت کے حصول کا پہلا ذریعہ حلال ہی ہے، حرام سے موٹا ہونے اور پھولنے والا جسم اللہ کی مقدس جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، کہ مالک جنت نبی مکرم علیہ السلام فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، وہ جسم جنت میں داخل نہ ہوگا جو حرام سے پلا ہو۔ (مشکوٰۃ شریف)

بہرحال اہل ایمان سے اللہ کا مطالبہ ہے کہ حلال کھاؤ، حرام سے بچو۔ آیت زیر بحث میں جو احکام دیئے جارہے ہیں، ان پر گفتگو سے قبل وہ آیات ملاحظہ ہوں جن میں انہی احکام کی مزید وضاحت فرمائی گئی۔

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ وَالْمُنْخَنِقَۃُ وَالْمَوْقُوْذَۃُ وَالْمُتَرَدِّیَۃُ وَالنَّطِیْحَۃُ وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِکُمْ فِسْقٌ (المائدہ: ۳)

حرام کیا گیا تم پر مردار، اور (رگوں کا بہتا ہوا) خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر (وقت ذبح) غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور گلا گھونٹ کر مارا جانے والا، اور (لکڑی وغیرہ کی) ضرب سے مارا ہوا، اوپر سے گرا ہوا، اور سینگ مارا ہوا، اور جس کو درندے نے کھایا ہو، مگر جو تم نے ذبح کرلیا اور جو باطل معبودوں کے نشان پر ذبح کیا گیا ہو اور جوئے کے تیروں سے اپنے حصے تقسیم کرنا، یہ سب نافرمانی کے کام ہیں۔

اس آیت مقدسہ میں گیارہ چیزوں کی حرمت موجود ہے۔ میتۃ، دم، خنزیر، مَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ کی وضاحت آپ اگلے صفحات پر ملاحظہ کریں گے۔ بقیہ محرمات کی مختصر تشریح یہ ہے۔

منخنقۃ، وہ جانور جو اگرچہ فی نفسہ تو حلال تھا، لیکن اس کو گلا دبا کر مارا گیا، جیسے عام طور پر غیر مسلم مرغی وغیرہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ شاید اسی کو جھٹکے کا جانور کہا جاتا ہے۔ ایسا جانور حرام ہوگیا۔

موقوذۃ، کسی ایسی چیز سے مارا ہوا جانور جو دھاردار نہ ہو۔ ڈنڈے سے، پتھر سے، بندوق کی گولی سے جو کاٹتی نہیں بلکہ جلا کر مارتی ہے، کوئی بھی بے دھار چیز چاہے اللہ کا نام لے کر ماری جائے، اس سے مرا ہوا جانور حرام ہوجاتا ہے۔

متردیۃ، وہ جانور جو پہاڑ وغیرہ سے گر کر مر جائے۔

نطیحۃ، وہ جانور جسے کسی دوسرے جانور نے سینگ مار کر، مار ڈالا ہو۔

مَا اَکَلَ السَّبُعُ، وہ جانور جس کو درندے نے پکڑا اور اس کا کچھ حصہ ہی کھایا لیکن وہ مرگیا۔

یہ تمام جانور اگرچہ "میتۃ" مردار میں شامل ہیں، لیکن اللہ نے ان کو علیحدہ علیحدہ اس لئے بیان فرمایا کہ ان کی حرمت میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے، ان جانوروں کی حرمت ان کی موت سے ہے، لیکن اگر مرنے سے پہلے انہیں اللہ کا نام لے کر ذبح کرلیا گیا تو یہ حلال ہیں، بشرطیکہ جانور فی نفسہ حلال ہو۔

مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ، وہ جانور بھی حرام ہیں جو بت خانوں میں لے جا کر بتوں کے نام پر ذبح کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مشرکین نزول قرآن کے دور میں کیا کرتے تھے اور آج تک کرتے ہیں۔ ان کی حرمت کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ ان کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ بتوں کا نام لیا جاتا ہے، لہذا اگر کسی مسلمان کے ہاتھ ایسا جانور آ گیا اور اس نے بسم

اللہ، اللہ اکبر کہہ کر اسے ذبح کیا تو وہ حلال ہوگا، یہی صورت ان جانوروں کی ہے جو جاہل مسلمان مزارات وغیرہ پر لے جاتے ہیں، جانور کو مزار کے گرد گھماتے ہیں یا اس کے اوپر سے اتارتے ہیں، پھر ذبح کرتے ہیں- اگرچہ یہ عمل نہایت ہی جاہلانہ اور احمقانہ ہے، سخت گناہ ہے کہ اس میں مشرکین سے مشابہت ہے- نیز صاحب مزار کو اس غیر شرعی عمل سے خوشی نہیں بلکہ سخت تکلیف ہوتی ہے- مزارات کے خدام کی ذمہ داری ہے کہ وہ جاہلوں کو ایسے غیر شرعی کاموں سے منع کریں، تاہم اس جانور کا گوشت حلال ہے- کیونکہ کسی بھی مسلمان کے متعلق یہ بدگمانی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اتنا جاہل ہو جائے گا کہ بوقت ذبح بھی جانور پر اللہ کی بجائے، کسی بزرگ یا ولی کا نام لینے لگے- اور اگر العیاذ باللہ، کسی نے ایسا کیا تو یہ شرکِ صریح ہوگا اسے توبہ لازم ہے اور جانور حرام ہوگا-

آخر میں جوئے کے تیروں سے فال لے کر، اس پر کام کی ابتداء کا دارومدار کرنے، یا اس سے دولت کمانے کی ممانعت کی جارہی ہے، جس کا مشرکین میں عام رواج تھا- کہ جب کسی کام کا ارادہ کرتے تھے تو تین تیر لیتے تھے- ان سے فال نکالتے تھے، اسی طرح وہ تیروں سے جوا کھیلتے تھے- اللہ نے اس کو بھی حرام قرار دیا- ہمارے دور میں بھی یہ طریقہ جاری ہے، اب تیر تو نہیں استعمال ہوتے لیکن دوسرے طریقوں سے فال نکالی جاتی ہے یا دولت کمانے کے لیے مختلف قسم کی لاٹریوں کا طریقہ رائج ہے، اسلام ان لغویات کی اجازت ہرگز نہیں دیتا- بلکہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے اس کی شرعی حیثیت کا جائزہ لیا جائے، اگر وہ جائز ہو تو اس میں کامیابی کے امکانات پر، اللہ کی عطا کردہ عقل سے غور کیا جائے اور جب عقل کامیابی کی امید دلائے تو اللہ پر بھروسہ کر کے اس کا آغاز کر دیا جائے- انجام اللہ کے سپرد کر دیا جائے، اسی کو توکل کہتے ہیں- نیز دولت کمانے کے لئے لاٹریوں اور جوئے کے دیگر طریقوں کو نہ اپنایا جائے، بلکہ محنت ومشقت سے اپنا رزق تلاش کیا جائے-

اسی سورہ مائدہ میں پھر ارشاد ہو رہا ہے-

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ (المائدہ:۸۷-۸۸)

اے ایمان والو، مت حرام قرار دو ان پاکیزہ چیزوں کو جنہیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا اور حد سے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا، اور کھاؤ اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے حلال پاکیزہ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس پر تم ایمان رکھتے ہو-

سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے-

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ (الانعام:۱۲۱)

اور مت کھاؤ اس سے جس پر (بوقت ذبح) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو- اور بیشک وہ (کھانا) گناہ ہے، اور بیشک شیطان وسوسے ڈالتے ہیں، اپنے دوستوں کے دلوں میں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے

ان کا کہا مان لیا تو بیشک تم مشرک ہو جاؤ گے۔

اسی سورت میں مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا۔

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ (الانعام: ۱۴۵)

آپ فرما دیجئے، میں نہیں پاتا، اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی حرام کی ہوئی چیز، جسے وہ کھاتا ہے، مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا خون بہتا ہوا، یا خنزیر کا گوشت، کیونکہ بے شک وہ نجس ہے یا نافرمانی کے لئے ذبح کے وقت جانور پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، پھر جو مجبور ہو جائے، نہ سرکشی کرنے والا ہو، نہ حد سے بڑھنے والا ہو، تو بیشک آپ کا رب بہت بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔

ان تینوں آیات کا بنیادی مضمون تقریباً ایک ہی ہے کہ حلال کو حرام قرار دینے کی ممانعت فرمائی گئی، طیبت استعمال کرنے کی تاکید کی جارہی ہے، حرام جانوروں سے بچنے کی تاکید ہے، اسی مضمون کو پھر سورۃ النحل میں دہرایا گیا، ارشاد ہوتا ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾ (النحل: ۱۱۴۔۱۱۵)

پس کھاؤ، اس سے جو رزق تمہیں اللہ نے دیا، جو حلال و طیب ہو، اور شکر کرو اللہ کی نعمت کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس نے تم پر حرام کیا مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔ پس جو مجبور ہوا، نہ نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

طیبٰت

طیبٰت پاکیزہ چیزیں یا رزق طیب وہ ہے جو نہ خود بُرا ہو اور نہ بُرے ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ جیسے سؤر یا کتے کا گوشت خود ہی بُرے ہیں۔ لہٰذا ان کی حرمت واضح ہے۔ لیکن جو چیزیں واضح طور پر اللہ اور اس کے رسول کے ارشاد کے مطابق حلال ہیں، لیکن حرام دولت سے حاصل کی جائیں تو وہ اگرچہ حلال ہی ہیں، حرام نہیں، لیکن طیّب نہیں۔ جبکہ اللہ مومنین کے لئے صرف حلال کو نہیں، بلکہ حلال طیّب کو پسند فرماتا ہے۔ جیسا کہ آپ مذکورہ بالا آیات میں دیکھ چکے ہیں۔ مثلاً مرغی کا گوشت، دودھ بلاشبہ حلال طیّب ہیں لیکن اگر انہیں جوئے، رشوت سود وغیرہ کی دولت سے خریدا گیا تو صرف حلال ہیں طیب نہ رہیں، خبیث ہو گئیں۔ جبکہ مرضی الٰہی حلال طیب ہے۔ یہ تو اس کا کرم ہے کہ اس نے خبائث کو حرام قرار نہ دیا، حلال ہی رکھا۔ مؤمن کا کام اللہ کے کرم سے فائدہ اٹھانا ہی نہیں بلکہ اس کی شان رضائے الٰہی کی جستجو اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ پس اسے صرف حلال کے استعمال سے مطمئن نہیں ہونا چاہئے، بلکہ حلال طیّب کے حصول کی کوشش کرنا اور خبائث سے بچنا

چاہئے۔طیبت کی وضاحت کے لئے حرام اور خبائث میں فرق جاننا ضروری ہے جس کو ہم ایک مثال کے ذریعہ بیان کرتے ہیں تا کہ آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

ہمارے کپڑوں پر پیشاب کے چھینٹے پڑ گئے جو ہمیں نظر نہیں آرہے، پھر بھی ہم ان کپڑوں میں نماز پڑھنا تو درکنار انہیں ویسے بھی پہنے رہنا گوارا نہیں کرتے۔یہ بات پاکیزہ طبع لوگوں کی ہے۔ان غلیظ وخبیث طبع لوگوں کی نہیں جو پیشاب کر کے استنجا تک نہیں کرتے۔نہ جانے کتنا پیشاب ان کی رومالی میں جمع ہوتا رہتا ہے اور وہ اسی پاجامے کو پہنے پھرتے ہیں۔تو بات گندے لوگوں کی نہیں ہو رہی، پاکیزہ لوگوں کی ہو رہی ہے، کہ وہ ایسا کپڑا پہننا تک گوارا نہیں کرتے جس پر پیشاب کے چھینٹے پڑ جائیں۔اسے فوراً بدل لیتے ہیں، اسی لئے کہ پیشاب کا نجس و ناپاک ہونا واضح اور یقینی ہے۔بالکل اسی طرح جیسے حرام کا حرام ہونا واضح اور یقینی ہے۔لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ وہ کپڑا کیوں فوراً دھوتے یا تبدیل کرتے ہیں جس پر شربت، دودھ وغیرہ جیسی پاک چیز گر جاتی ہے۔آپ اس کو گندہ کہتے ہیں، ہاں یہ گندہ ہو گیا، ناپاک نہیں ہوا۔بس اسی طرح وہ گائے یا بکری کا گوشت جو حرام کی دولت سے خریدا گیا، حرام تو نہیں، ناپاک تو نہیں، حلال ہی ہے لیکن خبیث ہے، گندہ ہے طیب نہ رہا۔حیرت ہے آپ گندہ کپڑا ذرا دیر کے لئے برداشت نہیں کرتے اور گندہ خبیث گوشت کھائے چلے جاتے ہیں۔مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔کیا آپ صرف اتنے ہی پاکیزہ طبع اور صاف ستھرے ہیں کہ ظاہر چمکتا رہے، خون میں چاہے کتنی ہی گندگی مل جائے۔گندے لباس میں اگر آپ کی عزت محفل میں لوگوں کی نظروں میں نہیں رہتی تو خبائث سے باطن کو گندہ کر لینے کے بعد، اللہ کے نزدیک آپ کی عزت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔آپ لباس پر پاکیزہ چیزوں کا دھبہ برداشت نہیں کرتے، اللہ آپ کی حرام کی دولت کے داغ دھبے نہیں چاہتا۔آپ لباس صاف ستھرا اور چمکدار پسند کرتے ہیں اللہ اپنے بندوں کا دل چمکدار اور صاف ستھرا پسند فرماتا ہے۔اسی لئے فرمایا گیا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ (الشمس:۹-۱۰)

بیشک کامیاب ہوا جس نے اس (قلب) کو پاک صاف کر لیا، اور یقیناً ناکام ہوا جس نے اس (قلب) آلودہ کر لیا۔

تزکیہ، دل کو چمکانے کا نام ہے، جس کا ذریعہ طیّبت ہیں۔اور خبائث، قلب کو ایسا ہی آلودہ اور گندہ کر دیتے ہیں جیسے کپڑے پر گرنے والی چیزیں کپڑے کو گندہ کر دیتی ہیں۔تم کہتے ہو کہ انسان اچھے لباس میں باوقار نظر آتا ہے۔اللہ فرماتا ہے انسان کی ظاہری و باطنی کامیابی کا ذریعہ، قلب کی چمک، اس کا صاف وستھرا ہونا ہے۔لہٰذا حکم دیا گیا کہ ”اے ایمان والو، رزق طیب کھاؤ“ حرام سے بچو اور خبیث سے بھی بچو، ان دونوں سے دل گندا ہو جاتا ہے۔دل ہماری تجلیات، رحمتوں کے نزول کا مرکز و مقام ہے۔جب یہ چمکتا ہے، پاک وصاف ہوتا ہے تو اس پر ہماری تجلی ہوتی ہے۔ہماری رحمتیں برستی ہیں، مومن کو ہمارا اقرب حاصل ہوتا ہے، وہ مومن کامل بنتا ہے، صالح بنتا ہے، ولی بن جاتا ہے۔ہم اس کی دعاؤں کو شرف قبول عطا فرماتے ہیں۔اس کی پسند ہماری پسند بن جاتی ہے۔دنیا و آخرت کے خوف وغم سے وہ آزاد ہو جاتا ہے، ہم اسے حیاتِ طیبہ کی نعمت سے نوازتے ہیں۔مخلوق میں اس کی عزت ہوتی ہے، فرشتے اس پر رشک کرنے لگتے ہیں، وہ فرشتوں سے مرتبہ ومقام میں بلند ہو جاتا ہے،

ایسے ہی مومن کے لیے میرے آقا ﷺ مژدہ دیتے ہیں-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُؤْمِنُ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ بَعْضِ مَلٰٓئِكَتِهٖ-

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، مومن اللہ کے نزدیک بعض فرشتوں سے زیادہ عزت والا ہے۔ (ابن ماجہ)

یہ سب عظمتیں ان کے لئے ہیں جو حرام سے بھی بچتے ہیں اور خبائث سے بھی- صرف حلال طیب پر قناعت کرتے اور اللہ کا شکر کرتے ہیں- اور جو قلب کو حرام وخبائث سے ملوث وگندہ کر لیتے ہیں اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس گندگی اور غلاظت پر نادم وشرمندہ ہونے کی بجائے اس پر نازاں وفرحاں ہوتے ہیں، حلال طیب کی تلاش کرنے والوں کو حقیر اور بیوقوف سمجھتے ہیں، ان کی آنکھوں پر حرام کی چربی ایسی چھا جاتی ہے کہ انہیں برائی، اچھائی معلوم ہونے لگتی ہے- گندگی کو وہ صفائی اور پاکیزگی خیال کرنے لگتے ہیں- ان پر لگے ہوئے غلاظت کے یہ دھبے ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں اور بالآخر وہ اپنے انجام بد کو پہنچ کر رہتے ہیں، کہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں اور آخرت میں ان کے انجام کی خبر میرے آقا ﷺ نے دی جو آپ گزشتہ صفحات پر، بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پڑھ چکے ہیں- کہ ''وہ جسم جنت میں داخل نہ ہو گا جو حرام سے پلا ہو'' مزید ارشادات ملاحظہ ہوں-

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا وَّاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِیْنَ فَقَالَ یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ یَمُدُّ یَدَیْهِ اِلَى السَّمَآءِ یَارَبِّ یَا رَبِّ وَ مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَ غُذِیَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذَالِكَ-

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا- اللہ پاک ہے وہ صرف پاکیزہ چیزوں ہی کو قبول فرماتا ہے اور اللہ نے مومنین کو اسی کا حکم دیا، جس کا رسولوں کو حکم دیا- پس فرمایا اے رسولوں کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے اور نیک کام کرو، اور فرمایا اے مسلمانوں کھاؤ پاکیزہ رزق سے جو ہم نے تمہیں دیا، پھر آپ نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، اس کے بال بکھرے ہیں، چہرہ غبار آلود ہے، اس حال میں وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر پکارتا ہے، اے رب، اے رب، حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام کا ہے اور اس کا لباس حرام کا ہے- اور وہ حرام ہی سے پالا گیا ہے، تو ایسے شخص کی دعا کس طرح قبول کی جا سکتی ہے۔ (مسلم شریف)

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَ بَیْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَّا یَعْلَمُهُنَّ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَاَ

لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَ مَنْ وَّقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ كَالرَّاعِيْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ اَلَآ وَ اِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اِلَآ اِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ اَلَآ وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَآ وَهِيَ الْقَلْبُ۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچالیا اور جو مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوا، وہ حرام میں مبتلا ہوا، اس چرواہے کی طرح جو کھیت کی منڈیر پر اپنے جانور چرائے اور خطرہ رہے کہ کوئی جانور کھیت میں گھس جائے۔ خبردار بے شک ہر بادشاہ کی ایک حد مقرر ہے، خبردار بے شک اللہ کی حد اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ خبردار بیشک انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ ٹھیک ہوا سارا جسم ٹھیک ہو گیا اور جب وہ خراب ہو گیا سارا جسم خراب ہو گیا۔ خبردار، وہ دل ہے۔ (بخاری و مسلم)

مشتبہات سے پرہیز

ان دونوں حدیثوں پر غور فرمایئے۔ پہلی حدیث میں بتایا گیا کہ بندہ کتنی ہی عاجزی وانکساری کے ساتھ دعا کرے لیکن اگر اس کا کھانا پینا، پہننا سب کچھ حرام کا ہے تو اس کی دعا کبھی قبول نہیں ہوسکتی۔ دوسری حدیث بتارہی ہے کہ جسم کی قوت اور انسان کے اخلاق و کردار کا دارومدار دل پر ہے، اگر یہ دل ہی خراب ہو گیا تو انسان کا سارا جسم تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور دل کی خرابی کا سبب حرام خوری ہے، جس کا اظہار انسان کی بری عادتوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ کہ حرام خور میں احساس گناہ تک باقی نہیں رہتا، وہ اپنی بدکاریوں پر نازاں رہتا اور فخر کرتا ہے۔ پس فساد قلب انسان کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ جبکہ قلب کا صالح ہونا، انسان کے لیے باعزت پرسکون زندگی کا سبب بنتا ہے۔ قلب کی صالحیت اسی شخص کو نصیب ہوتی ہے جو کھانے پینے اور کمانے میں محتاط رہتا ہے۔ اتنا محتاط کہ نہ صرف حرام کو چھوڑتا ہے بلکہ مشکوک چیزوں سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ معمولی اور چھوٹی برائیوں کا عادی ہو جاتا ہے تو بڑے گناہوں میں مبتلا ہونا اس کے لئے دشوار نہیں رہتا۔ اور ایک نہ ایک دن وہ بھی قوم مجرم کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ مشکوک غذا اور دولت سے نہ بچنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ شک وشبہ والی چیزوں کے استعمال کا عادی ہو جانے کے بعد انہیں حرام کی پرواہ نہیں رہتی۔ حلال و حرام کا امتیاز تک باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے فطرت انسانی کو بخوبی جاننے والے، نبی مکرم علیہ السلام مشتبہ چیزوں کے استعمال کی ممانعت فرمارہے ہیں اور بڑی ہی اچھی مثال سے غلاموں کو تعلیم دے رہے ہیں کہ کھیت کی منڈیر پر جانور کیوں چراتے ہو۔ جو تمہیں جانور کے کھیت میں منہ مارنے کا خطرہ رہتا ہے۔ مشتبہ چیزیں کیوں استعمال کرتے ہو، مشتبہ دولت کیوں کماتے ہو، جو حرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے علماء ایسے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کو ممنوع قرار دیتے ہیں، جہاں حلال کے ساتھ حرام بھی بکتا ہو۔ نیز ایسی دوکانوں سے گوشت خریدنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں، جہاں حلال گوشت کے ساتھ خنزیر کا

گوشت وغیرہ بھی فروخت ہوتا ہو، آپ ایسے شخص پر کیسے اعتماد کر سکتے ہیں۔ جو چند پیسوں کے لیے مسلمان ہوتے ہوئے حرام کا کاروبار کرتا ہے، اس سے کیا بعید کہ وہ آپ کو حرام ہی کھلاتا ہو اور دھوکا دیتا ہو، پس اس معاملہ میں خصوصاً اُن مسلمانوں کو نہایت ہی احتیاط کرنا چاہئے جو غیر مسلم ممالک میں رہتے ہیں۔ جہاں بعض مسلم دوکاندار حرام وحلال دونوں کا کاروبار کرتے ہیں، بس اتنا کرم کرتے ہیں کہ حلال گوشت ایک طرف رکھتے ہیں اور حرام ایک طرف۔ کس قدر احمق ہیں ایسے لوگ جو دوسروں کو حلال کھلانے کا اہتمام کرتے ہیں اور خود اپنی کمائی کو حرام کی تجارت سے حرام کر لیتے ہیں۔ آپ کیسے یہ یقین کر سکتے ہیں کہ جو خود حرام سے نہیں بچ رہا، وہ آپ کو بچائے گا؟ بہر حال یہاں اگر حرام کا یقین نہیں تو شبہ ضرور ہے اور یہاں کی ہر چیز مشتبہ ہے۔ جس سے حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان کو پرہیز کرنا لازم ہے۔ مشتبہ غذا سے بچنے اور پرہیز کرنے میں مسلمان کو کتنا محتاط ہونا چاہئے، اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے کیجئے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ لِاَبِيْ بَكْرٍ غُلَامٌ يُخْرِجُ لَهُ الْخَرَاجَ فَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خَرَاجِهٖ فَجَآءَ يَوْمًا بِشَيْءٍ فَاَكَلَ مِنْهُ اَبُوْبَكْرٍ فَقَالَ لَهُ الْغُلَامُ تَدْرِيْ مَا هٰذَا فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَ مَا هُوَ قَالَ كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِاِنْسَانٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا اُحْسِنُ الْكِهَانَةَ اِلَّا اَنِّيْ خَدَعْتُهٗ فَلَقِيَنِيْ فَاَعْطَانِيْ بِذٰلِكَ فَهٰذَا الَّذِيْ اَكَلْتَ مِنْهُ قَالَتْ فَاَدْخَلَ اَبُوْبَكْرٍ يَدَهٗ فَقَآءَ كُلَّ شَيْءٍ فِيْ بَطْنِهٖ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک غلام تھا جو انہیں اپنی کمائی سے کچھ حصہ دیتا تھا۔ اور آپ اسے استعمال فرماتے تھے، تو ایک دن وہ کوئی چیز لے کر آیا اور آپ کو پیش کی آپ نے لے کر اسے تناول فرما لیا۔ پھر غلام نے آپ سے کہا، کیا آپ کو معلوم ہے یہ کیا تھا، آپ نے فرمایا، بتاؤ کیا تھا۔ غلام نے کہا زمانہ جاہلیت میں، میں نے ایک شخص کو آئندہ ہونے والی کچھ باتیں بتائیں، جبکہ میں کہانت کا فن کوئی خاص نہیں جانتا، میں نے تو اسے دھوکہ دیا تھا، پھر وہ مجھے ملا اور اس نے مجھے یہ چیز دی تھی جس میں سے آپ نے کھایا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں یہ سن کر حضرت ابوبکر نے اپنے منہ میں انگلی ڈالی اور جو کچھ آپ کے پیٹ میں تھا نکال دیا۔ (بخاری شریف)

یعنی دھوکے سے کمائی ہوئی چیز اُس غلام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھلا دی، جو اگرچہ بنفسہ جائز تھی لیکن بہر حال مشتبہ تھی، آپ نے احتیاط قے کی اور یہ پسند نہ فرمایا کہ ایسی غذا آپ کے پاکیزہ خون کا حصہ بنے۔ اور اب ہمارا کیا حال ہے۔ وہی جس کی خبر، مخبر صادق ﷺ چودہ سو برس پہلے دے چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ایک زمانہ آئے گا کہ انسان اس مال کے متعلق جو اس نے کمایا پروانہ کرے گا، کہ حلال ہے یا حرام۔ (بخاری شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث کو بار بار پڑھئے" ایسا زمانہ آئے گا کہ انسان حلال وحرام کی پروانہ کرے گا" - جائزہ لیجئے اپنے گرد و پیش کا اور سوچئے کیا وہ زمانہ نہیں آ گیا جس کی خبر مخبر صادق ﷺ دے رہے ہیں - آپ کو بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو حلال پر بخوشی قناعت کرتے ہوں اور حرام کو موقع ملنے، اس پر قدرت ہونے کے باوجود حرام سمجھ کر چھوڑتے ہوں - ورنہ یہی دیکھا اور سنا جاتا ہے کہ رشوت کی دولت کمانے والا، اسے اللہ کا فضل قرار دیتا ہے - سود کھانے والا اسے منافع کہہ کر خود لوگوں کو حتی کہ اللہ اور اس کے رسول کو دھوکہ دیتا ہے - لاٹری اور جوئے میں جیتے جانے والی دولت کو مقدر کی خوبی کہا جاتا ہے، یتیموں کا مال ہڑپ کر جانے والے اسے اپنا حق قرار دیتے ہیں - صاحبِ اقتدار اور ان کے مقربین بینکوں سے قوم کی دولت بطور قرض نکالتے ہیں پھر اسے معاف کرا کے اپنے مکر وفریب پر نازاں ہوتے ہیں - ستم ظریفی یہ کہ انہی مجرموں کو معاشرے میں عزت حاصل ہوتی ہے، حرام کی دولت سے شاندار گاڑیاں دوڑانے والے، بہترین بنگلوں میں رہنے والے ہی باعزت گردانے جاتے ہیں - حیرت یہ ہے کہ غریب جسے واقعی دولت کی ضرورت ہوتی ہے اس لوٹ مار میں بہت کم نظر آتا ہے - دولت مند ہی ان جرائم میں پائے جاتے ہیں، کہ انہیں ہوس بھی زیادہ ہوتی ہے اور ان کے پاس لوٹ وکھسوٹ کے وسائل بھی ہوتے ہیں - غرضیکہ حصولِ دولت میں حلال وحرام کی پروا کرنے والے اب آپ کو بہت ہی کم نظر آئیں گے - یہی حال کھانے پینے میں ہے - جو لوگ غیر مسلم ممالک میں آباد ہیں وہ اس بلا میں بری طرح مبتلا ہیں - کیونکہ ان ممالک میں حلال اگرچہ دشوار نہیں، لیکن تلاش ضرور کرنا پڑتا ہے اور یہ لوگ اس کی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتے - مثلاً ایسی دوکانیں موجود ہیں جہاں واقعی حلال گوشت فروخت ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ ان عام دوکانوں سے گوشت خریدتے ہیں جہاں حلال وحرام دونوں پائے جاتے ہیں - یہی وہ مشتبہ صورت ہے جس سے بچنے کا حکم دیا گیا -

بہر حال حرام سے بچنے کے لئے مشتبہات سے بچنا ضروری ہے - اس سلسلے میں ہمارے اسلاف کس قدر محتاط تھے - اس کا اندازہ کرنے کے لئے چند بزرگوں کا حال ملاحظہ ہو، کہ بزرگوں کی زندگی کے حالات ہمارے لئے مذہب کی پابندی کا نمونہ ہیں - اور ان کو جاننے سے احکام شریعت کی تعمیل آسان ہوتی ہے -

حضرت امام حنبل رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں ایک دوکاندار کے پاس اپنا ایک طشتِ گروی رکھ کر اس سے کچھ قرضہ لیا، مقررہ وقت پر قرضہ واپس کرنے گئے تو دوکاندار نے آپ کے سامنے دو طشت رکھ دیئے اور کہا مجھے نہیں معلوم آپ کا کون سا ہے، ان دونوں میں سے جو چاہیں آپ لے لیں، آپ نے فرمایا میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا کون سا ہے اور کوئی مشتبہ چیز میرے لئے حلال نہیں - لہٰذا میں اپنا طشت چھوڑتا ہوں، تم ہی رکھو - دوکاندار نے کہا نہیں، یہ طشت آپ کا ہے، میں تو آپ کو آزما رہا تھا - آپ نے فرمایا تم اپنا قرض واپس لو اور طشت بھی رکھو اب میں اسے نہیں لے سکتا، تم نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا، آپ طشت چھوڑ کر چل دیئے -

حضرت امام حنبل کی خدمت میں بُشر بن حارث حافی رحمۃ اللہ علیہ کی بہن حاضر ہوئیں اور سوال کیا، میں چھت پر بیٹھ کر سوت کاتتی ہوں - رات کو شاہی سواریاں گزرتی ہیں تو ان کی مشعلوں کی روشنی ہماری چھت پر پڑتی ہے - کیا میں اس روشنی میں سوت کات سکتی ہوں - آپ نے فرمایا، اللہ تم پر رحم کرے، تم کون ہو - عرض کیا میں بُشر بن حارث کی بہن ہوں - فرمایا

تمہارے گھر سے تو تقویٰ و پرہیزگاری کا دریا بہتا ہے تم مشعلوں کی روشنی میں سوت نہ کاتا کرو- کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی مشعل کی روشنی سے بھی فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں-

حضرت رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا نے ایک مرتبہ شاہی مشعل کی روشنی میں اپنی پھٹی ہوئی قمیص سی لی اور پہن لی- آپ کو اپنے دل کی حالت کچھ بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی- کئی دن رات پریشان رہیں- کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے- اچانک قمیص کا خیال آیا، آپ نے اسے اتار کر پھینک دیا- دل کی حالت درست ہوگئی پھر وہی نور پیدا ہو گیا، جو پہلے تھا- یہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ کسی کی روشنی سے آپ نے اس کی اجازت کے بغیر فائدہ حاصل کیا تھا-

اس قسم کے بے شمار واقعات بزرگوں کی سیرت میں موجود ہیں، جو اگرچہ تقوے کی انتہائی اور بلند ترین منزل کا پتہ دیتے ہیں- ہمارا وہ مقام کہاں، تاہم اگر ہم ان چیزوں سے پرہیز نہیں کر پاتے، جن کا مشتبہ ہونا بمشکل معلوم ہوتا ہے تو ہمیں اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے ایسی چیزوں سے تو لازماً بچنا چاہئے جن کا حرام ہونا، حلال ہونے سے زیادہ واضح ہے- لیکن ہم تو دین سے لاپرواہی کا اتنا شکار ہو چکے ہیں کہ حلال و حرام کا امتیاز تو درکنار حرام کو حلال سمجھنے لگے ہیں۔

بہرحال اللہ چاہتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ چاہتے ہیں کہ مؤمن طیّبات، حلال پاکیزہ رزق کھائے، مشتبہات تک سے بچے، واضح حلال کھائے اور واضح حلال کمائے، کہ رزق حلال صرف جسم کی نہیں روح کی بھی غذا ہے- اس سے صرف جسم ہی کو نہیں، روح کو بھی تقویت حاصل ہوتی ہے- یہی اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کا بنیادی ذریعہ ہے- رزق حلال مومن کے چہرے کو باوقار بناتا ہے، بارونق اور پرکشش کر دیتا ہے- دل منور اور روشن ہو جاتا ہے- گناہوں اور برائیوں سے نفرت پیدا ہوتی ہے- شریعت کی پابندی سہل ہو جاتی ہے، رزق حلال کھانے والا ہر قسم کی بدکاری اور بدکرداری سے محفوظ رہتا ہے- اس کے اخلاق و اطوار حسین ہو جاتے ہیں- اس کا دل نرم ہو جاتا ہے- لوگوں کو ستانے، ان پر ظلم کرنے، ان کا حق مارنے کی اس میں جرأت نہیں رہتی- بغض، کینہ، حسد، غیبت، دوسروں کی عیب جوئی، دوسروں کا برا چاہنا، بدترین عیب اور مہلک بیماریاں ہیں- جو مومن حلال کی روزی کھاتا ہے وہ ان امراض سے محفوظ رہتا ہے، گویا رزق حلال، مومن میں انسانیت، شرافت، محبت، ظرافت، قناعت، صبر و شکر کے ایسے موتی چمکا دیتا ہے کہ وہ معاشرے کی نظر میں باعزت ہو جاتا ہے اور زندگی کے ہر مرحلے میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔

رزق حلال کی تلاش بڑا جہاد ہے، بڑی عبادت ہے کہ اسی کے کھانے سے مومن میں شجاعت و بہادری کا جوہر پیدا ہوتا ہے- یہی عبادات میں اثر پیدا کرتا ہے، جس معاشرے کے افراد رزق حلال کے پابند ہو جاتے ہیں اس سے گناہوں، بدکاریوں اور برائیوں کی لعنت ختم ہو جاتی ہے- وہاں نہ رشوت ہوتی ہے، نہ جوا، نہ شراب و زنا کا انتشار ہوتا ہے نہ ظلم و ستم کی مار- بے حد پرسکون زندگی ہو جاتی ہے- آج جن ممالک میں اسلامی نظام کی تحریک چل رہی ہے، حکومت سے نفاذ اسلام کے مطالبہ ہو رہے ہیں، اس مقصد کے لئے قائدین تحریک عوام کو کٹوا رہے ہیں، ملک کو سیاسی و معاشی بحران کا شکار بنا رہے ہیں، کاش وہ اس نکتہ پر غور کریں کہ بدکرداروں، حرام خوروں پر اگر اسلامی نظام کو مسلط کر بھی دیا جائے تب بھی اس کا مقصد یعنی امن و امان اور پرسکون زندگی میسر نہیں آ سکتا- پس قوم کے وسائل کو، قوت کو غلط راہ پر ضائع کرنے کے بجائے اسلام کی تبلیغ

کرنے، اور گھر گھر اس کا پیغام پہنچانے پر صرف کیا جائے کہ افراد کی اصلاح ہو وہ بدکرداری اور حرام خوری سے باز آ جائیں۔ ذاتی زندگی میں اسلام کے احکام کی تعمیل کرنے لگیں تو یقین جانئے خود بخود اسلامی نظام برپا ہو جائے گا، نہ مطالبہ کی ضرورت باقی رہے گی نہ کوئی تحریک چلانے کی۔

غرضیکہ رزق حلال کا حصول اور اس کا کھانا بڑا ہی بابرکت ہے، جسے یہ نصیب ہو گیا اسے اللہ کی ایک بڑی نعمت مل گئی۔ اسی لئے آیہ مبارکہ میں "طیبات" کھانے کا حکم دینے کے ساتھ ہی شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا، تو آیئے "شکر" سے متعلق چند سطور کا مطالعہ کر لیجئے۔

شکر

شکر، کسی محسن کے احسان کو یاد کر کے اس کی تعریف کرنا ہے۔ اللہ سے زیادہ احسان فرمانے والا کون ہو سکتا ہے۔ پس اسی کا حق ہے کہ بندہ اس کو یاد کرے اور اس کی تعریف کرے۔ تقاضائے عبدیت و بندگی بھی یہی ہے، جو بندہ مالک کو یاد کرتا اور اس کی تعریف کرتا رہتا ہے اس پر مالک کی عنایات کی بارش جاری رہتی ہے، اسی لئے مالک حقیقی نے اپنا اصول بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَ لَىٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ○

(ابراہیم: ۷)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے تمہیں آگاہ فرمایا، کہ اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً تمہیں اور زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو بیشک میرا عذاب ضرور سخت ہے۔

میرے آقا ﷺ جن کی ادائیں، تفسیر قرآن ہیں، اس آیہ مبارکہ کا عملی نمونہ پیش فرماتے ہیں۔

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ مَكَّةَ نُرِیْدُ الْمَدِیْنَةَ فَلَمَّا كُنَّا قَرِیْبًا مِّنْ عَزْوَرَآءَ نَزَلَ ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْهِ فَدَعَا اللّٰهَ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا فَمَكَثَ طَوِیْلًا ثُمَّ قَامَ فَرَفَعَ یَدَیْهِ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا فَمَكَثَ طَوِیْلًا ثُمَّ قَامَ فَرَفَعَ یَدَیْهِ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا قَالَ اِنِّیْ سَاَلْتُ رَبِّیْ وَشَفَعْتُ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ ثُلُثَ اُمَّتِیْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّیْ شُكْرًا ثُمَّ رَفَعْتُ رَاْسِیْ فَسَاَلْتُ رَبِّیْ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ ثُلُثَ اُمَّتِیْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّیْ شُكْرًا ثُمَّ رَفَعْتُ رَاْسِیْ فَسَاَلْتُ رَبِّیْ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ الثُّلُثَ الْاٰخِرَ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِّرَبِّیْ۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو جب ہم مقام غزوزاء پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ حضور علیہ السلام نے دست مبارک اٹھائے اور تھوڑی دیر دعا کی، پھر آپ نے سجدہ کیا، اور لمبا سجدہ کیا، پھر کھڑے ہوئے ہاتھ اٹھائے اور تھوڑی دیر دعا کی۔ پھر سجدے میں چلے گئے، فارغ ہو کر آپ نے فرمایا، میں نے اپنے رب سے امت

کی شفاعت کی تو اس نے مجھے تہائی امت کی شفاعت کا حق دیا، تو میں نے سجدہ شکر ادا کیا، پھر میں نے سر اٹھایا اور اپنے رب سے امت کے لئے دعا کی تو رب نے مجھے میری دو تہائی امت عطا فرما دی، تو میں نے سجدہ شکر ادا کیا- پھر میں نے سر اٹھایا اور اپنے رب سے امت کے لئے دعا کی تو رب نے مجھے باقی تہائی امت بھی عطا فرما دی، تو پھر میں نے اپنے رب کے لئے سجدہ کیا۔ (ابوداؤد)

اللہ کے رسول ﷺ ہر مرتبہ مقبولیت دعا پر سجدہ شکر ادا کرتے رہے اور رب کریم اپنی نعمت میں اضافہ فرماتا رہا- کہ اس کا یہی اصول ہے، یہی وعدہ ہے "اگر تم شکر کرو گے، تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا"-

حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، ام المومنین، آپ مجھے حضور علیہ السلام کی سب سے عمدہ اور اعلیٰ بات بتائیں جو آپ نے دیکھی ہو- یہ سن کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا، آپ کی کون سی بات ایسی تھی جو عمدہ اور اعلیٰ نہ ہو- ایک مرتبہ رات کو آپ میرے ساتھ بستر میں آرام فرما رہے تھے- جو مجھے نہایت ہی پسند تھا- آپ نے فرمایا، اے ابوبکر کی بیٹی، تم مجھے اپنے رب کی عبادت کرنے دو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، مجھے آپ کا قرب پسند ہے- لیکن میں آپ کی مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح دیتی ہوں- پس آپ اٹھے، مشک کے پاس تشریف لے گئے اور اچھی طرح وضو فرمایا- پھر آپ نے نماز شروع کی اور قیام کی حالت میں اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو سینہ مبارک تک بہنے لگے- پھر آپ نے رکوع، سجدہ کیا اور اس حالت میں بھی آپ کے آنسو جاری رہے- یہاں تک کہ حضرت بلال آئے اور نماز فجر کی اطلاع دی- میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، جب اللہ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے تو پھر اللہ کے دربار میں اس قدر رونے کا کیا سبب ہے۔ آپ نے فرمایا "تو کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں"۔ یہ ہے نمونہ شکر جو اسوہ کامل، نبی مکرم علیہ السلام کی ذات میں ہمیں ملتا ہے۔ مزید ایک روایت ملاحظہ ہو۔

عَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ فَقِيْلَ لَهٗ لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا وَقَدْ غُفِرَلَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَأَخَّرَ قَالَ اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا-

حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے رات میں قیام فرمایا، جس سے آپ کے مبارک پیروں پر ورم آ گیا، تو آپ سے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ (بخاری و مسلم)

بہر حال قانون الٰہی یہ ہے کہ شکر گزاروں پر نعمتوں کی بارش ہوتی ہے- ان کے لئے رحمتوں کے دروازے وا اور کشادہ رہتے ہیں- رب شکر کو پسند فرماتا ہے اور شکر گزار بندوں کے جان و مال کا محافظ بن جاتا ہے- ان کے مال و منال میں برکت رہتی ہے، ان کے گھروں میں سکون اور شہروں میں امن و امان ہوتا ہے- شکر گزار افراد اور قوموں میں میل و محبت اور اتحاد و اتفاق کی دولت وافر ہوتی ہے اور ناشکروں پر اللہ کا عذاب مسلط ہوتا ہے- جس گھر کے افراد ناشکرے ہو جاتے ہیں کہ

کبھی اللہ کے دربار میں سر نہیں جھکاتے، کبھی اللہ کے کلام کی تلاوت نہیں کرتے، ان کی دولت کا کوئی پیسہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں ہوتا ایسے ہی لوگ تو ناشکرے ہیں۔ ان کے گھروں میں طرح طرح کی آفات و بلیات، بیماریاں، تنگدستی، آپس کے جھگڑے، برکت نہ ہونے کا شکوہ، یہی چیزیں نظر آئیں گی۔ اور جس قوم میں ناشکری کی وبا عام ہو جائے وہ معاشی تنگی کا شکار، مہنگائی کے عذاب میں مبتلا، انتشار و افتراق میں الجھی ہوئی، اندرونی و بیرونی دشمن سے خوفزدہ، لوٹ، مار، قتل و غارت گری سے کانپتی ہوئی نظر آئے گی۔ گویا شکر زندگی کو پرسکون بناتا ہے اور ناشکری عذاب الٰہی کا باعث بنتی ہے۔ قرآن کریم میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ جیسے قوم لوط نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی جو بڑی ہی ناشکری ہے، کہ رسولوں کی بعثت انسان پر اللہ کا سب سے عظیم انعام ہے۔ ان کی تکذیب یعنی نافرمانی، توہین، گستاخی انعام الٰہی کو ٹھکرانا اور اس کی ناشکری کرنا ہے۔ جس میں قوم لوط مبتلا ہوئی، اللہ نے ان پر پتھر برسائے اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن انہی میں کچھ شکرگزار بندے بھی تھے جو عذاب الٰہی سے محفوظ رہے کہ اللہ اپنے شکرگزار بندوں کی جس طرح چاہتا ہے حفاظت فرماتا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝ (القمر: ۳۳ تا ۳۵)

قوم لوط نے جھٹلایا پیغمبروں کو، بیشک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ہوا بھیجی، سوائے آل لوط کے کہ ہم نے ان کو رات کے پچھلے حصہ میں بچا لیا، اپنی طرف سے (خاص) احسان فرما کر اسی طرح ہم (اس کو) بدلہ دیتے ہیں جو شکر کرتا ہے۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتماد نہ کرتے ہوئے اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ اس گستاخی کے سبب ان پر بجلی کی کڑک کا عذاب نازل ہوا جس سے وہ سب مردہ ہو گئے۔ نبی نے اپنے رب سے ان کو دوبارہ زندہ کرنے کی دعا کی، رب نے نبی کے صدقہ میں انہیں ایک دن اور ایک رات مردہ رکھنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیا یہ ایک بڑا احسان تھا جو اس لئے کیا گیا کہ بنی اسرائیل اللہ کے شکرگزار بندے بنیں، فرمایا گیا۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (البقرہ: ۵۶)

پھر ہم نے تمہارے مرنے کے بعد تمہیں زندہ کیا تاکہ تم (ہمارا) شکر ادا کرو۔

انعامات الٰہیہ پر شکر

آیئے قرآن پاک کی ایسی چند آیات کا مطالعہ کریں جن میں اللہ رب العزت نے اپنے انعامات کا تذکرہ فرماتے ہوئے بندوں سے شکر کا مطالبہ کیا اور بتایا کہ تمام احسانات ہم نے تم پر اسی لئے کیے ہیں کہ تم شکرگزار بندے بنو، جو اعتراف بندگی کا سب سے پہلا ذریعہ ہے اور درحقیقت تمام عبادات و اعمال شکر ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ پس بندہ جو کچھ کرے رب کے شکر ہی کی نیت سے کرے۔

نبی مکرم علیہ السلام کے غلاموں سے شکر کا مطالبہ کرتے ہوئے اپنے احسانات یاد دلائے گئے کہ تم سرزمین مکہ میں کیسے مظلوم و خوفزدہ تھے۔ کفار تمہیں کتنا ستاتے اور تنگ کرتے تھے۔ اللہ نے احسان فرمایا کہ مدینہ منورہ کو تمہارے لئے پناہ گاہ

بنا دیا، پھر تمہیں ایسی قوت و طاقت بخشی کہ جن سے تم ڈرتے تھے وہ تم سے کانپنے لگے- پہلے مقابلہ بدر میں تمہیں ظالموں پر غالب کر دیا، تم معاشی تنگی کا شکار تھے جس کے سبب تمہاری کہیں عزت نہ تھی، رب نے احسان فرمایا، تمہارے لئے رزق طیب کے دروازے کھول دیئے- قیصر و کسریٰ کے خزانے تک تمہارے قدموں میں آ گئے- پس تمہاری عزت ہونے لگی- بکریاں چرانے والے دنیا کے سب سے بڑے حکمران بن گئے- ان انعامات سے اس لئے نوازا گیا کہ تم شکر گزار بندے بنو-

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (الانفال:۲۶)

اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، زمین پر بے بس تھے تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں، تو اس (اللہ) نے تمہیں ٹھکانا دیا، اور اپنی مدد سے تمہیں قوت بخشی اور پاکیزہ چیزوں سے تمہیں روزی دی، تاکہ تم شکر کرتے رہو-

ماہ رمضان میں روزے کی فرضیت کا اعلان فرماتے ہوئے رمضان کی عظمت بیان کی گئی کہ یہ بنی نوع انسان کے لئے ذریعہ ہدایت، کتاب قرآن عظیم کے نزول کا بابرکت مہینہ ہے جو اسی لائق ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے اس کا ہر لمحہ، صاحب قرآن کی ہدایت کے مطابق اللہ کی عبادت میں گزاریں اور جو مسافر ہوں یا بیمار ہوں وہ روزے قضا کر لیں کہ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے- تمہیں جنت میں پہنچانے کا ایک بہانہ چاہتا ہے- تمہیں کسی دشواری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا ہے- پس انتیس یا تیس دن کے روزے پورے کرلو- جب چاند نظر آ جائے تو اللہ کی طرف سے قرآن ملنے، روزے رکھنے کی توفیق نصیب ہونے پر خوشی مناؤ، عید مناؤ- اس طرح کہ اسی رب کو یاد کرو، اسی کی بڑائی بیان کرو جس نے تم پر یہ انعامات فرمائے- یہ انعامات اس لئے کیے کہ تم رب کریم کے شکر گزار بندے بنو-

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ٘ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (البقرہ:۱۸۵)

اللہ تم پر آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تنگی کا ارادہ نہیں فرماتا، اور تاکہ تم گنتی پوری کرلو، اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ تمہیں اللہ نے ہدایت دی، اور تاکہ تم (ہمارا) شکر ادا کرو-

غزوہ بدر کے موقع پر مسلمان مالی، معاشی، افرادی ہر حالت میں کمزور تھے- کفار نے جنگ مسلط کر دی اور اہل ایمان نے اپنی کمزوری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، اپنے آقا ﷺ کی تعمیل حکم کی- تین سو تیرہ افراد نے دشمن کی بڑی تعداد کا مقابلہ کیا- دنیا حیرت زدہ ہو گئی کہ کمزور طاقتوروں پر غالب ہوئے، کامیاب ہوئے- غزوہ بدر کا مفصل ایمان افروز حال جاننے کے لئے ہماری کتاب ''یوم الفرقان'' کا مطالعہ کیجئے- اللہ رب العزت نے اس غزوے میں اہل ایمان پر خصوصی انعام فرمایا- ان کی غیبی مدد کی- فرمایا یہ انعام اسی لئے کیا گیا کہ تم رب رحیم کا شکر ادا کرتے رہو-

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ١ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۱۲۳ (آل عمران: ۱۲۳)

اور بیشک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی، اس حال میں کہ تم (اس وقت) کمزور تھے تو اللہ سے ڈرو، تاکہ تم

شکر گزار ہو جاؤ۔

شریعت مطہرہ میں تیمم ایک بڑی نعمت ہے کہ طہارت و پاکیزگی کا عادی مومن بندہ جب سخت بیماری یا پانی نہ ملنے کی وجہ سے غسل یا وضو نہ کر سکے تو وہ مضطرو بے چین نہ ہو، کہ اللہ کو اپنے بندوں کی تنگی و پریشانی گوارا نہیں وہ تو صرف انہیں پاک و صاف رکھنا چاہتا ہے، جس کے لئے پانی لازمی نہیں، اس کے حکم کی تعمیل لازمی ہے۔ پس جب ایسی صورت پیش آ جائے کہ پانی کا استعمال نقصان دہ ہو یا پانی ملتا ہی نہ ہو تو تیمم کر لیا جائے۔ اللہ کا بندہ اللہ کے نزدیک پاک ہو جائے گا۔ کیسی آسانی کر دی گئی، کیسی نعمت دی گئی۔ تمہیں سب نعمتیں دی جائیں گی پس تم شکر ادا کرتے رہو۔

مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (المائدہ:٦)

اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے، لیکن اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک کر دے اور تم پر اپنی نعمت کو پوری کر دے تا کہ تم شکر کرو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر قابو عطا فرمایا کہ وہ اسے اپنی قوت و طاقت اور عقل سے کھودتا ہے۔ اس سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے، اپنی رہائش کے لئے اس پر جس طرح چاہتا ہے عمارتیں بناتا ہے۔ پھر زمین کو قوت روئیدگی بخشی کہ وہ انسان کے لئے رزق طیب اگاتی ہے۔ ان عظیم انعامات کا تقاضہ تو یہ ہے کہ انسان اللہ کا بہت ہی شکر ادا کرے، لیکن انسان ناشکرا ہے، بہت کم شکر ادا کرتا ہے۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝ (الاعراف:١٠)

اور بیشک ہم نے تمہیں زمین میں قوت کے ساتھ ٹھہرایا اور بنائے اس میں تمہارے لئے زندگی کے اسباب، تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو۔

سورۃ النحل کا دوسرا رکوع

سورۃ النحل کے دوسرے رکوع کا مطالعہ کیجئے، رب کریم اپنے بے شمار انعامات میں سے چند کا ذکر فرماتا ہے، کہ اللہ نے تمہارے لئے پانی جیسی عظیم نعمت پیدا کی، جس پر تمہاری اور تمہارے جانوروں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اسی سے تمہارے لئے طرح طرح کے پھل پھول اور سبزہ اُگتا ہے۔ اس نے تمہارے ہی لئے سورج، چاند اور تاروں کو پیدا کیا، جن سے دن، رات کی روشنی اور آسمانوں کی پرکشش زینت کے علاوہ تمہارے ہزاروں فائدے ہیں۔ اسی نے زمین سے مختلف انواع کی چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں اور ان پر تمہیں رسائی کی قوت و عقل عطا فرمائی کہ تم اپنے کھانے کی مفید و لذیذ چیزوں کو پہچان لیتے ہو۔ زمین کھود کر سونا، چاندی اور دیگر معدنیات حاصل کر لیتے ہیں۔ تیل، گیس جیسی نعمتوں کو پا لیتے ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے سمندر کو مسخر و مطیع بنا دیا، جس سے تم اپنی غذا کے لئے مچھلی کا صحت بخش گوشت حاصل کرتے ہو۔ چمکتے قیمتی پتھر نکالتے ہو، اس پر کشتیاں اور جہاز دوڑاتے ہو۔ غور کرو یہ اللہ کے کیسے عظیم انعامات ہیں۔ اللہ تم سے ان کے بدلے کچھ نہیں

چاہتا، اور تمہارے پاس ہے ہی کیا جو تم اللہ بے نیاز کو دے سکو- پس تم بندے بنے رہو، ہماری نعمتوں سے خوب مزے اڑاؤ، صرف ہمارا شکرادا کرتے رہو-

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (النحل: ۱۴)

اور وہی ہے (اللہ) جس نے تمہارے لئے دریا کو مسخر کیا، کہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ، اور تم اس میں سے زیور نکالتے ہو، جسے تم پہنتے ہو، اور تم دریا میں کشتیاں دیکھتے ہو جو پانی چیر کر اس میں چلتی ہیں، اور (یہ) اس لئے کہ تم اس کا فضل (رزق) تلاش کرو اور تا کہ تم شکرادا کرتے رہو-

اللہ کی اس نعمت پر بھی غور کرو کہ اس نے تمہیں ماں کے پیٹ سے پیدا کیا، جہاں چند روز نہیں، نو ماہ وہ تمہیں غذا بہم پہنچاتا رہا اور تمہارے جسم کی پرورش کرتا رہا- پھر جب تم اس دنیا میں آئے تو تمہاری حالت یہ تھی کہ جس ماں کے پیٹ میں تم نو مہینے رہے اس کو بھی پہچاننے کی تم میں صلاحیت نہ تھی، رب نے کیسا تم پر کرم کیا کہ تمہیں کان دیئے، آنکھیں دیں، دل دیا، تم ماں کو بھی پہچاننے لگے، باپ کو بھی اعزاء اقرباء کو بھی- حتی کہ تم اپنے معاش اور روزی حاصل کرنے، اپنی خواہشات کی تکمیل کے طریقوں کو بھی پہچاننے لگے، لیکن افسوس کہ انسان نے اس کو نہ پہچانا، جس نے اپنے فضل وکرم سے اس کو سب کچھ پہچاننے کی صلاحیت عطا فرمائی- ایسا انسان بڑا ہی ظالم ہے- رب نے تمہیں ان انعامات سے صرف اس لئے نوازا کہ تم اس کا شکرادا کرتے رہو، جو رب کو پہچاننے کا سب سے بڑا ثبوت ہے-

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْــٴًـاۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (النحل: ۷۸)

اور اللہ نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں پیدا کیا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے- اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم شکرادا کرو-

اللہ ہی نے تمہیں سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں اور دل جیسی نعمت عطا فرمائی- جن کی اہمیت کا اندازہ ان لوگوں کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے جو ان نعمتوں سے محروم ہیں- ان پر تم جتنا بھی شکرادا کرو، کم ہے- لیکن تم بہت ہی کم شکرادا کرتے ہو-

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

(المومنون: ۷۸)

اور اللہ وہی ہے جس نے بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل (مگر) تم بہت ہی کم شکرادا کرتے ہو-

اللہ رب العزت کا یہ انعام کتنا عظیم ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات بنائی، دن بنایا کہ رات کی تاریکی میں تم آرام کرتے ہو، جس سے جسم تروتازہ اور جاندار رہتا ہے اور دن کی روشنی میں تم اپنا معاش اور رزق تلاش کرتے ہو- پس ہونا

یہ چاہیے کہ جب تم رات کو آرام کرو، چین کی نیند سوؤ، تو رات بنانے والے خالق کو یاد کرو- اور جب تم دن میں دولت کماؤ، کاروبار کرو تو بھی اسی کو یاد کرتے رہو، اور رب کی یاد ہی اس کا بڑا شکر ہے-

وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (القصص: ۷۳)

اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات، دن کو بنایا تا کہ تم (رات) میں آرام کرو اور (دن میں) اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر ادا کرتے رہو-

اللہ کریم کیسی صحت افزاء ہوائیں چلاتا ہے، جن سے تمہارے دل و دماغ تروتازہ ہو جاتے ہیں- پانی برسنے کی خوشخبری ملتی ہے، جس سے فصلیں اچھی ہونے کی امید بندھتی ہے اور اس سے دریاؤں، سمندروں میں کشتیاں اور جہاز چلانا آسان ہو جاتا ہے- ان معتدل ہواؤں کی قدر و منزلت بتانے ہی کے لئے کبھی اللہ ان ہواؤں کو طوفانی بنا دیتا ہے، جس سے تمہارا سب کچھ تباہ و برباد ہو جاتا ہے- یہ ریاحِ مُبَشِّرات اسی لئے بھیجی جاتی ہیں کہ تم اللہ کا شکر ادا کرتے رہو-

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (الروم: ۴۶)

اور اس کی نشانیوں میں سے خوشخبری دینے والی ہواؤں کا بھیجنا اور اس لئے کہ وہ تمہیں اپنی رحمت سے چکھائے اور تا کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور اس لئے کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر ادا کرتے رہو-

اللہ تبارک وتعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے- اس نے ہر چیز کو اس کے مقصدِ تخلیق اور استعداد کے مطابق احسن، نہایت ہی کامل و مکمل پیدا فرمایا، کہ اس میں نہ کسی کمی کی اور نہ ہی زیادتی کی گنجائش چھوڑی- بالخصوص انسان اس کے کمالِ تخلیق کا عظیم نمونہ ہے، کہ اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسانِ اول کو مٹی جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا اور پھر نسلِ انسانی کو ایک نہایت ہی کمزور پانی کی بوند سے جاری فرمایا، جو رحمِ مادر میں نو ماہ تک تخلیق کے مختلف مراحل طے کرتی ہے- کہ یہ بوند، خون کی پھٹک سے بنتی ہے، پھر گوشت کا لوتھڑا، جس کا کچھ حصہ سخت ہو کر ہڈیوں میں تبدیل ہوتا ہے- کوئی حصہ جگر، گردوں، دل وغیرہ کی صورت اختیار کرتا ہے- پھر اسی سے ہاتھ، پیر اور انسانی شکل بننے لگتی ہے- حتیٰ کہ اس میں وہ روح ڈال دی جاتی ہے جس کی حقیقت کو سمجھنے سے انسان کی عقل عاجز ہے- بس انسان اس کو اتنا ہی سمجھ سکتا ہے کہ ''روح اللہ کا حکم ہے'' اپنی تخلیق کو ان مراحل کے حیرت انگیز طور پر طے کرنے والے انسان کو بے حد و حساب اپنے خالق کا شکر ادا کرنا چاہئے لیکن وہ بہت کم شکر ادا کرتا ہے-

الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝ (السجدہ: ۷ تا ۹)

اللہ وہ ہے جس نے ہر چیز کو نہایت ہی کامل بنایا اور انسان کی پیدائش کی ابتداء مٹی سے فرمائی- پھر اس

کی نسل بے وقعت پانی کے نچوڑ سے چلائی- پھر اسے برابر کیا- اور اپنی طرف سے روح پھونکی اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے ،لیکن تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو۔

اللہ کی عظیم قدرت کا کرشمہ تو دیکھو، کہ ایک سمندر میں دو قسم کا پانی ہے، ایک نہایت میٹھا، خوش ذائقہ، دوسرا نہایت نمکین، بدذائقہ، کڑوا- دونوں آپس میں ملنے کے باوجود اک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوتے- مزے کی بات یہ کہ دونوں میں مچھلیاں ہوتی ہیں، جن کا گوشت تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے، یہ نہیں کہ کڑوے پانی کا گوشت بھی کڑوا ہو، جو کھایا نہ جا سکے- مزید یہ کہ ہماری زیب و زینت کے لئے اس نے سمندر میں قیمتی موتی، جواہرات اور مرجان پیدا فرمائے- نیز اللہ کا یہ احسان دیکھو کہ اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کشتیاں پانی کو چیرتی کیسے دوڑتی ہیں، جو مختلف ممالک سے تجارت کرنے اور ایک دوسرے سے علمی وفنی فوائد حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ ہے- اللہ نے یہ انعامات اسی لئے کیے کہ تم شکر کرو۔

وَمَا يَسْتَوِى الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۖ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (فاطر: ۱۲)

اور دونوں سمندر ایک جیسے نہیں یہ (ایک) میٹھا ہے، بہت میٹھا، اس کا پانی نہایت خوشگوار ہے اور یہ (دوسرا) نمکین، سخت کڑوا ہے- اور تم ہر ایک میں سے تازہ گوشت نکالتے ہو اور زیور نکالتے ہو جسے تم پہنتے ہو، اور تم اس (پانی) میں کشتیوں کو دیکھتے ہو جو پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں، تاکہ تم اس کا فضل (رزق) تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔

اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت کیا قابل غور نہیں کہ وہ کس طرح بنجر و مردہ زمین کو قوت روئیدگی بخشتا ہے، جس سے تمہارے لئے قوت و فرحت بخش غذا مہیا ہوتی ہے- ہزاروں قسم کے پھل، پھول تمہیں میسر آتے ہیں- اسی زمین میں کھجور کے تناور درخت، آسمان سے باتیں کرتے اُگتے ہیں اور اسی سے انگور کی نازک بیل پھیلتی ہے، اسی سے فراہمی آب کا ایک نظام چشموں کی صورت میں جاری ہوتا ہے- یہ طرح طرح کے درخت، ان سے نکلنے والے پھل پھول تمہارے ہاتھوں نے تو نہیں بنائے، اللہ ہی کا تو تم پر احسان ہے، پھر بھی تم شکر نہیں کرتے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (یٰسین: ۳۵)

اور مردہ زمین میں بھی ان کیلئے نشانی ہے، جسے ہم نے زندہ کیا، اور اس سے ہم نے غلہ نکالا، تو وہ اس سے کھاتے ہیں، اور ہم نے اس میں باغ بنائے کھجوروں اور انگوروں کے اور ہم نے اس میں کچھ چشمے جاری کیے تاکہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور نہیں بنایا اسے ان کے ہاتھوں نے، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے-

اللہ کا یہ انعام بھی دیکھیے، کہ اس نے اپنے دست قدرت سے بنائے ہوئے عظیم الجثہ مویشیوں کا انسان کو مالک بنا

دیا اور انہیں اس کے تابع کر دیا، کہ اونٹ جیسے جانور کی ناک میں رسی ڈال کر، وہ جدھر چاہتا ہے، اس کو لے جاتا ہے، ان جانوروں پر انسان سواری کرتا ہے، سامان لادتا ہے، حتیٰ کہ انہی کو اپنی غذا بھی بناتا ہے، ہزاروں فائدے ہیں جو انسان ان سے حاصل کرتا ہے۔ اگر ہمارا کرم نہ ہو، اور ہمیں انسان کی خاطر و مدارات ملحوظ نہ ہو، تو ہماری اس مخلوق پر قابو پالینا ممکن نہیں، پھر بھی تم ہمارا شکر نہیں کرتے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ۝

(یٰسٓ: ۷۳)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے دست قدرت سے بنائی ہوئی مخلوق میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے، تو وہ ان کے مالک ہیں، اور ہم نے انہیں ان کے تابع کر دیا، تو ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں۔ اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں، اور ان میں ان کے لئے بہت فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔

اللہ وہ ہے جس نے اپنی سمندر جیسی مخلوق کو تمہاری خدمت مفت انجام دینے پر مقرر کر دیا ہے کہ اس نے اس کی سطح کو اس قدر نرم بنایا کہ تم اس میں غوطہ لگا کر آسانی موتی، جواہرات کی صورت میں دولت حاصل کرتے ہو۔ اس نرمی کے باوجود اللہ کی قدرت تو دیکھو کہ اس پر تمہاری کتنی وزنی کشتیاں، مسافر بردار جہاز، مال بردار جہاز، آئل ٹینکرز چلتے کہ تم اس کے ذریعہ بین الاقوامی تجارت کرنے کے قابل ہوئے۔ اپنا رزق حاصل کرنے کے قابل ہوئے۔ سوچو اگر اللہ کا یہ انعام نہ ہوتا تو تمہارے لئے دولت کمانے کے وسائل کتنے محدود ہو جاتے اور تمہاری دنیا کتنی چھوٹی ہو جاتی۔ یہ فضل الٰہی اس لئے ہوا کہ تم شکر ادا کرو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

(الجاثیہ: ۱۲)

اللہ (وہ) ہے جس نے دریا کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں، اور اس لئے کہ تم اس کا فضل (رزق) تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔

اللہ کی ایک عظیم نعمت پانی ہے جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے، ذرا سوچو تمہیں کس قدر وافر مقدار میں یہ نعمت میسر ہے۔ غور کرو یہ کہاں سے آتا ہے، تو تمہیں اللہ کے فضل کے سوا اس کا اور کوئی ذریعہ نہ ملے گا۔ سمندر، دریاؤں، کنوؤں، چشموں کی صورت میں تمہارے پاس یہ پانی اسی کے فضل سے آسمان سے برستا ہے، جس کا کچھ حصہ تم استعمال کرتے ہو اور کچھ بخارات بن کر بادلوں میں تبدیل ہوتا اور پھر برستا ہے۔ بادلوں سے پانی برسانے والے تم ہو، یا ہم۔ آج تک کوئی احمق یہ دعویٰ نہ کر سکا کہ پانی میں برساتا ہوں، نہ کوئی عقلمند آج تک کوئی ایسی ایجاد کر سکا۔ جس کے ذریعہ انسان کو اپنی مرضی کے مطابق بارش میسر آ سکے۔ پھر یہ پانی اسی کے کرم سے پینے اور استعمال کرنے کے قابل ہے، اگر وہ چاہتا تو سب پانی سمندر کے پانی کی طرح کھارا، بدذائقہ اور کڑوا کر دیتا۔ اے انسان تیرے سامنے یہ ایک ایسی حقیقت موجود ہے جس کا انکار تو کسی طرح

نہیں کر سکتا- پھر تو کیسا ظالم واحسان فراموش ہے کہ ایسی عظیم قدرت والے اور ایسے کرم والے رب کا شکر ادا نہیں کرتا-

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ
الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ (الواقعہ:۶۸:۷۰)

کیا تم نے (غور سے) دیکھا ہے، پانی جو تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے اتارا ہے یا ہم ہی اتارنے والے ہیں اور اگر ہم چاہتے تو اس کو کھاری بنا دیتے، پھر تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے-

یہ چند آیات اور ہر آیت کے ساتھ اس کا مختصر مفہوم، یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ رب العزت جل مجدہ نے کس تاکید کے ساتھ انسان سے اپنی نعمتوں پر شکر کا مطالبہ کیا، صرف یہی ایک ایسا عمل ہے جس کی ذمہ داری انسان پر نہایت قوی دلائل سے ثابت کی گئی- ایک خیال یہ آتا ہے کہ آخر اللہ کو شکر اس قدر کیوں پسند ہے، تو ظاہر ہے کہ اسے تو اس کی ضرورت نہیں، کہ وہ بے نیاز، ہر ضرورت سے پاک ہے- نہ ہی اس سے اس کی شان میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، کہ وہ تو ہمیشہ سے بلند شان والا ہے اور ہمیشہ رہے گا- بندوں سے اللہ نے شکر اور جن اعمال کا مطالبہ فرمایا وہ بلاشبہ بندوں ہی کے فائدے کے لئے ہے- اس کا اصول ہے کہ شکر کرنے والوں پر وہ مزید انعامات کی بارش برساتا ہے، جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، مزید برآں اللہ نے وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ تم سے شکر کا مطالبہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے کیا جارہا ہے- ہماری ذات تو بے نیاز ہے- ملاحظہ فرمایئے، ارشاد ہوتا ہے-

وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ (النمل:۴۰)

اور جس نے شکر کیا، تو وہ اپنے ہی فائدے کے لئے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی، تو بے شک میرا رب بے پرواہ، بزرگی والا ہے-

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ (لقمان:۱۲)

اور جو شکر کرے وہ اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے، اور جس نے ناشکری کی، تو یقیناً اللہ بے نیاز، تعریف کیا ہوا ہے-

شکر کا طریقہ

شکر کا کوئی متعین طریقہ نہیں اور نہ کوئی مقرر وقت- حقیقت تو یہ ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری ہی شکر ہے- تاہم اگر خصوصی طور پر بطور شکر نوافل پڑھے جائیں یا کوئی بھی نفلی عبادت کی جائے یا صدقہ وخیرات کیا جائے تو بہت ہی باعث برکت اور مزید نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے- ہر نعمت ملنے پر سجدہ شکر ادا کرنا حضور علیہ السلام کی مبارک سنت ہے-

عَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا جَآءَهٗ اَمْرٌ سُرُوْرًا اَوْ يُسَرُّ بِهٖ خَرَّ سَاجِدًا شَاكِرًا لِلّٰهِ تَعَالٰى

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو جب بھی کوئی خوش کرنے والی خبر ملتی تو آپ سجدہ کر کے اللہ کا شکر ادا فرماتے تھے- (ابوداؤد)

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ کو طریقہ عبادت میں بندے کا سجدہ کرنا زیادہ محبوب ہے، کہ جب بندہ حالت سجدہ میں ہوتا ہے تو اللہ سے قریب تر ہوتا ہے۔ لہٰذا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ سجدہ ہے۔ اللہ کے انعامات تو بے شمار ہیں، سب کے بدلے سجدے کرنا یا کسی بھی طریقے سے اس کے احسانات سے بریٔ الذمہ ہونا ممکن نہیں، بس بندے کو اپنی استطاعت کے مطابق اس کا شکر ادا کرتے رہنا چاہئے۔ حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ غنیۃ الطالبین اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ عوارف المعارف میں تحریر فرماتے ہیں" حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کے دربار میں عرض کیا، الٰہی میں تیرا شکر کیسے ادا کروں، جبکہ تیرا شکر ادا کرنا بھی تو تیری ایک نعمت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ اب تو نے میرا شکر ادا کیا، یعنی بندہ شکر ادا کرتا رہے اور یہی یقین کرے کہ شکر الٰہی کا حق ادا نہ ہوا۔ تو اللہ اپنے کرم سے اسے شکر گزاروں میں شامل فرمالیتا اور اپنے سایہ رحمت میں پناہ دے دیتا ہے۔

شکر کا ایک خاص موقع وہ ہے جب انسان کی نظر کسی ایسے انسان پر پڑے جو ان نعمتوں سے محروم ہو، جن سے اللہ نے اسے نوازا ہے۔ جیسے تندرست آدمی کسی مریض کو دیکھے تو شکر ادا کرے کہ اللہ نے اس کو صحت عطا فرمائی۔ امیر کسی غریب کو دیکھے تو شکر ادا کرے کہ اللہ نے اسے دولت سے نوازا۔ عالم جاہل کو دیکھے تو شکر ادا کرے کہ اللہ نے اسے نعمت علم سے مزین کیا۔ صحیح الاعضاء شخص کسی معذور کو دیکھے تو شکر ادا کرے کہ اللہ نے اسے تمام جسمانی قوتیں بخشیں۔ یہی حضور علیہ السلام کا مبارک طریقہ تھا۔ جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔

عَنْ أَبِيْ جَعْفَرٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَاٰى رَجُلًا مِّنَ النُّغَاشِيْنَ فَخَرَّ سَاجِدًا۔

حضرت ابوجعفر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے ایک مرتبہ ایک بونے کو دیکھا، تو آپ نے سجدہ کیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

بہرحال شکر اللہ کا پسندیدہ عمل ہے جو اسے بندوں سے مطلوب ہے۔ اسی لئے انبیاء کرام ورسل عظام کا یہ وطیرہ رہا اور مقربین وصالحین نے اسی کو قرب الٰہی کا ذریعہ بنایا۔ ہر مومن کو اسے اختیار کرنا چاہئے، تاکہ منعم حقیقی کی نعمتوں اور احسانات کی برسات برستی رہے، کہ شکر گزاروں پر رب کی نعمتیں زیادہ ہوتی رہتی ہیں۔ اور ناشکرے محروم کر دیئے جائیں، اللہ اپنے نیک بندوں کی طرح ہمیں بھی شاکر بنائے۔ آمین

میتۃ

"میتۃ" کے متعلق ہم جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، اس سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ زیر غور آیت اور اس کی مؤید آیات میں، جن کا آپ مطالعہ کر چکے ہیں، صرف چار چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ میتۃ، دم، خنزیر، ما اھل بہ لغیر اللہ، اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ بس یہی چار چیزیں حرام ہیں، جبکہ قرآن وسنت کے مطابق باجماع اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں۔ یہاں تمام حرام چیزوں کو بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ جن چیزوں کو کفار مکہ نے از خود حلال یا حرام کر لیا تھا، ان میں سے ان چار حرام چیزوں کو بیان کر کے واضح کر دیا گیا کہ ان کے علاوہ کفار مکہ جن چیزوں کو حرام کہتے ہیں وہ سب حلال ہیں۔ ہجرت کے بعد پھر مزید چیزوں کی حرمت سے متعلق احکام نازل کیے گئے جن کے مطابق صاحب شریعت ﷺ نے حلال وحرام اشیاء کی

وضاحت فرمائی - مثلاً شراب، درندوں وغیرہ کی حرمت کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیئے، یہاں تک کہ آپ نے ہر داڑھ سے چیر کر کھانے والے جانور اور پنجوں سے نوچ کر کھانے والے پرندوں کو حرام کر دیا - ہم بھی یہاں تمام حرام جانوروں کا بیان نہیں کر رہے، بلکہ آیت میں جن مذکورہ بالا جانوروں کی حرمت بیان کی گئی ہے وہی ہمارا موضوع قلم ہیں -

''میتہ''، مردار وہ جانور جو اگرچہ فی نفسہ حلال ہو لیکن شریعت کے مطابق اسے ذبح نہ کیا جائے، جس کا طریقہ شریعت نے متعین کر دیا کہ حلال جانور کو، دھاردار آلہ سے اس طرح کاٹا جائے کہ اس کی وہ چار رگیں کٹ جائیں جن سے سانس لی جاتی ہے، غذا معدے میں جاتی ہے، اور دو رگیں جن میں خون جاری رہتا ہے - نیز وقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے - پس جو جانور اس کے علاوہ کسی بھی طریقے سے مارا گیا وہ میتہ، مردار، حرام ہے - مثلاً گردن میں پھندا ڈال کر مارا - یا کسی اور طرح گلا گھونٹ کر مارا، یا جانور خود گلا گھونٹنے سے مر گیا، اسی کو قرآن کریم میں ''منخنقہ'' کہا گیا ہے، یا جانور کو لاٹھی مار کر، غلیل وغیرہ سے پتھر مار کر، بندوق وغیرہ سے گولی مار کر، مارا گیا - اسی کو ''موقوذہ'' فرمایا گیا ہے - یا جانور کو بلندی سے پھینک کر مارا، یا وہ خود کسی اونچی جگہ سے گر کر مر گیا - یا کنوئیں میں گر کر مر گیا - پانی میں ڈوب کر مر گیا، یہ ''متردیہ''، یا جانور آپس میں لڑے اور ایک دوسرے کا سینگ لگنے سے مر گیا - اسی کو نطیحہ کہا جاتا ہے - یا وہ جانور جس کو کسی درندے وغیرہ نے چیر پھاڑ ڈالا - نیز وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیے گئے، جس کی تفصیل آپ سورہ مائدہ کی آیت میں گزشتہ صفحات پر ملاحظہ فرما چکے ہیں - یہ تمام جانور ''میتہ'' میں ہی شمار ہوتے ہیں - ان کا کھانا حرام، ان کا گوشت بیچنا حرام ہے - ہاں ان کی کھال، ہڈی، دانت وغیرہ سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے - ان کا کاروبار بھی جائز ہے - جیسے بعض دوسرے حرام جانوروں کی بھی یہ چیزیں حلال کی گئی ہیں - جیسے ہاتھی کے دانت، کھال وغیرہ -

میتہ حرام ہے لیکن صاحب شریعت ﷺ کا کرم ہے کہ آپ نے ہمارے لیے دو مردار حلال فرمائے - اسی طرح دم حرام ہے، لیکن آپ نے ہمارے لئے دو خون حلال فرمائے - جیسا کہ ان احادیث سے واضح ہے -

عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَ دَمَانِ الْمَيْتَتَانِ الْحُوْتُ وَالْجَرَادُ وَالدَّمَانِ الْكَبِدُ وَالطِّحَالُ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، ہمارے لئے دو مردار جانور اور دو خون حلال کئے گئے ہیں، دو مردار مچھلی اور ٹڈی ہے اور دو خون کلیجی اور تلی ہے۔ (ابن ماجہ)

لیکن جو مچھلی پانی ہی میں مر جائے اور پانی کے اوپر تیرنے لگے، وہ حرام ہو جائے گی، جیسا کہ آپ نے فرمایا:۔

عَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اَلْقَاهُ الْبَحْرُ وَ جَزَرَ عَنْهُ الْمَآءُ فَكُلُوْا وَمَا مَاتَ فِيْهِ وَ طَفَا فَلَا تَاْكُلُوْهُ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دریا نے جس مچھلی کو پانی سے باہر (زندہ) پھینک دیا اسے کھاؤ اور جو پانی میں مر کر تیرنے لگے، اسے نہ کھاؤ۔ (ابوداؤد)

کس قدر کرم فرمایا نبی رحمت ﷺ نے کہ مچھلی کو ہمارے لئے حلال فرما دیا، جو ہماری جسمانی صحت کے لئے ایک مفید ترین

غذا ہونے کے علاوہ ہمارے معاش کا ایک بڑا ذریعہ بھی ہے۔ مچھلی کی تمام اقسام حلال ہیں، لیکن پانی کے تمام جانور حلال نہیں۔ کہ پانی میں تو زہریلے سانپ وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ یا وہ جانور بھی جو بظاہر پانی میں ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ پانی کی تہہ میں زمین کے اندر رہتے ہیں۔ جو حشرات الارض میں شمار ہوتے ہیں۔ یا وہ جانور جو زیادہ پانی میں رہتے ہیں، لیکن انڈے، بچے پانی سے باہر آ کر دیتے ہیں، یہ سب حرام ہی ہیں۔

میتہ حرام ہے لیکن شکاری جانور کا مارا ہوا جانور مردار نہیں۔ یہ حلال ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (المائدہ:۴)

وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کون سی چیزیں ان کے لئے حلال کی گئی ہیں، آپ فرما دیجئے کہ تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، اور شکار ان کا، سکھایا ہے جنہیں تم نے، شکاری جانوروں میں سے، شکار پکڑنے کی تعلیم دیتے ہوئے، تم انہیں وہ طریقہ سکھاتے ہو جو اللہ نے تمہیں سکھایا۔ تو کھاؤ اس میں سے جسے (شکاری جانور) تمہارے لئے پکڑے رہیں اور اس (شکاری جانور) پر اللہ کا نام لیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ بہت تیز حساب لینے والا ہے۔

شکاری جانور

شکاری جانوروں سے شکار کرنے کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ اسی لئے حضور علیہ السلام سے یہ سوال کیا گیا، تا کہ مسلمانوں کو اس کے جائز و ناجائز ہونے کا پتہ چل جائے اور اللہ اور اس کے رسول کا جو بھی حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی۔ اور شکاری جانور کا مارا ہوا شکار جائز قرار دیا۔ چاہے شکاری جانور پرندہ ہو، جیسے باز وغیرہ یا درندہ ہو جیسے کتا وغیرہ۔ دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ کہ ان کا مارا ہوا شکار جائز و حلال ہے، لیکن مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ جن کی تصریح فقہاء کرام نے احادیث مبارکہ کی روشنی میں کی ہے۔

شکاری جانور مسلمان کا پالا ہوا ہو، غیر مسلم کے جانور کا شکار مسلمان کے لئے حلال نہیں۔

شکاری جانور کو پوری طرح شکار کی تربیت دی گئی ہو۔ جس کی پہچان یہ ہے کہ اگر شکاری جانور بالکل شکار کے قریب پہنچ جائے اور اسے مالک واپس بلائے تو وہ شکار کو چھوڑ کر واپس آ جائے، شکار نہ کرے۔ یعنی وہ مالک کے حکم کا پوری طرح پابند ہو۔

شکاری جانور کو بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر چھوڑا گیا ہو۔

شکاری جانور ایسا تربیت یافتہ ہو کہ شکار کو پکڑ کر مالک کے پاس لے آئے یا اس تک مالک کے پہنچنے کا انتظار کرے۔ اس میں سے بالکل نہ کھائے، حتی کہ شکار کا خون اگر اس کے منہ پر لگ گیا تو اس کو بھی نہ چاٹے۔

ان شرائط کے ساتھ شکاری جانور کا شکار حلال ہے، اگر شکار زندہ ہے تو اسے بسم اللہ اللہ اکبر، ذبح کیا جائے گا اور اگر مر چکا تو بھی جائز ہے۔ لیکن ایک مزید شرط یہ بھی ہے کہ شکاری جانور نے شکار کو دبوچ کر نہ مارا ہو، بلکہ اپنے پنجوں اور دانتوں

سے زخمی کر کے مارا ہو- کہ خون بہا ہو، کہ ذبح کی ایک صورت ہو جائے گی- دبوچ کر مارنے کی صورت میں شکار حرام ہو جائے گا کہ وہ ''منخنقہ'' کے حکم میں ہے، ان مسائل سے متعلق حضور علیہ السلام کے ارشادات ملاحظہ ہوں-

عَنْ عَدِیِّ ابْنِ حَاتِمٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَیْتَ اَحَدَنَا اَصَابَ صَیْدًا وَ لَیْسَ مَعَهٗ سِکِّیْنٌ یَذْبَحُ بِالْمَرْوَةِ وَ شِقَّةِ الْعَصَا فَقَالَ اَمِرِ الدَّمَ بِمَ شِئْتَ وَاذْکُرِ اسْمَ اللّٰهِ

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا، یا رسول اللہ آپ کا کیا حکم ہے، کہ اگر ہم میں سے کسی کو شکار مل جائے اور اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ نوک دار پتھر یا لاٹھی کی دھار دار کھپچی سے اس کو ذبح کر سکتا ہے- آپ نے فرمایا (بصورت مجبوری) اللہ کا نام لے کر جس چیز سے چاہو خون بہا دو- (نسائی شریف)

عَنْ عَدِیِّ ابْنِ حَاتِمٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَا عَلَّمْتَ مِنْ کَلْبٍ اَوْ بَازٍ ثُمَّ اَرْسَلْتَهٗ وَ ذَکَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ فَکُلْ مِمَّا اَمْسَکَ عَلَیْکَ قُلْتُ وَ اِنْ قَتَلَ قَالَ اِذَا قَتَلَهٗ وَ لَمْ یَاْکُلْ مِنْهُ شَیْئًا فَاِنَّمَا اَمْسَکَهٗ عَلَیْکَ-

حضرت عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جس کتے یا باز کو تم نے تربیت دی ہو، پھر تم نے اسے اللہ کا نام لے کر شکار پر چھوڑا تو جس جانور کو وہ تمہارے لئے پکڑ رکھے، تم اسے کھا لو، میں نے عرض کیا اگر چہ وہ اسے مار ڈالے، آپ نے فرمایا جب اس نے شکار کو مار ڈالا اور اس میں سے خود کچھ نہ کھایا، تو اس نے اسے تمہارے ہی لئے پکڑ رکھا- (ابوداؤد)

عَنْ عَدِیِّ ابْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَرْسَلْتَ کَلْبَکَ فَاذْکُرِ اسْمَ اللّٰهِ فَاِنْ اَمْسَکَ عَلَیْکَ فَاَدْرَکْتَهٗ حَیًّا فَاذْبَحْهُ وَ اِنْ اَدْرَکْتَهٗ قَدْ قَتَلَ وَ لَمْ یَاْکُلْ مِنْهُ فَکُلْهُ وَ اِنْ اَکَلَ فَلَا تَاْکُلْ فَاِنَّمَا اَمْسَکَ عَلٰی نَفْسِهٖ فَاِنْ وَجَدْتَّ مَعَ کَلْبِکَ کَلْبًا غَیْرَهٗ وَ قَدْ قَتَلَ فَلَا تَاْکُلْ فَاِنَّکَ لَا تَدْرِیْ اَیُّهُمَا قَتَلَ وَ اِذَا رَمَیْتَ بِسَهْمِکَ فَاذْکُرِ اسْمَ اللّٰهِ فَاِنْ غَابَ عَنْکَ یَوْمًا فَلَمْ تَجِدْ فِیْهِ اِلَّا اَثَرَ سَهْمِکَ فَکُلْ اِنْ شِئْتَ وَ اِنْ وَجَدْتَّهٗ غَرِیْقًا فِی الْمَآءِ فَلَا تَاْکُلْ-

حضرت عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم اپنے کتے کو چھوڑو، تو اس پر اللہ کا نام لو، اگر وہ تمہارے لئے شکار کو روکے رکھے اور وہ زندہ ہو تو اسے ذبح کر لو، اور اگر تم پاؤ کہ اس نے مار دیا، لیکن اس میں سے کھایا نہیں، تو اسے کھا لو، اور اگر اس نے کچھ کھا لیا تو تم نہ کھاؤ- کیونکہ اس نے اپنے لئے شکار کیا تھا، اگر تم اپنے کتے کے ساتھ دوسرا کتا پاؤ اور شکار کو مار دیا ہے، تو اسے نہ کھاؤ- کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ دونوں میں سے کس نے مارا ہے- اور جب تم تیر مارو، تو اس پر اللہ کا نام لو، اور اگر (وہ شکار) تم سے ایک دن غائب رہے (پھر ملے) تو اگر تم اس پر اپنے تیر کے سوا کوئی

دوسرا نشان نہ پاؤ تو کھالو، اگر چاہو، اور اگر (شکار) پانی میں ڈوبا ملے تو نہ کھاؤ۔ (بخاری ومسلم)

تیر، تلوار، چھری یا کوئی بھی دھار والی چیز حتیٰ کہ نوک دار پتھر بھی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر جانور کو مارا جائے، جس سے وہ زخمی ہو اور خون بہنے لگے، تو ایسا جانور ذبح کے حکم میں ہے، حلال ہے، لیکن بندوق وغیرہ کی گولی سے اگر جانور مر گیا تو وہ ذبح کے حکم میں نہیں۔ وہ میتہ ہوگا۔ کیونکہ گولی جسم کو کاٹتی نہیں، بلکہ بندوق کی طاقت سے جسم کو چیرتی ہوئی اندر گھستی ہے، پھر اسے جلاتی ہے جس کی وجہ سے جانور مرتا ہے۔ ایسا جانور ''موقوذہ'' کے حکم میں ہے، جو حرام ہے۔ اس مسئلہ میں بعض حضرات کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے گولی سے مرے ہوئے جانور کو تیر، تلوار وغیرہ سے مرے ہوئے جانور پر قیاس کیا اور حلال لکھا، جو غلط ہے۔

''میتہ'' کے ضمن میں ہم نے خاصی ضروری باتیں عرض کر دیں، جن سے ''میتہ'' کا مفہوم بخوبی واضح ہو گیا۔ حلال و حرام جانوروں کی مزید تفصیل اور ان سے متعلق مسائل فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، عوامی معیار کی آسان اردو میں فقہ کی کتاب ''بہارِ شریعت'' ہے۔

دم۔ خون

اسلام اپنے ماننے والوں کو ظاہری، باطنی، جسمانی، روحانی ہر اعتبار سے پاکیزہ، صاف ستھرا رکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے جسم کی صفائی کے لئے غسل و وضو کے طریقے تعلیم دیئے گئے۔ کپڑوں، رہنے کی جگہوں کو پاک رکھنے کا حکم دیا گیا۔ تزکیہ نفس اور قلب کی پاکیزگی کو کامیابی و کامرانی کا ذریعہ قرار دیا گیا، لیکن طہارت و پاکیزگی کا دارومدار غذا پر ہے۔ وہ شخص پاک و صاف رہ سکتا ہے جو گندی اور خبیث غذاؤں سے اپنے خون کو محفوظ رکھتا ہے۔ لہٰذا شریعت مطہرہ نے غذا میں صاف ستھری چیزیں کھانے کی اجازت دی اور تمام گندی اور غلیظ چیزوں کو حرام یا خبیث قرار دیا۔

فطرتاً یہ حقیقت مسلّم ہے کہ خون گندا ہوتا ہے، بس فرق یہ ہے کہ عام انسان اس کو طبعاً گندا سمجھتا ہے، لیکن مؤمن جو ہر چیز کو شریعت کی عینک سے دیکھتا ہے، اس کو شرعاً گندا سمجھتا ہے۔ عام لوگوں کا خون سے بچنا طبعی عمل ہے، لیکن مؤمن کا اس سے بچنا شرعی عمل ہوتا ہے۔ پس جب اس کے کپڑے پر خون لگتا ہے اور وہ اس کو دھوتا ہے تو اسے اس عمل پر ثواب ملتا ہے۔

کفار مکہ طبعاً بھی اتنے گندے ہو چکے تھے کہ وہ ایسے بہت سے کاموں کو پسند کرنے لگے تھے، جن کو ایک انسان کی طبعِ سلیم ہرگز پسند نہیں کرتی۔ خون کے ساتھ ان کا عمل بھی ایسا ہی تھا کہ بتوں کے نام پر قربان کئے ہوئے جانوروں کا خون، اللہ کے مقدس گھر، کعبہ پر ملتے تھے۔ ایک دوسرے پر اس کے چھینٹے ڈالتے تھے، اس کو جما کر کھاتے تھے۔ ایسی مکروہ اور شنیع حرکات کو اسلام کسی طرح گوارا نہیں کرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کے لئے ''دمِ مسفوح'' کو حرام قرار دے دیا، کہ جو خون جاندار کے جسم سے نکل چکا، بہہ گیا، وہ حرام ہے۔ اس کی شکل و صورت تبدیل کر کے بھی اس کا استعمال کسی طرح جائز نہیں، نہ اس کو کھا سکتے ہیں، نہ پی سکتے ہیں، نہ جسم پر مل سکتے ہیں، کپڑے پر لگ گیا تو کپڑا ناپاک، کسی جگہ پر لگ جائے تو وہ جگہ ناپاک، نہ اس کو جما کر کھانا جائز، نہ پکا کر۔

خون جب تک جسم میں ہے بڑا ہی قیمتی اور اہم ہے کہ جسم کی حرکت کا دارومدار اسی پر ہے۔ یہ معتدل رہے، تو جسم

صحت مند ہے، اس کی رفتار میں کمی زیادتی ہو جائے تو جسم طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن جب یہ جسم سے باہر آ گیا تو سوائے گندگی کے کچھ نہ رہا- ہر کوئی اس سے بچتا ہے، کپڑے پر چھینٹ بھی آ جائے تو وہ پہننے کے لائق نہیں رہتا- جسم پر لگ جائے تو اسے فوراً صاف کیا جاتا ہے، انسان اشرف المخلوقات ہے- اللہ نے اس کو اختیار دیا کہ وہ اپنی غذا کے لئے جانوروں کا خون بہائے- یہ خون غذا نہیں، نہ ہی یہ مقصود ہے، مقصود تو گوشت ہے کہ یہی غذا بن سکتا ہے- بس یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمارے لئے کچھ جانوروں کا گوشت حلال کر دیا، جو حلال ہے، اسے جیسے چاہو کھاؤ، خون حرام ہے، ناپاک ہے، اس سے بچو اور انسان کا خون، انسان کے لئے نہایت ہی محترم ہے، اس طرح کہ اس کا بہانا حرام ہے کہ یہ انسان کا دوسرے انسان کو ایذا پہنچانا ہے جو اللہ کسی حال میں پسند نہیں فرماتا- میرے آقا ﷺ کے ارشادات پر غور فرمایئے-

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَ يَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ-

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کو ترک کر دے۔ (بخاری شریف)

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِى الدِّمَآءِ-

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خونوں کا فیصلہ کیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَزَوَالُ الدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ-

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک دنیا کا مٹ جانا، زیادہ معمولی بات ہے کسی مسلمان کے قتل سے۔ (ترمذی شریف)

عَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ وَّ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِشْتَرَكُوْا فِىْ دَمِ مُؤْمِنٍ لَاَكَبَّهُمُ اللّٰهُ فِى النَّارِ-

حضرت ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، کہ اگر ایک مؤمن کا خون بہانے میں آسمان و زمین والے سب شریک ہوں، تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔ (ترمذی شریف)

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَّ قِتَالُهٗ كُفْرٌ-

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ (بخاری ومسلم)

ان ارشادات سے جہاں خون کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، وہاں مسلم معاشرے کو پرسکون بنانے کے لئے حضور علیہ السلام کی تعلیم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آج امت مسلمہ کے درمیان قتل وغارت کا جو بازار گرم ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو، جس کے ہاتھ یا کم ازکم زبان سے اس کا بھائی محفوظ ہو کہ دوسروں کی غیبت کرنا، ان پر الزام تراشی بلاضرورت ہماری عادت بن گئی ہے۔ صحابہ کرام جب مل کر بیٹھتے تھے تو ان کا موضوع گفتگو دین ہوتا تھا۔ وہ اپنی اصلاح کی باتیں کرتے تھے، قرآن وحدیث سنتے سناتے تھے اور ہم اگر چار بھی جمع ہو جائیں تو ساری قوم کے عیب تلاش کرتے ہیں۔ آج کسی کی عزت وآبرو، کسی سے محفوظ نہیں۔ حتی کہ اگر ہم کسی کو خوشحال دیکھتے ہیں تو تنہائی میں بھی یہ سوچتے ہیں کہ اس شخص کے پاس دولت کہاں سے آتی ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر ایسے دست بگریباں ہوتے ہیں کہ قتل وخون تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ وتعلق ہی نہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول کا قائم کردہ رشتہء اسلام سب رشتوں سے افضل اور مستحکم ترین ہے۔ لیکن اس کا احساس تک نہ رہا۔ اسی لئے ہم باعزت اور باوقار زندگی سے محروم ہو گئے۔ کاش مسلمانوں نے آقا علیہ ﷺ کے ان ارشادات پر عمل کیا ہوتا، تو ان کی بے خوف وخطر اور پرسکون زندگی پر دنیا والے رشک کرتے، ان کے میل ومحبت اور اتحاد واتفاق کے باعث دشمن بھی ان سے کانپتے، ذلت وخواری کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے، جب ہم خود ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے، تو جو ہمارا خون، ہمیشہ حلال جانتے رہے، ان سے ہم اپنے آپ کو کیسے بچا سکتے ہیں۔

ہمارے دور میں خون ایک طریقہ علاج بن گیا ہے کہ بعض اوقات مریض کو انسان کا خون چڑھایا جاتا ہے، بحمد للہ، اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور نبی مکرم علیہ السلام ایک کامل معلم ہیں، پس کسی دور کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں، جس کی رہنمائی ہماری شریعت نہ کرتی ہو، خون دینے کا مسئلہ تو بہت ہی واضح ہے جو اسی زیر بحث آیت میں موجود ہے، کہ جن چیزوں کی حرمت کا حکم دیا جارہا ہے، حالت اضطرار میں ان کے استعمال کی اجازت بھی دی جارہی، اور استعمال کرنے والوں کو مغفرت وبخشش کا مژدہ بھی سنایا جارہا ہے۔ پس مسئلہ واضح ہے کہ اگر کسی مریض کی جان خطرے میں ہو اور خون اس کی جان بچا سکتا ہو، تو اس کے لئے خون لینا بھی جائز اور دینے والے کے لئے دینا بھی جائز۔ ہاں اپنا خون بیچنا، بینک میں جمع کرانا، یا صرف طاقت کے لئے خون لینا، خون کا کاروبار کرنا کہ غریب لوگوں کو پیسہ کا لالچ دے کر ان کا خون خریدا جائے اور اس پر منافع کمایا جائے۔ یہ سب صورتیں قطعاً ناجائز اور حرام ہیں۔ تفاسیر، احادیث وفقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

خنزیر

خنزیر، سؤر نہایت ہی غلیظ جانور ہے، صورت وشکل کا نہایت قبیح، عادات واطوار میں نہایت ہی شنیع، بیماریوں کا پلندہ، جو قومیں حلال وحرام کی قیود سے آزاد اور گوشت خور ہیں وہ بھی اس کا گوشت عام گوشت کی طرح استعمال نہیں کرتیں۔ انہیں اعتراف ہے کہ اس گوشت میں بے حد بیماریاں ہیں، اس سے انسان کے عادات واطوار پر برا اثر پڑتا ہے۔ ہم جنسی جیسی بدترین

عادات پیدا ہوتی ہے، تاہم وہ یہ جانتے ہوئے بھی اس غلیظ گوشت کی، کرسمس اور دیگر اہم تقریبات پر خصوصی ڈش بناتے اور کھاتے ہیں- اسی لئے ان میں بدترین امراض پھوٹتے ہیں، جن سے الحمدللہ مسلمان محفوظ ہیں- تفصیلات کے لئے اگر آپ چاہیں تو امریکہ و یورپ سے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی میڈیکل رپورٹس کا مطالعہ کر سکتے ہیں- میں نے ایک ایسی رپورٹ ''ٹائم'' میں پڑھی تھی، جس میں بتایا گیا تھا کہ ان لوگوں کے جسم میں ایک خاص قسم کے دانے پھوٹتے جن سے نہایت ہی بدبو آتی ہے- اس بیماری کی وجہ معلوم کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ مرض اکثر انہی لوگوں میں ہوتا ہے جو خنزیر کا گوشت زیادہ استعمال کرتے ہیں- اسی طرح ان ممالک میں ہم جنسی کی وبا عام ہے- حتیٰ کہ اب اس کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہے- یعنی دو مرد یا دو عورتوں کی باقاعدہ شادی ہوسکتی ہے، اور اس پر عمل جاری ہے- ایسے جوڑوں کو ٹیلی ویژن پر لایا جاتا ہے اور ان کی زندگی کے متعلق سوالات کیے جاتے ہیں- اور وہ اپنی اس خنزیر جیسی زندگی پر اظہار اطمینان کرتے ہیں- ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ''-

الحمدللہ، کہ اس نے مجھے اسلام جیسے مقدس مذہب پر پیدا کیا- یا اللہ! اسی پر میرا خاتمہ فرما، اور تو گواہ ہو کہ میں اپنے مذہب کے حکم پر نہ صرف مطمئن ہوں، بلکہ کسی مذہب میں اس سے بہتر کوئی قانون نہیں پاتا- مجھے اس پر فخر ہے- اس نے مجھے باعزت بنایا اور میرے لئے یہی عزت کافی ہے- کہ میرا رب مجھے ''اے ایمان والو'' کے پیارے خطاب سے نوازتا ہے- اے اللہ! میں ایمان والا ہوں اور تیرے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں تو ہی مجھے اپنے احکام کی تعمیل کی توفیق عطا فرما-

قرآن کریم نے، اس غلیظ جانور کو صرف حرام ہی نہیں، بلکہ نجس، ناپاک قرار دیا- یعنی صرف اتنا ہی نہیں کہ اس کا گوشت حرام ہے، بلکہ اس کی ہڈی، کھال، بال ہر چیز گندی، اس کی کھال کا جوتا تک پہننا جائز نہیں- نہ اس کو شوقیہ پال سکتے ہیں، نہ اس کا کاروبار کر سکتے ہیں- اس سے انسان کی کوئی ضرورت وابستہ ہی نہیں- جبکہ دیگر حرام جانور بہت سے ایسے ہیں جن سے ضرورتیں وابستہ کی گئیں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ان کو پالنے کی، ان کا کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی- ان کا گوشت تو حرام ہے، لیکن ان کی ہڈیوں، دانتوں، کھال اور بال استعمال کرنا جائز ہیں- یہ خنزیر ہی اس قدر غلیظ جانور ہے جس کو نجس فرما کر مسلمان کو اس سے لاتعلق رہنے کا حکم دیا گیا-

ایک خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ جانور اس قدر غلیظ و بیکار ہے تو اس کو پیدا ہی کیوں کیا گیا، یہ سوال بڑا ہی عجیب ہے، جبکہ اس کائنات میں اللہ کی بے شمار مخلوق ایسی ہے جو ہمیں بیکار نظر آتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالق کائنات نے کوئی ذرہ بھی بیکار پیدا نہیں فرمایا- ارشاد ہوتا ہے-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ (ص:٢٧)

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بے فائدہ نہیں بنایا، یہ تو انہی لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا، تو ہلاکت ہے کافروں کے لئے آگ کے عذاب سے-

کوئی چیز ہمارے لئے مفید ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ بے فائدہ ہرگز پیدا نہیں کی گئی- خالق حقیقی ہی اس کی پیدائش کی حکمت جانتا ہے- نہ ہمارا علم اتنا وسیع اور نہ عقل اتنی قوی کہ ہم ہر چیز کی حکمت جان لیں اور سمجھ لیں- پس اہلِ ایمان اہلِ عقل

کا کام حکمتیں جاننا نہیں بلکہ اس کائنات کے ذرے ذرے میں غور وفکر کرنا اور اللہ وحدہ لاشریک کی قدرت کا اعتراف واقرار کرتے ہوئے یہ کہنا ہے کہ "اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بیکار پیدا نہیں فرمایا"۔

الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًاۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

(آل عمران:۱۹۱)

جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور پہلو پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں وہ غور کرتے ہیں، (کہتے ہیں) اے ہمارے رب، تو نے یہ (سب کچھ) بیکار پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، پس ہمیں نار جہنم کے عذاب سے بچا۔

یہ "اولوالالباب" عقل والوں کی خوبی بیان کی گئی، کہ عقل والا ہر چیز کی حکمت تلاش نہیں کرتا، وہ تو ہر چیز سے اللہ کی قدرت، پہچانتا ہے، کائنات میں غور کرنے سے اس کا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔

غرضیکہ قرآن کریم نے خنزیر کو دیگر جانوروں کی طرح صرف حرام ہی نہیں فرمایا، بلکہ اس کو "نجس العین" قرار دیا۔ اب غور کیجئے ایسے مؤمن کی حالت پر، جو اللہ کے اس حکم کے بعد بھی خنزیر کھائے، یا اس کا کاروبار کرے، اگر وہ یہ حرکت جائز وحلال سمجھ کر کرتا ہے، تب تو ایمان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا، کافر ہو گیا، مرتد ہو گیا۔ اور اگر اسے اس کی حرمت کا اعتراف ہے، لیکن دنیا کے عیش یا لالچ نے اسے اس گناہ میں مبتلا کر رکھا ہے، تو بہر حال وہ فاسق مُعلن ہے۔ جس سے ملنا جلنا اور اس کا کھانا پینا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ یہی حکم ان تمام بد نصیبوں کا ہے جو محرمات قطعیہ میں مبتلا ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ اسلام کے نورانی چہرے پر کلنک کا داغ ہیں، ان سے بچیئے، کہیں یہ آپ کے ایمان کی پاکیزہ چادر کو داغدار نہ کردیں، حکم الٰہی ہے۔

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۸﴾

(الانعام ۶۸)

اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو، جو ہماری آیتوں میں کج بحثی کرتے ہیں، تو ان سے منہ پھیر لو۔ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات سے بحث کرنے لگیں۔ اور اگر تمہیں شیطان بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد ظلم کرنے والی قوم کے ساتھ نہ بیٹھو۔

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ

وہ جانور بھی حرام ہے جو اگرچہ حلال تھا، لیکن "ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا گیا۔ جیسے کفار "بسم اللات والعزیٰ" کہہ کر جانوروں کو ذبح کرتے تھے، اور بڑا ہی متبرک سمجھ کر اس کا گوشت کھاتے تھے۔ ایسا جانور

اگرچہ ''میتہ'' میں شامل ہے لیکن قرآن کریم نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور اس کی حرمت کا اعلان فرمایا۔ کیونکہ اسکو ذبح کیا جاتا ہے یہ ظاہری عمل اس کے حلال ہونے کا شبہ پیدا کرسکتا تھا۔ پس قرآن کریم نے اس شبہ کو زائل کردیا اور واضح کر دیا کہ کسی جانور کا گوشت حلال ہونے کے لیے اس کا فی نفسہ حلال ہونا اور ذبح کیا جانا ہی کافی نہیں بلکہ وقت ذبح اس پر اللہ کا نام لینا لازمی وضروری ہے کہ یہ بھی ذبح کرنے والے کی طرف سے ایمان کے اظہار واعلان کا ذریعہ ہے جو شخص چھری چلا کر جانور کی جان لے رہا ہے عین اس حالت میں وہ اپنی زبان پر اللہ کا نام لاکر، اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے، کہ میں تو اس جانور کا عارضی مالک تھا، لیکن حقیقی مالک، اے اللہ تو ہی ہے، جس نے اس پر مجھے قدرت عطا فرمائی، پس تیرے ہی نام سے میں اس کو ذبح کرتا ہوں اور تیرے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ تو مجھے اس کا اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

تو وہ جانور جس پر ذبح کے وقت بتوں کا یا کسی انسان کا نام لیا گیا وہ ''میتہ''، مردار اور حرام ہے اور جان بوجھ کر ایسا کرنے والا مشرک اور مرتد ہے۔ بات بالکل واضح ہے لیکن بدقسمتی سے امت میں ایک ایسا گروہ بھی ایک عرصہ سے چلا آرہا ہے جس کا کام شریعت کے واضح مسائل کو غلط انداز میں، قرآن وسنت کی منشاء کے خلاف بیان کرکے ان مسائل کو مختلف فیہ اور متنازع بنادینا ہے کہ ان کا مشن ہی امت میں انتشار وافتراق پھیلانا ہے۔ ایسے لوگوں نے اس صاف ستھری بات کو بھی غلط رنگ دیا اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے آیت کے معنی اس طرح کیے کہ '' جس جانور پر کسی وقت بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا جائے وہ حرام ہے''۔ اور پھر انہوں نے اس کا سہارا لے کر ایسے مسلمانوں کو مشرک ومرتد کہنا شروع کردیا جو عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے کسی جانور کو غوث پاک، خواجہ غریب نواز یا کسی اور بزرگ اور اللہ کے ولی کی طرف منسوب کردیتے ہیں جس سے ان کا منشاء صرف یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ دولت کے اس ایثار اور جانور کی اس قربانی کا ایصالِ ثواب، منسوب الیہ، یعنی اس بزرگ کو کیا جائے گا جس کی طرف اس جانور کی نسبت کی جارہی ہے اور جب وہ اسے ذبح کرتے ہیں تو اللہ کے سوا کسی کا نام نہیں لیتے۔ ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' کے سوا کچھ نہیں کہتے۔ ہم سنیں یا نہ سنیں لیکن ایک مسلمان سے اس کے علاوہ ہم اور کوئی توقع نہیں کرسکتے۔ ہمیں ایک مؤمن پر بدگمانی کرنے کا کیا حق ہے اور اس بدگمانی پر کسی کو مشرک ومرتد کہہ دینے کا کیا جواز، کہ چونکہ یہ شخص جانور کو غوث پاک کی طرف منسوب کرتا تھا لہٰذا اس نے ذبح کے وقت بھی ضرور انہی کا نام لیا ہوگا، ظن وگمان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ اور وہ بھی مؤمن کو مشرک قرار دینے کا فیصلہ کرنا، اہل ایمان کا تو کام نہیں اور نہ ہی ایسا فیصلہ حق ہوسکتا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (یونس:۱۰:۳۶)

اور ان (کافروں) کے اکثر لوگ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں، بیشک گمان حق سے بالکل بے نیاز نہیں کرسکتا۔ یقیناً اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

غور فرمایئے، محض گمان کی بنیاد پر اہل ایمان کو مشرک ومرتد قرار دینے کا فیصلہ خود ان کو کہاں پہنچا رہا ہے۔ اگر صرف ظاہری نسبت کی بناء پر جانور ہمیشہ کے لیے حرام ہوگیا تو اس جانور کا کیا حکم ہوگا جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا گیا۔ اور اس کو مسلمان نے

خرید کر یا مانگ کر اللہ کا نام لے کر ذبح کر لیا۔ حکم تو یہی ہونا چاہیے کہ وہ حرام ہے جب کہ ایسا نہیں شریعت کا مسئلہ ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حلال ہے۔ اس لیے کہ ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا گیا اسی طرح اگر کسی نے کہا کہ یہ گائے، بکری میں نے اپنے بیٹے کے عقیقہ یا ولیمہ کے لیے خریدی ہے تو کیا وہ بھی حرام ہوگئی کوئی بھی یہ فتویٰ نہیں دے سکتا کہ وہ حرام ہے۔ تو آخر کیا غضب ہو گیا کہ کسی عاشق نے یہ کہہ دیا کہ یہ جانور میں غوث الاعظم کے لئے، داتا گنج بخش کے لیے، اپنے پیر کے لیے ذبح کروں گا۔ ہماری عادت تو حسنِ ظن کی ہے۔ ہم مؤمن کے ایمان پر نظر رکھتے ہوئے یہی یقین کرتے ہیں کہ اس قربانی کا ایصالِ ثواب بزرگوں کے لئے ہوگا۔ ذبح کے وقت یقیناً اللہ ہی کا نام لیا جائے گا کہ مؤمن کتنا ہی جاہل ہو کتنا ہی برا ہو لیکن شرک کو وہ خوب جانتا ہے اور شرک سے خوب بچتا بھی ہے۔ مؤمن کا حال تو یہ ہے کہ ایک مسلمان شرابی جس کو اللہ تعالی نے ہماری تبلیغ کے ذریعہ توبہ کی توفیق نصیب فرمائی، بہت شراب پیتا تھا۔ لوگوں نے ہمیں اس کی ایک عجیب بات یہ بتائی کہ اللہ کا یہ بندہ منہ سے شراب کا گلاس لگاتا ہے تو بسم اللہ ضرور کہہ لیتا ہے۔

بہر حال غیر اللہ کی طرف نسبت کرنے سے کوئی چیز حرام نہیں ہوتی، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر چیز کا مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ لیکن یہ اسی کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں جن چیزوں کا مالک بنایا ان کو اپنی طرف منسوب کرنے کی اجازت عطا فرمائی یہ گھر میرا ہے، یہ بیٹا میرا ہے، یہ دولت میری ہے، نہ جانے کیا کیا میرا، تیرا ہے۔ جبکہ نہ کوئی چیز میری ہے نہ تیری۔ لیکن میرا، تیرا کہنا جائز ہے۔ تو جانور کے لیے آپ یہ خصوصی حکم کیسے لگا سکتے ہیں کہ غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ ہاں ذبح کے وقت اگر غیر اللہ کا نام لیا گیا تو یقیناً وہ جانور حرام ہو گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں کرسکتا اور نہیں کرتا۔ پس ایسے لوگ ظالم ہیں جو زندہ جانوروں کی غیر اللہ کی طرف نسبت کرنے والوں کو، مشرک و مرتد کہہ دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کا مشن اہلِ ایمان کے دلوں سے اہلُ اللہ کی محبت نکالنا ہے جس میں نہ وہ کامیاب ہو سکے اور نہ ہو سکیں گے۔ کہ اللہ خود ہی اپنے نیک بندوں کی محبت اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرماتا ہے۔ امت میں انتشار و افتراق پیدا کرنے والوں سے اللہ دور رکھے۔

بخاری و مسلم کی ایک صحیح حدیث ہے کہ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ایک کنواں کھدوایا جس کا نام انہوں نے اپنی والدہ کی طرف اس کی نسبت کرتے ہوئے ''بئر ام سعد'' سعد کی ماں کا کنواں رکھا، مقصود یہ تھا کہ جو لوگ بھی اس سے فائدہ حاصل کریں وہ میری ماں کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ غور فرمایئے اگر کسی غیر کی طرف منسوب کرنے سے کوئی چیز ناپاک و حرام ہو جاتی ہے تو اس کنوئیں کا پانی بھی ناپاک ہو جاتا۔ اس کا پینا، اس سے وضو و غسل کرنا، کپڑے دھونا، سب ممنوع، ناجائز ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں کیونکہ کسی چیز کی غیر اللہ کی طرف نسبت نہ اس کو ناپاک کرتی ہے اور نہ ہی حرام و ممنوع۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جو ہمارے عقیدے کو پختہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اضطرار

اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ جہاں طاقت ختم ہو جائے، وہی اضطرار کی حالت ہے۔ یعنی جبر

واکراہ اور مجبوری کا وقت ہے اللہ بڑا ہی رحیم وکریم اور اپنے بندوں کی طاقت کو خوب جاننے والا ہے۔ اسی لیے اس نے ہمیں وہ دین عطا فرمایا جو آسان ہے اور بار بار ارشاد فرمایا'' اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے تمہیں مشکل میں مبتلا کرنا پسند نہیں فرماتا''۔ عبادات کے احکام دیئے تو ان میں بیماروں، کمزوروں، مسافروں کے لیے خصوصی رعایت فرمائی۔ غریبوں اور محتاجوں کا خیال فرمایا۔ اسی طرح حرام کھانے سے منع فرمایا۔ تو اس میں لاچاری اور مجبوری کے وقت رعایت دی اور فرمایا گیا کہ جو چیزیں تم پر حرام ہیں ان سے بچو۔ لیکن اگر ایسا وقت آ جائے کہ جان جانے کا اندیشہ ہونے لگے تو جان بچاؤ اور ہماری حرام کی ہوئی چیز ہماری ہی اجازت سے کھالو۔ لیکن دیکھو بڑی احتیاط رکھنا۔ ''غَیرَ بَاغٍ'' اضطرار کے بہانے نافرمانی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ ''وَلَا عَادٍ'' اتنا ہی کھانا جتنا اضطرار دور کرنے کے لئے ضروری ہو، اس سے تجاوز نہ کرنا، مزے نہ لینے لگنا اور یہ بھی نہ سمجھ بیٹھنا کہ اس حالت میں تم نے جو کھایا وہ تمہارے لئے حلال ہو گیا، نہیں وہ حرام ہی تھا، پس تم اپنے اس عمل پر جو اگرچہ بحالت مجبوری کیا توبہ کرتے رہنا اور ہم اپنے فضل وکرم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں بخش دیں گے، کہ'' بیشک اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے''۔

اضطرار کی صرف تین حالتیں ہیں، مسلمان کسی ایسی جگہ پھنس جائے جہاں حرام گوشت کے علاوہ کوئی دوسری چیز میسر ہی نہ ہو۔ ایسی حالت میں حلال چیز تلاش کرنے کی اس وقت تک کوشش کی جائے جب تک کر سکتا ہے، جب نڈھال ہو جائے تو انتظار کرے شاید کہیں سے کوئی حلال چیز آ جائے اور جب پوری طرح یہ محسوس ہونے لگے کہ اب اگر پیٹ میں کچھ نہ گیا تو جان نکل جائے گی تو جو بھی موجود ہے کھالے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ظالم وجابر، حرام کھلانے پر مصر ہو تو جب یہ یقین ہو جائے کہ اگر اب اس کی بات نہ مانی گئی تو یہ جان لے ہی لے گا، تو اس کی بات مان کر اپنی جان بچالینا فرض ہے۔ لیکن بڑی احتیاط کرنا ہوگی کہ اگر دو لقموں سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو تیسرا نہ کھایا جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے جس کا علاج ماہر ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق صرف ایسی ہی دوا سے ہو سکتا ہے جس میں کسی حرام کی آمیزش ہو تو پہلے کوشش کی جائے کہ اس کا بدل کسی حلال دوا سے حاصل کر لیا جائے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو بیماری سے نجات کے لیے اس دوا کو استعمال کیا جا سکتا ہے جس میں حرام کی آمیزش ہے۔ جیسا کہ آج کل اکثر دواؤں میں حرام کی آمیزش ہوتی ہے، ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن مجبوراً استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن صرف طاقت کے لیے بطور ٹونک ان کا استعمال ہرگز جائز نہیں کہ طاقت بہت سی دوسری چیزوں غذا وغیرہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ان تین صورتوں کے علاوہ کوئی صورت اضطرار کی ایسی نہیں جس میں حرام چیز کا استعمال جائز ہو۔ کسی ایسے ملک یا شہر میں رہنا جہاں حلال گوشت میسر نہ ہو، اضطرار و مجبوری نہیں کہ اول تو ہمارے دور میں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں حلال گوشت حاصل کرنا دشوار ہو، کم از کم ہم نے اپنے پچیس سالہ دور سیاحت میں کوئی ایسی جگہ نہ دیکھی۔ ہاں بعض جگہ عام طور پر حلال گوشت میسر نہیں آتا، لیکن تدبیر وکوشش سے مل جاتا ہے اور اگر گوشت نہ بھی ملے تو مچھلی، انڈا اور بہت سی غذائیں ایسی ہوتی ہیں جو استعمال کی جا سکتی ہیں۔ اور انسان ساری عمر انہی پر بسر کر سکتا ہے۔ ہاں ہسپتالوں اور جیل خانوں میں ضرور قدرے

دشواری ہے تو وہاں بھی دوسری غذائیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ گوشت پر زندگی کا دارومدار نہیں، یہی حالت سفر میں ہے کہ اگر ہوائی جہاز وغیرہ کے سفر میں گوشت کا حلال ہونا یقینی نہ ہوتو اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ حرام کو حلال کرنے کا بہانہ اختیار کر کے اسے اضطرار اور مجبوری قرار دے لینا بہت بڑی گمراہی ہے جو ایمان کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ ایمان مسلمان کے لیے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے، اس کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی تکلیف بھی برداشت کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ صحابہ کرام اور اسلاف کے واقعات موجود ہیں جنہوں نے ہر حال میں اپنے آپ کو حرام سے بچا کر ہمارے لیے ایمان کی حفاظت کا نمونہ پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق و ہمت نصیب فرمائے۔

وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بسم اللہ الرحمن الرحیم



مقالہ ۵

البقرہ: ۱۷۸ تا ۱۸۲

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَ لَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر بدلہ ان لوگوں کے خون کا جو (ناحق) قتل کیے جائیں، آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت، تو جس (قاتل) کے لئے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو بھلائی کے ساتھ مطالبہ ہو اور نیکی کے ساتھ اس کی طرف ادائیگی۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے سہولت اور رحمت ہے پھر اس کے بعد جو زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لیے قصاص میں حیات ہے اے عقلمندو تاکہ تم (خونریزی سے) بچو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ⑩

تم پر فرض کیا گیا، جب تم میں کسی کو موت آئے اگر وہ کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر لے، اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے، دستور کے موافق یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؕ ⑩

تو جو وصیت کو سن کر، اسے بدل دے تو اس کا گناہ انہی لوگوں پر ہے جو اسے بدلیں۔ بیشک اللہ سب کچھ سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑩ (البقرہ:۱۷۸تا۱۸۲)

پھر جسے وصیت کرنے والے کی طرف سے بے انصافی یا گناہ کا خوف ہو، پس وہ ان کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بیشک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم والا ہے۔

اے ایمان والو! عدل وانصاف کی بقاء اور امن وامان کے قیام کے لیے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی کسی کو عمداً اور قصداً قتل کر دے تو قاتل کو اسی طرح قتل کر دیا جائے جیسے اس نے قتل کیا تھا۔ نیز زمانہ جاہلیت کا یہ طریقہ یکسر ممنوع قرار دیا جاتا ہے کہ اگر قاتل آزاد ہو تو اس کے بدلے غلام کو قتل کیا جائے اور اگر قاتلہ عورت ہو تو اس کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے، ایسا ہرگز کرنے کی اجازت نہیں۔ بلکہ اگر آزاد مرد نے کسی غلام کو قتل کیا ہے تو اسی آزاد مرد کو قتل کیا جائے گا کسی غلام کو نہیں۔ اور اگر عورت نے کسی مرد کو قتل کیا ہے تو اس عورت ہی کو قتل کیا جائے گا کسی مرد کو نہیں کہ اسلام ایسی ناانصافی اور ظلم کی اجازت نہیں دے سکتا کہ قصور کسی کا ہو اور سزا کسی کو دی جائے۔ ہاں اسلام اس موقع پر بھی عفو ودرگزر کی تلقین کرتا ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف کرنا چاہیں تو اس کی جان بخشی کر کے اس سے دیت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اس مطالبہ میں بھی نرمی اور حسن سلوک کو ملحوظ رکھنا بہتر ہوگا، کہ نہ تو دیت کی وصولیابی میں سختی کی جائے اور نہ قاتل کی طرف سے اس کی ادائیگی میں غیر ضروری تاخیر کی جائے، جو بھی ایسا کرے گا وہ اللہ کے یہاں دردناک عذاب کا مستحق قرار پائے گا، کہ اس نے اللہ کی عطا کردہ سہولت سے غلط فائدہ حاصل کیا۔ قصاص کا حکم نہ تو ظلم ہے، نہ ناانصافی بلکہ قتل وغارت کے خاتمہ کا ذریعہ ہے اس سے دوسروں کی جانوں کو تحفظ ملتا ہے۔

اے ایمان والو! موت سے پہلے وصیت کے ذریعہ سخاوت کے اظہار کے طور پر سارا مال و دولت غیر متعلقہ لوگوں یا رفاہی اداروں کو دے دینا، جاہلیت کا طریقہ تھا۔ اب تمہیں وصیت کی تو اجازت ہے، لیکن حق داروں کے حقوق پامال کرنے کی اجازت نہیں، پس تم، اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ کے لئے وصیت کیا کرو۔ نیز وصیت سننے والے گواہوں کو وصیت میں تبدیلی کا حق نہیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو سخت گناہ گار ہوں گے کہ اگر ان کی اس بددیانتی کا کسی کو پتہ نہ چلا تو اللہ تو

سننے اور جاننے والا ہے۔ اس سے تو کوئی چیز نہیں چھپائی جاسکتی۔ ہاں ان گواہوں کو صرف اتنا حق حاصل ہے کہ اگر وصیت کرنے والا کوئی غلطی کر رہا ہے کسی کی حق تلفی کر رہا ہے تو اسے وہ نصیحت کریں، اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

سورۃُ البقرکی یہ پانچ آیات ہیں جن میں اہلِ ایمان کو دو حکم دیئے گئے۔ قصاص کا حکم یا اس کے بدلے دیت کا حکم۔ اسی کے ساتھ دیت کی وصولیابی اور اس کی ادائیگی کا اخلاقی طریقہ بھی بیان کیا گیا۔ دوسرا حکم وصیت سے متعلق ہے۔ جس کے ساتھ وصیت پر گواہوں کی ذمہ داری بھی بیان کردی گئی۔

قصاص و وصیت، اقوام کی تاریخ کے ہر دور میں رسمی طور پر جاری رہے ہیں، لیکن ان کا مقصد سوائے انتقامی کارروائی اور اظہارِ برتری اظہارِ سخاوت دولت مندی کے کچھ نہ تھا۔ اسلام کے جملہ قوانین دوسروں کے حقوق کی ادائیگی، عدل وانصاف کو رائج کرنے ظلم وستم کے انسداد اور امن وامان کی بحالی جیسے فوائد کے حامل ہیں۔ لہٰذا اسلام نے قصاص و وصیت کو قانونی شکل دے کر، انہیں ایسی ترامیم کے ساتھ نافذ کیا کہ امت مسلمہ کو ان سے یہ فوائد حاصل ہوسکیں۔ یہ مضامین فقہی اور قدرے دشوار ہیں، لیکن ہم انہیں آسان انداز پر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قصاص

قصاص کے معنی، خون کے بدلے خون کرنا، بدلہ لینا۔

اہلِ ایمان کو حکم دیا جارہا ہے کہ تم پر مقتولین کا بدلہ لینا فرض ہے۔ یہ حکم اگرچہ عام ہے لیکن اس کی تعمیل انہی لوگوں کی ذمہ داری ہے جنہیں عوام کی عزت وآبرو اور جان ومال کی حفاظت کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ یعنی صاحب اقتدار لوگ، حکام، اس طرح کہ قاتل کے ورثاء اپنے مقتول کے قتل کی اطلاع متعلقہ حکام کو دیں۔ حکام اس سے لاپرواہی نہ کریں بلکہ قاتل کو تلاش کرنا اور اس سے بدلہ لینا ان کی ذمہ داری ہے، جسے ان کو بحکم شریعت پورا کرنا ہوگا اگر اس مفہوم کے علاوہ یہ سمجھ لیا جائے، کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنے مقتول کا بدلہ خود لے تو یہ مفہوم نہ صرف قرآنی عبارت کے خلاف ہوگا بلکہ اس حکم کے مقصد کے بھی بالکل برعکس ہوگا۔ کہ قصاص کے حکم کا مقصد تو امن قائم کرنا بڑھتی جنگ کو ابتدائی ہنگامہ پر ہی ختم کردینا ہے۔ اب اگر ہر شخص اس حکم کے مطابق خود ہی بدلہ لینے لگا تو سب ہی قاتل ہوں گے اور سب ہی مقتول۔ بدامنی کا ایسا بھیانک منظر ہوگا کہ کوئی نہ سکون کی نیند سوسکے گا۔ اور نہ ہی چین سے زندگی کی دوسری ذمہ داریاں پوری کرسکے گا۔ قومی امور کی ذمہ داری چند افراد کو سونپ کر اسی لئے حاکم بنایا جاتا ہے کہ شرعی قانون کے مطابق وہ عوام کے حقوق کا تحفظ کریں۔

شریعت اسلامیہ نے اسلامی مملکت میں عوام وحکام کی ذمہ داریوں کو کچھ اس طرح تقسیم کیا ہے کہ عوام اور افراد، انفرادی طور پر قرآن وسنت کے احکام کی پابندی کریں اور حکام خود بھی پابندی کریں اور اس بات کی نگرانی بھی کریں کہ مملکت اسلامیہ میں بسنے والا کوئی مسلمان خلاف شرع کام میں مبتلا نہ ہو۔ نیز حدود وتعزیرات، جرائم پر سزاؤں کا نفاذ کریں کوئی چوری کرتا ہے تو ایک عام آدمی جس نے چور کو چوری کرتے دیکھا، گواہی دینے کا تو ذمہ دار ہے لیکن چور کا ہاتھ اگر وہ خود ہی کاٹ دے گا تو وہ مجرم قرار پائے گا۔ یہ اختیار حاکم وقاضی ہی کو ہے کہ ضروری تحقیقات اور شرعی قوانین کی تکمیل کے بعد سزا کا حکم نافذ

کرے۔ اور حاکم و قاضی کو بھی یہ اختیار صرف اپنی مملکت کے حدود ہی میں حاصل ہے۔ یعنی اگر کسی دوسرے ملک میں آباد مسلمان نے کوئی جرم کیا تو اس کو سزا دینے کا اختیار اسی ملک کے حاکم کو ہوگا اگر وہ ملک اسلامی ہے تو وہاں کا حاکم شرعی قوانین کے پیش نظر اپنی تحقیق کے مطابق سزا دے گا اور اگر کوئی غیر اسلامی ملک ہے تو وہاں کے قانون کے مطابق سزا ہوگی۔ اسلامی قانون ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ایران کا حاکم برطانیہ کے باشندے پر حد جاری کرے اور اس کو قتل کر دینے کا نہ صرف عوام کو اختیار دے بلکہ قاتل کے لیے انعام و اکرام کا بھی اعلان کرے۔ یہ نہ صرف قوانین شریعت سے ناواقفی کا ثبوت ہے بلکہ دہشت گردی بھی ہے اور دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا جرم بھی جس سے عالمی امن وامان میں خلل واقع ہوتا ہے۔

آیت زیر بحث میں حکم دیا جا رہا ہے کہ ''آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر آزاد کو غلام نے قتل کیا تو اس کے بدلے کسی دوسرے آزاد کو قتل کیا جائے اور غلام کو آزاد نے قتل کیا تو اس کے بدلے کسی غلام ہی کو قتل کیا جائے۔ عورت کو مرد نے قتل کیا تو اس کے بدلے کسی بھی عورت کو قتل کیا جائے۔ گویا سزا قاتل کو نہیں دی جائے گی بلکہ جنس کا بدلہ جنس سے لیا جائے گا یہ انصاف نہیں۔ سراسر ظلم ہے۔ اسلام ایسے لغو اور ظالمانہ حکم ہرگز نہیں دیتا۔ درحقیقت یہاں قصاص کا حکم ایک خاص صورت کے مطابق دیا گیا ہے جو یہ تھی کہ اہل عرب میں قصاص تو رائج تھا لیکن اس میں انصاف نہ تھا۔ اس سے مقصود قاتل کو سزا دینا اور سلسلہ قتل و غارت کا سدباب کرنا نہ تھا۔ بلکہ اپنی فوقیت، برتری اور قوت و طاقت کے مظاہرے کے لیے وہ قصاص لیتے تھے۔ اگر کوئی قبیلہ ان کے ایک آزاد آدمی کو قتل کر دیتا تو وہ دشمن کے کئی آزاد کو قتل کرتے، اگر ان کا غلام مارا جاتا تو وہ دشمن کا آزاد آدمی اس کے بدلے مارتے، اگر ان کی کوئی عورت ماری جاتی تو وہ اس کے بدلے دشمن کے مرد کو قتل کر دیتے اور اس کو اپنی بہادری، غلبہ اور شرف کا ذریعہ بناتے تھے۔ اسلام نے قصاص کا حکم دیا۔ جنگ بڑھانے کے لیے نہیں، قتل و غارت کو عام کرنے کے لئے نہیں، فخر و مباہات کا ذریعہ بنانے کے لئے نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ حق دار کو حق ملے۔ وارثوں کا یہ حق ہے کہ ان کے مقتول کے قاتل کو مارا جائے جب مقتول کا قاتل مار دیا گیا تو دشمن ختم ہوگیا۔ جس نے ایذا پہنچائی وہ نظروں کے سامنے نہ رہا۔ وارثین کی آتش غضب بجھانے کے لئے اتنا کافی ہے۔ پس سزا قاتل کو ملنی چاہیے تم ایک آزاد کے بدلے دو آزاد، غلام کے بدلے آزاد، عورت کے بدلے مرد کو قتل کر کے قصاص نہیں لے رہے، دہشت گردی میں اضافہ کر رہے ہو۔ پس اے مؤمنو، تم ایسا نہ کرو، بس قاتل کو قتل کرو اگر آزاد کا قاتل ایک آزاد ہے تو بس اسی کو قتل کرو، اگر غلام کو کسی غلام نے قتل کیا تو اسی کو قتل کرو۔ اگر عورت کو کسی عورت نے قتل کیا تو اسی کو قتل کرو۔ قاتل ہی کو قتل کرو اس کے بدلے کسی دوسرے کی جان نہ لو کہ یہ ظلم ہے، فتنہ و فساد میں اضافہ کرنا ہے۔

اسلام دین مساوات ہے اور حکم قصاص اس کا ثبوت ہے کہ اسلام سب کے لیے ایک ہی حکم دیتا ہے۔ اگر کسی امیر و دولت مند نے غریب کو قتل کیا تو اس امیر قاتل کو اسی طرح قتل کیا جائے گا جسطرح ایک غریب قاتل کو قتل کیا جاتا ہے۔ اگر کسی آزاد مرد نے کسی غلام کو قتل کیا تو اس آزاد قاتل کو اسی طرح قتل کیا جائے گا جس طرح غلام قاتل کو قتل کیا جاتا ہے۔ اگر کسی عورت کو عورت نے قتل کیا یا مرد نے تو قاتل ہی کو قتل کیا جائے گا۔ اصل قصاص یہ ہے کہ جان کے بدلے قاتل ہی کی جان لی

جائے۔ ہمارا یہ قانون ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اے مؤمنو! اسی کو ہم نے تمہاری شریعت میں باقی رکھا ہے، فرمایا گیا:

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ

اور (تورات میں) ہم ان پر فرض کر چکے ہیں کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بدلہ ہے تو جو شخص بدلہ معاف کر دے تو یہ معافی کفارہ ہوگی اس کے لیے (گناہوں کا)

وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (المائدہ:۴۵)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے (حکم) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

تورات میں طرح طرح کے ردوبدل کے باوجود آج بھی یہ حکم موجود ہے جو قرآن کی حقانیت کی تصدیق کرتا ہے۔

"اگر وہ اس صدمہ سے ہلاک ہو جائے تو، تُو جان کے بدلے میں جان لے اور آنکھ کے بدلے میں آنکھ دانت کے بدلہ میں دانت اور ہاتھ کے بدلہ ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، جلانے کے بدلہ جلانا، زخم کے بدلہ زخم، اور چوٹ کے بدلہ چوٹ۔"

(خروج ۲۱، ۲۳۔۲۵)

قصاص کا یہ اسلوب امیر وغریب، آزاد وغلام، مرد وعورت کے درمیان غیر منصفانہ فرق کو مٹاتا اور اسلامی مساوات کو اجاگر کرتا ہے اور صرف قصاص ہی نہیں بلکہ اسلام کے تمام حدود وتعزیرات اور دیگر احکام میں یہی روح رواں ہے۔ درج ذیل واقعہ سے مزید اندازہ لگائیے کہ اسلامی مساوات کا اندازہ کرنے کے لیے اس سے اہم واقعہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

عَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ قُرَيْشًا اَهَمَّهُمْ شَانُ الْمَرْاَةِ الْمَخْزُوْمِيَّةِ الَّتِىْ سَرَقَتْ فَقَالُوْا مَنْ يُّكَلِّمُ فِيْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالُوْا وَ مَنْ يَّجْتَرِئُ عَلَيْهِ اِلَّا اُسَامَةُ ابْنُ زَيْدٍ حِبُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَكَلَّمَهُ اُسَامَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَشْفَعُ فِىْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ ثُمَّ قَالَ اِنَّمَا اُهْلِكَ الَّذِيْنَ قَبْلَكُمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَ اِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ اَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَ اَيْمُ اللّٰهِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک مخزومی عورت کے معاملہ نے قریش کو پریشان کر دیا، جس نے چوری کی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ اس بارے میں کون حضور علیہ السلام سے عرض کر سکتا ہے بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت اسامہ بن زید کے سوا کوئی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہی حضور علیہ السلام کے بہت محبوب ہیں۔ پس حضرت اسامہ نے حضور علیہ السلام کے دربار میں معاملہ پیش کیا تو آپ نے فرمایا کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے متعلق سفارش کرتے ہو، پھر حضور علیہ السلام کھڑے ہوئے اور آپ نے خطبہ دیا، آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی لئے ہلاک کیے گئے کہ

جب کوئی معزز چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا، تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ اللہ کی قسم، اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ (مشکوٰۃ شریف)

کیا اس دور میں مساوات کے جھوٹے نعرے لگانے والے کوئی ایسی نظیر پیش کر سکتے آج کی مساوات یا تو عیاشی کا نام ہے اور یا لوگوں کے مال و دولت پر جبراً قبضہ کر لینے کا، جس کے پاس قوت و طاقت ہوتی ہے وہ دوسروں کو ننگا کر کے خود پہنتا ہے۔ دوسروں کو بھوکا کر کے خود کھاتا ہے۔ اور اسی کو مساوات کہتا ہے۔ دیکھئے ان ملکوں کا حال جن میں سوشلزم اور کمیونزم کے نام پر عوام کا خون چوسا جا رہا ہے، ان پر ظلم ہو رہا ہے اور انہیں اس کے خلاف آواز تک نکالنے کی اجازت نہیں۔ اسلام، امیر و غریب، کمزور و طاقتور، حاکم و محکوم، سب کا فرق مٹا کر سب کے لیے ایک قانون پیش کرتا ہے جو سزا خاندان بنو مخزوم کی چور عورت کے لیے ہے وہی سزا نبی کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے بھی ہے۔

قصاص کا قانون کوئی نیا نہیں بلکہ نہایت ہی قدیم ہے اور ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ آیت مبارکہ سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کو بھی اس کا حکم دیا گیا، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس کے مرتب جیمس نے اس موضوع کو خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے، وہ لکھتا ہے۔

> ''قدیم زمانہ میں قتلِ خطاء اور قتلِ عمد اور دیگر جرائم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا تاہم اپنے قبیلہ سے باہر چوری کر لینا یا قتل کر دینا کوئی عیب نہ تھا۔ بلکہ بعض اوقات اسے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ہاں اگر انتقام کا اندیشہ ہوتا تھا تو اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ پھر جب اخلاقیات کا تصور پیدا ہوا تو قبیلہ سے باہر اور اندر دونوں جگہ اس کو برا سمجھا جانے لگا۔ لیکن ملزم کی دولت مندی اور تنگ دستی کے اعتبار سے سزا میں فرق رہا۔ پہلی مرتبہ جرم کرنے والے اور دوسری مرتبہ جرم کرنے والے کی سزا میں بھی فرق ہوتا تھا۔ بعد کے جرائم میں قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ پہلی چوری پر صرف ایذاء دی جاتی تھی دوسری چوری پر انگلیاں کاٹ دی جاتی تھیں اور تیسری چوری پر ہاتھ اور ہونٹ کاٹے جاتے تھے۔ اور چوتھی چوری پر قتل کر دیا جاتا تھا۔ بعض قبائل میں جھوٹی گواہی دینے پر زبان کاٹ دی جاتی تھی۔ لیکن یہ عام دستور تھا کہ اعضا کو نقصان پہنچانے میں قصاص بالمثل کی پابندی کی جاتی تھی۔ یعنی ہاتھ کے بدلے ہاتھ، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ کا قانون رائج تھا''۔

اسلام عدل و انصاف کا دین ہے اس میں یہ کب گوارا کیا جا سکتا ہے کہ جرم کی سزا کے بہانے لوگوں کو ظلم کا شکار بنایا جائے۔ نیز اس کے لانے والے نبی، نبی رحمت ہیں جو انسانوں کو ایذاء پہنچانا تو در کنار جانوروں کو بھی تکلیف پہنچانے کی ممانعت فرماتے ہیں۔ مثلاً آپ کا ارشاد ہے کہ ''جب تم جانور ذبح کرنے لگو تو چھری تیز کر لو تا کہ جانور کو تکلیف نہ پہنچنے پائے'' ۔ پس آپ سے کس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آپ انسانوں کو ایذاء پہنچانے والا کوئی حکم جاری فرمائیں۔ ہاں جرائم کی روک تھام انسانوں ہی کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے کہ جس معاشرے میں جرائم کی کثرت ہوتی ہیں اس میں تمام ضروریات زندگی مہیا ہونے کے باوجود عوام کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنے جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے متفکر

و پریشان رہتے ہیں۔ ہمارے دور میں بھی ایسے بہت سے ممالک ہیں جنہیں اپنے عوام کے مہذب ہونے کا دعوئی ہے، وہ خوشحال بھی ہیں، ان کے انتظامی امور بھی بڑے دلکش ہیں لیکن جرائم کی کثرت نے وہاں کے بسنے والوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ جرائم کا خاتمہ سخت سزاؤں کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا اسلام جو دین رحمت ہے قاتل کو، قتل ثابت ہو جانے کے بعد قتل کر دینے کا حکم دیتا ہے، کسی کی جان لینے کے لیے نہیں بلکہ ایک قتل کے بعد ہمیشہ کے لئے فساد کے اس عمل کا خاتمہ کر دینے کے لئے لیکن انصاف کے ساتھ اس طرح نہیں کہ امیر قاتل کے بدلے کسی غریب کو قتل کر دیا جائے۔ عورت کے بدلے مرد کو، آزاد کے بدلے غلام کو یا اس کے برعکس، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں یا اس سے قبل ہوتا تھا۔ اسلام نے قصاص کو باقی رکھا اور قاتل ہی کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چاہے وہ کتنا ہی دولت مند ہو بارسوخ ہو یا بزعمِ خود معزز ہو۔

قصاص اور اقسام قتل

قصاص صرف قتلِ عمد کی صورت میں واجب ہے یعنی قاتل کو قتل کرنے کے لئے صرف اس سے قتل کا ثابت ہونا کافی نہیں بلکہ یہ ثبوت بھی ضروری ہے کہ اس نے جان بوجھ کر کسی ایسی چیز سے قتل کیا جس سے عام طور پر قتل کیا جاتا ہے، کہ قتل عمد کے علاوہ قتل کی مندرجہ ذیل قسموں اور صورتوں میں قصاص واجب نہ ہوگا۔

قتل شبہِ عمد، یعنی مقتول کو سزا دینا مقصود تھا، لیکن وہ برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ اس صورت میں قاتل گناہ گار ہوگا، اسے کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ یعنی ایک غلام آزاد کرنا ہوگا یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے۔ اور قاتل کے ورثاء مقتول کے ورثاء کو سو اونٹ یا ان کی قیمت بطور دیت ادا کریں گے۔ نیز اگر قاتل، مقتول کا وارث ہے تو میراث سے محروم ہو جائے گا۔

قتلِ خطاء، یعنی مقتول غلطی سے مر گیا، مثلاً شکاری، شکار پر حملہ کر رہا تھا کہ کوئی شخص اچانک سامنے آ گیا اور مر گیا۔ غلطی اور خطا پر عنداللہ کوئی مواخذہ نہیں، جیسے کسی نے روزے کی حالت میں روزہ توڑنے والا کوئی عمل بھول کر کیا تو روزہ نہیں ٹوٹتا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ (احزاب:۵)

اور نہیں ہے تم پر کوئی گناہ اس میں جو تم غلطی سے کرو اور لیکن (ان کاموں میں گناہ ہے) جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں۔

گناہ کا سبب قصد ہے، عمد ہے۔ خطاء و نسیان سے جو کام ہو جائے اس میں گناہ نہیں۔ میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے۔

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ

میری امت سے خطاء، بھول اور جبریہ کاموں پر گناہ اٹھالیا گیا ہے۔

یہ صدقہ ہے نبی رؤف و رحیم کا، تاہم ایسی بڑی غلطی جس سے کسی کی جان چلی گئی، قابل سزا ہے۔ تاکہ آئندہ اس کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ یا اس کو کوئی بہانہ نہ بنا سکے۔ لہٰذا شریعت مطہرہ نے اس صورت کے قاتل کے لئے سزا مقرر کی کہ وہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کی جائے۔

قتل قائم مقام خطاء اس کو اتفاقیہ قتل بھی کہا جا سکتا ہے، مثلاً دو آدمی آپس میں مذاق کر رہے تھے اور ہاتھا پائی ہو رہی

تھی یا کھیل رہے تھے ایک کو چوٹ آئی اور مر گیا اس میں دوسرے شخص کا کوئی قصور نہیں تاہم وہ مجرم قرار پائے گا اور اسے بھی مذکورہ بالا سزا دی جائے گی تاکہ اگر اس میں کوئی سازش ہو تو اسے بھی سزا مل جائے اور دوسروں کے لئے بھی عبرت ہو۔

قتل بالسبب یہ ہے کہ کسی شخص کے عمل کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص مر جائے۔ مثلاً کسی شخص نے اپنے گھر کے سامنے کنواں کھودا اور اس میں گر کر کوئی مر گیا تو یہاں اگرچہ کسی کو قتل کرنے کا وہم وگمان تک نہ تھا۔ لیکن بہرحال ایک شخص کی جان ضائع ہونے کا سبب کنواں کھودنے والا بنا، اس کی غیر ذمہ داری یا بے حسی کی اسے سزا ملنا چاہیے جو یہ ہے کہ وہ مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرے، جن کا واقعی بھاری نقصان ہوا ہے۔

یہ فقہی مسائل ہیں جنہیں بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام نے قصاص کا حکم صرف دہشت گردی اور بد امنی کے خاتمہ کے لئے دیا ہے جو قتل عمد سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ دیگر اقسامِ قتل میں یہ فتنہ نہیں لہٰذا ان میں سزائیں ضرور ہیں لیکن قصاص نہیں۔ عمداً اور قصداً قتل کرنے والا ایسا مجرم ہے جس کے باعث فساد پیدا ہوتا ہے اور اس کا زندہ رہنا پورے معاشرے میں خوف وہراس کا سبب بنتا ہے لہٰذا اسے قتل کر دینا ضروری ہے تاکہ کسی شخص کو اپنی جان کا خطرہ نہ رہے ہاں دیت کی ادائیگی کی صورت میں اس کا زندہ رہنا مضر نہیں رہتا کہ وہ نفسیاتی طور پر اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ اب کسی پر ہاتھ اٹھانے کی اس میں ہمت نہیں رہتی۔ کچھ اسے اپنے مجرم ہونے کا احساس رہتا ہے اور کچھ اس پر خاندان کے ان لوگوں کا دباؤ ہوتا ہے جنہوں نے اس کی طرف سے دیت کی بھاری رقم ادا کی ہے۔

دیت

دیت یعنی خون بہا، کہ مقتول کے وارث یا ان میں سے کوئی وارث راضی ہو تو قاتل کی جان بخش دی جائے گی اور شریعت کا مقرر کردہ خون بہا ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

ورثاء کو اپنے عزیز کے قتل سے جو دکھ اور صدمہ پہنچا اس کا یہی تقاضہ تھا کہ قاتل کو موت کی سزا دے کر ان کی تسلی کا اہتمام کیا جائے لیکن انہیں یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ اپنا حق معاف کر کے اسکے عوض اگر چاہیں تو دولت قبول کر لیں، کیونکہ شریعت کے اس حکم کا مقصد صرف کسی کی جان لینا نہیں، بلکہ وُرثاء کی تسلی، اور ان کا حق ادا کرنا ہے۔ نیز مسلمانوں کے معاشرے میں ایک قتل کی وجہ سے جو اضطراب پیدا ہوا ہے اس کو ختم کرنا اور مستقبل کے لیے ایسے فتنہ کا سدِّ باب کرنا ہے۔ اگر وُرثاء برضا ورغبت دیت قبول کرنے پر آمادہ ہوں تو قصاص کے مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ وُرثاء کی تسلی بھی ہو جائے گی قاتل کے بدلے میں کوئی کسی کو قتل بھی نہیں کرے گا۔ جنگ کی بڑھتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی اور ایک معقول رقم کی ادائیگی کے خوف یا اپنی جان جانے کے ڈر سے آئندہ کوئی کسی کو قتل کرنے کی جرأت بھی نہ کرے گا۔ اسی لئے معافی کے اختیار کو ایک نہایت ہی پیارے انداز میں بیان کیا جا رہا ہے کہ جو تمہارے باپ، بھائی، بیٹے وغیرہ میں سے کسی کا قاتل ہے وہ اپنے جرم کے اعتراف کے ساتھ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اب اس کی جان تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس سے تمہارا کوئی خونی رشتہ نہ سہی لیکن وہ تمہارا اسلامی بھائی تو ہے اور یہ رشتہ تمام رشتوں سے مضبوط تر ہے، اہم ہے اور تمہیں اختیار بھی ہے کہ اپنے بھائی کی جان بخش دو۔

آیت پر مزید غور کیجئے کہ جب وُرثاء نے جان بخش دی، دیت قبول کر لی تو اب دیت وصول کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ قاتل کے خاندان پر دیت ادا کرنے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ اکبر، کتنے پیارے ہیں میرے مذہب کے قوانین۔ کیسے فطری انداز سے انسان کو کنٹرول کرتے ہیں، کیسے جھگڑوں اور فتنوں کا قلع قمع کرتے ہیں، کس طرح دشمنی اور عداوت کے داغوں کو مٹا کر بھائی سے بھائی کو ملاتے ہیں، قتل تو ہو ہی چکا۔ اب قصاص لے لو یا دیت قبول کر لو۔ بس یہ خیال رکھو کہ قاتل کوئی غیر نہیں، تمہارا اپنا ہے۔ اسلامی بھائی ہے اور دیت قبول کر کے جب تم نے اسلام دوستی کا ثبوت دے ہی دیا تو اب معروف پر بھی عمل کرو کہ دیت وصول کرنے میں ظلم و زیادتی اور سختی نہ کرو۔ اب قاتل کو قاتل نہ سمجھو، اپنا بھائی ہی جانو۔ وصولیابی میں جتنی سہولت دے سکتے ہو دو۔ اور قاتل کو چاہئے کہ وہ مقتول کے وُرثا کا احسان مانے، دیت کی ادائیگی میں پوری دیانت سے کام لے، ٹال مٹول نہ کرے۔ اس کا بوجھ کتنا ہلکا ہو گیا۔ اللہ کی اس پر کتنی رحمت ہوئی ہے۔ اسے تو خون کا بدلہ خون سے دینا تھا۔ دیت قبول کرنے والوں نے اس کی جان بچا دی اب اسے صرف دولت ادا کرنا ہے۔ پس اسے کوئی ہیرا پھیری نہیں کرنا چاہیے۔ جس قدر ہو سکے جلد یہ قرضہ ادا کر دے اور اگر اس نے ایسا نہ کیا، احسان کا بدلہ دیانت سے ادا نہ کیا تو پھر اللہ خود فیصلہ فرمائے گا کہ ''اس کو دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا''۔

ہے، دنیا کا کوئی ایسا مذہب یا کسی ملک کا قانون جو اس انداز پر معاشرے کی اصلاح کرتا ہو اور اس طرح پُرسکون زندگی مہیا کرنے کا اہتمام کرتا ہو۔ میرے مذہب میں قتل کے بدلے قتل کی سزا کو جبر و تشدد قرار دینے والے غور کریں، اس حکم کے انداز بیان پر کہ کس پُرحکمت انداز میں مقتول کے غمزدہ وارثین کو مطمئن بھی کیا گیا کہ تمہیں پورا پورا حق ہے کہ تم اپنے عزیز کے خون کا بدلہ خون سے لے لو، اور پھر کیسے معاف کر دینے اور دیت قبول کر لینے پر آمادہ کیا گیا کہ قاتل بھی تو تمہارا بھائی ہے کیوں نہ اس کو معاف کر کے اس سے خون بہا قبول کر لو، پھر دونوں کو محبت کے رشتے میں جوڑتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ دیت وصول کرنے میں سختی نہ کرو۔ اور دیت دینے والا اس کو ادا کرنے میں لاپرواہی نہ کرے۔ جب قتل کا جھگڑا ختم ہو گیا تو اب پیسے پر کوئی جھگڑا نہ ہونا چاہیے اب خود بھی آرام کی نیند سوؤ اور دوسروں کو بھی آرام کرنے دو۔ میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا اُعْفِیَ مَنْ قَتَلَ بَعْدَ اَخْذِ الدِّیَةِ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کو معاف نہیں کیا جائے گا جو دیت لے کر بھی قتل کر دے۔ (مشکوٰۃ شریف)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ مَا مِنْ رَجُلٍ یُصَابُ بِشَیْءٍ فِی جَسَدِهٖ فَتَصَدَّقَ بِهٖ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهٖ دَرَجَةً وَّ حَطَّ عَنْهُ خَطِیْئَةً۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام کو فرماتے سنا کہ ایسا کوئی شخص نہیں جس کے جسم پر زخم کیا گیا اور اس نے معاف کر دیا مگر اللہ اس کا درجہ بلند فرما دیتا اور اس کی خطائیں معاف کر دیتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

دیت قبول کر لینے والا بڑا ہی رحم دل اور صابر ہے، کہ اس نے اپنے مقتول عزیز کے مقابلے اپنے اسلامی بھائی کو

ترجیح دی۔ اس کو قتل کی سزا سے بچالیا۔ پس اللہ بھی اس کو اس عمل کی جزا دے گا کہ دنیا والے بھی اس کا احترام کریں گے اور آخرت میں بھی اس کا درجہ بلند ہوگا۔ لیکن اگر اس نے دیت قبول کر کے بھی قاتل کو قتل کر دیا تو اب وہ خود قاتل بھی قرار دیا جائے گا اور اللہ بھی اس کی بغاوت کو معاف نہیں فرمائے گا۔ وہ دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے۔

قصاص میں زندگی

قصاص میں زندگی ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ موت میں زندگی ہے۔ عجب بات معلوم ہوتی ہے۔ غور کیا جائے تو کوئی عجب بات نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے جو بہت ہی عام ہے۔ لیکن ہم اس کو بھولے ہوئے ہیں۔ بس زندگی ہی سے پیار کرتے ہیں۔ موت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ذرا غور کیجئے تو حقیقت سامنے ہے کہ موت میں ہی زندگی ہے۔ سوچئے اگر جانور نہ مرتے تو کیا زمین پر، پانی میں، فضا میں کہیں ہمارے لئے جگہ ہوتی۔ یہ موت ہی ہے جو جانوروں کو نہ جانے کتنے جانوروں اور انسانوں کی غذا بنا کر، ان کو زندگی بخشتی ہے۔ تصور کیجئے کیا حال ہوتا اس زمین کا اگر انسان اول حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک کسی کو موت نہ آئی ہوتی۔ سب اس زمین پر موجود ہوتے۔ پہلوں کو موت آتی ہے تو بعد والوں کے لئے زمین پر جگہ ہوتی ہے۔ ترقی پسند قوموں، سائنس کے متوالوں نے ایسی دوائیں ایجاد کیں جن سے انسان کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ لیکن وہ خود ہی اپنی اس ایجاد سے تنگ آ گئے اور اب بوڑھوں کو زہر دے کر مارنے پر مجبور ہیں۔ بلکہ بوڑھے خود ہی چیخ اٹھے کہ ہمیں اب آرام کی نیند سلاؤ، یہ زندگی نہیں چاہیے۔ اسلام نے انسان کے لیے اس فطری عمل کو آسان بنانے کے لئے بیماری کو کفارۂ گناہ قرار دیا۔ جہاد کو ذریعہ شہادت بنایا۔ قصاص میں حیات کا اعلان فرمایا۔

قصاص میں زندگی ہے اس طرح بھی کہ اس سے معاشرہ پر امن ہوتا ہے۔ آبادیوں میں سکون ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں، جن شہروں اور ملکوں میں چین نہ ہو وہاں کے باشندوں کو دن رات قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ کا ڈر لگا رہے، حقیقت میں وہاں زندگی نہیں۔ زندگی تو پُرسکون ماحول میں نظر آتی ہے جہاں لوگ رات کو آرام کی نیند سوتے اور دن میں چین سے اپنی روزی تلاش کرتے ہیں۔ قصاص ماحول کو پُرسکون بنا دیتا ہے کہ ایک قاتل کی موت سے پورا معاشرہ عبرت حاصل کرتا اور قتل و غارت سے بچتا ہے۔ یہی حال اسلام کی دوسری سزاؤں کا ہے۔ جو بظاہر بڑی سخت نظر آتی ہیں لیکن جرائم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی ہیں۔ اسلامی ملکوں کے گلی کوچوں میں نہ لٹیرے نظر آتے ہیں نہ شرابیوں کی گالیاں سنائی دیتی ہیں، نہ لوگوں کو اپنے مال کی حفاظت کی فکر ہوتی ہے، نہ رات کو گھروں میں دوکانوں میں تالوں کی اور الارم لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ پولیس کا گشت ہوتا ہے، نہ جیلوں پر عوام کی دولت خرچ ہوتی ہے۔ نہ عدالتوں کا جال بچھانا پڑتا ہے۔ بڑا ہی پُرسکون، بے خوف و خطر ماحول ہوتا ہے۔ آج بھی جن مسلم ممالک میں شریعت کے بعض قوانین پر عمل ہے وہاں دیگر ممالک کی نسبت زندگی زیادہ پُرامن نظر آتی ہے۔ کاش ہمارے دور میں کوئی اسلامی حکومت ہوتی تو ہم تہذیب و تمدن کے جھوٹے دعویداروں کو اس ملک کا پُرامن، پُرسکون، خوشحال ماحول دیکھنے کی دعوت دیتے تو ان کی زبانیں اسلام پر اعتراض کرنے سے خود بخود رک جاتیں۔ لیکن شومیٔ قسمت کہ ہم ایسی کوئی عملی صورت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ بس ہمارے پاس دلائل کا چراغ ہے جس سے ہم اپنے دل کے اندھیروں میں اجالا کر سکتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ ہے جس کے سہارے ہم اپنے ایمان کو مضبوط کر لیتے ہیں اور رحمت الٰہی

سے امید کی وابستگی ہے جس سے روشن مستقبل کی آس لگائے زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔

قصاص میں زندگی ہے، ایک حقیقت ہے، کوئی مانے یا نہ مانے ہم سمجھا سکیں یا نہ سمجھا سکیں۔ اُولوالالباب عقلمندوں نے ہمیشہ اس کو مانا اور سمجھا۔ اور اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچایا۔ اللہ کے احکام پر غور کر کے ان پر عمل کر کے وہ متقی بنے۔

وصیّت

نبی مکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے سب ہی لوگ خصوصاً اہلِ مکہ اپنی مرضی سے قانون وضع کرتے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ قصاص کے متعلق پڑھ چکے کہ اس کی عملی صورت تو موجود تھی مگر حقیقت مسخ ہو چکی تھی۔ اصل میں وہ قصاص نہ تھا بلکہ صرف انتقام تھا۔ اسلام نے قصاص کی تمام غلط رسم ورواج کی اصلاح کی یا بتدریج ان کو ختم کیا۔ اسی طرح وصیّت کا معاملہ بھی کہ عرب میں وصیّت کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور مرنے سے پہلے ہر شخص ضرور وصیّت کرتا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ اپنی دولت سے حق داروں، اہل وعیال کو تو یکسر محروم کر دیتا تھا اور اپنی نیک نامی یا سخاوت کا ڈھونگ رچانے کے لیے تمام دولت غرباء میں تقسیم کرنے یا کسی رفاہی ادارے کو دے دینے کی وصیت کر جاتا تھا۔ قرآن نے ابتداء اس غلط رواج کی اصلاح کی کہ وصیّت کی اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے فرض قرار دیا۔ لیکن حق تلفی سے بچاتے ہوئے والدین اولاد اور اعزاء واقرباء کے لیے وصیّت کرنے کا حکم دیا۔ مزاج قرآن یہی ہے کہ قوم کی اصلاح بتدریج کی جائے۔ لہٰذا کچھ مدت تک یہی حکم رہا پھر سورۃ النساء کی آیات وراثت نازل ہوئیں جن میں وارثوں اور ان کے حصوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا اور صاحب شریعت ﷺ نے وصیّت و وراثت کے احکام کی وضاحت فرمائی، جس کے مطابق ہمیشہ کے لیے یہ طے پایا کہ قرآن کریم نے جن رشتہ داروں کے حقوق کی وضاحت فرما دی اور ان کے حصوں کا تعین کر دیا ہے، ان کے متعلق کوئی وصیّت ممنوع ہے۔ وصیّت کا اختیار صرف تہائی مال میں ہے کہ مالک، اصل وارثین کے علاوہ دور کے رشتہ داروں، احباب یا رفاہی و مذہبی اداروں پر اپنی دولت کا تہائی حصہ تقسیم کرنے کی وصیت کر سکتا ہے۔ کل مال میں نہیں کہ یہ اصل وارثین کی حق تلفی ہے جس کو اسلام جیسا عدل وانصاف کا مذہب ہرگز پسند نہیں فرماتا۔ نیز وصیت کرنا فرض نہیں، صرف مستحب ہے۔ اگر کسی شخص نے ان احکام کے خلاف وصیّت کی یا اور کوئی خلاف شرع وصیت کی تو وہ نافذ العمل نہیں وارثین کو چاہیے کہ ایسی وصیت کو کالعدم قرار دیں ورنہ وصیّت کرنے والا گنہگار ہوگا۔

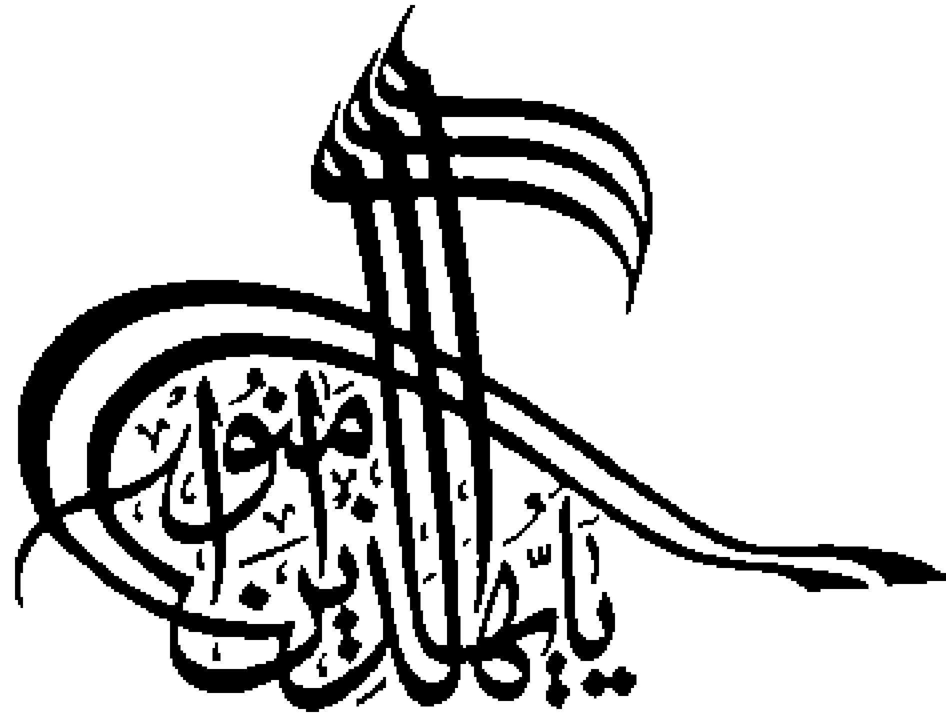
ان احکام سے واضح ہے کہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ ہر شخص اپنے اختیارات اور حقوق ملکیت کو اپنی زندگی تک ہی محدود سمجھے۔ مرنے کے بعد اس کا کچھ نہ رہا۔ اب اللہ اپنی عطا کردہ دولت جن کو منتقل کرنے کا حکم دیتا ہے ان کو منتقل کر دی جائے گی۔ وصیّت کے ذریعہ حقوق تلف کرنا یا قبر میں جانے کے بعد بھی اپنے اختیارات کو باقی رکھنے کی ہوس دونوں ہی جُرم ہیں۔ مرنے کے بعد اپنے گناہوں میں ان جرائم کا اضافہ کرنا بڑی ہی جرأت ہے اللہ ہواء وہوس اور دنیا کے ایسے تعلق سے محفوظ رکھے، آمین۔

وصیّت کے اس قانون کا اصل منشاء وارثین کی حق تلفی اور اُن کے خداداد اختیارات کو سلب کرنے سے روکنا ہے لہٰذا ایسی وصیّت بھی جائز نہیں کہ ترکہ کا فائدہ تو ورثاء میں تقسیم ہوتا رہے لیکن اصل مال پر انہیں کوئی اختیار نہ ہو۔ مثلاً کسی نے اپنے

مرنے سے پہلے یہ وصیّت کر دی کہ میری فلاں عمارت یا زمین وغیرہ کا منافع میری اولاد لیتی رہے گی لیکن اسے فروخت کرنے یا اس میں تبدیلی کا کسی کو حق نہ ہوگا۔ ایسی وصیّت درحقیقت اولاد اور دیگر ورثاء میں عداوت کا بیج بونے کے مترادف ہے کہ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ ایسی وصیت خاندان میں شدید اختلاف کا باعث ہوتی ہے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ مرنے والا کوئی ایسا عمل نہ کرے جس سے مرنے کے بعد بھی ترکہ پر اس کا اثر یا اس سے تعلق باقی رہے۔ دولت کی محبت کا یہ بدترین ثبوت ہے کہ انسان مرنے کے بعد بھی اپنی دولت کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا حق تو یہ ہے کہ انسان کو دولت جمع کرتے وقت ہی یہ سوچنا چاہیے کہ اسے ایک دن ضرور مرنا ہے اور یہ سب مال حق داروں کو مفت ہاتھ آئے گا۔ لہٰذا اسے جمع کرنے کی ہوس نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے ذریعہ اپنی عاقبت کو بہتر بنانا چاہیے کہ خود استعمال کرے، اہل خانہ و خاندان کو فائدہ پہنچائے۔ زکوٰۃ ادا کرے، صدقہ وخیرات میں سخاوت سے کام لے، کہ جو کچھ انسان خرچ کر لیتا ہے وہی اس کا ہوتا ہے۔ چھوڑا ہوا مال اس کا نہیں۔ اسی لیے شریعت نے جائز ذرائع اور محنت ومشقت سے دولت کمانے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، لیکن دولت کی محبت کو مذموم قرار دیا ہے۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ٦

البقرہ: ١٨٣ تا ١٨٨

يٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَۙ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ
اُخَرَؕ وَ عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ
لَّهٗؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ
الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْیَصُمْهُؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ
الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ٘ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِۙ
فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ
اِلٰى نِسَآىٕكُمْؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ

اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ
كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ
اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَى الَّیْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ
اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا
اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ
بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۸۳ تا ۱۸۸)

اے ایمان والو! فرض کیے گئے تم پر روزے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ گنتی کے مقررہ تھوڑے دنوں میں۔ پس جو تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو تو (اس پر) دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا لازم ہے اور ان لوگوں پر جو روزہ رکھ سکتے ہوں فدیہ ہے، کھانا ایک مسکین کا پھر جو خوشی سے زیادہ نیکی کرے تو وہ بہتر ہے اس کے لیے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، لوگوں کو ہدایت کرنے والا، اور روشن دلیلیں رہنمائی کرنے والا اور حق و باطل میں فیصلہ کرنے والا، تو تم میں سے جو اس مہینے میں موجود ہو وہ ضرور اس کے روزے رکھے، اور جو بیمار یا مسافر ہو تو (اس پر) دوسرے دنوں سے گنتی (پوری کرنا لازم) ہے۔ اللہ تم پر آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تنگی کا ارادہ نہیں فرماتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو۔ اور اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔ اور (اے حبیب علیہ السلام) جب آپ سے سوال کریں میرے بندے میرے بارے میں تو (آپ فرما دیں) بیشک میں (ان کے) قریب ہوں، دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرے تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ کامیابی حاصل کریں۔ حلال ہوا، تمہارے لئے روزے کی رات میں اپنی عورتوں کے پاس جانا وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو، اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنی جانوں میں خیانت کرتے تھے تو اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا، اور تمہیں معاف کر دیا پس اب (چاہو) تو ان سے مباشرت کرو، اور طلب کرو جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھا ہوا ہے اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید دھاگا، سیاہ دھاگے سے، صبح کے وقت پھر روزہ پورا کرو، رات آنے تک اور ان سے مباشرت نہ کرو، جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ متقی ہو جائیں اور ناحق ایک دوسرے کے مال آپس میں نہ کھاؤ اور نہ (بطور رشوت) وہ مال حاکموں تک پہنچاؤ کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ (ناجائز طور پر) جان بوجھ کر تم کھا لو۔

ان آیات میں روزے کی فرضیت ان کی مدت، رمضان کی فضیلت، ابتداء فرض شدہ روزے میں تبدیلی کے بعد اس

کی تکمیل کا بیان ہے۔ نیز اللہ نے اپنا ایک اصول بیان فرمایا کہ وہ رحیم وکریم اپنے بندوں پر آسانی فرماتا ہے انہیں دشواری میں مبتلا نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر تمہیں کوئی عبادت یا شریعت کا کوئی حکم مشکل معلوم ہوتا ہے تو اس کو اپنی کمزوری سمجھو کہ اللہ اپنے بندوں کو ان کی استطاعت، قوت سے زیادہ کسی کام کا حکم نہیں دیتا۔ پھر متلاشیانِ حق کو مژدہ سنایا کہ جس رب کی تم عبادت کرتے ہو اس کے حضور گڑگڑاتے ہوا سے اپنے سے دور نہ جانو وہ تمہارے قریب ہے جو بھی اسے پکارتا ہے وہ اس کی سنتا ہے۔ دعاؤں کو قبول کرتا ہے بس شرط اتنی ہے کہ بندہ اس کا مطیع وفرمانبردار اور اس پر پورا پورا ایمان رکھتا ہو۔ آخری آیت میں مال ناحق کھانے اور اسے حکام کو بطور رشوت دینے کی ممانعت کی جارہی ہے۔ آیئے، ان مضامین کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

اے ایمان والو! فرض کیے گئے تم پر روزے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متقی بن جاؤ۔

صیام

صوم، رُکنا، شریعت میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک اللہ کی عبادت کی نیت سے کھانے پینے اور عمل زوجیت سے رُکنا صوم ہے۔ جس کی جمع صیام ہے۔ یعنی روزے، روزہ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فرضیت کا اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر فرمایا:

پہلی یہ کہ یہ عبادت صرف تم پر ہی فرض نہیں کی جارہی بلکہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض ہو چکی ہے۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر ہر قمری مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزے فرض تھے۔ بنی اسرائیل کو عاشورے کا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ روزے حضور علیہ السلام نے بطور نفل ہمارے لئے بھی باقی رکھے۔ اور ان کو بے حد ثواب کا ذریعہ قرار دیا۔ ہر قمری مہینے کی تیرہ چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزوں ہی کو ایام بیض کے روزے کہا جاتا ہے۔ جن کو اہل تقویٰ بڑی پابندی سے رکھتے ہیں۔ عاشورے کا روزہ بھی بہت باعث ثواب ہے بس اس میں اتنی تبدیلی کی گئی کہ صرف ایک روزہ رکھنے کی بجائے دو یعنی نو اور دس محرم کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ تاکہ یہودیوں سے مشابہت نہ ہونے پائے۔ کہ مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم کے مذہبی شعار واعمال کا اختیار کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے علماء ٹائی استعمال کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں کہ یہ لباس کا حصہ نہیں بلکہ عیسائیوں کا مذہبی شعار، صلیب کا نشان ہے جس سے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سولی دیئے جانے کے عقیدے کا اظہار کرتے ہیں۔ پس بہتر تو یہ ہے کہ مسلمان ٹائی بالکل استعمال نہ کریں۔ ملازمت وغیرہ کے اوقات میں بصورت مجبوری استعمال میں کوئی حرج نہیں لیکن نماز میں یا اپنی ہی تقریبات میں صرف بطور فیشن اس کو استعمال کرنا بلاوجہ گناہگار ہونا ہے۔ عیسائیوں پر اور یہودیوں پر رمضان ہی کے روزے فرض تھے۔ لیکن ان قوموں کے دین کی کوئی بات اصل کے مطابق نہ رہی روزے میں بھی انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق جو چاہی تبدیلی کر ڈالی۔ پچھلی امتوں پر روزوں کی فرضیت سے متعلق یہ روایات معتبر ہوں یا نہ ہوں لیکن اتنی بات تو یقینی ہے کہ ہر دور کے لوگوں پر روزے فرض کئے گئے کیونکہ یہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ روزہ ہی نہیں بلکہ دیگر عبادات بھی پچھلی امتوں پر فرض ہوئیں۔ کیونکہ

سب کا دین اسلام ہی رہا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اسی دین کو اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے ہاں شریعتوں میں یعنی احکامِ اسلام پر عمل کے طریقوں میں فرق ہوتا رہا لیکن بنیادی احکام مثلاً نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا حکم سب کو دیا گیا۔ انبیاءِ کرام اور ان کے ماننے والے ان احکام کی تعمیل کرتے رہے، اہلِ ایمان کو روزے کا حکم دینے کے ساتھ اس بات کا تذکرہ خصوصی طور پر اس لئے کیا گیا کہ روزہ واقعی ایک مشکل عبادت ہے اور انسان کی فطرت ہے کہ دوسروں کی مشکل دیکھ کر اسے اپنی مشکل آسان معلوم ہوتی ہے۔ نیز جو کام دوسرے کرتے ہیں اس کام کو انسان دوسروں پر فضیلت حاصل کرنے کے لئے بہتر سے بہتر کرنا چاہتا ہے۔ پس اللہ نے جو اپنے بندوں کی فطرت و عادت کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے، ایک جملہ ارشاد فرما کر ہمارے لئے اس عبادت کو آسان بنا دیا۔ اب ہم خراب موسم میں روزے کی سخت تکلیف کو یہ خیال کر کے بآسانی برداشت کر لیتے ہیں کہ جب ہم سے پہلوں نے یہ عبادت کر لی تو ہم ان سے کم یا کمزور نہیں جو اللہ کے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکیں۔ نیز پچھلوں نے اللہ کا حکم مان کر اللہ کا قُرب حاصل کیا تو ہم اسے چھوڑ کر اللہ کے فضل و کرم سے کیوں کر محروم رہیں۔ اللہ بھی بندوں پر کرم فرماتا ہے کہ جب اہلِ ایمان روزہ رکھنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو وہ ان کی مدد کرتا ہے کہ موسم چاہے اچھا ہو یا خراب، دن بڑے ہوں یا چھوٹے مسلمان بآسانی پورے مہینے کے روزے رکھتے ہیں۔ بعض ممالک میں موسم گرما میں پیاس کی شدت کے باوجود انہیں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ یورپ وغیرہ میں اگرچہ موسم اچھا ہی رہتا ہے لیکن موسم گرما کے دن اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ اکیس گھنٹے سے بھی زیادہ کا روزہ ہو جاتا ہے، پھر بھی اللہ کے بندے اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ دس سال کی عمر تک کے بچے روزہ رکھتے ہیں۔ غیر مسلم اس پر حیرت کرتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح بھوکے، پیاسے رہ لیتے ہیں۔ لیکن انہیں کیا پتہ کہ ایمان کی قوت اللہ اور اس کے رسول کی محبت تو گردن کٹانا، جان دے دینا تک آسان کر دیتی ہے کہ اللہ اہلِ ایمان کا حامی و ناصر بن جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ روزے تم پر اس لئے فرض کیے گئے ہیں ''تاکہ تم متقی بن جاؤ'' کہ شریعت کے جملہ احکام کا مقصد مومنین کو متقی بنانا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم بار بار تقویٰ اختیار کرنے اور متقی بننے کا حکم دیتا ہے۔ تقویٰ سے متعلق ضروری گفتگو انشاء المولیٰ آپ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہاں ہم صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ ایمان کے بعد ہر مؤمن رضائے الٰہی کا متلاشی اور اس کے قرب کا متمنی ہو جاتا ہے۔ تقویٰ اسی راہ کا نام ہے جس پر مؤمن چل کر اپنی آرزو کی تکمیل کرتا ہے۔ یعنی رب کریم کی رضا بھی حاصل کر لیتا ہے اور قُرب بھی۔ ہر انسان اقرار توحید اور اعتراف نبوت کے بعد اس راہ کا مسافر بن جاتا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، دیگر اعمال صالحہ اس راہ کی مشعلیں ہیں جن کے نور میں مؤمن آگے بڑھتا رہتا اور کامیابی کی منزل سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بالخصوص روزہ تقویٰ کی تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ ہے کہ روزے دار صرف اللہ کے حکم کی تعمیل میں حلال چیزوں کا حرام ہو جانا بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ بھوکا رہتا ہے، پیاسا رہتا ہے جب کہ کھانے پینے کی ہر چیز پر اسے پوری طرح قدرت حاصل ہوتی ہے۔ بیوی پر شہوت کی نظر تک نہیں ڈالتا اس سے زیادہ اللہ کی رضا جوئی کا اظہار اور کس عمل سے ہو سکتا ہے۔ روزہ تکلیف دہ ترین حال میں بھی حکم الٰہی کی تعمیل کا عملی ثبوت ہے۔ روزہ اطاعت و فرمانبرداری اور اظہارِ عبدیت کا بہترین نمونہ ہے۔ روزہ اللہ اور اس کے رسول کی ممنوعہ چیزوں سے بچنے کا عادی بناتا ہے۔ روزہ دوسروں کی تکالیف کا احساس

پیدا کرتا ہے۔ روزہ ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ روزہ خواہشات نفس کے خلاف جہاد کی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہی سب خوبیاں راہ تقویٰ کے مسافر کو منزل سے قریب کرتی ہیں۔ اسی لیے میرے آقا علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ لَمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَ الْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَ شَرَابَهٗ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص روزے میں جھوٹ بولنا اور برے کام کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے۔

(بخاری شریف)

کھانا پینا چھڑانا مقصودِ روزہ نہیں۔ مقصدِ روزہ تو تقویٰ ہے جو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب روزے دار، ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے احکام شرع کی پابندی کرے۔ ایسا شخص روزے کا مقصد حاصل کرتا ہے۔ میرے آقا علیہ السلام فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ یُضٰعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ یَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَ طَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِیْ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَ فَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ وَ لَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْیَبُ عِنْدَاللّٰهِ مِنْ رِیْحِ الْمِسْكِ وَالصِّیَامُ جُنَّةٌ فَاِذَا كَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ امْرُءٌ صَائِمٌ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر نیک عمل دس گنا سے سات سو گنا کر دیا جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا مگر روزہ، کیونکہ یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی (بلاحساب) جزا دوں گا۔ کیونکہ روزے دار اپنی خواہشات اور کھانے کو صرف میرے لئے ترک کرتا ہے اور روزے دار کے لئے دو مسرتیں ہیں ایک خوشی اسے افطار کے وقت ہوتی ہے اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت ہوگی اور روزے دار کے منہ کی بو اللہ کو مشک سے زیادہ پسند ہے اور روزہ ڈھال ہے جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو نہ فحش بات کہے اور نہ شور کرے۔ اگر کوئی اس کو گالی دے تو اسے چاہیے کہ گالی دینے والے سے کہہ دے کہ میں روزے دار ہوں۔ (بخاری و مسلم)

روزے دار کی کیفیت اگر یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس پر پوری طرح قابو پالیا تو واقعی وہ اس تقویٰ کو قبول کر رہا ہے جو فرضیت روزہ کا مقصد ہے اور متقی مؤمن ہی مسلم معاشرے کا بہترین فرد بنتا ہے۔ ایسے افراد سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے وہ نہایت ہی صاف ستھرا اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ اس میں امن وامان، سکون اور چین کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے افراد باعزت ہوتے ہیں، باوقار اور بارعب ہوتے ہیں۔

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَی

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

گنتی کے مقررہ تھوڑے دنوں میں پس جو تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو تو (اس پر) دوسرے دنوں سے گنتی (پوری کرنا) لازم ہے۔ اور ان لوگوں پر جو روزہ رکھ سکتے ہوں فدیہ ہے، کھانا ایک مسکین کا پھر جو خوشی سے زیادہ نیکی کرے تو وہ بہتر ہے اس کے لیے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو۔

فرضیت صوم

روزہ نبوت کے پندرھویں سال دس شوال ۲ ہجری میں فرض ہوا۔ اس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ جو لوگ روزہ رکھنا نہ چاہیں وہ فدیہ ادا کر دیں۔ ہاں اگر رکھ لیں تو بہتر ہے۔ یہ تو ایک آسانی تھی لیکن دشواری یہ تھی کہ کھانا، پینا، عملِ زوجیت غروبِ آفتاب کے بعد صرف اس وقت تک جائز تھا جب تک کوئی سوئے نہیں۔ سوتے ہی روزہ شروع ہو جاتا اور یہ چیزیں حرام ہو جاتی تھیں۔ پھر اگلی آیات نازل ہوئیں جن کے ذریعے مدت روزہ کا تعین کر دیا گیا اور فدیہ دے کر بلا کسی مجبوری کے روزہ نہ رکھنے کا اختیار ختم کر دیا گیا۔ فرمادیا گیا '' رمضان کے مہینے کے روزے رکھنے ہیں اور جو بھی رمضان کا مہینہ پائے وہ اس حکم کی تعمیل کرے۔ ہاں مریض و مسافر کے لیے حسبِ سابق رخصت ہے کہ وہ اگر مرض میں شدت کی وجہ سے یا سفر میں دشواری کی وجہ سے روزہ نہ رکھیں تو قضا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اللہ جو اپنے بندوں پر بڑا ہی رحیم و کریم ہے، بندوں کے لیے آسانی چاہتا ہے انہیں کسی تکلیف و دشواری میں مبتلا کرنا پسند نہیں فرماتا۔ اس ارشاد کے بعد بھی روزے کا آغاز سوتے ہی ہو جایا کرتا تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس دشواری کو بھی ختم کر دیا گیا۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث ہے کہ نماز میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں اور روزہ میں بھی تین تبدیلیاں کی گئیں۔ پہلی حضور علیہ السلام جب مدینہ تشریف لائے تو ہر ماہ تین روزے اور ایک عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد یہ روزے نفلی ہو گئے۔ دوسری رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد ہر شخص کو اختیار تھ کہ روزہ رکھے یا فدیہ دے دے۔ لیکن روزہ رکھنا افضل تھا۔ پھر یہ حکم نازل ہوا کہ جو بھی رمضان کا مہینہ پائے روزہ رکھے اس کے بعد صرف بوڑھے آدمی کے لیے یہ اجازت باقی رہی کہ اگر وہ روزہ نہیں رکھ سکتا تو فدیہ ادا کرے۔ تیسری ان احکام کے بعد بھی روزے میں یہ سختی باقی تھی کہ اس کی ابتداء سوتے ہی ہو جاتی تھی۔ جونہی کوئی سویا دوسرا روزہ شروع ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دشواری کو بھی ختم فرمادیا۔ ان تبدیلیوں کے بعد روزہ مکمل ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے دین کے دیگر احکام کی طرح مکمل ہو گیا۔

یہاں فدیہ کی وضاحت کر دینا بھی مناسب ہو گی۔ فدیہ وہ بدلہ ہے جو کسی عبادت کے نہایت ہی مجبوری کے باعث چھوٹ جانے پر ادا کرنا شرعاً لازمی ہے۔ روزے کا فدیہ ایک غریب کو دو وقت پیٹ بھر کھانا کھلا دینا یا اس کی قیمت دے دی ہے۔ اس طرح کہ غریب کو اس کا مالک بنا دیا جائے اور اس کے عوض اس سے کوئی خدمت نہ لی جائے۔ ایسا مریض روزے کا فدیہ دے سکتا ہے جسے بظاہر صحت مند ہونے کی امید نہ ہو۔ لیکن اگر وہ صحت مند ہو گیا تو اسے چھوٹے ہوئے روزے قضا کر نے ہوں گے۔ ایسا بوڑھا فدیہ دے سکتا ہے جس میں روزہ رکھنے کی بالکل طاقت نہ ہو۔ ایک روزے کا فدیہ دو غریبوں یا چند غر

میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص فدیہ ادا کئے بغیر مر گیا تو اس کے مال سے پہلے فدیہ ادا کیا جائے پھر وُرثاء میں تقسیم ہو گا اور اگر کسی نے کچھ نہ چھوڑا تو اعزاء کو چاہیۓ کہ استحساناً اس کا فدیہ ادا کر دیں تا کہ وہ عذاب سے محفوظ رہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، لوگوں کو ہدایت کرنے والا اور روشن دلیلیں رہنمائی کرنے والا اور حق و باطل میں فیصلہ کرنے والا تو تم میں سے جو اس مہینے میں موجود ہو وہ ضرور اس کے روزے رکھے اور جو بیمار یا مسافر ہو تو (اس پر) دوسرے دنوں سے گنتی (پوری کرنا لازم) ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اللہ تم پر آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تنگی کا ارادہ نہیں فرماتا۔ اور تا کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور تا کہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔

رمضان

روزوں کے لیے رمضان کا مہینہ منتخب فرمایا گیا کہ یہ مہینہ ہمیشہ سے بابرکت اور پُرعظمت چلا آ رہا ہے کہ ابراہیمی صحیفے اس ماہ کی پہلی رات میں نازل ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت اسی ماہ کی چھ تاریخ کو دی گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل اس ماہ کی تیرہ تاریخ کو ملی اور امت مسلمہ کے لئے اس ماہ کی عظمت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو اپنی آخری کتاب عطا فرمائی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال رمضان میں نبی مکرم علیہ السلام کو پورا قرآن کریم سناتے تھے اور پھر پورے سال ضرورت کے مطابق اس کی آیات نازل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ سلسلہ پچیس سال تک جاری رہا ہے۔ امت مسلمہ کے لئے اللہ کی یہ آخری کتاب ایک عظیم نعمت ہے۔ زندگی کا مکمل ضابطہ حیات ہے۔ عبادات و معاملات، اللہ اور اللہ کے بندوں سے تعلقات کا معلم ہے۔ اصول انسانیت، تہذیب و تمدن کا مدرس ہے۔ انبیاء و رسول اور امم ماضیہ کے حالات کا مخبر ہے۔ کتب سابقہ کا مصدِق ہے۔ انبیا، و رسول بالخصوص سید الانبیاء والمرسلین کی ناموس اور ان کے مراتب اعلیٰ کا محافظ ہے۔ اللہ و رسول، ملائکہ، کتب سماویہ، بعث بعد الموت اور یوم آخرت پر ایمان کا مبلغ ہے۔ اس کی تلاوت قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اس میں تفکر و تدبر عقل کو جلا بخشتا ہے اس کا ورد قلب کو پاکیزہ کرتا ہے۔ اس پر عمل دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کی ضمانت دیتا ہے۔ اس سے بیماروں کو شفا حاصل ہوتی ہے۔ کمزوروں کو طاقت میسر آتی ہے، ذلیل و خوار عزت و عظمت پاتے ہیں۔ بے وقار باوقار ہو جاتے ہیں۔ مغلوبین غلبہ پاتے ہیں۔ مرعوبین بارعب ہو جاتے ہیں۔ محکومین حاکم بن جاتے ہیں۔ محتاج حاجت روا ہو جاتے ہیں۔ کفر و شرک کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے والوں، ضلالت و گمراہی کی تاریکی میں بھٹکنے والوں کے لیے یہ منارۂ نور ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے پیغامِ ہدایت ہے۔ اہلِ ایمان کے لئے ہدایت کی بشارت ہے۔ باغیوں کے لیے نذیر ہے۔ مؤمنین و مطیعین کے لئے بشیر ہے۔ یہ اللہ کی آیات کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس کی قدرت

کے نشانات کو واضح کرتا ہے۔ انسان کے کردار کی تعمیر کرتا ہے، معاشرے کی اصلاح کرتا ہے، معاش کے طریقے سکھاتا ہے۔ اصول حکومت و سیاست اور تجارت کی تعلیم دیتا ہے۔ عدل و انصاف اور مساوات کا علمبردار ہے۔ مرد و عورت کے فرائض مقرر کرتا ہے۔ اس نے ہر ایک کے حقوق متعین کئے، باہمی تعلقات کی حدود کا تعین کیا۔ بلاشبہ اس کتاب کا ایک ایک حرف اللہ کا کلام ہے۔ اس کے الفاظ و معانی اور احکام کی افادیت و صداقت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ جیسا لوحِ محفوظ میں ہے ویسا ہی صاحبِ قرآن ﷺ پر نازل ہوا۔ اور جیسا نازل ہوا ویسا ہی ہمارے پاس ہے اور ہمیشہ اپنی اصل حالت میں موجود رہے گا۔ اس میں تغیر و تبدل اور تحریف کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس کا نازل فرمانے والا رب قدیر خود ہی اس کا محافظ ہے۔ جس گھر میں تلاوت قرآن نہ ہو وہ قبرستان کی مانند ہے۔ جس دل میں قرآن نہ ہو وہ ویران ہے۔ قرآن پر عمل ہی مؤمن کے لئے ذریعہ عروج و ترقی ہے کہ صاحبِ قرآن ﷺ فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ مَقَابِرَ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْفِرُ مِنَ الْبَیْتِ الَّذِیْ یُقْرَاُ فِیْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اپنے گھروں کو مقابر کی طرح نہ بناؤ بیشک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ البقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ (مسلم شریف)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِهٖ شَیْءٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ كَالْبَیْتِ الْخَرِبِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا جس کے دل میں کچھ بھی قرآن نہیں بیشک وہ دل ویران گھر کی مانند ہے۔ (ترمذی شریف)

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ یَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّ یَضَعُ بِهٖ اٰخَرِیْنَ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، بیشک اس کتاب کے ذریعہ اللہ بعض قوموں کو عروج عطا فرماتا ہے اور بعض پر زوال آجاتا ہے۔ (مسلم شریف)

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَیْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَ عَلَّمَهٗ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جس نے قرآن پڑھا اور دوسروں کو پڑھایا۔ (بخاری شریف)

پس ایسی عظیم کتاب جس ماہ میں نازل ہوئی وہ اسی لائق ہے کہ اس کتاب پر ایمان رکھنے والے اس سے مستفید ہونے والے بطور شکر اس ماہ کی راتوں اور دنوں کو عبادت الٰہی میں گزاریں۔ یہ مہینہ اسی لائق ہے کہ اس کی ہر ساعت عظمت و برکت سے پُر ہو اور اس میں اللہ کی طرف سے بندوں کو بطور انعام ہر نفلی عبادت کا ثواب فرض کے برابر اور فرائض کا ثواب ستر گنا زیادہ عطا فرمایا جائے۔ جو اس مبارک مہینہ کی راتوں میں خصوصی عبادت کریں، تراویح پڑھیں، قرآن کریم سنیں۔ ان

کے گناہوں کو بخش دیا جائے۔ روزہ داروں کے رزق میں اضافہ کر دیا جائے۔ عظمتِ قرآن کا مقتضی ہے کہ اس مہینہ کا عشرۂ اول مؤمنین پر نزولِ رحمت کا عشرہ ہو، دوسرے عشرے میں گناہگاروں کے نامہ اعمال سے گناہ مٹا دیئے جائیں اور تیسرے عشرے میں مستحقین عذاب کو جہنم کی آگ سے آزاد کر دیا جائے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث کا آخری حصہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ و اَوسطُهٗ مغفِرةٌ و اٰخِرُهٗ عِتقٌ مِّنَ النَّارِ و مَنْ خفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَ اَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ

(رمضان ایسا مہینہ ہے) جس کا ابتدائی حصہ نزول رحمت کا ہے اور درمیانی حصہ مغفرت کا اور آخری حصہ نارِ دوزخ سے آزادی کا ہے اور جس نے اس ماہ میں اپنے خادم کے کام میں کمی کر دی اللہ اس کی بخشش فرمائے گا اور اسے آگ سے آزادی بخشے گا۔　(بخاری شریف)

نزولِ قرآن کی شب، شبِ قدر میں عبادت کا ثواب ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ قرار دیا گیا۔ جس پر قرآن گواہ ہے۔ پس یہ عظمتوں اور برکتوں والا مہینہ، جشنِ قرآن کا مہینہ ہے۔ قرآن سے راہ ہدایت پانے والے مؤمن کو، اس کی برکتوں سے مالا مال ہونے والے مؤمن کو، اللہ کے اس عظیم عطیہ پر اس کا خوب شکر ادا کرنا اور اس پر عمل کر کے اپنے ایمان کے کمال کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے۔ یہی مہینہ نہایت موزوں قرار پایا۔ اُس عبادت کے لیے جو نسبتاً دشوار ہے لیکن اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے کہ دیگر عبادات میں تو ریا و نمود کا امکان ہے مگر روزے میں اس کا شائبہ بھی نہیں۔ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ کون روزے دار ہے اور کون نہیں۔ روزے دار کے ظاہر حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جس سے دوسروں کو پتہ چل سکے، اسی لیے ارشاد ہوا۔

اَلصَّوْمُ لِىْ وَ اَنَا اَجْزِىْ بِهٖ

روزہ (خاص) میرے لئے ہے اور میں ہی (بلا حساب) اس کی جزا دوں گا۔

پوری حدیث آپ گزشتہ صفحات پر پڑھ چکے ہیں۔ اس جملے کا منشاء یہ ہے کہ وہی عبادت مقبول ہے جس میں ریا اور دکھاوا نہ ہو۔ تمام عبادتیں اپنا ایک ظاہری حال رکھتی ہیں۔ نماز پڑھنے والوں کو آپ نمازی کہہ سکتے، حج کرنے والے کو حاجی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن روزے کا کوئی ظاہری حال نہیں۔

پس یہ پوشیدہ ترین عبادت صرف اللہ ہی کے لیے ہوگی پس یہ بندے کی طرف سے اللہ کو معبود حقیقی تسلیم کرنے کا نہایت ہی اعلیٰ عمل ہے۔ اسی لیے روزے کی کوئی مقرر جزا نہیں۔ یہ رب کے کرم پر موقوف ہے جتنا چاہے ثواب عطا فرما دے۔ یہ ایسی عبادت ہے جس کو کوئی نہیں جان پاتا تو اس کا ثواب بھی کسی کو نہیں بتایا گیا۔ دینے والا رب جانتا ہے اور لینے والا بندہ جانے گا۔ نیز دیگر عبادتوں کا ثواب حقداروں کو ان کے حقوق کے بدلے دیا جا سکتا ہے اور عبادت کرنے والا خالی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن روزے کا ثواب کسی کو نہیں دیا جائے گا۔ کوئی حقدار مانگے گا بھی تو یہی جواب ملے گا کہ "بندے نے روزہ صرف میرے لیے رکھا تھا، اس کا ثواب آج صرف اسی کی نجات کا ذریعہ ہوگا۔ اللہ کو یہ عبادت اتنی پسند ہے کہ "روزے دار کے منہ کی بو بھی اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہوتی ہے" اور "روزے دار کی فرحت و خوشی کے لیے دو وقت

مخصوص ہیں، ایک افطار کا اور دوسرا رب سے" لقاء" ملنے کا اور روزے دار افطار کے وقت جو دعا کرتا ہے، اللہ اس کو قبول فرماتا ہے"۔ یہ روزہ مومن کو مجاہد بناتا ہے، صابر و شاکر بناتا ہے، زاہد و متقی بناتا ہے۔ اس سے غریبوں اور محتاجوں کی مدد کا جذبہ پیدا ہوتا، باہمی ہمدردی اور محبت کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ عبادات میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ اطاعت میں ذوق پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر نور برستا ہے۔ جسمانی صحت اچھی ہوتی ہے، روحانی قوت بڑھتی ہے، نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، قلب کی تطہیر ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ اللہ کی خشیت پیدا ہوتی، رسول سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ خدمت دین کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ ایسی عظیم عبادت کے لیے نزول قرآن کا مہینہ کیسا موزوں و مناسب رہا کہ مومن اس ماہ میں روزہ رکھ کر بآسانی قرآن سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ پس مومن کس قدر خوش نصیب ہے، کہ اللہ نے اس پر روزے فرض کئے، ان کے رکھنے کے لیے رمضان کا مقدس مہینہ منتخب فرمایا کہ عبادت کی ادائیگی، حکم کی تعمیل کا بھی اجر ملے اور رمضان کی برکتوں اور رحمتوں سے بھی جھولیاں بھریں، جنہوں نے اس حقیقت کو سمجھا وہ ایک رمضان ختم ہوتے ہی مستقبل کے رمضان کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ان پر روزے شاق نہیں ہوتے بلکہ جب رمضان جاتا ہے، تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کوئی مہمان چلا گیا۔ جو ان کا مونس تھا غمگسار تھا۔ جس نے انہیں رزق کی وسعت بخشی، رحمتوں، برکتوں سے مالا مال کیا۔ سکون قلب بخشا۔ اب وہ گیارہ ماہ بعد اس کے آنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۸۶)

اور (اے حبیب علیہ السلام جب آپ سے سوال کریں میرے بندے، میرے بارے میں تو (آپ فرما دیں) بیشک میں (ان کے) قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے دعا کرے تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ کامیابی حاصل کریں۔

اللہ قریب ہے

وہ اللہ جس نے قرآن نازل فرمایا جس نے روزے فرض کیے تم اس کے متعلق جاننا چاہتے ہو، وہ کہاں ہے تو بس اتنا جان لو کہ وہ تم سے قریب ہے۔ بس تمہارا یہ یقین ہی کافی ہے کہ جس اللہ کی تم عبادت کرتے ہو جسے تم پکارتے ہو جس سے تم دعائیں مانگتے ہو جس کی رضا کے لیے تم روزہ جیسی سخت عبادت کرتے ہو، وہ تم سے قریب ہے۔ تمہارے حال کو دیکھتا ہے، تمہاری پکار کو سنتا ہے، تمہاری دعائیں درخواستیں اس تک پہنچتی ہیں۔ تم آہستہ پکارو یا زور سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ تمہارے دلوں کے خیالات تک جان لیتا ہے۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (الملک:۱۳)

تم آہستہ بولو یا زور سے بیشک وہ دلوں کی باتیں بھی خوب جانتا ہے۔

تمہارے دلوں کے ان خیالات تک کو وہ جان لیتا ہے جن کا خود تمہیں احساس نہیں ہو پاتا۔ تم سے کوئی چیز اتنی قریب نہیں، جتنا تمہیں پیدا کرنے والا رب تم سے قریب ہے۔ وہ تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (ق:١٦)

اور بیشک ہم نے انسان کو پیدا کیا، اور ہم ان وسوسوں تک کو جانتے ہیں جو اس کے نفس میں پیدا ہوتے ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

جب تمہارا کوئی عزیز ترین شخص سکرات موت سے تڑپ رہا ہو تو تم لاچار و مجبور اس کو دیکھتے رہتے ہو، نہ موت سے نجات دلا پاتے ہو، نہ کسی طرح مدد کر کے، اس کو تکلیف سے بچا، پاتے ہو، اس وقت بھی ہم ہی قریب ہوتے ہیں لیکن تم ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔

فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الواقعہ:۸۳۔۸۵)

تو کیوں نہیں (موت کو ٹال دیتے) جب روح حلق تک آ پہنچتی ہے اور تم اس وقت دیکھتے رہتے ہو۔
اور ہم اس کے تم سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم نہیں دیکھتے۔

بلاشبہ اللہ قریب ہے، شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ مگر اس کا قرب جسمانی اور مکانی نہیں کہ وہ جسم و مکان سے پاک ہے۔ تمہاری نظر میں نہیں سما سکتا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (الانعام:١٠٣)

اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور وہی ہر چیز کی باریکیوں اور مشکلات کو جاننے والا ہے۔

جس شخص کو مالک کے قرب کا یقین ہو جاتا ہے وہ اپنے مالک کی اطاعت و فرمانبرداری میں کبھی تساہل نہیں کرتا۔ جو ذمہ داریاں اسے مالک نے سونپی ہیں، انہیں پورا کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ اسے خوف رہتا ہے کہ اگر کام میں کوئی سستی ہوئی تو مالک کے انعام و اکرام سے وہ محروم کر دیا جائے گا حتیٰ کہ اگر کوئی جرم سرزد ہو گیا تو سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ اسی لیے مالک حقیقی اپنے بندوں کو اپنے قرب کا یقین دلا رہا ہے اور حکم دیتا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ:٨)

اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سب کاموں کی خبر رکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔

اس خیال سے اللہ کی نافرمانی کرنا بڑی ہی حماقت ہے کہ تمہارا کوئی عمل اللہ سے چھپ سکتا ہے کہ وہ ایسی قدرت والا مالک ہے جو تمہارے ظاہر و باطن کو خوب جانتا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (ھود:۵)

اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں بیشک وہ سینوں کی باتیں تک جانتا ہے۔

اللہ کے قرب کا احساس ہی ذریعہ تقویٰ ہے، یہ احساس جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی تقویٰ بڑھتا ہے، جس کا اثر بندے کے عمل و کردار سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس طرح کہ اسے برائیوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ نیکیوں کی رغبت پیدا ہوتی ہے حتی

کہ برے کام اس کے لیئے دشوار اور اچھے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی عبادت میں اسے لذت آنے لگتی ہے۔ یہی حلاوتِ ایمان ہے جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے۔ ایسے شخص کے لیے ساری ساری رات اللہ کے دربار میں کھڑے رہنا آرام کی نیند سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے، اسے روزے رکھنے میں، کھانے، پینے سے زیادہ مزا آتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے سجدے اس کے لئے راحت وسکون کا باعث ہوتے ہیں۔ اللہ کے دربار میں رونے سے اسے سرور ملتا ہے۔ بندے کے یہ اعمال اسے اللہ سے قریب کرنے لگتے ہیں۔ بالخصوص سجدہ جو بندے کی اداؤں میں مالک کے نزدیک محبوب ترین ادا ہے، جسے خود مالک نے اپنے قرب کا ذریعہ قرار دیا۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ (العلق:۱۹)

سجدہ کرو، اور قریب ہوتے رہو

اسی محبوب ادا کے انکار کے سبب شیطان لئیم ورجیم قرار پایا کہ جو سجدے سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اللہ اس سے اپنے عذاب و عتاب اور قہر و جبر کی صفات کے ساتھ قریب ہوتا ہے اور جو قرب الٰہی کے حصول کے لئے سجدے کرتے رہتے، زندگی کے ہر لمحہ میں مالک کی اطاعت وفرمانبرداری کا لحاظ رکھتے ہیں، ان سے اللہ اپنی صفات رحم وکرم کے ساتھ قریب ہوتا ہے۔ کہ ایسے ہی لوگوں کو بے انتہا انعامات سے نوازتا ہے۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (الاعراف:۵۶)

بیشک اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔

قرب کا نتیجہ

محسنین کو اللہ کا قُرب نصیب ہوتا ہے جسکے نتیجے میں وہ دنیا وآخرت کے خوف، غم سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ عزت و شہرت پاتے ہیں، دنیا ان کی مطیع ہو جاتی ہے۔ ان کی نظر عنایت لوگوں کے مقدر بدل دیتی ہے، ان کی محبت اللہ اور اس کے رسول سے محبت کی دلیل ہوتی ہے۔ ان کا احترام، ان سے وابستگی ذریعہ نجات ہے۔ ان کے دامن سے وابستہ ہو جانا، ضلالت وگمراہی سے نجات کی ضمانت ہے۔ یہی لوگ قرآنی اصطلاح میں اولیاء اللہ ہیں۔ انہی کا دشمن اللہ کا دشمن قرار دیا گیا ہے۔ ان کو اللہ کا جو قرب نصیب ہوتا ہے، وہ ان کے اعمال وافعال سے عیاں ہوتا ہے۔ جیسا کہ میرے آقا ﷺ نے بیان فرمایا۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰلِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَحْبَبْتُهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ فَکُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَ بَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَ یَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَ اِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ وَ مَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَ اَنَا اَکْرَهُ مَسَاءَ تَهٗ وَلَا بُدَّلَهٗ مِنْهُ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے

میرے دوست سے دشمنی کی۔ میں اس سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں اور میرا بندہ (صرف) میری فرض کی ہوئی محبوب چیزوں ہی (کی پابندی) سے، میرا قرب حاصل نہیں کرتا (بلکہ) وہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ تو اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو دیتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں اور میں جس کام کو کرنے والا ہوتا ہوں اس کے کرنے میں مجھے تردد نہیں ہوتا (صرف) مجھے تردد، نفس مؤمن کے متعلق ہوتا ہے کہ وہ موت کو مکروہ جانتا ہے اور میں اس کے برا سمجھنے کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ اور وہ اس کے لیے ضروری ہے (یعنی اسے موت سے چھٹکارا نہیں) (بخاری شریف)

دنیا کے بادشاہوں، حکام حتی کہ معمولی دولت مندوں کے چاپلوسیوں اور خوشامدیوں کو اپنے مجازی آقاؤں سے کچھ اختیار مل جاتے ہیں، کچھ وسائل مل جاتے ہیں۔ تو کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس خصوصی قوت و طاقت سے، جو مالک حقیقی، بادشاہِ حقیقی، احکم الحاکمین اپنے مقربین کو عطا فرما دیتا ہے جس کے سبب وہ عام انسانوں سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اب ان کے سننے، دیکھنے، پکڑنے، چلنے کی قوتیں، ہما، شما جیسی نہیں رہتیں۔ ان قوتوں کا عطا فرمانے والا اللہ ہی ہے۔ وہ کسی کو زیادہ کسی کو کم عطا فرماتا ہے۔ اور کسی کو بالکل ہی محروم کر دیتا ہے۔ بہرا، اندھا اور معذور بنا دیتا ہے۔ پس وہ قادر مطلق اپنے مقربین کو یہ قوتیں اتنی وافر عطا فرماتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے ہر طرح ممتاز ہو جاتے ہیں۔ نیز ان مقربین پر اللہ کا ایک کرم اور ہوتا ہے جو میرے آقا ﷺ بیان فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ قَالَ فَیُحِبُّهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَیُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَ اِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ اَبْغَضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَیُبْغِضُهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللّٰهَ یُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَیُبْغِضُوْنَهٗ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَاءُ فِی الْاَرْضِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں۔ اے جبرئیل تم بھی اس سے محبت کرو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، پس جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں، کہ بیشک اللہ فلاں سے محبت فرماتا ہے، تو تم بھی اس سے محبت کرو۔ پس آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ اہل زمین میں مقبول ہو جاتا ہے اور جب اللہ

کسی بندے کو ناپسند فرماتا ہے تو جبرئیل کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص کو ناپسند کرتا ہوں۔ تو تم بھی اس کو ناپسند کرو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تو جبرئیل اسے ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ پھر آسمان میں اعلان فرما دیتے ہیں کہ بیشک اللہ فلاں شخص کو ناپسند فرماتا ہے، تم بھی اس کو ناپسند کرو، تو آسمان والے بھی اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ پھر زمین والوں میں بھی اس کی نفرت پیدا کر دی جاتی ہے۔

(مسلم شریف)

قربِ الٰہی ایک اعزاز ہے

قربِ الٰہی بندے کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ یہ عزت وشہرت کا ایسا ذریعہ بنتا ہے کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھچنے لگتے ہیں۔ مخلوق کے دلوں کی گہرائیوں میں ان کی عقیدت پیدا ہو جاتی ہے وہ مخلوق سے بھاگتے ہیں، اور مخلوق ان کی طرف بھاگتی ہے۔ ان کی ایک نظر کرم ڈوبتے ہوؤں کو ترا دیتی اور گرتے ہوؤں کو سہارا دے دیتی ہے۔ ان کا فیض ان کی زندگی کے ساتھ محدود نہیں ہوتا۔ نہ ان کی عزت وشہرت زندگی سے متعلق ہوتی ہے، بلکہ اس ظاہری دنیا کے چلے جانے کے بعد بھی، ان کا فیض جاری رہتا ہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو کر بھی ہماری بگڑی بناتے ہیں۔ نامرادوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ بھکاریوں کی جھولیاں بھرتے ہیں۔ عقیدت مندوں کو ان کے مزارات پر، اللہ کا نور برستا نظر آتا ہے۔ ان کے مزارات کو کوئی کتنا ہی ویران کرنا چاہے لیکن وہ آباد ہی رہتے ہیں۔ کوئی کتنے ہی شرک و بدعت کے فتوے جاری کرے، لیکن عقیدت مندوں کی جبینِ نیاز ان کی بارگاہ میں جھکتی ہی رہتی ہے۔ ان کی آرام گاہوں پر عقیدت کے پھول اور چادریں ہی نظر آتی ہیں۔ ان کی خانقاہوں پر بہار ہی بہار ہوتی ہے۔ یہاں بے چین دلوں کو قرار اور بے تاب روحوں کو سکون میسر آتا ہے۔ یہاں خالی ہاتھ آنے والے مالا مال ہو کر لوٹتے ہیں۔ مقربین کی یہ عزت وشہرت، دولت، حکومت یا علم کے باعث نہیں جو ختم ہو جائے یہ تو قربِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اللہ کی دی ہوئی عزت ہے، اسے کون ختم کر سکتا ہے۔ کون چھین سکتا ہے۔ یہ وہ بہترین مومن ہیں جن کے لیے میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں:

عَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ خِيَارُكُمُ الَّذِيْنَ اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ۔

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضور علیہ السلام کو، میں نے فرماتے سنا، کیا میں تمہیں نہ بتا دوں، کہ تم میں سے بہترین آدمی کون ہے صحابہ نے عرض کیا، کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں، کہ جب انہیں دیکھا جائے تو اللہ یاد آ جائے۔ (ابن ماجہ)

جسے قربِ الٰہی نصیب ہو جاتا ہے، اس کا نورانی چہرہ دیکھتے ہی بد سے بدتر کو بھی اللہ یاد آ جاتا ہے اور ان کا یہ اثر ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ آپ ان مقربین کے مزارات پر حاضر ہوتے ہیں، سوچئے، وہاں آپ کو کیا ماحول نظر آتا ہے یہی نا، کہ کسی کے اللہ کے دربار میں ہاتھ اٹھے ہوتے ہیں تو کوئی سجدے میں پڑا ہوتا ہے۔ کسی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، کوئی روتا ہوتا ہے، کوئی گڑگڑاتا ہوتا، کوئی تلاوت قرآن میں مصروف تو کوئی تسبیح پڑھتا نظر آتا ہے۔ غرضیکہ کسی نہ

سی طرح ہر ایک ذکر اللہ میں ہی مصروف نظر آتا ہے۔ کیونکہ صاحب مزار بندہ خود ساری زندگی اللہ ہی کو یاد کرتا رہا۔ اللہ نے اس کو اپنا شعار بنا دیا کہ جو اسے دیکھتا ہے یا جو اس کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ وہ اللہ ہی کو یاد کرتا ہے۔ یہ ''شعائر اللہ'' ہیں، کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آ جاتا ہے۔ اور ''شعائر اللہ'' کی عظمت، اللہ کی مخلوق کے دلوں سے نکالنے کی کوشش کرنے والے بڑے ہی ظالم ہیں۔ اپنی کوششوں میں وہ ہمیشہ ناکام رہے اور ناکام ہی رہیں گے۔ ''شعائر اللہ'' کی عظمت تو، علامتِ تقویٰ، ثبوتِ تقویٰ اور اعلانِ تقویٰ ہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج:۳۲)

حق یہی ہے اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم بجالایا تو بیشک یہ دلوں کے تقوے سے ہے۔

سوچئے، اہل ایمان کے دلوں سے تقویٰ کو نکالنے، اسے مٹانے کی کوششیں کرنے والے کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ انہی کے لئے تو اللہ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ جیسا کہ آپ حدیث شریف میں پڑھ چکے ہیں۔

بہر حال، قرب الٰہی، ذریعہ عزت و عظمت ہے، مقربین الٰہی امت کے لیے واجب الاحترام ہو جاتے ہیں۔ اس قُرب کی اعلیٰ ترین منزل حُبِ الٰہی ہے، کہ بندہ اللہ سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ اللہ اس سے محبت فرمانے لگتا ہے۔ اور مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے۔ اس اعلیٰ ترین منزل کے فرد اعلیٰ، فردِ اول، فرد اکمل نبی مکرم ﷺ ہیں۔ کہ آپ بلاشبہ سید المقربین، سید المحبوبین، سید الاولیاء والصالحین ہیں۔ جن کو ''اُدْنُ مِنِّیْ'' کا خطاب، اور ''وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى'' کا وعدہ الٰہی حاصل ہوا۔ انہی کی اتباع و پیروی کو ساری مخلوق کے لیے قرب الٰہی اور حُبِ الٰہی کا وسیلہ قرار دیا گیا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (آل عمران:۳۱)

(اے محبوب) آپ فرما دیجئے، اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

صالحیت، ولایت، محبوبیت کے جملہ مراتب اسی سید المحبوبین ﷺ سے وابستہ ہیں۔

لا ورب العرش جس کو جو ملا ان سے ملا بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

محبت کا ایک اہم جز، ناز اور ناز برداری ہے کہ محبت محبوب کو حق ناز دیتی ہے اور محب سے ناز برداری کی صورت میں انعام و اکرام کی برسات کا وسیلہ بنتی ہے۔ پس محبوب ناز کرتا ہے اور محب ناز برداری، میدان بدر میں سید المحبوبین ﷺ کا حال دیکھئے کہ آپ اپنے جانثاروں کی چھوٹی سی کمزور جماعت کے لیے فتح و کامرانی کی دعا فرما رہے ہیں۔ چشمہائے مبارک سے نور کی برسات ہو رہی ہے کہ اچانک ارشاد فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُنْشِدُكَ عَهْدَكَ وَ وَعْدَكَ اَللّٰهُمَّ اِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ اَبَدًا

اے اللہ، میں تجھے، اس عہد اور وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ اے اللہ اگر تو اسے پورا

نہ کرے گا تو پھر تا ابد تیری عبادت نہ کی جائے گی۔

غور فرمایئے کیسے ناز بھرے الفاظ میں اس رب سے بھیک مانگی جارہی ہے جس کی شان "غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ" ہے، کوئی اس کی عبادت کرے یا نہ کرے، اسے کیا پروا۔ بندوں کے عبادت کرنے سے نہ اس کی شان بڑھتی ہے، اور نہ ہی بندوں کے عبادت نہ کرنے سے اس کی بلند شان میں کوئی کمی یا نقص پیدا ہوسکتا ہے۔ لیکن محبوب حالت ناز میں فرمارہے ہیں "پھر تا ابد تیری عبادت نہ کی جائے گی" اور محب، ناز برداری فرماتے ہوئے مژدہ دیتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝ (الانفال:۹)

تو اس نے تمہاری فریاد سن لی یقیناً میں تمہاری مدد کرنے والا ہوں، ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔

ایک بار پھر محبوب نے اظہار ناز کیا اور عرض گزار ہوئے:

اَللّٰهُمَّ اِنْ ظَهَرُوْا عَلٰى هٰذِهِ الْعِصَابَةِ ظَهَرَ الشِّرْكُ وَلَا يَقُوْمُ لَكَ دِيْنٌ۔

اے اللہ اگر یہ کافر، مسلمانوں کے اس گروہ پر غالب آ گئے تو شرک غالب آ جائے گا اور تیرا دین قائم نہ ہو سکے گا۔

پس رب کریم نے محبوب کی ناز برداری فرمائی، فرشتوں کو حکم دیا کہ اہلِ ایمان کی مدد کرو۔ میں کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب پیدا کردوں گا اور تم ان کو خوب مارتے رہنا۔ (مفہوم آیت سورۂ انفال) نیز، اپنے محبوب سے مزید تین ہزار فرشتے نازل کرنے کا وعدہ فرمایا۔ پھر اس تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے پانچ ہزار فرشتوں کو نازل کرنے کا مژدہ دیا۔ (مفہوم آیت سورۂ انفال)

محبوبین کی اسی ادا کو نبی مکرم علیہ السلام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ بعض بکھرے بالوں والے، دروازوں سے دھتکارے ہوئے لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ کسی بات پر اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ اسے پورا ہی کردیتا ہے۔ (مسلم شریف)

اللہ کے عشق و محبت میں دیوانوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کے بال بکھرے ہوتے، کپڑے بوسیدہ ہوتے ہیں۔ چہروں پر دیوانگی کے آثار نمایاں ہوتے، انداز گفتگو بہکا بہکا سا ہوتا ہے۔ لیکن یہ مخلوق کی تقدیر کے مالک ہوتے ہیں۔ حالت ناز ان پر طاری ہوتی ہے ان کی زبان سے نکلی ہوئی ناممکن بات بھی ممکن بن جاتی ہے۔ یہ محبوب جو کہہ دیتے ہیں محبت وہ پورا کر دکھاتا ہے۔ اسی لیے بعض اولیاء کرام کے کلام میں ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آپاتیں۔ لیکن حالت ناز میں کہنے والوں نے کہہ دیں اور ہمیں اپنی عقیدت و محبت کے امتحان میں مبتلا کردیا۔ پس وہ لوگ کامیاب ہوئے جنہوں نے ان باتوں سے اولیاء کی عظمت کو پہچانا اور جنہوں نے ان پر نکتہ چینی کی ان کو غیر شرعی قرار دیا، وہ مقربین کے دشمن قرار پائے۔ جو نہایت ہی خطرناک

مقام ہے۔اسی مقام ناز میں میرے آقا غوث الاعظم الشیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے برسرمنبر اعلان فرمایا۔

قَدَمِيْ هٰذَا عَلٰى رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللّٰهِ

میرا یہ قدم، اللہ کے ہر ولی کی گردن پر ہے

اور ناز برداری فرمانے والے محب نے، مشرق و مغرب کے اولیاء تک یہ آواز پہنچائی اور سب کے سر بھی خم کرا دیئے۔

غرضیکہ اللہ بندوں سے قریب ہے، باغیوں کی بغاوت دیکھتا ہے، اطاعت شعاروں کی اطاعت پر نظر رکھتا ہے۔ محسنین و صالحین پر رحمتوں کی بارش برساتا ہے۔ پکارنے والوں کی دعاؤں کو سنتا اور قبول فرماتا ہے۔ ''اے نبی، جب آپ سے میرے بندے، میرے متعلق سوال کریں، تو آپ فرما دیجئے کہ بیشک میں قریب ہوں''۔

دعا

آیہ مبارکہ کا آخری حصہ ملاحظہ فرمایئے جس میں اہل ایمان کو بصورتِ وعدہ، مژدہ دیا جارہا ہے'' میں دعا کرنے والوں کی دعا کو قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرے''۔ وہ اللہ جو اپنے بندوں سے قریب ہے بندوں کی دعائیں قبول فرما رہا ہے، اسی وعدے کا اعادہ کرتے ہوئے دوسری جگہ فرمایا:

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ۠ ﴿۶۰﴾ (المؤمن: ۶۰)

اور تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔

دعا کا حکم بھی دیا جارہا ہے اور قبولیت کا وعدہ بھی فرمایا جارہا ہے۔ یہ اس رب کا وعدہ ہے جو بندوں سے قریب تر ہے اور وعدہ خلافی اس کی شان کے خلاف ہے۔ نیز وہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی وضاحت کرتے ہوئے میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں۔

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِيْ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اِلَيْهِ اَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تمہارا پروردگار بہت حیاء و کرم والا ہے، وہ اپنے بندے سے شرم کرتا ہے کہ بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھائے اور وہ انہیں خالی واپس کر دے۔ (ترمذی شریف)

جب بادشاہ ایسے کرم والا، ایسی بخشش والا ہو، کہ منگتوں کو خالی ہاتھ واپس کر دینا گوارہ نہ فرمائے، تو کتنا بدنصیب ہے وہ جو کریم کے دربار میں حاضر تو ہو، لیکن بھکاری بننے سے شرمائے۔ مانگنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے۔ عبدیت کا تقاضا یہی ہے۔ کہ بندہ معبود سے گڑگڑا، گڑگڑا کر مانگے۔ میرا رب یہی پسند فرماتا ہے کہ جب ہمارے دربار میں آؤ تو جھولی پھیلاؤ۔ کچھ مانگو۔ تکبر میں مبتلا نہ ہو۔ ذلیل و خوار ہو جاؤ گے جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ یہ جتنی عبادت ہیں ان کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ بندہ

عبادت کر کے معبود کو خوش کرے اور پھر ہاتھ پھیلا کر خوب مانگے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، دعا عبادت کا مغز ہے۔
(ترمذی شریف)

جس طرح مغز کے بغیر سارا جسم بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح جس عبادت کے بعد دعا نہ کی جائے بندہ اس عبادت کی برکتوں سے محروم رہتا ہے۔ اسی لیے اللہ کو عبادت سے زیادہ دعا پسند ہے۔ میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَیْسَ شَیْءٌ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَآءِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی عمل عظمت والا نہیں۔
(ابن ماجہ شریف)

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مزید ملاحظہ فرمائیے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ لَّمْ یَسْاَلِ اللّٰهَ یَغْضَبْ عَلَیْهِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو اللہ سے سوال نہیں کرتا، اللہ اس سے ناخوش ہوتا ہے۔
(ترمذی شریف)

دعا، رب کے حضور اپنے عجز و لاچاری کا اعتراف ہے، عبدیت کا اظہار ہے جو اللہ پسند فرماتا ہے۔ پس جو بندہ اپنی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا اپنی حقیقت کو نہیں پہچانتا اور اتنا جری ہے کہ مالک سے مانگنے میں بھی عار کرتا ہے۔ اللہ اس سے خوش نہیں ہوتا۔ پس بندے کو یہی زیب دیتا ہے کہ وہ داتا سے مانگتا رہے۔ خوب مانگے، رو رو کر مانگے، پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ مانگے، کہ جس سے مانگ رہا ہے وہ سن بھی رہا ہے، دیکھ بھی رہا ہے اور اس نے دینے کا وعدہ بھی کیا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اُدْعُوا اللّٰهَ وَ اَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِّنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَّاهٍ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: اللہ سے دعا مانگو یہ یقین کر کے وہ ضرور قبول فرمائے گا۔ اور خوب جان لو کہ اللہ غفلت اور بے پروائی کرنے والے کی دعا قبول نہیں فرماتا۔
(ترمذی شریف)

یہ یقین کر کے مانگو کہ جس کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہو وہ بڑی قدرت والا ہے۔ جسے چاہتا ہے بغیر حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ اس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بس اپنی ضرورت بیان کیے جاؤ۔ جو مانگ رہے ہو شاید تمہارے لیے بہت ہو۔ اس کے لیے کوئی چیز بہت نہیں، پس تم پورے اعتماد کے ساتھ اپنی ضرورت سے بھی زیادہ مانگتے رہو۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا دَعَا اَحَدُكُمْ فَلَا یَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ ارْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ ارْزُقْنِیْ اِنْ شِئْتَ وَلْیَعْزِمْ مَسْئَلَتَهٗ اِنَّهٗ

يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ لَا مُكْرِهَ لَهٗ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی، دعا مانگے تو اس طرح نہ کہے کہ اے اللہ مجھے بخش دے اگر تو چاہے مجھ پر رحم فرما۔ اگر تو چاہے بلکہ دعا میں پختہ ارادہ کر لے، بیشک اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ اس پر زبردستی کرنے والا کوئی نہیں۔ (بخاری شریف)

مانگنے میں رغبت ہو، اصرار ہو، ساتھ ہی عاجزی ہو، ادب ہو، احترام ہو، جیسے چھوٹا بڑے سے، فقیر امیر سے، بیٹا باپ سے مانگتا ہے جو چاہو مانگو، لیکن ایسی چیز ہرگز نہ مانگو جس کو مانگنے سے اللہ اور اس کے رسول نے پہلے روک دیا ہے، شریعت نے اس کو حرام کر دیا ہے۔ مثلاً اے اللہ میرے شراب کے کاروبار میں برکت دے، اے اللہ مجھے جوئے میں کامیاب کر دے، محرّمات شرعیہ کی دعا حقیقت میں اللہ کے غضب اور عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کو معلوم ہو کہ ملک کے قانون میں ایک چیز ممنوع ہے اور پھر بھی آپ حاکمِ وقت سے اس کا سوال کریں۔ یہ طلب نہیں بلکہ حاکم کا مذاق اڑانا ہے۔ جس پر سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ یا کم از کم حاکم آپ کی اس حرکت پر ناراض ضرور ہوگا۔ سرکارِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رِحْمٍ مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: بندہ کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک وہ گناہ یا رشتہ قطع کرنے کی دعا نہیں مانگتا۔ اور جب تک وہ جلدی نہیں کرتا۔ (مسلم شریف)

صحابہ کرام نے آپ سے پوچھا کہ جلدی سے کیا مراد ہے۔

قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ يُسْتَجَابُ لِیْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَ يَدَعُ الدُّعَاءَ۔

یا رسول اللہ، جلدی سے کیا مراد ہے، آپ نے فرمایا جلدی یہ ہے کہ دعا کرنے والا یہ کہے کہ میں نے دعا مانگی، لیکن وہ قبول نہیں کی گئی اور اس کے بعد وہ مایوس ہو جائے اور دعا کرنا چھوڑ دے۔

یعنی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

قبولیت کا وقت اللہ کے علم میں ہے۔ جب وہ وقت آئے گا ضرور مقبولیت ہوگی۔ مایوسی کفر ہے۔ مومن کی شان کے لائق نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو مانگتے ہیں نہیں ملتا۔ بظاہر دعا قبول نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا اثر ضرور کسی دوسری صورت میں ہوتا ہے۔ جو چیز مانگ رہے ہیں یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ ہمارے لیے مفید ہے یا مضر۔ اگر وہ مضر ہوتی ہے تو اللہ کرم فرماتا اور اس سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن اس کے عوض ہمیں بہت سی دوسری مفید چیزیں عطا فرماتا رہتا ہے۔ نہ جانے کتنی آفتیں، بلائیں، مصیبتیں، بیماریاں اس دعا ہی کے اثر سے ٹلتی اور ختم ہوتی رہتی ہیں۔

غرضیکہ وعدۂ الٰہی ہے کہ وہ اپنے بندے کی دعا قبول کرتا ہے اور وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کرتا ہے۔ دعا کے آداب میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ رب کے دربار میں اس کے محبوبین، مقربین بالخصوص وسیلہ دنیا و آخرت حضور نبی مکرم

علیہ السلام کے واسطہ اور وسیلہ سے دعا کی جائے کہ اللہ اس کو پسند فرماتا ہے۔ یہی نبی مکرم علیہ السلام کی تعلیم ہے۔ اسی پر صحابہ کا عمل رہا اور یہی طریقہ اولیاء واصفیاء اور علماء نے اختیار کیا۔ جیسا کہ آپ گزشتہ صفحات پر ''استعانت'' کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔ دوبارہ ان صفحات کا مطالعہ کر لیجئے، نیز دعا کے عنوان پر ہمارا ایک مفصل مضمون ہماری کتاب ''تبلیغی کتاب'' کے حصہ اول میں موجود ہے۔ لہذا ہم یہاں اس مختصر گفتگو پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اللہ ہماری دعاؤں کو قبول فرمائے۔ آمین

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷ (البقرہ: ۱۸۷)

حلال ہوا تمہارے لیے روزے کی رات میں اپنی عورتوں کے پاس جانا، وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنی جانوں میں خیانت کرتے تھے تو اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا اور تمہیں معاف کر دیا۔ پس اب (چاہو) تو ان سے مباشرت کرو اور طلب کرو جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے لکھا ہوا ہے۔ اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے۔ صبح کے وقت پھر روزہ پورا کرو، رات آنے تک۔ اور ان سے مباشرت نہ کرو۔ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ متقی ہو جائیں۔

تکمیل صیام

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ابتدائی دور میں روزے کا آغاز سوتے ہی ہو جاتا تھا۔ نہ سحری تھی اور نہ ہی رات کو عمل زوجیت کی اجازت۔ یہ حکم کس قدر مشکل تھا۔ اس کی تعمیل نہ جانے ہمارے لئے کتنی دشوار ہوتی جب کہ صحابہ کرام بھی اس کی پابندی نہ کر پائے۔ اللہ ان سے راضی ہو اور ہمیں ان کے احترام کی توفیق عطا فرمائے کہ انہی حضرات کا ظاہری گناہ ہمارے لئے باعثِ رحمت بنا اور ان کی عظمت وفضیلت کا مظہر ہوا۔ کہ اللہ نے رات میں عملِ زوجیت کی اجازت بھی دے دی اور کھانے پینے کی بھی۔ نیز ''فتاب علیکم وعفا عنکم'' کا مژدہ سنا کر اپنے محبوب علیہ السلام کے صحابہ کی عزت وناموس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ فرما دیا۔ اللہ ان کی توبہ قبول کر چکا اور انہیں معاف بھی فرما چکا ہے۔ اب کوئی میرے محبوب کے ان محبوب غلاموں پر تنقید وتنقیص نہ کرے بلکہ ساری امت ان کی ممنون رہے کہ ان کے صدقہ میں یہ نعمتیں نصیب ہوئیں۔ وہ واقعات ملاحظہ ہوں جو نزول رحمت کا باعث بنے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان کی ایک رات اپنی بیوی سے ہم بستری کر لی۔ فراغت کے بعد غسل فرمایا اور بقیہ رات نہایت بے چینی سے روتے ہوئے گزاری۔ صبح ہوتے ہی آقا کے دربار میں حاضر ہوئے اور اپنے جرم کا اقرار کرنے لگے۔ دعائے مغفرت کی بھیک مانگنے لگے۔ حاضرین میں سے چند دیگر صحابہ کو بھی ہمت ہوئی تو انہوں نے بھی عمر جیسا ہی اپنا حال پیش کیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے لیے اپنے غلاموں کا یہ حال نہایت ہی باعث تشویش تھا۔ آپ نے اس سلسلہ میں اللہ سے دعا کی اور وحی کا انتظار فرمانے لگے۔

اسی دوران حضرت صرمہ ابن قیس رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش آیا جو نہایت ہی غریب تھے۔ دن بھر محنت مزدوری کر کے بمشکل روزی حاصل کر پاتے تھے۔ افطار و مغرب کے بعد کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھکے ہوئے تھے کہ نیند آ گئی۔ بیوی نے کھانے کے لیے اٹھایا۔ آپ نے فرمایا میں سو گیا تھا۔ روزہ شروع ہو چکا اب کیسے کھانا کھا سکتا ہوں۔ صبح حسب معمول مزدوری کے لیے چلے گئے۔ دوپہر تک نڈھال ہو کر گر پڑے۔ بے ہوش ہو گئے۔ آقا ﷺ کو محبوب غلام کی اس حالت پر بہت دکھ ہوا۔ پس وحی نازل ہوئی اور رمضان کی راتوں میں صبح صادق سے قبل تک عمل زوجیت اور کھانے پینے کی اجازت دے دی گئی۔ صرف حالت اعتکاف میں بیوی کے پاس جانے کی ممانعت کی گئی اور واضح کر دیا گیا کہ یہ احکام اللہ کی حدود ہیں۔ اب کسی کو ان سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں۔

رمضان کی راتوں میں عملِ زوجیت کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے شوہر و بیوی کے رشتہ کو ایک نہایت ہی عجیب اور پیاری تشبیہ کے ساتھ بیان فرمایا، ''عورتیں تمہارا لباس اور تم عورتوں کا لباس ہو''۔ اللہ اکبر، یہ ہے اعجاز قرآن جس کا مقابلہ نہ آج تک کوئی کر سکا اور نہ قیامت تک ممکن ہے۔ ذرا اس تشبیہ پر غور تو کیجئے۔ شوہر و بیوی کے ایک دوسرے پر تمام حقوق اور ایک دوسرے سے متعلق ان کی تمام ذمہ داریوں کو ایک جملہ سے بیان کر دیا گیا۔ ''عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورتوں کا لباس ہیں'' جو اہمیت لباس کی جسم کے لیے ہے وہی بیوی کے لیے شوہر کی اور شوہر کے لیے بیوی کی۔ جو قدر تم اپنے لباس کی کرتے ہو، وہی عورت اپنے شوہر کی اور شوہر بیوی کی کرے۔ لباس جسم کو گرمی و سردی کی تکالیف سے بچاتا ہے۔ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کو زندگی کی تکالیف سے بچانے کے ذمہ دار ہیں۔ لباس جسم کے عیوب کو چھپاتا ہے۔ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کے عیوب کو چھپانے کے پابند ہیں۔ لباس جسم پر حیاء و شرم کا پردہ ہے، یہ دونوں بھی ایک دوسرے کے لیے حیا و شرم کی بقاء کا ذریعہ ہیں۔ لباس جسم کو گرد و غبار سے محفوظ رکھتا ہے، شوہر و بیوی ایک دوسرے کو گناہوں سے بچاتے ہیں۔ اپنے لباس پر داغ، دھبے تمہیں بے حد ناگوار معلوم ہوتے ہیں تم انہیں صاف کرتے ہو، دھوتے ہو۔ شوہر و بیوی ایک دوسرے کو بداخلاقی و بدکرداری کے دھبوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جتنا سوچئے، اتنی ہی اس تشبیہ کی افادیت اور وُسعت آپ کو معلوم ہوتی چلی جائے گی۔ ہمارا مشاہدہ تو یہ بھی بتاتا ہے کہ امریکہ و یورپ اور جن ممالک میں بھی لباس کی اہمیت نہیں، وہاں اس مضبوط ترین، رشتہ ازدواج کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ جہاں اور جب دل چاہا لباس اتار پھینکا۔ یہی رد یہ شوہر و بیوی کے درمیان نظر آتا ہے کہ جب چاہا شوہر نے بیوی کو نکال باہر کیا اور جب چاہا بیوی نے شوہر کو لات مار دی۔ احترام اور حقوق کا احساس نام کی تو کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ غرضیکہ بڑی ہی پیاری تشبیہ ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اللہ نے ایسا ضابطہ

حیات عطا فرمایا جو انسان کو اس کے فطری تقاضوں کے مطابق امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا اور انسانیت کے تقدس کا درس دیتا ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریوں کی وضاحت کرتا ہے۔

رمضان کی راتوں میں، عمل زوجیت اور کھانے پینے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ تمہیں یہ اجازت اس وقت تک ہے جب تک کہ'' سفید وسیاہ دھاگے میں فرق نظر آنے لگے''۔ اس ارشاد پر بعض صحابہ ساری رات سفید وسیاہ دھاگے دیکھتے رہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دونوں قسم کے دھاگے اپنے تکیہ کے نیچے رکھے اور بار بار انہیں دیکھتا رہا کہ کب ان کا رنگ ظاہر ہو مجھے کچھ بھی نظر نہ آسکا۔ صبح حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہو کر میں نے اپنی پریشانی بیان کی۔ آپ مسکرائے اور فرمایا'' تب تو تمہارا تکیہ بہت ہی بڑا ہے'' مقصد یہ ہے کہ آیت میں جو ڈورے مراد ہیں وہ تمہارے تکیہ میں کہاں سما سکتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا'' اس سے دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے'' یعنی دن کی سفیدی ظاہر ہونے لگے اور رات کی سیاہی چھٹنے لگے۔ یہی صبح صادق کہلاتی ہے۔ اللہ نے اس کی وضاحت کے لیے'' من الفجر'' کا جملہ نازل فرمایا۔

روزے کے احکام میں تبدیلی اور بتدریج ان کی تکمیل مزاجِ قرآن کے عین مطابق ہے کہ اللہ رب العزت انسان کے مزاج کو، اس کی فطرت کو خوب جاننے والا ہے اس نے اپنی حکمت اور تدبیر سے اس طرح احکام عطا فرمائے کہ لاقانونیت کی زندگی بسر کرنے والوں پر بار نہ ہو۔ اب بھی داعیانِ دین کے لیے حکم ہے کہ وہ حکمت ومصلحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے محبت و شفقت کے ساتھ لوگوں کو دین کی دعوت دیں انہیں دشواریوں اور الجھنوں میں مبتلا کرنے سے گریز کریں۔ حضور علیہ السلام کی تعلیم ہے:۔

عَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ قَالَ بَعَثَ النَّبِیُّ ﷺ جَدَّہٗ اَبَا مُوْسٰی وَ مُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَ بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَ تَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا۔

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی مکرم علیہ السلام نے ان کے دادا ابو موسیٰ اور معاذ رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجا اور فرمایا آسانی کرنا اور مشکل میں نہ ڈالنا۔ خوشخبری دینا نفرت پیدا نہ کرنا اور دونوں متحد ومتفق رہنا اختلاف نہ کرنا۔ (بخاری ومسلم)

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا بَعَثَ اَحَدًا مِّنْ اَصْحَابِہٖ فِیْ بَعْضِ اَمْرِہٖ قَالَ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَ یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور علیہ السلام صحابہ میں سے کسی کو، کسی کام پر مقرر فرماتے تو نصیحت فرماتے تھے کہ لوگوں کو خوشخبری دو، نفرت نہ دلاؤ۔ آسانی کرو، اور دشواری میں نہ ڈالو۔ (بخاری ومسلم)

تاہم اب شریعت کو مکمل صورت ہی میں پیش کیا جائے گا یہ نہیں کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھنے کی دعوت دی جائے اور پھر چار کی، کہ اب دین مکمل ہو چکا۔ اس میں کمی زیادتی کا کسی کو اختیار نہ رہا۔ اب شریعت مکمل ہے، مکمل ہی کو سہولت اور آسانی

سے پیش کرنا ہوگا۔ اس طرح کہ لوگوں پر بار نہ ہو۔ اور وہ دل و جان سے اسے قبول کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ انداز بیان و دعوت مؤثر و مفید اور پرکشش ہونا چاہیے۔ مستحبات سے زیادہ فرائض کی دعوت پر توجہ دینا چاہیے۔

یہاں ہم نے احکام صوم اور فضائل رمضان کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو تفصیل مطلوب ہو تو اس عنوان پر ہماری کتاب ''تیس راتیں'' پڑھیے۔ جو ہماری زبان کے علاوہ انگریزی اور ڈچ میں بھی چھپ چکی ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (البقرہ:۱۸۸)

اور ناحق ایک دوسرے کے مال آپس میں نہ کھاؤ اور نہ (بطور رشوت) وہ مال حاکموں تک پہنچاؤ کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ (ناجائز طور پر) جان بوجھ کر تم کھالو۔

مالِ ناحق

مال ناحق، مال باطل یا مال حرام وہ مال ہے جو کسی کو تکلیف پہنچا کر یا کسی کا حق مار کر حاصل کیا جائے۔ مثلاً سود کا مال یا رشوت کا مال کہ دینے والے کو اس کی ادائیگی سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ کتنی اذیت پہنچتی ہے۔ یا یتیموں اور بیواؤں کی امانتوں کو ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر غصب کر لینا اور وہ مال بھی ناحق ہے جس کو ایسی چیزوں کے ذریعے حاصل کیا اور کمایا جائے جن کو شریعت مطہرہ نے حرام کر دیا ہے۔ اس کے کمانے میں چاہے کتنی ہی محنت و مشقت اٹھانی پڑے۔ مثلاً شراب، خنزیر وغیرہ کی تجارت سے حاصل شدہ مال، قرآن نے ایسے تمام اموال کو باطل قرار دیا اور اس کے کھانے یا کسی بھی طرح استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی، کیونکہ:۔

جس معاشرے میں مال حرام کا لین دین عام ہو جائے وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ وہاں زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ غور کیجیے ان ممالک کی حالت پر جہاں سود کا لین دین عام ہے، رشوت زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے کہ رشوت لینے والے اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں، کوئی کام بغیر رشوت کے نہیں ہوتا۔ جن کے پاس دولت ہے وہ رشوت دے کر دوسروں کا بھی حق مار لیتے ہیں اور غریب اپنے حق سے بھی محروم رہتا ہے۔ شراب اور دیگر اشیاء جن کو حرام کیا گیا، اگر بازاروں میں کھلے عام خریدی اور بیچی جاتی ہے، تو بمشکل ہی کوئی ان کے استعمال سے بچ پاتا ہے۔ ایسے ممالک میں دولت مند، امیر ترین اور غریب، غریب ترین ہوتا چلا جاتا ہے۔ چوری، ڈکیتی، قتل و غارت کی لعنت عام ہو جاتی ہے۔ شریفوں کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ لوگوں میں خود غرضی، مفاد پرستی پیدا ہوتی ہے وہ ہوا و ہوس کا ایسا شکار ہوتے ہیں کہ ان کے پیش نظر صرف اور صرف دولت ہوتی ہے، نہ کسی کی عزت کی پروا رہتی ہے نہ جان و مال کی۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ چیزوں میں ملاوٹ کرتے ہیں، صرف عام کھانے پینے کی اشیاء ہی کو مضر صحت نہیں بناتے بلکہ دواؤں تک میں ملاوٹ کر کے ان کو بے اثر یا مہلک کر دیتے ہیں۔ حرام کے یہ عادی ایسی دوائیں تک بیچ دیتے ہیں، جن کی تاریخ استعمال ختم ہو چکی ہوتی ہے اور وہ زہر کا کام کرنے لگتی ہیں۔ دولت کی ہوس میں مبتلا انسان کے لیے، انسان کی عزت و آبرو لوٹ لینا، حتیٰ کہ ان کا خون بھی کر دینا، ایک کھیل سے زیادہ نہیں رہتا۔ جس میں کامیاب ہو کر وہ خوش ہوتا ہے۔ خوب قہقہے لگاتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے اس جھوٹے دور میں آپ کو بیشتر

ممالک ایسے ہی ملیں گے، ان میں غیر مسلم ممالک بھی ہوں گے، مسلم ممالک بھی۔ دولت کے ان پوجاریوں کی صف میں عوام بھی نظر آئیں گے اور قوم سے ہمدردی کے نعرے لگانے والے اس کی اصلاح کا دعویٰ کرنے والے لیڈر بھی، یہ وہ لوگ ہیں جن تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ پاتا۔ وہ خود جو کچھ کرتے ہیں، اسی کو قانون سمجھتے ہیں۔ مال باطل کا نشہ ان کو انجام سے ایسا غافل کر دیتا ہے کہ یہ اپنے مکروفریب کے جال کو اپنے گرد آہنی دیواروں کا حصار سمجھتے ہیں۔ لیکن اللہ کی بے آواز لاٹھی کی مار جب ان پر پڑتی ہے اور اس کی سخت پکڑ کا پنجہ ان تک پہنچتا ہے، تو دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے کہ سود و رشوت کی دولت سے گل چھرے اڑانے والے، یتیموں، بیواؤں کے مال کو ہڑپ کرنے والے حرام کاروبار کی دولت سے عیاشی کرنے والے، کبھی تو جیل میں سڑتے ہوئے نظر آتے ہیں کبھی مہلک مرض میں تڑپتے ہوئے، کبھی یہ کسی کے انتقام کا شکار ہوتے ہیں، تو کبھی ان کا سب کچھ آگ بھسم کر جاتی ہے اور ایسے موقعوں پر قدرت پکارتی ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۞ (الحشر:۲)

تو عبرت حاصل کرو، اے آنکھوں والو

کتنے عبرت حاصل کرتے ہیں، یہ کسی کو کیا پتہ، لیکن مال حرام کے عادی پھر بھی باز نہیں آتے کیونکہ جس کے منہ کو حرام لگ جاتا ہے اس کی آنکھوں پر ایسا غلیظ پردہ آجاتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر بھی اسے اپنے انجام سے خوف نہیں آتا۔ وہ گناہوں میں ایسا غرق ہوتا ہے کہ اسے اس سے باہر کی دنیا خار دار ہی نظر آتی ہے۔

رشوت

آیت مبارکہ کا یہ حصہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ ''وہ مال حاکموں تک نہ پہنچاؤ'' یعنی حکام سے بآسانی اپنے حقوق حاصل کرنے یا جائز و ناجائز کام لینے کے لیے انہیں تحائف و ہدایا، دولت دینے کی ممانعت کی جارہی ہے۔ جس کو رشوت کہا جاتا ہے۔ گویا یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو محض اپنی آسانی کے لیے ملک و ملت کے خدام کو حرام کا عادی بنا دیتے ہیں، انہیں تو یہ کام کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی، کیونکہ ان کے پاس دولت ہوتی ہے۔ وہ اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ لیکن اذیت میں وہ عام لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو دولت نہ ہونے کے سبب حکام کا منہ بھرنے سے مجبور ہوتے اور یہ حکام جو حرام کے عادی ہو جاتے ہیں کسی کا کام بغیر رشوت لئے نہیں کرتے۔ لہٰذا عام لوگ اپنے حقوق تک سے محروم رہتے ہیں، پس حکم دیا گیا کہ حاکموں کو حرام کا عادی نہ بناؤ۔ انہیں ان کی ذمہ داریاں پوری کرنے دو اور اپنے حقوق، دولت کے سہارے بآسانی نہیں، بلکہ محنت و مشقت سے حاصل کرو اور انہی پر قناعت کرو۔ حکام سے ناجائز کام کرانے یا ان کے ذریعہ دوسروں کی حق تلفی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ رشوت لینے والوں کو برا کہتے ہیں، ان سے نفرت کرتے ہیں، ان کو ذلیل و خوار جانتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ رشوت لینے والے بہت ہی ذلیل ہوتے ہیں۔ معاشرے کے بدترین افراد یہی لوگ ہیں، جن کی وجہ سے پورا معاشرہ تہس نہس ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے کے یہ سانپ کون پالتا ہے، انہیں کون پروان چڑھاتا، تو واضح جواب یہی ہے کہ رشوت دینے والے ہی انہیں پالتے اور پروان چڑھاتے ہیں، لہٰذا دونوں ہی برابر کے مجرم ہیں۔ رشوت لینے والا بھی اور رشوت دینے والا بھی اور یہی میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ

حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔ (ابوداؤد شریف)

راشی، رشوت دینے والا اس لیے مجرم قرار پایا کہ یہی پورے معاشرے میں فساد پیدا کرنے کا سبب بنا۔ ایک طرف یہ ہوا کہ جب دوسروں نے اس کے کام آسانی سے بنتے دیکھے تو انہوں نے بھی وہی ہتھیار استعمال کیا جو اس نے کیا تھا۔ اس طرح پورا معاشرہ راشی بن گیا اور یہ بات عام ہوگئی کہ پیسہ دو اور جو چاہو کرالو۔ دوسری طرف اس کا اثر بد یہ ہوا کہ حکام رشوت ہی سے کام کرنے کے عادی ہوگئے۔ جس سے انہوں نے اتنی دولت کمائی کہ وہ اپنی اصل تنخواہ کو جیب خرچ اور حرام کی دولت کو اصل آمدنی تصور کرنے لگے۔ اگر معاشرے کے تمام افراد لعنت و پھٹکار کے خوف سے فیصلہ کرلیں کہ وہ ہرگز رشوت نہیں دیں گے تو رشوت لینے والے اپنی موت آپ مر جائیں گے اور معاشرہ اس لعنت سے محفوظ ہو جائے گا۔ پھر ہر ایک کو آسانی اس کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اور حکام اپنی تنخواہوں پر ہی قناعت کر کے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگیں گے۔ یہی واحد ذریعہ ہے معاشرے کو رشوت کی غلاظت سے پاک کرنے کا۔ کوئی برائی قانون سازی یا نگہبانی سے ختم نہیں ہوتی، اسی وقت ختم ہوتی ہے جب اس میں مبتلا افراد کو اس کی مضرت اور تکلیف کا احساس ہو اور وہ خود ہی اس کے خلاف جہاد کرنے اور اس کو ختم کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

مرتشی، رشوت لینے والے پر اس لئے لعنت ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف تو مالک یا حکومت کو دھوکا دیتا ہے کہ اس کو جو ذمہ داری سونپی گئی تھی، اس کا معاوضہ بھی اس کے لیے مقرر تھا۔ پھر بھی یہ بھیک مانگتا اور اپنے منصب سے ناجائز فائدہ حاصل کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ عوام کو مجبور کرتا ہے کہ اس کا پیٹ بھرنے کے لیے وہ بھی حرام کی دولت حاصل کریں۔ یہ معاشرے کا وہ ظالم فرد ہے جو چند ٹکوں میں ہر وقت بکتا رہتا ہے۔ کسی کا حق مارتا ہے، کسی کو دیتا ہے۔ اس نے عوام کی زندگی کو ایسا ناہموار بنا دیا ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق، جو پیسہ پھینکتا ہے وہ سب کچھ پالیتا ہے اور جس کے پاس پیسہ نہیں وہ غریب حق دار ہونے کے باوجود دھکے ہی کھاتا رہتا ہے۔ رشوت کی دولت کو میرے آقا ﷺ نے خیانت قرار دیا۔ آپ فرماتے ہیں۔

عَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَرَزَقْنٰهُ رِزْقًا فَمَا اَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُوْلٌ۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس کو ہم کسی کام کا عامل بنائیں اور اس پر جو روزی اسے دیں تو اس نے اس کے علاوہ جو لیا وہ خیانت ہے۔ (ابوداؤد)

میرے آقا ﷺ کا منشا واضح ہے کہ ملازم کو جب اس کے کام کی مقررہ تنخواہ ملتی ہے، تو اسے اپنی ذمہ داری پوری کرنے پر کسی سے کچھ مانگنے کا حق نہیں، اگر کوئی مانگتا ہے تو وہ دوہری خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک خیانت وہ اپنے مالک سے کرتا ہے کہ اس سے بھی تنخواہ لیتا ہے اور چھپ کر دوسروں سے بھی معاوضہ لے لیتا ہے۔ دوسری خیانت اپنے منصب سے کرتا ہے کہ اسے اپنے اختیارات سے عوام کی خدمت کرنا چاہئے تھی۔ لیکن اس ظالم نے اپنے منصب کو عوام کا خون چوسنے کا

آلہ بنالیا۔

غرضیکہ راشی ومرتشی دونوں ہی لعنت کے مستحق قرار پائے اور لعنت کا مطلب آسمان سے پتھر برسنا نہیں، بلکہ انفرادی اور قومی طور پر ذلیل وخوار ہوجانا آفات وبلیات اور طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوجانا ہی لعنت ہے۔ اس اعتبار سے اپنے ماحول پر نظر ڈالیے اور تسلیم کر لیجئے کہ مخبر صادق ﷺ کا ارشاد حق ہے کہ ہم لعنت میں مبتلا ہیں۔ ہمہ وقت، عزت وآبرو، جان ومال کا خطرہ، ہر طرف لوٹ مار اور ڈکیتی سیاست کے نام پر قتل وغارت کا گرم بازار، ہوش ربا گرانی، کسی گھر میں چین وسکون کا نہ ہونا، اخلاق ومروت کا فقدان یہ سب لعنت نہیں۔ تو پھر آپ اس کو کیا کہیں گے یہ لعنت کیوں برس رہی ہے اس سوال کا جواب بھی آپ اپنے گردوپیش سے حاصل کرسکتے ہیں۔ کیا کوئی محکمہ ایسا دکھایا جاسکتا ہے جہاں رشوت خور نہ بیٹھے ہوں، قوم کے محافظ پولیس کی وردی میں، حقداروں کو حقوق دلانے کے لئے قانون کے ترجمان سیاہ گون میں، مریضوں کو سکون مہیا کرنے کے ذمہ دار سفید گون میں، حتیٰ کہ قوم کو تہذیب وتمدن کا درس دینے والے معزز اساتذہ درسگاہوں میں، بڑی ہی دیدہ دلیری کے ساتھ، حرام کی دولت بٹورنے میں مصروف نظر آئیں گے، جس کو یہ ظالم اپنا حق، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں جبکہ نبی مکرم علیہ السلام ایسے لوگوں کو جہنمی قرار دیتے ہیں۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ وہ گوشت جنت میں داخل نہ ہوگا جو حرام (مال) سے پیدا ہوا، اور ہر وہ گوشت جو حرام (مال) سے پیدا ہوا ہے، اس کے لیے جہنم ہی زیادہ مناسب ہے۔ (مشکوۃ شریف)

عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِّیَ بِالْحَرَامِ۔

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ راوی ہیں، کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا وہ جسم جنت میں داخل نہ ہوگا جو مال حرام سے پلا ہے۔ (مشکوۃ شریف)

بہرحال مال ناحق کے استعمال اور اس کی عام عادت پڑ جانے سے معاشرہ برباد ہوجاتا، تباہ ہوجاتا ہے۔ اللہ کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ اس پر ایمان رکھنے والے ایسے گھناؤنے ماحول میں زندگی بسر کریں۔ پس منع فرمایا کہ اس مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ جو مستقبل میں تمہاری دنیاوآخرت کی بربادی کا سبب بن جائے۔

نیز مال ناحق کو اس لیے ممنوع قرار دیا گیا کہ انفرادی طور پر نہایت ہی مہلک ہے جو شخص اس کے قریب بھی گیا وہ اس میں غرق ہی ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اس کا اثر صرف جسم پر ہی نہیں بلکہ دل ودماغ اور روح تک پر ہوتا ہے، کہ مال حرام کے عادی آپ کو اکثر طرح طرح کے امراض میں مبتلا نظر آئیں گے۔ ان کے ذہن مفلوج ہوجاتے ہیں۔ دل سخت ہوجاتے ہیں۔ اللہ کی عبادت، نماز وروزہ سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ایسا شخص زبان کا بھی گندا ہوتا ہے۔ جہاں بیٹھتا ہے لوگوں کی تحقیر کی باتیں کرتا ہے، غیبت کرتا ہے، جب بولتا ہے زبان سے انگارے ہی برساتا ہے۔ گالی گلوچ کی عادت پڑ جاتی ہے۔

تکبر وغرور اس کی شان بن جاتا ہے، خودستائی اور بڑائی اس کی پہچان ہو جاتی ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی اس کی آن بن جاتی ہے۔ گوشت و پوست کا یہ بے حقیقت پتلا، پتھر کی سخت چٹان بن جاتا ہے۔ تہذیب وتمدن سے یہ آزاد نظر آنے لگتا ہے۔ ایسا شخص سارا دن کتوں کی طرح دوسروں کی دولت پر منہ مارتا پھرتا ہے۔ یہ ساری رات مضطرب و بے چین رہتا ہے۔ نیند کی گولیاں کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ معاشرے کا ہر فرد حتیٰ کہ گھر والے بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ مال حرام پر گزر بسر کرنے والوں کی نہ عبادتوں میں اثر ہوتا ہے نہ دوسری نیکیوں کا انہیں کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی دعائیں مردود ہوتی ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام فرائض کے بعد کسب حلال کو سب سے بڑی عبادت قرار دیتے ہیں۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ روزی کا حلال ذریعہ تلاش کرنا، فرض کے بعد فرض ہے۔ (مشکوۃ شریف)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَنِ اشْتَرٰى ثَوْبًا بِعَشَرَةِ دَرَاهِمَ وَ فِيْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ تَعَالٰى لَهٗ صَلٰوةً مَا دَامَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَدْخَلَ اِصْبَعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ وَ قَالَ صُمَّتَا اِنْ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُهٗ

حضرت ابن عمر نے بیان کیا کہ جس نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا ہے تو اللہ اس کی نماز قبول نہ کرے گا، جب تک وہ اس کے جسم پر رہے گا، پھر اپنی دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کر کے فرمایا، یہ بہرے ہو جائیں اگر میں نے حضور علیہ السلام کو اسی طرح فرماتے نہ سنا۔
(مشکوۃ شریف)

حضرت عبداللہ مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا دل اور زبان مسلمان نہ ہو جائے۔ اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاء سے محفوظ نہ ہو جائیں اور جب کوئی بندہ مال حرام کھاتا ہے، پھر اس سے صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا۔ اور جب اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی۔ اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بری چیز سے برے عمل کو نہیں دھوتا، ہاں اچھے عمل سے برے عمل کو دھو دیتا ہے۔

ان احادیث مبارکہ سے آپ نے اندازہ کیا کہ آقا ﷺ ہم غلاموں کو مال ناحق سے بچتے رہنے کی کس قدر تاکید فرما رہے ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ قابل توجہ یہ بات ہے کہ مال حرام کی نحوست، ہمارے کسی ایک عمل پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ سارے اعمال اور تمام عبادتیں اس کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ آپ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ملاحظہ کیا کہ "جو کپڑا مال حرام سے خریدا گیا، اس کو پہن کر جتنی نمازیں پڑھیں وہ سب اکارت ہو گئیں"۔ اسی پر

اور دوسری عبادات کا حال قیاس کر لیجئے۔ مال حرام سے آپ نے حج کیا۔ رشوت کے پیسے سے آپ نے ہر سال عمرہ کیا۔ سود کی دولت سے آپ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ آپ اپنے دل کو جیسے چاہیں مطمئن کر لیں، لیکن ان عبادتوں کا انجام وہی ہے جو مخبر صادق ﷺ نے بیان فرمادیا۔ ایک نہایت ہی بھیانک صورت اور نظر آئی کہ کسی رشوت خور نے، رشوت کی دولت سے ایک نہایت ہی خوبصورت مسجد تعمیر کی، کیا اس مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہوگی۔ تو اسی حدیث پر غور کیجئے۔ جس میں فرمایا گیا۔ کہ مال حرام سے خریدے ہوئے کپڑوں میں جو نماز پڑھی گئی وہ قبول نہ ہوگی، بات واضح ہے، جب حرام کے کپڑوں سے نماز نہیں ہوتی تو جو مسجد حرام کی دولت سے بنائی گئی ہے، اس میں نماز کیسے ہوگی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جتنے لوگوں نے وہاں نماز پڑھی اس کے خراب ہونے کا وبال اس مسجد کے بنانے والے پر ہوگا۔ اللہ محفوظ رکھے ایسی دولت سے جو ذریعہ نجات بننے کی بجائے وبال جان اور ذریعہ عذاب بن جائے۔

آج ہمارا مقصود صرف حصول مال ہے۔ حلال وحرام کے امتیاز کا تو خیال تک نہیں آتا۔ دیکھ لیجئے کس دیدہ دلیری سے رشوت لینے والے، رشوت لیتے ہیں اسی سے حاجی ہو جاتے ہیں۔ متقی زاہد بن جاتے ہیں یہاں جو چاہیں بنیں۔ شریف بھی کہلائیں۔ باعزت بھی لیکن انجام یقیناً وہی ہوگا، جو میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ جسم جنت میں داخل نہ ہوگا، جو مال حرام سے پلا''۔ کیسا زہر ہے یہ مال حرام اور کیسے احمق ہیں اس زہر کو کھانے والے اور اس پر اترانے اور گھمنڈ کرنے والے۔ اے اللہ مالِ حرام کے ذرائع ہم پر بند فرمادے۔ اور مال حلال وطیب ہمیں بغیر حساب عطا فرما۔ آمین

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۷

البقرہ:۲۰۸ تا ۲۰۹

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾

(البقرہ:۲۰۸۔۲۰۹)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور اگر تم اس کے بعد بھی پھسلنے لگو کہ آ گئیں تمہارے پاس کھلی دلیلیں، تو جان لو کہ بے شک اللہ بہت غالب، بڑی حکمت والا ہے۔

ایمان والو! مطالبہ ایمان یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد ان کے احکام کی زندگی کے ہر شعبہ میں اطاعت واتباع کرو اور اسلام کو اس طرح اختیار کر لو کہ تمہارا کوئی عمل یا قول اس کے خلاف نہ ہو۔ احکامِ اسلام سے بغاوت، شیطان کی اتباع و پیروی کے سوا کچھ نہیں جو طرح طرح سے تمہیں اس پر آمادہ کرتا ہے کیونکہ وہ تو اسی وقت تم سے اپنی دشمنی کا اعلان کر چکا ہے جب اللہ نے اسے انسان اول حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ پس وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

وہ تمہارا خیرخواہ ہو ہرگز نہیں ہوسکتا۔اس کی بات ماننے میں ہرگز تمہاری بھلائی اور کامیابی نہیں ہوسکتی۔لہٰذا تم اس کی پیروی نہ کرو۔ تمہارے پاس قرآن وسنت کی صورت میں اللہ کی قدرت کے روشن دلائل آچکے ہیں،تمہیں زندگی بسر کرنے کے اصول دیئے جاچکے ہیں اور تم اعلان ایمان کے بعد انہیں قبول بھی کرچکے اور ان پر عمل کا عہد بھی کرچکے ہو۔اب بھی اگر تم پھسلو گے،اسلام کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کروگے،اسلام کے عطا کردہ اصولِ زندگی کو پس پشت ڈالو گے تو اللہ تو بہت غالب ہے۔بڑی حکمت والا ہے وہ پوری پوری طرح اس بات پر قادر ہے کہ تمہاری بدعملی کی تمہیں سزا دے۔

مسلم کامل بنو

ایمان،زبان سے اقرار اور دل سے یقین کا نام ہے۔اسلام اطاعت وفرمانبرداری کے لیے سر تسلیم خم کردینا،مطیع ہو جانا۔''سلم'' سے مراد اسلام ہے یعنی مطیع وفرمانبردار بن جاؤ۔''کافۃ''،سب کے سب پورے کے پورے۔

واضح ہے کہ آیت میں اہل ایمان سے مسلم کامل بن جانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے کہ ایمان کا مقتضیٰ اسلام ہے۔ ایمان کا ثبوت احکام اسلام کی تعمیل ہے،جو مؤمن ہوا،اسے مسلم بھی ہونا چاہیے۔جس نے اللہ کے وجود و وحدانیت،حاکم اعلیٰ ہونے،قادر مطلق،مالک حقیقی ہونے کا زبان سے اقرار کرلیا دل سے یقین کا دعویٰ کرتا ہے۔اس کو زیب یہی دیتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ ہی کے احکام کی تعمیل کرے۔جس نے رسول کی رسالت کا اعتراف کرلیا اس کے مبعوث من اللہ ہونے کو تسلیم کرلیا۔اسے رسول ہی کی اتباع وپیروی کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیے۔جس نے قرآن کو کلامِ الٰہی مان لیا۔اس کو قرآن ہی کے بتائے ہوئے اصول زندگی اپنانا ہوں گے۔جس نے یقین کرلیا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اور مالک یوم الدین کے دربار میں حاضر ہوکر اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے۔اسے اپنے ہر کام سے پہلے مالک کی مرضی معلوم کرنا چاہیے۔پس ایمان کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلم کامل بنو۔یہی مؤمن ہونے کا ثبوت ہے۔اسی میں عزت اور نجات ہے۔

اسلام میں داخل ہوجاؤ پورے کے پورے کہ اسلام تمہاری زندگی کے بعض شعبوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔بلکہ احکام اسلام کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام مؤمن کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے۔زندگی کے ہر شعبہ میں،ہر معاملہ میں یہ تمہاری رہبری کے لئے کافی ہے۔ہر دور اور ہر ملک میں بسنے والوں کے لئے یہ رہنما ہے۔یہ وہ سرچشمہ ہدایت ہے جس سے سیراب ہونے والوں کے شب وروز پرسکون ہوجاتے ہیں۔یہ وہ منبع رشد وہدایت ہے جس سے رہبری حاصل کرنے والوں کو منزل مقصود ملتی ہے یہ وہ مینارۂ نور ہے جو تاریکی میں بھٹکنے والوں کے ظاہر وباطن کو روشن ومنور کردیتا اور انہیں دوسروں کا رہبر بنادیتا ہے۔یہ وہ خزانہ رحمت ہے جو بھکاریوں کی نظروں میں،قیصر وکسریٰ کے محلات،ان کے تخت وتاج کو حقیر بنادیتا ہے۔یہ وہ پسندیدہ دین ہے جس کی اشاعت وتبلیغ کے لیے اللہ رب العزت جل مجدہ نے انبیاء ورسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔انسان اول حضرت آدم علیہ السلام اسی دین پر پیدا کیے گئے۔یہ دین،دینِ فطرت ہے۔اس کے عطا کردہ اصولِ زندگی انسان کی فطری اور تخلیقی صلاحیتوں کے عین مطابق ہیں جن کی انسان بلاتکلف پابندی کرسکتا ہے۔اسلام انسانی اقدار کا محافظ ہے۔شرافت انسان کی بقاء کا ضامن ہے۔تہذیب وتمدن کا معلم ہے۔پس انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اسی کو ضابطہ حیات بنائے،اسی کو اللہ نے مقبول وپسندیدہ دین قرار دیا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹)

بیشک اللہ کے نزدیک اسلام ہی (پسندیدہ) دین ہے

یہی ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا دین تھا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو یہی دین اختیار کرنے کی وصیت فرمائی۔ پس ہر عقلمند کو یہی دین اپنانا اور اسی کی پابندی کرنا چاہیے۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۳۰۔۱۳۲)

اور کون منہ پھیر سکتا ہے، دین ابراہیم سے سوا، اس کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنا دیا ہو اور بیشک ہم نے ابراہیم کو چن لیا دنیا میں اور بیشک وہ قیامت کے دن نیکوکاروں میں ہوں گے۔ اور یاد کرو جب اس سے اس کے رب نے فرمایا، گردن جھکادو عرض کی میں نے اپنی گردن جھکادی سارے جہانوں کے پروردگار کے لئے۔

اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے (بھی) اے میرے بچو، بیشک اللہ نے پسند فرمایا ہے، تمہارے لیے یہی دین، پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

اب تم کون سا دین تلاش کرتے ہو، جس رب کی اطاعت وفرمانبرداری زمین وآسمان کی تمام مخلوق کرتی ہے۔ خوشی یا ناخوشی شعوری یا غیر شعوری طور پر اور ہر ایک کو اسی مالک حقیقی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تو اس کے پسندیدہ دین سے بہتر، انسان کے لیے کون سا ضابطہ حیات ہوسکتا ہے۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ۝ (آل عمران:۸۳)

کیا اللہ کے (پسندیدہ) دین کے سوا (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں، حالانکہ اسی کے مطیع ہوگئی ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ خوشی سے یا مجبوری سے اور اسی کی طرف وہ سب لوٹائے جائیں گے۔

پس اے نبی علیہ السلام، آپ بھی اپنی زبان مبارک سے اعلان فرمادیجئے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران:۸۴)

آپ فرمایئے، ہم ایمان لائے، اللہ پر اور اسپر جو اتارا گیا ہم پر، اور جو اتارا گیا ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف

سے ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

جس دین کو محمد عربی ﷺ لے کر آئے ہیں۔ یہ کوئی نیا دین نہیں، یہ وہی قدیم ضابطہ حیات ہے۔ جس کو اللہ نے انسان کے لئے پسند فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک، جملہ انبیاء ورُسل نے اسی دین کو اختیار کیا اور اسی کی تبلیغ واشاعت کی اور اسی دین کو مکمل صورت میں لے کر نبی آخرالزماں ﷺ تشریف لائے۔ تو اب تم اس دین کو چھوڑ کر کس دین سے وابستہ ہونا چاہتے ہو۔

اسلام کا دینِ قدیم اور حق ہونا واضح کر دیا گیا ہے لہٰذا اب اگر تم نے اسے چھوڑا اور کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسلام کے علاوہ ہر دین مردود ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۸۵﴾

(آل عمران:۸۵)

اور جو تلاش کرے گا، اسلام کے سوا کوئی (اور) دین تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت میں نقصان میں ہوگا۔

اے ایمان والو، تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ تمہارے لئے یہی بہتر ہے تم دنیا کی پروانہ کرو۔ تمہاری عزت وناموس کا محافظ تمہیں پُرسکون و باوقار زندگی مہیا کرنے کا ضامن تمہاری خوشحالی کا کفیل اسلام ہی ہے۔ آ ؤاس کے دامن سے وابستہ ہو کر دیکھو تمہاری زندگی پُر بہار ہو جائے گی۔

دین نظامِ حیات کا نام ہے اور ہر جاندار ایک نظامِ حیات کا محتاج ہے۔ اس کے وضع کرنے اور بنانے کا حق سوائے خالق حقیقی کے کسی کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ صرف وہی اپنی مخلوق کے مزاج اور ضروریات سے واقف ہے۔ صرف وہی ہر جاندار کے فطری تقاضہ کے مطابق نظام ترتیب دینے پر قادر ہے۔ اس نے جانوروں کے لئے جو نظام بنایا وہ اسی کے مطابق ابتدائے آفرینش سے ہمیشہ کے لیے زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ جب بھی انہیں اس نظام سے ہٹایا جاتا ہے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، اپنے شرف کی بقاء کے لئے یہ ایسے نظام کا محتاج ہے جو اس کو جانوروں سے ممتاز رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو نبیوں کے ذریعہ نظام عطا فرمایا، جس کی بنیاد اطاعت وفرمانبرداری پر رکھی گئی۔ اسی لئے اس کا نام اسلام رکھا گیا اور اس کے ماننے والوں کو مسلم کہا گیا۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ

(الحج:۷۸)

(اللہ نے تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اس (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

اور نبی آخرالزماں ﷺ کو حکم دیا گیا:

وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۲﴾

(الزمر:۱۲)

(اے حبیب علیہ السلام) آپ فرما دیجئے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

اس عالم میں آپ کا مسلم اول ہونا تو ظاہر ہے۔ اور عالمِ غیب، عالمِ ارواح میں بھی ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' کے جواب میں سب

سے پہلے ''بلیٰ'' کہنا بھی آپ ہی سے ثابت ہے۔

دین کامل

غرضیکہ اسلام وہ دین ہے جو خالق انسان نے اس کی پیدائش کے روزِ اول ہی اس کو بطور نظام حیات عطا فرمایا۔ لیکن اللہ ہی نے انسان کی فطرت میں ارتقاء ترقی کرنے کا مادہ رکھا۔ لہٰذا ہر دور میں اسلام کے احکام اس دور کے ارتقائی تقاضوں یا یوں کہئے کہ انسان کی قوتِ تعمیل کے مطابق دیئے جاتے رہے۔ اسی لئے انبیاء کی شریعتوں میں فرق نظر آتا ہے۔ لیکن علمِ الٰہی کے مطابق نبی آخرالزماں ﷺ کی بعثت کے وقت تک انسان اِرتقاء کی ساری منزلیں طے کر کے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اب اس کے فطری تقاضوں میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہ رہا۔ پس اللہ نے اپنے محبوب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلسلہ نبوت کو ختم فرمادیا۔ اور آپ کے آخری نبی ہونے کا اعلان فرمایا۔ نیز آپ پر اپنی آخری کتاب قرآن کریم نازل فرما کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نزولِ وحی اور آسمانی کتابوں کا سلسلہ بند کردیا۔ اور قرآنِ کریم کو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے ضابطہ حیات قرار دیا۔ اور ہر قسم کی خرد برد سے بچانے کے لئے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا۔ کہ پہلی کتابوں کا غائب ہوجانا، ان میں تغیر وتبدل ہوجانا انسان کے لئے مضر نہ تھا۔ کیونکہ وہ خاص قوموں اور خاص ادوار ہی کے لئے نازل کی گئی تھیں۔ حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان کتابوں کو بھی انسان کو ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ یہ کتابیں کمالِ ارتقاء پر پہنچ جانے والے انسان کے قابلِ عمل بھی نہ ہوسکتی تھیں۔ آپ کی بعثت کے بعد انسان کا سرمایہ حیات، نظامِ حیات، صرف اور صرف اللہ کی آخری کتاب قرآن ہے۔ لہٰذا اللہ خود اس کی حفاظت فرماتا ہے۔ اسی لئے باوجود کوشش کے آج تک کوئی قرآن کا ایک نقطہ تک مٹا دینے یا کم کردینے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اور نہ ہی قیامت تک ایسا ممکن ہے۔ قرآن کے ذریعہ اللہ نے اپنے محبوب علیہ السلام کے واسطہ سے جو دین عطا فرمایا وہ بھی ایسا مکمل ہے کہ قیامت تک آنے والے ہر دور کے لیے کافی اور ہر زمانہ کے انسانوں کے لئے قابلِ عمل ہے۔ اب نہ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے، اور نہ ہی اس میں کسی تبدیلی کا امکان ہے۔ پس حجۃ الوداع کے عظیم موقع پر اللہ نے اپنے نبی مکرم ﷺ سے اعلان کرادیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

(المائدہ: ۳)

آج میں نے مکمل کردیا تمہارے لئے تمہارا دین اور پوری کردی تم پر اپنی نعمت اور پسند کرلیا۔ تمہارے لئے اسلام کو (بطور) دین۔

اے ایمان والو تم اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ کہ یہی مکمل دین ہے، یہی تم پر میری نعمتوں کا تتمہ ہے اسی کو میں نے تمہاری زندگی کے نظام العمل کے لئے پسند کیا ہے۔

اب اسلام صرف وہی ہے جو نبی آخرالزماں ﷺ لے کر آئے، زبور، تورات، انجیل کا زمانہ، ان کتابوں کی شریعت اب اسلام نہیں۔ ان کے ماننے والے اب مسلمان نہیں۔ اب انسان ارتقاء کے عروج پر پہنچ چکا ہے۔ پچھلی شریعتوں میں اس کے فطری تقاضے پورے کرنے کی وسعت نہیں۔ اب قرآن کا دور ہے۔ پس پچھلی کتابوں اور پچھلے نبیوں کو مان کر اللہ

کے قرب اور اس کی رضا کا دعویٰ کرنے والے کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اب تو قرب الٰہی اور رضائے الٰہی کا ذریعہ صرف اور صرف نبی آخر الزماں ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونا اور ان کی عطا کردہ شریعت پر عمل کرنا ہے۔ مؤمن ہونے کا دعویٰ کرنے والے یہودی ہوں یا عیسائی اس وقت تک اپنے دعوے میں سچے نہیں ہو سکتے، جب تک کہ وہ اسلام میں پورے داخل نہ ہو جائیں۔ مسلم نہ بن جائیں جو اسلام کو اپنا لے گا۔ اللہ اس کے ایمان کو قبول کر لے گا۔ میرے آقا ﷺ کا واضح ارشاد ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یَهُوْدِیٌّ وَّلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے۔ اس امت کے جس یہودی اور نصرانی کو میری نبوت کی خبر پہنچے اور وہ میری رسالت پر ایمان لائے بغیر مرجائے تو وہ یقیناً دوزخی ہے۔ (مسلم شریف)

عجیب بات

عجیب بات یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے، اپنے آپ کو یہودی اور عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے خود کو عیسائی کہتے ہیں۔ جبکہ موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے درمیان جتنے بھی انبیاء آئے، سب نے اسلام ہی کی دعوت دی اور اپنے آپ کو سب نے ہی مسلم کہا۔ گویا یہودیوں اور عیسائیوں نے خود ہی اپنے آپ کو اسلام سے خارج کر لیا جب کہ بحمد اللہ حضور ختمی مرتبت ﷺ کے غلام اپنے آپ کو محمدی نہیں بلکہ مسلمان ہی کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام سے بے انتہا عشق و محبت کے باوجود اور آپ کے اعلیٰ فضائل و کمالات پر یقین رکھنے کے باوجود، ہم اللہ وحدہ لاشریک ہی کے بندے ہیں اور اسی کے عطا کردہ نظام حیات کو اپنائے ہوئے، پس اسی کے دیئے ہوئے نام سے ہماری پہچان ہے کہ ہم مسلم ہیں اور یہی ہمارے لئے بڑا اعزاز ہے۔ ہم اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

دین میں تغیر و تبدل

جس نظام کو ماننے والے، آئے دن اپنی ضروریات و خواہشات کے مطابق اس میں تبدیلیاں کرتے رہیں وہ نظام آفاقی نہیں رہتا وہ تو انسانی نظام ہو جاتا ہے۔ دنیا کے دوسرے نظاموں کی طرح یہود و نصاریٰ کو اس کا خود بھی اعتراف ہے کہ ان کے دین میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے ان کے علماء کو اپنے مراتب کے مطابق اس کا اختیار حاصل ہے۔ اتنا تغیر ہوا کہ ان کی کتابیں بھی اصل حالت پر نہ رہیں پھر وہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں اور اگر دعویٰ کرتے ہیں تو اس کی صداقت کا ان کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ دین الٰہی پر عمل پیرا ہیں۔ جب کہ مسلمان کا یہ دعویٰ برحق ہے کیونکہ نہ تو ہماری کتاب میں آج تک کوئی تبدیلی ہوئی اور ہم نے دین کے کسی حصہ کو تو درکنار، ایک مسئلہ کو بھی تبدیل نہ کیا۔ نہ ہماری شریعت، علماء کو ان کے بلند مرتبہ نائب رسول ہونے کے باوجود تبدیلی کا حق دیتی ہے۔ مسلمان کسی ملک میں ہو، کیسا ہی ماحول ہو، کیسا ہی موسم ہو۔ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، نکاح، طلاق اور دیگر تمام امور میں اسی طریقے کو اختیار کئے ہوئے ہے۔ جو چودہ سو سال پہلے تھا۔ اور جس کی تعلیم معلم

انسانیت نبی مکرم ﷺ نے دی۔ مثلاً ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے کہ ہمارے روزہ و عید اور حج کا تعلق قمری مہینوں سے ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی ہمیں یہ عبادات اچھے موسم میں ادا کرنے کا موقع ملتا ہے اور کبھی نہایت سخت موسم میں، کہ گرمی کی شدت ہوتی ہے۔ دن طویل ہوتے ہیں لیکن ہم اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ اپنی تکلیف کی پروانہیں کرتے اور کسی میں یہ جرأت نہیں کہ تکلیف کی وجہ سے وہ ان مخصوص مہینوں میں تبدیلی کر دے۔ اسی طرح ان عبادات کی ابتداء اور انتہا چاند دیکھ کر کی جاتی ہے۔ اس طرح کہ چاند دیکھنے والے علماء کے سامنے خود حاضر ہوں اور شہادت دیں کہ انہوں نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے۔ تب علماء مہینہ کے آغاز کا اعلان کر سکتے ہیں ورنہ موجودہ مہینہ کے تیس دن پورے ہونے کے بعد نیا مہینہ شروع ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے عدالت میں جج کسی مقدمہ کا فیصلہ شہادت ہی کی بنیاد پر کرتا ہے۔ حتّٰی کہ جج نے ایک معاملہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا لیکن شہادت اگر اس کے برعکس ہے تب بھی اسے شہادت پر ہی اعتماد کرنا پڑے گا۔ شہادت واقعہ کو دیکھنے والے کی جج کے سامنے موجودگی اور حاضری ہی کا نام ہے۔ یعنی فون، فیکس وغیرہ کے ذریعہ واقعہ کا معلوم ہونا خبر کہلائے گا شہادت نہیں۔ یورپ وغیرہ میں موسم کی خرابی کے سبب چاند بمشکل ہی نظر آتا ہے۔ جس سے مسلمانوں میں واقعی ہیجان و پریشانی ہے اور بعض علماء بھی فون و فیکس وغیرہ کا سہارا لے کر اس پریشانی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن معتمد علماء کی اکثریت دین میں اس معمولی تبدیلی کی بھی اجازت نہیں دیتی اور آج تک باوجود پریشانی کے اسی پرانے طریقے پر عمل جاری ہے کہ دین مکمل ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی بھی تبدیلی اس کی آفاقیت اور دین سماوی ہونے کی حیثیت وافادیت کو پامال کر دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کو مرتد قرار دیا۔ اور ان کی سرکوبی کے لئے زبردست اسلامی لشکر متعین فرمایا کہ دین میں تبدیلی کا یہ پہلا فتنہ تھا اور اس کو نہ کچلا جاتا تو تبدیلی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھل جاتا اور العیاذ باللہ پھر اس دین کا بھی وہی حشر ہوتا جو یہود و نصاریٰ کے دین کا ہے۔ کہ ہر دور کے لوگوں کو اپنی ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلی کا حق حاصل ہو جاتا۔

پس اسلام ہر قسم کے تبدل و تغیر سے محفوظ دین مکمل ہے تو اے مؤمنو تم اس میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ نزول قرآن کے دور میں یہ پیغام خاص طور پر ان لوگوں کے لئے تھا جن کے دلوں میں مؤمن ہو جانے کے بعد بھی اپنے سابقہ دین کے کچھ احکام کی محبت باقی تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح ان پر عمل باقی رکھنا چاہتے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام اور دیگر علماء یہود مؤمن ہونے کے بعد بھی یہ خیال کرتے تھے کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کا دن نہایت ہی قابل احترام ہے۔ یہودیوں پر اس کی تعظیم واجب ہے اور اسلام اس کی بے حرمتی کا حکم نہیں دیتا۔ اسی طرح شریعت موسوی میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام ہے اور اسلام اس کا کھانا لازمی قرار نہیں دیتا۔ تو اگر ہم ہفتہ کا احترام بدستور کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت حسب سابق نہ کھائیں تو شریعت موسوی اور اسلام دونوں پر عمل ہو جائے گا۔ یہی منافقین کا حال تھا کہ وہ اسلام کے بعض احکام پر عمل کر کے مسلمانوں پر اپنا اسلام ظاہر کرنے کی کوشش کرتے اور جب موقع ملتا تو وہ کافروں کے ساتھ مل کر ان کو خوش کر دیا کرتے تھے۔ ایسی دوغلی پالیسی ہی کو ختم کر دینے کے لئے حکم دیا گیا کہ اسلام میں کیا نہیں ہے جس کے لئے تم دوسرے ادیان کا سہارا لیتے ہو۔ یہ مکمل دین ہے زندگی کے ہر شعبے کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد تم اپنے

دل ودماغ سے دیگر ادیان پر عمل کا وہم وگمان تک نکال دو۔ اور اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

ہمارے دور میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جن کے سروں پر ماڈرن ازم کا بھوت سوار رہتا ہے۔ وہ سود کو تجارت کا جز ولاینفک سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر شعبہ تجارت میں ترقی ممکن ہی نہیں۔ رشوت کو اپنا حق قرار دیتے ہیں۔ جھوٹ، فریب، وعدہ خلافی کو سیاست وتدبیر کہتے ہیں۔ خصوصاً مغربی ممالک میں آباد مسلمانوں کا تو برا حال ہے۔ کلبوں میں ناچنا گانا، شراب، کو صحت وتندرستی کے لئے لازمی تصور کرنا، حرام گوشت کو مجبوری قرار دینا، ان کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ مرد وعورت کا اختلاط، غیر مردوں کا غیر عورتوں سے، غیر عورتوں کا غیر مردوں سے ہاتھ ملانا، عریاں لباس پہننا اور دیگر غیر مسلموں کی حرکتوں کو اپنانا وہ آداب معاشرت میں شمار کرتے ہیں۔ یہی ماڈرن ازم کے متوالے دین کی ہر بات کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اس دین پر عمل کرنے والوں پر قدامت پسندی کا الزام تراشتے ہیں، ٹائی لگا کر، بغیر ٹوپی نماز پڑھنا ان کو پسند ہے۔ رمضان وعید کی تاریخوں کا مہینوں پہلے اعلان ان کا مطالبہ ہے۔ حتی کہ ماڈرن ازم کی ماری ہوئی عورتیں، مردوں جیسے حقوق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ مثلاً اگر مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دیدے تو عورت کو کیوں حق نہیں کہ وہ شوہر کو طلاق دیدے۔ اگر ایک مرد کی شہادت مقبول ہے تو ایک عورت کی کیوں قابل قبول نہیں۔ ماڈرن ازم کے ان دیوانوں کو قرآن خطاب کر رہا ہے کہ ''اے مؤمنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ماڈرن ازم کا یہ خیال شیطان ہی ذہن میں پیدا کرتا ہے تا کہ اہلِ ایمان کو وہ دین سے دور کر دے وہ انسان کا دوست نہیں کھلا دشمن ہے۔ بڑے پرکشش انداز میں برائیوں کو پیش کرتا ہے۔ اللہ کے بندوں کو ان کا عادی بناتا ہے۔ وہ شیطان کے مکروفریب میں مبتلا ہو کر انسانی اقدار تک سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بے حیاء وبے شرم ہو کر جانوروں جیسی زندگی کو پسند کرنے لگتے ہیں۔

اسلام مکمل نظام حیات ہے

جو نام نہاد ماڈرن ازم سے مؤمن کو بچا کر حقیقی ترقی اور فلاح وبہبود کی منزل دکھاتا ہے۔ اس کا پیش کردہ طریقہ معاش وتجارت، سود، دھوکا، جھوٹ اور مکروفریب سے پاک ہے۔ اس کے عطا کردہ اصول سیاست کی بنیاد تدبیرِ مدن شہروں اور ملکوں کی ترقی، قوم کی آسودگی وخوشحالی کی تدابیر اختیار کرنے پر ہے۔ اس کا تعلیم کردہ اندازِ حکومت ملک کی فلاح وبہبود، قوم میں خودداری کے جذبات بیدار کرنے، ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لئے کامیاب ترین انداز ہے۔ اسلام جس طرح بندوں کو مالک سے معاملہ ٹھیک رکھنے، اس کی عبادت کرنے کا حکم دیتا ہے اسی اہمیت کے ساتھ بندوں کو آپس میں اپنے معاملات ٹھیک کرنے اور ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ امیروں کو غریبوں کا نگہبان ٹھہراتا ہے کہ وہ زکوٰۃ، صدقہ وخیرات کی صورت میں غریبوں پر اپنی دولت صرف کریں۔ انہیں تنگدستی، جہالت کی زندگی سے نجات دلائیں۔ ارتکازِ دولت کا رجحان ایک لعنت ہے جس سے معاشرے میں غربت وجہالت بڑھتی اور ضرورت مندوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر نظام اس کے خاتمہ کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن امیروں سے دولت چھیننے کے قانون تو نافذ ہوتے ہیں مگر غریبوں میں اس کو منتقل کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ نتیجتاً عام امیروں کی دولت چھنتی ہے اور باقتدار امیر کھاتے ہیں اور زیادہ دولت مند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسلام بڑی ہی حسن تدبر کے ساتھ امیروں سے دولت نکالتا ہے اور غریبوں میں تقسیم

کا حکم دیتا اور اس کا انتظام کرتا ہے۔ زکوٰۃ، عُشر، قربانی، صدقہ وخیرات، وراثت یہ دولت مندوں سے دولت نکالنے کے ذرائع ہی ہیں۔ اور ان کے مصارف کا تعین اور حکام کو اس کی نگرانی کا ذمہ دار ٹھہرانا اس دولت کو حق داروں تک پہنچانے ہی کا اہتمام ہے۔ اسلام جس طرح بندوں کو اللہ سے رشتہ مضبوط کرنے کا حکم دیتا ہے اسی اہتمام سے بندوں کو باہمی صلہ رحمی کے احکام بھی دیتا ہے۔ والدین کو اولاد کی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اولاد پر والدین کی زندگی تک ہی نہیں بلکہ مرجانے کے بعد بھی ان کے حقوق کی تعلیم دیتا ہے۔ مرد وعورت، شوہر و بیوی کو مساوی حقوق دیتے ہوئے ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کا تعین کرتا ہے۔ بھائی، بہن دوسرے رشتہ داروں، پڑوسیوں معاشرے کے دیگر افراد حتی کہ غیر مسلموں کے درمیان میل جول کی حدود مقرر کرتا ہے۔ اسلام عدل وانصاف کا علمبردار ہے حتی کہ اپنے ماننے والوں کو بھی غیر مسلموں کے ساتھ کسی نازیبا، غیر اخلاقی حرکت کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام انسانی حرمت وعظمت کا محافظ ہے حتی کہ کسی غیر مسلم مقتول کی لاش کی بے حرمتی بھی گوارا نہیں کرتا۔ اسلام حاکم ومحکوم کے درمیان ایسا قُرب چاہتا ہے جس سے ملک میں امن وامان رہے۔ حکام کو حکم دیتا ہے کہ وہ رعایا کے لئے اپنے دروازے بند نہ کریں اور عوام کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے حکام کی اطاعت و فرمانبرداری کریں۔ جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے مطیع وفرمانبردار رہیں۔ اور اگر حکام غیر مسلم ہوں تب بھی ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ جب تک وہ مسلم رعایا کے دین میں مداخلت نہ کریں۔ حکام، عوام کا حق ادا کریں اور عوام حکام کی اطاعت کریں۔ تو ملک کبھی بدامنی کا شکار نہیں ہوسکتا۔ اللہ اکبر، غور کیجئے اسلام کے احکام وقوانین پر اور ان کی افادیت پر تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں مسلم بنایا۔ تو آپ کو آفاقی اور انسانی نظام کا فرق معلوم ہوگا۔ اگر مؤمن اسلامی نظام، اسلامی شریعت، کو اچھی طرح جان لے تو وہ کبھی کسی دوسرے نظام کی طرف نظر نہ اٹھائے۔ اسلامی نظام کی خوبیوں کے سامنے اسے دنیا کا ہر نظام حقیر نظر آنے لگے گا۔ ماڈرن ازم کے پوجاری، آپ کو ایسے ہی مسلمان نظر آئیں گے جو اپنی شریعت، قرآن وحدیث کے احکام، سے ناواقف اور جاہل ہیں۔ طُرفہ یہ ہے کہ اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ خود اپنا ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں۔ جب کہ اس کے صحیح ہونے کی ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہوتی چونکہ وہ اپنے نظریہ کا تحفظ دلائل سے نہیں کر پاتے لہٰذا علماء دین سے دور رہتے ہیں، ان سے نفرت کرتے ہیں، ان کو قدامت پسند، رجعت پسند، فرسودہ ذہنیت رکھنے والے اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ کتنا ظلم کرتے ہیں یہ اپنے اوپر اپنی اولاد پر اپنے متعلقین پر۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اسلام سے دوری، اسلامی تہذیب سے نفرت ان لوگوں میں صرف عیش وعشرت اور آرام کے دنوں تک ہی رہتی ہے۔ جونہی ان پر اللہ کی لاٹھی برستی ہے ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ جب ان کی فیشن پرستی ان کے لئے وبال جان بن جاتی ہے تو انہیں ہوش آتا ہے۔ کبھی تو یہ وبال ان پر اس طرح آتا ہے کہ اس کا گھر برباد ہوجاتا ہے۔ اولاد آوارہ ہو جاتی ہے۔ بیٹا، بیٹی ساری ساری رات گھر سے غائب رہتے ہیں اور ماں باپ کو یہ پوچھنے تک کا حق نہیں دیتے کہ تم ساری رات کہاں رہے۔ کبھی بیٹا اپنی مرضی سے شادی رچا کر ماں باپ کے سارے ارمان روند ڈالتا ہے تو کبھی بیٹی گھر سے بھاگ جاتی اور خاندان کی عزت وآبرو کو پامال کر دیتی ہے۔ کبھی فیشن ایبل شوہر کی ماڈرن بیگم دوسروں کے ساتھ ناچتی اور شوہر صاحب کو حق اعتراض تک نہیں دیتی ہے۔ اور کبھی ان پر قدرتی آفات عبرتناک انداز میں آتی ہیں تو ماڈرن ازم کا بھوت سر

سے نکلتا ہے۔ اب مصلیٰ یاد آتا ہے، عالموں کا خیال آتا ہے۔ یہ بندہ جو دین کو قدامت پسندی قرار دیتا تھا اب ایسا قدامت پسند ہوتا ہے کہ اسی میں پناہ لیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا قرآن کریم حال بیان فرماتا ہے:

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۝ (حٰم السجدہ:۵۱)

اور جب انسان پر ہم انعام کرتے ہیں، تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور جب اسے مصیبت پہنچتی ہے تو (لمبی) چوڑی دعائیں کرنے والا ہو جاتا ہے۔

حضور نبی کریم علیہ السلام کے چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے اور ان کی روشنی میں غور کیجئے کہ اسلام کیسا جامع و کامل نظام حیات ہے، جو مسلمانوں کو پر سکون زندگی مہیا کرنے کے لئے، کیسے کیسے احکام دیتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّ سَبْعُوْنَ شُعْبَةً فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا، ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے بہتر، اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور سب سے کم درجہ کا ایمان کسی کو تکلیف دینے والی چیز کا راستہ سے ہٹا دینا ہے اور شرم و حیا بھی ایمان کی شاخ ہے۔ (بخاری و مسلم)

راستے پر پڑے ہوئے کانٹوں، پتھروں، ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے شیشوں وغیرہ سے چلنے والوں کو کبھی کبھی ایسی تکلیف پہنچتی ہے کہ وہی ان کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ میرے آقا ﷺ ایسی چیزوں کو راستے سے صاف کر دینے کا حکم دیتے ہیں کہ کسی بھی انسان کو، چاہے وہ تمہارا بھائی مسلم ہو یا دشمن غیر مسلم ہو تکلیف نہ پہنچے۔ یہ کوئی دنیوی خدمت یا معمولی کام نہیں بلکہ آپ نے اس کو دین کا ایک جز قرار دیا۔ کہ ایسا کرنے والے کو اللہ اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ اس کی راہ میں آنے والی مصیبتوں کو دور کرے گا، اس کے لئے جنت تک پہنچنے کا راستہ سہل و آسان فرمائے گا۔ کوئی دین ہے جو اس انداز پر انسانیت کی ہمدردی کی تعلیم دیتا ہو۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَ يَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هجرما نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور اصل مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے۔ (بخاری شریف)

مسلمان کے کمال کا ذریعہ صرف عبادات، صدقہ و خیرات ہی پر موقوف نہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ بندوں سے اس کے

معاملات کا صاف وستھرا ہونا بھی ضروری ہے۔جس شخص کے ہاتھ سے یا زبان سے اس کے مسلمان بھائیوں کو تکلیف پہنچتی رہے وہ کتنا ہی عبادات کا پابند کیوں نہ ہو، کامل مسلمان نہیں ہوسکتا۔ بات بہت چھوٹی سی ہے لیکن اس کے مفہوم کی وسعت پر غور کیجئے تو معاشرے میں امن وسکون کے قیام کے مؤثر ترین طریقہ کی تعلیم ہے۔ (بخاری شریف)

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی کامل مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہیں کرتا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(بخاری شریف)

کیا تم اپنے لئے پسند کرتے ہو کہ تمہاری تجارت میں خسارہ ہو۔تمہارا مالی نقصان ہو۔تمہاری عزت وآبرو کو کوئی پامال کرے۔تمہاری ماں، بیوی، بیٹی، بہن پر کوئی بری نظر ڈالے۔تمہاری اولاد کو کوئی تکلیف پہنچائے۔ تمہاری بیٹی کی سسرال والے اسے ستائیں یا طعنے دیں۔تمہارے گھر کے سامنے کوئی اپنا کوڑا، گندگی وغیرہ ڈال دے۔تمہارے کاموں میں کوئی بھی مداخلت کرے۔تم پر کوئی الزام لگائے تمہارے عیب تلاش کیے جائیں اور انہیں اچھالا جائے۔ تمہارا کوئی کام بغیر رشوت کے نہ ہو۔ تمہارا سکون، تمہاری نیند شور وغل گانوں اور باجوں، ریکارڈنگ اور ٹی وی کی اونچی آواز سے برباد ہو۔ تمہارے مکان و جائداد پر کوئی قبضہ کرلے۔تمہیں کھانے پینے کی چیزیں ادویہ ملاوٹ کرکے کھلائی جائیں اور تمہاری صحت، بلکہ زندگی تک خطرے میں پڑ جائے۔تمہاری خریدی ہوئی چیزیں کم تول کر کم ناپ کر تمہیں دی جائیں۔ تمہاری اولاد تمہاری نافرمانی کرے۔تمہارے گھر پر کوئی پتھر برسائے۔تمہاری دوکان، مکان، گاڑی کو کوئی آگ لگائے۔ایسی ہی تکلیف دہ اور باتیں سوچنے ہر ایک چیخ کر بولے گا مجھے ہرگز ہرگز یہ پسند نہیں کہ کوئی مجھے کسی طرح بھی تکلیف پہنچائے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ظالم جو چیز تو اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ اپنے بھائیوں کے لئے کیوں پسند کرتا ہے کہ دن رات تو انہیں تکلیف پہنچاتا ہے اسی لئے میرے آقا ﷺ کی تعلیم ہے کہ" جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسرے کے لئے بھی پسند نہ کرو۔" کہ جس چیز سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے، اسی سے دوسروں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔اگر تم نے اس پر عمل کیا تو تم پکے، کامل مسلمان ہو جاؤ گے۔ معاشرے سے نفرتوں کو مٹانے اور مہذب بنانے کے لئے کس قدر اہم طریقہ بتایا میرے آقا ﷺ نے، آپ نے مزید ارشاد فرمایا:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ بیکار کاموں کو چھوڑ دے۔ (ترمذی شریف)

وقت بچانا، اس کی قدر کرنا انسان کی ترقی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جس کی تعلیم کو اسلام نے اپنی تعلیمات کا ایک

حصہ بنایا۔ ہر وہ کام جس کا حلال ذریعہ معاش یا جسمانی صحت وتندرستی سے تعلق نہ ہو، بیکار ہے۔ مثلاً ناچنا، گانا، گانے سننا، ٹیلیویژن دیکھتے رہنا، راستوں پر کھڑے رہنا یا بیٹھنا۔ دوسروں کے عیب یا برائیوں کو تلاش کرنا، افواہیں پھیلانا، بازاروں گلی کوچوں میں بلاضرورت گھومتے پھرنا۔ یہ تمام لغو اور بیکار کام ہیں۔ جن سے انسان بے وقار ہوتا، مالی نقصانات میں مبتلا ہوتا ہے۔ بری عادتوں اور خصائل کا شکار ہوتا ہے۔ معاشرے کی تباہی کا بیج بنتا ہے۔ پس حضور علیہ السلام ایسے تمام کاموں سے دور رہنے کو اسلام کی، مسلمان کی خوبی قرار دیتے ہیں۔ نیز آپ فرماتے ہیں۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: لوگوں سے ان کی حیثیت کے مطابق سلوک کیا کرو۔ (ابوداؤد شریف)

لوگوں کے مناصب اور ان کے مرتبوں کو نہ پہچاننے والا، کتنا ہی دولت مند ہو، بظاہر عزت والا ہو، اس کو نہ تو مہذب کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے اس کی عزت کرتے ہیں۔ دوسروں کی عزت کرنے والا ہی عزت پاتا ہے اور مہذب کہلاتا ہے۔ اسلام مسلمانوں کو ایک با عزت، مہذب قوم بنانا چاہتا ہے۔ میرے آقا صلى الله عليه وسلم کی تعلیم کا یہ ایک جملہ ہی اس مقصد کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ ''لوگوں سے ان کی حیثیت کے مطابق سلوک کرو'' جو تم سے عمر، مرتبے میں چھوٹے ہیں، ان سے محبت وشفقت کا سلوک کرو، جو تم سے مالی یا جسمانی اعتبار سے کمزور ہیں ان کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کا سلوک کرو، جو تم سے عمر، علم، منصب، مال میں بڑے ہیں ان کا مناسب انداز پر احترام کرو۔ آپ مزید فرماتے ہیں۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ جَآءَ شَیْخٌ یُرِیْدُ النَّبِیَّ صلى الله عليه وسلم فَاَبْطَأَ الْقَوْمُ عَنْهُ اَنْ یُوَسِّعُوْا لَهٗ فَقَالَ النَّبِیُّ صلى الله عليه وسلم لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک بوڑھا شخص حضور علیہ السلام کے قریب پہنچنا چاہتا تھا لوگوں نے اس کو جگہ دینے میں دیر کی (اسے کچھ پریشانی ہوئی، آپ نے دیکھا تو) فرمایا جس نے چھوٹوں پر رحم نہ کیا اور بڑوں کی تعظیم نہ کی، وہ ہم میں سے نہیں۔ (ترمذی شریف)

یعنی چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آنا اور بڑوں کا احترام کرنا مسلمان کی ایک پہچان ہے۔ وہ چھوٹے بڑے کسی بھی اعتبار سے ہوں۔ خاص طور پر بوڑھوں کے متعلق آپ نے فرمایا:

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مَا اَکْرَمَ شَابٌّ شَیْخًا مِّنْ اَجْلِ سِنِّهٖ اِلَّا قَیَّضَ اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَ سِنِّهٖ مَنْ یُّکْرِمُهٗ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: جس جوان نے بوڑھے کی تعظیم کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے، تو اللہ تعالیٰ (اس تعظیم کرنے والے کے لیے) ایسے شخص کو مقرر فرمائے گا جو بڑھاپے میں اس کی تعظیم کرے گا۔ (ترمذی شریف)

بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے اپنی تعظیم کرانے کا ذریعہ ہے۔ جو اپنے ماں، باپ کی تعظیم کرتا، ان کا حکم مانتا ہے اس کی اولاد بھی

اس کی تعظیم اور فرمانبرداری کرتی ہے جو بڑوں سے گستاخی اور بے ادبی سے پیش آتا ہے اس کے چھوٹے بھی اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جس معاشرے میں احترام ومحبت ہوتا ہے اس میں بیشتر اختلافات لڑائی جھگڑے خود بخود ختم ہو جاتے اور معاشرہ پُر امن رہتا ہے اور یہی تو اسلام چاہتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے باہمی نفرتوں کو مٹانے کے لئے فرمایا:

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰى عَصَبِيَّةٍ وَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً وَّ لَيْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ۔

حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی معظم ﷺ نے فرمایا، وہ شخص ہماری جماعت میں نہیں جو لوگوں کو تعصب پر آمادہ کرے اور نہ ہماری جماعت میں وہ ہے جو تعصب کی وجہ سے لڑے اور نہ ہماری جماعت میں وہ ہے جس کی موت تعصب کی حالت میں واقع ہو۔ (ابوداؤد شریف)

عصبیت اور تعصب، معاشرے کا سکون وچین برباد کر دیتا ہے۔ لسانی جھگڑوں، صوبائی جنگوں، قومی وقبائلی لڑائیوں نے ہر دور میں ملکوں کو کمزور کیا۔ قوموں کو تباہ کیا۔ بھرے گھروں کو اجاڑا، تجارتی اور معاشی مسائل پیدا کئے۔ جس معاشرے میں یہ وبا پھوٹ پڑے وہ تہس نہس ہو جاتا ہے۔ اس کے افراد کی کہیں عزت ووقعت باقی نہیں رہتی۔ نبی مکرم علیہ السلام کی بعثت کے وقت اہل مکہ بری طرح اس لعنت میں مبتلا تھے۔ پیغامبر امن ﷺ کی تعلیم اور عمل نے اس کا خاتمہ کیا اور ایسا خاتمہ کیا کہ اوس وخزرج جیسے قبیلوں کے دل ملا دیئے۔ عربی وعجمی کا تخیل ختم فرمادیا۔ مہاجر وانصار کو بھائی بھائی بنایا تو وہ ایک دوسرے پر اپنا جان ومال قربان کرنے لگے۔ کاش آج ہم بھی حضور علیہ السلام کے اس ارشاد پر عمل کریں تو دنیا بھر میں بکھرے ہوئے مسلمان اور پھیلی ہوئی مسلم مملکتیں ایک بڑی قوت بن کر ابھر سکتے ہیں۔ لیکن بُرا ہو اس تعصب کا جس نے ہمیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ کر بے وقار اور بے عزت کر دیا ہے، بھکاری بنا دیا ہے۔

اگر ہم اسی طرح لکھتے رہے تو یہ کتاب احادیث کا مجموعہ بن جائے گی۔ لہٰذا ان چند احادیث پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔ اگر انہی پر بنظرِ غائر غور کیا جائے تو اسلام کی خوبیوں کو جاننے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اللہ ربُّ العزت نے ہمیں وہ نظامِ عمل، نظامِ حیات عطا فرمایا جس کا مقابلہ نہ تو دنیا کا کوئی نظام کر سکتا ہے، اور نہ ان ادیان میں سے کوئی دین کر سکتا ہے جن کے ماننے والے انہیں بلا دلیل آفاقی دین کہتے ہیں۔ پس ایسا دین ہوتے ہوئے در در کی ٹھوکریں کھانا، اغیار کے طریقوں کو اپنانا، اپنی تہذیب وتمدن کے پاکیزہ لباس کو غیروں کی گندی تہذیب سے ملوث کرنا اور اس کو ماڈرن ازم کا نام دینا اس دین متین کے ساتھ غداری نہیں تو اور کیا ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھکاری بننا کیسی بدنصیبی ہے۔ دعوئے ایمان کے ساتھ، اللہ اور اس کے رسول کی مکمل اطاعت وفرمانبرداری سے گریز اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ اور اسی لئے آج ہم پریشان حال ہیں۔ مصائب وآلام کا شکار ہیں۔ آج اسلام صرف مساجد کی چہار دیواری میں ہی نظر آتا ہے۔ بلکہ یہاں بھی ماڈرن ازم کے بہت دلدادہ ٹائی باندھے، ننگے سر سجدوں میں نظر آتے ہیں۔ نہ جانے ایک معمولی سی بات کیوں عقل میں نہیں آتی کہ شریعت کی بغاوت ... بدلے تضیعِ اوقات کے سوا کچھ نہیں۔ بیرونِ مساجد ہمارے گھروں میں اسلام کتنا ہے، یہ سب ہی جانتے ہیں بالخصوص یورپ وامریکہ میں آباد مسلمانوں کی حالت تو نہایت ہی افسوسناک ہے کہ

ان کے ذہنوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ یہاں اسلام پر عمل کرنا ممکن ہی نہیں۔ مسلمانوں کی اسلام سے عملی بغاوت نے ہی زندگی کو ایسا اَجیرن بنا دیا ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہ دن میں چین ہے، نہ رات میں سکون۔ نہ گھر والوں میں عزت ہے نہ باہر والوں میں۔ بس تڑپتے، پھڑکتے جانوروں سے بدتر زندگی کے دن گزر رہے ہیں۔ اس اضطرابی کیفیت سے نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے، کہ مکمل اطاعت و فرمانبرداری سے گریز، اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے، جس سے نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ:

''اے ایمان والو، اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

اے ایمان کی سعادت سے سرفراز فرمانے والے، رب کریم، واسطہ تیرے نبی رحیم ﷺ کا تو اپنے نیک بندوں کی طرح ہمیں بھی اسلام میں پورا پورا داخل ہونے کی توفیق مرحمت فرما۔ آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۸

البقرہ: ۲۵۴

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (البقرہ: ۲۵۴)

اے ایمان والو! خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) اس چیز سے جو ہم نے تمہیں عطا فرمائی۔ اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید وفروخت ہے اور نہ (کافروں کیلئے) دوستی اور نہ شفاعت اور کافر ہی ظالم ہیں۔

اے ایمان والو! یہ دنیا تو دار العمل ہے، یہاں بیج بوؤ اور قیامت میں اس کے پھل حاصل کرو۔ اللہ نے تمہیں جو دولت دی ہے اور اپنے فضل وکرم سے اسے خرچ کرنے کا تمہیں اختیار بھی دیا ہے۔ اسی لئے کہ تم دنیا میں اس سے وہ بیج بوؤ جو آخرت میں تمہارے کام آسکیں۔ کہ قیامت کے دن دنیا میں کی ہوئی نیکیوں، صدقہ وخیرات کے علاوہ کچھ کام نہ آئے گا۔ نہ تو اس دن دنیا جیسی بیع اور خرید وفروخت ہوگی کہ کسی سے نیکیاں خرید کر تم فائدہ حاصل کرسکو۔ نہ اس دن دنیا کے رشتے اور تعلقات کام آسکیں گے اور نہ ہی اللہ کی اجازت کے بغیر تمہاری کوئی سفارش کرے گا۔ پس جو کچھ کرنا ہے دنیا ہی میں کرلو، کافروں جیسی زندگی اختیار نہ کرو، ان کی طرح دولت عیش وعشرت میں برباد نہ کرو۔ وہ تو ظالم ہیں۔ ان کے طرز حیات کو اگر تم

نے اختیار کیا تو تم بھی ظلم کرنے والوں میں ہو جاؤ گے۔ اس آیت مبارکہ میں جو امور قابل وضاحت ہیں وہ یہ ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، لا بیع، جس دن کوئی بیع نہ ہوگی۔ لا خلۃ، جس دن کوئی دوستی نہ ہوگی۔ لا شفاعۃ، جس دن کوئی شفاعت نہ ہوگی۔

انفاق فی سبیل اللہ:

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان اہم اعمال میں سے ایک ہے جس کا ذکر اور تاکید قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہی متقین نیکوں کی جو خوبیاں بیان ہوئیں ان میں سے ایک انفاق بھی ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ (البقرہ:۳)

(قرآن) پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے (ہماری راہ) میں خرچ کرتے ہیں۔

انفاق خرچ کرنا، جس طرح اردو میں عام ہے اسی طرح عربی میں بھی عام ہے۔ یعنی کہیں بھی خرچ کیا جائے، خرچ کرنا ہی ہے انفاق ہی ہے۔ لیکن جو خرچ کرنا متقین کی علامت ہے اور جس خرچ کرنے کا حکم اہلِ ایمان کو دیا گیا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ ''انفاق فی سبیل اللہ'' ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (الانفال:۶۰)

اور اللہ کی راہ میں تم جو کچھ خرچ کرو گے۔ (اس کا اجر) تمہیں پورا، پورا دیا جائے گا۔ اور تم ظلم نہیں کئے جاؤ گے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید:۱۰)

اور تمہیں کیا ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ حالانکہ آسمانوں اور زمینوں کا وارث اللہ ہی ہے۔

ان آیات نے واضح کر دیا کہ اللہ جس انفاق کا اہلِ ایمان سے مطالبہ فرماتا ہے وہ اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد آیات میں فی سبیل اللہ کا جملہ آتا ہے۔ اب خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سبیل اللہ، اللہ کی راہ کون سی ہے، جس میں انفاق، مطلوب اور باعث اجر و ثواب ہے۔ تو حقیقت تو یہی ہے کہ مسلمان کا ہر ایسے کام میں خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو۔ بس نیت کی ضرورت ہے۔ مثلاً کھانے پینے پر خرچ کرنا اس نیت سے کہ اللہ تعالیٰ نے جسم و جان کی حفاظت فرض قرار دی ہے۔ لباس پر خرچ کرنا اس نیت سے کہ اللہ نے ستر پوشی کرنے کا حکم دیا ہے۔ سواری پر خرچ کرنا، اس نیت سے کہ یہ حصول معاش، صلہ رحمی، میل وجول وغیرہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح دیگر تمام ضروریات پر غور کیجئے اور ان پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کو اپنی نیت کے خلوص سے آپ انفاق فی سبیل اللہ بنا لیجئے۔ اور اللہ کی طرف سے اس پر اجر و ثواب کا یقین رکھئے کہ مسلمان کا ہر عمل جو شریعت کے خلاف نہ ہو خلوص نیت کے ذریعہ عبادت بن جاتا ہے۔ اور اگر کوئی

لمبے لمبے سجدے کرے لیکن نیت میں فتور ہو کہ لوگوں پر اپنے تقوے کا اظہار مقصود ہو تو یہ سجدے ہی کیا، ہر عمل جو نام ونمود اور دنیوی مقصد کے لئے کیا جائے عنداللہ مردود ہے۔ اس پر نہ کوئی اجر ہے اور نہ ثواب۔ بہرحال خلوص نیت کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے ہمارا ہر خرچ انفاق فی سبیل اللہ ہے، تائید کے لئے بطور مثال نبی مکرم علیہ السلام کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ دِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ رَقَبَةٍ وَّ دِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰی مِسْكِيْنٍ وَّ دِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِیْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ایک دینار ہے جس کو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ایک دینار ہے جس کو تم غلام آزاد کرنے پر خرچ کرو اور ایک دینار ہے جو تم نے کسی غریب پر خرچ کیا اور ایک دینار ہے جس کو تم اپنے گھر والوں پر خرچ کرتے ہو۔ ان سب میں ثواب کے اعتبار سے وہ دینار سب سے بڑا ہے، جس کو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔ (مسلم شریف)

مطلب یہ کہ اگرچہ یہ تمام اخراجات باعث ثواب ہیں۔ لیکن اہل خانہ پر خرچ کرنے کا ثواب زیادہ ہوتا ہے کہ یہ وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے جس سے آدمی اپنی ذمہ داری کو اس لئے پورا کرتا ہے کہ اللہ نے اسے اہل خانہ کا کفیل بنایا ہے۔ قرآن کریم بھی ایسے لوگوں پر انفاق کا حکم دیتا ہے۔ جن کی کفالت اور تعاون آپ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ فرمایا گیا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ (البقرہ:۲۱۵)

وہ (اے حبیب) آپ سے پوچھتے ہیں، کیا خرچ کریں۔ آپ فرما دیجئے۔ تم جو مال (بھی) خرچ کرو تو (وہ) ماں باپ، قریبی رشتہ داروں، یتیموں محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے اور تم جو نیکی کرو تو بیشک اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

غور فرمایا، آپ نے کہ انفاق کی ابتداء والدین سے کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کہ انسان پر سب سے مقدم انہی کا حق ہے۔ ان کی نگہداشت ان کی خدمت اوّلین فریضہ ہے۔ ان کے بعد دوسرے اعزاء پر خرچ کا حکم دیا گیا۔ اولاد، بہن، بھائی، چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ وغیرہ اس کے بعد حق ہے باہر کے لوگوں کا۔ ان میں سب سے مقدم قوم کے یتیم بچے ہیں جو قوم کا کمزور ترین لیکن نہایت ہی اہم حصہ ہیں۔ کہ یہ سب سے زیادہ تعاون کے محتاج ہوتے ہیں کہ اگر ان کی طرف سے لاپرواہی برتی گئی، ان کی صحت تعلیم وتربیت کا خیال نہ کیا گیا۔ تو یہ پوری قوم کی پریشانی اور زوال کا سبب بن سکتے ہیں۔ پھر مسکینوں، مسافروں پر خرچ کیا جائے، گویا ابتداء گھر سے کرو۔ پہلے اپنے اہل خانہ وخاندان کی خوشحالی کی فکر کرو۔ پھر قومی ذمہ داری پوری کرؤ گھر والوں کو پریشان حال چھوڑ کر قومی خدمات انجام دینا رفاہی کاموں میں حصہ لینا نہ عقلمندی ہے اور نہ ہی اللہ اور رسول کا حکم۔

بہرحال انفاق کے معنی بہت ہی وسیع ہیں شرعی حدود میں رہتے ہوئے جس پر بھی خرچ کیا جائے، وہ اللہ ہی کی راہ میں خرچ کرنا کہلائے گا۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ دینی اور مذہبی کاموں پر خرچ کرنے کو عام طور پر انفاق کہا جاتا ہے۔ مثلاً

مدارس کے اخراجات پورے کرنا، علماء اور مبلغین کا تعاون کرنا، مساجد کی تعمیر میں حصہ لینا، غریبوں کو کھانا کھلانا، کپڑے پہنانا وغیرہ۔

کتنا خرچ کیا جائے:

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خرچ کیا جائے اور کتنا خرچ کیا جائے تو اس کا جواب ''مما رزقنکم'' میں موجود ہے کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے خرچ کرو، رزق کے لغوی معنی ہیں:

اَلنَّصِيْبُ وَ الْعَطَايَا يُطْلَقُ عَلَى الْحِسِّيِّ وَ الْمَعْنَوِيِّ

(ضیاء القرآن)

حصہ اور بخشش چاہے حسی ہو یا معنوی

یعنی کسی کو کچھ دینا وہ عطیہ نظر آتا ہو یا نظر نہ آئے۔ اس اعتبار سے مال، اولاد، علم، معرفت سب ہی رزق ہیں۔ اللہ کی رضا کے لیے مال دینا بھی انفاق، اللہ کی رضا کے لیے اولاد وقف کر دینا مثلاً دینی تعلیم دلانا، جہاد کے لیے اسلامی فوج میں بھرتی کرا دینا یہ بھی انفاق، اللہ کی رضا کے لئے اس کے عطا کردہ علم سے دین کی تبلیغ و اشاعت کرنا بھی انفاق اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کو معرفت و حکمت کی تعلیم دینا، روحانی تربیت کرنا یہ بھی انفاق۔ پس رزق کے معنی بھی بہت وسیع ہیں کہ اللہ کی دی ہوئی ہر چیز کو اللہ کی مرضی کے لئے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق خرچ کرنا ''انفاق فی سبیل اللہ'' میں شامل ہے۔ جیسا کہ نبی مکرم علیہ السلام کی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے۔ آپ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

عَنْ جَابِرٍ وَّ حُذَيْفَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ

حضرت جابر و حذیفہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ہر نیک کام صدقہ ہے۔

(بخاری و مسلم)

عَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَلَوْ اَنْ تَلْقٰى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تم کسی نیک کام کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ وہ کسی بھائی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا ہی کیوں نہ ہو۔

(مسلم شریف)

عَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةٌ وَ كُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ وَّ كُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ وَّ كُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ وَّ اَمْرٍ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَّ نَهْيٍ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَّ فِىْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيَاْتِىْ اَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَ يَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا اَجْرٌ قَالَ اَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِىْ حَرَامٍ كَانَ عَلَيْهِ فِيْهِ وِزْرٌ فَكَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِى الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ اَجْرٌ۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: تسبیح، تکبیر، تحمید اور تہلیل صدقہ ہیں۔ اسی طرح نیک بات کی ترغیب اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے۔ بیوی کے ساتھ عمل زوجیت

بھی صدقہ ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ، انسان اپنی شہوت پوری کرتا ہے تو اس میں بھی اس کو اجر ملتا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر وہ حرام جگہ اپنی شہوت پوری کرے تو کیا اس کو گناہ نہ ہوگا، تو حلال عمل سے اس کو ثواب کیوں نہ ہوگا۔ (مسلم شریف)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَاْكُلُ مِنْهُ اِنْسَانٌ اَوْ طَيْرٌ اَوْ بَهِيْمَةٌ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ صَدَقَةٌ

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیت بوتا ہے اور اس سے کوئی انسان یا پرندہ یا چرندہ فائدہ حاصل کرتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

ان تمام روایات کو سامنے رکھیے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مسلمان کا ہر عمل صدقہ ہوتا ہے۔ یعنی اسے ہر نیک کام پر انفاق فی سبیل اللہ کا اجر و ثواب ملتا ہے۔ لیکن قرآن کریم جس انفاق کا مطالبہ کر رہا ہے اس سے مقصود، اللہ کی راہ میں دولت خرچ کرنا ہے کہ یہی انسان کی اللہ کی راہ میں بڑی قربانی ہے۔ کیونکہ فطری طور پر انسان کو دولت سے بڑی محبت ہوتی ہے اور انفاق یا خرچ کرنے کا لفظ عام طور پر دولت خرچ کرنے ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دولت کی محبت دل سے نکال دینا اور اسے ایسے کاموں پر خرچ کرنا جن سے بظاہر اپنی ذات کا کوئی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔ انفاق فی سبیل اللہ ہے جو ایک بڑی قربانی ہے اور جس کا اجر و ثواب بھی بہت عظیم ہے۔ یہ قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام بالخصوص، سید الانبیاء ﷺ کی سنت ہے۔ صالحین کا وطیرہ ہے اس سے معاشرے میں فتنہ و فساد کا خاتمہ ہوتا کہ اکثر جرائم کا سبب غریبوں کی بھوک ہے۔ اگر اللہ کے نام پر دولت نکالی جائے اور نظم کے ساتھ اس سے غربت و جہالت کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جائے تو ہماری تاریخ شاہد ہے کہ مسلم معاشرے میں کوئی فرد نہ بھوکا سوتا ہے نہ کوئی جاہل نظر آتا ہے۔ اسلام کے دیگر احکام کی طرح ''انفاق فی سبیل اللہ'' بھی درحقیقت معاشرے کی اصلاح اور اس کو پرسکون بنانے کی ایک تدبیر ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی نظام میں نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کیا جائے تو حق تو یہ تھا کہ رب کا سب کچھ دیا اسی کی راہ میں لٹا دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام نے کر دکھایا، لیکن دینے والا بڑا کریم ہے وہ نہ تو وسعت سے زیادہ مکلّف کرتا ہے اور نہ ہی دشواری میں مبتلا کرتا ہے۔ اس نے ''مِمّا'' کا مطالبہ فرمایا۔ کہ ہمارے دیئے ہوئے میں سے کچھ، دوسری جگہ مزید وضاحت کے ساتھ ارشاد ہوا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرہ:۲۱۹)

(اے حبیب) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

''عفو'' یعنی جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اللہ کے لئے خرچ کرو۔ یہ ارشاد مژدہ و خوشخبری ہے ان غریبوں کے لیے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن استطاعت نہ ہونے کے باعث تڑپ کر رہ جاتے ہیں کہ جب اللہ نے تمہیں ''عفو'' ضروریات سے زیادہ دیا ہی نہیں تو تم کیوں تڑپتے ہو۔ تم سے انفاق کا مطالبہ ہی نہیں اور یہ تنبیہ ہے ان دولت مندوں

کے لئے جن کے پاس لاکھوں کی مقدار میں ''عفو'' ضرورت سے زیادہ مال ہے لیکن پھر بھی وہ ظالم اپنے پڑوس کے بھوکے تک کی ضرورت کا احساس نہیں کرتے۔ اگر ان کے در پر کوئی مصیبت کا مارا آ بھی جائے تو انہیں بہت ہی ناگوار ہوتا ہے۔ کیسا اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں سب کچھ خرچ کر دینے کا حکم نہ دیا۔ جبکہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے۔ پھر بھی ہم اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے یہ ہماری بڑی ہی بدنصیبی ہے، دینے والا رب ہمیں انفاق کا حکم بھی کیسے پیارے انداز میں دیتا ہے۔ وہ بندوں کو خود ہی دیتا ہے اور پھر ان سے قرض مانگتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (البقرہ:۲۴۵)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو اللہ اسے بڑھا کر، اس کے لئے کئی گنا کر دے اور اللہ ہی تنگی اور فراخی کرتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ (الحدید:۱۱)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو اللہ اسے بڑھاتا رہے اسی کیلئے اور اس کے لئے عزت کا اجر ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (التغابن:۱۷)

اگر تم اللہ کو اچھا قرض دو تو وہ اس کو تمہارے لئے دوگنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ نہایت ہی قدر رداں، بہت حلم والا۔

دولت کے لالچی دنیا والوں کو قرض دیتے ہیں اور اس پر سود کے چند ٹکے کما کر حرام کھاتے ہیں۔ قرض دینے کا مزا اللہ کو ہے، جو اگر چہ تمہاری دولت کا محتاج نہیں وہ تو خود اپنے خزانہ سے جسے چاہتا ہے بغیر حساب عطا فرماتا ہے۔ رزق کی فراخی یا تنگی اسی کے قبضہ میں ہے۔ وہ رب تم سے قرض مانگتا ہے تمہارے ہی فائدے کے لیے تم اسے قرض دو، وہ اس پر بے حساب منافع دے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا۔ یہ بے حساب منافع صرف قیامت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی ملتا ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا کبھی محتاج و تنگدست نہیں ہوتا جتنا خرچ کرتا ہے اتنی ہی اس کی دولت میں برکت ہوتی ہے۔ غور فرمایئے، حضور نبی کریم علیہ السلام کے ارشادات پر۔

عَنْ اَسْمَآءَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْفِقِیْ وَلَا تُحْصِیْ فَیُحْصِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ وَ لَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ اَرْضَخِیْ مَا اسْتَطَعْتِ۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، بے حساب خرچ کرو اللہ تمہیں بے حساب عطا فرمائے گا۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز نہ کرو ورنہ اللہ تم پر روک دے گا جتنی استطاعت ہو صدقہ کرو۔ (بخاری و مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْفِقْ یَابْنَ اٰدَمَ

اُنْفِقْ عَلَیْکَ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ کا ارشاد ہے، اے ابن آدم خرچ کر تجھ پر فراخی کی جائے گی۔ (بخاری ومسلم)

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَا ابْنَ اٰدَمَ اَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَیْرٌ لَّکَ وَ اَنْ تُمْسِکَهٗ شَرٌّ لَّکَ وَلَا تُلَامُ عَلٰی کَفَافٍ وَّ ابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ضروریات سے زیادہ مال خرچ کرنا تیرے حق میں بہتر ہے اور اگر تم اس کو خرچ نہ کرو گے تو یہ تمہارے لئے بہتر نہیں اور حد اعتدال تک خرچ کرنے میں تجھ کو برا نہ کہا جائے گا اور اس سے شروع کرو جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہے۔
(مسلم شریف)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ السَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰهِ بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ وَ الْجَاهِلُ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے سخی اللہ سے قریب، جنت سے قریب اور لوگوں کے قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے۔ جب کہ بخیل اللہ سے دور، جنت سے دور اور لوگوں سے دور ہے اور سخی جاہل اللہ کو، عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہے۔ (ترمذی شریف)

سبق آموز واقعہ

ایک نہایت ہی سبق آموز واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ اس سے عبرت حاصل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ یہ بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا واقعہ بیان فرمایا۔ ان میں سے ایک کوڑھی تھا، دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمانے کا ارادہ کیا تو ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔ یہ فرشتہ پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ تجھے کون سی چیز بہت اچھی معلوم ہوتی ہے وہ کہنے لگا اچھا رنگ اور صحت مند جسم میری خواہش ہے کہ مجھے اس بیماری سے نجات مل جائے۔ اور لوگوں کی نفرت بھری نظروں سے محفوظ ہو جاؤں (کہ لوگ اس بیماری کی وجہ سے مجھ سے نفرت کرتے ہیں) حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ فرشتے نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس کا رنگ صاف ہو گیا۔ جلد ٹھیک ہو گئی اور بالکل تندرست ہو گیا۔ فرشتے نے اس سے سوال کیا کہ تمہیں کون سا مال پسند ہے اس نے کہا اونٹ۔ فرشتہ نے اس کو دس ماہ کی حاملہ اونٹنی دے کر کہا لو اللہ تمہیں اس میں برکت دے۔ پھر یہ فرشتہ گنجے کے پاس آیا، اس سے پوچھا تمہیں کیا چیز پسند ہے اس نے کہا میری آرزو ہے کہ میرا گنج ختم ہو جائے اور میرے سر پر خوبصورت بال نکل آئیں۔ فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کا گنج جاتا رہا اور

یہ پیغام ان کے پاس ...

... فرشتے نے اس سے سوال کیا تمہیں کون سا مال پسند ہے۔ وہ بولا مجھے گائے پسند ہے۔ فرشتے نے اس کو ایک حاملہ گائے دی اور کہا اللہ تمہیں اس میں برکت دے۔ پھر فرشتہ اندھے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا تمہیں کیا پسند ہے۔ وہ بولا ... اللہ نظر عطا فرما دے۔ فرشتے نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ دیکھنے لگا۔ فرشتے نے اس سے بھی پوچھا تمہیں کون سا مال پسند ہے۔ اس نے کہا مجھے بکری پسند ہے۔ فرشتے نے اس کو ایک حاملہ بکری دی اور کہا لو اللہ تمہیں اس میں برکت دے۔ ان تینوں جانوروں میں خوب برکت ہوئی۔ اونٹنی والے کے پاس ایک جنگل اونٹوں سے بھر گیا۔ گائے والے کا ایک جنگل گائیوں سے بھر گیا۔ بکری والے کا ایک جنگل بکریوں سے بھر گیا۔ (یہ تو اللہ کا کرم ہوا جسے دینا چاہے وہ ایسے ہی دیتا ہے۔ اب ان کی آزمائش کا آغاز ہوتا ہے) فرشتہ پہلے شخص کے پاس کوڑھی بن کر پہنچا اور کہنے لگا میں غریب ہوں، معذور ہوں، سفر میں میرا تمام سامان ختم ہو گیا۔ اللہ کے سوا میرا کوئی نہیں میں تم سے اس اللہ کے نام پر سوال کرتا ہوں جس نے تمہیں ایک اچھا رنگ، اچھی جلد اور ان بے شمار اونٹوں سے نوازا۔ مجھے صرف ایک اونٹ دے دو۔ تاکہ میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں۔ وہ بولا مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں (میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا) فرشتے نے کہا میں نے تجھے پہچان لیا، تو وہ کوڑھی ہے جس سے لوگ نفرت کرتے تھے، اللہ نے تجھ پر کرم کیا اور یہ سب کچھ عطا فرما دیا۔ وہ بولا نہیں ایسا نہیں۔ یہ مال و دولت تو میرے باپ دادا کا چھوڑا ہوا ہے، جس کا میں وارث بنا۔ (آج کل کے دولت مند بھی کچھ ایسا ہی جواب دیتے ہیں، مال و دولت کے نشے میں اپنی اوقات بھول جاتے ہیں) فرشتے نے کہا اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تجھے ویسا ہی کر دے، اب فرشتہ گنجا بن کر دوسرے کے پاس پہنچا اس سے بھی ویسی ہی گفتگو کی۔ گنجے نے بھی کوڑھی جیسا جواب دیا۔ فرشتے نے اس سے بھی کہا کہ اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تجھے پہلا جیسا ہی کر دے۔ پھر فرشتہ اندھا بنا اور تیسرے شخص کے پاس آیا اور اس سے کہا میں غریب مسافر ہوں۔ میرا سب سامان ختم ہو گیا۔ آج میرا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ میں تم سے اس اللہ کے نام پر سوال کرتا ہوں جس نے تمہیں نظر لوٹائی۔ بکریاں دیں۔ میری مدد کر دو تاکہ میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں۔ اس نے کہا بیشک میں اندھا تھا، اللہ نے مجھے نظر عطا کی، پس تم جو چاہو لے لو اور جو چاہو چھوڑ دو۔ خدا کی قسم اللہ کے لیے تم جو کچھ بھی مانگو گے، میں انکار نہ کروں گا۔ تب فرشتے نے کہا، تمہارا مال تمہیں مبارک ہو۔ میں تو تمہارا امتحان لینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ پس اللہ تم سے راضی ہوا۔ اور تمہارے ساتھیوں سے وہ ناراض ہوا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ ذریعہ برکت ہے

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق بڑی نعمت ہے۔ قُرب الٰہی، رحمت الٰہی کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ دولت مندوں کو چاہیے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم اور دیگر دولت مند صحابہ کی زندگی کا مطالعہ کیا کریں اور ان کی طرح اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ انفاق فی سبیل اللہ، ایک بڑا ہی سود مند سودا ہے۔ دنیا کا کوئی سودا اس کے برابر منافع بخش نہیں ہو سکتا۔ کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہی رہتا ہے۔ کتنا یہ اللہ کے فضل اور خرچ کرنے والے کی نیت کے خلوص پر موقوف ہے۔ وعدہ الٰہی یہی ہے کہ وہ خرچ کرنے والے کے مال کو بڑھاتا ہے، اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرتا۔ ایک مثال کے طور پر بتایا گیا کہ ایسے لوگوں کو کتنا نفع ہوتا

ہے۔اللہ فرماتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ (البقرہ:۲۶۱،۲۶۲)

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کی سی ہے جس نے سات بالیں اگائیں، ہر بال میں سو دانے ہیں، اور اللہ بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہے اور اللہ بڑی وسعت والا بہت علم والا ہے۔

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر دینے کے بعد نہ احسان جتائیں اور نہ تکلیف دیں ان کے لیے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ایک دانے کی سات بالیں، ہر بال میں سو دانے یہ تو ایک مثال ہے ہم تو اس کے امیدوار ہیں کہ "اللہ بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہے" اور اس کے کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے" نیز اس کے کہ "خرچ کرنے والوں پر نہ کوئی خوف ہے نہ غم" کیسی بخشش ہے۔

انفاق امیر و غریب دونوں کے لیے ہے

انفاق کی ذمہ داری اگرچہ زیادہ تر دولت مندوں ہی پر ہے کہ ان کے لیے یہ نیکی آسانی ہے۔ لیکن اس حکم میں امیر و غریب سب شامل ہیں۔ غریبوں کے پاس جو کچھ ہے وہ بھی اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اس نیک عمل کا اجر عظیم حاصل کر سکتے ہیں، کہ اللہ کے نزدیک مقدار کی زیادتی ہی قابل قبول نہیں بلکہ کیفیت اور خلوص کی زیادہ قدر ہے۔ نیز انفاق ایک ایثار ہے، قربانی ہے اور ایثار و قربانی میں انسان کو جو تکلیف ہوتی ہے وہی ذریعہ اجر و ثواب ہے۔ ایک امیر کو ہزاروں خرچ کر کے وہ تکلیف نہیں ہوتی جو ایک غریب کو دس، بیس خرچ کر کے ہوتی ہے۔ پس غریب کو کم خرچ کر کے بھی زیادہ اجر کی امید رکھنا چاہیے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ (التوبہ:۱۲۱)

اور وہ نہیں خرچ کرتے کوئی چھوٹا خرچ، اور نہ بڑا اور نہیں طے کرتے (اللہ کی راہ میں) کوئی میدان مگر ان کے لیے لکھ دیا جاتا ہے۔ تاکہ اللہ بدلہ دے ان کاموں کا جو وہ کرتے تھے۔

چھوٹا خرچ غریبوں کی طرف سے ہو یا بڑا خرچ امیروں کی طرف سے، سب لکھا جاتا ہے سب کا اجر ملے گا۔ نبی محبُّ الفقراء والغرباء ﷺ نے غریبوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تعلیم کے لئے ارشاد فرمایا:

عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا آگ سے بچو، خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی خرچ کر کے۔ (بخاری شریف)

یعنی اگر کسی کے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے تو وہ ایک کھجور کا ٹکڑا ہی اللہ کی راہ میں خرچ کردے وہی اس کے لئے جہنم کی آگ سے نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ کھجور کے ٹکڑے کی جگہ آپ اپنی زبان میں اس کو روٹی کا ٹکڑا کہہ لیجئے، بہر حال غریبوں میں بھی '' انفاق فی سبیل اللہ'' کی عادت ہونی چاہیے، اپنی غربت کو بہانہ بنا کر ایسی عظیم عبادت سے محروم رہنا بڑی ہی بدنصیبی ہے۔

عوامی چندہ

جب دینی امور مثلاً مساجد و مدارس کی تعمیر، تبلیغ اسلام کے لیے جلسوں وغیرہ کے اہتمام کے لئے دولت کی ضرورت پیش آئے تو مناسب و بہتر یہ ہے کہ منتظمین صرف امیروں اور دولت مندوں کے دروازے نہ کھٹکھٹائیں بلکہ عام چندہ وصول کرنے کا انتظام کریں تا کہ اس میں غریب بھی شریک ہوسکیں اور دولت مند بغیر احسان جتلائے اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لیں۔ کیونکہ صرف امیروں کے سہارے اگر چہ کام تو سہل ہو جاتا ہے جلدی ہو جاتا ہے لیکن ہمارا وسیع مشاہدہ کہ اس کے اثرات بہت برے ہوتے ہیں۔ مثلاً دولت مند، دین کے لئے چندہ کرنے والوں کو حقیر اور بھکاری سمجھنے لگتے ہیں۔ جیسا کہ آج کل علماء کے ساتھ ہو رہا ہے، کہ جو علماء اپنی ذمہ داری سمجھ کر دینی مدارس کے لئے دوکان، دوکان جا کر چندہ کرتے ہیں ان کا چندہ دہندگان کی نظروں ہی میں نہیں بلکہ پوری قوم میں کوئی وقار باقی نہیں رہتا۔ ان کی وجہ سے پورے طبقہ علماء پر طعن کیا جاتا اور انہیں چندہ خور کہا جاتا ہے یہ ایک نہایت ہی عظیم مذہبی سانحہ ہے جس کی وجہ سے علماء کو تبلیغی اور دین امور کی انجام دہی میں بڑی مشکلات کا سامنا ہے کہ آج کا دولت مند ہر ایک کو خوشی سے پیسہ دینے کو تیار ہے۔ سوائے علماء کے، نیز اگر تنہا ایک دولت مند کوئی مسجد تعمیر کرا دیتا ہے تو اس کی نسلیں تک مسجد کے نمازیوں اور امام پر اپنی فوقیت و برتری کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ ہر موقع پر یہی کہتا نظر آتا ہے کہ اس مسجد میں میرا حکم چلے گا کیونکہ اس کی تعمیر میں نے یا میرے باپ نے یا دادا نے کرائی ہے اور سب ہی کو غلاموں کی طرح اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے حتی کہ امام صاحب بھی صرف اسی کی نہیں بلکہ کسی بھی دولت مند کی غلط روی کی شرعی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اور جو ہمت کرتے ہیں وہ ملازمت سے برطرف کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسے کئی واقعات میرے مشاہدے میں ہیں۔ پھر جہاں تمام مذہبی کام دولت مندوں کی دولت سے ہوتے ہیں وہاں کے غریبوں میں خودی، خودداری، حق کی حمایت جیسی خوبیاں ختم ہو جاتی ہیں جو قومی وقار، معاشی اور معاشرتی زندگی کے لئے لازمی ہیں۔

ہم نے جنوبی افریقہ اور دیگر متعدد ممالک میں دیکھا کہ اکثر مساجد امیروں کی تعمیر کردہ ہیں۔ اور ان کے ماہانہ اخراجات کے بھی وہی کفیل ہیں، جن کے اثرات وہی ہیں جو ابھی ہم نے بیان کئے۔ ان واقعات سے اندازہ لگایئے ایک ذی علم، متقی امام صاحب کو مسجد سے اس لئے نکالا دیا گیا کہ ایک دولت مند جنہوں نے مسجد تعمیر کی اور خود ہی اس کے صدر بھی تھے یہ چاہتے تھے کہ امام صاحب خطبہ و نماز جمعہ کا موقع عرب سے آئے ہوئے ایک شخص کو دیں۔ امام صاحب نے یہ بات مانے

سے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ شخص داڑھی منڈا تھا۔ امام صاحب نے کہا کہ ایسے شخص کے پیچھے نہ تو شرعاً نماز جائز ہے اور نہ ہی اس کو مقتدی گوارا کریں گے۔ بس دوسرے ہی دن امام صاحب کا بستر بوریا گول اور کسی مقتدی کی ہمت نہیں کہ وہ امام صاحب کی حمایت میں آواز اٹھائے۔ اور ملاحظہ ہو ایک مسجد میں ہمیں جمعہ پڑھانے کی دعوت دی گئی۔ دوران تقریر ہماری نظر اگلی صف کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب پر پڑی جو ایک خوبصورت مصلے پر بیٹھے تھے۔ شکل وصورت سے کوئی متقی بھی نظر نہیں آتے تھے جو ہم سوچتے کہ یہ کوئی پیر صاحب ہوں گے۔ حالانکہ کسی پیر صاحب کے لئے بھی صف میں خصوصی مصلیٰ بچھانا جائز نہیں۔ خیر نماز سے فارغ ہوئے تو مزید حیرت اس بات پر ہوئی کہ امام صاحب نے ہم سے کہا حضرت ذرا ادھر تشریف لائیں ان صاحب سے ملاقات کر لیجئے ہم تو مہمان تھے میزبان کے اشارے پر چل دیئے۔ ان صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہم سے مصافحہ کیا، مسکرائے اور ہم اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔ نوجوان تھے لیکن کھڑے نہ ہو سکے۔ ہمیں بڑی تشویش ہوئی یہ کیا چکر ہے، یہ کون بندہ ہے، جس کا اتنا احترام ہوتا ہے۔ امام صاحب ہم سے عمر میں بڑے تھے۔ ہم نے احترام سے پوچھا حضرت یہ داڑھی منڈے کون بزرگ ہیں وہ مسکرائے فرمانے لگے حضرت آپ مقدر والے ہیں کہ کسی مسجد کے امام نہیں۔ ہم سے پوچھئے اس دور کی امامت میں کیسی کیسی مکروہ باتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا حضرت یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ یہ بتایئے وہ صاحب کون تھے۔ فرمانے لگے یہ جواب کی تمہید تھی۔ اب جواب ہے کہ یہ صاحب بڑے خوش نصیب ہیں اور ان کی خوبی صرف یہ ہے کہ یہ اس شخص کے صاحبزادے ہیں جس نے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی اور انہیں باپ کی دولت کی طرح یہ مصلیٰ شریف بھی وارثت میں ملا ہے اور یہ حق بھی کہ امام کو ان کے پاس جا کر مصافحہ کرنا چاہیے اور یہ ان پر دولت کا بوجھ ہے۔ جس نے ان کو امام اور علماء کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونے سے محروم کر رکھا ہے۔ ویسے یہ معذور نہیں ماشاءاللہ سارا دن دولت کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔

اس قسم کے اور بہت واقعات ہمارے مشاہدے میں آئے جن کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک دولت مند کے لاکھوں سے بہتر وہ ہزاروں ہیں جو ایک ایک کر کے غریبوں سے جمع کیے جائیں کہ کام میں برکت بھی ہوتی ہے اور مذہبی آزادی بھی متاثر نہیں ہو پاتی۔ نیز اس سے غریبوں میں احساس ذمہ داری اور جذبہ خودداری پیدا ہوتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان سے مطالبہ فرماتا ہے کہ اس کی دی ہوئی دولت کا کچھ حصہ اس کی راہ میں خرچ کیا جائے اور یہ مطالبہ آمادگی کے بڑے ہی مؤثر انداز سے کیا جا رہا ہے۔ خرچ کرو جو کچھ خرچ کر سکتے ہو کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں نہ بیع ہوگی اور نہ خلۃ ہوگی اور نہ شفاعۃ ہوگی۔

کافروں جیسا طریقہ اختیار نہ کرو

یہ دن کون سا ہوگا اکثر مفسرین کہتے ہیں، یہ قیامت کا دن ہوگا لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ہر ایک کی اپنی موت کا دن ہوگا۔ ہم ابھی اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ پہلے آیت کے آخری حصہ پر غور فرمایئے، ارشاد ہوتا ہے "اور کافر ہی ظالم ہیں" بتانا یہ مقصود ہے کہ تم میں اور کفار میں ہر اعتبار سے فرق ہے تم دیکھتے ہو کہ کافر اپنی دولت، اپنی مرضی سے خرچ

کرتے ہیں۔ بن خواہشِ نفس کی تکمیل پر خرچ کرتے ہیں، عیاشی پر خرچ کرتے ہیں۔ جوا، شراب نوشی، بدکاری، ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ ان کے نزدیک نہ دولت حاصل کرنے میں کوئی قید اور پابندی ہے اور نہ خرچ کرنے میں کہیں حلال و حرام کا تصور نہیں۔ یعنی مسلمان جو حرام کی آسانی حاصل ہونے والی دولت کی طرف نظر بھی نہیں اٹھاتا۔ اس کی دولت بڑی محنت سے ہوتی ہے۔ اے ایمان والو! تم دولت خرچ کرنے میں کافروں جیسا طریقہ اختیار نہ کرو۔ تمہارے پاس جو کچھ ہے، اس سے اپنی ضروریات پوری کرو۔ اپنے اہل وعیال کی کفالت کرو اور ''عفو''، اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ کافر تو ہیں ہی ظالم، ان کا ہر عمل بےمقصد اور بے محل ہوتا ہے۔ تو خرچ بھی وہ بے محل اور بےمقصد کرتے ہیں۔ تم ان کی طرح ظالم نہ بنو کہ ظالموں کا ٹھکانہ تو جہنم کی آگ ہے۔ میرے آقا ﷺ تو یہ بھی پسند نہیں فرماتے کہ مؤمن کا کھانا تک کوئی کافر یا فاسق وفاجر کھائے تو آپ کو یہ کب گوارا ہوگا کہ مؤمن کی دولت بے محل اور بےمقصد خرچ ہو۔ آپ نے فرمایا:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا یَاْکُلْ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، صرف اہل ایمان سے دوستی رکھو اور تمہارا کھانا صرف متقی کھائے۔ (ترمذی)

لا بیع

اس دن خرید وفروخت نہ ہوگی کہ وہاں دولت حاصل کر کے خرچ کرو اور عذاب الٰہی سے نجات پالو۔ بیع دنیا میں معاشی وسائل وذرائع کا مرکز ہے۔ حصول دولت کا سرچشمہ ہے۔ صنعت وحرفت کی نہریں اسی سے جاری ہوتی ہے۔ رزاقِ حقیقی اللہ وحدہ لاشریک نے اس کو بلا قیود وشرائط اپنے بندوں کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ لین دین کا جو معاملہ بھی آپس میں طے ہو جائے اور اس سے جتنی دولت بھی حاصل ہو وہ حلال ہے۔ نبی مکرم علیہ السلام نے دیانت دار اہلِ ایمان تاجروں کو جنت کی خوشخبری سنائی، اب یہ مسلمان کی حرماں نصیبی ہے کہ وہ حصول رزق کے اس وسیع وعریض اور مقدس ذریعہ کو کافروں کی طرح جھوٹ مکروفریب، دھوکہ دھڑی اور سود کی گندگی سے اپنے لئے گندا اور حرام کرلے۔ مسلمانوں کے لیے ان غلاظتوں سے پاک وصاف پیشہ، تجارت ہے، جس میں اللہ نے برکت رکھی ہے اور دیانت دار تاجروں کو مخبر صادق ﷺ نے مژدہ سنایا:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: سچا اور امانت دار تاجر (قیامت میں) نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی)

امانت دار تاجر کون ہے، سب جانتے ہیں۔ ایک جملہ میں یوں سمجھ لیجئے کہ امانت دار تاجر وہ ہے جو صرف اپنے نفع کے لئے خریدار کا حق نہ مارے اس کو نقصان نہ پہنچائے اس کو دھوکا نہ دے۔ اس پر ظلم نہ کرے ایسے تاجر کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ آپ نے

حدیث شریف میں ملاحظہ فرمایا۔

ہوتا یہ ہے کہ انسان تجارت یا اپنے معاش کے دیگر وسائل کو بڑھاتے بڑھاتے دولت کی محبت میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ صرف اس کو بڑھانا ہی چاہتا ہے خرچ کرنا گوارا نہیں کرتا۔ حتی کہ اپنے ضروری اخراجات بھی [illegible] معلوم ہونے لگتے ہیں ایسے ہی شخص کو بخیل، خسیس یا کنجوس کہا جاتا ہے جو درحقیقت اللہ کی طرف سے انسان کی [illegible] کا طریقہ ہے۔ میرے آقا ﷺ کا یہ ارشاد نہایت ہی قابل غور ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لُعِنَ عَبْدُا لدِّيْنَارِ وَ لُعِنَ عَبْدُ [illegible]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا دینار [illegible]

لعنت کی گئی ہے۔ [illegible]

دینار و درہم یعنی دولت کے بندے وہی بخیل ہیں جو اللہ کی راہ میں تو خرچ کرنا درکنار اپنے ضروری اخراجات [illegible] کرتے۔ ایسے لوگوں پر لعنت و پھٹکار ہی ہے کہ وہ جس دولت کی دن رات حفاظت کرتے اور اس کو بڑھانے میں لگے رہتے ہیں وہ بسا اوقات ان کے لیے عذاب بن جاتی ہے اور زندگی میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی چین اور سکون نہیں۔ رات کو آرام کی نیند تک نصیب نہیں ہوتی۔

وَلَا خُلَّةٌ

خلہ، یعنی دوستی، تعلقات، یہ انسان کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے کہ فطری طور پر ہر شخص اپنے اعزاء و اقارب اور دیگر لوگوں سے محبت کرتا ہے اور اپنے تعلقات کی وسعت پر ناز کرتا ہے۔ اسلام بھی اس کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں اعزاء و اقارب سے صلہ رحمی یعنی تعلقات کو مضبوط رکھنے۔ دیگر مسلمانوں سے دوستی اور محبت قائم کرنے سے متعلق واضح احکامات موجود ہیں کہ اس سے باہمی تعاون حاصل ہوتا ہے۔ فتنہ وفساد مٹتا ہے اور بے [illegible] برائیوں کا معاشرے سے خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے معلم اسلام ﷺ نے آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرنے، مصافحہ و معانقہ کرنے کی تعلیم دی جو بظاہر بہت ہی معمولی باتیں نظر آتی ہیں لیکن مسلم معاشرے پر ان کی نہایت ہی گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَ تُقْرِئُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ [illegible]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام سے ایک شخص نے پوچھا، اسلام کی کون سی عادت بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا کھانا کھلانا اور واقف و ناواقف کو سلام کرنا۔ (بخاری و مسلم)

عَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ اِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ اَنْ يَّتَفَرَّقَا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جب دو مسلمان ملیں اور مصافحہ کریں تو دونوں کو بخش دیا جاتا ہے، ان کے جدا ہونے سے پہلے۔ (ترمذی)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا وَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا تم جنت میں نہیں داخل ہو سکتے جب تک کہ مومن ہو جاؤ اور اس وقت تک مؤمن کامل نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں محبت نہ کرو اور کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتادوں جس سے تم آپس میں محبت کرنے لگو۔ آپس میں سلام کیا کرو۔ (مسلم شریف)

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُؤْمِنُوْنَ کَرَجُلٍ وَّاحِدٍ اِنِ اشْتَکٰی عَیْنُهٗ اشْتَکٰی کُلُّهٗ وَ اِنْ اشْتَکٰی رَأْسُهٗ اشْتَکٰی کُلُّهٗ۔

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ایمان والے ایک جسم کی طرح ہیں، اگر آنکھ کو تکلیف ہو جائے تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر سر کو تکلیف ہو جائے تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے۔ (مسلم شریف)

اگر غور کیا جائے تو اسلام کی تمام تعلیمات کا بنیادی مقصد باہمی تعلقات کو مضبوط کرنا اور امت کو ایک متحد قوم بنانا ہے کہ اس سے اپنے مسائل حل ہوتے ہیں اور دشمن پر رعب طاری رہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ سب کچھ اس وقت تک ہے جب تک سانس چل رہا ہے جونہی سانس منقطع ہوئی تمام تعلقات رشتے اور دوستیاں ختم۔ انسان دنیا میں نہ جانے کیا کیا کرتا ہے۔ صرف اپنے اہل وعیال کے لئے اپنے اعزا کے لئے، اپنے تعلقات بڑھانے کے لئے، لیکن رشوت کی کمائی، مکروفریب سے حاصل کردہ دولت لوگوں پر ظلم وستم ان مقدس رشتوں کو دنیا وآخرت میں وبال جان بنا دینے والے اعمال ہیں۔ اسلام نے تو یہ چاہا تھا کہ مومن اپنے تمام تعلقات سے اپنے معاشرے کی خدمت کرے اور اپنی زندگی کو پرسکون بنائے۔ لیکن شومی قسمت کہ ''خلة'' دوستی کا رشتہ، اللہ سے غفلت کا ذریعہ بن گیا اور یہ حال ہو گیا کہ اگر اس شخص سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرنے کا سوال کیا جاتا ہے تو یہ اپنے اہل خانہ، اعزاء واقارب، دوست احباب کے کثیر اخراجات کا بہانہ کر کے معذرت کر لیتا ہے۔

وَلَا شَفَاعَةٌ

شفاعۃ کے عام معنی سفارش کے ہیں لیکن اس کے اصلی معنی ملنے یا ملانے کے ہیں۔ شفعہ عربی زبان میں جوڑے کو اور برابر والے پڑوسی کو کہتے ہیں۔ اسی سے حق شفعہ ہے جو برابر والے پڑوسی کے حق کے لئے بولا جاتا ہے۔ سفارش کو، شفاعت اس لیے کہا جاتا ہے کہ سفارش کرنے والا کمزور حق دار کے ساتھ اپنی قوت اور وسائل ملا کر اس کو طاقتور بنا دیتا ہے۔

اس لئے شفاعت کا لفظ ہر ایسے کام کے لئے بولا جا سکتا ہے جس سے کسی کمزور کو تقویت پہنچائی جائے۔ قرآن کریم نے شفاعت کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝ (النساء:۸۵)

جو اچھی سفارش کرے اس میں سے اس کے لئے حصہ ہے اور جو بری سفارش کرے اس میں سے اس کے لئے حصہ ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ۔ شفاعت حسنہ یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کی سفارش کی جائے جو واقعی حقدار ہو۔ نیز سفارش کرنے والا جس سے سفارش کر رہا ہے اس پر اپنے اثر، دولت یا کسی لالچ کا دباؤ نہ ڈالے بلکہ کمزور کی بات متعلقہ حاکم، افسر یا کسی شخص تک پہنچا دے۔ اگر کام ہو جائے تو شکریہ ادا کرے نہ ہو تو برا نہ مانے اور تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہونے دے۔ وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل واقعہ بطور مثال ملاحظہ ہو۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے طلاق لے لی تھی، جب کہ وہ اپنی بیوی سے محبت کرتے تھے۔ طلاق کے بعد یہ بہت پریشان حال رہنے لگے۔ نبی مکرم علیہ السلام کو ان کی حالت پر رحم آیا اور آپ نے حضرت بریرہ سے فرمایا کہ مغیث تم سے بہت محبت کرتے ہیں، تمہاری جدائی ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم ان سے دوبارہ نکاح کر لو۔ حضرت بریرہ نے جواب دینے سے پہلے سوال کیا، یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا سفارش، اگر حکم ہے تو تعمیل کے لیے بندی حاضر ہے۔ آپ نے فرمایا، حکم نہیں سفارش ہے۔ تو عرض کرنے لگیں حضور میرا دل مغیث کی طرف بالکل مائل نہیں ہوتا۔ یعنی میں ان سے دوبارہ نکاح کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ حضرت بریرہ جانتی تھیں کہ حکم رسول کے بعد تو مجھے کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، لیکن سفارش میں حق اختیار ہے۔ لہٰذا انہوں نے صاف انکار کر دیا اور حضور علیہ السلام نے ان کو، ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ قطعاً ناگواری کا اظہار نہ فرمایا۔

پس شفاعت حسنہ کے لئے تین باتیں نہایت اہم ہیں۔ جس کی سفارش کی جائے وہ شرعی اور قانونی طور پر واقعی حق دار ہو۔ نیز سفارش کرنے والا اپنی اس مدد کا مالی یا جسمانی بدلہ نہ مانگے نہ اس کی کوئی امید کرے۔ اور جس سے سفارش کی جائے اس پر کام کرنے کے لئے نہ کوئی دباؤ ڈالا جائے نہ اسے کوئی مالی پیش کش کی جائے۔ نہ کسی طرح کا لالچ دیا جائے اگر وہ کام نہ کر سکے تو کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہ کیا جائے۔ یہ ہے شفاعت حسنہ اور جب سفارش ان چیزوں کے برعکس ہو یعنی جس کی سفارش کی جائے وہ حقدار نہ ہو بلکہ سفارش کے ذریعہ وہ کسی کا حق مارنا چاہتا ہو یا کسی پر ظلم کرنا چاہتا ہو یا سفارش کرنے والا کوئی بدلہ لے کر سفارش کرے یا کام کرنے والے کو کسی طرح سے اس کا بدلہ دیا جائے جسے رشوت کہتے ہیں تو یہ سفارش، شفاعت سیئہ کہلائے گی۔ قرآن کریم نے ان دونوں قسموں کو بیان کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ شفاعت حسنہ کرنے والے کو

اس کا اجر وثواب ضرور ملے گا اور شفاعت سیئہ کرنے والے کو اس کی سزا ضرور دی جائے گی۔ نیز فرمایا گیا:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ (المائدہ:۲)

اور تم نیکی اور پرہیز گاری (کے کاموں) میں باہم مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

نبی مکرم علیہ السلام کے بے شمار ارشادات محفوظ ہیں۔ جن سے شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے۔ اچھی سفارش کرنے اور بری سفارش سے بچنے کی تاکید بھی ملتی ہے۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص کسی نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اسے اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا اس پر عمل کرنے والے کو ملتا ہے۔ (مسلم شریف)

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ کَانَ اِذَا اَتَاهُ السَّائِلُ اَوْ صَاحِبُ الْحَاجَةِ قَالَ اشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَ یَقْضِیَ اللّٰهَ عَلٰی لِسَانِ رَسُوْلِهٖ مَاشَآءَ۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے دربار میں جب کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ فرماتے تم سفارش کیا کرو، تمہیں ثواب ملے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہتا ہے وہی فیصلہ کراتا ہے (تمہیں اس پر راضی ہونا چاہیے) (بخاری ومسلم)

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ شَفَّعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَةً فَاَهْدٰی لَهٗ هَدِیَّةً عَلَیْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰی بَابًا عَظِیْمًا مِنْ اَبْوَابِ الرِّبٰوا۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جو شخص کسی حاکم یا امیر سے کسی کی سفارش کرے اور پھر اس حاکم یا امیر کو ہدیہ بھیجے اور وہ اس کو قبول کر لے تو گویا وہ حاکم یا امیر سود کے کسی بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔ (ابوداؤد)

بیع، خلۃ، شفاعۃ سے متعلق اس ضروری تفصیل کے بعد اب آیت زیر گفتگو کا مفہوم واضح ہے کہ ''اے ایمان والو، ہم نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کا کچھ حصہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ (عفو) ہوا سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس دن کے آنے سے پہلے جس کا آنا یقینی ہے یعنی قیامت سے پہلے کہ قیامت کے دن نہ تو وہ بیع ہو گی جس کا لالچ تمہیں ''انفاق فی سبیل اللہ'' سے روکتا ہے۔ نہ یہ دوست کام آئیں گے جن پر تم اپنی ساری دولت خرچ کرتے ہو اور نہ ہی اس دن اللہ کی اجازت کے بغیر تمہیں سفارش کر کے کوئی بچا سکے گا۔ جس کے ذریعہ دنیا میں تمہارے کام بن جاتے ہیں۔ تم اپنے اخراجات میں کافروں جیسا طریقہ اختیار نہ کرو کہ وہ تو ہیں ہی ظالم۔ کتنا پیارا انداز ہے دعوت انفاق کا۔ کیسی حسین تدبیر کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔

آیت مبارکہ کا دوسرا مفہوم، جو بعض مفسرین نے بیان کیا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے حکم دیتا ہے کہ موت کا دن آنے سے پہلے اللہ کی راہ میں اللہ کی دی ہوئی دولت کا کچھ حصہ خرچ کر دو، کہ موت کے بعد نہ حصول دولت کا سلسلہ رہے گا نہ اس کے خرچ کرنے کا موقع۔ اور نہ ہی کوئی دوست کام آسکے گا اور نہ کوئی سفارش کر سکے گا۔ کافروں جیسا طریقہ اختیار نہ کرو کہ وہ تو ہیں ہی ظالم۔ یہاں یوم سے مراد موت کا دن لیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم بھی ہے۔

وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰﴾ (المنافقون: ۱۰)

اور خرچ کرو اس (مال) سے جو ہم نے تمہیں دیا، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے پھر کہے اے رب تو نے مجھے کچھ دن کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ دیتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا۔

دو باتیں

خلة وشفاعة کے متعلق مزید دو باتیں قابل بیان ہیں۔ جو نہایت اہم ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق عقیدے سے ہے۔

پہلی یہ کہ قیامت میں وہ خلة بیشک کام نہیں آئے گی جس کی بنیاد دنیا میں خونی رشتوں یا دنیاوی تعلقات پر ہوتی ہے۔ لیکن وہ دوستی اور تعلق جس کی بنیاد روحانی اور مذہبی رشتوں پر ہو وہ یقیناً قیامت میں کام آئے گی۔ جیسا کہ فرمایا گیا۔

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴿۶۷﴾ یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ (الزخرف: ۶۷، ۶۸)

گہرے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیز گاروں کے۔ اے میرے بندو آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے۔

متقین میں قیامت کے دن دوستی ہوگی وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے۔ اسی لیے قرآن کریم بار بار تقویٰ اختیار کرنے، متقی بننے اور متقیوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ (التوبہ: ۱۱۹)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ ہو۔

صادقین، متقین ہی ہیں کہ سچ کی پابندی حصول تقویٰ کے لیے پہلا قدم ہے۔ بہر حال قیامت کے دن، اَخلاّء تمام دوست منہ پھیرلیں گے سوائے اولیاء، صالحین، مشائخ، علماء دین، پیر و مرشد، دینی رہنماؤں اور استادوں کے۔ دنیا میں جو ان کے دامن سے وابستہ رہا، ان سے محبت کرتا رہا، ان کی خدمت کرتا رہا، قیامت میں یہ اس کے مددگار ثابت ہوں گے۔

دوسری بات یہ کہ قیامت کے دن ''شفاعت نہ ہونے'' کا مطلب یہ نہیں کہ العیاذ باللہ، حضور علیہ السلام کو بھی اختیار شفاعت حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو ہم عرض کر چکے کہ اللہ رب العزت کی اجازت کے بغیر کسی کو کسی کی سفارش کرنے کی مجال نہ ہوگی۔ نبی شفیع المذنبین کی شفاعت تو قرآن و حدیث سے ثابت ہے، اس کا انکار سوائے گمراہ و

پر نصیب کے نہ کسی نے کیا اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ آپ کے علاوہ اور بھی ہیں جن کی شفاعت کی آپ نے خوشخبری سنائی۔ مثلاً قرآن اپنی تلاوت کرنے والوں کی، حجر اسود اپنے چومنے والوں کی، رمضان روزہ رکھنے والوں کی شفاعت، بچے اپنے والدین کی شفاعت کریں گے۔

عقیدۂ شفاعت

شفاعت کا عقیدۂ حق تو ہم جیسے گناہ گاروں کے لیے بڑا ہی تقویت بخش سہارا ہے کہ ہمارا تو یقین ہی یہ ہے کہ ہماری عبادات و اعمال کی مقبولیت مشکوک ہونے کے باوجود ہماری نجات یقینی ہے کہ ذریعہ نجات نبی رؤف الرحیم ﷺ کی شفاعت ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارا ایک مضمون بعنوان ''میدان حشر'' ہماری کتاب ''مقالات قادری'' کی تیسری جلد میں ہے جو مفصل اور نہایت مفید ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ چند باتیں عرض ہیں۔

اولاً یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی شفاعت کی نفی کی گئی ہے وہ کفار کے لئے ہے۔ ... اور باذن الٰہی شفاعت کے لئے ہے۔ یعنی قیامت کے دن کافروں کا شفیع کوئی نہ ہوگا۔ اور جس کے لئے شفیع ہوگا بھی ... کی اجازت سے ہے۔ اور اللہ جس کو شفاعت کا اعلیٰ منصب عطا فرمائے گا اس کی شفاعت قبول بھی فرمائے گا۔ ورنہ اس ... عطا فرمانا بے مقصد ہوگا۔ اور اللہ پاک ہے اس سے کہ وہ کوئی بے مقصد کام کرے۔

ثانیاً، نبی مکرم ﷺ کی شفاعت قرآن کریم سے ثابت ہے۔ جس کا انکار بڑی گمراہی ہے۔ ہر دور میں جمہور علماء ... کا اس عقیدے پر اتفاق رہا ہے کہ نبی مکرم علیہ السلام ''شفیع المذنبین'' ہیں ﷺ۔ اللہ نے اپنے محبوب سے وعدہ فرمایا:

عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا۝ (بنی اسرائیل: ۷۹)

... ہے کہ (اے محبوب) آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر جلوہ گر فرمائے گا۔

... مقام محمود مقام شفاعت ہے۔ جیسا کہ خود صاحب مقام محمود ﷺ فرماتے ہیں۔

ھُوَ الۡمَقَامُ الَّذِیۡ اَشۡفَعُ فِیۡہِ لِاُمَّتِیۡ

(مقام محمود) وہ مقام ہے جہاں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا۔ (احمد بن حنبل)

کس کی شفاعت کریں گے، کیسے کریں گے احادیث مبارکہ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ ان سب کو یہاں نقل کرنا ممکن نہیں۔ صرف چند ارشادات پڑھیے اور دعا کرتے جایئے اللھم ارزقنا شفاعۃ نبیک نبی الرحمۃ ﷺ

عَنۡ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ قَالَ شَفَاعَتِیۡ لِاَھۡلِ الۡکَبَائِرِ مِنۡ اُمَّتِیۡ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ میری شفاعت اپنی امت کے گناہ کبیرہ کرنے والوں کے لیے ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

عَنۡ عَوۡفِ بۡنِ مَالِکٍ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ اَتَانِیۡ اٰتٍ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّیۡ فَخَیَّرَنِیۡ بَیۡنَ اَنۡ یَّدۡخُلَ نِصۡفُ اُمَّتِیَ الۡجَنَّۃَ وَ بَیۡنَ الشَّفَاعَۃِ فَاخۡتَرۡتُ الشَّفَاعَۃَ

وَ هِیَ لِمَنْ مَّاتَ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰهِ شَیْئًا۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: میرے رب کے پاس سے ایک آنے والا (فرشتہ) میرے پاس آیا۔ پس اس نے مجھے (رب کی طرف سے) اختیار دیا کہ میں آدھی امت جنت میں داخل کیے جانے کا (وعدہ قبول کرلوں) یا شفاعت کرنے کا (حق لے لوں) پس میں نے شفاعت کو پسند کیا۔ اور یہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو مر گیا اور اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا (بس شرک نہیں کیا، حالت ایمان پر مرا، چاہے کوئی عمل کیا یا نہ کیا)۔ (ابن ماجہ)

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَشْفَعُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثَلٰثَةٌ الْاَنْبِیَآءُ ثُمَّ الْعُلَمَآءُ ثُمَّ الشُّهَدَآءُ۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا انبیاء، علماء اور شہداء۔ (ابن ماجہ)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُصَفُّ اَهْلُ النَّارِ فَیَمُرُّ بِهِمُ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ یَا فُلَانُ اَمَا تَعْرِفُنِیْ اَنَا الَّذِیْ سَقَیْتُکَ شَرْبَةً وَّ قَالَ بَعْضُهُمْ اَنَا الَّذِیْ وَهَبْتُ لَکَ وُضُوْءً فَیَشْفَعُ لَهٗ فَیُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا: جہنمی صف بستہ کھڑے ہوں گے کہ ایک جنتی ان کے سامنے سے گزرے گا تو ان میں سے ایک آدمی کہے گا اے فلاں، کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے۔ میں وہی ہوں جس نے آپ کو پانی پلایا تھا اور دوسرا کہے گا میں وہی ہوں جس نے آپ کو وضو کے لیے پانی دیا تھا۔ پس وہ اس کی شفاعت کرے گا اور اسے جنت میں داخل کرائے گا۔ (ابن ماجہ)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ مِنْ اُمَّتِیْ یَشْفَعُ لِلْفِئَامِ وَ مِنْ هُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْقَبِیْلَةِ وَ مِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْعُصْبَةِ وَ مِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلرَّجُلِ حَتّٰی یَدْخُلُوا الْجَنَّةَ۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا میری امت میں سے کچھ لوگ ایک پوری جماعت کی شفاعت کریں گے اور کچھ ایک قبیلہ کی اور کچھ خاندان کی اور کچھ ایک شخص کی۔ حتیٰ کہ وہ سب جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ (ترمذی)

ان احادیث سے نہ صرف حضور نبی مکرم ﷺ کا ''شفیع المذنبین'' ہونا ثابت ہے، بلکہ یہ بھی واضح ہے کہ غلاموں میں سے بھی ایسے مقربین اور محبوبین ہوں گے۔ جو اس دن ہم گناہگاروں کا سہارا بنیں گے، ہماری شفاعت کریں گے اور ہماری نجات کا وسیلہ بنیں گے اور جنہیں شفاعت نصیب ہوگی ان کے لیے قیامت کے تمام مراحل آسان ہو جائیں گے۔ حتیٰ

کہ وہ "صراط" جیسے خطرناک پل سے بھی جھومتے ہوئے "رب سلم" کا نغمہ گنگناتے ہوئے گزریں گے۔

عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ شِعَارُ الْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى الصِّرَاطِ رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ۔

حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ مژدہ سناتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن پل صراط پر مومنین کا وظیفہ ہوگا "رب سلم، سلم" اے رب سلامت رکھ، سلامت رکھ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

رضا پل سے اب وجد کرتے گزریئے ۔۔۔ کہ ہے رب سلم صدائے محمد ﷺ

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا شَفَاعَةَ نَبِيِّكَ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ وَالشَّفَاعَةِ
وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ



مقالہ ۹

البقرہ: ۲۶۴ تا ۲۶۶

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰىۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ
وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ
فَتَرَكَهٗ صَلْدًاؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْاؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۝٢٦٤
وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ
جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّؕ وَ اللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝٢٦٥ اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُۙ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ
فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُوْنَ ۝٢٦٦ (البقرہ: ۲۶۴ تا ۲۶۶)

اے ایمان والو! نہ ضائع کرو اپنی خیراتیں احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر اس کی طرح جو اپنا مال

لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ تو اس کی مثال اس چکنے پتھر کی سی ہے جس پر (کچھ) مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہوئی جس نے اسے صاف پتھر کر چھوڑا۔ وہ اپنی کمائی سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں فرماتا۔

اور ان لوگوں کی مثال جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دلوں کو مضبوط رکھنے کیلئے، اس باغ کی سی ہے جو اونچی زمین پر ہو اس پر زور کی بارش ہوئی تو وہ اپنا پھل دوگنا لایا، پھر اگر زور کی بارش اسے نہ پہنچے تو شبنم (ہی) کافی ہے، اور اللہ تمہارے سب کام دیکھ رہا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں اس کیلئے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں اور اسے بڑھاپا پہنچ گیا ہو اور اس کے کمزور بچے ہوں تو اسے گرم ہوا کا ایک جھونکا پہنچے جس میں آگ تھی تو وہ (باغ) جل گیا۔

اسی طرح اللہ تمہارے لیے آیتیں بیان فرماتا ہے، تا کہ تم فکر سے کام لو۔

اے ایمان والو! تم ہماری رضا کے لیے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت خرچ کرتے ہو تو نہ تو اس کا کسی پر احسان جتلاؤ نہ ہی دکھاوا کرو۔ ایسا کرو گے تو ثواب سے محروم ہو جاؤ گے۔ کہ احسان جتلانا اور دکھاوا کرنا مؤمن کی شان نہیں۔ یہ تو کافروں کا طریقہ ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے چکنے پتھر پر تھوڑی سی مٹی ڈال کر کوئی کھیتی اگا لے اور خوش ہونے لگے، جبکہ ایسی کھیتی کو بڑی ہی آسانی سے پانی بہا کر لے جاتا ہے اور پتھر چکنا کا چکنا رہ جاتا ہے۔

ہاں جو لوگ صدقہ کر کے نہ تو احسان جتلاتے ہیں نہ دکھاوا کرتے ان کا مقصد صرف اللہ کو راضی کرنا ہوتا ہے، اپنے ایمان کو مکمل کرنا ہوتا ہے وہ ایسی کھیتی اُگاتے ہیں جس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ نہ سخت بارش اس کو تباہ کرتی ہے اور اگر بارش نہ بھی ہو تو رات کی شبنم سے ہی وہ اُگتی رہتی ہے۔ اللہ دلوں کا حال جانتا اور تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

دیکھو، تمہارا صدقہ بڑا ہی قیمتی اور مفید ہے۔ تمہارے لئے بڑا سہارا ہے۔ کیا تم پسند کرو گے کہ تمہاری حالت اس بوڑھے جیسی ہو جو ایک نہایت خوبصورت پھلدار باغ سے آس لگائے بیٹھا ہو لیکن اچانک اس کو قدرتی آگ جلا کر خاکستر کر دے۔ کیا حال ہوگا اس بوڑھے کا اگر تم نے اپنے صدقات کو احسان جتلا کر دکھاوا کر کے ضائع کر دیا تو قیامت کے دن کے لیے جو تم نے اپنی اس نیکی پر بھروسہ کیا ہوا تھا وہاں اس کا کوئی بدلہ و ثواب تم نہ پاؤ گے۔ اور پھر و گے پریشان ہوتے اور پچھتاتے۔ اللہ تمہارے لئے واضح احکام بیان فرماتا ہے تا کہ تم غور و فکر سے کام لو۔

قرآن و حدیث سے واضح ہے کہ صدقہ اللہ کے نزدیک بڑی محبوب عادت ہے۔ لیکن کوئی بھی عبادت مفید نہیں اگر اسے اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کی پابندی کے ساتھ ادا نہ کیا جائے۔ کیونکہ درحقیقت وہ مخصوص عمل جسے عبادت قرار دیا گیا، مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود اظہار عبدیت اور بندگی ہے کہ جس کام کے کرنے کا اللہ حکم دیتا ہے اسے اسی طریقے سے کرو۔ جو طریقہ اللہ یا اس کے رسول ﷺ نے متعین کیا، طریقہ ادا میں ذرا سی تبدیلی بھی پوری عبادت کے مردود اور نا مقبول ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ مثلاً نماز تو عبادت ہے لیکن وہ اسی وقت قابل قبول ہے جب اس کو مقررہ اوقات اور ادا

کرنے کے مقررہ طریقے کے مطابق ادا کیا جائے۔ یہی حال تمام عبادات کا ہے۔ زکوۃ وصدقہ وخیرات یقیناً عبادت ہیں لیکن اگر غریبوں پر اس کا احسان جتلایا یا اس سے اپنے دولت مند ہونے اور سخی ہونے کا مظاہرہ کیا تو سب ضائع اور اکارت۔ غرضیکہ عبادات میں بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر عبادت کو اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقہ ہی کے مطابق ادا کیا جائے۔ اپنی مرضی اور عقل سے نہیں۔ یہی عبدیت ہے، یہی بندگی ہے۔ اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد آیات مذکورہ سے متعلق مضامین کا مطالعہ کیجئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ
وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اے ایمان والو! نہ ضائع کرو اپنی خیراتیں احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر، اس کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ تو اس کی مثال اس چکنے پتھر کی سی ہے جس پر (کچھ) مٹی ہو پھر اس پر زور کی بارش ہوئی جس نے اسے صاف پتھر کر چھوڑا، وہ اپنی کمائی سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں فرماتا۔

اس آیت کے ضمن میں ہم مندرجہ ذیل عنوانات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں:

صدقہ، مَنّ، اذیٰ، رِئا

صدقہ

صدقہ صَدَقٌ سے بنا ہے۔ یعنی سچ، اسی سے صِدّیق ہے، یعنی سچ کی تصدیق کرنے والا اور اس کو بلا تامل تسلیم کرنے والا۔ اسی سے صَدیق، یعنی مخلص دوست۔ اسی سے صادق یعنی سچ بولنے والا۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ ایک بڑا ایثار ہے جو مومن کے ایمان کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ مؤمن ہی کیا جو اللہ کو اپنی ہر چیز سپرد کر دینے اور اس کے بدلے جنت کا مستحق قرار پانے کا عہد کر لینے کے باوجود اپنا محبوب مال اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں خرچ نہ کر سکے۔ اسی لئے قرآن کریم میں اس کا بار بار مطالبہ کیا گیا اسے متقین کی علامت قرار دیا گیا۔ دنیا میں برکت کا باعث اور آخرت میں نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

صدقہ اپنے معنی کے اعتبار سے انفاق کی طرح عام ہے کہ اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری میں ہر کام صدقہ ہے۔ مالی صدقہ تو دولت خرچ کرنا ہے لیکن عملی طور پر مؤمن کا ہر قول وفعل ہر نیک کام، برے کاموں سے بچنا صدقہ ہے۔ مظلوم کو ظالم سے نجات دلا دینا دو بھائیوں میں صلح ومحبت کرا دینا، مریض کی عیادت کرنا، کسی کے جنازے میں شریک ہونا، کسی کو دین کی بات بتانا، دین پر عمل کی دعوت دینا، راستہ سے تکلیف دینے والی چیز ہٹا دینا، مسلمان بھائی کے سامنے اس کو خوش کرنے کے لئے خندہ پیشانی سے آنا حتی کہ جانوروں پر رحم کرنا سب صدقہ ہے۔ مؤمن کو اس کا اجر وثواب ملتا ہے۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ وہ مومنین کو ان کے صدقات کا اجر وثواب عطا فرماتا ہے جبکہ وہ رحیم وکریم رب تو انسان کو پہلے ہی اتنے

انعامات سے نواز چکا ہے۔ اور اس پر اتنے احسانات فرما چکا ہے کہ انسان اجر وثواب کی امید کے بغیر بھی کتنا ہی صدقہ کرے اللہ کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ یہ کس قدر کرم ہے میرے آقا ﷺ کا کہ آپ نے مومن کے ہر عمل کو صدقہ قرار دیا۔ ورنہ کتنی ہی دولت خرچ کردی جاتی، دن رات کی سانسوں کا بھی صدقہ ادا نہ ہو پاتا۔ نبی مکرم علیہ السلام نے ہمیں بڑا سہارا دیا کہ آپ کے ارشادات سے ہم یہ یقین کرنے کے قابل ہوئے کہ کچھ نہ کرنے کے باوجود ہمارے کچھ اعمال اللہ کے دربار میں بطور صدقہ پیش ہوجاتے ہیں جو ہماری طرف سے اس کے بے شمار احسانات کا معمولی شکرانہ ہوجاتا ہے۔ اور اس طرح ہم بھی شکر گزار بندوں میں شامل ہوجاتے ہیں اور اس کی کریمانہ شان کے پیش نظر ہم اجر وثواب کے بھی امیدوار بن جاتے ہیں کہ صدقہ چاہے مالی ہو یا عملی درحقیقت رب کے بے شمار انعامات واحسانات کے شکریہ کا ذریعہ ہے۔ صاحب جودوکرم آقا ﷺ نے ہمارے اعمال کو کس طرح صدقہ قرار دیا۔ اس کا اندازہ آپ کے چند ارشادات سے کیجئے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ قَالَ فَلْیَعْمَلْ بِیَدَیْهِ فَیَنْفَعُ نَفْسَهٗ وَ یَتَصَدَّقُ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ اَوْ لَمْ یَفْعَلْ قَالَ فَیُعِیْنُ ذَالْحَاجَةِ الْمَلْهُوْفَ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَفْعَلْهُ قَالَ فَیَاْمُرُ بِالْخَیْرِ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَفْعَلْ قَالَ فَیُمْسِکُ عَنِ الشَّرِّ فَاِنَّهٗ لَهٗ صَدَقَةٌ۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے۔ صحابہ نے عرض کیا اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو۔ آپ نے فرمایا ہاتھ سے کام کرکے اپنے آپ کو فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔ صحابہ نے عرض کیا اگر کسی سے نہ ہوسکے۔ آپ نے فرمایا کسی ضرورت مند اور غمگین کی (عملی) مدد کرے۔ صحابہ نے عرض کیا، اگر ایسا بھی نہ کرسکے آپ نے فرمایا نیکی کا حکم کرے۔ صحابہ نے عرض کیا اگر کوئی یہ بھی نہیں کرپایا۔ آپ نے فرمایا خود برائی سے رکا رہے اور یہی اس کے لئے صدقہ ہے۔ (بخاری ومسلم)

حدیث مبارکہ سے واضح ہوا کہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا بھی صدقہ ہے، کسی کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ اگر کوئی اتنا بھی نہ کرسکے تو برائی سے بچ کر ہی صدقہ کا اجر حاصل کرسکتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ کُلُّ سَلَامٰی مِنَ النَّاسِ عَلَیْهِ صَدَقَةٌ کُلَّ یَوْمٍ تَطْلُعُ فِیْهِ الشَّمْسُ یَعْدِلُ بَیْنَ الْاِثْنَیْنِ صَدَقَةٌ وَّ یُعِیْنُ الرَّجُلَ عَلٰی دَآبَّتِهٖ فَیَحْمِلُ عَلَیْهَا اَوْ یَرْفَعُ عَلَیْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ وَّالْکَلِمَةُ الطَّیِّبَةُ صَدَقَةٌ وَّ کُلُّ خُطْوَةٍ یَّخْطُوْهَا اِلَی الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ وَّ یُمِیْطُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ صَدَقَةٌ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا انسان کے ہر عضو پر جب دن کا سورج طلوع ہوتا ہے، صدقہ لازم ہوتا ہے اگر وہ دو انسانوں کے درمیان انصاف کرتا ہے تو وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو سواری پر چڑھنے میں مدد کرتا ہے یا اس کا سامان اٹھا کر دیتا ہے یہ بھی صدقہ اور اگر

کسی سے کلمہ خیر کہتا ہے یہ بھی صدقہ ہے اور نماز کے لئے ہر قدم صدقہ ہے۔ اسی طرح راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ اِنْسَانٍ مِّنْ بَنِیْ اٰدَمَ عَلٰی سِتِّیْنَ وَ ثَلٰثِمَائَةِ مَفْصِلٍ فَمَنْ كَبَّرَ اللّٰهَ وَ حَمِدَ اللّٰهَ وَ هَلَّلَ اللّٰهَ وَ سَبَّحَ اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ اللّٰهَ وَ عَزَلَ حَجَرًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ اَوْ شَوْكَةً اَوْ عَظْمًا اَوْ اَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ نَهٰی عَنِ الْمُنْكَرِ عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّيْنَ وَ الثَّلَاثِ مِائَةِ فَاِنَّهٗ يَمْشِیْ يَوْمَئِذٍ وَّ قَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهٗ عَنِ النَّارِ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہر انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں جو اللہ اکبر کہے، الحمد للہ کہے، لا الہ الا اللہ کہے، سبحان اللہ کہے، استغفر اللہ کہے، راستہ سے پتھر یا کانٹا یا ہڈی ہٹا دے یا نیکی کی دعوت دے، برائی سے روکے (اس کے یہ سب کام دن بھر میں) تین سو ساٹھ مرتبہ ہو جائیں تو وہ ایسی حالت میں چلتا ہے کہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے محفوظ کر چکا ہوتا ہے۔ (مسلم)

کتنا آسان طریقہ بتایا میرے آقا ﷺ نے جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا اپنا کام کرتے رہیے، سیٹیاں بجانے اور گنگنانے کی بجائے اللہ کو یاد کرتے جائیے۔ اللہ اکبر، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، سبحان اللہ، استغفر اللہ جیسے متبرک کلمات زبان پر ہوں تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ روزگار میں روزی میں برکت بھی ہوتی ہے اور جہنم کی آگ سے حفاظت بھی۔ بڑا ہی پیارا مذہب ہے ہمارا۔ بہت آسان ہے اس سے فائدہ حاصل کرنا۔ بس بات صرف عمل کرنے کی اور یقین کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ غُفِرَ لِامْرَأَةٍ مُّوْمِسَةٍ مَّرَّتْ بِكَلْبٍ عَلٰی رَأْسِ رَكِیٍّ يَّلْهَثُ كَادَ يَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَاَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهٗ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ قِيْلَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَّطْبَةٍ اَجْرٌ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا ایک بدکار عورت صرف اس وجہ سے بخشی گئی کہ وہ ایسی جگہ سے گزری جہاں کتا پیاس کی شدت سے زبان نکالے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ قریب ہی تھا کہ پیاس کی وجہ سے وہ مر جاتا اس عورت نے دیکھا تو اپنا موزہ اتار کر اسے اپنی چادر میں باندھا اور (قریبی کنوئیں سے) پانی نکال کر کتے کو پلا دیا۔ پس اس عورت کی بخشش ہوگئی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ کیا جانوروں کے ساتھ بھلائی پر بھی اجر ملتا ہے تو آپ نے فرمایا ہر زندہ جگر کے ساتھ بھلائی کرنے پر اجر ملتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

جانوروں پر رحم اور ان کے ساتھ بھلائی بھی وہ صدقہ ہے جو قیامت میں نجات اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ بنتا ہے۔ اف جو مذہب جانوروں کے ساتھ رحم و شفقت کی تعلیم دیتا ہے کیا ہوا اس کے ماننے والوں کو کہ وہ ذاتی مفاد کے لیے

دوسروں پر ظلم وستم کر کے خوش ہونے لگے۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک جانور پر ہی ظلم کا انجام ملاحظہ ہو۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ وَ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ عُذِّبَتِ امْرَاَةٌ فِیْ هِرَّةٍ اَمْسَكَتْهَا حَتّٰى مَاتَتْ مِنَ الْجُوْعِ فَلَمْ تَكُنْ تُطْعِمُهَا وَلَا تُرْسِلُهَا فَتَاْكُلَ مِنْ خِشَاشِ الْاَرْضِ۔

حضرت ابن عمر و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، ایک عورت کو ایک بلی کے بندر کھنے پر عذاب کیا گیا جو بھوک سے مرگئی۔ اس عورت نے نہ اس کو کھانا کھلایا اور نہ آزاد کیا۔ کہ وہ زمینی جانوروں سے اپنی خوراک حاصل کر لیتی۔ (بخاری و مسلم)

ایک بلی کو ستانے اور بھوکا مار دینے پر اللہ کا عذاب ہوا تو ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا جنہوں نے اپنے بھائیوں کی روزی غصب کرنے، قتل و غارت کرنے اور معاشرے میں بدامنی پھیلانے ہی کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔ بہر حال دوسروں کی مدد کرنا حتی کہ جانوروں پر بھی رحم کرنا صدقہ ہے۔ مزید ملاحظہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ لَقَدْ رَأَيْتُ رَجُلًا يَتَقَلَّبُ فِی الْجَنَّةِ فِیْ شَجَرَةٍ قَطَعَهَا مِنْ ظَهْرِ الطَّرِيْقِ كَانَتْ تُؤْذِی النَّاسَ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا میں نے ایک شخص کو جنت میں آزادی سے گھومتا دیکھا کیونکہ اس نے راستے سے ایک ایسے درخت کو کاٹ دیا تھا جس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ (مسلم شریف)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَبَسُّمُكَ فِیْ وَجْهِ اَخِيْكَ صَدَقَةٌ وَّ اَمْرُكَ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَّ نَهْيُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَّ اِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِیْ اَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ وَّ نَصْرُكَ الرَّجُلَ الرَّدِیْٓءَ الْبَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ وَّ اِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيْقِ لَكَ صَدَقَةٌ وَّاِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِیْ دَلْوِ اَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اپنے بھائی کے سامنے تمہارا مسکرانا صدقہ ہے، تمہارا نیکی کی دعوت دینا صدقہ ہے، تمہارا برائی سے روکنا صدقہ ہے، تمہارا بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھانا صدقہ ہے راستہ سے پتھر اور ہڈی ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اور اپنے ڈول سے بھائی کے ڈول میں کچھ ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔ (ترمذی شریف)

یہ چند احادیث پیش کی گئیں جو یہ جاننے کے لیے کافی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں بھی اجر و ثواب کے اعتبار سے نہایت ہی اہم ہوتی ہیں اور ایسا عملی صدقہ ہیں جو قیامت کے دن کام آئے گا جس دن نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دنیا کے رشتے کام آئیں گے۔ نہ بغیر اذن الٰہی کسی کو کسی سفارش کی مجال ہوگی۔ پس مؤمن کو چاہیے کہ وہ دنیا میں چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو

صورت میں قیمتی موتی چنتا رہے تا کہ قیامت کے دن مالا مال ہو۔

عملی صدقہ پر اس مختصر گفتگو کے بعد اب ہم مالی صدقہ سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہیں گے۔ عام طور پر مالی صدقہ ہی کو صدقہ کہا جاتا ہے۔ یہی معنٰی قرآنی آیات سے مفہوم ہیں اور اسی کو انفاق فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ آپ گزشتہ صفحات پر ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اقسام صدقہ

صدقہ واجب، زکوٰۃ، صدقہ فطر، قربانی، نذر اور صدقہ نفل اپنی مرضی سے اللہ کی رضا کے لیے نبی مکرم علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق کسی بھی دینی کام کے لیے یا امت مسلمہ کی عام خدمت کے لیے خرچ کرنا جیسے تبلیغ دین میں علماء کی مالی امداد کرنا، غریبوں کو کھانا کھلانا، مساجد تعمیر کرانا، ان کے اخراجات میں حصہ لینا وغیرہ، قرآن کریم کی جن آیات میں صدقہ کی ترغیب دی جاتی ہے ان میں صدقہ واجب و نفل دونوں شامل ہیں۔ اور جہاں زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کا ادا نہ کرنے والا فاسق و فاجر اور منکر، مرتد، واجب القتل ہے۔ اور جن آیات میں صدقہ ادا نہ کرنے پر سخت وعید آئی ہے وہاں صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا نصاب بھی متعین ہے اور اس کی مقدار بھی۔ کہ شارع علیہ السلام نے وضاحت فرما دی کہ زکوٰۃ کب فرض ہوتی ہے اور فرضیت کی صورت میں مال کا کتنا حصہ ادا کرنا فرض ہے۔ ہاں صدقہ نفل کی کوئی مقدار نہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ مال کا کچھ حصہ حسبِ حیثیت ہر مسلمان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہنا چاہیے کم از کم چاہے وہ کھجور کی گٹھلی کا ٹکڑا ہو اور زیادہ سے زیادہ اتنا کہ جو اللہ سے اس کے رسول سے مؤمن کی محبت کا ثبوت فراہم کرے۔ لیکن طریقہ مسنونہ اللہ کی راہ میں اتنا دینا ہے جس سے اہل وعیال اور دیگر اہلِ حقوق کی حق تلفی نہ ہو۔ اہل وعیال کے ضروری اخراجات کو کم کر کے صدقہ وخیرات کرنا والدین و دیگر اعزاء کی ضروریات کی پروا نہ کرنا غریبوں کے لئے لنگر جاری کر دینا یا اصل وارثوں کو محروم کر کے ساری دولت و جائیداد کسی مسجد و مدرسہ کے لئے وقف کر دینا اسی قسم کی دوسری صورتیں تعلیم نبوی کے خلاف ہیں۔ اور جو عبادت خلافِ سنت ہو وہ کیا قبول ہوگی کہ عبادت تو نام ہی حضور علیہ السلام کی اداؤں کی پابندی کا ہے۔

طریقہ صدقہ

نبی مکرم علیہ السلام نے جو طریقہ صدقہ تعلیم فرمایا، احادیث کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدقہ کرتے وقت سب سے پہلے اپنے اعزاء، احباب اور دیگر قریبی لوگوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً:

عَنْ مَيْمُوْنَةَ بِنْتَ الْحَارِثِ اَنَّهَا اَعْتَقَتْ وَلِيْدَةً فِيْ زِمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَذَكَرَتْ ذَالِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَوْ اَعْطَيْتِهَا اَخْوَالَكِ كَانَ اَعْظَمَ لِاَجْرِكِ

حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنی لونڈی حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ میں آزاد کی اور اس کا تذکرہ حضور علیہ السلام سے کیا تو آپ نے فرمایا اگر تم اسے اپنے ماموں کو دے دیتیں تو زیادہ ثواب ملتا۔ (بخاری و مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ قَالَ جُهْدُ الْمُقِلِّ وَ ابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا، یا رسول اللہ! کون سا صدقہ افضل ہے تو آپ نے فرمایا کم سرمایہ والے کا خدمت دین میں کوشش کرنا اور اس سے ابتداء کرو جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہے۔ (ابوداؤد)

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَّ هِیَ عَلٰی ذِی الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَ صِلَةٌ

حضرت سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ مسکین پر صدقہ کرنا صرف صدقہ ہے۔ اور رشتہ دار کو صدقہ دینے پر دوہرا اجر ہے صدقہ کا اور صلہ رحمی کا۔ (ترمذی)

اسلام قومی اتحاد کا داعی ہے جس کی ابتداء کا، گھر اور خاندان سے حکم دیتا ہے کہ جس قوم کے گھروں اور خاندانوں ہی میں اتحاد نہ ہو وہ قوم کبھی متحد نہیں ہو سکتی۔ نیز اسلام معاشرے سے جہالت و غربت کا خاتمہ چاہتا ہے۔ اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ گھروں اور خاندانوں سے پہلے جہالت اور غربت کو ختم کیا جائے۔ لہذا تعلیم دی گئی کہ بصورت صدقہ دولت کی تقسیم کا آغاز گھر سے اور خاندان سے کرو۔ پہلے ان لوگوں کو خوشحال بناؤ جو تمہارے قریب تر ہیں، پھر اپنی تحریک آگے بڑھاؤ تو تم کامیاب ہو گے۔ اور معاشرے سے غربت و جہالت کا خاتمہ بھی ہو سکے اور قومی اتحاد بھی پیدا ہو گا۔ غور فرمایئے کیسی فطری تربیت کی جا رہی ہے۔ آج اتحاد بین المسلمین کے لیے نہ جانے کیا کیا جتن کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر اس سادہ سے طریقہ کار کو اپنا لیا جائے تو یہ جوہر خود بخود نصیب ہو سکتا ہے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام کی اس تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ وہ قائدین اور لیڈر غور کریں جو قومی اتحاد کے داعی ہونے کے دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اس تعلیم پر عمل کرنے سے انہیں لوگوں پر احسان مندی، ان سے خراج تحسین حاصل کرنے اور ان پر اپنی برتری اور فوقیت کے اظہار کا موقع فراہم نہیں ہو سکتا۔ اور شاید اسی لئے وہ اس طریقہ کار کو اپنانے پر آمادہ نہیں ہوتے اس کے لیے تو بڑا اخلوص درکار ہے۔ صرف رضائے الٰہی کا جذبہ شرط ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس سب سے زیادہ کھجوریں ہوتی تھیں اور اپنی جائیداد میں انہیں سب سے زیادہ ''بیرحاء'' والا باغ پسند تھا۔ جو مسجد نبوی شریف کے سامنے ہی تھا۔ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اکثر اس باغ میں تشریف لے جاتے اور اس کا عمدہ پانی نوش فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۹۲

تم ہرگز نیکی نہ پا سکو گے یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جسے تم پسند کرتے ہو اور تم جو کچھ مال خرچ کرو، تو بیشک اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ (آل عمران: ۹۲)

اس وقت ابو طلحہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم اس

وقت تک ہرگز نیکی نہ پا سکو گے جب تک اللہ کی راہ میں اپنا پسندیدہ مال خرچ نہ کرو''۔ پس مجھے بیرحاء والا باغ سب سے زیادہ پسند ہے لہذا میں اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں۔ یارسول اللہ! آپ کو اختیار ہے آپ اس کا جو چاہیں کریں۔ اس موقع پر حضور علیہ السلام نے حضرت طلحہ سے فرمایا شاباش، شاباش یہ بہت ہی منافع بخش مال ہے۔ اور میں نے تمہاری گزارش سن لی ہے اور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اس باغ کو اپنے اعزاء میں تقسیم کر دو۔ ابوطلحہ نے عرض کیا یارسول اللہ میں ایسا ہی کروں گا اور انہوں نے وہ باغ اپنے چچازاد بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا۔

نبی مکرم علیہ السلام نے صدقہ کا جو طریقہ تعلیم فرمایا یہ خاص طور پر ایسے حضرات کے لئے قابل غور ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری کے لیے خلاف سنت راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ بلاشبہ محنت بھی کرتے ہیں اور ایثار بھی۔ لیکن ان کی حالت دیکھ کر اہل علم کو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں بیکار کر رہے ہیں کیونکہ ان کا عمل خلاف سنت ہے۔ ہمارے مشاہدے میں ایسے بہت لوگ آئے جن کی غلط روی نے انہیں سخت نقصان پہنچایا۔ مثلاً ایک صاحب نے اپنے جماعتی پروگرام میں شرکت کے لیے ملازمت چھوڑ دی۔ چند دن بعد گھر میں فاقے ہونے لگے اور تنظیم کا کوئی فرد پوچھنے تک نہ آیا۔ ایک صاحب نے بیوی کا سارا زیور اس کی اجازت کے بغیر چرا کر اپنی جماعتی تحریک کو بطور چندہ دے دیا۔ بیوی لڑ جھگڑ کر گھر چلی گئی۔ اور بالآخر موصوف کو طلاق دینا پڑی۔ دو بچے بھی تھے جو بے آسرا ہو گئے۔ ایک صاحب جذبہ خدمت دین میں کئی کئی ماہ باہر رہتے تھے۔ متمول تھے، تاجر تھے۔ چند سال بعد پتہ چلا دیوالیہ ہو گیا۔ پیسے پیسے کو ترسنے لگے۔ اس کو مذہبی غلط روی کہا جاتا ہے۔ جو بظاہر خدمت دین نظر آتی ہے جبکہ حقیقتاً خلاف شرع ہے۔ اور تباہی و بربادی کا سبب ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے وہ اپنے ماننے والوں پر دین کی خدمت لازم قرار دیتا ہے لیکن اس کے لیے ایسے طریقوں کی تعلیم دیتا ہے جن کی پابندی زندگی کے تمام شعبوں کا تحفظ کرتی ہے۔ یعنی دین کی خدمت بھی ہوتی ہے۔ اور اہل و عیال کی کفالت بھی اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی بھی۔ مثلاً یہ صدقہ ہی ہے، اسلام میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ذریعہ اسلام، مسلم معاشرے سے غربت و جہالت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ دینی کاموں کو فروغ دینا چاہتا ہے لیکن اپنے گھر سے اس کو شروع کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہ اگر قوم کے افراد اپنے اپنے گھروں کو مالی، اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے درست کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو معاشرہ خود بخود درست ہو جاتا ہے کہ معاشرہ نام ہی افراد کی اجتماعی صورت کا ہے اور آج مسلم معاشرے کی بنیادی خرابی ہی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر پر توجہ دینے کے بجائے دوسروں کی خرابیاں ٹٹولنے میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کو وہ خدمت دین، تبلیغ دین کا نام دیتا ہے۔

صدقہ کے فوائد

صدقہ مالی عبادت ہے جس کا اصل مقصد تو غربت و جہالت کو ختم کرنا ہے جو پورے معاشرے کے لیے تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ کہ غربت کی کثرت اور جہالت کی زیادتی ہی کے سبب معاشرے میں چوری، ڈکیتی، قتل و غارت اور دوسرے طرح طرح کے جرائم جنم لیتے ہیں۔ لیکن اس قومی فائدے کے علاوہ بھی صدقہ کرنے والوں پر اللہ کا خصوصی کرم ہوتا ہے۔ ان کے رزق میں برکت ہوتی ہے، معاشی حالت درست ہوتی ہے۔ آفات و بلیات ٹل جاتی ہیں۔ سکون قلب میسر آتا ہے۔ زندگی کی بہت سی الجھنیں خود ختم ہو جاتی ہیں جیسا کہ حضور علیہ السلام کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ وَّ مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَّ مَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِّلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا اور اللہ عفو سے (ضرورت سے زیادہ مال خرچ کرنے سے) اس کی عزت میں اضافہ کرتا ہے اور جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کے درجات بلند فرما دیتا ہے۔ (مسلم شریف)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِیءُ غَضَبَ الرَّبِّ وَ تَدْفَعُ مِيْتَةَ السَّوْءِ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا صدقہ اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے اور دردناک موت کو دور کرتا ہے۔ (ترمذی شریف)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَا مِنْ مُّسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا اِلَّا كَانَ فِیْ حِفْظٍ مِّنَ اللّٰهِ مَا دَامَ عَلَيْهِ مِنْهُ خِرْقَةٌ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام سے سنا، آپ نے فرمایا جس نے کسی مسلمان کو کپڑا پہنایا تو جب تک اس کے جسم پر اس کپڑے کا ٹکڑا بھی باقی رہے گا، کپڑا پہنانے والا اللہ کے حفظ و امان میں رہے گا۔ (ترمذی شریف)

احادیث مبارکہ میں بیان کردہ صدقہ کی برکتیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ صدقہ عزت میں اضافہ کا ذریعہ ہے۔ جس کے حصول کے لئے ہم نہ جانے کیا کیا تگ و دو کرتے رہتے ہیں لیکن آسان طریقہ اختیار نہیں کرتے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اپنی دولت کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں، عزت خود بخود حاصل ہو جائے گی۔ صدقہ اللہ کے غضب کو دور کرتا ہے جو ہماری ساری قوت و طاقت کے باوجود ہمیں تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ کہ غضب الٰہی میں گرفتار ہو کر بڑی بڑی قومیں تباہ ہو گئیں۔ وہ لوگ بڑے ہی کامیاب رہتے اور پُرسکون زندگی پاتے ہیں جو اللہ کے غضب سے محفوظ رہیں۔ صدقہ دردناک موت سے بچاتا ہے۔ موت تو ہر ایک کو آنا ہی ہے۔ لیکن وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جو ہنستا مسکراتا چلا جائے۔ نہ اس کے سکرات موت دوسروں کے لئے عبرت بنیں نہ اس کی حادثاتی اور دردناک موت کی کہانیاں سننے میں آئیں۔ صدقہ ہی ہے جو عذاب الٰہی کی اس صورت سے بھی نجات دلاتا ہے۔ صدقہ اللہ کی حفظ و امان کے حصول کا ذریعہ ہے کہ کمزور انسان ہمہ وقت طرح طرح کے خطرات میں مبتلا رہتا ہے۔ کبھی دشمن کا خطرہ، کبھی بیماری کا خطرہ، کبھی ذلت وخواری کا خطرہ۔ ان خطرات سے حفاظت کی ساری تدابیر غیر مؤثر اور بیکار ہو سکتی ہیں۔ لیکن صدقہ وہ کامیاب تدبیر ہے جو کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ پس اس تدبیر کو اختیار کر کے مؤمن باعزت ہو سکتا ہے۔ اللہ کے غضب سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ دردناک موت سے بچ سکتا ہے۔ اللہ کی حفظ و امان میں اسے پناہ مل سکتی ہے کہ ربِ کریم اس سے راضی ہو جاتا ہے۔

وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِیْ يُؤْتِیْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ

تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾ (اللیل: ١٧ تا ٢١)

اور اس (جہنم) سے (بہت) دور رکھا جائے گا۔ سب سے بڑا پرہیزگار جو اپنا مال (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے تاکہ پاکیزگی حاصل کرے۔ اور اس پر کسی کا کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے (وہ تو اپنا مال) صرف اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند (شان والا) ہے اور ضرور عنقریب وہ راضی ہوگا۔

یہ آیت مبارکہ اگرچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی لیکن اس کا مژدہ قیامت تک آنے والے ان مؤمنین کے لیے ہے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم کو اپنی راہ منزل بناتے ہیں اور صرف رضائے الٰہی کے لئے صدقہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ متقی نہیں بلکہ اتقیٰ ہیں۔ ان کے لئے جہنم سے دور رکھے جانے کا مژدہ ہے کہ جہنم میں وہ جائے گا جس پر اللہ کا غضب ہوگا۔ اور صدقہ تو مخبر صادق ﷺ کے ارشاد کے مطابق ''اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے'' صدقہ کرنے والے پر صرف اللہ کی رحمت ہی سایہ فگن ہوتی ہے، دنیا میں بھی اس طرح کہ زندگی کے مصائب و آلام، آفات و بلیات، بیماریوں اور تکلیفوں سے نجات نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی اس طرح کہ صدقہ کرنے والے کو جہنم کی آگ سے دور رکھا جائے گا۔ بہت دور۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے درجات بلند کئے جائیں گے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١٨﴾ (الحدید: ١٨)

بے شک صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور جنہوں نے اللہ کو قرض حسنہ دیا ان کے لئے (ان کا مال) کئی گنا بڑھا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت کا اجر ہے۔

اخلاص

صدقہ بیشک دنیوی اور اُخروی برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ بشرطیکہ مقبول ہو۔ صدقہ ہی کیا تمام اعمال کی مقبولیت فضل الٰہی پر موقوف ہے۔ لیکن اگر اعمال کو ان کے شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے تو قبولیت کے یقین سے دل مطمئن ہوتا ہے اور اس لئے بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾ (التوبہ: ١٢٠)

بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کا ثواب ضائع نہیں کرتا۔

محسنین، حقیقت میں وہی ہیں جو اعمال کو ان کے شرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ تمام اعمال حسنہ کے لئے خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے، شرائط دو قسم کی ہیں ایک وہ جن کا تعلق ظاہر سے ہے جیسے نماز کے لئے وضو۔ ایسے شرائط کے ترک سے عبادت ادا ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی نے بغیر وضوء کے نماز پڑھی تو اس کا فریضہ ادا ہی نہیں ہوگا۔ دوسرے وہ شرائط جن کا تعلق باطن سے ہے۔ جیسے نماز کے لیے خشوع وخضوع۔ ان شرائط کو کوئی ادا نہ کرسکا تو بظاہر تو عبادت یا کوئی بھی نیکی ادا ہو جائے گی لیکن اس کی مقبولیت اس پر اجر و ثواب کا ملنا، یا اس کے دنیاوی فوائد کا حاصل ہونا مشکوک رہے گا۔ مثلاً

قرآن وحدیث میں نماز کے اُخروی فائدوں کے علاوہ اس کی دنیاوی برکات کا بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن ہم جیسے نمازی ان برکات وفوائد سے محروم ہیں۔ اس لئے کہ ہم نماز کو اس کے ظاہری شرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ لیکن باطنی شرائط پورے کرنے میں ناکام ہیں۔ ان تمام باطنی شرائط کو معلم شریعت ﷺ نے ایک ہی جملے میں بیان فرمادیا۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ وَ اِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوٰی۔

بیشک اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لیے اس کی نیت کے مطابق اجروثواب ہے۔

نبی مکرم علیہ السلام کے اس ارشاد کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ہم تک پہنچایا۔ حضور علیہ السلام نے اپنے خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کو منبر پر ہی بیان فرمایا۔ اس حدیث مبارکہ کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو چھ مقام پر بیان کیا۔ نیز تمام محدثین اس کو ضرور بیان کرتے ہیں محدث حافظ ابن مہدی کا قول ہے کہ جو شخص کتاب لکھے اس کو چاہئے کہ اس حدیث سے کتاب کا آغاز کرے۔ امام قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث دین کا تہائی حصہ ہے۔

حضور علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اعمال کے باطنی شرائط میں نیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ نیت ہی کے مطابق برآمد ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں بھی اس کو متعدد مقامات پر بیان کیا گیا اور اعمال میں اخلاصِ نیت کا حکم دیا گیا۔

وَ مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ ۝ (آل عمران:۱۴۵)

اور جو اعمال سے دنیا کا بدلہ چاہے ہم اس میں سے اسے دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے ہم اس میں سے اسے دیں گے، اور عنقریب ہم (اچھا) بدلہ دیں گے شکر کرنے والوں کو۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۝ (النساء:۱۳۴)

جو دنیا کا ثواب چاہے، تو اللہ کے پاس ثواب ہے دنیا اور آخرت کا اور اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ (الاعراف:۲۹)

اور اسی کی عبادت کرو، اس حال میں کہ تم خالص کرنے والے ہو اس کے لیے عبادت کو۔

صدقہ کی قبولیت کے لیے ظاہری شرط منّ واذیٰ ہے، کہ جس کو صدقہ دیا جائے اس پر نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ ہی کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے۔ اور باطنی شرط رضائے الٰہی ہے کہ صدقہ صرف اور صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے دیا جائے۔ اپنی دولت مندی یا سخاوت کی خوبی کا اظہار مقصود نہ ہو۔ اگر یہ ظاہری و باطنی شرائط پوری نہ کی گئیں تو اگرچہ صدقات واجبہ، زکوٰۃ، صدقہ فطر وغیرہ شرعاً تو ادا ہو جائیں گے لیکن دنیوی زندگی میں صدقات کے جن فوائد و برکات کا قرآن وحدیث میں وعدہ کیا گیا ہے، ان سے محروم رہے گی اور آخرت میں اس کے اجروثواب کا کیا حال ہوگا۔ آیت زیر مطالعہ کا آخری حصہ

ملاحظہ ہو۔" وہ اپنی کمائی سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے" یعنی قیامت کے دن انہیں کوئی اجر وثواب نصیب نہ ہوگا۔

مَنٌّ

کسی پر احسان رکھنا یا احسان جتانا شریعت مطہرہ نے اس کو ایسا بدترین عمل قرار دیا ہے کہ صدقہ جیسی عظیم عبادت کے ثواب تک کو یہ کھا جاتا ہے۔ دو وجہ سے اول اس لئے کہ کسی کی مدد کرنے والا، احسان جتا کر اس غلط خیال کا اظہار کرتا ہے کہ وہی اس کمزور کا سہارا بنا جس کی اس نے جسمانی یا مالی مدد کی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اس پر کرم کیا کہ اس کو مدد کرنے کے قابل بنا دیا۔ اللہ اگر چاہتا یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس کو محتاج بنا تا اور جس کی اس نے مدد کی اس کو مددگار بنا دیتا۔ پس اسے بجائے احسان جتانے کے کسی کی مدد کر کے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ اس کے لئے حصول ثواب کا ذریعہ بنا۔ اور اللہ کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ کہ اللہ انہی کے طفیل صاحب استطاعت لوگوں کو روزی دیتا ہے۔ جیسا کہ میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ مُصْعَبِ بن سَعْدٍ قَالَ رَأَى سَعْدٌ اَنَّ لَهُ فَضْلاً عَلٰى مَنْ دُوْنَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَ تُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ۔

مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خیال کیا کہ انہیں (دولت کی وجہ سے) دوسروں پر فضیلت ہے۔ پس حضور علیہ السلام نے فرمایا تم اپنے کمزور لوگوں کی وجہ سے مدد کئے جاتے اور روزی دیئے جاتے ہو۔ (بخاری شریف)

عَنْ اَبِي الدَّرْدَآءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ ابْغُوْنِيْ فِيْ ضُعَفَآئِكُمْ فَاِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ اَوْ تُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَآءِكُمْ۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا مجھے اپنے کمزوروں میں تلاش کیا کرو، کیونکہ تم اپنے ضعیفوں کے سبب روزی دیئے جاتے ہو، یا فرمایا تم اپنے کمزوروں کی وجہ سے مدد کئے جاتے ہو۔ (ابوداؤد)

دوسرے اس لیے کہ احسان جتانا ایسا زبانی تیر ہے جو کمزور ومحتاج کی عزت وآبرو اور اس کے جذبات کو اس کی خودی اور خودداری کو ایسا زخمی کر دیتا کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے مردہ نظر آنے لگتا ہے۔ نہ سر اٹھا کر چل سکتا ہے، نہ کسی محفل میں نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ کسی کو اتنا کمزور اور خوار کر دینے سے تو بہتر یہ تھا کہ اس کو اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا جاتا اور یہ احسان جتانے والا اس کی مدد ہی نہ کرتا۔ اللہ نے مؤمنین کو اس مرض سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے حبیب علیہ السلام کو حکم دیا:

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ (المدثر:٦)

(اے حبیب) کسی پر احسان نہ کیجئے زیادہ لینے کی نیت سے۔

یعنی اس لیے احسان نہ کیجئے کہ آپ پر اس سے بہتر احسان کیا جائے۔ یہ بھی ایک قسم کا من ہے۔ ظاہر ہے اللہ کے رسول ﷺ کسی پر احسان بدلہ لینے کی نیت سے نہیں فرماتے تھے۔ کہ بدلہ کی امید تو وہ کرے جسے کسی کے احسان کی ضرورت ہو یا اس کے احسانات قابل شمار ہوں۔ جب کہ میرے آقا کی شان تو بہت بلند و بالا ہے۔ آپ اللہ کے سوا کسی کے احسان کے

محتاج نہیں۔ نیز انسان وانسانیت پر اللہ کے بعد آپ ہی کے احسانات سب سے زیادہ ہیں۔ جن کا گننا اور شمار کرنا ناممکن ہے۔ جس کی بعثت ہی اللہ کا خصوصی احسان ہو، اس کے احسانات کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پس نبی کو احسان کے بدلے کی امید سے روکنے کا اصل مقصد غلاموں کو روکنا ہے۔ خود میرے آقا ﷺ نے اس بدعملی سے غلاموں کو بچانے کے لیے ارشاد فرمایا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنَّانٌ وَّلَا عَاقٌّ وَّلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا احسان جتانے والا، والدین کا نافرمان اور ہمیشہ شراب پینے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (نسائی شریف)

ذرا غور فرمایئے اس ارشاد پر۔ والدین کی نافرمانی سب ہی جانتے ہیں کتنا بڑا گناہ، جس کی صراحۃً قرآن کریم میں ممانعت موجود ہے اور شراب پینا کس قدر عظیم گناہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب کو نجس اور اس کے پینے کو عمل شیطان فرمایا ہے۔ احسان جتانے کو عام طور پر گناہ خیال ہی نہیں کیا جاتا لیکن حدیث شریف سے واضح ہے کہ یہ تینوں گناہ تقریباً ایک نوعیت کے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم کی سزا کا موجب ہو سکتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے یہ ارشاد ملاحظہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ ثَلٰثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلْمَنَّانُ الَّذِیْ لَا يُعْطِیْ شَيْئًا اِلَّا مَنَّهٗ وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهٗ بِالْحَلْفِ الْفَاجِرِ وَالْمُسْبِلُ اِزَارَهٗ۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا۔ ایک وہ شخص جو ہر نیکی کا احسان جتلاتا ہے، دوسرا وہ شخص جو جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال فروخت کرتا ہے، تیسرا وہ شخص جو تکبر کی وجہ سے اپنے کپڑوں کو لٹکا کر چلتا ہے۔
(مسلم شریف)

منان، احسان فرمانے والا اللہ ہے۔ صرف اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ اظہار احسان کرے۔ بندہ تو عبدالمنان احسان فرمانے والے کا غلام ہے۔ اسے کسی پر احسان جتانے کا حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں اسے صرف شکر ادا کرتے رہنا زیب دیتا ہے۔ کہ وہ اللہ کا بھی شکر ادا کرے۔ اللہ کا وعدہ ہے ''اگر تم شکر ادا کرتے رہو گے، تو ہم تمہیں اور زیادہ نوازتے رہیں گے''۔ نیز بندوں کے احسانات پر شکر ادا کرنا اللہ کو پسند اور نبی کریم علیہ السلام کی سنت ہے۔ بندوں کا آپس میں شکریہ ادا کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ باہمی تعاون کے جذبات پیدا ہوتے، ایک دوسرے کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔ جب کہ احسان جتانا نفرت پیدا کرتا ہے، دوست کو دوست سے جدا کر دیتا ہے، کوئی نہیں پسند کرتا کہ اس پر کوئی احسان جتائے۔ ہر ایک اس کو اپنی کمزوری اور ذلت وخواری سمجھتا ہے۔ لہٰذا اگر باپ بھی بیٹے پر احسان جتائے تو بیٹا اس سے دور ہو جاتا ہے اس سے ایسی منافرت پیدا ہوتی ہے کہ گھر بگڑ جاتے ہیں، خاندان منتشر ہو جاتے ہیں، اختلاف بڑھتا ہے، انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اسلام دین محبت ہے، پیغام اتحاد ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو ایسی عادات واطوار کی تعلیم دیتا ہے جس سے شجر محبت پروان چڑھے اور اس کے سایہ تلے نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی پناہ لیں۔ مصیبت زدہ یہاں آ کر سکون کا سانس لیں۔ پس وہ کیسے پسند کر سکتا ہے۔ ایسے عمل کو اور ایسے

لوگوں کو جو اس کی بنیادی تعلیم کے مقصد کو فوت کر دینا چاہیں۔ ایسا ہی عمل شرمن ہے جس کا کوئی داغ مومن پر نظر نہیں آنا چاہیے۔

اذیٰ

اذیٰ، ایذاء سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں تکلیف دینا، چاہے زبان سے ہو یا اعضاء سے، اسلام کسی کو کسی طرح تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں دیتا اور تکلیف پہنچانے والے کو نہ اللہ پسند کرتا ہے نہ اللہ کا رسول۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (التوبہ:۶۱)

اور جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اللہ کے رسول کو تکلیف بلا واسطہ پہنچائی جائے یا بالواسطہ، بلا واسطہ جیسے کافروں، منافقوں نے تکلیف پہنچائی اور بالواسطہ کہ آپ کے چاہنے والوں کو آپ کے غلاموں کو تکلیف پہنچائی جائے۔ یہ تکلیف چاہے زبانی پہنچائی جائے یا اعضاء سے تکلیف دینے والا اپنا ہی ہو یا غیر۔ کسی مسلمان کو کافر، مشرک، بدعتی کہنے والا کسی مسلمان پر الزام لگانے والا، کسی مسلمان کو گالی دینے والا، رسول کو زبانی تکلیف پہنچانے کا مرتکب ہے اور کسی مسلمان پر ہاتھ اٹھانے والا، کسی مسلمان کو قتل کرنے والا، امت میں انتشار پیدا کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے والا۔ رسول کو جسمانی تکلیف پہنچاتا ہے اور رسول کو تکلیف پہنچانا درحقیقت اللہ کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ (الاحزاب:۵۷)

بیشک جو لوگ تکلیف پہنچاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو، اللہ نے ان پر لعنت فرمائی، دنیا اور آخرت میں اور ان کے لیے ذلت وخواری کا عذاب تیار کیا۔

اس آیت میں پہلی آیت سے بھی زیادہ وعید ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے صرف آخرت کا عذاب ہی نہیں بلکہ دنیا میں بھی ان پر لعنت ہوتی ہے۔ دنیا میں لعنت ان کا چین وسکون سے محروم ہو جانا، دنیا والوں کی نظروں میں ذلیل وخوار ہو جانا، معاشی انحطاط کا شکار ہو جانا، سیاسی بحران میں مبتلا ہو جانا، غیروں کے در کا بھکاری بن جانا۔ یہ ہے دنیاوی لعنت جو اس وقت امت مسلمہ کی حالت کے عین مطابق ہے۔ کاش ہم اپنے اعمال کو سدھار لیں تاکہ اس سے نجات نصیب ہو سکے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ مومنین کو ستانے کا ذکر فرمایا گیا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (الاحزاب:۵۸)

اور جو لوگ ایمان والے مردوں اور عورتوں کو ستاتے ہیں، بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی خطا کی ہو، تو بیشک انہوں نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ (اپنے سر پر) اٹھایا۔

ظاہر ہے مومنین کو ستانا، ان کے جان ومال یا عزت وآبرو کو خطرے میں ڈال دینا ہے۔ خواہ یہ کام کوئی گھر والا اپنے گھر والوں کے ساتھ کرے یا کوئی خاندان والا اپنے خاندان کے ساتھ کرے۔ پڑوسی، پڑوسی کو ستائے۔ ایک جماعت کے

لوگ دوسری جماعت کے لوگوں کو ستائیں۔ ایک صوبہ کے لوگ دوسرے صوبہ کے لوگوں کو ستائیں۔ بہر حال ایذاء ایک کھلا گناہ ہے جس کا بوجھ ستانے والا اپنے سر پر اٹھائے پھرتا ہے۔ اسی کو فتنہ وفساد کہتے ہیں۔ جو لوگ بھی اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ ۝ (البروج:۱۰)

بیشک جن لوگوں نے ایمان والے مردوں اور عورتوں کو مصیبت میں ڈالا، پھر انہوں نے توبہ نہ کی ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔

اور میرے آقا ﷺ ایذاء اور فتنہ وفساد کا خاتمہ فرمانے کے لیے تعلیم دیتے ہیں:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَّ قِتَالُهٗ کُفْرٌ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ (بخاری ومسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَکَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَکُهُمْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا

جب کوئی کہے کہ لوگ ہلاک ہو گئے تو ان سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا وہی ہے۔ (مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَضٰی لِاَحَدٍ مِّنْ اُمَّتِیْ حَاجَةً یُّرِیْدُ اَنْ یَّسُرَّهٗ بِهَا فَقَدْ سَرَّنِیْ وَ مَنْ سَرَّنِیْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰهَ وَ مَنْ سَرَّ اللّٰهَ اَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: جس نے میرے امتی کی حاجت پوری کی اس ارادہ سے کہ وہ خوش ہو جائے تو اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا۔ اور جس نے اللہ کو خوش کیا تو اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (بیہقی)

عَنْ سَعِیْدِ بْنِ زَیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اِنَّ مِنْ اَرْبَی الرِّبٰوا اَلْاِسْتِطَالَةُ فِیْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَیْرِ حَقٍّ۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، بدترین سود مسلمان کی عزت پر ناحق ہاتھ ڈالنا ہے۔ (ابوداؤ)

عام مؤمنین کو ایذاء دینا جب اتنا بڑا جرم ہے تو اللہ اور اس کے رسول کے محبوب اور مقرب بندوں کو ستانے اور تکلیف پہنچانے کا انجام کس قدر برا ہوگا۔ یہ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ کسی پر لعن طعن کرنا الزام وتہمت لگانا یا کسی کی توہین کرنا بھی ایذاء ہی ہے۔ پس جو لوگ صحابہ کرام، اولیاء وصالحین، علماء ومشائخ کے لیے نامناسب الفاظ استعمال کرتے اور ان

کی توہین کرتے ہیں وہ بھی ایذاء کے مجرم ہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِيْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَ مَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ وَ مَنْ اٰذَاهُمْ فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اٰذَانِيْ فَقَدْ اٰذَى اللّٰهَ وَ مَنْ اٰذَى اللّٰهَ فَيُوْشِكُ اَنْ يَّاْخُذَهٗ۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو میرے بعد انہیں (تنقید و طعن کا) نشانہ نہ بنالینا جو ان سے محبت کرتا ہے تو میری محبت کی وجہ سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے تو مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے۔ جس نے انہیں تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی اور جس نے اللہ کو تکلیف دی تو قریب ہے کہ اللہ اس کو پکڑ لے۔ (ترمذی شریف)

ایذاء بہرحال ایک جرم ہے جو اگر افراد کی عادت بن جائے تو قوم کی تباہی و بربادی کا باعث ہو جاتا ہے اور پورے معاشرے میں افراتفری پیدا کر دیتا ہے۔ اسلام انسانوں کو امن وسکون کی زندگی فراہم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا کسی ایسے مرض کو پنپنے کی اجازت نہیں دیتا جس سے یہ مقصد فوت ہو جائے۔ نیز اسلام دینِ رحمت ہے وہ جو رحمت کا پیغام دیتا اور انسانوں پر اپنے عطا کردہ اصولِ زندگی کے ذریعہ رحمت کی بارش برسانا چاہتا ہے اس میں ایسے لوگوں کی ہرگز گنجائش نہیں جن کو ایذاء رسانی میں مزا آتا ہے ایسے موذی دنیا میں اللہ کی لعنت اور آخرت میں دردناک عذاب کے حق دار ہی ہو سکتے ہیں۔

ریاء

ریا کے معنی ہیں دکھاوا۔ احادیث میں اس کے ساتھ سُمعہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی سنانا، یعنی کوئی کام دکھاوے کے لئے کرنا۔ جیسے نماز پڑھنا تا کہ لوگ متقی اور نیک جانیں۔ یا صدقہ دینا تا کہ لوگ دولت مند اور سخی سمجھیں۔ یا کوئی کام سنانے کے لئے کرنا مثلاً قرات وخوش الحانی سے قرآن کریم کی تلاوت کرنا تا کہ لوگ قاری کہیں۔ یا تقریر سے سامعین کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا تا کہ لوگ بڑا عالم سمجھیں اور عزت کریں۔ جبکہ مسلمان کا ہر کام صرف اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ پس جو مسلمان ''ریاء وسمعہ'' کے مرتکب ہوتے ہیں وہ گویا ایک قسم کے شرک یا نفاق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لہذا وہ اعمال جو ''ریاء و سمعہ'' کے لئے کئے جائیں ضائع اور بیکار ہوں گے، مردود ہوں گے اور ان پر کوئی اجر وثواب نہ ہوگا۔ بظاہر تو یہ اعمال ادا ہو جاتے ہیں لیکن عمل کا مقصد صرف اس کا ادا ہو جانا تو نہیں بلکہ اس کا مقصد اس کے دنیوی اور اُخروی فوائد و برکات ہیں جن سے ''ریاء وسُمعہ'' کرنے والا نہ صرف محروم رہتا ہے بلکہ مزید تباہی اور عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم دکھاوے کے لئے نمازیں پڑھنے والوں کے حق میں فرماتا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ﴿۶﴾ (الماعون: ۴-۶)

تو ویل ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں۔

حضور نبی کریم علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ یُقْضٰی عَلَیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ فَاُتِیَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِیْهَا قَالَ قَاتَلْتُ فِیْكَ حَتّٰی اسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتَ وَ لٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِاَنْ یُّقَالَ جَرِیْءٌ فَقَدْ قِیْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْهِهٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ وَ رَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَ عَلَّمَهٗ وَ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَاُتِیَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِیْهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَ عَلَّمْتُهٗ وَ قَرَأْتُ فِیْكَ الْقُرْآنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِیُقَالَ هُوَ قَارِیٌٔ فَقَدْ قِیْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْهِهٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ وَ رَجُلٌ وَّ سَّعَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَعْطَاهُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ فَاُتِیَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِیْهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِیْلٍ تُحِبُّ اَنْ یُّنْفَقَ فِیْهَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِیْهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِیُقَالَ هُوَ جَوَّادٌ فَقَدْ قِیْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْهِهٖ ثُمَّ اُلْقِیَ فِی النَّارِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، قیامت کے دن لوگوں میں سب سے پہلے جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ شہید ہے۔ اس کو سامنے لایا جائے گا اللہ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا جن کو وہ پہچان لے گا پھر اس سے کہا جائے گا تو نے اس کے بدلے کیا عمل کیا۔ وہ عرض کریگا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ شہادت حاصل کی۔ اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے جنگ اس لیے کی تھی کہ تو بہادر کہلائے اور تجھے یہی کہا گیا پھر اس کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔
پھر اس شخص کو بلایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور قرآن کریم پڑھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا تو وہ ان کو پہچان لے گا۔ پس اس سے پوچھا جائے گا تو نے ان کے بدلے کیا کیا۔ وہ عرض کرے گا میں نے علم سیکھا، دوسروں کو سکھایا اور تیری رضا کے لیے قرآن پڑھا۔ اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے علم اس لیے حاصل کیا تھا کہ تو عالم اور قاری کہلائے اور لوگوں نے تجھے ایسا ہی کہا پھر اس کے لئے حکم ہوگا اور اس کو چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔
اور ایک شخص وہ ہے کہ اللہ نے اس کو فراخی رزق سے نوازا اور طرح طرح کے مال دیئے۔ اس کو لایا جائے گا اور اللہ اس کو بھی اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور پوچھے گا تو نے ان کے بدلے کیا کیا۔ وہ عرض کرے گا۔ مولا میں نے تیری کوئی پسندیدہ راہ نہ چھوڑی جہاں تیری رضا کے لئے مال خرچ نہ کیا ہو۔ اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے دولت اس لئے خرچ کی کہ تو سخی کہلائے پس تجھے ایسا ہی کہا گیا۔ پھر اس

کیلئے فیصلہ ہوگا اور اسے بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم شریف)

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ریاء کیسا بدترین کینسر ہے جو شہادت، علم اور صدقہ جیسے عظیم اعمال کو بھی کھا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے نبی کریم علیہ السلام کے یہ ارشادات ملاحظہ ہوں۔

عَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَ مَنْ يُّرَآئِی يُرَائِی اللّٰهُ بِهٖ

حضرت جندب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس نے کوئی عمل سنانے کے لیے کیا تو اللہ بھی اس کے ساتھ سناوا کرے گا۔ اور جس نے کوئی عمل دکھاوے کے لیے کیا تو اللہ بھی اس کے ساتھ دکھاوا کرے گا۔ (بخاری و مسلم)

عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ صَلّٰی يُرَآئِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَ مَنْ صَامَ يُرَآئِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَ مَنْ تَصَدَّقَ يُرَآئِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ۔

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو فرماتے سنا، جس نے دکھانے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے دکھانے کے لئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھانے کے لیے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْکُمُ الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ قَالَ الرِّيَآءُ۔

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، سب سے زیادہ ڈر جس سے میں تم پر ڈرتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ، شرک اصغر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا، ریاکاری۔ (مشکوٰۃ شریف)

ان چند احادیث سے آپ پر ریا کی حقیقت واضح ہوگئی۔ انسان کی اس سے زیادہ حرماں نصیبی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ عزت و شہرت کے لئے اپنی آخرت کا سرمایہ بھی داؤ پر لگا دے۔ عبادات اور تمام ہی اعمال صالحہ، حقیقت میں سرمایہ آخرت ہیں۔ ذخیرہ آخرت ہیں۔ ہر شخص اپنی نجات کا یقین اپنے اعمال کے مطابق کرتا ہے۔ دنیا کا سرمایہ اگر ایک مرتبہ برباد ہو جائے تو انسان دوبارہ محنت و کوشش کر کے نقصان کی تلافی کر لیتا ہے۔ لیکن جس دن اس سرمایہ سے خزانہ خالی ہونے کی خبر ملے گی تو بندہ خالی جھولی اور خالی ہاتھ ہی رہے گا کہ وہ دن نہ دوبارہ عمل کا ہے نہ کمانے کا۔ بس کرم ہے میرے آقا مخبر صادق ﷺ کا کہ انہوں نے وہ دن آنے سے قبل خسارے اور نقصان کی خبر دے دی۔ پس اگر ہم آپ کی خبر پر یقین کر کے اپنی اصلاح کر لیں تو نقصان کی تلافی کا موقع ہے۔ اور بڑا ہی آسان طریقہ ہے۔ ریاء و نمود کرنے والے توبہ کر لیں۔ اللہ توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ جو سرمایہ اب تک ضائع ہوا وہ بھی دوبارہ خزانہ میں پہنچا دیا جائے گا اور مستقبل میں بربادی کا خطرہ بھی نہ رہے گا۔ ریاء کوئی معمولی جرم نہیں۔ ویسے بھی کوئی جرم معمولی نہیں ہوتا۔ ریاء کو خاص طور پر شرک اصغر قرار دیا گیا۔ کہ بندہ جو کام صرف اللہ کی رضا کے لئے کرتا ہے اس میں بندوں کی خوشنودی کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ یہی تو شرک ہے۔ سجدہ اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن

اس کا مقصد بندوں سے خراج عقیدت حاصل کرنا ہو۔ یہی تو شرک ہے۔ یہ کرم ہے آقا علیہ اللہ کا کہ آپ نے اس کو شرک مطلق قرار نہیں دیا۔ شرک اصغر قرار دیا کہ اگر بندہ اس سے توبہ کر لے تو اس کے ضائع شدہ اعمال کا ثواب عطا کر دیا جائے گا۔

صدقہ ،مَن ،اذیٰ ،رءیاء

کی ضروری وضاحت کے بعد متعلقہ آیت کا مفہوم واضح ہے۔

اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں محنت سے کمائی ہوئی دولت کا خرچ کرنا، صدقہ کرنا تمہارا بڑا ہی ایثار ہے۔ جس کا تمہارے لیے ہماری طرف سے دنیا و آخرت میں بڑا اجر و ثواب ہے۔ اس کی بڑی برکتیں ہیں۔ پس تم صدقہ کرنے کے بعد اس کی حفاظت کرو۔ ایسا نہ کرنا کہ جس کی تم نے مدد کی اس پر احسان جتلا کر یا اس کی طرف سے احسان کی توقع کر کے یا اس کو کسی دوسرے طریقہ سے ستا کر اپنے اجر و ثواب کو ضائع کر دو، کہ صدقہ وہی مفید و بہتر ہے جس کے بعد من و اذی نہ ہو۔ اللہ رب العزت فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ (البقرہ:۲۶۲۔۲۶۳)

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے لیے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اچھی بات اور لوگوں کو معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف پہنچے اور اللہ بے نیاز ہے بہت حلم والا ہے۔

اور دکھاوے کے لیے بھی صدقہ کرنا، کیونکہ ریاء کے لئے تو وہ آدمی خرچ کرتا ہے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور اللہ کے سامنے حاضر ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ جو صدقہ ریا کے لیے کیا جائے وہ بظاہر دنیا میں تو نظر آتا ہے لیکن آخرت میں جب اس کی ضرورت ہوگی تو پتہ چلے گا کہ ریاء نے اس کو کھا کر دنیا ہی میں ختم کر دیا تھا۔ جیسے چکنے پتھر پر اگر مٹی جمی ہو اور اس پر بیج ڈال دیا جائے تو وہ اگ تو جائے گا لیکن بارش اس کو بہا لے جائے گی۔ اور پتھر چکنا ہی چکنا رہ جائے گا۔ ایسی کھیتی سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو پائے گا۔ اسی طرح دکھاوے کے لیے جو صدقہ کیا جاتا ہے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو پاتا۔ ساری کمائی ضائع ہو جاتی ہے۔ ریاء و نمود کافروں کا طریقہ ہے اور وہ کفر میں اتنے ڈوب چکے ہیں کہ اب اللہ نے بھی انہیں ہدایت نہ دینے کا فیصلہ فرما لیا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (البقرہ:۲۶۵)

اور ان لوگوں کی مثال جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے اس باغ کی سی ہے جو اونچی زمین پر ہو اس پر زور کی بارش ہوئی تو وہ اپنا پھل دگنا

لایا۔ پھر اگر زور کی بارش اسے نہ پہنچے تو شبنم (ہی) کافی ہے۔ اور اللہ تمہارے سب کام دیکھ رہا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں، اس مؤمن کے انفاق فی سبیل اللہ کی خوبی ایک مثال سے واضح کی جارہی ہے جو دو مقاصد کے لیے یہ عمل اختیار کرتا ہے۔

اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ، تَثْبِيْتًا لِّلْقَلْبِ

اللہ کی مرضی حاصل کرنے اور دل کو پختہ کرنے کے لیے

رضائے الٰہی

رضائے الٰہی، مقتضاء ایمان ہے۔ مؤمن کی زندگی کا مقصود اصلی ہے۔ تمام عبادات و اعمال کا محور ہے کہ نماز، روزہ اور دیگر عبادات و اعمال اصل مقصود نہیں یہ سب ذرائع ہیں اللہ کی رضاء حاصل کرنے کے۔ فرشتے ہوں یا جنات یا اشرف المخلوقات انسان، سب ہی کے تقرب کا ذریعہ اللہ کی خوشنودی ہے۔ ابلیس اسی لیے مردود بارگاہ ہوا کہ اس نے اللہ کی رضا کے خلاف آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ آدم علیہ السلام اسی لیے زمین پر اتارے گئے کہ انہوں نے اللہ کی مرضی کے خلاف شجر ممنوعہ کا پھل کھایا۔ ابراہیم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں ﷺ تک جملہ انبیاء و رسل نے مظالم و مصائب صرف اللہ کو راضی کرنے ہی کے لیے برداشت کیے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو چھوڑ چھاڑ تیزی سے کوہ طور پر پہنچے صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی جلدی میں۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ (طٰہٰ: ۸۳۔۸۴)

اور اے موسیٰ، آپ نے اپنی قوم کو چھوڑ کر آنے میں جلدی کیوں کی۔ (جواباً) عرض کیا کہ وہ لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں اور اے میرے رب میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی تاکہ تو راضی ہو جائے۔

صحابہ، اولیاء، اصفیاء، صالحین کی اطاعت میں محنت و مشقت کا مقصد رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جنہوں نے خلوص کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لیے گردنیں کٹائیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ قرار دیے گئے۔ جنہوں نے اپنا وطن چھوڑا، اپنی دولت لٹائی، ان خوش نصیبوں کو دنیا ہی میں اللہ کی طرف سے رضا اور خوشنودی کا مژدہ سنادیا گیا۔

رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (المائدہ: ۱۱۹)

اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آیت کے آخری جملہ پر غور فرمایئے۔ ہم نے اپنی زندگی میں نہ جانے کن مقاصد کے حصول کو اپنی کامیابی سمجھ رکھا ہے۔ جبکہ ہمارا خالق اپنی رضا کو سب سے بڑی کامیابی قرار دیتا ہے۔ پس اس کا حصول ہماری زندگی کا مقصود ہونا چاہیے۔ یہی ہماری منزل ہونا چاہیے اور اسی راہ کو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔ جو اس منزل تک پہنچا ہے کہ "یہی سب سے بڑی کامیابی ہے" اس راہ کے لئے صحابہ کرام کی حیات مقدسہ مشعل ہے جس کی روشنی سے ہم منزل کو پاسکتے ہیں۔ غور کیجئے صحابہ کرام کی ایثار

قربانی کے ان واقعات پر جن سے ہماری کتابیں پر ہیں۔ کون سی کشش تھی، کیا لالچ تھا جس کے لیے اللہ کے ان مقدس بندوں نے قربانیاں دیں۔ اپنا وطن چھوڑا، دولت لٹائی، شب و روز محنت و مشقت کی، بھوکے پیاسے رہ کر ریگستانوں کے سفر کیے۔ رشتہ ناطے توڑے، اپنوں کو چھوڑا، غیروں کو اپنا بنایا، اپنے بچوں کو اپنی آنکھوں سے ذبح ہوتے دیکھا، اپنی گردنیں کٹائیں، صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے۔ غزوہ بدر، غزوہ احد اور دیگر غزوات کے واقعات ہم نے بارہا سنے۔ غزوہ احزاب میں صحابہ کی مشقت پر قرآن گواہ ہے۔ حدیبیہ میں نہ چاہنے کے باوجود صحابہ نے اپنے آقا کے احکام کو جس طرح تسلیم کیا، قرآن میں وہ موجود ہے۔ واقعات کربلا سن کر ہم ہر سال نہ جانے کتنے آنسو بہا لیتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا ہمیں کہ ہم اصل مقصد پر توجہ نہیں کرتے۔ یقین جانیئے اگر ہم نے ان تمام واقعات کے بنیادی مقصد کو پیش نظر رکھا ہوتا تو ہماری منزل بھی رضائے الٰہی ہوتی اور جب مؤمن اس کو اپنی منزل بنالیتا ہے تو دنیا ہی میں اس کے لئے مژدہ ہے۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۝ (التوبہ:۱۰۰)

اور مہاجرین وانصار میں سے سبقت کرنے والے اور جنہوں نے نیک کاموں میں ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی رضا حاصل کر لینا ہی ''بڑی کامیابی ہے'' کامیابی حاصل کرنے میں مہاجرین وانصار صحابہ نے سبقت کی۔ ان کی اتباع کر کے ہم بھی اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔

نام نہاد ترقی کے اس دور میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی غرض سے دوڑنے والوں نے زمین، پانی، ہوا، فضا ہر جگہ شعبدہ بازی کی اور کامیابی کو تلاش کیا لیکن وہ یہی متعین نہ کر سکے کہ کامیابی ہے کیا؟ پس وہ ساری شعبدہ بازیاں بلا مقصد کرتے رہے اور ہر قدم آگے بڑھا کر انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ حتیٰ کہ موت نے ان کو آ لیا۔ اور وہ نیست و نابود ہو گئے۔ اسلام نے سب سے پہلے کامیابی کا تعین کیا پھر اس کے حصول کے لیے تگ و دو اور محنت و کوشش کا حکم دیا۔ اس کی راہوں کو متعین کرنے اور اس کے حصول کے طریقوں کی تعلیم دینے کے لئے رہبر و راہنما مقرر فرمائے۔ ان راہنماؤں یعنی انبیاء و رسل علیہم السلام کی قیادت کو تسلیم کر لینے کے بعد جس نے ان کے بتائے ہوئے طریقوں کو اپنایا اور ان کی متعین کردہ راہ کو اختیار کیا وہ مادی و ظاہری وسائل کے سہارے کے بغیر ہی کامیاب و کامران رہا۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک کامیابی کے دعویدار ایسا ایک کامیاب شخص بھی پیش نہ کر سکے جس کی کامیابی اپنوں ہی میں مسلم ہو۔ جبکہ نبی امی ﷺ کی تعلیم و تربیت نے ایسے بے شمار کامیاب و کامران پیدا کر دکھائے جن کو صرف اپنوں نے ہی بالاتفاق تسلیم نہ کیا بلکہ غیروں نے بھی ان کی کامیابی کا اعتراف کیا۔ کس کا نام لیا جائے، قابل شمار ہوں تو چند سطور میں ان کے نام لکھ دیئے جائیں۔ یہ تو اللہ کا لشکر ہے جس کے فرد اعلیٰ، مؤمن اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور آخری، آخر ہوا ہی نہیں۔ آخر تو جب ہوتا جب معلم امی ﷺ کی

تعلیم کا اختتام ہو جاتا۔ ان کی تعلیم تو جاری ہے قیامت تک جاری رہے گی اور اس لشکر کے سپاہی پیدا ہوتے رہیں گے اور جو بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر رضا الٰہی کو اپنا مقصد زندگی بنالے گا اس کو خوشخبری ملتی رہے گی۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾ (المجادلہ:۲۲)

اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہ لوگ ہیں اللہ کا لشکر، (اے دنیا والو) خبردار رہو، بیشک اللہ کا لشکر ہی کامیاب ہونے والے لوگ ہیں۔

یہی لوگ ہیں جنہیں طمانیت قلب نصیب ہوتی ہے جو ہر قسم کے خوف وخطر سے محفوظ پرسکون زندگی کا ذریعہ ہے۔ اسی سے دنیا میں عزت وعظمت ملتی ہے اور آخرت میں بلند وارفع مراتب حاصل ہوتے ہیں اور ان کا بلندترین مقام یہ ہے کہ رب کریم کی طرف سے ان کو ان کے بہترین انجام کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾ (الفجر:۲۷۔۳۰)

اے نفس مطمئنہ، لوٹ، اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پھر میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو۔

اللہ کی طرف سے "راضیۃ مرضیہ" کا مژدہ مومن کامل کی معراج، رفعت وبلندی کی انتہائی منزل ہے۔ اس سے اوپر مقام نبوت ہے جس میں صفی اللہ، خلیل اللہ، کلیم اللہ، روح اللہ، سب ہی نظر آتے ہیں۔ اس سے بھی اعلیٰ مقام محبوبیت ہے۔ جو صرف ایک کے لیے مخصوص ہے کہ محبوب ہوتا ہی ایک ہے۔ اسی مقام پر محبوب نے اُدنُ منی کی صدا سنی اور دنیٰ فتدلیٰ کا منظر دیکھا۔ یہی صاحب معراج ﷺ ہیں۔ جن سے وابستہ ہونے والوں کو معراج ملی اور ان کی اپنی اصل معراج وہ نہیں جس میں انہیں وہاں بلایا گیا۔ جہاں کسی ملک مقرب کی بھی رسائی نہیں۔ بلکہ ان کی اصل معراج تو وہ مژدہ رب ہے جس میں ان کی رضا پوری کرنے کا وعدہ فرمایا گیا۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴿۵﴾ (الضحیٰ:۵)

اور بیشک عنقریب آپ کا رب آپ کو (اتنا) دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

رضائے الٰہی مومن کا مقصد حیات ہے۔ تمام عبادات واعمال کی روح اور جان ہے۔ ایک سجدہ بھی اگر صرف اس کی رضا کے لیے ہو جائے تو دن رات کی ان عبادتوں سے بہتر ہے جو اپنی اغراض کے لیے یا ریا ونمود کے لیے کی جائیں۔

دل کی پختگی

تثبیت کے معنی ہیں کسی چیز کا پختہ کرنا، مضبوط کرنا۔ اسی سے ثابت ہے یعنی وہ عمل یا قول جو کسی دعوے کو پختہ ومستحکم کرتا ہو۔ جیسے کلمہ پڑھنا، نماز ادا کرنا، دعوئے ایمان کو ثابت کرتا ہے۔

تثبیت قلب، دل کی پختگی، ایک ایسی قلبی کیفیت ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد کوئی کام کسی کے کہنے پر یا کسی

سے حکم کی تعمیل میں یا کسی بدلے کی امید پر نہیں ہوتا۔ بلکہ دل اس کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور جب ... م ہو جاتا ہے تو دل میں ایک سرور سا اطمینان سا پیدا ہوتا ہے جیسے ہمارے دنیاوی معاملات کا حال ہے۔ مثلاً بھوک کے وقت ہم کسی کے کہے بغیر کھانا کھانے پر آمادہ ہوتے ہیں اور جب اچھا کھانا میسر آتا ہے تو ایک خاص سرور محسوس کرتے ہیں۔ اسی کیفیت کو دل چاہنا یا دل خوش ہو گیا وغیرہ کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔ ہر عمل کے لیے تثبیت قلب ضروری ہے کہ اس کے بغیر آسان سے آسان کام بھی دشوار اور بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ اور کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ ہو جائے کوئی لطف اور مزا نہیں آتا۔ اسی بات کو عام لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ دل نہ چاہے تو چھوٹا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے اور دل نہ چاہے تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔ یہ کیفیت دنیوی معاملات میں تو بہت کم ہوتی ہے کہ دنیا کا کون سا کام ہے جس کو ہمارا دل نہیں چاہتا۔ کہیں خواہشِ نفس کی تکمیل اور کہیں دولت کا لالچ۔ ہمیں ہر وقت ہر کام پر آمادہ و تیار رکھتے ہیں۔ دیکھ لیجئے سارا دن دنیا کے پیچھے بھاگنے اور دولت کمانے میں تگ و دو کرنے کے باوجود بھی ہم کبھی نہ تھکتے ہیں اور نہ اکتاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں شیطان کو مداخلت کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن دینی معاملات میں ہر وقت یہی حالت طاری رہتی ہے کہ یہاں شیطان پوری پوری مداخلت کرتا ہے۔ تقریباً پانچوں نمازوں کے وقت کوئی نہ کوئی ایسی وجہ نکل آتی ہے کہ نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ یہی حال دیگر عبادات کا ہوتا ہے۔ پس یا تو عبادت بالکل ہی چھوٹ جاتی ہے اور یا یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سر سجدے میں اور دل دوکان میں یا مکان میں۔ سجدہ کر کے سرور نہیں آتا بلکہ جلد سے جلد بھاگنے کی فکر طاری ہوتی ہے۔

تثبیت قلب کی اہمیت و ضرورت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لیے حالات نہایت ناسازگار تھے حتیٰ کہ جن خوش قسمتوں نے اس وقت اسلام قبول کیا انہیں کفار و مشرکین کی طرف سے سخت ظلم و ستم اور مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا، ان حالات نے نبی مکرم علیہ السلام کو بھی اس قدر متفکر کر دیا تھا کہ ہر وقت آپ کے قلب مبارک پر بوجھ رہتا تھا۔ اللہ رب العزت نے اپنے پیارے حبیب علیہ السلام کو تسلی دینے اور مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام کے واقعات بیان فرمائے اور ارشاد فرمایا:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ (ہود:۱۲۰)

اور یہ سب جو ہم آپ سے انبیاء کے واقعات بیان کرتے ہیں (اس لیے ہے) کہ آپ کے قلب کو پختہ کر دیں۔

یعنی فکر و پریشانی کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے بھی اسلام کو مٹانے اور انبیاء کو ان کے مشن میں ناکام کرنے والے ذلیل و خوار ہوتے رہے ہیں۔ اب بھی ایسا ہوگا۔ بس مبلغین کا دل پختہ اور مضبوط ہونا چاہیے۔

نیز قرآن کریم بتدریج نازل کرنے اور شریعت کے احکام آسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، دینے میں یہی حکمت رہی۔ فرمایا گیا:

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚۛ كَذٰلِكَ ۚۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا ۝ (الفرقان:۳۲)

اور کافر کہنے لگے، قرآن کریم ایک دم کیوں نہیں اتارا گیا۔ اس طرح (اس لیے کیا) تا کہ ہم اس کے ساتھ آپ کا دل پختہ کر دیں اور اس لیے ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے۔

قرآن کریم پچیس سال میں نازل ہوا۔ حالانکہ اللہ چاہتا تو ایک مرتبہ میں نازل فرما دیتا۔ شریعت کے اکثر احکام بھی آہستہ آہستہ مکمل کیے گئے۔ مثلاً ابتداء شراب سے اظہار نفرت کیا گیا، پھر حرمت کا حکم آیا۔ روزہ ابتداء کچھ آسانیوں اور دشواریوں کے ساتھ رہا۔ پھر اس کے مکمل احکام دیئے گئے۔ ایسا ہی بعض دیگر عبادات و معاملات میں کیا گیا۔ اس میں حکمت و مصلحت ''تثبیت قلب'' ہی کی تھی، کہ پہلے لوگوں کو عادی بنایا جائے تا کہ ان کے لیے مکمل شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ لیکن اب دل پختہ کرنے کے لیے احکام شرع میں تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ اسی لئے کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اب شریعت مکمل ہے اور مکمل رہے گی۔ ''تثبیت قلب'' کا مقصد حاصل کرنے کے لئے اب اسلاف کا طریقہ ان کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کافی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جو لوگ اسلاف کے حالات زندگی سے ناواقف و جاہل ہیں انہی کے لیے دین کی پابندی بہت دشوار ہوتی ہے لیکن جو لوگ علم رکھتے ہیں نہ ان کے لیے احکام دین پر عمل مشکل ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں شریعت کے کسی حکم پر کوئی اعتراض ہوتا ہے۔ پس یوں سمجھ لیجئے کہ ''علم دین، مسلمان کے قلب کو پختہ کر دیتا اور دین پر عمل کو آسان بنا دیتا ہے''، عبادات کی پابندی، معاملات میں دیانت، قول میں حق و صداقت، حلال سے محبت، حرام سے نفرت، غرضیکہ ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اہل علم کے لیے سہل و آسان ہو جاتی ہے۔ نبی مکرم علیہ السلام اکثر دعا فرماتے تھے۔

يَا مُثَبِّتَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ

اے دلوں کو پختہ کرنے والے، ہمارے دلوں کو اپنے دین پر پختہ فرما دے۔ (ابن ماجہ)

کوئی عبادت، اصل مقصد نہیں بلکہ جملہ عبادات، تثبیت قلب کی تربیت اور اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ مثلاً نماز کی پابندی نمازی میں ہر قسم کی برائیوں سے رکنے کی پختگی پیدا کرتی ہے۔ روزہ، صبر، ہمدردی اور غرباء کی امداد پر آمادہ کرتا ہے۔ زکوٰۃ دین کے لیے مالی ایثار کا عادی بناتی ہے۔ حج اللہ کے حکم کی تعمیل میں کاروبار، اہل و عیال اور وطن چھوڑنے رسول کی اداؤں پر عمل کرنے اور اللہ کے دربار میں حاضری کے عقیدے کو مستحکم کرنے کا اثر رکھتا ہے۔ اسی طرح صدقہ انسان کے دل سے دولت کی محبت نکال دیتا ہے اور یہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ انسان حرام کے لاکھوں پر حلال کے سینکڑوں کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ نیز دولت کمانے سے زیادہ اسے خرچ کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔ وہ صرف مانگنے والوں کو نہیں دیتا، بلکہ خرچ کے مواقع کا انتظار کرنے لگتا ہے اور انہیں تلاش کرتا پھرتا ہے۔ جب کسی کو دیتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے دینے کے قابل بنایا۔ یہ ہے ''تثبیت قلب''۔

اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اور تَثْبِيْتًا لِّلْقَلْبِ، کے مفہوم کی مذکورہ بالا وضاحت کے بعد آیت زیر بحث کے مضمون پر غور فرمایئے۔

ایسے لوگوں کے انفاق فی سبیل اللہ کی افادیت اور مضبوطی کو ایک مثال سے بیان کیا جا رہا ہے۔ جو صرف اللہ کی رضا، اور دین پر اپنے دلوں کو پختہ کرنے کے لیے اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کو اپنے صدقات سے دنیا و آخرت

میں ایسے ہی فائدہ ہوتا ہے جیسے ایک باغ کے مالک کو اپنے ایسے باغ سے نفع ہوتا ہے جو بالائی زرخیز زمین پر ہو۔ جس پر اگر زور دار بارش ہوتی ہے تو باغ کے پھلوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بارش کا زیادہ پانی نشیبی زمین کی طرف بہہ جاتا ہے اور جب زور دار بارش نہیں ہوتی تب بھی وہ باغ سرسبز ہی رہتا ہے کہ اونچی زمین پر ہونے کی وجہ سے اس پر اوس پڑتی رہتی ہے جو اس کو تروتازہ رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ جس نے اپنے قلب میں رضائے الٰہی کا بیج بولیا۔ وہ اب چاہے مقدار کے اعتبار سے زیادہ صدقہ کی بارش کرے یا کم صدقہ دے اس کی کھیتی بڑھتی ہی رہے گی۔ دل پختہ ہوتا رہے گا۔ اور اس تروتازہ قلب سے سکون وطمانیت کے پھل ملتے رہیں گے۔ اور یہی سرسبز وشاداب باغ آخرت میں اس کے لیے جنت کی صورت میں ہوگا۔

اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُۙ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۠ ﴿۲۶۶﴾ (البقرہ:۲۶۶)

کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں اس کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں اور اسے بڑھاپا پہنچ گیا ہو اور اس کے کمزور بچے ہوں۔ تو اسے گرم ہوا کا ایک جھونکا پہنچے جس میں آگ تھی، تو وہ (باغ) جل گیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے آیتیں بیان فرماتا، تاکہ تم فکر سے کام لو۔

آیت مذکورہ میں صدقہ اور جملہ اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی تلقین ایک نہایت ہی پرکشش مثال کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ جس کی وضاحت سے قبل ہم ''اخلاص'' کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اخلاص

کسی کام کو کسی ایک کے لئے خاص کرنے کا نام اخلاص ہے۔ دنیوی معاملات میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے اور دینی امور میں بھی۔ دنیوی طور پر کوئی شخص اس وقت تک قابل اعتماد اور باعزت نہیں ہوسکتا جب تک اس میں اخلاص نہ ہو۔ مثلاً دو دوست ایک دوسرے کو اپنا راز اس وقت تک نہیں بتا سکتے جب تک دونوں کو باہمی دوستی میں خلوص کا یقین نہ ہو جائے یا آپ اپنا محافظ کسی ایسے شخص کو نہیں بنا سکتے جب تک آپ کو یہ یقین نہ ہو کہ یہ شخص آپ کے دشمن سے ملا ہوا نہیں ہے۔ اور وہ آپ کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور آپ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز جانتا ہے۔ یہی حال دنیا کے تمام معاملات کا ہے کوئی ایسا شخص جو دوست و دشمن سے برابر کا تعلق رکھتا ہو یا دوسروں کے فائدے پر اپنے فائدے کو ترجیح دیتا ہو نا قابل اعتماد ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرے میں اس کی عزت ہوتی ہے۔ جیسا نبی مکرم علیہ السلام کے دور میں گروہ منافقین کا حال تھا کہ نہ مسلمان ان پر اعتماد کرتے اور ان کی عزت کرتے تھے اور نہ ہی کافر۔ گویا دنیاوی معاملات میں اخلاص نہ ہو تو آدمی بالکل ہی بے سہارا ہو جاتا ہے۔ ذلیل وخوار سمجھا جانے لگتا ہے، اس سے کہیں زیادہ دینی امور میں اخلاص کی اہمیت ہے کہ عبادات واعمال اگرچہ بظاہر ادا ہوتے ہیں لیکن ان کے ظاہری و باطنی فوائد اور دنیوی واخروی برکات، اخلاص کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں۔ مخلص ہی اللہ اور رسول کی نظر میں قابل اعتماد ہے۔ محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اسی اہمیت کے اظہار کے لیے اللہ نے اپنے پیارے محبوب علیہ

السلام کوخلوص پیدا کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ آپ سے زیادہ اخلاص کی خوبی کس میں ہوسکتی ہے۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ...... قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝ (الزمر: ۲، ۳، ۱۴)

آپ (اے حبیب) اللہ کی عبادت کرتے رہیں اسی کے لیے اپنی بندگی کو خالص رکھتے ہوئے...... اے لوگوں سن لو کہ خالص بندگی اللہ ہی کے لئے۔

پس اے میرے طریقے پر عبادت کرنے والے مؤمنو، تم بھی اپنی عبادات اور اعمال میں خلوص پیدا کرو۔ صرف اللہ کی رضا کے لیے ہر کام کرو۔ نہ کسی کو خوش کرنے کے لیے نہ دکھاوے کے لیے۔ حتی کہ جنت کے لالچ میں بھی نہیں۔ وہ راضی ہوگیا تو خود بخود سب مل جائے گا، مانگنے تک کی ضرورت نہ ہوگی۔

اللہ نے اپنے پیارے محبوب علیہ السلام کو اخلاص کا حکم دیا اور ہمارے عمل کے لیے اس کا اعلان کرایا۔ نبی مکرم علیہ السلام نے اس کی مزید تاکید کے لیے مختلف انداز میں ہمیں اس کی تعلیم دی۔ آپ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ اَعْمَالِكُمْ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔ (مسلم شریف)

یعنی نیک و متقی ہونے کے لیے ظاہری شکل وصورت اور لباس کا متشرع ہونا یا دولت کا بہانا لازمی نہیں۔ اللہ کے یہاں تو اخلاص کی قدر ہے۔ صرف فرائض ادا کر لینے والا اور اللہ کی راہ میں چند پیسے خرچ کر دینے والا اس شخص سے زیادہ مقرب و محبوب ہے جو شب وروز عبادات میں مصروف رہے۔ بظاہر سنن و مستحبات کا پابند ہو۔ مشائخ جیسا مخصوص لباس پہنے، خوب صدقہ و خیرات کرے لیکن سب کچھ ریاء و نمود کے لیے ہو، خلوص کہیں نہ ہو۔ آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ ایسا شخص نہ صرف اپنے اعمال کو اکارت کر رہا ہے بلکہ شرک اصغر کا مرتکب ہو رہا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا صَلّٰى فِی الْعَلَانِيَةِ فَاَحْسَنَ صَلّٰى فِی السِّرِّ فَاَحْسَنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا عَبْدِیْ حَقًّا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا: بیشک بندہ جب لوگوں کے سامنے اچھی طرح نماز پڑھے اور تنہائی میں بھی اچھی طرح نماز پڑھے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرا سچا بندہ ہے۔ (ابن ماجہ)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَعْمَلُ الْعَمَلَ فَيَطَّلِعُ عَلَيْهِ فَيُعْجِبُنِیْ قَالَ لَكَ اَجْرَانِ اَجْرُ السِّرِّ وَ اَجْرُ الْعَلَانِيَةِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام سے کسی نے پوچھا، یارسول اللہ!

میں کوئی کام صرف اللہ کے لئے کرتا ہوں لیکن لوگوں کو اس کا پتہ چل جاتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔
آپ نے فرمایا تیرے لیے دوگنا اجر ہے۔ عمل کو پوشیدہ رکھنے کا اور اس کے ظاہر ہونے کا۔ (ابن ماجہ)

سرکار کے ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ اگر اپنے تقوے کا قصداً اظہار و اعلان مقصود نہ ہو اور لوگوں کو معلوم ہو جائے، لوگ اس کی تعریف کریں اور اس کی وجہ سے عزت و احترام کریں تو یہ اخلاص کے منافی نہیں۔ بلکہ اس شخص کو خوش ہونا اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے اسے نیکی کی توفیق بخشی اور لوگوں کی نظروں میں باعزت بنایا۔ نیز مزید نیک بننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر فرائض کی ادائیگی کا اظہار تہمت سے بچنے اور لوگوں کو فرائض کی پابندی کرنے کی ترغیب کی نیت سے کیا جائے تو زیادہ باعث ثواب ہے۔ مثلاً ایک شخص پانچوں نمازوں کے لیے مسجد آتا ہے جس سے مقصود جماعت کے ثواب کے علاوہ یہ بھی ہو کہ لوگ اسے بے نمازی نہ کہیں یا اسے دیکھ کر اس کے متعلقین بھی پابند صلوٰۃ بنیں تو یہ ہرگز اخلاص کے خلاف نہیں۔ زکوٰۃ کے لیے خاص طور پر حکم ہے کہ اعلان و اظہار کے ساتھ ادا کی جائے۔ تاکہ دوسروں کو ترغیب ہو اور وہ بھی اس فریضہ کو ادا کریں۔ ایسے شخص کو اپنی زکوٰۃ ادا کرنے کے ثواب کے علاوہ، ان لوگوں کی زکوٰۃ کا ثواب بھی ملے گا جو اس کو دیکھ کر ادا کر رہے ہیں جبکہ کسی دینے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

بہر حال اخلاص، اعمال کی مقبولیت کی بنیاد ہے، اللہ تعالیٰ صدقات کا حکم دیتے ہوئے اخلاص کے ساتھ صدقہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کو مؤثر فرمانے کے لیے آیت مذکورہ بالا میں ایک مثال دی جارہی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی مثال ہے جو بوڑھا ہو چکا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، جن کی کفالت کا بوجھ اس پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بچوں کی کفالت بھی ہو اور اس کو آرام بھی ملے۔ پس اس نے اپنی ساری جمع پونجی سے کھجوروں، انگوروں اور دوسرے پھلوں کا ایک نہایت ہی خوبصورت باغ لگایا جس کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لیے اس نے اس میں نہریں کھودیں اور آس لگائے بیٹھا ہے کہ اس باغ کی آمدنی میرے اس وقت کام آئے گی جب میں کچھ کرنے کے قابل نہ ہوں گا، نہ ہی کوئی میری مدد اور تعاون کرنے والا ہوگا۔ لیکن افسوس ہوا یہ کہ اچانک اس باغ میں آگ لگ گئی۔ اس کی سب امیدیں خاکستر ہو گئیں۔ سوچو اس شخص کی پریشانی اور بے چارگی کا کیا حال ہوگا۔ یہ صدقات، عبادات اور تمام اعمال در حقیقت انسان کا باغ ہیں جو اس دنیا میں لگایا جاتا ہے تاکہ ایسے دن کام آئے جس دن اس کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ نہ بیع، کاروبار ہوگا نہ خلّہ۔ دوست کی دوستی ہوگی نہ شفاعہ، کسی کی سفارش ہوگی۔ سوچو کیا حال ہوگا اس شخص کا جس کے باغ کو مَن، اذیٰ اور ریاء نے جلا کر پہلے ہی خاکستر کر دیا ہو۔ پس اے مومنو، نیکیاں کرو، صدقات دو اور اپنے لگائے ہوئے اس باغ کو اخلاص کے پانی سے سیراب کرتے رہو تاکہ تمہاری وابستہ امیدیں پوری ہو سکیں۔ دیکھو اللہ جو کچھ تمہیں بتارہا ہے یہ نہایت ہی قابل غور و فکر ہے۔ ان باتوں کو خوب سوچو اور عمل کرو۔

ان آیات پر ہم نے خاصی طویل گفتگو کی۔ تاہم ایک بات مزید بیان کرنا نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ تینوں آیات میں تین مثالیں بیان کی گئیں۔ پس ہم "امثال قرآن" کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ مطالعہ کا لطف دوبالا ہو۔

امثال قرآن

مثال، تشبیہ، استعارہ ہر زبان میں کلام کی خوبی اور متکلم کے بلیغ و فصیح ہونے کی دلیل سمجھے جاتے ہیں۔ زبان عربی

ہمیشہ سے اپنے اندر بلاغت کی ساری خوبیاں رکھتی ہے۔ یقیناً اس لیے کہ اس میں اللہ کا آخری کلام نازل ہونا تھا جو ہمیشہ باقی اور محفوظ رہنے والی آسمانی کتاب ہے اور اس لیے کہ یہی اللہ کے آخری نبی کی زبان ہوگی۔ جس کی نبوت کا چمکتا آفتاب کبھی غروب نہ ہوگا۔ نیز اس لیے کہ یہی جنتیوں کی زبان ہوگی۔ اہل عرب کو ہر دور میں اپنی زبان پر اتنا ناز رہا کہ وہ غیر عرب کو عجمی، یعنی گونگا کہتے ہیں۔ مثال، تشبیہ واستعارہ عربی کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا ہے جس سے عربی ادب کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ کسی شخص کو ماہر وفصیح خطیب تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک اس کے کلام میں یہ خوبیاں نہ پائی جائیں۔ قرآن کریم عرب کے اصول فصاحت و بلاغت پر نہیں بلکہ اس فصاحت و بلاغت میں اضافہ اور اس کی اصلاح کرتا ہوا نازل ہوا۔ اسی لیے بار بار اس کی زبان کو "عربی مبین" کہا گیا۔ اور اس کی اسی خوبی کو منجملہ دیگر خوبیوں کے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل بنایا گیا کہ جب کفار مکہ نے کلام الٰہی کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ ان کو کوئی سکھاتا ہے اور یہ ہمیں سنادیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ ان عقل کے ماروں نے سکھانے والوں کے جو نام لیے وہ سب غلام غیر عربی تھے۔ اللہ ان کو جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ (النحل: ۱۰۳)

اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو یہ قرآن ایک انسان سکھاتا ہے۔ حالانکہ جس کی طرف یہ تعلیم قرآن کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے۔ اور یہ قرآن فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے۔

مثال، کلام کی وضاحت اور مخاطب کو سمجھانے کا ایک صحیح طریقہ تھا۔ لہٰذا قرآن کریم نے بھی اس کو باقی رکھا۔ جب کہ تفہیم کا یہ انداز سابقہ کتابوں میں بھی اختیار کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر مثالوں کے ذریعہ اپنے کلام مبارک کی وضاحت فرمائی۔ اس لیے نہیں کہ کلام الٰہی میں کوئی ابہام و اشکال تھا بلکہ اس لیے کہ بعض ناقص ذہن اصل کلام کو سمجھ نہیں پاتے جو لوگ صاحب قرآن ﷺ پر ایمان لانے کے بعد آپ کی تعلیمات کی روشنی سے قرآن پر غور و فکر کرتے ہیں ان کے لئے اللہ کا کلام بالکل واضح ہے وہ اس کے ایک ایک لفظ کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنی ناقص عقل پر اعتماد کرتے یا نورِ ایمان سے محروم ہوتے ہیں ان پر مثالوں کے سہارے کلام الٰہی کو واضح کیا جاتا ہے تاکہ کوئی شخص استفادہ قرآن سے محروم نہ ہو۔ لیکن برا ہو ضد اور ہٹ دھرمی کا جو اس کے باوجود بھی انسان کو محرومی اور بدنصیبی میں مبتلا کردیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اللہ کے فضل و کرم کو اس کے کلام لاریب فیہ کا عیب و نقص بتانے لگتا ہے۔ جیسا کہ کفار و مشرکین قرآنی مثالوں کے متعلق کہا کرتے تھے کہ اللہ جیسی بلند عظمت اور شان رکھنے والے کے کلام میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثال اور ان کا تذکرہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ کلام کلام الٰہی نہیں ہو سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ مثال متکلم کی شان کے مطابق ہونا چاہیے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ متکلم کی شان کے مطابق کلام ہوتا ہے اور مثال مخاطبین کی عقلوں کے مطابق دی جاتی ہے۔ اللہ رب العزت نے معترضین کے اس لغو اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾ (البقرہ:۲۶)

بیشک اللہ حیا نہیں فرماتا، اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال، مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی، تو جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے (اتری) ہے اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے بہتوں کو، اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو۔

یعنی مچھر، مکھی یا اس سے چھوٹی بڑی چیزوں کو بطور مثال بیان کرنا متکلم کی شان کے خلاف ہرگز نہیں کہ اصولِ بلاغت کے مطابق متکلم اور مثال میں مشابہت ضروری نہیں، بلکہ مثال اور ممثل لہ کے درمیان مشابہت ہونا تقاضۂ بلاغت و فصاحت ہے۔ پس قرآن اس تقاضہ کو پورا کرتا ہے اس پر اعتراض صرف وہی کر سکتے ہیں جو پہلے ہی کفر و ضلالت میں مبتلا ہوں۔ اہلِ ایمان تو قرآن کے ہر حرف کو حق جانتے ہیں۔ خصوصاً ان مثالوں کا وہ لطف حاصل کرتے ہیں۔ ان سے وہ کلام الٰہی کو مزید آسانی سے سمجھتے ہیں۔ ان سے ان کا ایمان اور زیادہ مستحکم و مضبوط ہوتا ہے۔

اللہ رب العزت جل مجدہ اپنے کلام کی تاثیر کو ایک مثال سے واضح فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (الحشر:۲۱)

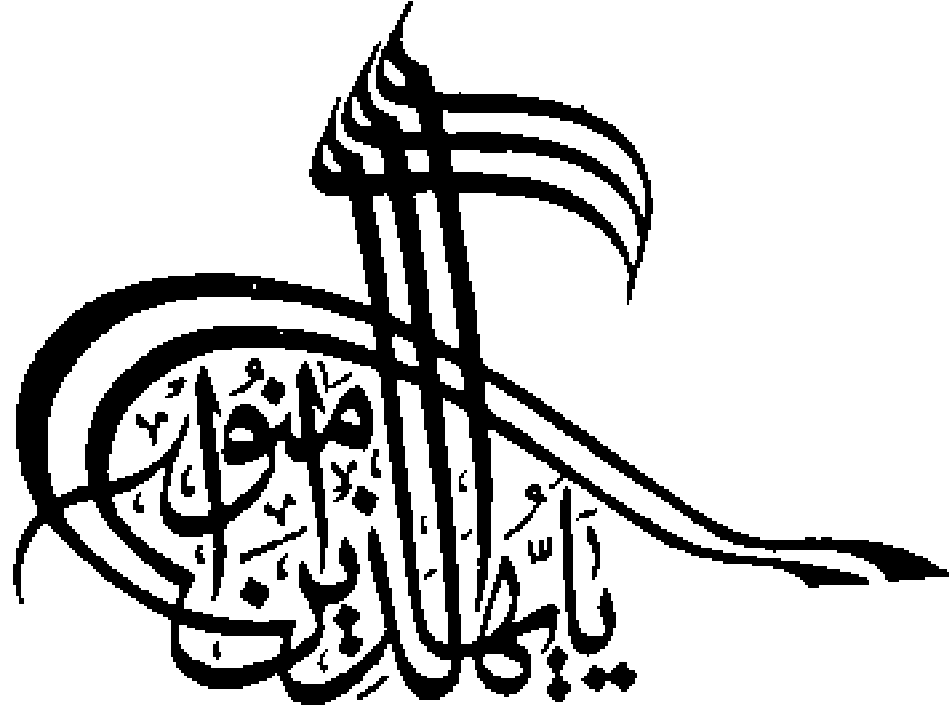
اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو (اے مخاطب) ضرور تو اسے (اللہ کیلئے) جھکتا ہوا اللہ کے خوف سے پھٹا ہوا دیکھتا۔ اور یہ مثالیں لوگوں کے لیے ہم بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

یعنی قرآن کریم تو دلوں پر اثر انداز ہونے والی کتاب ہے۔ اس کی تاثیر ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ حتی کہ اگر پہاڑوں کو عقل و شعور دے کر ان پر اللہ کا یہ کلام نازل ہوتا تو وہ بھی اپنی سختی کے باوجود اللہ کے سامنے جھک جاتے اور اللہ کے خوف سے پھٹنے لگتے لیکن قرآن کریم کا اثر قبول نہ کرنے والا انسان اپنی ہٹ دھرمی اور نفس پرستی کے سبب ان پتھروں سے بھی سخت ہو جاتا ہے اور اس پر آیات قرآنیہ کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ ایک مثال ہے جس پر غور کرو کہ اللہ مثالیں غور و فکر کرنے ہی کے لیے بیان فرماتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ امثلہِ قرآنی معجزاتِ قرآن میں سے ایک معجزہ ہے کہ اللہ نے جس کمالِ مشابہت کے ساتھ مثال بیان فرمائی اس پر عقلِ انسان دنگ ہے اور اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ جو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ایک بین ثبوت ہے۔ نیز ان مثالوں سے اہلِ ایمان پر حق مزید واضح ہوتا ہے۔ اللہ توفیق دے تو امثلہِ قرآن کا بغور مطالعہ کیجئے پھر دیکھئے کیا لطف آتا ہے۔ آیات زیر گفتگو میں صدقہ سے متعلق جو تین مثالیں بیان ہوئیں، انہی پر غور فرمایئے اور دیکھئے کس طرح باطل و بیکار صدقہ کی وضاحت کی گئی۔ کس طرح اخلاص کے ساتھ پیش کیے جانے والے صدقہ کے مفید و مستحکم ہونے کو بیان کیا گیا اور کس طرح ہر کسی کے لیے صدقہ کی ضرورت و اہمیت کو واضح فرمایا گیا۔ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۱۰

البقرہ: ۲۶۷ تا ۲۷۷

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪
وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا
اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ
مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ
الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ
نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا
الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ
سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِي

سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ٘ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ٘
تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ٘ لَا یَسْــٴَـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا٘ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ۝
اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ٘
وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝
اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ
الْمَسِّ٘ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا٘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا٘
فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ٘ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ٘ وَمَنْ عَادَ
فَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ٘ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝
یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ٘ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ۝
اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ٘ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝ (البقرہ: ۲۶۷۔۲۷۷)

اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیں اور (اللہ کی راہ میں) ناقص چیزوں کے دینے کا ارادہ نہ کرو کہ تم اس سے خرچ کرتے ہو حالانکہ تم (خود) اسے لینے والے نہیں مگر یہ کہ تم اس میں چشم پوشی کرلو اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے بہت حمد کیا ہوا۔ شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے وعدہ فرماتا ہے اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔ وہ حکمت عطا فرماتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت دی گئی تو بے شک اسے بہت بھلائی عطا کی گئی، اور نصیحت نہیں قبول کرتے مگر عقل والے۔ اور جو بھی تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا، یا کوئی منت مانی، تو بے شک اللہ اسے جان لیتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اگر تم ظاہر کر کے خیرات دو تو کیا ہی اچھا ہے اور اگر تم اسے چھپاؤ اور فقیروں کو دو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور وہ مٹا دے گا تمہارے کچھ گناہوں کو اور اللہ تمہارے سب کاموں سے خبردار ہے۔ ہدایت پر (کسی کو) لانا تمہارے ذمہ نہیں، ہاں اللہ جسے چاہے ہدایت پر لاتا ہے اور تم جو مال خرچ کرو تو تمہارے ہی نفع کے لئے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کی رضا کے لیے، اور تم جو مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے، اس کا پورا ثواب تمہیں دیا جائے گا اور تم ظلم نہ کیے جاؤ گے۔

(یہ خیرات) ان محتاجوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے۔ وہ زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے جاہل انہیں غنی سمجھتا ہے۔ (ان کے) سوال سے بچنے کے سبب، تو پہچان لے گا انہیں ان کی صورت سے وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے، اور جو مال تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو بیشک

اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

جو لوگ اپنے مال رات، دن پوشیدہ اور ظاہر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس، اور ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے چھو کر شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا بیع تو سود ہی کی طرح ہے اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود۔ تو جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی تو وہ باز آ گیا تو اس کا ہو چکا جو اس نے پہلے لیا ہو، اور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے۔ اور جو اس سے دوبارہ سود لیا تو وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ نہیں پسند کرتا کسی ناشکرے گناہ گار کو۔

بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے اور نماز قائم رکھی اور زکوۃ دیتے رہے ان کے لئے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اے ایمان والو! اپنی کمائی اور زمین سے جو کچھ ہم نے تمہارے لیے پیدا کیا ان میں سے اللہ کی راہ میں نفیس و پاکیزہ چیزیں خرچ کرو۔ ایسا مال اللہ کے لئے نہ دو جس کو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے اس عمل کا فائدہ تمہیں کو پہنچے گا۔ کیونکہ اللہ کسی چیز کا محتاج نہیں وہ تو غنی اور حمید ہے۔ تم شیطان ملعون کے بہکائے میں نہ آنا وہ تمہارے دل میں یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے تمہاری دولت کم ہو جائے گی۔ ایسا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیطان کی باتوں پر عمل سے تنگدستی آتی ہے۔ غربت آتی ہے اور انسان برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جبکہ احکام الٰہی کی تعمیل گناہوں کی بخشش کا ذریعہ اور اللہ کے فضل کا وسیلہ ہے۔ اللہ ہی بڑی وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔

اللہ کے انعامات میں سے سب سے بڑی نعمت حکمت ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اس نعمت سے نواز دیتا ہے اور جسے یہ نعمت نصیب ہوگئی وہ ہر اعتبار سے بلند و بالا اور مالا مال ہو جاتا ہے۔ پس تم اہل حکمت کی عزت کیا کرو۔ یہ تمہاری عقلمندی کا ثبوت ہوگا۔ کیونکہ اہل حکمت کے مراتب کو اہل عقل ہی جانتے اور سمجھتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں تم جو کچھ خرچ کرتے ہو اور جس نیت سے خرچ کرتے ہو وہ اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ پس خوب خرچ کرو اور صرف اس کی رضا کے لئے خرچ کرو کہ اس عمل میں ریا، دکھاوا دوسروں کو خوش کرنا بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والوں کا دنیا و آخرت میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ صدقہ چاہے تم ظاہر کر کے کرو یا چھپا کر اگر اس میں خلوص ہے تو تمہیں اس کا فائدہ ضرور ہو گا۔ اس سے تمہارے گناہ بھی مٹ جائیں گے۔ اللہ تمہارے کاموں کے مقاصد کو بخوبی جانتا ہے، پس اگر مقصد صحیح ہے یعنی اللہ کی رضا کا حصول تو تمہارا عمل ضرور مقبول ہوگا۔ اس پر تمہیں ضرور اجر و ثواب ملے گا۔

تم لوگوں کی مالی مدد اس نیت سے کرتے ہو وہ بھی تمہاری طرح ہدایت یافتہ ہو جائیں تو تم اپنا کام جاری رکھو۔ اگر وہ ہدایت قبول نہیں کرتے تو تم نیکی سے کیوں رکتے ہو۔ ہدایت دینا تو اللہ کا کام ہے۔ تمہیں تمہارے عمل کا فائدہ ہوگا تم تو

صرف اللہ کی رضا چاہتے ہوتو اللہ تم سے راضی ہوکر تمہارے عمل کا تمہیں پورا پورا اجر عطا فرمائے گا۔ تمہارے اجر میں کمی کر کے ہرگز تم پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔

تمہارے صدقات کے مستحق دوسروں کے علاوہ خصوصی طور پر وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دین میں مصروفیت کے سبب اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔ تمہاری طرح وہ حصول معاش کی فرصت نہیں پاتے وہ ضرورت مند ہیں۔ لیکن نہ تو ان کے چہروں سے ان کی ضرورت کا پتہ چلتا ہے اور نہ وہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔ جاہل انہیں دولت منداور غنی سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت یہ نہیں۔ پس تم ان کی مدد کرو۔ ان کو صدقہ دو اگر ایسے لوگ مجاہد ہیں تو تمہیں ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کا ثواب ہوگا اور اگر یہ لوگ اہلِ علم ہیں تو تمہیں ان کے ساتھ خدمتِ دین، تبلیغِ دین، اشاعتِ دین میں شرکت کا اجر ملے گا۔

اے ایمان والو! ہمارا اصول ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ظاہر یا پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، ہم انہیں اجر وثواب سے نوازتے ہیں اور دنیا میں مصائب وآلام، تنگدستی وغربت کے خوف سے آزاد کردیتے ہیں اور آخرت میں بھی وہ اپنی نجات کے غم میں مبتلا نہ ہوں گے۔ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے جسے دنیا میں کوئی خوف نہ رہے اور آخرت کا کوئی غم نہ رہے۔ ذرا سوچو تو سہی اس کی زندگی کیسی پُرسکون اور پُرکیف ہوجاتی ہے۔ پس تم صدقہ کرنے میں کوتاہی اور سستی نہ کرو۔

اے ایمان والو! اللہ نے تم پر بڑا کرم کیا ہے کہ حصول معاش اور دولت کمانے کے لئے تمہیں تجارت کا وسیع میدان عطا فرمایا ہے۔ پس اس سے خوب فائدہ حاصل کرو۔ لیکن اس وسیع میدان میں جو کانٹے، گندگی اور حرام ہے اس سے بچتے رہو۔ یہاں سب سے گندی چیز ربو، سود ہے۔ یہ کافروں کا خیال ہے کہ بیع اور ربوٰ ایک ہی چیز ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں بیع کو اللہ نے حلال کیا ہے اور ربو کو حرام، پس جو محنت ومشقت سے حلال روزی حاصل کرنے کی بجائے، سہولت وآسانی سے حرام دولت کمائے گا وہ دنیا وآخرت کے خسارے میں مبتلا ہوگا کہ ربوٰ سے دولت کمانے والا مکار وچالاک، متکبر ومغرور، حشر کے دن مخبوطُ الحواس اپنی قبر سے نکلے گا اور اللہ کی مخلوق اس کا تماشہ دیکھے گی۔ پھر اسے جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس نے اگر ربو کو کافروں کی طرح حلال سمجھا تھا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ جہنم میں رہے گا اور اگر حرام سمجھ کر کھاتا رہا تو سزا کا عرصہ پورا کر کے آزاد ہوگا اور دنیاوی خسارہ یہ ہے کہ ربو کی دولت چاہے کتنی ہی جمع کر لی جائے لیکن ایک نہ ایک دن سب برباد ہوجاتی ہے۔ جب کہ صدقہ دینے والوں کا مال بظاہر کم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں بڑھتا ہے کہ اللہ اس میں برکت پیدا فرما دیتا ہے۔

اے ایمان والو! تم مؤمن کامل بنو کہ جو لوگ نیکیاں کر کے نمازوں کی پابندی کر کے، زکوٰۃ ادا کر کے اپنے ایمان کے کمال کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں رب ان کو دنیا وآخرت میں اجر عطا فرماتا ہے۔ وہ ہر قسم کے خوف وغم سے آزاد ہوجاتے ہیں۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾
(البقرہ:۲۶۷)

اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ کرو، اوران چیزوں میں سے جو ہم

نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کیں، اور (اللہ کی راہ میں) ناقص چیزوں کے دینے کا ارادہ نہ کرو کہ تم
اس سے خرچ کرتے ہو، حالانکہ تم (خود) اسے لینے والے نہیں، مگر یہ کہ تم اس میں چشم پوشی کر لو۔ اور
جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے، بہت حمد کیا ہوا۔

طیبٰت اور خبائث

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں "طیّبٰت" خرچ کرو اور "خبیث" خرچ کرنے کا ارادہ تک نہ کرو۔ طیبٰت، طیّب کی جمع ہے جس کے معنیٰ اگرچہ حلال و پاکیزہ کے بھی ہیں لیکن یہاں عمدہ اور پسندیدہ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد خبیث کا لفظ ہے جس کے معنیٰ ہیں گندی، خراب، بیکار اور ناپسندیدہ چیز۔ کبھی حرام کو بھی خبیث کہہ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ حرام بھی گندا، خراب، بیکار اور ناپسندیدہ ہوتا ہے۔

طیّب، چاہے حلال کے معنیٰ میں ہو یا عمدہ و نفیس کے معنیٰ میں بہر حال انسان کا بھی پسندیدہ ہے اور اللہ کا بھی۔ اسی لئے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے وہی چیزیں پسند فرمائی ہیں جو طیّب ہوں۔ قرآن کریم کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ (المائدہ: ۴)

آپ سے پوچھتے ہیں وہ کون سی چیزیں ہیں جو ان کے لیے حلال کی گئی ہیں۔ آپ فرما دیجئے، حلال کی گئی ہیں تمہارے لیے طیبٰت۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (الاعراف: ۱۵۷)

اور وہ (رسول) حلال کرتا ہے ان کے لیے طیبٰت کو اور حرام کرتا ہے ان کے لیے خبائث کو۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۴ (المؤمن: ۶۴)

وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو قرار کی جگہ بنایا اور آسمان کو چھت اور تمہاری صورتیں بنائیں تو بہت اچھی صورتیں بنائیں۔ اور تمہیں طیبٰت سے رزق عطا فرمایا۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ تو اللہ بڑی ہی برکت والا سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ: ۱۰۰)

(اے حبیب) فرما دیجئے نہیں برابر ہو سکتا خبیث اور طیّب اگرچہ خبیث کی کثرت تمہیں تعجب میں ڈال دے، تو اے عقلمندوں اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝۸۱ (طہٰ: ۸۱)

کھاؤ، ان طیبٰت میں سے جو ہم نے تمہیں عطا فرمائیں اور اس میں حد سے نہ بڑھو ورنہ میرا غضب تم پر

نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا، تو بیشک وہ (ہلاکت کے گھڑے میں) گرا۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ

(آل عمران: ۱۷۹)

(اے لوگوں) اللہ ایمان والوں کو اس حال پر نہ چھوڑے گا، جس پر تم ہو یہاں تک کہ علیحدہ کردے خبیث کو طیب سے۔

یہ چند آیات پیش کی گئیں جن میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر جگہ مؤمنین کے لیے طیبت کو پسند کیا جا رہا ہے اور خبائث سے ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا ہے۔ طیبات حلال ہیں، خبائث حرام۔ طیبات ہی کو بندوں کا رزق بنایا گیا۔ خبائث چاہے کتنی ہی کثرت سے ہوں، آسانی سے میسر بھی آئیں لیکن طیبات سے برابر نہیں ہو سکتے چاہے وہ کم ہوں اور مشکل سے حاصل ہوں۔ طیبات ہی کھانے کا حکم ہے جو حد سے تجاوز کر کے خبائث کی طرف بڑھے گا وہ اللہ کے غضب میں مبتلا ہوگا۔ ان آیات کے علاوہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر طیبت کا ذکر موجود ہے۔ مٹی سے تیمم کی اجازت دی گئی تو صعید طیب کی قید کے ساتھ کہ جس مٹی سے تیمم کرو وہ پاک ہونی چاہیے۔ اہل ایمان کو اعمال صالحہ کی برکت سے پرسکون زندگی دینے کا وعدہ فرمایا تو اسے حیوٰۃ طیبہ کہا گیا۔ مؤمنین ومؤمنات سے جنت کا وعدہ کیا گیا تو مسکن طیبہ پاکیزہ گھروں کا ذکر فرمایا۔ پس جب اللہ تمہارے لیے طیبات کو پسند فرماتا ہے اور تمہیں خبائث سے بچاتا ہے تو تم جو اللہ کو دیتے ہو اس کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہو وہ بھی طیب ہونا چاہیے۔ حلال بھی ہو، عمدہ بھی ہو اور تمہارا پسندیدہ بھی۔

بیکار، ناپسندیدہ اور گھٹیا چیز اللہ کے لیے دینے کا ارادہ بھی نہ کرو۔ کیونکہ کسی کو ایسا تحفہ دینا عقل وانصاف کے خلاف ہے۔ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے تو تم کبھی پسند نہ کرو گے، کبھی ایسے تحفہ پر خوش نہ ہو گے، لو گے ہی نہیں اور اگر چشم پوشی کرتے ہوئے لے بھی لو گے تو پسند نہ کرو گے۔ نیز تحفہ ہمیشہ اس کی شان اور مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیا جاتا ہے۔ جسے تحفہ دیا جا رہا ہے اگر تم کسی بادشاہ یا حاکم کو کوئی تحفہ دیتے ہو تو چاہے اس کی قیمت معمولی ہو لیکن اچھی اور پسندیدہ چیز کا انتخاب کرتے ہو۔ اللہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، احکم الحاکمین ہے۔ وہ تمہارے تحفوں کا محتاج بھی نہیں۔ اس کی شان تو غنی ہے، بے نیاز ہے، حمد والا ہے۔ وہ تم سے صدقوں کا مطالبہ اپنے لئے نہیں بلکہ تمہارے ہی فائدے کے لئے کرتا ہے۔ پس ایسے شان والے کی راہ میں جو خرچ کرو وہ طیب ہونا چاہیے۔ حلال، پاکیزہ، پسندیدہ ہونا چاہیے۔ تب قبول ہوگا۔ اور تمہیں اس کا پورا پورا فائدہ ہوگا۔ اس کے یہاں صدقات طیبات کی بڑی قدر ہے۔ نبی مکرم علیہ السلام فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا تَصَدَّقَ اَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَيِّبٍ وَّلَا يَقْبَلُ اِلَّا الطَّيِّبَ اِلَّا اَخَذَهُ بِيَمِيْنِهٖ وَ اِنْ كَانَتْ تَمْرَةً فَتَرْبُوْ فِیْ كَفِّ الرَّحْمٰنِ حَتّٰى تَكُوْنَ اَعْظَمَ مِنَ الْجَبَلِ وَ يُرَبِّيْهَا لَهٗ كَمَا يُرَبِّیْ اَحَدُكُمْ وَلَدَهٗ اَوْ فَصِيْلَهٗ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو کسی عمدہ چیز کا صدقہ کرے کہ اللہ

اچھی چیز کے علاوہ کچھ قبول نہیں فرماتا تو اللہ اسے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے، چاہے وہ ایک کھجور ہی کیوں نہ ہو پس وہ اللہ کے ہاتھ میں بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بھی بڑی ہو جاتی ہے۔ اور اللہ اس کی اسی طرح پرورش کرتا ہے جیسے تم اپنے بچے یا اونٹ کے بچے کو پالتے ہو۔ (ابن ماجہ)

دولت کی دو قسمیں:

آیت زیر گفتگو پر غور فرمایئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دولت کی دو قسمیں بیان فرمائی جا رہی ہیں۔

☆ مَا كَسَبْتُمْ ، وہ دولت جو تم نے کمائی۔

☆ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ، اور وہ دولت جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ دولت چاہے ملازمت یا تجارت کے ذریعہ حاصل کی جائے یا کھیتی باڑی کر کے زمین سے حاصل کی جائے ہم بہرحال اسے محنت و مشقت اور تدبیر سے حاصل کرتے ہیں۔ اس میں فرق کیا ہے وہ ہماری کمائی ہے، ہم اس کے مالک ہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک سمندر ہے۔ غوطے لگایئے اور موتیوں سے مالا مال ہوتے رہیئے۔ جتنا آپ قرآن کریم میں غور و فکر کریں گے اتنا ہی علم کی نعمت سے مالا مال ہوں گے۔ ایمان کی دولت اتنی ہی بڑھتی رہے گی آیت مذکورہ میں مقصود تو صرف یہ حکم دینا ہے کہ اللہ کی راہ میں طیبات خرچ کرو۔ لیکن یہ بھی بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں تم جو کچھ خرچ کرو گے، اللہ پر کوئی احسان نہ کرو گے۔ کیونکہ یہ دولت تمہاری نہیں تم اپنے پاس سے اللہ کو کچھ نہیں دیتے بلکہ اللہ جو اپنے فضل و کرم سے تمہیں عطا فرماتا ہے، اسی کا کچھ حصہ اپنی راہ میں خرچ کرنے کا وہ تمہیں حکم دیتا ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ رزق صرف اللہ ہی کے فضل و کرم سے نصیب ہوتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (الاسراء:۳۱)

اور اپنی اولاد کو فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی انہیں رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ بے شک ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔

قتل اولاد کا ہو یا کسی کا بھی، بہرحال حرام اور قابل سزا جرم ہے۔ یہاں اس نظریہ کو مسترد کرنا مقصود ہے کہ کثرت اولاد، املاق، غربت و تنگدستی کا سبب ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ بلکہ اس دور میں باقاعدہ اور منظم طور پر موجود ہے کہ حکومتی سطح پر اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام ہوتا ہے اور عوام کو کثرت اولاد سے بچنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ مانع حمل ادویہ تقسیم کی جاتی ہیں۔ اکثر ممالک میں اس کے انتظام و انصرام کے لیے مستقل محکمے اور وزارتیں قائم ہیں۔ جس کو "فیملی پلاننگ" یا "خاندانی منصوبہ بندی" کا نام دیا جاتا ہے۔ کثیر رقم اس کام پر صرف ہوتی ہے۔ صرف غیر مسلم ممالک ہی نہیں بلکہ بعض مسلم ممالک بھی اس کوشش میں شریک ہیں۔ گزشتہ دنوں اسی نظریہ کی بڑے پیمانہ پر اشاعت اور اس کو بین الاقوامی اہمیت کا حامل مسئلہ قرار دینے کے لیے سربراہان ممالک کی ایک کانفرنس بھی قاہرہ میں ہوئی۔ جس کا مقصد دیگر قوانین کی منظوری کے علاوہ "اسقاط حمل" کو قانونی مسلمہ حیثیت دینا بھی تھا۔

لغو نظریہ

اسلام اس لغو نظریہ کو یکسر مسترد کرتا ہے اور واضح طور پر بتاتا ہے کہ اللہ کی مخلوق کا رزق اللہ کی طرف سے مقرر ہے جو تمہیں رزق دیتا ہے وہی آنے والی نسلوں کو بھی رزق دے گا۔ لہذا تمہارا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ کثرت اولاد تنگی رزق کا باعث بنتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام اس نظریہ کی تعلیم دیتا ہے کہ "ہر بچہ کا رزق اس کی پیدائش ہی کے ساتھ آنے لگتا ہے" کیا تم نہیں دیکھتے کہ ابھی بچہ ماں کے پیٹ سے باہر نہیں آپاتا کہ ماں کی چھاتی میں اس کے لیے دودھ جوش مارنے لگتا ہے۔ جس طرح بچے کا رزق اس کی پیدائش سے پہلے ہی ماں کی چھاتی میں پہنچ جاتا ہے اسی طرح ہر اس جگہ اس کے پہنچنے سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ جہاں اسے تلاش معاش میں کسی نہ کسی دن پہنچنا ہے۔ پس یہ دنیا والے کیوں رزق کے لیے متفکر ہیں۔ ان کے قبضہ میں تو اپنا رزق نہیں، یہ دوسروں کو کیا دیں گے صرف اور صرف خالق رحیم و کریم ہی رزاق حقیقی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ (الروم: ۴۰)

اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا۔

"خاندانی منصوبہ بندی" کے ٹھیکیدار، خاندانی منصوبہ بندی کی آڑ میں خاندانوں کی تباہی کے منصوبے بناتے ہیں۔ وہ انسان کی نسل کشی کے درپے ہیں۔ کیونکہ وہ دولت کی ہوس میں اس قدر مبتلا ہیں کہ موجودہ لوگوں کے منہ کا نوالہ چھین لینا ان کے لیے کافی نہیں وہ آئندہ نسلوں کے رزق پر بھی قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔

موجودہ دور کی غربت سے نجات کا ذریعہ ہرگز ہرگز "خاندانی منصوبہ بندی" نہیں بلکہ معاشی منصوبہ بندی ہے۔ جس کے لئے آبادی کم کرنے یا اس کو بڑھنے سے روکنے کی کوششیں غیر مؤثر اور لایعنی ہیں بلکہ پیداوار بڑھانے اور دولت کو ضائع کرنے سے باز رہنے کی ضرورت ہے۔ دنیا بھر میں نہ جانے کتنے ایسے شعبہ ہیں جن پر بے شمار دولت صرف ہوتی ہے جبکہ ان کا تعلق قوموں کی فلاح و بہبود سے قطعاً نہیں۔ اگر یہی دولت غربت کے خاتمہ پر منصوبہ بندی کے ساتھ خرچ کی جائے تو یقین جانیے دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی بھوکا باقی نہیں رہے گا۔ "خاندانی منصوبہ بندی" کے عنوان سے قاہرہ کانفرنس پر اتنی کثیر رقم خرچ ہوئی کہ اس سے پورے مصر کی معاشی حالت کو بدلا جا سکتا تھا۔ روس چاند پر کمندیں تو ڈالتا رہا لیکن قوم کی حالت پر کبھی توجہ نہ دی۔ جو فاقوں میں مبتلا رہی۔ یہی حال ساری دنیا کا ہے۔ عوام بھوکے تڑپ رہے ہیں اور حکام ان کا رزق غیر ضروری کاموں پر صرف اپنی قوت و برتری کے مظاہرے اور ایک دوسرے کو مرعوب کرنے پر صرف کر رہے ہیں۔ رزّاق حقیقی کے خزانوں میں دولت کی کمی نہیں۔ اس نے اپنی مخلوق کے لیے بے شمار وسائل پیدا فرمائے ہیں۔ لیکن ظالم لوگ دوسروں کا حصہ غصب کر کے ان کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔ اور پھر خاندانی منصوبہ بندی کے نعرے لگاتے ہیں۔ معیشت کی تباہی کا سبب کثرتِ اولاد کو قرار دیتے اور اس کو روکنے کی تدبیریں نکالتے ہیں۔ یہ تو رب کا بڑا کرم ہے کہ اس نے رزق اپنے قبضہ میں رکھا ورنہ تو قوت و طاقت والے کمزوروں کو زندہ بھی نہ رہنے دیتے۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ۞
وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۞ (الحجر: ۲۰-۲۱)

اور ہم نے اس (زمین) میں تمہارے لیے وسائل زندگی بنائے اور ان کے لیے بھی جنہیں تم رزق دینے والے نہیں۔ اور کوئی چیز نہیں لیکن ہمارے پاس اس کے خزانے ہیں اور ہم اس (رزق کو) نہیں اتارتے۔مگر ایک معلوم اندازے کے مطابق۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (الشوریٰ:۲۷)

اور اگر اللہ اپنے سب بندوں کیلئے رزق کشادہ کر دیتا تو وہ ضرور زمین میں سرکشی کرتے۔لیکن وہ جتنا چاہتا ہے اندازے کے مطابق اتارتا ہے۔ بےشک وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے انہیں خوب دیکھتا ہے۔

رزق کی تقسیم اللہ کی طرف سے منصفانہ ہوتی ہے کسی کو زیادہ رزق ملتا اور کسی کو کم۔ اس لیے نہیں کہ اس کے خزانوں میں کمی ہے یا اس کی تقسیم میں العیاذ باللہ بے ترتیبی اور بے تدبیری ہے۔ بلکہ اس لیے کہ یہ کمی وزیادتی نظامِ عالم کی بقا کے لیے ضروری ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (الشوریٰ:۱۲)

وہی مالک ہے آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔ بیشک وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

بہرحال رزق دینے والا اللہ ہی ہے۔ جسے جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور جب چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے دے کر لے بھی لیتا ہے۔انسان کی یہ خود فریبی ہے کہ وہ حصولِ رزق کو اپنی محنت اور اپنی تدبیر سمجھتا ہے اور ناز کرتا ہے کہ میں نے اتنی دولت کما لی۔ پھر دعویٰ کرتا ہے کہ یہ دولت، یہ جائیداد، یہ سرمایہ میرا ہے حالانکہ نہ اس نے کچھ کمایا نہ کوئی چیز اس کی ہے۔ اللہ نے کرم کیا اس کو دے دیا اور جب اللہ چاہے اس سے لے لے۔ دیتا آہستہ آہستہ محنت کرا کے ہے اور لیتا آناً فاناً ہے۔ برسوں محنت کر کے انسان دولت مند ہوتا ہے لیکن رات کو امیر سونے والا صبح بھکاری ہوتا ہے۔ اگر حصولِ دولت انسان کا کمال ہوتا تو آرام سے بیٹھ کر ہزاروں کمانے والوں سے زیادہ مزدوری کرنے والے کما لیا کرتے اور کوئی غریب و بھکاری نظر نہ آتا۔ یہ فرق دولت ہی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ رزّاق اللہ ہی ہے۔

ما کسبتم

آیت زیرِ گفتگو میں اسی حقیقت کو نہایت پُر از حکمت انداز سے دولت کی دو قسمیں بتا کر بیان کیا جا رہا ہے۔ کہ دولت ایک وہ ہے جو بظاہر ماکسبتم تم نے حاصل کی۔ اس میں حصول معاش کے وہ تمام ذرائع شامل ہیں جن سے انسان فوراً اپنی محنت کا اجر حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً ملازمت، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ۔ کہ ایک ملازم صبح سے شام تک اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ شام یا ہفتہ بعد یا مہینہ پورا ہونے پر اسے مقررہ تنخواہ مل جائے گی۔ ایک تاجر یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنا مال فروخت کرے گا اور اسے منافع حاصل ہو جائے گا۔ میں انسان ان ظاہر طریقوں سے حاصل کردہ دولت

کو اپنی محنت کا نتیجہ قرار دے اور اپنا خیال کرے تو تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیجئے کہ دولت پر اس کی ملکیت کا دعویٰ سچا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ میں نے محنت سے کمایا، لہٰذا میرا ہے۔ لیکن اگر دولت حاصل کرنے کے دوسرے طریقے پر غور کیا جائے تو یہ دعویٰ خود بخود فریب اور باطل نظر آنے لگے۔ ما اخرجنا لکم من الارض، دولت کی اس دوسری قسم پر غور کیجئے۔ جس میں زمین سے اگنے والی ہر چیز تیل، سونا، چاندی اور دیگر معدنیات سب شامل ہیں، ان ذرائع سے جو دولت حاصل ہوتی ہے اس کا دارومدار انسان کی محنت کے باوجود صرف اللہ کے فضل و کرم پر ہے۔ مثلاً ایک کسان بڑی محنت سے کھیتی کے لیے زمین تیار کرتا ہے اس میں ہزاروں کا بیج بھی ڈال دیتا ہے لیکن اب وہ بے بس نظر آتا ہے۔ یہ سوچ کر اس کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی کہ کہیں یہ زمین سارا بیج کھا نہ جائے کہ زمین میں تو جو کچھ جاتا ہے اس کو کھا ہی جاتی ہے، اپنا جیسا کر دیتی ہے۔ یہ کسان ہر وقت زمین پر یاس و امید کی نظریں ڈالتا رہتا ہے۔ بالآخر ایک دن اسے ننھے کلے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ جوں جوں فصل بڑھتی جاتی ہے کسان کی امیدیں جوان ہوتی جاتی ہیں اور ایک دن وہ اپنی فصل کاٹتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

ذرا سوچو تو سہی بیج بونے کے بعد اسے زمین میں اگا لینے کا کوئی ذریعہ انسان کے پاس ہے۔ بے انتہا سائنسی ترقی کے باوجود انسان اپنے بوئے ہوئے بیج سے پھل حاصل کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ تلاش نہ کر سکا۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ ایک چھوٹے سے بیج سے وہ ہزاروں پھل پیدا فرما دیتا ہے۔ حصولِ رزق کی یہ قسم انسان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے رزّاقِ حقیقی صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔ جو تم نے ظاہری ذرائع سے کمایا اور اسے اپنی محنت و تدبر کا نتیجہ قرار دیا۔ یہ بھی تمہارا فریب ہے۔ حقیقت میں اس کا عطا فرمانے والا بھی وہی رب ہے جو زمین سے تمہارے لیے رزق پیدا فرماتا ہے۔

اے ایمان والو! جو تم کماؤ اور جو ہم تمہارے لیے زمین سے نکالیں دونوں کو اللہ ہی کی عطا و دین سمجھو اور اس سے اللہ کے نام پر عمدہ اور پسندیدہ حصہ خرچ کرو۔

قرآن کریم کی یہ بلاغت بھی قابل غور ہے کہ اخرجنا فرمایا، زرعنا نہ فرمایا۔ کیونکہ پہلا لفظ دوسرے سے زیادہ عام ہے۔ زرعنا کے معنی ہم نے اُگایا۔ یعنی صرف وہ چیزیں جو بیج کے ذریعہ زمین سے باہر آتی ہیں۔ اور اخرجنا کے معنی ہم نے نکالا، اس میں اُگنے والی چیزوں کے علاوہ زمین سے نکلنے والی ہر چیز شامل ہے۔ مثلاً سونا، چاندی، تیل، قیمتی پتھر وغیرہ۔ مقصود یہ ہے کہ جو دولت بھی زمین میں ملے اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کرو۔

ما کسبتم، سے جو صدقات واجب قرار دیئے گئے ہیں وہ زکوٰۃ، صدقہ فطر، قربانی ہیں۔ یہ صدقات کن لوگوں پر واجب ہیں، ان کی مقدار کیا ہے، ان کے مصارف کیا ہیں۔ ان تمام احکام کو صاحب شریعت ﷺ نے تفصیل سے بیان فرما دیا۔ جس میں کسی قسم کی تبدیلی، کمی یا زیادتی کا کسی کو اختیار نہیں۔ مثلاً کوئی یہ نیت کرے کہ قربانی کی جگہ وہ اس کی قیمت خیرات کردے۔ ایسا کرنے والے پر قربانی نہ کرنے کا سخت گناہ ہوگا۔ ان کے علاوہ صدقات نافلہ ہیں جن میں کوئی پابندی نہیں۔ امیر صدقہ کرے یا غریب، کوئی زیادہ کرے یا کم۔ ہاں قرآن کریم اور نبی کریم علیہ السلام نے صدقہ کرنے کی تلقین فرمائی، اس کی برکتیں بیان کیں، اس پر عظیم اجر و ثواب کی خوشخبری دی۔ جیسا کہ آپ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اب یہ مومن کا اپنا عمل ہوگا کہ وہ دولت کما کر، اس سے محبت کرتا ہے یا اللہ اور اس کے رسول کے مطالبہ کو پورا کر کے دنیا و آخرت کی

بھلائیاں کمانے کا اس کو ذریعہ بناتا ہے۔

ما اخرجنا لکم من الارض، زمین سے حاصل شدہ دولت پر جو صدقہ واجب ہے اسے عُشر کہا جاتا ہے جو زرعی پیداوار کی زکوٰۃ ہے۔ احناف کے نزدیک زمین سے جو کچھ پیدا ہوا اور جتنا بھی پیدا ہو سب پر زکوٰۃ ہے۔ جو زمین بارش سے سیراب ہو اس پر عشر دسواں حصہ زکوٰۃ کا ادا کرنا ہوگا اور جس زمین کو اپنی محنت سے یعنی کنوئیں یا نہر وغیرہ کا پانی دیا جائے اس کی فصل سے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ جیسا کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ فِيْمَا سَقَتِ السَّمَآءُ وَالْعُيُوْنُ اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ وَ مَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ۔

حضرت عبداللہ بن عمر حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ جو زمین بارش یا چشموں سے سیراب ہوتی ہے یا سیم زدہ ہو اس میں دسواں حصہ ہے اور جس زمین کو کنوئیں سے سیراب کیا جائے اس میں بیسواں حصہ ہے۔ (بخاری شریف)

بہرحال کسب کردہ دولت ہو یا زمین کی عطا کردہ سب پر زکوٰۃ ہے جو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے جس کا منکر بالاتفاق مرتد ہے۔ اور ادا نہ کرنے والا فاسق و فاجر۔ شرعاً جو اہمیت نماز کی ہے وہی زکوٰۃ کی۔ انسان کو فطری طور پر اپنی دولت سے محبت ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (آل عمران: ۱۴)

لوگوں کے لیے آراستہ کی گئی ان کی خواہشوں کی محبت عورتوں سے بیٹوں سے سونے چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانوں سے اور نشان کیے ہوئے (پسندیدہ) گھوڑوں سے اور مویشیوں اور کھیتی سے۔ یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔

اور اللہ یہی چاہتا ہے کہ بندہ اپنی محبوب و پسندیدہ چیزوں کو اللہ کے حکم پر قربان کرے۔ لہٰذا ان سے زکوٰۃ ادا کرنے، صدقہ و خیرات کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے قرآن و حدیث نے سخت وعید کا اعلان فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (التوبہ: ۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ تو (اے حبیب) ان کو خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں اور ان کی پیٹھیں (اور کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے

جمع کر کے رکھا تھا تو چکھو مزا اپنے جمع کرنے کا۔

کس قدر ہیبت ناک وعید ہے مال جمع کرنے والوں اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں پر۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پر تو اس وعید کا ایسا اثر تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنے ہی کو حرام قرار دیتے تھے۔ لیکن اجماع امت اسی پر ہے کہ یہ وعید ان لوگوں کے لیے ہے جو دولت کے اتنے متوالے ہیں کہ اس کی زکوٰۃ تک ادا نہیں کرتے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز نہیں۔ اگرچہ وہ سات زمینوں کے نیچے مدفون ہو۔ اور جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہی کیوں نہ ہو۔ نیز ارشاد ہوا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ (آل عمران:۱۸۰)

اور ہرگز گمان نہ کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں۔ اس چیز میں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی۔ کہ وہ بخل ان کے لئے بہتر ہے۔ بلکہ وہ ان کے لیے بہت برا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن طوق بنا کر ڈالا جائے گا ان کے گلے میں اس چیز کا جس میں انہوں نے بخل کیا۔

ان آیات کی وضاحت نبی مکرم علیہ السلام کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَّلَا فِضَّةٍ لَّا يُؤَدِّىْ مِنْهَا حَقَّهَا اِلَّا اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ صُفِّحَتْ لَهٗ صَفَائِحُ مِنْ نَّارٍ فَاُحْمِىَ عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَيُكْوٰى بِهَا جَنْبُهٗ وَ جَبِيْنُهٗ وَ ظَهْرُهٗ كُلَّمَا رُدَّتْ اُعِيْدَتْ لَهٗ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ الْعِبَادِ فَيَرٰى سَبِيْلَهٗ اِمَّاۤ اِلَى الْجَنَّةِ وَ اِمَّا اِلَى النَّارِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: سونے چاندی کا مالک اگر اس کا حق ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کے لیے آگ کی تختیاں بنا کر جہنم کی آگ میں گرم کر کے اس کے پہلو، اس کی پیشانی اور اس کی پیٹھ کو داغا جائے گا اور ایسا بار بار کیا جائے گا اس دن جو پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا پھر بندوں کا فیصلہ ہوگا اور وہ جنت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھیں گے۔ (مسلم شریف)

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكٰوتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ مَالُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ يَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ يَعْنِىْ شِدْقَيْهِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ ثُمَّ تَلَا وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الْاٰيَةَ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس کو اللہ نے مال عطا فرمایا

اوراس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لیے یہ مال گنجے سانپ کی شکل میں بنا دیا جائے گا جس کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہوں گے اور قیامت کے دن وہ سانپ اس شخص کی گردن میں طوق کی طرح ڈال دیا جائے گا اور یہ سانپ اس مال والے کی دونوں باچھوں کو پکڑ کر کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ بخیل لوگ یہ گمان نہ کریں، آخر آیت تک۔ (بخاری شریف)

وسوسہ شیطان:

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ (البقرہ:۲۶۸)

شیطان تمہیں تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا خوب جاننے والا ہے۔

اس سلسلہ کی یہ دوسری آیت ہے جس میں مؤمنین کو شیطان کے وسوسوں سے بچنے اور اپنے فضل و کرم کی امید رکھنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ اس موقع پر ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ''وسوسہ شیطان'' کیا ہے۔

وسوسہ، ایسے برے خیالات کو کہا جاتا ہے جو انسان کو گناہ اور معصیت پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کا مقابل الہام ہے۔ یعنی ایسے خیالت جو مؤمن کو اعمالِ صالحہ پر آمادہ کریں اور اس کے ایمان کو مزید مستحکم کریں۔ یہ خیالات نیک بندوں کے دلوں میں اللہ کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں جو اللہ کا ان بندوں پر خاص کرم ہوتا ہے۔ انبیاء کا الہام شریعت کا حصہ بنتا ہے جبکہ عام مؤمنین کا الہام ان کی ہدایت و رہبری کا ذریعہ ہوتا ہے اور وسوسہ، شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہر انسان کے ساتھ وسوسہ دلانے کے لئے ایک شیطان اور الہام کے لیے ایک فرشتہ ہوتا ہے۔ صاحبِ مرقاۃ لکھتے ہیں کہ جب انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک شیطان بھی پیدا ہوتا ہے۔ جسے فارسی میں ہمزاد اور عربی میں وسواس کہتے ہیں۔ گویا اگر دنیا بھر میں ایک دن میں انسانوں کے ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہیں تو تنہا ابلیس کے ہزاروں شیطان پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ بات کوئی قابلِ حیرت نہیں کہ اگرچہ عام طور پر ایک عورت کے ایک ہی بچہ ہوتا ہے لیکن ایک سے زیادہ بھی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض جانور ایسے ہیں جو ہزاروں انڈے دیتے اور ان سے بچے نکلتے ہیں۔ پس کیا تعجب ہے کہ ابلیس کے بیک وقت اتنے بچے پیدا ہوں جتنے اس وقت میں دنیا بھر کے انسانوں کے پیدا ہوئے۔ نبی مکرم ﷺ خبر دیتے ہیں اور آپ کی ہر خبر حق ہے۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا وَ قَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَالُوْا وَ اِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اِيَّايَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں جس کا ایک ساتھی جنوں میں سے نہ ہو اور ایک ساتھی فرشتوں میں سے نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول

اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی۔ آپ نے فرمایا، ہاں میرے ساتھ بھی لیکن اللہ نے میری مدد فرمائی اور وہ (جن) مسلمان ہوگیا اب وہ مجھے صرف بھلائی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ (مسلم)

نبی کا معصوم ہونا، شیطانی وسوسوں سے محفوظ ہونا منصب نبوت کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتو نبی کی تمام تعلیمات مشکوک اور قابل تردد ہو جائیں گی۔ پس اللہ نے اپنے محبوب نبی آخرالزماں ﷺ کو معصوم بھی پیدا فرمایا اور آپ کے شیطان کو آپ کا مطیع وفرمانبردار کیا۔ جس کے نتیجہ میں آپ کی بتائی ہوئی کسی بات میں شک وشبہ کی گنجائش باقی رہی اور نہ ہی آپ سے کسی قسم کی خطاء ولغزش کا امکان رہا۔ اسی لیے قرآن کریم نے بغیر کسی قید کے علی الاطلاق آپ کی اطاعت کا حکم دیا فرمایا گیا:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (الحشر:۷)

اور رسول جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس سے منع فرمائے، رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

رسول کی دی ہوئی کتاب کا نام قرآن ہے۔ رسول کے بتائے ہوئے بندگی کے طریقوں کا نام عبادت ہے۔ رسول کی منع کی ہوئی چیزوں کی عبادت کا نام شرک ہے۔ رسول نے جن چیزوں کے کھانے اور استعمال کی اجازت دی وہ حلال ہیں اور جن سے رسول نے روکا وہ حرام ہیں۔ دین نام ہے رسول کے قول وفعل، حرکات وسکنات اور اداؤں کا۔ رسول کا ہر قول وعمل ، ہمارے لیے سنت بنا اور اس پر ہم اجر وثواب کے مستحق قرار دیے گئے، ﷺ

شیطان کا حملہ

شیطان کا حملہ ہر شخص پر ہوتا ہے سوائے نبی مکرم علیہ السلام کے کہ آپ کا شیطان آپ کا مطیع وفرمانبردار کر دیا گیا۔ شیطان کی طرف سے اس حملہ کا آغاز انسان کی پیدائش کے پہلے ہی لحہ سے ہو جاتا ہے کہ جونہی بچہ پیدا ہوتا ہے یہ ظالم اس پر جھپٹتا اور حملہ آور ہوتا ہے جس سے اس کا مقصد بچہ کی دینی استعداد کو برباد کرنا اور اس پر گمراہی وفساد کا اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صِیَاحُ الْمَوْلُوْدِ حِیْنَ تَقَعُ نَزْغَةٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہی بچہ کا رونا شیطان کے تکلیف پہنچانے کی وجہ سے ہے۔ (بخاری ومسلم)

وسوسہ شیطان کی بنیادی وجہ انسان کی ابتلاء وآزمائش ہے کہ شیطان درحقیقت پیدا ہی اس لئے کیا گیا کہ وہ انسان کو بھکائے اور انسان نبی کے دامن میں پناہ لے کر اس کے وسوسوں سے بچے۔ اسی لیے جب نیک لوگوں، صالحین کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے تو وہ اس کا شکار ہونے کے بجائے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اس کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کے بجائے

نبی کی اتباع و پیروی کرتے ہیں۔ پس یہ وساوس ان کے لیے مہلک بن جانے کی بجائے۔ ان کے ایمان کے کمال کی علامت و نشانی بنتے ہیں۔ حضور نبی مکرم علیہ السلام فرماتے ہیں۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِىْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا بیشک، شیطان انسان کے جسم میں اس طرح پھرتا ہے جیسے رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

انسان کے جسم میں شیطان کا دوڑنا یا اس کے وسوسوں کا دوڑنا کوئی تعجب کی بات نہیں حضور علیہ السلام نے خود ہی مثال دے کر اس کو واضح کر دیا کہ جس طرح رگوں میں خون دوڑتا ہے اسی طرح شیطان دوڑتا ہے۔ کیونکہ شیطان کثیف نہیں وہ آگ اور ہوا کی طرح لطیف ہے۔ جہاں چاہے گھس سکتا ہے۔ مزید یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح انسان کے جسم میں طرح طرح کے جراثیم پیدا ہو جاتے اور خون ورطوبت کے ساتھ پھرتے رہتے ہیں اسی طرح شیطان بھی پھرتا رہتا ہے اور جس طرح خون و جراثیم کی حرکت یا کمی وزیادتی سے انسان کا جسم متاثر ہوتا ہے اور اسی کے مطابق انسان کا عمل ہوتا ہے۔ اسی طرح شیطان کی حرکت انسان کے جسم کو متاثر کرتی اور اس سے عمل کراتی ہے۔ نیز نقصان دہ جراثیم کو جسم سے ختم کرنے کے لیے دوائیں استعمال کی جاتی۔ اسی طرح شیطان کا وسوسہ، نبی کی اطاعت وفرمانبرداری سے ختم ہوتا ہے۔ جس مؤمن نے اپنے اس مرض کو پکڑ لیا یعنی اسے شیطانی وسوسہ کا احساس ہو گیا وہ اللہ سے ڈرا اور وسوسہ کو اس نے دبایا، وہی مؤمن کامل ہو گیا۔ جیسا کہ نبی مکرم علیہ السلام نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَآءَ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلَى النَّبِىِّ ﷺ فَسَاَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِىْٓ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْتُّمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ! ہم لوگ اپنے دلوں میں ایسے ایسے برے خیالات محسوس کرتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص انہیں زبان تک پر لانا ناپسندیدہ اور بہت ہی برا سمجھتا ہے۔ آپ نے فرمایا واقعی ایسا ہے (کہ تم ان خیالات کو مکروہ جانتے ہو) تو عرض کرنے لگے ہاں، یارسول اللہ۔ آپ نے فرمایا تو یہ خالص ایمان کی نشانی ہے۔ (مسلم شریف)

حدیث مبارکہ سے واضح ہے کہ اگر انسان شیطان کے وسوسہ کو سمجھ لے، اسے برا جانے تو یہ اس کے کمال ایمان کی علامت ہے۔ کیونکہ چور وہیں پہنچتا ہے جہاں مال ہوتا ہے۔ اسی طرح شیطان بھی وہیں اپنا کام کرنا چاہتا ہے جہاں ایمان ہوتا ہے۔ وہی مالک عقلمند ہے، بہادر ہے جو چور سے اپنے مال کی حفاظت کر لے اور وہی مؤمن کامل ہے جو شیطان سے اپنے ایمان کی حفاظت کر لے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے حضرت قاسم بن محمد کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

عَنِ الْقَاسِمِ ابْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَهٗ فَقَالَ اِنِّیْ اَهِمُ فِیْ صَلٰوتِیْ فَیَکْبُرُ ذٰلِکَ عَلَیَّ فَقَالَ لَهٗ امْضِ فِیْ صَلٰوتِکَ فَاِنَّهٗ لَنْ یَّذْهَبَ ذٰلِکَ عَنْکَ حَتّٰی تَنْصَرِفَ وَ اَنْتَ تَقُوْلُ مَا اَتْمَمْتُ صَلٰوتِیْ۔

حضرت قاسم بن محمد سے ایک شخص نے کہا کہ مجھے نماز میں اکثر وہم ہو جاتا ہے۔ جو مجھے بہت ناگوار ہوتا ہے آپ نے فرمایا اسی حالت میں نماز ادا کرتے رہو کہ بیشک وہ (شیطان) تم سے دور نہ ہوگا، یہاں تک کہ تم اپنی نماز سے فارغ ہو کر بھی یہی کہو گے کہ میں نے اپنی نماز مکمل نہیں کی۔

(بروایت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ)

حضرت قاسم، محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے، یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں۔ عظیم تابعی مدینہ منورہ کے سات فقہاء میں سے ایک اور اپنے دور کے افضل ترین فرد ہیں۔ آپ ثقہ، بلند مرتبہ عالم، فقیہ امام، صاحب ورع وتقویٰ اور کثیر الحدیث تھے۔ اپنے والد محمد بن ابی بکر کے بعد یتیم ہو گئے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی پرورش کی۔ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بھائی امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کے داماد اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی والدہ کے دادا ہیں۔ ۱۰۱ھ یا ۱۰۲ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (اشعۃ اللمعات)

ایسی عظیم شخصیت کا ارشاد ظاہر ہے حضور علیہ السلام کے ارشادات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ پس واضح ہے کہ نماز میں بھی شیطان وسوسہ پیدا کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے اس شیطان کا جو نماز میں وسوسہ پیدا کرنے پر مقرر ہے، نام بھی بتایا۔ "خُنزَب یا خِنزَب" دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں۔

نماز کے دوران ایک بزرگ کے پاس شیطان آیا اور کہنے لگا آپ یہ نماز دوبارہ ادا کریں کہ آپ نے اچھی طرح نہ پڑھی۔ آپ نے جواب دیا میں یہ نماز نہ لوٹاؤں گا۔ جیسی پڑھ سکتا ہوں، پڑھ لی۔ بس اللہ کے دربار میں اپنی کوتاہی کی معذرت کرلوں گا۔ شیطان بولا دیکھئے آپ لاپرواہی نہ کریں۔ یہ نماز کا معاملہ ہے لاپرواہی کا موقع نہیں۔ بزرگ نے پھر جواب دیا جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں نماز دوبارہ نہ لوٹاؤں گا۔ شیطان اصرار کرتے ہوئے بولا جناب میں آپ کا ہمدرد و ناصح ہوں۔ نماز ایک عظیم عبادت ہے اور اللہ کے یہاں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ اللہ کے مقرب ہیں۔ اللہ ایسی نماز قبول نہیں کرتا، اس سے آپ کے مرتبے میں کمی ہو سکتی ہے۔ اس کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔ اب بزرگ نے اُسے ڈانٹتے ہوئے فرمایا۔ میں جانتا ہوں تو شیطان ہے، ہرگز میرا ہمدرد و ناصح نہیں ہو سکتا۔ جبکہ اللہ رحیم و کریم ہے۔ اگر میری نماز ناقص بھی ہے تو وہ اپنے فضل وکرم سے اسے قبول فرمائے گا۔ تو دفع ہو جا، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ بالآخر شیطان ذلیل و خوار ہو کر چلا گیا۔ (اشعۃ اللمعات)

بزرگ کا یہ واقعہ قابل غور ہے آپ نے اپنی نماز پر اعتماد لاپرواہی یا سستی کے سبب نہ کیا بلکہ اللہ کے فضل وکرم کی امید اور شیطان لعین کی مخالفت پر کیا۔ اور یہ دونوں باتیں ہی اللہ کی رضا کا سبب ہیں۔ پس ایسی نماز اگر ناقص بھی ہوگی تب بھی ضرور مقبول ہوگی۔

وسوسہ شیطان کا ظاہری سبب انسان کا ماحول اور اس کے اعمال ہوتے ہیں۔ جو شخص نیکوں کی صحبت میں رہتا ہے

دین وشریعت کی پابندی کی کوشش کرتا ہے، اگر چہ وہ بھی شیطان کے وسوسہ میں مبتلا ہوتا ہے، لیکن الہام کا فرشتہ اس کا معاون و مددگار بنتا ہے۔ وہ اس شخص کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ اِس سے بچنا چاہیے اور یہ شخص اللہ کے فضل و کرم سے برے خیالات پر عمل سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن جس شخص کا ماحول خراب ہوتا ہے۔ شرابیوں، جواریوں، راشیوں اور بدکاروں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے شیطان اس کو بہکا تا ہے، تو الہام کا فرشتہ بھی اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ یہ بدنصیب شیطان کی چال کا شکار ہو جاتا اور اس کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر دنیا وآخرت کی ذلت وخواری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ شیطان کا گروہ قرار دیتا ہے، جنہیں شیطان جہنمی بنا کر چھوڑتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؕ﴿۶﴾ (فاطر:۶)

بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن (ہی) بنائے رہو۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ دوزخ والوں میں سے ہو جائیں۔

آج کل (۱۹۹۴ء) یورپ میں ایک قسم کا بکٹیریا دریافت ہوا ہے جو انسان کو اندر ہی اندر کھا لیتا اور تین دن میں موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ یقین جانیئے، وسوسہ شیطان اس سے بھی زیادہ زود اثر زہر ہے جو دنوں میں نہیں لمحہ بھر میں انسان کی دنیا وآخرت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ نہ جانے کتنے اولیاء، علماء اور صالحین اس زہر کا شکار ہو چکے ہیں۔ اللہ ہی کی پناہ ہے، شیطان مردود سے۔

وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ (الانعام:۱۲۱)

اور بیشک انسان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ اور اگر تم نے ان کا کہا مان لیا تو بیشک تم مشرک ہو جاؤ گے۔

شیطان سے پناہ مانگو

وسوسہ شیطان کا نتیجہ جدل وجدال اور اس کی انتہاء شرک میں مبتلا ہو جانا ہے۔ یہ کافروں کو مسلمانوں سے اور کبھی مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑاتا ہے۔ تو کبھی یہ شرابی، جواری، راشی اور بدکار بنا کر لوگوں کو آپس میں لڑاتا ہے تو کبھی اس کے پیدا کردہ اوہام مسلمان کو شرک تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح ممالک کے درمیان جنگیں ہوتی ہیں۔ شہروں اور گلی کوچوں میں خانہ جنگی ہوتی، فرقہ واریت پھیلتی ہے اور پرسکون معاشرے تہ وبالا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم شیطان سے پناہ مانگنے کی بار بار تاکید فرماتا ہے۔

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾

(الاعراف:۲۰۰)

اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ پہنچے تو فوراً پناہ لو اللہ کی، بیشک وہی بہت سننے والا سب کچھ

جاننے والا ہے۔

یہ حکم ایسے عام لوگوں کے لیے ہے جو اپنی لاپرواہی کے باعث شیطان کے وسوسوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے نیک بندے متقی تو ہر وقت ہی اس خطرے سے باخبر رہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

(الاعراف: ۲۰۱)

بیشک جو لوگ اللہ سے ڈرے، جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھوتا ہے وہ فوراً خبردار ہو جاتے ہیں تو اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اور جن لوگوں نے شیطانوں ہی کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ یعنی وہ ہر وقت بری صحبت ہی میں رہتے ہیں، اچھے لوگوں سے بھاگتے ہیں، ان سے نفرت کرتے ہیں، بروں کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔ تو ایسے لوگ بے حد خطرے میں ہوتے ہیں کہ ان کے شیطان دوست انہیں بہکانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے اور کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

وَ اِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ (الاعراف: ۲۰۲)

اور (جو شیطانوں کے بھائی ہیں) ان کے بھائی (شیطان) انہیں گمراہی کی طرف کھینچتے ہیں پھر کوتاہی نہیں کرتے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

(النحل: ۹۸ تا ۱۰۰)

تو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو اللہ کی پناہ لو شیطان مردود سے۔ بے شک اسے ان لوگوں پر کوئی غلبہ نہیں جو ایمان لائے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں اس کا غلبہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور جو اسے (اللہ کا) شریک جانتے ہیں۔

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۶﴾

(حم السجدہ: ۳۶)

اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی وسوسہ پہنچے تو (فوراً) اللہ کی پناہ لو۔ بے شک وہی خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے۔

قرآن کریم نے شیطان مردود سے پناہ مانگنے کا حکم دیا جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ شیطان انسان کا ایسا کھلا دشمن ہے جو اس کو لمحہ بھر میں اللہ سے دور کر دیتا اور اپنا ساتھی بنا لیتا ہے۔ اسی لئے جب حضرت آدم علیہ السلام پر یہ حقیقت واضح ہوئی تو انہوں نے مدتوں رو رو کر اللہ سے توبہ کی۔ ان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں ﷺ تک تمام ہی انبیاء کرام شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرتے رہے۔ حالانکہ انبیاء کیا صالحین و مخلصین کو بھی شیطان نہیں بہکا سکتا۔

لیکن تقاضہ عبدیت یہی ہے کہ بندہ اللہ سے شیطان کی پناہ طلب کرتا رہے۔حضور نبی کریم علیہ السلام سے تعوذ پناہ مانگنے کے لیے جو الفاظ مروی ہیں وہ یہ ہیں۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝

میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے

یہ الفاظ شیطان کے وسوسہ اور ایسے تمام اعمال کا خاتمہ کر دیتے ہیں جو وسوسہ کی وجہ سے سرزد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حضور علیہ السلام نے ایک شخص کو سخت غصہ کی حالت میں دیکھا تو آپ نے فرمایا اگر یہ شخص اعوذ پڑھ لے، تو اس کی حالت ٹھیک ہو جائے گی۔ کیونکہ غصہ کا سبب بھی وسوسہ ہی ہے جو آپس کے میل و محبت کو ختم کر دیتا ہے اور غصہ کرنے والا بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ شیطان یہی تو چاہتا ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو اعوذ پڑھتا ہے اللہ اس کے اور شیطان کے درمیان تین سو پردے حائل کر دیتا ہے۔ یعنی وہ شخص شیطان کے وسوسہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ بہت سی مجرب دعائیں ہیں جن میں حضور علیہ السلام نے اعوذ کو شامل فرمایا۔

وسوسہ شیطان کے خطرناک ہونے کا مزید اندازہ نبی مکرم علیہ السلام کے اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک مرتبہ آپ مسجد میں معتکف تھے۔ ایک رات اُم المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ سے ملنے کے لیے تشریف لائیں جب وہ واپس ہونے لگیں تو آپ انہیں گھر تک پہنچانے کے لیے ساتھ ہو لئے۔ راستہ میں دو صحابی سامنے آتے نظر آئے۔ آپ نے انہیں آواز دی فرمایا دیکھ لو کہ میرے ساتھ تمہاری ماں صفیہ ہیں۔ ان دونوں نے عرض کیا سبحان اللہ، یعنی یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے متعلق یہ بدگمانی بھی کر سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی غیر عورت ہوگی۔ آپ نے فرمایا بیشک شیطان انسان کے ساتھ ہوتا اور وسوسہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہیں بدظنی میں مبتلا نہ کر دے۔ اس لیے میں نے بتانا ضروری سمجھا کہ میرے ساتھ کوئی غیر عورت نہیں۔ سبحان اللہ معلم کامل ﷺ کا طریقہ تعلیم تو ملاحظہ ہو۔ ایک طرف تو آپ نے اپنے اس عمل سے ان صحابہ کے ایمان کی حفاظت فرمائی کہ اگر یہ اپنے آقا پر کسی بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے تو ایمان ہی سے محروم ہو جاتے۔ دوسری طرف آپ نے امت کو یہ تعلیم دی کہ جس طرح شیطان کے وسوسہ سے خود بچنا ضروری ہے اسی طرح اپنے مسلمان بھائی کو بچانا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا کام نہ کرو جس کے گناہ ہونے کا شبہ تک ہو۔ اور اگر کہیں شبہ کا موقع پیدا ہوتا ہو تو دیکھنے والے پر اس کو واضح کر دو۔

وسوسہ شیطان اس قدر مہلک مرض ہے کہ اللہ نے اس سے حفاظت کے لیے قرآن کریم میں پوری سورت نازل فرمائی اور اپنے حبیب علیہ السلام کی وساطت سے امت کو وسوسہ شیطان سے بچنے کا طریقہ تعلیم فرمایا۔ ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

(سورۃ الناس)

(اے حبیب) آپ فرمائیں، میں پناہ لیتا ہوں سب لوگوں کے رب کی۔ سب لوگوں کے بادشاہ کی۔

سب لوگوں کے معبود کی۔ وسوسہ ڈالنے والے، پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والے کے شر سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، جنوں اور آدمیوں میں سے۔

وسواس، بہت وسوسہ پیدا کرنے والا۔ یہ اس شیطان کا نام ہے جو دلوں کو وسوسہ میں مبتلا کرتا ہے۔ اس کا طریقہ واردات یہ ہے کہ جب انسان اللہ کو یاد کرتا ہے تو یہ پیچھے ہٹ جاتا اور چھپ کر دیکھتا رہتا ہے۔ جونہی بندہ اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے یہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے، بالکل چور کی طرح۔ اس لیے اس کو خناس، پیچھے ہٹ کر، چھپ کر دیکھنے والا کہتے ہیں۔ یہ وسواس وخناس جنوں میں سے بھی ہوتا ہے اور کبھی آدمیوں میں سے بھی۔ آدمیوں میں سے وسواس وخناس وہ شخص ہے جو خود وسوسہ کا شکار ہو کر دین سے دور ہو جاتا ہے اور پھر بڑی ہی چالاکی سے وہ لوگوں کو اپنی راہ پر لگا لیتا ہے۔ مثال کے طور پر رشوت لینے والا اپنی حرام کی دولت سے حاصل کردہ خوشحالی اور آسودگی لوگوں کو دکھاتا ہے اور انہیں بھی اسی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ یا چرس و مروانہ استعمال کرنے والے پہلے لوگوں کو یہ زہر مفت دیتے ہیں۔ اور جب ان کے منہ لگ جاتا ہے تو ان کا خون چوستے ہیں اور خوب دولت کماتے ہیں۔ برائی کی طرف کھینچنے والے سب ہی لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ ابتداء بڑی ہمدردی، دوستی اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ کوئی ان کے بہکائے میں نہ آئے تو وقفہ دے دے کر حملہ کرتے اور کامیابی تک اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اخوانُ الشیاطین اور وسواس وخناس ہیں۔ جن میں کفار و مشرکین، بدعقیدہ اور برے عقائد کی اشاعت و تبلیغ کرنے والے بدکار اور بدکاری کی دعوت دینے والے سب ہی شامل ہیں اور انہی لوگوں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا۔

فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾ (النساء:۷۶)

(اے مسلمانو) تم لڑو، شیطان کے مددگاروں سے بیشک شیطان کا مکر کمزور ہے۔

وسوسہ شیطان کا غلبہ انہی لوگوں پر ہوتا ہے جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے اور جو شیطان کے وسوسوں پر عمل کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، ورنہ ایمان کی قوت تو اتنی ہے کہ اس کے مقابلہ میں مکرِ شیطان اور شیطان کی تمام طاقت نہایت ہی معمولی اور کمزور ہے۔ مؤمن کا ایمان جب کامل ہو تو شیطان اس کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا:

مَا لَقِیَکَ الشَّیْطَانُ سَالِکًا فَجًّا قَطُّ اِلَّا سَلَکَ فَجًّا غَیْرَ فَجِّکَ

(اے عمر) شیطان تم سے کسی راستے میں نہیں ملتا مگر اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔
(بخاری و مسلم)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَیَخَافُ مِنْکَ یَا عُمَرُ (ترمذی)

اے عمر شیطان تم سے ڈرتا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا:

اِنِّیْ لَاَنْظُرُ اِلٰی شَیَاطِیْنِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ قَدْ فَرُّوْا مِنْ عُمَرَ۔

میں جنوں اور انسانوں کے شیطانوں کو عمر سے بھاگتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ (ترمذی)

اللہ نے جنہیں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی قوت ایمان عطا فرمائی ان سے اسی طرح شیطان بھاگا۔ اگر ہمیں بھی یہ قوت نصیب ہو جائے تو ہم اس ظالم دشمن کے مکر و فریب سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔

وسوسہ، پچھلی شریعتوں میں قابل گرفت جرم اور گناہ قرار دیا گیا تھا۔ کہ پچھلی امتوں پر دل میں برائی کا خیال پیدا ہونے پر بھی گناہ ہوتا اور انہیں سزا ملتی تھی۔ لیکن یہ صدقہ ہے نبی رحمت ﷺ کا کہ وسوسہ جب تک وسوسہ رہے ہمارے لیے اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ مواخذہ۔ کہ آقائے رحمت ﷺ مژدہ سناتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَکَلَّمْ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وسوسوں کو درگزر فرما دیا ہے جو سینوں میں پیدا ہوتے جب تک کہ ان پر عمل نہ کرے یا زبان پر نہ لائے۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ انسان کے دل میں جو بُرا خیال یکا یک آتا ہے اسے ''ہاجس'' کہا جاتا ہے۔ یہ تمام امتوں کے لیے معاف رہا۔ کیونکہ ایسا خیال بندے کے اختیار سے باہر ہے اور جو بُرا خیال دل میں آئے اور آتا ہی رہے کہ ہر وقت دماغ میں گھومتا رہے اسے ''خاطر'' کہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے معاف کیا گیا جو اس امت پر اللہ کا خاص فضل و احسان ہے۔ جس طرح سہو و نسیان پر کوئی گرفت نہیں اور اگر بندہ اس وسوسہ کو پسند کرنے اور اس کے دل میں اس پر عمل کی خواہش ہونے لگے تو اس کو ''ہم'' کہتے ہیں یہ بھی امت سے معاف کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اس حد تک پہنچنے کے بعد اگر بندے نے اس کو دل و دماغ سے محو کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب عطا فرمائے گا، لیکن اگر بندہ اس سے بھی آگے بڑھ جائے اور اس پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ کر لے اور صرف اس لئے عمل نہ کر پائے کہ اسباب مہیا نہ ہوں تو اسے ''عزم'' کہتے ہیں۔ اس انتہا پر پہنچنے کے بعد مواخذہ ہوگا۔ کیونکہ یہ کیفیت قلبی اعمال میں سے ہے، بالکل اس طرح جیسے بغض و کینہ رکھنے یا برے عقائد پر مواخذہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ عمل جیسا گناہ نہیں۔ اور نہ ہی اس پر حد شرع جاری ہوگی۔ مثلاً کسی نے زنا کا پختہ ارادہ تو کر لیا، لیکن سبب مہیا نہ ہونے کے باعث اب تک عمل نہ ہو سکا تو یہ اس اعتبار سے زنا نہیں کہ اس پر زنا جیسا گناہ بھی نہ ہوگا۔ اور حد بھی جاری نہیں ہوگی، لیکن یہ عزم گناہ ہے۔ (اشعۃ اللمعات)

وسوسہ کی اس ضروری تفصیل کے بعد اب آیت زیر بحث کی طرف رجوع کیجئے۔ اللہ تعالیٰ خصوصی طور پر شیطان لعین کے وسوسہ فقر کا ذکر فرماتا ہے۔ جسے شیطان کا وعدہ کہا گیا۔ جس سے مراد محتاجی ہے اور وسوسہ فحشاء کا ذکر کیا گیا جسے امر شیطان کہا جا رہا ہے اور اس سے مراد بخل ہے۔ چونکہ یہ آیت عمدہ چیزیں صدقہ کرنے سے متعلق ہے۔ لہٰذا یہاں اسی شیطانی وسوسہ کا ذکر ہے جو اس موقع پر پیدا ہوتا ہے کہ جب مومن صدقہ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو شیطان یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ اگر تو اسی طرح

اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہا تو بہت جلد فقیر ومحتاج ہو جائے گا۔لہذا اپنا ہاتھ روک، یعنی بخل کر۔ بخل کو فحشاء کہا گیا۔ بے حیائی کا کام کیونکہ بخل بذات خود بھی بے حیائی ہے کہ اس شخص سے زیادہ بے حیاء کون ہو سکتا ہے جسے اللہ دولت دے اور وہ اس پر سانپ بن کر بیٹھ جائے۔ جس نے دی اس کی راہ میں خرچ نہ کرے۔ علاوہ ازیں بخل بہت سی بے حیائیوں کا سبب بن جاتا ہے۔ شیطان کے اس وسوسہ کی یاد دہانی کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کا اعلان فرمایا کہ میں تم سے تمہاری بخشش کا وعدہ بھی کرتا ہوں اور تم پر اپنے مزید فضل کا بھی۔ یعنی اے ایمان والو! شیطان کے وسوسہ سے بچو، ہماری راہ میں خرچ کرتے رہو، خوب خرچ کرو نہ تو تم محتاج ہو گے اور نہ فقیر۔ جتنا تم خرچ کرو گے اس سے زیادہ ہم تمہیں دیں گے۔ اور مزید انعام یہ فرمائیں گے کہ تمہارے گناہوں کو بخش دیں گے اور اللہ تمہاری حالت اور نیتوں کو خوب خوب جانتا ہے۔

ذریعہ خیر کثیر

یُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ؕ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ (البقرہ:۲۶۹)

وہ حکمت عطا فرماتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت دی گئی تو بے شک اسے بہت بھلائی عطا کی گئی اور نصیحت نہیں قبول کرتے مگر عقل والے۔

ہر بھلائی ہر وہ چیز جو انسان کو عزت وعظمت بخشے، امن وسکون اور اطمینان قلب فراہم کرے۔ جس سے انسان بام عروج پر پہنچے، خیرِ کثیر ہے۔ جو نہ دولت سے نصیب ہوتی ہے نہ اس کے حصول کا ذریعہ اقتدار، حکومت اور سلطنت ہے۔ یہ صرف اس کا مقدر بنتی ہے جسے حکمت نصیب ہو جائے اور حکمت اللہ ہی کی عطا ودین ہے۔ جس پر وہ چاہتا ہے فضل فرماتا اور اس انعام سے نواز دیتا ہے یہ فیصلہ الٰہی ہے۔ مژدۂ قرآن ہے۔ نا قابلِ انکار حقیقت ہے جس کا اعتراف اُولوالالباب اہل عقل وخرد کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس کے مقابل دنیا اور اس کی ہر چیز قلیل ہے، معمولی ہے، بے وقعت ہے۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ (اے حبیب علیہ السلام) آپ فرما دیجئے، دنیا کا سامان بہت ہی تھوڑا ہے۔ (النساء:۷۷) جس چیز کے حصول کے لیے انسان بھاگتا رہتا ہے، اس کے تعاقب میں نہ جانے کیا کیا کرتوت کرتا ہے، وہ قلیل ہے، معمولی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہوا وہوس میں مبتلا انسان کتنی ہی دنیا حاصل کرلے لیکن نہ اسے عزت نصیب ہوتی ہے نہ سکون و طمانیت۔ نہ جانے کتنے سُورما پیدا ہوئے اور انجام کار زمین کی غذا بن گئے، نہ ان کا نام رہا نہ ان کے کارناموں کا تذکرہ۔ لیکن جسے حکمت نصیب ہوئی وہ زندگی میں مخلوق کے دلوں کا حاکم بنا اور بعد موت عقیدت ومحبت کا مرکز قرار پایا۔ پس حکمت وہ گوہر ہے جس کا حصول انسان کا مقصد زندگی ہونا چاہیے۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مختلف معنی میں حکمت کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ اس کی نعت الٰہیہ ہونے کا مفہوم موجود ہے جس کی تعبیر مفسرین ومحدثین نے مختلف الفاظ سے کی ہے کہیں حکمت سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کہیں علمِ صحیح کہیں عملِ صالح، کہیں قولِ صادق، کہیں عقلِ سلیم، کہیں فقہ فی الدین، کہیں اصابتِ رائے۔ میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے ''رَاْسُ الْحِكْمَةِ خَشْیَةُ اللّٰهِ'' اصل حکمت اللہ کا خوف ہے۔ مفسرین نے اس کی جامع تعریف اس طرح کی:

وَالْحِكْمَةُ وَضْعُ الْاُمُوْرِ فِیْ مَحَلِّهَا عَلَى الصَّوَابِ ، وَ كَمَالُ ذٰلِكَ اِنَّمَا يَحْصُلُ بِالنُّبُوَّةِ

ہر چیز کا اس کے اصل مقام پر رکھنا حکمت ہے اور اس کا کمال صرف نبوت ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔

حکمت کے انتہائی کمال کا عطائی، وہی ذریعہ نبوت ہے۔ پس اللہ نے اپنے جن منتخب بندوں کو تاج نبوت عطا فرمایا انہیں دولتِ حکمت سے بھی خوب خوب سرفراز فرمایا۔ حتی کہ سیدالانبیاء ﷺ کو خصوصی طور پر معلّم حکمت کے منصب پر فائز فرمایا۔ غور فرمایئے حکمت، خیرِ کثیر کا ذریعہ ہے۔ اور میرے آقا ﷺ معلّم حکمت ہیں۔ پس آپ سے وابستگی، آپ کی تعلیمات پر عمل آپ کے عطا کردہ علوم کا حصول، خیرِ کثیر، حاصل کرنے کا ذریعہ قرار پاتا ہے۔ اسی لئے میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں:

عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْراً يُّفَقِّهْهُ فِی الدِّيْنِ وَ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِیْ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ اور بے شک میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرمانے والا ہے۔ (بخاری شریف)

خیر کثیر کسی بھی صورت میں ہو اللہ رب العزت نے اس کا واسطہ ووسیلہ صاحب کوثر ﷺ کو بنایا۔ ہر بھلائی انہی کے دامن سے وابستہ ہے۔ انہی کے خزانے سے سب کو بھلائیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا:

لا ورب العرش، جس کو جو ملا ان سے ملا
بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

نیز فرماتے ہیں

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
دریا بہا دیئے ہیں در بے بہا دیئے ہیں

حکمت:۔ آیت مذکورہ میں حکمت سے مراد وہ علم ہے جو بواسطہ رسول، اللہ رب العزت نے انسان کو بخشا۔ جس سے انسان خالق کی معرفت حاصل کرتا اور مخلوق کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے طریقے سیکھتا ہے۔ نیز دنیا کی متاعِ قلیل کے حصول اور اس کے استعمال کا صحیح صحیح ڈھنگ سیکھتا ہے۔ یہی علم انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ بام عروج پر پہنچاتا ہے۔ یہی علم نبی کا ترکہ ہے اور اس کے حاصل کر لینے والے اور اس کے نور کو پھیلانے والے "وارثینِ انبیاء" قرار پائے۔ بلا شبہ یہ حکمت، علم ذریعہ خیر کثیر ہے۔ ایسا شخص قابل رشک ہے جسے یہ علم نصیب ہو۔ اور وہ اسی کی روشنی میں زندگی کے ہر معاملہ کا فیصلہ کرے اور ساری زندگی اس نور کو پھیلاتا رہے۔ بیشک ساری نیکیوں کا سلسلہ موت منقطع کر دیتی ہے لیکن علم کا ثواب جاریہ موت سے متاثر نہیں ہوتا۔ اسی علم کی طلب جنت کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے اور طالب کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ فرشتے اس کے لیے اپنے بازو بچھانے لگتے ہیں۔ اسی علم والوں یعنی علماء دین کے لیے آسمان و زمین کی ہر چیز حتی کہ پانی میں مچھلیاں، مغفرت کی

دعا کرتی ہیں۔ عالم، عابد سے ایسا افضل ہے جیسے چودھویں کا چاند تاروں پر۔ حصول علم کے دوران مر جانے والے کو مرتبہ شہادت نصیب ہوتا ہے۔ اسی علم کے سیکھنے یا سکھانے کے لیے رات کو تھوڑی دیر جاگنا، پوری رات کی عبادت سے افضل ہے۔ علم پھیلانے والا ہی سخی ہے۔ علم حاصل کرنے والے کا پیٹ علم سے کبھی نہیں بھرتا۔

یہ خلاصہ ہے معلم حکمت ﷺ کے ارشادات کا۔ جس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ علم دین ذریعہ خیرِ کثیر ہے۔ اللہ رب العزت نے علماء دین کو اسلام کی اشاعت اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی اور اس کے صلہ میں ان سے خیرِ کثیر کا وعدہ فرمایا۔ جن علماء نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی انجام دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان کے لیے وعدہ الٰہی پورا ہوا۔ حکومت و سلطنت اور دولت کے نشے میں مست ہو کر لوگوں نے علماء کے مرتبہ ومقام کو پامال کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ انہیں جیلوں میں ڈالا گیا، کوڑے مارے گئے، الزام تراشیاں کی گئیں۔ معاشرے سے ان کا اثر ختم کرنے کے لیے ان کے خلاف ہر قسم کا حربہ استعمال کیا گیا۔ ایسے ظالموں کا آج کوئی نام تک نہیں لیتا لیکن ان کے دور کے علماء آج بھی امت کی عقیدت ومحبت کا مرکز ہیں۔ آج تک ان کی تعلیمات کا فیض جاری ہے۔ اُن کی تصنیفات شائع ہوتی رہتی ہیں، ان کا ذکر زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہی وہ خیر کثیر ہے جس کا اہل علم سے وعدہ کیا گیا۔

علم اور علماء پر تفصیلی گفتگو ہم نے اپنی کتاب ''وراثت انبیاء'' میں کی ہے۔ جس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

یہی وہ علم ہے جو انسان کی عزت وعظمت کا ذریعہ، اس کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے، جہالت اور غربت کو دنیا سے مٹانے والا ہے اور جو انسان کو پُرسکون زندگی بخشتا ہے۔ جس سے ملکوں میں امن وامان قائم ہوتا ہے۔ محکوم، حاکم کا حکم ماننے لگتے ہیں۔ مظلوم، ظالم کے ظلم سے چھٹکارا پاتا ہے۔ عدل وانصاف عام ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے اور جس سے تہذیب وتمدن سے پُر معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ چھوٹے بڑوں کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنے لگتے ہیں۔ انسانوں میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی علم سے صوبائی، قبائلی تعصب مٹتا ہے۔ رنگ وزبان کا فرق ختم ہوتا ہے۔ تکبر، غرور، حسد، بغض، کینہ، جیسی مہلک بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ اللہ کا نازل کیا ہوا رسول کا سکھایا ہوا علم ہے جو اللہ کے بندوں، رسول کے غلاموں کے لیے رحمت وبرکت کا ذریعہ ہے۔ آج ہم اسی علم سے دور ہو گئے تو کسی اعتبار سے بھی ہماری حالت ٹھیک نہ رہی۔ جتنا زندگی کو سدھارنا، سنوارنا چاہتے ہیں، سہل وآسان بنانا چاہتے ہیں اتنا ہی دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن آج بھی پکار رہا ہے:

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾

اور وہ (نبی) غیب بتانے پر بخیل نہیں اور وہ (قرآن) شیطان مردود کا کہا ہوا نہیں تو تم کہاں چلے جا رہے ہو۔ (التکویر: ۲۴۔۲۶)

ہم ہیں قرآن کی سنتے ہی نہیں، جو قرآن سناتا ہے، رسول کے دامن میں پناہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ آج ہماری نظروں میں اس کی کوئی قدر نہ رہی۔ شیطان کی پکار پر یورپ امریکہ کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی پناہ میں جا رہے ہیں جو خود انسانیت کے بڑے دشمن ہیں۔ جنہوں نے انسان کی عزت، تہذیب، تمدن سب کچھ چھین لیا ہے۔ جنہوں

نے ظاہری چمک دمک پیدا کر کے انسانوں کے دلوں کی دنیا کو تاریک کر دیا ہے۔ جنہوں نے انسان کی عزت کو شراب سے بہایا، صحت و تندرستی کو زنا اور بدکاری سے تباہ کیا۔ اور ہنستے بستے شہروں کو، لہلہاتی فصلوں کو وہ اپنے مہلک ہتھیاروں سے برباد کرتے رہتے ہیں۔ سوچو!

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾ ۔ تو تم، کہاں جا رہے ہو۔ (التکویر:۲۶)

دیکھو اللہ کے نبی معلّمِ کامل ﷺ نے جس شمع علم کو روشن کیا اس نے آج تک ہر دور میں انسان کی رہبری، رہنمائی کی ہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ ہم اسی شمع علم سے اپنی تاریک دنیا کو روشن و منور کریں۔

بلند درجے

یہی علمائے کرام ہیں جن کے درجات بلند فرمانے کا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ (مجادلہ:۱۱)

اللہ تعالیٰ درجے بلند فرماتا ہے تم میں سے ان کے جو ایمان لے آئے اور جن کو علم دیا گیا۔

مرتبہ چاہے دنیا کا ہو یا آخرت کا۔ ایمان والوں اور علم والوں ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ اہل علم پر اللہ کا یہ کیا کم احسان ہے کہ زندگی میں دنیا ان کے گرد جمع رہتی ہے۔ اور مرنے کے بعد ہمیشہ ان کا نام احترام ہی سے لیا جاتا ہے۔ یہ کیا کم احسان ہے کہ ان میں ایسی قوت و طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کا لالچ، ظالموں کا ظلم کوئی چیز انہیں خدمت علم و دین سے نہیں روک پاتی۔ یہ کیا کم احسان ہے کہ ان کا مقام یا تو رسول کا منبر ہوتا ہے یا مصلّٰی۔ دنیا ان کو کتنی ہی حقیر نظروں سے دیکھے لیکن وعدہ الٰہی کے مطابق ان کا درجہ، مرتبہ بلند ہی رہتا ہے۔ صاحبِ حکومت و اقتدار لوگوں کا مجمع ہو یا دولت مندوں کا علماء ان میں تاروں کی طرح چمکتے ہی نظر آتے ہیں۔ ماضی میں بھی یہی مقام تھا۔ آج بھی یہی ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا کہ یہ مرتبہ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ کوئی نہیں چھین سکتا۔ دولت چھینی جا سکتی ہے، اقتدار چھین لیا جاتا ہے، لیکن علم، اسے کون چھین سکتا ہے۔ کیا خوب فرمایا۔ حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے:

''علم مال سے بہتر ہے، مال کی حفاظت کرنا پڑتی ہے مگر علم تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ مال خرچ کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔ مگر علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ علم حاکم ہے، مال محکوم۔ مال دار چل بسے مگر علم والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ علم والوں کے جسم تو مٹ سکتے ہیں مگر ان کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں''۔

پھر علماء کرام کے ادب و احترام کی تعلیم دیتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

جب تم کسی عالم کے پاس پہنچو، تو پہلے عالم کو پھر دوسروں کو سلام کرو۔ عالم کے سامنے نہایت ادب سے بیٹھو، ہاتھوں سے اشارے نہ کرو، آنکھیں نہ پھیراؤ، عالم سے حجت نہ کرو، بحث نہ کرو، سوالوں سے پریشان نہ ہو کہ عالم اس درخت کی طرح ہے جو پھلوں سے لدا ہوا ہے اور اپنے میٹھے پھل کو برابر ٹپکاتا رہتا ہے (یعنی ہر قسم کے سوال کا جواب دیتا ہے) اور عالم کے لیے ضروری ہے کہ

باوقار اور سنجیدہ ہو۔ اِدھر اُدھر بلاضرورت نہ دیکھے۔ شوروغل نہ کرے کھیل کود نہ کرے۔ روکھا اور بے مروت بیہودہ باتیں کرنے والا نہ ہو''۔

گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر بنی اسرائیل کا قائد'' طالوت'' کو مقرر فرمایا تھا جب کہ نہ اس کا خاندان بڑا تھا نہ ہی وہ دولت مند تھا، نہ اسے کوئی شہرت حاصل تھی۔ وہ تو اس وقت کے نبی کے پاس اپنے باپ کے گمشدہ گدھے کے مل جانے کی دعا کرانے آیا تھا۔'' طالوت'' کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ یہاں امارت وقیادت اس کا انتظار کر رہی ہے۔ نبی نے اللہ کی بتائی ہوئی علامات اس میں پائیں اور بنی اسرائیل کو جمع کر کے اعلان کر دیا کہ یہ ہے۔ تمہارا امیر ہے اور جب انہوں نے اس کی حیثیت کو چیلنج کیا تو نبی نے علم ہی کو اس کے اس بلند مرتبہ کا ذریعہ بتایا۔ اللہ فرماتا ہے:

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىهُ عَلَيۡکُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِى الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ (البقرہ: ۲۴۷)

نبی نے کہا، بے شک اللہ نے اسے (طالوت کو) تمہارے مقابلے میں چن لیا ہے اور اس کو علم اور جسم میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔

یہ ہے وہ بلند درجہ جو اللہ اہلِ علم کو عطا فرماتا ہے:

عالم وجاہل

ایک سوال کی صورت میں اللہ کا اعلان ہے کہ علم والے اور جاہل ہرگز ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝ (زمر: ۹)

(اے محبوب علیہ السلام) آپ پوچھئے کیا برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور جاہل؟ البتہ صرف عقل مند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

علم والے اور جاہل کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ جاہل جو قرآن کا پیغام سمجھنا تو درکنار، قرآن کے الفاظ تک نہیں پڑھ پاتا۔ جو روزہ، نماز، حج وزکوٰۃ کے ضروری مسائل تک نہیں جانتا جو اپنے ماں باپ کا جنازہ تک نہیں پڑھ سکتا۔ جو والدین اور بیوی بچوں کے حقوق میں فرق نہیں کر پاتا، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اہمیت کا احساس تک نہیں رکھتا۔ ایسا شخص عالم کے برابر کیسے ہو سکتا ہے۔ عالم جو جانتا ہے کہ انسان کا مقصد زندگی کیا ہے، جو سمجھتا ہے کہ عبادات کی اہمیت اور فائدہ کیا ہے، جو بندوں کے حقوق پہچانتا اور انہیں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دین پر دنیا کو قربان کرتا ہے جو شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے جو خود سیدھے راستے پر ہوتا ہے اور دوسروں کو اچھی راہ دکھاتا ہے۔ جو اپنی منزل پہچانتا ہے۔'' عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے'' یہ ایک حقیقت ہے لیکن اس حقیقت کو دنیا کے پجاری دولت کے نشے میں مست، نہیں تسلیم کر سکتے، اس کو تو عقلمند ہی مانتے ہیں۔ اسی لئے حضرت ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں'' علماءِ حق کے وجود سے دین ودنیا کا استحکام ہے اور علم کی تباہی دین ودنیا کی تباہی ہے''۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں'' عالم کی موت سے، اسلام میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جو مدتیں

گزرنے کے باوجود بھی پر نہیں ہوتا"۔

شیطان کا مکر

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث پر دوبارہ غور کیجئے جس میں عابد پر عالم کی فضیلت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبادت ایک نیکی ہے اور عبادت گزار بندہ قابل تعریف ہے۔ لیکن علم کے بغیر عبادت کرنے والا شیطان کے فریب کا شکار بھی بہت جلد ہوتا ہے۔ کبھی تو اس طرح کہ وہ اپنی عبادت پر تکبر و غرور کرنے لگتا ہے۔ اپنے آپ کو متقی اور پرہیز گار جاننے لگتا ہے اور دوسروں بلکہ عالموں تک کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ آج کل کے جاہل صوفی اور پیروں کو دیکھ لیجئے کیسے شیطان کے فریب میں پھنسے ہیں۔ خود کچھ جانتے نہیں اور عالموں کے قریب آنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے معتقدین اور مریدین کو بھی عالموں سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا دین بس وہ ہے جو وہ سوچ لیتے ہیں اور اسی کو وہ طریقت کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ شریعت سے طریقت علیحدہ ہو تو کچھ نہیں۔ اور نہ ہی تصوف اور صوفی ہونا کوئی علیحدہ چیز ہے۔ شریعت کی پابندی اور دین کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی تصوف ہے۔ اس اعتبار سے ہر مسلمان کو صوفی ہونا چاہئے۔ اور علماء خود صوفی ہوتے ہیں اور لوگوں کو صوفی بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ نہ جانے کس بنیاد پر صوفی اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے علیحدہ ایک گروپ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض لوگ خصوصیت کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ صوفی کا لفظ استعمال کرتے ہیں جب کہ امام غزالی، مجدد الف ثانی، خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہم جیسے اکابر نے کبھی اپنے آپ کو صوفی نہ کہلایا۔ جب کہ یہ حضرات تصوف کے معلّم اور مبلِّغ سمجھے جاتے ہیں۔ غرضیکہ جاہل عابد شیطان کے مکر کا بہت جلد شکار ہوتا ہے اور کبھی وہ اس طرح شیطان کے فریب میں مبتلا ہوتا ہے کہ کسی عبادت کو بڑا اہم سمجھ بیٹھتا ہے جب کہ اس کے لیے شریعت کے مطابق دوسری ذمہ داریاں پوری کرنا ضروری ہے۔ مثلاً آج کل گروہی تبلیغ کا ایک سلسلہ جاری ہے جس میں سب سے بڑی عبادت کچھ عرصہ کے لیے کاروبار، اہل و عیال سب کو چھوڑ کر تبلیغ کے لیے کسی دوسرے شہر یا ملک جانا قرار دیا جاتا ہے۔ شیطان کے اس مکر نے نہ جانے کتنے لوگوں کا کاروبار برباد کر دیا۔ گھروں کو تباہ کر دیا۔ جاہل مبلِّغ سب کچھ چھوڑ کر تبلیغ کے لئے چل دیا۔ پیچھے تجارت برباد ہوگئی، نوکری چھوٹ گئی، جوان بیوی گناہ میں مبتلا ہوگئی، بیٹی گھر چھوڑ کر بھاگ گئی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے حادثات ہوتے ہیں۔ یہ بربادی صرف جہالت کی وجہ سے ہوئی۔ علم ہوتا تو جانتے کہ حالات کے مطابق ذمہ داریوں کو پورا کرنا عبادت ہے، جس کی مثال احادیث میں موجود ہے۔

"وراثت انبیاء" سے یہ چند اقتباسات پیش کئے گئے۔ جن پر ہم اس عنوان کو ختم کرتے ہیں۔ اللہ ہمیں وہ حکمت عطا فرمائے جو "ذریعہ خیر کثیر" ہے۔

نذر کا بیان

وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (بقرہ: ۲۷۰)

اور جو بھی تم نے (اللہ کی راہ میں خرچ کیا، یا کوئی منت مانی، تو بے شک اللہ اسے جان لیتا ہے اور ظالموں

کا کوئی مددگار نہیں۔

نذر کی تعریف یہ ہے:

هُوَ مَا اَوْجَبَهُ الْمُکَلَّفُ عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ عِبَادَاتٍ لَّوْ لَمْ یُوْجِبْهُ لَمْ یَلْزِمْهُ.

کسی مکلّف کا اپنے اوپر کسی ایسی عبادت کو واجب کر لینا کہ اگر وہ اس کو خود واجب نہ کرتا تو اس پر لازم نہ ہوتی۔ (ماخوذ از ضیاء القرآن)

نذر ماننے کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔قرآن کریم میں حضرت عمران کی بیوی جن کا نام مفسرین نے بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق حنّہ لکھا، کے نذر ماننے کا ذکر موجود ہے۔ارشاد ہوا:

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ (آل عمران:۳۵)

جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے رب میں نے تیرے لیے (اس کی) منت مانی، جو میرے پیٹ میں ہے آزاد کیا ہوا (خالص تیرے لیے) تو (اے رب) قبول کر لے مجھ سے، بے شک تو ہی بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

حنّہ کی آرزو تھی کہ بیٹا پیدا ہوگا تو میں اپنی کوئی ذمہ داری اس کے سپرد نہ کروں گی۔ بلکہ اس کو اللہ کے لیے آزاد کر دوں گی۔ کہ وہ زندگی بھر بیت المقدس کی جاروب کشی کرتا رہے گا کہ اللہ ہی نے مجھے یاس و ناامیدی کے بعد اولاد عطا فرمائی ہے۔تو یہ اولاد اسی کے لیے وقف ہوگی۔لیکن ہوا یہ کہ حنّہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے مریم رکھا۔حنّہ بیٹی کی پیدائش سے پریشان ہوئیں کہ اب نذر کیسے پوری کریں کیونکہ اس وقت تک بیت المقدس کی خدمت کی لڑکیوں کو اجازت نہ تھی۔لیکن رب کی حکمت کچھ اور ہی تھی کہ اس بیٹی ہی کو اپنی قدرت کا نمونہ اور شاہکار بنانا تھا۔ پس اللہ نے حنّہ کی طرف سے بیٹی ہی کو قبول فرمالیا۔اور ان کی پرورش کا غیبی انتظام فرمایا۔یہی مریم بنت حنّہ، اللہ کی قدرت کاملہ سے بغیر شوہر کے ایک بیٹے کی ماں بنیں۔ جو اللہ کے جلیل القدر رسول ہوئے۔جن کو عیسٰی روح اللہ کہا گیا۔اللہ نے ان کی ماں مریم کی طرح ان کو بھی اپنی قدرت کا مظہر بنایا۔کہ جب دشمن ان کی جان کے درپے ہوئے تو اللہ قادر مطلق نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔جو آج تک زندہ ہیں۔قیامت سے پہلے دنیا میں تشریف لائیں گے۔نبی آخرالزماں ﷺ کے امتی کی حیثیت سے، اسلام کی عظیم خدمت انجام دیں گے۔اور زندگی کے بقیہ ایام پورے کر کے طبعی موت سے دنیا سے رخصت ہوں گے۔ اور نبی مکرم علیہ السلام کے روضہ مبارک میں دفن کیے جائیں گے۔ جہاں ان کی قبر کی جگہ مخصوص ہے۔

نذر کی دوسری نظیر سورہ مریم میں موجود ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جب حضرت مریم کو اپنی بدنامی اور لوگوں کے طعنوں کی فکر ہوئی اور سوچنے لگیں کہ میں اپنے گھر والوں اور خاندان کو کیسے منہ دکھاؤں گی اور انہیں کیسے مطمئن کروں گی۔تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا:

فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْۤ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ

اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ (مریم:۲۶)

پس اگر تو کسی آدمی کو دیکھے تو (اشارے سے) کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لئے (خاموشی کے) روزے کی نذر مانی ہے تو آج میں ہرگز کسی آدمی سے گفتگو نہ کروں گی۔

مذکورہ بالا دونوں واقعات سے بہت پہلے کی بات ہے کہ جب تعمیر کعبہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان حج کرنے کا حکم دیا تو حج کے چند احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾ (حج:۲۹)

پھر چاہیے کہ دور کریں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی نذریں اور طواف کریں ایسے گھر کا جو بہت قدیم ہے۔

حضور علیہ السلام کی بعثت سے قبل بھی نذر کا عام رواج تھا۔ اسی رواج کے مطابق نبی مکرم علیہ السلام کے دادا حضرت عبدالمطلب نے چاہ زمزم کھودتے ہوئے رب کعبہ سے دعا کی تھی کہ مجھے دس بیٹے عطا فرما اور نذر مانی تھی کہ اگر یہ دسوں میری زندگی میں جوان ہو گئے تو اے اللہ، ان میں سے ایک کو میں تیرے لیے قربان کروں گا۔

بہرحال نذر کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔ ہر قوم میں تھا اور آج بھی ہے۔ اسلام نے ماضی کے تمام طریقوں اور رسم و رواج کا یکسر خاتمہ نہ کیا بلکہ ان میں جو چیزیں اسلام کے بنیادی اصولوں اور مزاج کے خلاف نہ تھیں انہیں ضروری اصلاحات کے بعد باقی رکھا۔ نذر بھی انہی میں سے ہے۔ جس کا ذکر آیت زیر گفتگو میں کیا گیا۔ ''کہ تم جو بھی خرچ کرتے ہو اور جو بھی نذر مانتے ہو اللہ کو اس کا پوری طرح علم ہے'' لہٰذا خلاف شرع اپنی دولت خرچ کر کے یا خلاف شرع نذر مان کر اللہ کے عذاب کو دعوت نہ دو۔ اور ظالمین میں شامل نہ ہو۔ کہ ظالمین کا دنیا و آخرت میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ نیز ایفائے نذر کو اہل جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی قرار دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ﴿۷﴾ (الدھر:۷)

جو اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت ہر طرف پھیلی ہوگی۔

نذر در حقیقت اللہ سے کیا گیا ایک وعدہ ہے، جو بندہ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا پورا کرنا بندے پر واجب قرار دیا گیا اور اس کو جنتیوں کی خوبیوں میں شمار کیا گیا۔ صاحب شریعت ﷺ نے مختلف اوقات میں نذر سے متعلق احکام کی وضاحت فرمائی۔ اس سلسلہ کی چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَ ابْنِ عُمَرَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُنْذِرُوْا فَاِنَّ النَّذْرَ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْقَدْرِ شَيْئًا وَ اِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ۔

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا نذر نہ مانا کرو، کہ یہ تقدیر کو نہیں بدل سکتی، لیکن اس کے ذریعہ بخیل کا مال نکل جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حدیث شریف میں مطلقاً نذر ماننے کی ممانعت نہیں۔ بلکہ بات بات پر نذر ماننے اور اس خیال سے ماننے کی

ممانعت کی جارہی ہے کہ نذر ماننے سے تقدیر تک بدل جاتی ہے اور مرضی کے مطابق کام ضرور ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آپ نے نذر کا ایک فائدہ بھی بیان فرما دیا کہ جو شخص ویسے صدقہ و خیرات کرنے میں بخیل ہو، نذر پوری کرنے ہی کے بہانے اس کا مال خرچ ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا نذر کی وقعت کو برقرار رکھتے ہوئے اہم مواقع پر ہی ماننا چاہیے۔ اور یہ خیال تک نہیں کرنا چاہیے کہ اس ذریعہ سے مراد ضرور ہی پوری ہوگی کہ مرادیں پوری کرنے والا اللہ ہی ہے۔ جو اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق جسے جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ نذر تو اس کی عطا پر شکریہ کا ایک طریقہ ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ نَذَرَ اَنْ يُّطِيْعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ وَ مَنْ نَّذَرَ اَنْ يَّعْصِيَهٗ فَلَا يَعْصِهٖ۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس نے اللہ کا حکم ماننے کی نذر کی تو ضرور حکم مانے اور جس نے اس کی نافرمانی کی نذر مانی تو اس کی نافرمانی نہ کرے۔ (بخاری شریف)

مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی ایسے عمل کی نذر مانی جائے جو شریعت کے مطابق ہو تو اسے پورا کیا جائے۔ اور اگر ایسے عمل کی نذر مانی گئی جو خلاف شرع ہو تو اسے پورا نہ کیا جائے، لیکن اس صورت میں کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا، جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا نَذْرَ فِيْ مَعْصِيَةٍ وَّ كَفَّارَتُهٗ كَفَّارَةُ الْيَمِيْنِ۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، گناہ کے کام کی نذر نہیں اور اس کا کفارہ وہی قسم والا کفارہ ہوگا۔ (ابوداؤد شریف)

خلاف شرع کسی عمل کی نذر ہو، غیر معین نذر ہو کسی ایسے کام کی نذر ہو جو طاقت سے باہر ہو اسے پورا نہیں کیا جائے گا۔ ہاں کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اور نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ یعنی غلام آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا۔ اگر دونوں میں سے کچھ نہ کر سکے تو تین روزے رکھنا۔

نذر کے عمل میں اس کے ایصال ثواب میں کسی بزرگ ولی کا نام لینا جائز ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ اگر میرا یہ کام ہو گیا تو میں حضور غوث پاک کی فاتحہ کراؤں گا یا محفل میلاد کراؤں گا یا فلاں بزرگ کے مزار پر فاتحہ کے لیے حاضری دوں گا۔ یہ تمام صورتیں بلا تامل جائز ہیں کہ اولیاء کرام سے اظہار عقیدت اور ثبوتِ نسبت قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

نذر کے متعلق تفصیلی مسائل فقہاء کرام نے بیان فرمائے ہیں۔ جو بوقت ضرورت علماء سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ یہاں آیت زیر گفتگو سے متعلق یہ چند سطور کافی ہیں۔

صدقہ کے دو طریقے:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ

عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (البقرہ:۲۷۱)

اگر تم ظاہر کر کے خیرات دو تو کیا ہی اچھا ہے اور اگر تم اسے چھپاؤ اور فقیروں کو دو تو وہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ اور وہ مٹا دے گا تمہارے کچھ گناہوں کو اور اللہ تمہارے سب کاموں سے خبر دار ہے۔

صدقہ دینے کے دو طریقے ہیں۔ اعلان اور اظہار کے ساتھ صدقہ کیا جاتا ہے یا اخفاء، خاموشی کے ساتھ دے دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی مکرم علیہ السلام سے سوال کیا کہ ہم کس طرح صدقہ کریں۔ ظاہر کر کے یا چھپا کر۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے صحابہ کے صدقے میں کرم فرمایا کہ وحی کے ذریعہ اس سوال کا جواب دیا گیا۔ جس سے ہمیشہ کے لئے مسئلہ واضح ہو گیا۔ کہ صدقہ ادا کرنے کے دونوں ہی طریقے جائز ہیں۔ حالات کے مطابق جو صورت بھی مناسب وموزوں ہو اسے اختیار کیا جائے۔

صدقہ اگر اظہار واعلان کے ساتھ دیا جائے تو اہم شرط یہ ہے کہ ریاء دکھاوے کا وسوسہ تک نہ آنے پائے۔ دولت مندی کے اظہار، اپنی برتری اور ضرورت مندوں کی تحقیر کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس اعلان سے مقصود یا تو یہ ہو کہ لوگ بخل یا کنجوسی کا الزام نہ لگانے پائیں ان کو بدگمانی کے گناہ سے بچایا جائے یا اس لئے کہ دوسروں کو ترغیب ہو کہ وہ بھی دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، جیسے عام اجتماعات میں مساجد ومدارس وغیرہ کے لئے چندہ کیا جاتا ہے جو نبی مکرم علیہ السلام کی سنت ہے کہ آپ بھی جہاد اور دیگر دینی کاموں کے لئے عام اجتماعات میں چندہ فرماتے تھے اور صحابہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ صدقہ پیش فرماتے تھے۔ یہ دینی خدمت کے لئے حرص پیدا کرنے کا ایک طریقہ ہے اور دینی امور میں حرص جائز ہے۔ اسی حرص میں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک کے موقع پر اپنا نصف سرمایہ اللہ کی راہ میں پیش کیا اور یا صدقہ کا اعلان اس لیے کیا جائے کہ صحیح ضرورت مند اور مستحق کا پتہ چل جائے کیونکہ اس صورت میں بہت کم امکان رہتا ہے کہ کوئی غیر ضرورت مند صدقہ لینے کی کوشش کرے۔

بہر حال اعلان واظہارِ صدقہ جائز ہے۔ بہتر ہے قرآن کریم نے اس کے لیے ''فنعما ھی'' کا جملہ استعمال فرمایا۔ یعنی وہ اچھا ہے اس کا سب سے عظیم اخروی فائدہ یہ ہے کہ صدقہ میں پہل کرنے والے شخص کی اتباع و پیروی میں جتنے لوگ صدقہ کرتے ہیں یا کرتے رہیں گے ان کا ثواب کم ہوئے بغیر اتنا ہی ثواب پہل کرنے والوں کو بھی ملتا رہے گا غور فرمایئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صدقات اعلان کے ساتھ دیئے۔ آج تک ان کا جذبہ ایثار امت کے دلوں میں ایثار کے جذبات پیدا کرتا ہے اور عشاق ان کے واقعات سن کر دین کی خدمت کے لئے اپنی دولت برساتے ہیں۔ اگر ان حضرات کے تمام صدقات خفیہ اور پوشیدہ ہوتے تو ہمیں ان کا علم تک نہ ہوتا۔ اور خدمت دین کا جذبہ بیدار نہ ہو پاتا۔ نیز ان حضرات کی اتباع میں آج تک غلاموں نے دین کے لئے جو کچھ خرچ کیا اور قیامت تک جو کچھ خرچ ہو گا اس کے ثواب میں یہ حضرات برابر کے شریک ہیں اور انہی کے صدقے میں ہمارے صدقات مقبول ہوتے ہیں۔

ہر قسم کا صدقہ اعلان کے ساتھ کرنا جائز ہے۔ لیکن فقہاء نے خصوصیت کے ساتھ صدقاتِ واجبہ، زکوٰۃ، صدقہِ فطر،

قربانی وغیرہ کو اعلان و اظہار کے ساتھ ادا کرنا افضل قرار دیا ہے۔ تاکہ لوگ اس بدگمانی سے محفوظ رہیں کہ فلاں دولت مند زکوٰۃ وغیرہ تک ادا نہیں کرتا۔ نیز دوسرے صاحبِ حیثیت لوگوں کو بھی اپنے فرض کی ادائیگی کا احساس ہو۔ یہی حکم دیگر عبادات نماز، روزہ اور حج کا ہے۔ کہ فرائض کی ادائیگی اس طرح کرنا افضل ہے کہ دوسروں کو اس کا علم ہو جائے کہ اس سے وہی فوائد حاصل ہوں گے جو اعلان کے ساتھ صدقہ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ گویا ایسا شخص عملاً مبلغ بھی ہوگا اور ایسا متقی بھی جس کے تقوے پر بہت سے مسلمان گواہ ہوں گے۔

خفیہ طور پر صدقہ دینا بھی جائز ہے "خیر لکم" یہ تمہارے لئے اور بھی بہتر ہے یہ صورت بالخصوص ایسے عام لوگوں کے لئے پہلی صورت سے افضل ہے جو وساوس پر قابو نہ پاسکتے ہوں اور ان وسوسوں میں مبتلا ہونے کا امکان ہو جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا۔ ایسے لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ صدقہ واجب و نفل سب خفیہ طور پر ادا کریں۔

بہرحال قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ صدقہ دینے والا اپنے حال اور حالات کے مطابق دونوں طریقوں میں سے جو مناسب خیال کرے، اختیار کر سکتا ہے۔ اللہ کے نزدیک دونوں ہی مقبول و پسندیدہ ہیں۔ عمل کرنے والے کی نیت میں خلوص ہونا ضروری ہے کہ اعمال کی مقبولیت کا دارومدار خلوص نیت پر ہی ہے۔

غیر مسلموں کو صدقہ دینا:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (البقرہ:۲۷۲)

ہدایت پر (کسی کو) لانا تمہارے ذمہ نہیں، ہاں اللہ جسے چاہے، ہدایت پر لاتا ہے اور تم جو مال خرچ کرو تو تمہارے ہی نفع کے لئے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کی رضا کے لئے اور تم جو مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے اس کا پورا ثواب تمہیں دیا جائے گا اور تم ظلم نہ کئے جاؤ گے۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو اخلاق و کردار کا ایسا پیکر بناتا ہے جس سے اپنے غیر سب ہی فیضیاب ہوں۔ حتیٰ کہ وہ اپنی دعوت کی اشاعت و تبلیغ کا تو حکم دیتا ہے لیکن اسے قبول کرنے کے لئے کسی پر کسی قسم کے جبر و اکراہ کی اجازت نہیں دیتا۔

قرآنِ کریم کا واضح اعلان ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۟ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ:۲۵۶)

دین میں زبردستی نہیں۔ بیشک خوب ظاہر ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے، تو جس نے شیطان (کے حکم) کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا تو بیشک اس نے ایسا مضبوط دستہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

یہ اسلام کی دعوت کا بنیادی اصول ہے کہ حق و باطل کو دلائل سے واضح کر دیا جائے۔ اس کو قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے لیکن یہ اصولِ دعوت غیر مسلموں کے لئے کفار کے لئے ہے۔ جس نے اسلام کو قبول کر لیا اسے احکام شریعت کی پابندی سے آزاد چھوڑ دینا مقصود نہیں جب مسلمان خلاف شرع کوئی عمل کرے گا تو اس پر حد ضرور جاری ہوگی۔ اور اسے قرآن وسنت کی پابندی پر مجبور کیا جائے گا کہ غلام کتنا ہی چہیتا ہو لیکن آقا اسے اپنے احکام کی بغاوت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مؤمن وہ غلامِ مصطفیٰ ہے جس کی عزت وعظمت کا ذریعہ صرف اطاعتِ مصطفیٰ ہے۔ شرعی احکام کی پابندی اس کی ذمہ داری ہے اس میں کوتاہی پر وہ شرعی سزا کا مستحق ہوگا۔ غیر، غیر ہیں ان کے سامنے صرف دعوت پیش کی جائے گی۔ حق و باطل کو واضح کیا جائے گا۔ انہیں ڈرا کر، ستا کر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا کہ اسلام دین رحمت ہے کسی کو زحمت و مصیبت میں مبتلا نہیں کرتا۔

اسی اصول کی بنیاد پر غیر مسلموں سے دوستی کی ممانعت کے باوجود شریعت نے ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور ان کی امداد کرنے کی اجازت دی ہے۔ فقہاء نے اس کی وضاحت کے لئے ایک بہت ہی دلچسپ مثال بیان فرمائی کہ اگر تمہارے دو پڑوسی ہیں۔ ایک مسلمان دوسرا غیر مسلم تو اگر غیر مسلم پر کوئی مصیبت آئے تو تم اس کی امداد کو پہنچو۔ لیکن اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو مدد کے لئے غیر مسلم کو نہ پکارو بلکہ اپنے مسلمان پڑوسی سے مدد حاصل کرو۔ یعنی غیر مسلم کی امداد کرنا جائز ہے کہ یہ اسلام کی عظمت کا مظاہرہ اور تبلیغ کا عملی طریقہ ہے لیکن غیر مسلم سے مدد لینا جائز نہیں کہ اس سے اپنی مجبوری اور اپنی قوم، مسلمانوں کی توہین ظاہر ہوگی۔

اس مسئلے کی بنیاد پر غور کیجئے کہ وہ مسلم حکام امت کے لئے کس قدر باعث ننگ و عار ہیں۔ جو اپنوں ہی کے خلاف غیر مسلموں کو، اسلام کے دشمنوں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ صرف اپنی حکومت و دولت بچانے کے لئے وہ دشمن اسلام سے امتِ مسلمہ کو قتل کراتے۔ مسلم مملکت کو تباہ و برباد کراتے ہیں اور اس کو اپنی فتح قرار دیتے ہیں۔ یہی لوگ اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی توہین کے مجرم ہیں۔ یہی دشمن کا آلہ کار بن کر امت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔

صدقہ، مملکتِ اسلامیہ اور مسلمانوں سے غربت و افلاس دور کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن اسلام انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اجازت دیتا ہے کہ ان غیر مسلموں کی بھی صدقہ سے امداد کی جاسکتی ہے، جنہوں نے اسلامی مملکت میں آباد رہنے کو ترجیح دی اور بحیثیت اقلیت اسلامی حکومت ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی محافظ ہے۔ پس امت مسلمہ کو اجازت ہے کہ انفرادی طور پر بھی ان کی امداد کریں کہ یہ بھی اب ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہیں۔

صحابہ کرام اپنے غیر مسلم اعزاء و اقارب کا مالی تعاون کرتے رہتے تھے اور یہ امید رکھتے تھے کہ یہ لوگ ضرور اسلام قبول کر لیں گے۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر صحابہ نے غیر مسلموں کی امداد نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس خیال سے کہ یہ لوگ مالی پریشانی سے تنگ آ کر اسلام قبول کر لیں گے۔ آیت زیر گفتگو میں اسی طریقے کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تم پر کسی کے ہدایت قبول کرنے کی ذمہ داری نہیں کہ تم اس کی تدبیریں اختیار کرو۔ حتی کہ لوگوں کو پریشان کرو اور ان پر جبر کرو۔ تمہارا کام تو صرف تبلیغ اور پیغامِ ہدایت پہنچانا ہے۔ صدقہ نہ اپنوں کو کسی لالچ اور بدلہ کی امید پر دو اور نہ غیروں کو۔ صدقہ تو تم

اپنی بھلائی کے لیے کرتے ہو۔ اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہو، تو تمہارا یہ مقصد ضرور حاصل ہوگا کہ دنیا میں تمہیں صدقہ کی برکات نصیب ہوں گی اور آخرت میں اس کا پورا پورا اجر، اور تمہارا رب تم سے ضرور راضی وخوش ہوگا۔

فقہاء نے غیر مسلموں کو صدقہ دینا جائز قرار دیا ہے۔ لیکن نفلی صدقہ، صدقہ واجب زکوٰۃ وغیرہ۔ غیر مسلم کو نہیں دی جاسکتی کیونکہ یہ صرف ان مستحقین کا حق ہے جن کی قرآن وحدیث نے وضاحت کردی ہے۔ نیز مسلمان دولت مند کی دولت میں زکوٰۃ وغیرہ درحقیقت غریب مسلمانوں کا حق مقرر کیا گیا ہے۔ جو صرف انہی کو دیا جائے گا۔ صدقہ صرف ان غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے جو اسلام کی حکمرانی کو قبول کرلیں اور اسلام اور مسلمانوں سے عداوت، ان کے خلاف سازشوں میں ملوث نہ ہوں۔ یہی حکم ان کافروں کے لئے ہے جو آج کل مسلم ممالک میں آباد ہیں۔ علاوہ ازیں اسلام کی تبلیغ، مسلمانوں کی انسانی ہمدردی کے جذبہ کے اظہار کے طور پر، صدقہ سے ایسے غیر مسلموں کی بھی امداد کی جاسکتی ہے جو کسی ہنگامی آفت مثلاً زلزلہ، قحط وغیرہ میں مبتلا ہوں یا غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے پڑوسی ہوں، جو ضرورت مند ہوں۔

مستحقین صدقہ

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝ (البقرہ: ۲۷۳)

(یہ خیرات) ان محتاجوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے۔ وہ زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جاہل انہیں غنی سمجھتا ہے (ان کے) سوال سے بچنے کے سبب (اے سننے والے) تو ان کی صورت سے انہیں پہچان لے گا، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے اور جو مال تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو بیشک اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

قرآن کریم نے ان لوگوں کا تعین کردیا ہے جنہیں صدقہ دیا جائے۔ ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝ (التوبہ: ۶۰)

بیشک صدقات، صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور جو انہیں وصول کرنے پر مقرر کیے گئے اور جن کے دلوں کو اسلام سے مانوس کرنا مقصود ہو اور (غلامی سے) گردنیں آزاد کرانے میں اور قرض داروں کے لیے، اور اللہ کی راہ میں، اور مسافروں کے لیے مقرر کئے ہوئے صدقات ہیں اللہ کی طرف سے اور اللہ بہت جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔

یہ زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ کے مستحقین کا بیان ہے۔ یہ آٹھ قسم کے لوگ ہیں۔

فقراء: جن کے پاس نصاب سے کم مال ہو۔ لیکن وہ اپنی ضروریات پوری کرنے مثلاً بچوں کی شادی وغیرہ کے اخراجات سے

قاصر ہوں اور فکر مند ہوں۔ اپنی عزت و شرافت کے سبب کسی سے سوال بھی نہ کر سکتے ہوں۔

مساکین: جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو وہ نان شبینہ تک کو محتاج ہوں وہ بھکاری ہوں یا نہ ہوں۔

عاملین: وہ لوگ جنہیں حاکم اسلام نے زکوۃ کی وصولیابی کے لیے مقرر کیا ہو۔

مؤلفۃ القلوب: ایسے لوگ جن کا معاشی مشکلات کے سبب دین سے منحرف ہو جانے، مرتد ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس وجہ سے ان کی دلجوئی ضرور ہو۔

الرقاب: گردنیں چھڑانے پر زکوٰۃ کی رقم صرف کی جائے۔ یعنی ایسے لوگوں کو اس دولت سے آزاد کرایا جائے جو غلام ہوں یا غیر مسلموں کی قید و بند میں صرف مسلمان ہونے کے ناطے تکالیف میں مبتلا ہوں۔

غارمین: وہ لوگ جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے قرض لیتے رہے اور محدود آمدنی کے باعث اس کی ادائیگی، ان کے لیے ناممکن ہو۔ قرض کی ادائیگی کے لیے انہیں زکوٰۃ وغیرہ دی جائے۔

فی سبیل اللہ: جن لوگوں نے اپنے آپ کو خدمت دین کے لیے وقف کر رکھا ہو۔ مثلاً مجاہدینِ اسلام، علماء دین اور دینی طالب علم۔

ابن السبیل: وہ لوگ جو حالت سفر میں کسی ناگہانی آفت، چوری وغیرہ کے باعث ضرورت مند ہو گئے اگرچہ وہ اپنے گھروں میں مال دار ہوں۔

آیت زیرِ گفتگو میں فقراء ہی کے ایک گروہ کی وضاحت کی جارہی ہے کہ یہ سب زیادہ مستحق زکوٰۃ وصدقات ہیں جبکہ ان کے ظاہری حال کو دیکھ کر دولت مند انہیں کچھ نہیں دیتے۔ حالانکہ یہ بھی فقراء ہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں وقف کر رکھا کہ ان کے شب وروز خدمت دین میں صرف ہوتے ہیں۔ قرآن وسنت کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ دین پھیلانے کی تدابیر میں مصروف رہتے ہیں ان کی یہ مصروفیت انہیں اپنے معاش کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے نہ تجارت کرنے کی فرصت دیتی ہے نہ ملازمت کرنے کی جب کہ ان کے اہل وعیال بھی ہیں۔ ان کی ضروریات عام لوگوں سے زیادہ ہی ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ علمی وجاہت، علمی وقار کی حفاظت کے سبب یہ نہ تو کسی سے اپنا حال کہہ سکتے ہیں نہ ہی ان کا ظاہر ان کے فقر کی ترجمانی کرتا ہے۔ نہ یہ لوگوں سے سوال کر پاتے ہیں۔ جاہل ان کو بہت ہی خوشحال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے معاش کی طرف سے نہایت متفکر رہتے ہیں۔ پس لوگوں کو چاہئے کہ وہ ان کی عزت بھی کریں اور مالی خدمت بھی۔ ان پر جو مال بھی صرف کیا جائے گا وہ بہترین صدقہ ہوگا۔ زکوٰۃ کی دولت سے ان کی خدمت کی جائے گی تو وہ یقیناً مقبول ہوگی۔ کہ درحقیقت یہ دوہری عبادت ہے۔ زکوٰۃ وصدقہ بھی اور خدمت دین میں تعاون بھی۔

قرآن کریم کے اس حکم کے مطابق ہی ہر دور میں حکام وعوام نے دین کے خادموں کی خدمت کا پوری طرح خیال رکھا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تجارت کرتے تھے۔ انہوں نے بے شمار دولت دینی ضروریات پر صرف کی

لیکن جب خود خلیفہ ہوئے اور تجارت کی فرصت نہ رہی تو صحابہ نے بیت المال سے ان کی تنخواہ مقرر کی اور آپ نے قبول فرمائی۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو بھی بیت المال سے تنخواہ ملتی تھی۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے خلیفہ ہارون رشید کے دور میں قضاء کا عہدہ قبول کیا جس کی وہ تنخواہ لیا کرتے تھے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں سے نذرانہ قبول کرتے تھے۔ نظام الملک بادشاہ نے مدرسہ نظامیہ کے مدرس اول کی تنخواہ ایک لاکھ درہم ماہانہ مقرر کی تھی۔ فتاوی عالمگیری کے مرتبین علماء کو اورنگ زیب عالمگیر کی طرف سے باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی اور فتاویٰ کے مکمل ہونے پر ان میں بطور نذرانہ و انعام دو لاکھ درہم اور دو سو قرش سونا تقسیم کیا گیا۔ اسی طرح آپ ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو علماء کی خدمت یا تو بیت المال سے ہوتی رہی یا عوام خود ان کی خدمت کرتے رہے۔ اسی لئے ان میں سے اکثر خوشحال رہے اور فکر معاش سے آزاد ہو کر دین کی خدمت انجام دیتے رہے کسی کی پروا کئے بغیر صدائے حق بلند کرتے رہے۔ لیکن ہمارا دور اس قدر افسوسناک ہے کہ علماء سے حکام، دین کی تبلیغ و اشاعت کا تو مطالبہ کرتے ہیں۔ عوام ان سے حق بات سننا چاہتے ہیں۔ لوگ ان سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ فتوے لیتے ہیں۔ نکاح پڑھواتے ہیں، جنازے پڑھواتے ہیں، دعا و تعویذ کے لئے ان کے پاس آتے ہیں۔ لیکن نہ حکام کی طرف سے ان کی کوئی خدمت ہوتی ہے۔ نہ ہی عوام کو ان کی خدمت کا احساس رہا ہے۔ اسی لئے آج معاشی طور پر سب سے زیادہ کمزور آپ کو علماء ہی کا طبقہ نظر آئے گا۔ آج حال یہ ہے کہ امام کے مقتدی نماز پڑھنے گاڑیوں میں آتے ہیں۔ لیکن غریب امام کے پاس سائیکل تک نہیں ہوتی۔ اگر عوام خدمت علماء کا احساس کریں اور صدقہ و زکوٰۃ سے ان کی امداد کریں تو علماء فکر معاش سے آزاد ہو کر سکون سے خدمت دین کی ذمہ داری پوری کر سکتے ہیں۔ نیز لوگوں کے صدقات و زکوٰۃ بھی یقیناً صحیح مستحقین کو پہنچیں۔ کہ جو علماء اس کے مستحق نہ ہوں گے وہ اسے ہرگز ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی صدقات و زکوٰۃ اگر علماء کو دے کر انہیں اس کا وکیل مختار بنا دیا جائے کہ وہ جیسے چاہیں اس کو خرچ کر دیں تو یہ ایک بہترین طریقہ ہوگا۔ صدقات و زکوٰۃ کے مستحقین تک پہنچنے کا اگر علماء مستحق ہوں گے تو وہ اس کو خود استعمال کریں گے اور اگر مستحق نہ ہوں گے تو وہ اس کو شرعی طریقے پر صحیح مصرف میں خرچ کریں گے۔ بہرحال صدقات و زکوٰۃ علماء کو دی جائے یا ان کے ذریعہ دوسروں تک پہنچائی جائے دونوں صورتیں اعلیٰ و افضل ہیں۔

عاملین کی وضاحت

یہاں ایک وضاحت بے محل نہ ہوگی وہ یہ کہ قرآن نے زکوٰۃ کا مستحق جن آٹھ قسم کے لوگوں کو قرار دیا ہے ان میں ایک گروہ عاملین کا بھی ہے۔ واضح رہے کہ عاملین وہ لوگ ہیں جنہیں حاکم اسلام زکوٰۃ کی وصولیابی کے لیے مقرر کرتا ہے۔ ان لوگوں کی اُجرت زکوٰۃ کی رقم سے ادا کی جا سکتی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں دینی مدارس کی طرف سے یا رفاہی تنظیموں کی طرف سے جو لوگ زکوٰۃ کی وصولیابی کرتے ہیں ان کی اُجرت زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرنا جائز نہیں کہ وہ شرعی عاملین کے حکم میں نہیں۔ کیونکہ حاکمِ اسلام کے مقرر کردہ عاملین درحقیقت فقراء کے وکیل ہوتے ہیں۔ جب زکوٰۃ ان کے سپرد کی جاتی ہے۔ اسی وقت ادا ہو جاتی ہے اور صاحب نصاب اس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ نیز یہ عاملین بحیثیت وکلاء فقراء، نگرانِ اعلیٰ، یعنی حاکمِ اسلام کی مقررہ اُجرت اس رقم سے لے سکتے ہیں۔ لیکن دینی مدارس یا تنظیموں کے مقررہ عاملین کی حیثیت وکلاء فقراء کی

نہیں۔ لہٰذا انہیں جو زکوٰۃ دی جاتی ہے وہ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک کہ وہ مستحقین کو نہ پہنچا دیں۔ اور نہ وہ اس سے اپنی اُجرت لینے کے مجاز ہیں۔ اس وضاحت سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ موجودہ تنظیموں یا عوامی قائم کردہ بیت المال میں جو زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے وہ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک کہ مستحقین کو نہ پہنچے۔ لہٰذا زکوٰۃ ادا کرنے سے پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ یہ ادارے زکوٰۃ کی رقوم جمع تو نہیں کرتے رہتے۔ جیسا کہ بعض اداروں کے پاس زکوٰۃ کے لاکھوں روپے جمع ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضابطوں کے مطابق ماہانہ صورت میں مستحقین کو دیتے ہیں۔ یا بعض ادارے زکوٰۃ کی رقوم سے تجارت کرتے اور اس کے منافع سے غرباء کی امداد کرتے ہیں۔ یہ اور اس جیسی دیگر صورتیں چاہے کتنی ہی مفید اور پرکشش ہوں لیکن ناجائز ہیں۔

یاد رکھیے، زکوٰۃ نماز و روزہ کی طرح ایک دینی فریضہ ہے جس طرح دیگر فرائض و عبادات کی ادائیگی کے شرعی احکام موجود ہیں اور ان کی پابندی لازمی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے بھی شرعی احکام موجود ہیں۔ جن کی پابندی لازمی ہے۔ صرف ایک مسئلہ ہے زکوٰۃ کے احکام کی باریکی اور نزاکت کا اندازہ کر لیجیے کہ اگر کسی غریب کو زکوٰۃ کے پیسے سے کھانا کھلایا گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوئی۔ اور اگر کھانا دے دیا گیا تو ادا ہو گئی۔ لہٰذا یہ تصور بڑا ہی غلط ہے کہ زکوٰۃ کی مد میں ہم تو پیسہ دے چکے اور بری الذمہ ہو گئے۔ ایسا ہرگز نہیں زکوٰۃ دینے والے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ جسے زکوٰۃ دے رہا ہے اس کے متعلق تحقیق کرے کہ وہ واقعی شریعت کے مطابق وکالت کا اہل ہے یا نہیں۔ چندے کے طور پر آنکھ بند کر کے یا معاشی و معاشرتی تعلقات کی بناء پر زکوٰۃ دے دینا ہرگز جائز نہیں۔ ہم پھر اسی بات کا اعادہ کرتے ہیں جو ابھی عرض کر چکے ہیں کہ سب سے آسان و معتبر ذریعہ علماء کی وکالت ہے۔ کہ انہیں زکوٰۃ دے کر وکیل مختار بنا دیا جائے۔ وہ شریعت کے مسائل سے بھی واقف ہوتے ہیں اور خشیت الٰہی بھی ان کا خاصہ ہے۔ لہٰذا وہی آپ کی زکوٰۃ صحیح مصرف میں خرچ کر سکتے ہیں کہ اگر خود مستحق ہیں تو خود استعمال کریں گے اور اگر خود مستحق نہیں تو شرعی مستحقین تک بروقت پہنچائیں گے۔ کوئی خلاف شرع طریقہ اختیار کرنے کا ان سے خطرہ نہیں۔

اگر اللہ نے صاحب نصاب بنایا ہے تو زکوٰۃ کے مسائل جاننا بھی علم دین کا حصہ ہے۔ جسے سیکھنا نبی مکرم علیہ السلام نے ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے فرض قرار دیا ہے۔ لہٰذا ''بہار شریعت'' حاصل کیجئے اور بآسانی تمام ضروری دینی مسائل جان لیجئے۔ یہاں ہم نے ضرورت وقت کے مطابق ایک اہم مسئلہ بیان کر دیا۔ اللہ توفیق دے کہ قارئین اس پر عمل کریں۔

تتمہ مضمون صدقہ

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (بقرہ: ۲۷۴)

جو لوگ اپنے مال رات دن پوشیدہ اور ظاہر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس اور ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

سورہ بقرہ کی گزشتہ نو آیات میں صدقہ کے فضائل، احکام وغیرہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمانے کے بعد اس عنوان

کی اس آخری آیت میں صدقہ دینے والوں کو اجر وثواب کا مژدہ سنایا جارہا ہے۔ کہ جولوگ اپنے اموال، بصورت زکوٰۃ، صدقہ وغیرہ کم وزیادہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں رات کو دن میں چھپا کر ظاہر کر کے ہر طریقے اور انداز و مقدار میں خرچ کرتے ہیں کہ کسی طرح اللہ کی رضا حاصل ہو جائے۔ ان کے لیے خوشخبری ہے، وہ مطمئن رہیں۔ ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس محفوظ ہے۔ جو دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں اس طرح کہ ان کو مال تلف ہو جانے کا خطرہ نہیں رہتا کہ جس مال کی زکوٰۃ دی جاتی رہتی ہے اللہ اس کا محافظ ہو جاتا ہے اور جو لوگ صدقہ کرتے رہتے ہیں وہ آفات و بلیات اور دیگر نقصانات سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ کہ نبی مکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق صدقہ بلاؤں کو رد کرتا ہے، یعنی صدقہ دینے والے کا صرف مال ہی محفوظ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بھی ہر طرح محفوظ و مامون رہتا ہے۔ اس کی زندگی پُر سکون اور پُر کیف ہو جاتی ہے اور آخرت میں اس طرح کہ صدقہ دینے والا اپنے انجام سے بے نیاز ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں جس اللہ کی رضا کے لیے اپنی محبوب دولت خرچ کرتا رہا اس اللہ سے اسے پوری پوری امید ہوتی ہے کہ وہ اسے بخش دے گا۔ اس کا انجام بخیر ہوگا۔ وہ جھومتا، خوش ہوتا جنت میں داخل ہوگا۔

اس ارشاد کے اولین مصداق وہی لوگ ہیں جو قرآن کریم کے اولین مخاطبین ہیں یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جنہوں نے ہر طرح صدقہ کر کے رب کی رضا حاصل کی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دن میں اصحاب صفہ کے لیے نقد دینار کی صورت میں ایک بڑی رقم پیش کی۔ حضرت علی نے رات میں اصحابِ صفہ کے لیے وسق (تقریباً چھ من) کھجوریں دیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار دینار صدقہ کیے۔ دس ہزار رات میں، دس ہزار دن میں اتنے ہی چھپا کر اور اتنے ہی ظاہر کر کے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ صرف چار درہم تھے آپ نے چاروں صدقہ کر دیئے۔ ایک رات میں ایک دن میں ایک چھپا کر ایک اعلانیہ۔ غرضیکہ آیتِ مبارکہ کا اصل مصداق یہی لوگ قرار پائے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت خصوصی طور پر انہی حضرات کے لئے مژدہ بن کر نازل ہوئی۔ اب قیامت تک جو مؤمن بھی ان کے نقش قدم پر چل کر اسی خلوص کے ساتھ صدقہ کرتا رہے گا۔ قرآن دنیا ہی میں اس کو قبولیتِ صدقہ کا مژدہ دیتا رہے گا۔

پس مؤمن کو چاہیے کہ وہ صدقہ دینے میں کم زیادہ کی پروانہ کرے۔ اخلاص سے ایک پیسہ دینے والے کے لیے بھی یہ مژدہ ہے اور ریاء دکھاوے کے لئے ہزاروں دینے والا بھی اس سے محروم ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ غرباء اس خیال سے صدقہ نہیں دیتے کہ ہمارے چند پیسوں کی کیا حیثیت یا ہم تو خود صدقہ کے مستحق ہیں۔ تو صدقہ کیسے کریں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ صدقہ کا مقصد تو اللہ کی رضا کا حصول ہے جو دولت مند اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کر کے حاصل کرتا ہے۔ اور غریب کو اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کر کے حاصل کرنا چاہیے۔ نیز یہ خیال کہ صدقہ لے کر صدقہ کیسے کریں، غلط ہے کہ جو پیسہ اسے ملا ہے اور وہ اس کا مالک ہے جس طرح وہ اسے اپنی دیگر ضروریات پر خرچ کرتا ہے اسی طرح اس ضرورت پر بھی خرچ کرے کہ اللہ کی رضا حاصل کرنے سے بڑی ضرورت اور کون سی ہو سکتی ہے۔

نیز مؤمن کو چاہیے کہ وہ صدقہ و خیرات کے عمل کو حسب توفیق ہمیشہ جاری رکھے۔ زکوٰۃ تو سال میں ایک مرتبہ متعین

مقدار میں دی جاتی ہے لیکن نفلی صدقہ کی نہ تو مدت مقرر ہے اور نہ مقدار۔ یہ عمل ہمیشہ جاری رکھا جا سکتا ہے کہ جو نیکی جاری رہتی ہے وہی افضل واعلیٰ ہے۔ میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں۔

خَيْرُ الْاُمُوْرِ مَا دَا وَ مَ عَلَيْهِ صَاحِبُهَا وَ اِنْ قَلَّ

بہترین عمل وہی ہے جو دائمی ہو اگر چہ تھوڑا ہو۔

نیز فرمایا:

اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهَا وَ اِنْ قَلَّ

اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل وہی ہے جو دائمی ہو اگر چہ تھوڑا ہو۔ (بخاری ومسلم)

''اے اللہ ہمیں دولت بھی عطا فرما اور اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق بھی'' آمین۔

سود خور کا بھیانک حال

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ:۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے چھو کر شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا بیع تو سود ہی کی طرح ہے اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود، تو جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی تو وہ باز آ گیا، تو اس کا ہو چکا جو اس نے پہلے لیا ہو اور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے، اور جو اس نے دوبارہ سود لیا تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ربو سود سے متعلق ضروری گفتگو ہم اگلے صفحات پر کریں گے۔ یہاں آیت بالا کا مضمون بیان کرتا ہے۔ ہر مسلمان یہ مانتا اور جانتا ہے کہ سود سے حاصل شدہ دولت، شراب، خنزیر اور دیگر حرام اشیاء ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص اس کی حرمت کا انکار کرے وہ کافر، مرتد اور جو اس کو حرام جانتے ہوئے بھی کھائے وہ دنیا و آخرت میں اللہ کے عذاب اور ذلت و خواری کا مستحق قرار پاتا ہے۔ آیت مذکورہ میں قیامت کے دن سود خور کی رسوائی بیان کرنا مقصود ہے جس کے لئے اس کی وہ بھیانک حالت بیان کی جارہی ہے جو حشر کے دن قبر سے نکلتے وقت ہوگی کہ اس دن قبر سے نکلتے ہی ہر ایک پر اس کے اعمال کا اثر ظاہر ہوگا۔ انبیاء و مرسلین کے نورانی چہروں پر اپنی اپنی امت کی بخشش اور اپنی ذمہ داریوں کے جواب دہی کے اثرات ہوں گے۔ اولیاء و صالحین کے چہروں پر طمانیت و سکون کے آثار ہوں گے۔ گناہگار مؤمنین پر گھبراہٹ لیکن شفاعت مصطفیٰ کی امیدواری کے آثار ہوں گے، جبکہ کفار کو اوندھے منہ اٹھایا جائے گا جو ان کی ذلت و خواری کا عام اعلان ہوگا۔

سودخوری وہ بدترین گناہ اور لعنت ہے جو ایمان کے باوجود حشر میں مؤمن کی رسوائی کا سبب بنے گی کہ جب سودخور قبر سے اٹھے گا تو بدحواس ہوگا، مخبوطُ الحواس ہوگا، بولنا کچھ چاہے گا اور زبان سے کچھ نکلے گا۔ جھومتا، بیدم سا چلتا ہوگا۔ جیسے اسے کسی خبیث بھوت جن نے دیوانہ کردیا ہو۔ کیونکہ وہ دنیا میں دولت کے ایسے دیوانے تھے کہ شیطان کی طرح اسے حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ دولت کی ہوس نے ان کے دلوں سے رحم، محبت اور سب کچھ چھین لیا تھا۔ ضرورت مندوں کو یہ لالچ دے کر بطور قرض اپنی دولت دیتے اور پھر اس پر اتنا سود وصول کرتے تھے کہ مقروض کے لیے اصل رقم کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی۔ حتیٰ کہ دولت کے پجاری یہ شیطان نما انسان لوگوں کی تجارت، جائداد، رہنے کے مکان تک پر قابض ہو جاتے تھے اور پھر بھی اصل رقم کا مطالبہ باقی رہتا تھا۔

کیسے ظالم ہیں وہ لوگ جو اپنی دولت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس طرح کہ دوسروں کا خون چوستے ہیں، ان کی زندگی اجیرن کردیتے ہیں، پھر خوش ہوتے ہیں۔ اور اپنے اس ظالمانہ کاروبار کو بیع، تجارت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیع و ربوٰ میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح تجارت سے منافع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح ربوٰ بھی منافع بخش کاروبار ہی تو ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ "اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے، اور ربوٰ کو حرام" پس جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کو حاکم حقیقی مانتا اور اپنی زندگی کے ہر عمل پر اس سے اجر و ثواب کی توقع کرتا ہے۔ اسے بلا چون و چرا رب کے اس حکم پر عمل کرنا ہوگا جس نے اس حکم کو تسلیم کر لیا۔ رب رحیم اسے دشواری میں مبتلا نہیں فرماتا کہ جو سود وہ اب تک لیتا رہا ہے اس کو واپس کرنے کا حکم دیا جائے۔ بلکہ وہ اپنے فضل و کرم سے اسے "سلف" قرار دیتا ہے کہ جو تم لے چکے وہ لے چکے، وہ تمہارا ہے، اب نہ لینا اگر دوبارہ لیا اور حرمت میں شک کے ساتھ تو ہم تمہارا ایمان بھی مسترد کردیں گے۔ تمہارا انجام کافروں کے ساتھ ہوگا کہ تم بھی ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں پڑے رہو گے۔

یہ ہے بھیانک رسوائی سودخوروں کی۔ میرے آقا ﷺ نے شب معراج میں اس سے بھی زیادہ بھیانک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ہمیں بتایا۔ آپ نے فرمایا:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَیْتُ لَیْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ عَلٰی قَوْمٍ بُطُوْنُهُمْ كَالْبُیُوْتِ فِیْهَا الْحَیَّاتُ تُرٰی مِنْ خَارِجِ بُطُوْنِهِمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰٓؤُلَآءِ یَا جِبْرَئِیْلُ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ اٰكَلَةُ الرِّبٰوا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، معراج کی رات میرا ایسے لوگوں پر سے گزر ہوا جن کے پیٹ گھروں جیسے تھے، جن میں سانپ تھے جو پیٹوں میں سے نظر آتے تھے۔ میں نے کہا اے جبریل، یہ کون لوگ ہیں، کہا، کہ یہ سود کھانے والے ہیں۔ (ابن ماجہ)

سودخور دنیا میں اپنے سود کی دولت پر مست ہوتا ہے۔ وہ آسیب زدہ دیوانوں کی طرح شب و روز سودی دولت جمع کرنے میں لگا رہتا ہے، نہ اسے کسی پر رحم آتا ہے نہ وہ کسی کے حقوق پہچانتا ہے۔ عام طور پر سود کھانے والوں کے پیٹ بڑے ہوتے ہیں۔

پس قیامت میں ان کی رسوائی ان کے دنیا کے حال کو بڑی صورت میں ظاہر کر کے کی جائے گی کہ وہ اپنی قبروں سے آسیب زدہ دیوانوں کی طرح برآمد ہوں گے۔ ان کے پیٹ مزید بڑھ کر پورے پورے گھروں کی طرح ہو چکے ہوں گے جس کے سبب ان کا چلنا دشوار ہوگا۔

اللہ محفوظ رکھے دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی سے۔ بالخصوص قیامت کی رسوائی سے کہ دنیا کی رسوائی تو محدود رہتی ہے کسی کے عیب کا پردہ اگر دنیا میں چاک ہو جائے تو اس کا پتہ اس کے گھر والوں محلے کے لوگوں یا اس کے شہر والوں ہی کو ہوتا ہے۔ لیکن قیامت کی رسوائی کا حلقہ محدود نہیں۔ وہاں جس کا عیب ظاہر ہوگا اللہ کی ساری مخلوق اس کا تماشہ دیکھے گی اور جو کچھ دنیا میں چھپایا تھا سب پر ظاہر ہو جائے گا۔ سود کی دولت سے، دنیا میں جھوٹی عزت بنانے والا قرآن و حدیث کی خبر کے متعلق کیسا ذلیل و رسوا ہوگا۔ کاش وہ اس خبر پر یقین کرے اور تائب ہو کر اللہ رحیم و کریم کی پناہ میں آ جائے۔ قیامت کی رسوائی، عذاب سے پہلے ایک بڑا عذاب ہے۔ اسی لئے خود اللہ اس سے محفوظ رہنے کی دعا تعلیم فرماتا ہے:

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۱۹۴

(آل عمران: ۱۹۴)

اے ہمارے رب ہمیں دے جس کا تو نے اپنے رسولوں (کی زبان) پر وعدہ فرمایا اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر نا بیشک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

ربٰو وصدقہ کا فرق

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝۲۷۶

(البقرہ: ۲۷۶)

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ نہیں پسند کرتا کسی ناشکرے گناہ گار کو

سود سے دولت کمانے والے یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی حرام کی یہ دولت اسی طرح بڑھتی رہے گی حتیٰ کہ اب ان کی نسل میں کوئی غریب نہیں ہو سکے گا۔ جب کہ ایسے ہی لوگ اگر بمشکل کچھ صدقہ و خیرات کرتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہمارا اتنا پیسہ کم ہو گیا۔ اسی کو ہم سود کے ذریعہ کئی گنا بڑھا سکتے تھے۔ یہ دونوں ہی خیال شیطانی ہیں، غلط ہیں۔ یہ جاننے والا سوائے اللہ کے کوئی نہیں کہ کون سی دولت حقیقت میں مٹ رہی ختم ہو رہی ہے اور کون سی بڑھ رہی ہے۔ کہ وہی دولت کو تباہ کر دینے پر اور وہی دولت کو بڑھا دینے پر قادر ہے۔ پس اس نے اعلان فرما دیا، "کہ سود کی دولت کے چاہے کتنے ہی ڈھیر لگالو۔ لیکن یہ دولت مٹ جائے گی اور صدقہ ایک پیسہ بھی خرچ کرو تو وہ کئی گنا بڑھ جائے گا۔ سودی دولت اس لیے مٹا دی جاتی ہے کہ سود کھانے والا یا تو حکم الٰہی کے برعکس ربٰو اور بیع کو ایک ہی جیسا قرار دیتا اور سود کی حرمت کو تسلیم نہیں کرتا۔ ایسا شخص کافر و مرتد ہے۔ اور یا وہ ربٰو کو حرام یقین کرتے ہوئے بھی حرام خوری میں مبتلا رہتا ہے، یہ شخص گناہ گار ہے۔ اور اللہ نہ کافر کو پسند فرماتا ہے اور نہ ہی گناہ گار کو۔ پس جسے اللہ پسند نہ فرمائے اس کا کوئی عمل اس کے لیے دنیا میں اور آخرت میں مفید ثابت نہیں

ہوسکتا ہے۔ سود خور یا تو کافر ہوگا اور یا گناہ گار۔ اس کی دولت کیسے دنیا یا آخرت میں اس کے کام آسکتی ہے جبکہ صدقہ دینے والا اپنے عمل سے اپنے کامل مؤمن ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا ہے اور مؤمن کا ہر عمل اس کو دنیا میں بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ تو اس کا صدقہ دنیا میں اس کے مال میں برکت کا اور آخرت میں اس کی نجات کا ضرور ذریعہ بنے گا۔ اور یہی حقیقت میں اس کے مال کا بڑھتے رہنا ہے۔

ہر شخص کے پیش نظر دولت کے حصول کا مقصد اپنے کردار کے مطابق ہوتا ہے۔ ایک مؤمن کامل، حلال ذرائع سے خوب دولت کمانا چاہتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی پرسکون زندگی بسر کرے اس کی اولاد خوشحال ہو۔ اپنے خاندان اور معاشرے سے غربت کے خاتمہ میں وہ آسانی حصہ لے سکے۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے قابل ہو۔ بر و تقویٰ میں وہ معاون بن سکے۔ اس کے پیش نظر ان تمام مقاصد کی بنیاد اللہ کو راضی کرنا اور اس کے رسول سے محبت کا ثبوت فراہم کرنا ہوتا ہے۔ تو یہ شخص اپنے ان مقاصد کو پالیتا ہے جس کا بدلہ اللہ کی طرف سے اس کو دنیا میں اس طرح ملتا ہے کہ اس کی کمائی میں برکت ہوتی ہے۔ تھوڑی دولت میں اس کے بہت سے کام بن جاتے ہیں۔ لوگ دل سے اس کی عزت کرتے اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ نہ جانے کتنے غریب اس کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں، جس کا خود بھی اس کو پتہ نہیں ہوتا۔ اور آخرت میں یہی صدقہ کرنے والے مطمئن ہوں گے۔ ان کی یہ دولت کئی گنا زیادہ دولت خرچ کرنے کے مساوی اجر و ثواب کی صورت میں ان کے وہاں کام آئے گی۔ پس انہوں نے جس مقصد سے دولت کمائی، وہ دنیا میں بھی پورا ہوا اور آخرت میں اور حقیقت میں یہی تو دولت کا بڑھنا ہے۔

ایک بد عمل، بدکردار مسلمان جب دولت کماتا ہے تو اس کے نزدیک صرف اپنی زندگی کو آسودہ بنانا ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں اپنے آپ کو بڑا دولت مند کہلانا چاہتا ہے۔ عزت والا بننا چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی اولاد کے لئے بھی دولت کے ڈھیر صرف اس مقصد سے جمع کرتا ہے کہ مرنے کے بعد لوگ یہی کہیں کہ فلاں شخص نے اپنی اولاد کے لیے خوب چھوڑا ہے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے وہ دن رات تگ و دو کرتا ہے۔ حلال و حرام کا اسے خیال تک نہیں آتا۔ رشوت لیتا ہے، لوگوں پر ظلم کر کے ان کی دولت ہڑپ جاتا ہے۔ یتیموں، بیواؤں کا مال تک ہضم کر بیٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ سودی کاروبار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ شخص بظاہر تو دولت کے ڈھیر جمع کر لیتا ہے لیکن جو مقاصد اس کے پیش نظر تھے وہ اسے حاصل نہیں ہو پاتے۔ نہ تو اس کی اپنی زندگی آسودہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کو رات دن سکون نہیں ہوتا۔ حکومت کی طرف سے مختلف ٹیکسوں کے مطالبہ، عوام کی طرف سے طرح طرح کی مقدمہ بازی کے ڈر میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ عداوتوں اور دشمنیوں کی بناء پر ہر وقت انہیں اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ شاندار مکانات اور تمام ضروری و غیر ضروری ساز و سامان کے باوجود یہ بدنصیب رات کو آرام کی نیند نہیں حاصل کر پاتے کہ یہ اپنی دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ لیکن نیند و سکون نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا ہے اور نہ کسی مارکیٹ میں مل سکتا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو صرف اور صرف اللہ کے خزانوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے والوں کو نصیب ہوتی، اور نہ لوگ ان کا احترام کرتے اور عزت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، بلکہ ہر شخص انہیں ظالم و

بدکردار ہی سمجھتا ہے اور ان کی ظاہری چاپلوسی وخوشامد کے باوجود ان سے نفرت کرتا اور اس کی موت کی آرزو کرتا رہتا ہے۔ حتی کہ ایسے لوگوں کی اولاد کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ باپ جلدی مر جائے تاکہ اس کی دولت ہاتھ لگے اور ہم عیش کریں۔ غرضیکہ سود در سود سے لاکھوں کو کروڑوں میں بنانے والے بظاہر دولت کے ڈھیر پر بیٹھے ہوتے ہیں لیکن یہ دولت ان کے لئے ایسے کانٹوں کی طرح ہوتی ہے جو انہیں کسی کل چین نہیں لینے دیتی۔

سودخوروں کے ٹولوں کو ظاہر حال دیکھنے والے لوگ بڑا ہی خوشحال سمجھتے ہیں اور اسی لئے وہ سود کو تجارت میں کامیابی کا ایک لازمی جز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر ذرا عقل و دیانت سے کام لیا جائے اور ان لوگوں کی حالت پر بھی نظر ڈال لی جائے جن کا سودخوروں نے خون تک چوس لیا ہے، وہ نہ صرف اپنے کاروبار، تجارت سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ سود کی ادائیگی کے بارنے ان کو صحت تک سے محروم کر دیا ہے۔ وہ اور ان کے اہل خانہ نان شبینہ تک کو ترستے ہیں۔ تو سود کی لعنت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے اور پھر ہر شخص اس کی حرمت کی حکمتوں کو تسلیم کر سکتا ہے۔

بہرحال سودی دولت بڑھتی نہیں ہے کہ جس دولت سے اس کے فوائد حاصل نہ ہوں اس کو بڑھنے والی دولت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اکثر سودخوروں کو دیکھا گیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کا مال ان کی زندگی ہی میں تباہ ہو جاتا اور وہ پیسے پیسے کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ اور اگر زندگی کے چند روز وہ اس دولت کے سہارے گزار بھی لیتے ہیں تو ان کے وارثوں کے ہاتھوں یہ دولت برباد ہوتی ہے کہ حرام سے کمائی ہوئی اور آسانی سے ہاتھ آئی ہوئی دولت کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ اسی لئے بزرگوں کا قول ہے کہ ''سودخور پر چالیس سال نہیں گزرنے پاتے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی دولت میں گھاٹا آ ہی جاتا ہے، پس سود کھانے والوں کے موٹے جسم اور ان کی چند روزہ خوشحال زندگی سے انہیں صحت مند اور تندرست نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان کی مثال تو اس شخص جیسی ہے جس کے جسم پر ورم آ گیا ہو اور وہ موٹا نظر آتا ہو۔ ورم سے جسم کی زیادتی کو صحت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وہ مرض ہے کہ اگر علاج سے ختم ہو جائے تو جسم پھر دبلا پتلا ہی نظر آئے گا اور اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو یہ چند ہی روز میں قبر تک پہنچا کر رہے گا۔ سود بھی ورم ہی کی طرح انسان کے ظاہری حال کو تبدیل کر دیتا ہے۔ جس کا انجام دنیا میں بھی عبرت ناک ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔ پس اعلان باری تعالیٰ حق ہے کہ ''اللہ سود کو مٹا دیتا اور صدقات کو بڑھا دیتا ہے''، دوسری جگہ فرمایا گیا:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ (الروم: ۳۹)

اور جو مال تم سود حاصل کرنے کے لیے (قرض) دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھتا رہے تو اللہ کے نزدیک نہ بڑھے گا اور جو زکوٰۃ (وخیرات) دو، اللہ کی خوشنودی کے لیے تو وہی لوگ اپنا مال بڑھانے والے ہیں۔

مؤمنین کاملین کا انجام

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ

رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞ (البقرہ: ۲۷۷)

بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے اور نماز قائم رکھی اور زکوۃ دیتے رہے، ان کے لئے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مؤمن کامل وہی ہے جو صالح ہو جس کی ظاہری علامت نماز کی پابندی اور زکوۃ ادا کرنا ہے۔ ایسے شخص کے لیے مژدہ ہے کہ اس کی ہر نیکی کا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے اور وہ ہر قسم کے خوف اور غم سے آزاد ہوگا۔

صالحیت ایمان کا مقتضی ہے، یعنی ایمان مؤمن کو صالح بنانا چاہتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ بار بار عمل صالح کا تذکرہ ہے۔ جس کی تفسیر صاحب قرآن ﷺ نے اپنے عمل اور تعلیم سے کی۔ صالحیت ہی حیات طیبہ کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ اسی پر تقویٰ کے تمام مراتب کا دارومدار ہے۔ اسی سے ولایت کی تمام منزلیں طے ہوتی ہیں۔ یہی انسان کا وہ شرف ہے، جس کے باعث وہ اشرف المخلوقات ہونے کا بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ صالحیت سے زندگی پُرسکون ہوتی ہے، یہی معاشرے میں عزت کا ذریعہ ہے۔ اسی سے معاشی آسودگی اور خوشحالی حاصل ہوتی ہے۔ صالحیت ہی انسان کو ہر دلعزیز بناتی ہے۔ اسی سے قیادت و سیادت کا استحقاق ہوتا ہے۔ اسی سے معاشرے میں امن و امان قائم ہوتا ہے۔ اسی سے افراد باہمی الفت ومحبت کے بندھن میں بندھ کر ایک مضبوط قوم بنتے ہیں۔

ہر قوم صالحیت پسندی کا دعویٰ کرتی ہے اور ہر مذہب اس کا پرچار کرتا ہے۔ لیکن اس جوہر نایاب کو حاصل کرنے کے کامیاب طریقے نہ کسی دنیاوی قانون میں پائے جاتے ہیں، نہ کسی مذہبی قانون میں۔ جب کہ اسلام کے تمام احکام اسی کی تربیت دیتے ہیں۔ ان کی پابندی کرنے والا خود بخود پیکر صالحیت بن جاتا ہے۔ عرب کے بدوؤں اور غلامی کی زندگی بسر کرنے والوں کے حالات کا مطالعہ کیجئے۔ اسلام کے دامن سے وابستہ ہوتے ہی کیسی صالحین کی قوم بن گئے، جو خون کے پیاسے تھے وہ دوسروں کے لیے خون بہانے لگے، جو عزت و آبرو کے لٹیرے تھے، وہ دوسروں کی عزت و ناموس کے محافظ بن گئے۔ جو کسی کو امن و امان کی زندگی بسر نہ کرنے دیتے تھے، انہوں نے دنیا کو امن و امان کے طریقے سکھائے۔ جو غربت و جہالت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے انہوں نے دنیا سے غربت کا خاتمہ کیا اور شمع علم کو روشن کیا۔ جو اپنے چند جانوروں کو بھی قابو نہ کر پاتے تھے انہوں نے انسانوں کے دلوں پر حکومت کی۔ جو تہذیب وتمدن کے نام سے بھی آشنا نہ تھے انہوں نے دنیا کو تہذیب وتمدن کے اصول سکھائے۔ غور کیجئے بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینے والی جاہل قوم کو اسلام نے کیسا صالح بنا دیا کہ متقی بھی بن گئے، ولی بھی بن گئے۔ انسانیت کے کمال کے لیے جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں، سب انہیں نصیب ہو گئے۔

صالحیت کا جو اہتمام اسلام کرتا ہے اس کی نظیر کسی مذہب یا دنیا کے کسی قانون سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے تو روزہ ہمدردی ومساوات کے جذبات اُجاگر کرتا ہے۔ زکوۃ وصدقہ دل سے مال و دولت کی محبت کو نکالتا اور معاشرے سے غربت کا خاتمہ کرتا ہے۔ حج، مذہبی اُخوت اتحاد اور یکجہتی کا درس دیتا اور مرکز سے وابستگی کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن نے شمع علم روشن کی تو صاحب قرآن نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں اس کا نور پھیلانے کی تاکید فرمائی۔ تاکہ اس دنیا کا کوئی

فرد جاہل نہ رہے۔ معلّمِ صالحیت ﷺ نے جو اصول زندگی عطا فرمائے وہ سب کے سب حقیقت میں انسان کو زیورِ صالحیت سے آراستہ ومزین کرتے ہیں۔ والدین، اولاد، اقرباء، احباب، شوہر، بیوی، بھائی، بہن، پڑوسی، حُکام، ملازمین کے حقوق اور دیگر انسانوں حتیٰ کہ جانوروں تک کے حقوق کا تعین اور ان کی ادائیگی کا حکم صالحیت ہی کی افزائش کے لئے تو ہے۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت وشفقت، یتیموں کی دیکھ بھال، بیواؤں کے ساتھ ہمدردی، لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا، غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہونا، اہل منصب لوگوں کے مراتب کا لحاظ کرنا، ضرورت مندوں کی صدقہ وخیرات یا قرض سے امداد کرنا، ان جیسے تمام اعمال سے صالحیت کی نشوونما ہوتی ہے، جن پر عمل کا اسلام حکم دیتا اور انہیں صالحیت کا لازمی جز قرار دیتا ہے۔ نیز اسلام ایسے تمام اعمال واقوال سے روکتا ہے جو صالحیت کے لیے مضر اور مہلک ہیں۔ مثلاً ترش کلامی، غصہ، حسد، کینہ، ظلم، بددیانتی، دھوکہ دہی، جھوٹ، بازاروں میں چلتے پھرتے کھانا پینا، عام گزرگاہوں پر پیشاب وغیرہ کرنا، کسی پر ظلم کرنا، گالیاں دینا، غیبت کرنا، چغلی کرنا، گروہ بندی کرنا، لسانی، صوبائی یا کسی قسم کے تعصب میں مبتلا ہونا، حکام سے بغاوت کرنا، محلّوں اور شہروں میں بدامنی پیدا کرنا، افواہیں پھیلانا، نامحرم مردوں اور عورتوں کا باہمی اختلاط، زنا، بدکاری، جوا، شراب، رشوت، سود، اوران جیسی تمام برائیوں اور بداخلاقی سے سختی کے ساتھ روکا گیا کہ اس سے صالحیت تباہ وبرباد ہوجاتی ہے۔ جب کہ کوئی مؤمن صالحیت کے بغیر مؤمن کامل نہیں ہوسکتا۔

غرضیکہ کمالِ ایمان کا ذریعہ صالحیت ہے جس کا ثبوت نماز اور زکوٰۃ سے فراہم ہوتا ہے۔ حج عمر میں ایک مرتبہ کیا جاتا ہے جس میں بہت سے معاشی فوائد بھی ہیں اور ایک نئی دنیا کے سفر یا طرح طرح کے لوگوں کو دیکھنے کی کشش بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کو دلیل صالحیت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کسی کا صرف حاجی کہلانا، اس کے صالح ہونے کا ثبوت نہیں۔ روزہ بلاشبہ عظیم عبادت ہے، لیکن سال میں ایک مرتبہ اس کا وقت آتا ہے۔ نیز یہ نہایت ہی ذاتی نوعیت کا عمل ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ کہ کس کا روزہ ہے اور کس کا نہیں۔ لہٰذا یہ بھی ثبوت صالحیت نہیں بن سکتا۔ ہاں نماز ایک ایسا عمل ہے جس کے لئے نمازی کو پانچ وقت روزانہ متعدد قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ اس کی پابندی مؤمن کے دل ودماغ کو متاثر کرتی ہے۔ نیز دوسرے لوگ بھی اس عمل کے گواہ بن جاتے ہیں۔ پس یہ صالحیت کی ایک بڑی علامت ہے۔ زکوٰۃ، صدقہ وخیرات غرباء کی امداد کا ایک اہم ذریعہ ہونے کے علاوہ مؤمن کے دل میں دولت کی محبت نہ ہونے کا ثبوت ہے۔ نیز ایسے سخی کو معاشرے کے اکثر افراد جانتے ہیں، اس کا احترام کرتے اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ پس یہ عمل بھی صالحیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

پس جو مؤمن صالح بن گیا اور نماز کی پابندی، زکوٰۃ وخیرات کی عادت سے اس نے اپنی صالحیت کا ثبوت بھی فراہم کردیا وہ بلاشبہ مؤمن کامل ہے اور اسی کے لیے مژدۂ الٰہی ہے۔ ''ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔ اللہ کا یہ کرم، ہر مؤمن پر اس کی صالحیت کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ جتنی صالحیت بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی یہ کرم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جسے صالحیت کا اعلیٰ منصب مقام ولایت نصیب ہوجاتا ہے، اس پر یہ کرم بالائے کرم بن کر برستا ہے۔ کہ ان کی زندگی میں خوف وحُزن کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ دنیا کے وہ مصائب وآلام جو بڑے بڑے سورماؤں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں، اولیاء اللہ پر

سے خس وخاشاک کی طرح گزر جاتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی ان مصائب کے سبب ان کے کسی معمول میں فرق نہیں آ پاتا۔ نیز میدان حشر میں بھی وہ ہر طرح مطمئن و پُرسکون ہوں گے۔ نہ حساب وکتاب کا خوف ہوگا نہ میزان اور پُل صراط کا غم۔ ایسے خوش نصیبوں کے دامن سے جو مؤمن بھی دنیا میں وابستہ ہوجاتا، ان کی عقیدت ومحبت کا رشتہ جوڑ لیتا ہے اس کا بھی مقدر چمک جاتا ہے۔ وہ بھی دنیا وآخرت کے خوف وغم سے آزاد ہوجاتا ہے۔ میرے غوث فرماتے ہیں:

مُرِيْدِیْ لَا تَخَفْ اَللّٰهُ رَبِّیْ عَطَانِیْ رِفعَةً نِلْتُ الْمَنَالِ

میرے مرید خوف نہ کر اللہ میرا رب ہے مجھے اس نے وہ بلندی عطا فرمائی ہے کہ میں مقاصد کو حاصل کر لیتا ہوں

پس جو ایسے بلند مرتبہ کے دامن سے وابستہ ہوجائے اسے کیا خوف، اسی لیے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پورے یقین کے ساتھ عرض کرتے ہیں، اور یہی عقیدہ ہمارا ہے۔

رضا کا خاتمہ بالخیر ہو گا
تری رحمت اگر شامل ہے یا غوث

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ١١

البقرہ: ٢٧٨ تا ٢٨١

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ
اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ
وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۤ
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾ (البقرہ: ٢٧٨ تا ٢٨١)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرواور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا سود میں سے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

پھر اگر تم ایسا نہ کرو تو اعلان سن لو جنگ کا، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں اور نہ تم ظلم کرو اور نہ ظلم کیے جاؤ۔

اور اگر وہ (قرض دار) تنگ دست ہے تو مہلت دو (اس کی) آسانی تک اور تم (قرض معاف کر کے) صدقہ کردو، تو تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔

اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور پھر بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو (اس کا) جو اس نے کمایا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو کہ جس چیز کو اس نے تمہارے لئے حرام کر دیا اس کا خیال تک نہ کرو۔ چاہے وہ کتنی ہی قیمتی ہو۔ لہٰذا ربوٰ کی حرمت کے بعد ان رقوم سے تمہارا کوئی تعلق نہ رہا جو قرض داروں کے ذمہ ہیں۔ اب تم صرف اپنا اصل مال واپس لے سکتے ہو۔ سود کی دولت تمہارے لئے حرام ہو چکی اسے چھوڑ دو۔ اگر تم واقعی مؤمن ہو گئے تو ہمارے اس حکم پر جس میں بظاہر تمہارا کچھ نقصان ہے، عمل کر کے اپنے ایمان کا ثبوت دو۔ اگر تم نے اس حکم کو بسر و چشم تسلیم نہ کیا تو تیار ہو جاؤ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے۔ یہ جنگ اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ لشکر اسلام تمہارا مقابلہ کرے گا، تمہیں قتل کرے گا جب کہ تم ربوٰ کی حرمت کا انکار کر کے مرتد ہو گئے۔ اور اگر تم نے اس کی حرمت کو تو تسلیم کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا، برابر سودی کاروبار کرتے رہے تو یہ جنگ اس طرح ہو گی کہ سود سے کمائی ہوئی تمہاری ساری دولت تباہ و برباد کر دی جائے گی۔ اور آخرت میں تمہارا انجام نہایت عبرتناک ہو گا۔

اور جب تم اللہ کے حکم پر عمل کر کے سود کے واجبات چھوڑ رہے ہو تو اس کا بھی خیال کرو کہ قرض دار سے اصل رقم کا مطالبہ سختی سے یا یک دم نہ کرو، بلکہ اس سے معاملہ طے کر لو اور اس کی آسانی کے مطابق وصولیابی کا معاہدہ کرو، کہ اللہ کسی پر زیادتی اور سختی کو ہرگز پسند نہیں فرماتا۔ چاہے وہ تمہارا اخوانی یا اسلامی بھائی ہو یا کوئی غیر مسلم، اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ اگر تم میں استطاعت ہو تو تم قرضہ بالکل ہی معاف کر دو۔ یہ تو تمہارے لئے بہت ہی سودمند سودا ہو گا کہ تمہیں صدقہ کرنے کا ثواب اور برکتیں نصیب ہوں گی۔

اے ایمان والو! ہر حال میں اس حقیقت کو یاد رکھو کہ تمہیں ایک دن ضرور اللہ وحدہ لاشریک کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ جو تمہارا مالک اور احکم الحاکمین ہے۔ اس دن ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ پس جس نے لوگوں کو معاملات میں آسانیاں فراہم کیں، قیامت میں ان کے لئے بہت سی آسانیاں ہوں گی۔ اور جس نے اس دنیا میں ظلم و ستم کیا لوگوں سے سود وصول کر کے ان کا خون چوسا، یا دولت جیسی ناپائیدار چیز کے لئے لوگوں کو ستایا تو قیامت میں ایسے لوگوں کے لئے بہت مشکلات ہوں گی۔ اللہ انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔

سود کا چھوڑنا، اس کے بعد اصل رقوم کی واپسی کے معاملات بے حد الجھنوں کا باعث بن سکتے تھے کہ مالی معاملات ہی الجھنوں، باہمی اختلافات کا سبب ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان امور کو نبٹانے کے لئے نہایت حکیمانہ انداز سے تعلیم دی گئی، جس پر عمل کے بعد اپنوں یا غیروں سے کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

سود کے واجبات

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا سود میں سے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

حرمت ربوٰ کا حکم نازل ہونے سے پہلے چونکہ اکثر لوگ سودی لین دین میں ملوث تھے۔ لہٰذا اب یہ سوال عام ہوا کہ

سود کے جو واجبات مسلمانوں یا کافروں کے ذمہ ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ یعنی اس سودی کاروبار سے کیسے نجات حاصل ہو کہ یہ تو ایک ایسا جال ہے جس میں پھنسنے کے بعد اس سے نکلنا ممکن ہی نہیں۔ جب تک کہ اس کو کاٹ نہ دیا جائے۔ پس اللہ رب العزت نے اس جال کو کاٹ دینے ہی کا حکم دیا کہ لینا دینا دونوں بند کر دو۔ اے مؤمنو! جو رقمیں تمہیں کافروں سے لینا ہیں وہ چھوڑ دو۔ اور جو کافروں کو دینا ہے وہ مت دو۔ اگر تمہارا دعویٰ ایمان سچا ہے تو بظاہر اپنا مالی نقصان برداشت کرو اور کافروں کی سودی رقوم روک کر انہیں یہ بتانے کی ہمت کرو کہ ہم تمہارے نفع کے لیے حرام کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

واضح رہے کہ صرف سودی رقوم لینے دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اصل رقوم کی نہیں۔ اس صورت میں کافروں کو اصل رقم دے کر صرف سودی رقم نہ دینا نہ تو بد دیانتی ہے اور نہ ہی غصب، بلکہ صرف ایک غلط کاروبار کو روک دینا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں بیان فرمایا گیا کہ ''سودی کاروبار سے تائب ہو جانے کے بعد صرف رأس المال اصل رقم کا حق باقی رہتا ہے۔ اس پر سودی زیادہ رقم وصول کر کے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ اصل رقم میں کمی کر کے تم پر کوئی ظلم کر سکے گا۔

اس حکم کے نزول کے بعد مسلمانوں نے اپنی تمام سودی رقم جو کافروں کے ذمہ تھی چھوڑ دینے کا اعلان کر دیا اور اپنی اصل رقوم کا مطالبہ باقی رکھا۔ یہی معاملہ کافروں کے ساتھ کیا گیا کہ ان کو واجب الادا سودی مطالبات دینے سے انکار کر دیا۔ اور اصل رقوم کی ادائیگی شروع کر دی۔ بعض کفار اس فیصلے پر راضی نہ تھے اور وہ اپنے سودی منافع کا بھی مطالبہ کر رہے تھے جس کے خاتمہ کے لیے نبی مکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر وضاحت کی کہ یہ حکم صرف مسلمانوں ہی کے لئے نازل نہیں ہوا۔ یہ پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ہے اس کے سوا سود کی لعنت کے خاتمہ کا کوئی طریقہ نہیں۔ لہٰذا ہم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی سودی رقم کی معافی کا پہلے اعلان کرتے ہیں، جو بہت بڑی رقم ہے۔ اور اکثر کفار مکہ کے ذمہ واجب الادا ہے۔ اس اعلان کے بعد بقیہ کافر بھی اپنے مطالبات سے دستبردار ہو گئے اور سود کے کاروبار کے جس جال میں ایک مدت سے لوگ پھنسے ہوئے تھے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کاٹ دیا گیا اور لوگوں نے اس سے آزاد ہو کر سکون کا سانس لیا۔

یہ حکم آج تک باقی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ آج کے لوگ ماضی کے لوگوں کی نسبت اس جال میں زیادہ بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ دولت کی حرص و ہوس میں مبتلا لوگوں نے یہ جال افراد و اقوام پر ایسا ڈالا ہے کہ لوگ اور حکومتیں اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھنے لگے ہیں اور خیال کیا جانے لگا ہے کہ یہ ہماری معیشت کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بغیر معاشی زندگی کی بقا ممکن نہیں۔ اس کے بغیر تجارت کا تصور نہیں۔ اس کے بغیر دنیا سے رابطہ قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ سب لایعنی تصورات ہیں۔ غیر مسلم دولت مند اقوام کے پیدا کردہ اوہام ہیں جن کے ذریعہ وہ چھوٹی قوموں اور حکومتوں بالخصوص مسلمانوں کو خوب خوب لوٹ رہے ہیں۔ ۱۹۹۱ء کی جنگ کے بعد امریکہ نے جس عیاری سے سعودی عرب، عراق اور کویت کو سود کے بار تلے دبایا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ حرمت سود کے اعلان کے بعد کتنی ہی صدیوں تک مسلمان اس کاروبار سے محفوظ رہے۔ کیا اس دور میں انہوں نے تجارت نہ کی، کیا اس دور میں ان کے پاس دولت نہ تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس امت پر بلا سودی کاروبار کا زمانہ معاشی طور پر زیادہ خوشحالی اور سکون کا زمانہ رہا ہے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ اپنا تھا، اور آج بہت کچھ ہے اور اپنا کچھ نہیں۔ ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس گاڑیاں، بلڈنگیں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ بنکوں کا ہے اور وہ اپنی اس جھوٹی

امارت پر بڑے مغرور اور خوش ہیں۔ یہی حال آج اکثر مسلم ممالک کا ہے کہ وہ قرضوں کی دولت پر زندہ ہیں۔ عربوں روپیہ صرف سود کی رقم کا ادا کرتے ہیں۔ اصل قرضے کی ادائیگی کی نہ نوبت آتی ہے نہ آسکتی ہے۔ مزید براں یہ ہے کہ وہ جن ممالک سے بھیک مانگتے ہیں ان کے ایسے غلام بن جاتے ہیں کہ اپنی قوم اور ملک کے اندرونی معاملات میں بھی آزاد نہیں رہ پاتے۔ ان کے اقتدار کی بقا اور موہوم آزادی کی بقا ان کے سود خور آقاؤں کی مرہون منت ہے۔

حیرت

ہم حیرت کرتے ہیں کہ جب سودی نظام کو معاشی خوشحالی کے لیے اپنایا گیا تو وہ خوشحالی کہاں ہے۔ کسے نصیب ہوئی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ زندگی دن بدن اجیرن ہوتی چلی جاتی ہے۔ غریب ملکوں ہی میں نہیں، امیر ممالک میں بھی بے روزگاری میں ہر روز اضافہ ہوتا ہے۔ بھوکے نوجوانوں کے پاس زندگی بسر کرنے کے لئے چوری ڈکیتی کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں۔ دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ غربت، جہالت، بیماریوں کا شکار ہے۔ لیکن سودی نظام میں ان مسائل کا کوئی حل نہیں۔ سودی کاروبار کے سب سے بڑے مہاجن خود ان مسائل کا شکار ہیں۔ یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ امریکہ و یورپ کے ممالک سودی نظام ہی کی وجہ سے خوشحال اور متمول ہیں۔ وہ دنیا بھر کے غریب ممالک کی مدد کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ ٹولہ ہے جو دنیا بھر کے انسانوں کا خون چوستا ہے امداد کے نام پر دولت دے کر یہ سود کی بھاری رقمیں وصول کرتے ہیں اور مقروض ممالک کو ہر طرح اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ ان سودی رقوم پر ہی ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ اپنا کاروبار جاری رکھنے اور اس کاروبار کی منڈی کو وسعت دینے کی غرض سے ہر ملک کے معاملات میں مداخلت کرتے ہیں اور پھر اس کو اپنا مقروض کر کے خوب خون چوستے ہیں جس کا مفاد ان کے عوام تک نہیں پہنچتا۔ عوام تو بیچارے خود اپنی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ ٹیکسوں کی صورت میں حکومت کو ادا کرتے ہیں۔ ان کے شرفاء نہایت محتاط انداز پر گزر بسر کرتے ہیں اور اکثریت لوٹ مار کا سہارا لیتی ہے۔ پس ایک مخصوص خون چوسنے والے ٹولے کی خوشحالی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لینا کہ ان کا نظام خوشحالی کا ضامن ہے، بڑی بے انصافی ہے۔ ان لوگوں اور قوموں پر نظر ڈالئے جو اپنا خون دے کر جاں بلب ہو چکے ہیں۔ اور پھر انصاف کیجئے کہ خوشحالی کسے نصیب ہوئی ہے۔ انسانی ہمدردی یہ نہیں کہ دوسروں کو بدحال کر کے ایک مخصوص گروہ خوشحال ہو جائے۔ انسانی ہمدردی تو وہ ہے جس کا تصور اسلام نے پیش کیا کہ ایک روٹی والا آدھی خود کھائے اور آدھی دوسرے کو کھلائے۔

پس اسلام ایسے نظام کو نہ صرف مسترد کرتا ہے بلکہ حرام اور ظلم قرار دیتا ہے۔ جس سے امیر مزید امیر ہوں اور غریب مزید غریب ہو۔ اور دنیا کی اکثریت چند مچھیروں کے جال میں پھنس کر رہ جائے۔ اسلام نے اپنے اصول تجارت قائم کیے۔ ان ہی اصولوں کی پابندی کے ساتھ باہمی تجارت یا غیر مسلموں سے تجارت کی اجازت دی اور امت سے غربت و جہالت کے خاتمہ کے لئے دولت مندوں کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا اور صدقات کی تلقین کی۔ تاکہ کوئی اسلامی ملک اپنے مسائل کے حل کے لئے کسی غیر مسلم دولت مند ملک کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلائے۔ اور ایسی حالت میں مبتلا نہ ہونے پائے جس سے مجبور ہو کر اسے مچھیرے کا شکار بننا پڑے۔ آج مسلمانوں کے پاس جو وسائل موجود ہیں، اگر وہ انہیں قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق استعمال کریں تو ان کی معاشی حالت سود خوروں سے کہیں زیادہ بہتر اور مستحکم ہو سکتی ہے، جبکہ وہ دورِ جس

میں سود کی حرمت کا حکم نازل ہوا، امتِ مسلمہ کی انتہائی غربت کا دور تھا۔ اس وقت نہ سونے کی کانیں تھیں، نہ تیل کے کنوئیں۔ اس کے باوجود دن بدن امت کی حالت سدھرتی چلی گئی اور وہ دور بھی آیا کہ زکوٰۃ کا مال بیت المال میں بھرا پڑا تھا، مستحقین کو تلاش کیا جاتا تھا لیکن کوئی نظر نہ آتا تھا۔ سود کی لعنت ختم ہوئی تو برکت ہی برکت ہوئی۔ نظام زکوٰۃ نافذ ہوا تو رحمت برسنے لگی۔ اسی غریب قوم میں ایسے ایسے امیر پیدا ہوئے جن کی سخاوت کے واقعات آج بھی بخیلوں کو سخی بنا دیتے ہیں۔ روٹی کپڑے کو ترسنے والے لوگ ایسے آسودہ حال ہوئے کہ تلاش کرنے پر بھی کوئی ننگا، بھوکا، نظر نہ آتا تھا۔ یہ آسودگی، یہ خوشحالی سودی نظام نے نہ دی بلکہ اس کے خاتمہ سے نصیب ہوئی، کہ برکت سود سے نہیں، زکوٰۃ و خیرات سے آتی ہے۔ دوبارہ غور فرمایئے اللہ کے اس اعلان پر:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

اعلانِ جنگ

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ (البقرہ:۲۷۹)

پھر اگر تم ایسا نہ کرو تو اعلان سن لو جنگ کا، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں اور نہ تم ظلم کرو اور نہ ظلم کیے جاؤ۔

گزشتہ صفحات پر آپ نے حشر میں سود خوروں کی رسوائی کا بھیانک حال پڑھا۔ اب ملاحظہ فرمایئے دنیا میں ایسے لوگوں کا حال کہ اے مؤمنو! اگر تم نے سود کی حرمت کے بعد بھی اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کی اور اس کاروبار کو نہ چھوڑا تو پھر ہم سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، اللہ اور اس کے رسول سے جنگ ہو گی۔

اللہ اکبر، سود خوروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ امتِ مسلمہ کے صرف ایک طبقہ کے خلاف اعلان جنگ ہوا ہے۔ بے نمازیوں، روزہ نہ رکھنے والوں، زکوٰۃ نہ دینے والوں، حج نہ کرنے والوں، دیگر برائیوں اور بدکاریوں میں مبتلا مسلمانوں کے خلاف یہ اعلان نہیں ہوا۔ صرف سود خوروں کے خلاف ہو رہا ہے کیونکہ صرف یہی طبقہ ایسا ظالم ہے جو اپنی دولت کے ذریعہ ضرورت مندوں کو اپنا غلام بناتا ہے۔ ان کی امداد و تعاون کا فریب دے کر ان کا خون چوستا اور ان کی عزت و ناموس پر ڈاکہ مارتا اور پوری زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ اس ظالم کے پاس وہ کشش ہے کہ لوگ اس سے بھاگتے نہیں۔ بلکہ اس کے سکوں کی چمک انہیں ایسا اندھا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے انجام سے بے خبر ان کے فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کبھی اس کے جال سے نہیں نکل پاتے۔ پس یہ لوگ دیگر بدعملوں سے بہت زیادہ خطرناک ہیں۔ پورے معاشرے کو تہس نہس کر دینے والے ظالم ہیں۔ یہ دوسروں کے منہ کا نوالہ تک چھین لیتے ہیں۔ اور انہیں فاقوں کی زندگی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے معاشرہ صرف غربت ہی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ بھوکوں کی کثرت کے باعث معاشرے کا امن و امان تباہ ہو جاتا ہے۔ چوری، ڈکیتی، قتل و غارت جیسے جرائم عام ہو جاتے ہیں۔ قوم کا ایسا بدترین گروہ اسی لائق ہے کہ قدرت ان سے جنگ کرے۔

اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کا مطلب یہ نہیں کہ ان لوگوں سے آمنے سامنے مقابلہ ہوگا یا ہتھیاروں کی جنگ لڑی جائے گی۔ نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ان پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں بلکہ یہ جنگ ایسے خطرناک انداز میں ہو گی کہ اس سے مفر ممکن نہیں۔ کوئی پناہ گاہ نہ مل سکے گی، بلکہ یہ سود خور کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ یہ سودی دولت کے ڈھیر جمع کرنا چاہیں گے لیکن کسی نہ کسی آفت سے ان کی دولت گھٹتی اور مٹتی رہے گی۔ یہ دولت سے عزت حاصل کرنا چاہیں گے لیکن دن بدن لوگوں کی نظروں میں گرتے جائیں گے۔ یہ دولت کے ذریعہ سکون چاہیں گے لیکن وہ انہیں کبھی میسر نہ آسکے گا۔ رات کو آرام کی نیند بھی نہ سوسکیں گے۔ سودی نظام کو اپنانے والے قوم وملک کی معاشی حالت سدھارنے کا دعوی کرتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ملک نظر نہیں آتا، جس کو معاشی آسودگی حاصل ہوئی ہو۔ جہاں غربت نہ ہو، مہنگائی اور بے روزگاری نہ ہو۔ وہ اپنی حالت کو جتنا سنبھالنا چاہتے ہیں اتنا ہی بگاڑ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہی ہے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ۔ انسان کے پاس وہ قوت وطاقت کہاں جس سے وہ اللہ ورسول کا مقابلہ کر سکے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ جو قوم اللہ سے جنگ میں مبتلا ہو جائے اس کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہتا۔ کوئی اسے تباہی و بربادی اور ذلت وخواری سے نہیں بچا سکتا۔ اسی لئے میرے آقا ﷺ نے سودی کاروبار کرنے والوں اور اس میں ملوث تمام افراد پر لعنت فرمائی۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اٰكِلَ الرِّبٰوا وَ مُوْكِلَهٗ وَ كَاتِبَهٗ وَ شَاهِدَيْهِ وَ قَالَ هُمْ سَوَآءٌ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس کا گواہ بننے والے پر لعنت کی اور فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں۔ (مسلم)

سود لینا، دینا برابر ہے:-

سود کے متعلق قرآن وحدیث میں جتنی وعیدیں آئی ہیں وہ صرف سود لینے والوں ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ سود دینے والوں کے لئے بھی ہیں۔ کیونکہ سود لینے والا اگرچہ نہایت ہی ظالم ہے۔ لوگوں کا خون چوستا، انہیں تباہ وبرباد کر دیتا ہے لیکن سود دینے والے بھی کم مجرم نہیں۔ کہ یہ اسلامی نظام زندگی سے کھلی بغاوت کرتے ہیں۔ اپنی محنت کی کمائی پر قناعت اور صبر وشکر کے ساتھ گزارہ کرنے کی بجائے یہ بھی دولت کی ہوس میں یا اپنی جھوٹی شان وشوکت کے اظہار کے لئے سود پر رقم لیتے ہیں۔ بڑی بڑی دوکانیں کھولتے، فیکٹریاں لگاتے ہیں تاکہ بڑے تاجر بنیں۔ بڑے بڑے مکان بناتے ہیں، شاندار قیمتی گاڑیاں چلاتے ہیں، تاکہ لوگ ان کو دولت مند سمجھیں اور جن ممالک میں حکومت کی طرف سے ٹیکسوں کی وصولیابی پر سختی ہے، وہاں اکثر لوگ ٹیکس سے بچنے کے لئے مقروض ہوتے ہیں اور سود ادا کرتے ہیں۔

ہم ایسے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ جو اپنے شہروں میں بڑے دولت مند، باعزت مشہور ہیں۔ لیکن وہ ہر ماہ ہزاروں کی رقم بینکوں کو ادا کرتے ہیں۔ اسلام اس جھوٹی شان وشوکت اور بناوٹی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ سادہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ قناعت کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق عزت وشہرت کا ذریعہ، دولت اور وہ بھی سودی دولت ہرگز نہیں بلکہ انسان کا اخلاق اس کا اعلیٰ کردار اور حلال طیب پر گزر بسر اسے اللہ اور اس کے رسول کی نظروں میں محبوب و

پسندیدہ بناتے ہیں۔ اور حقیقی عزت اسی کو ملتی ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول راضی ہو جائے۔ کوئی ہے جو ایک سیاہ رنگ حبشی غلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی عزت و شہرت کا مقابلہ کرے۔ یا کئی کئی دن فاقہ کرنے والے حضرت ابو ہریرہ کی عزت و شہرت کا مقابلہ کرے۔ ان حضرات کے بعد بھی آج تک نہ جانے کتنے دولت مند پیدا ہوئے۔ سب کے نام مٹ گئے۔ وہی ہستیاں تاریخ کے صفحات پر چمک رہی ہیں۔ لوگوں کی عقیدت و محبت کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ انہی کا ذکر زبانوں پر ہے جنہوں نے پیکرِ خلق بن کر تقویٰ و پرہیز گاری کی زندگی بسر کی۔

سود لینے والے، دینے والے اور اس کاروبار کے معاونین سب ہی ایک جیسے ہیں۔ سب دولت کی ہوس میں مبتلا ہیں۔ سب کو جھوٹی عزت و شہرت پسند ہے۔ سب کو نام و نمود کا ہیضہ ہے۔ لہٰذا سب ہی پر اللہ کے رسول ﷺ لعنت فرماتے ہیں۔ سب کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مقابلہ اور جنگ کا چیلنج ہے۔ سب حشر کے دن مخبوطُ الحواس ہوں گے۔ سب کے پیٹ گھروں کی طرح بڑے بڑے ہوں گے جن میں سودی دولت کیڑوں کی طرح بھری ہوگی۔ اللہ محفوظ رکھے۔

جس طرح جسم میں بعض جراثیم پیدا ہو کر مختلف امراض کا سبب بنتے ہیں، جو پورے جسم کو اضطراب و بے چینی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سود کے جراثیم جتنے پھیلتے چلے جاتے ہیں، اتنا ہی زندگی میں اضطراب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے عطا کردہ نظامِ زندگی کی اہمیت پر یقین رکھتا ہے۔ لیکن شومیٔ قسمت کہ ہمیں یہی یقین حاصل نہیں اسی لئے اس دور کا ہر شخص اگرچہ پریشان ہے وہ اس پریشانی کا شکوہ بھی کرتا ہے لیکن اسے دور نہیں کر پاتا۔ کیونکہ اصل علاج پر تو اس کا یقین ہی نہیں۔ وہ زہر پر زہر کھاتا چلا جاتا ہے۔ سود پر سود لیتا اور دیتا چلا جاتا ہے۔ لیکن تریاق تلاش نہیں کرتا اور اس زہر کا ایسا عادی ہو چکا ہے کہ اس سے روکنے والوں اور منع کرنے والوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔

سود کے یہ جراثیم جس طرح آج ہمارے نظامِ زندگی میں پھیلے ہیں، اس پر نہ مجھے کوئی حیرت ہے اور نہ ہی دیگر اہل علم کو، کہ پوری ملت کے جال میں پھنسنے اور تڑپنے کا جو منظر آج ہمارے سامنے ہے، میرے آقا مخبرِ صادق ﷺ پہلے ہی اس کی خبر دے چکے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيَاْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَّا يَبْقٰى اَحَدٌ اِلَّا اٰكِلَ الرِّبٰوا فَاِنْ لَّمْ يَاْكُلْهُ اَصَابَهٗ مِنْ بُخَارِهٖ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لوگوں پر ایسا زمانہ ضرور آئے گا جب کہ سود کھانے سے کوئی نہ بچے گا۔ اگر نہیں کھائے گا تو اس کے بخارات ضرور پہنچ جائیں گے۔

(ابن ماجہ)

کیسا سچا ارشاد ہے میرے آقا ﷺ کا۔ اور آپ کا ہر ارشاد سچ ہی ہوتا ہے۔ آج جس انداز پر سود کا جال پھیلا ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی اس سے بچا ہوا ہو۔ یہی تو راز ہے ہمارے اضطراب اور بے چینی کا۔ اللہ ہی رحم فرمائے۔

بے مثال تعلیم

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝
(البقرہ: ۲۸۰، ۲۸۱)

اگر وہ (قرض دار) تنگ دست ہے تو اسے مہلت دو۔ (اس کی) آسانی تک اور تم (قرض معاف کر کے) صدقہ کردو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم جانتے ہو۔

اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور پھر بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو (اس کا) جو اس نے کمایا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اسلام کے احکام اور تعلیمات میں جو ہمدردی اور محبت بھری ہوئی، انسانوں کی فلاح و بہبود کا جو لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان احکام پر عمل کرنے والوں کے لئے جو آسانیاں مہیا کی گئی ہیں، اس کی مثال نہ دیگر مذاہب میں ملتی ہے اور نہ ہی دنیاوی قوانین میں۔ ذرا غور فرمایئے کس شدت کے ساتھ سود کی حرمت کا اعلان کیا گیا اور اس پر عمل کرانے کے لئے کیسی شدید وعید اور برے انجام کو بیان کیا گیا۔ لیکن معاً ان لوگوں کے لئے آسانی فراہم کی گئی جو اپنی معاشی تنگی کی بنا پر سود دینے پر مجبور تھے اور اس نظام کے خاتمہ کے بعد ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ قرض کی ادائیگی کا پیش آتا تھا۔ لہٰذا وہ لوگ جو اب تک سود کھاتے رہے اور اب حکم الٰہی کے مطابق انہوں نے اس کاروبار سے توبہ کرلی اور اس طرح انہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے، اس لائق ہیں کہ ان سے مزید ایثار کا مطالبہ کیا جائے اور وہ یہ کہ جب تم نے ظلم کا کاروبار بند ہی کر دیا تو اب دیگر معاملات میں بھی ظلم سے بچو۔ اس طرح کہ اپنے قرض داروں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ رأس المال اصل رقم تو تمہارا حق ہے۔ یہ ضرور ملے گا۔ کیوں نہیں اس کی وصولیابی کا ایسا طریقہ اختیار کر لیتے جس سے اللہ اور اس کا رسول راضی ہو اور اسلام سے تمہاری وابستگی اور اسلام کی خوبی اجاگر ہو اور وہ یہ ہے کہ ذرا دیکھ لو کہ اگر تمہارا قرض دار مسلمان بھائی ہو یا کافر، واقعی تنگدست ہے، اس قابل نہیں کہ یک مشت تمہارا سارا قرضہ ادا کر سکے تو تم ذرا اس کے ساتھ ہمدردی کر دو کہ ادائیگی قرض کی مدت بڑھا دو۔ یک مشت لینے کی بجائے تھوڑا تھوڑا لے لو اور اگر تم نیکی کا مزید قدم آگے بڑھاؤ تو پھر تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہوگا، بہت ہی اچھا سودا ہے گا کہ قرضدار کی پوری پوری مدد کر دو۔ قرضہ معاف کر دو۔ اس پر صدقہ کر دو۔ یہ ایک بہترین صدقہ ہوگا کہ تم نے ایک انسان کو فکر و پریشانی سے آزاد کر دیا۔ بہر حال جو بھی کرو اس کا تمہیں اختیار ہے۔ اپنی استطاعت کے مطابق اور صالحیت کے حصول کے جذبہ سے کرو اور اس حقیقت کو نہ بھولو کہ یہ دنیا اور اس کی ہر چیز چندروزہ ہے بالآخر وہ دن آکر رہے گا جس میں اللہ وحدہ لاشریک کے دربار میں حاضری ہوگی اور پھر ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، نہ کسی کی حق تلفی ہوگی نہ کسی پر ظلم ہوگا۔

سود پر مزید گفتگو

بدنصیبی سے ہمارا دور وہی ہے جس کی پیشین گوئی مخبر صادق ﷺ چودہ سو برس پہلے فرما چکے ہیں کہ ''ایسا زمانہ آئے گا جس میں کوئی شخص سود کی لعنت سے نہ بچ سکے گا، جو بلا واسطہ اس کاروبار میں ملوث نہ بھی ہوگا اس تک کسی نہ کسی طرح اس کے اثرات ضرور پہنچیں گے''۔ آج کا ہر شخص شعوری یا لاشعوری طور پر اس ارشاد کے مطابق سود میں ملوث ہے۔ اور گناہ کے

اس دلدل میں پھنسنے والوں کو یہ دلدل ہی اپنی معیشت کا خزانہ معلوم ہونے لگی ہے۔ وہ اس ممنوعہ نظام معیشت کو معاش کا جزولا ینفک تجارت کی بنیاد قرار دے بیٹھے ہیں۔ تقریباً وہی نظریہ قائم کئے ہوئے ہیں جو سود خور کفار کا تھا۔

ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا

یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ بیع تو سود ہی کی طرح ہے۔

انہیں دولت کی ہوس نے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ بیع (تجارت) اور سود میں کوئی فرق ہی نظر نہ آتا تھا، اللہ رب العزت نے واضح فرمادیا کہ بہت بڑا فرق ہے۔ ایک حلال ہے اور ایک حرام، ایک میں برکت ہے ایک ذریعہ عذاب۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ:۲۷۵)

اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود کو

اس حرام کے بغیر نہ تو زندگی بسر کرنا دشوار ہے اور نہ ہی نجات مشکل۔ صرف ایمان شرط ہے اگر قوت ایمان بروئے کار لاتے ہوئے مسلم حکومتیں اور مسلم افراد اس حرام پر ایک مرتبہ لات ماردیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے نجات بھی نصیب ہو جائے گی، خوشحالی بھی ملے گی اور آخرت میں سرخروئی بھی۔

سود کی حرام دولت کی کشش نے عوام کو طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہم اپنے قارئین کی خدمت میں اس عنوان پر چند بنیادی باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ مسئلہ کی وضاحت بھی ہو جائے اور کچھ غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں۔

ربٰو، سود بالکل اسی طرح حرام ہے جس طرح شراب، خنزیر، جوا اور دیگر محرمات۔ پس دیگر محرمات سے بچنا اور سود کا کاروبار کرنا برابر ہی ہے۔ سود خور کسی طرح شرابی، زانی اور بدکار شخص پر برتری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سود خور درج ذیل حدیث پر غور کریں اور سوچیں کہ وہ کس قدر گھناؤنے عمل میں مبتلا ہیں۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حَنْظَلَةَ غَسِيْلِ الْمَلٰٓئِكَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دِرْهَمُ رِبٰوا يَاْكُلُهُ الرَّجُلُ وَ هُوَ يَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَّ ثَلٰثِيْنَ زِنْيَةً

غسیل الملائکہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص جان بوجھ کر سود کا ایک درہم کھائے تو چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بدتر ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلرِّبٰوا سَبْعُوْنَ جُزْءً اَيْسَرُهَا اَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا سود کے ستر اجزاء ہیں، سب سے کم ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے نکاح کرلے۔ (مشکوٰۃ شریف)

عام نگاہیں صرف شرابی، جواری، خنزیر خور، زانی وغیرہ ہی کو ذلیل وخوار اور بدکردار سمجھتی ہیں جبکہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں سود خوران سے بہت ہی بدتر ہیں۔ کہ یہ قوم کا خون چوستے ہیں۔ مزے لے لے کر چوستے ہیں اس کو حرام بھی نہیں سمجھتے۔

ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن سمجھنے لگے ہیں۔

ربٰو ، کی حرمت کا اعلان قرآن کریم نے کیا۔ اور اس کی تشریح دیگر احکام کی طرح حضور علیہ السلام نے فرمائی۔ جس کو ماننا اور جس پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح ہم نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ اور دیگر احکام کی تشریح تسلیم کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ مثلاً نماز کی فرضیت قرآن کریم سے بلاشبہ ثابت ہے، لیکن اس کی رکعات کا تعین اور ادائیگی کا طریقہ نبی مکرم علیہ السلام سے ہی ملا ہے، جس کو ہم مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ پس یہی اصول ربٰو کے لیے اپنانا ہوگا اور سود کے ان تمام طریقوں کو ممنوع تسلیم کرنا ہوگا۔ جو شارع علیہ السلام نے بیان فرمائے۔ اور فقہاء کرام نے امت کی سہولت کے لئے ان کو مزید واضح کر دیا۔ پس کسی طرح یہ کہنا مناسب نہیں کہ سود کی یہ صورت آئمہ اربعہ میں سے کسی کی بیان کردہ ہے۔ کیونکہ ائمہ اربعہ نے جو بھی شرعی احکام بیان فرمائے، ان کی اصل قرآن وحدیث یا عمل صحابہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس تک ہماری رسائی نہ ہو تو یہ ہماری کوتاہ نظری یا کم علمی ہوگی۔ پس یہ خیال کرنا کہ ربٰو کی وہی صورت حرام ہے جو حُرمتِ ربٰو کے وقت رائج تھی۔ یعنی لوگوں کو قرض دینا اور اس پر منافع لینا اور جب قرض دار قرض ادا نہ کر سکے تو منافع کی شرح بڑھا دینا صرف اسی صورت کو سود اور سودی کاروبار کہنا بالکل غلط ہے۔ حرمتِ ربٰو کا حکم نازل ہونے کے بعد نبی مکرم علیہ السلام نے بیع کی بعض صورتوں کو بھی ربٰو قرار دیا۔ جس کی بنیاد پر فقہاء کرام نے ربٰو کے تمام شعبوں کی وضاحت کی۔ ان میں سے ہر قسم ربٰو قرار پائے گی۔ حتیٰ کہ جس صورت میں ربٰو کا شائبہ بھی ہو اس کو ترک کر دینا افضل وبہتر ہے، جیسا کہ

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ اٰخِرَ مَا نَزَلَتْ اٰیَةُ الرِّبٰو وَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُبِضَ وَ لَمْ یُفَسِّرْهَا لَنَا فَدَعُوا الرِّبٰوا وَالرِّیْبَةَ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سود کے متعلق آخری آیت نازل ہوئی، تو (چند دن بعد) حضور علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور آپ نے اس کی تفسیر ہمارے لیے بیان نہ فرمائی۔ لہٰذا سود اور سود کے شبہ والی چیزوں کو چھوڑ دیا کرو۔ (ابن ماجہ)

حرج وتنگی

قرآن کریم کے بیان کردہ اصول کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حرج تنگی میں مبتلا نہیں فرماتا۔ عبادات ہوں یا معاملات زندگی کے کسی شعبہ میں اللہ کے احکام کی پابندی سے حرج، تنگی میں مبتلا ہونا ممکن نہیں۔ فرمایا گیا:

مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (المائدہ:۶)

اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے، لیکن اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک کر دے اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دے تاکہ تم شکر کرو۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ (الحج:۷۸)

اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

احکام اسلام کی پابندی میں ہرگز حرج اور تنگی کا خطرہ نہیں۔ ہاں ان سے بغاوت اور ان کے برعکس عمل میں سوائے حرج کے کچھ نہیں۔ اس اصول قرآن کو پیش نظر رکھئے تو یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ سودی کاروبار کے بغیر ہمارا زندہ رہنا یا معاشی آسودگی حاصل کرنا ممکن نہیں، جبکہ اسی اصول کی بنیاد پر سودی نظام حرج اور تنگی کا یقینی باعث ہے۔ اگر آپ دیانت سے دنیا کی معاشی حالت کا جائزہ لیں تو آپ تسلیم کریں گے کہ سود کی لعنت نے زندگی میں کیا حرج پیدا کیا کہ اس کے جال میں انسان مچھلیوں کی طرح تڑپتے ہی نظر آتے ہیں۔ ہر شخص شب و روز کی تگ و دو کے باوجود پریشان ہے، تنگ ہے، حرج میں مبتلا ہے۔

پس سود وہ نظام ہے جس کو انسان نے اللہ اور اس کے رسول کی ممانعت کے باوجود صرف اس لئے اپنایا کہ وہ راتوں رات بغیر محنت و مشقت کے دولت کے ڈھیر جمع کر لے۔ لیکن وہ انسانوں کا خون چوسنے والا بھیڑیا بن گیا۔ اس نے اپنی آخرت بھی تباہ کر لی اور دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوتا رہا، جبکہ اللہ نے اسے اس زہر سے بچنے کا حکم دے کر اسے تجارت کا وسیع میدان عطا فرمایا۔ جس کی پاکیزہ کمائی میں برکت رکھی جس سے معاشرے میں نہ صرف خوشحالی اور آسودگی کے پھل پھلتے ہیں، بلکہ باہمی محبت و الفت، امن و سکون اور شگفتہ زندگی کے پھول بھی مہکنے لگتے ہیں اور تاجر کو محنت و مشقت سے اپنی روزی کمانے والے کو آخرت میں جو مرتبہ نصیب ہوگا اس کی خبر، مخبر صادق ﷺ اس طرح دیتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، سچا اور امانت دار تاجر نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی)

اے ایمان والو! تم کیوں سودی کاروبار میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے ہو۔ آج اس سوال کا جواب یہی ملتا ہے کہ سودی کاروبار بین الاقوامی تجارت کا ایک جزو ہے۔ اس کے بغیر دنیا سے معاشی و اقتصادی رابطہ ممکن نہیں۔ اس جواب سے کیا ہم یہ سمجھیں کہ جس حرام کے بغیر دنیا سے رابطہ ممکن نہ رہے وہ حلال ہو جاتا ہے۔ یا یہ سمجھیں کہ جس رب نے سود کو حرام کیا، العیاذ باللہ وہ ہماری اس اہم ضرورت کو نہیں جانتا یا یہ کہ ہم زبان سے مؤمن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ایمان کی بقا اور حفاظت کے لیے کوئی ایثار کرنے، کوئی قربانی کرنے کی ہم میں قطعاً ہمت نہیں۔ پہلی دو باتیں سراسر غلط ہیں۔ حرام ہر حال میں حرام ہی رہتا ہے۔ اور اللہ علیم و خبیر خوب جانتا ہے کہ ہماری اہم ضرورت کیا ہے اسی لئے اس نے کسی ایسی چیز کو حرام نہیں کیا جس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہ ہو۔ بس اب تیسری ہی بات رہ جاتی ہے اور وہی صحیح ہے کہ ہم مؤمن ہونے کے بلند و بانگ دعوے تو کرتے ہیں لیکن ایمان کے تقاضوں کی تکمیل ہمارے بس کی نہیں۔ یا ایمان کو ایسا محفوظ خزانہ سمجھتے ہیں جس کو کوئی آفت نقصان نہیں پہنچا سکتی، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ایمان ایسا نازک شیشہ ہے جس میں معمولی ہوا سے بھی دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔ حرام کو حرام جانتے ہوئے۔ زندگی کا حصہ سمجھا تو ایمان کے دنیوی و اُخروی فوائد ختم ہو جاتے ہیں اور اگر حرام کو حرام ہی نہ جانا اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو کوئی اہمیت نہ دی، شریعت کے احکام کو فرسودہ سمجھا، قرآن وسنت کے عطا کردہ زندگی کے اصولوں کو پس پشت ڈال کر خود اپنی زندگی کے لئے اصول وضع کئے تو ایمان کا دعویٰ ہی دعویٰ رہ

جاتا ہے۔حقیقتاً ایمان رخصت ہوجاتا ہے۔پس اب یا تو ایمان کی حفاظت کر لیجئے یا حرام کی دولت کو اوڑھنا بچھونا بنا کر قیامت میں ننگے ہونے کے لئے تیار رہیے۔یہاں اپنی عقل پر اعتماد کیجئے اور حشر کے دن مخبوط الحواس اٹھنے کے لیے تیار رہیے۔

سود کی لعنت سے بچنا

اگر آپ یہ کہیں کہ ہم اللہ کے عذاب سے ڈرتے اور سود کی لعنت سے بچنا چاہتے ہیں، لیکن کیسے بچیں۔بری طرح اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔بہت ہی دشوار مرحلہ ہے تو ہم پوری طرح حالات سے باخبر ہوتے ہوئے عرض کریں گے کہ اول تو ہمارے دَور ہی کے ماہرینِ معاشیات نے اس پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے اور شرعی اصولوں کے مطابق وہ تمام طریقے واضح کردیئے ہیں جو سودی کاروبار کی لعنت سے بچنے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔نہ تجارت میں کوئی کمی واقع ہوگی اور نہ ہی دنیا سے اقتصادی رابطہ منقطع ہوگا۔لیکن نقار خانہ میں طوطی کی سنتا کون ہے۔اللہ گواہ ہے کہ علماء کرام اور فقہاء نے سود اور دیگر محرمات کو ہر دور میں نہایت وضاحت سے بیان کیا۔سود سے نجات کی قابلِ عمل تدابیر بھی پیش کیں اور امت کو اس جال سے نکالنے کی پوری پوری سعی بھی کی۔پھر بھی کوئی نہ مانے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں مؤمن کے لئے تو کسی حرام کو حرام جان لینا ہی کافی ہے۔اس سے نجات کی تدابیر کی ضرورت ہرگز نہیں۔بس حرام کو چھوڑ دینے کے لیے یہی کافی ہے کہ حرام ہونے کا پتہ چل جائے۔دیکھئے ان لوگوں نے شراب کو کس طرح چھوڑا، جن میں شراب کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہ تھا۔صرف یہی تو ہوا تھا کہ مدینہ کی گلی کوچوں میں حرمت شراب کا اعلان کرایا، جس نے اعلان سنا اس کا جام جہاں تھا وہاں سے آگے نہ بڑھ سکا۔اور آناً فاناً وہ محبوب مشروب جس کو بڑی ہی حفاظت اور بڑے اہتمام سے رکھا جاتا تھا گندی نالیوں میں بہنے لگا۔جام چھوڑ دیئے گئے، برتن توڑ دیئے گئے۔کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ یہ کہہ سکے کہ شراب کے بغیر ہم کیسے زندہ رہیں گے۔یا یہ پوچھ سکے کہ جو چیز ہماری گھٹی میں شامل ہے اس کو چھوڑنے کی تدبیر کیا ہے۔حرمت سود کا اعلان ہوا، تب بھی یہی حال ہوا۔کہ جس طریقہ کار پر پوری قوم کی معاشی واقتصادی حالت کا دارومدار تھا اس کو یکسر یک لخت چھوڑنے کے لیے نہ تدابیر پوچھی گئیں نہ مہلت مانگی گئی۔بس جو حرام ہو گیا وہ لمحہ بھر کے لئے بھی حرام ہے۔آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ایسے کہ ایمان مستحکم تھا۔صرف دعوائے ایمان نہ تھا۔بلکہ ہر وقت اس کا ثبوت بھی تھا۔اس کے تقاضوں کی تکمیل بھی تھی۔ہم سود ہی کے معاملہ میں نہیں اور دوسرے معاملات میں بھی ایمان کو کب فوقیت اور ترجیح دیتے ہیں۔نمازوں کی پابندی کے لیے، روزوں کی پابندی کے لیے، اسی طرح دیگر احکام اسلام پر عمل کے لیے کون سا اہتمام کرتے ہیں۔وقت ملا تو نماز پڑھ لی، موسم اچھا ہوا تو روزہ رکھ لیا۔بس ہمارا ایمان اتنا ہی رہ گیا ہے ہماری حالت تو اُس بزدل کی سی ہے جو اپنے جسم پر چیونٹی کی تصویر نہیں گدوا سکتا۔آپ اس سے کیسے یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ شیر کی تصویر گدوا لے گا۔ہم نماز، روزہ جیسی عبادتوں کی پابندی نہیں کر پاتے تو سود کے جال سے اپنے آپ کو کس طرح آزاد کر سکتے ہیں۔اپنی اسی ایمانی کمزوری کا انجام بھگت رہے ہیں۔کہ معاشی اعتبار سے غیروں کے در کے بھکاری ہیں۔سیاسی اعتبار سے بظاہر آزاد ہوتے ہوئے بھی غیروں کے غلام ہیں۔اور جب قوم، معاشی وسیاسی اعتبار سے آزاد نہیں رہتی تو اس کے لیے اپنے دین، مذہب، تہذیب وتمدن کی حفاظت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ایسی قوم کی حالت ایک ایسے لاچار ومجبور شخص جیسی ہو جاتی ہے جس کے گھر میں جو چاہتا ہے آتا ہے اس کی

آنکھوں کے سامنے اس کی دولت، عزت و آبرو، سب کچھ لٹتا رہتا ہے۔ لیکن وہ کسی کو ترچھی نظر سے دیکھنے کی بھی جرأت و ہمت نہیں کر پاتا۔ آج پوری دنیا میں ''خیرُ الامم'' کا یہی حال ہے۔ مؤمن کی عزت و آبرو کے تحفظ کا واحد ذریعہ قوتِ ایمان ہے جس سے آج ہم محروم ہیں۔ لہٰذا ذلیل وخوار ہیں اور اتنے کمزور ہیں کہ حرام کو اپنی زندگی کا جز و سمجھنے پر مجبور ہیں۔

سودی کاروبار سے نجات حکومتی سطح پر ضرور مشکل ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے مسلم حکمرانوں کی سوچ مذہبی انداز پر نہیں۔ وہ دنیا کے دھارے میں بہنا ہی اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اقتدار کی ہوس انہیں اقتدار ہی کے تحفظ کی تدابیر پر آمادہ رکھتی ہے اور اسی لئے وہ ملک کے عوام کو جھوٹی خوشحالی اور آسودگی فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ عوام کا بال بال سودی دھاگے سے جکڑ دیتے ہیں۔ اگر امت اسی انتظار میں رہے کہ ان کے حُکّام سودی کاروبار بند کر دیں تو اس سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ تو یقین جانئے اس انتظار کا دورانیہ اتنا طویل ہو جائے گا کہ حرام کھاتے کھاتے ہی قبر تک پہنچ جائیں گے۔ پس اس حالت میں ہر شخص کو اپنی عاقبت بنانے اور ایمان کی حفاظت کرنے کی خود کوشش کرنا اور اس کے لیے ہمت سے قدم اٹھانا چاہیے۔ اگر انفرادی طور پر آپ سود سے نجات حاصل کرنا چاہیں تو پھر اس کا جال مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور نظر آئے گا۔ صرف جھوٹی شان کے مظاہرے، بے جڑ دولت مندی اور پُر فریب ہوس سے توبہ کر کے اسلامی تعلیمات کے مطابق قناعت اور سادہ زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیجئے۔ اگر ایک شخص کے پاس سودی دولت سے خریدی ہوئی متعدد شاندار گاڑیاں، بڑی بڑی عمارتیں، فیکٹریاں ہیں تو کوئی مشکل نہیں کہ وہ ان سب کو فروخت کر کے سودی قرضے ادا کر دے اور اپنی روزی کمانے کے لئے ایک دوکان پر قناعت کرے۔ اس طرح وہ دن رات کی مصروفیت، بھاگ دوڑ سے بھی بچ سکتا ہے اور اس کی آخرت بھی سدھر سکتی ہے۔ اگر مسلمان انفرادی طور پر ایثار کریں، ان کے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے تو بنکوں کی صورت میں آگ کے انگاروں کا کاروبار کرنے والی بے شمار دوکانوں پر تالے پڑے نظر آنے لگیں گے۔

اس حقیقت کو یاد رکھیئے کہ اسلامی انقلاب حکومت کے اقدام سے بپا نہیں ہوتا یہ عوام ہی کے عمل و کردار کا اثر ہوتا ہے کہ حُکّام اسلامی نظام حیات اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں ایسے ممالک کا تذکرہ موجود ہے کہ حُکّام کی طرف سے اسلامی طرز زندگی کو ختم کرنے کی ہر طرح کوشش کی گئی، لیکن عوام نے ان کی ساری تدبیروں کو بے اثر کر دیا۔ اور ایسے حکام سے عنان حکومت چھین لی گئی جبکہ ہمارے دور میں عوام ہی کی دین سے لاپرواہی کا نتیجہ ہے کہ کسی ملک میں اسلامی نظام کا وجود نہیں۔ جن ممالک میں بعض اسلامی احکام نافذ بھی ہیں وہاں بھی دیانت سے ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ کبھی تو مجرم اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے آزاد ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ اپنی ملک کے حدود سے باہر جا کر عیاشی کرتے ہیں، جرائم کرتے ہیں اور قانون کا ہاتھ ان تک نہیں پہنچ پاتا۔

غرضیکہ سود ایک لعنت ہے جس سے نجات کے بغیر خوشحالی و آسودگی تو درکنار سکون و اطمینان کی زندگی بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم واقعی پریشان حال ہیں تو اس کا واویلا مچانا کبھی اس سے نجات کا ذریعہ نہیں ہو سکتا کہ مریض اس وقت مرض سے نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ علاج نہ کرے۔ ہماری پریشانی کا سبب ہمارا سودی کاروبار میں ملوث ہونا ہے۔ اسی سے چھٹکارا پریشانی سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

اللہ کا یہ اصول ہے کہ انسان جب اس کے ذکر سے غافل ہوتا، اس کے احکام سے بغاوت کرتا ہے، اس کے عطا کردہ اصول زندگی پس پشت ڈال کر خود اپنے وضع کردہ اصول پر زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو اس کی معیشت کو تنگ کر دیا جاتا ہے یعنی اس کے پاس دولت کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ مناصب و مراتب بھی حاصل کر لیتا ہے، بڑا عزت والا ہوتا ہے، اس کو شہرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ جملہ اسباب عیش و عشرت کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن اس کا دل ویران ہوتا ہے۔ سکون واطمینان کی نعمت سے وہ محروم ہوتا ہے۔ دن جھمیلوں میں گزرتا ہے اور رات تفکرات میں۔ اسے حقیقی خوشی کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ اس کی دنیا اس طرح برباد ہوتی ہے اور آخرت میں اس کا انجام نہایت عبرتناک ہوتا ہے۔ کہ جب وہ محشر میں اٹھے گا تو اندھا ہوگا۔ ہر طرف وہ اندھیرا ہی اندھیرا محسوس کرے گا۔ اپنی اس حالت پر حیرت کرتے ہوئے اللہ سے عرض کرے گا کہ دنیا میں تو میری نظر بڑی تیز تھی، آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، میرے اردگرد روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ یارب اب مجھے کیا ہوا کہ ہر طرف تاریکی ہے، اندھیرا ہے۔ جواب دیا جائے گا تو نے دنیا میں جس کو روشنی سمجھا وہ روشنی نہ تھی۔ اگر روشنی ہوتی تو تجھے میرے احکام ضرور نظر آتے اور تو ان پر عمل کرتا۔ لیکن تو نے وہاں میری آیات اور میری دعوت کو بھلا دیا، تو آج ہم نے تجھے بھلا دیا۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِىۡۤ اَعۡمٰى وَقَدۡ كُنۡتُ بَصِيۡرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ اَسۡرَفَ وَلَمۡ يُؤۡمِنۡۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبۡقٰى ﴿۱۲۷﴾ (طٰہٰ: ۱۲۴-۱۲۷)

اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لیے زندگی تنگ کر دی جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا ہے (دنیا میں تو) میں بالکل بینا تھا۔ اللہ فرمائے گا، اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس میری آیتیں، پس تو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے فراموش کر دیا گیا۔ اور جس نے حد سے تجاوز کیا اور ایمان نہ لایا اپنے رب کی آیتوں پر اور (سن لو) آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیرپا ہے۔

احکام اسلام میں سودی کاروبار کی حرمت سب سے زیادہ اہم ہے۔ جس کو ہر مسلمان جانتا بھی ہے اور علماء اس سے بچنے کی ہدایت بھی کرتے ہیں۔ اس سے نجات کی تدابیر بھی بیان کرتے ہیں۔ پھر بھی ظاہری چمک دمک کے دلدادہ لوگ اسے اپنی معیشت کا جز کہتے اور اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ تو وہ قرآن کریم کی ان آیات میں اپنا انجام پڑھ لیں۔ حشر میں تو جو ہوگا اس کا پتہ وہاں چلے گا۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی جو حالت ہے وہ قرآن کریم کی بیان کردہ حالت کی تصدیق کے لئے کافی ہے دین سے غافل کوئی شخص سودی کاروبار میں مبتلا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی زندگی پرسکون ہے یا اسے حقیقی خوشیاں نصیب ہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيۡرِ خَلۡقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَ اَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۱۲

البقرہ: ۲۸۲ تا ۲۸۳

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَ لْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ
كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ ۚ وَ لْیُمْلِلِ الَّذِیْ
عَلَیْهِ الْحَقُّ وَ لْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ
سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا
شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ
الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا
دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ
وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ
فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَ لَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا
شَهِیْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ یُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ

عَلِيْمٌ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ:۲۸۲۔۲۸۳)

اے ایمان والو! جب تم ایک مدت مقررہ تک قرض کا معاملہ کروتو اسے لکھ لواور چاہئے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ لکھ دے، اور وہ شخص لکھوائے جس پر قرض ہے اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور اس سے کچھ کم نہ کرے پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے، بیوقوف یا کمزور ہے یا طاقت نہیں رکھتا لکھوانے والے کی تو لکھوادے اس کا ولی انصاف سے، اور دو گواہ بنالو اپنے مردوں میں سے اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو کہ ان دو میں سے کوئی عورت بھول جائے تو اس ایک کو دوسری یاد لا دے، اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ گواہی کے لئے بلائے جائیں اور اس کے لکھنے میں سستی نہ کرو۔ قرض چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک (لکھ لو) تمہارے لئے اس میں پورا پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک، اور (یہ کام) زیادہ درست رکھنے والا ہے گواہی کو اور زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ تم شک میں نہ پڑو مگر یہ کہ کوئی سودا ہاتھوں ہاتھ ہو، جسے تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو ایسی صورت میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اسے نہ لکھواور گواہ بنالو جب تم خرید و فروخت کرواور تکلیف نہ دی جائے کسی لکھنے والے کو اور نہ کسی گواہ کو، اور اگر تم ایسا کرو گے تو بیشک وہ تمہارا گناہ ہوگا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ لکھنے والا تو رہن ہو قبضہ میں ہوا، پھر اگر تم میں ایک کو دوسرے پر اعتماد ہو، تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہئے کہ وہ اس کی امانت ادا کردے اور چاہئے کہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپاتا ہے تو بیشک اس کا دل گناہ گار ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب جانتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت دوسو بیاسی، قرآن کریم کی طویل ترین آیت ہے جس میں اللہ ربُّ العزت جلّ جلالہ وعمّ نوالہ نے معاملات بیع وشراء میں نہایت محتاط طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا تاکہ کسی قسم کے اختلاف کا امکان نہ رہے، فرمایا گیا۔ اے مؤمنو! جب تم باہمی رضامندی سے ایک مدت معینہ کے لئے قرض پر لین دین کروتو اسے لکھ لو تاکہ کسی قسم کی بھول چوک نہ ہونے پائے۔ جو تمہارے درمیان شکر رنجی کا باعث بنے۔ لکھنے والے کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ کاتب ایسے انداز سے لکھے کہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ جانبین میں سے کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ نیز لکھنے والے کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کہ اللہ نے جب اسے علم کی نعمت سے نوازا ہے تو اسے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور علم کے شکر کا بہترین طریقہ ضرورت مندوں کی علمی خدمت ہے۔ پس جسے لکھنا آتا ہے اسے چاہئے کہ یہ خدمت

بخوشی انجام دے۔ یہ وثیقہ لکھوانے کی ذمہ داری، اس کے ضروری اخراجات کی ادائیگی وہ شخص کرے گا جو قرض لے رہا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے اللہ سے ڈرتا رہے اور اپنی کسی چال سے معاہدے میں کوئی ایسی شق شامل نہ کرے جس کا اسے فائدہ پہنچے اور مال کا مالک اس سے بے خبر ہو یا اس پر راضی نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس معاملہ کا ایک فریق جو قرض لے رہا ہے معذور ہو، بیوقوف یا کسی اعتبار سے کمزور ہو۔ مثلاً یتیم ہو، نابالغ ہو، عورت ہو، بیوہ ہو، تو وثیقہ بنانے کا کام احتیاط و انصاف کے ساتھ ایسے لوگوں کا ولی انجام دے۔ اس معاہدے پر بھی دو گواہ بنانا ضروری ہے کہ بغیر گواہوں کے نہ کسی تحریر کا اعتبار ہوتا ہے اور نہ زبانی گفتگو کا، یہ دونوں گواہ مردوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ اگر کسی وجہ سے دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی۔ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں اس لئے کہ عورت میں بہ نسبت مرد کے نسیان کا مادہ زیادہ ہوتا ہے تو اگر ایک عورت معاہدے کی کوئی شق بھول جائے گی تو دوسری اس کو یاد دلا دے گی۔ گواہوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ گواہی ایک بڑی ذمہ داری اور امانت ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے اور اس امانت کی ادائیگی کا جب وقت آئے تو تمہیں انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اس کو دوسرے کا کام سمجھ کر نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھ کر بخوشی پورا کرو۔ مزید تاکید فرمائی گئی کہ دیکھو معاہدے کو تحریر میں لانے اور وثیقہ بنوانے میں سستی نہ کرنا، چاہے قرض کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ کیونکہ اختلاف کا ذریعہ چاہے معمولی ہو یا غیر معمولی لیکن اختلاف کا اثر ہمیشہ غیر معمولی اور بہت ہی برا ہوتا ہے۔ پس لکھوا لینا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اللہ کے نزدیک یہی انصاف حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ اسی سے گواہوں کی گواہی کا بھی پورا پورا فائدہ حاصل ہوگا۔ اسی سے ہر قسم کے شکوک و شبہات کا امکان ختم ہوسکتا ہے۔ ہاں نقد لین دین میں اس طویل طریقہ کار کی ضرورت نہیں کہ یہ معاملہ توقتی ہے۔ مال لیا اور قیمت ادا کر دی۔ بات ختم ہوئی۔ اس میں باہمی اختلاف کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ اس معاملہ پر بھی گواہ بنا لئے جائیں۔ ممکن ہے کہ مال خریدنے یا فروخت کرنے والے کی طرف سے کسی وقت کوئی فتنہ اٹھا دیا جائے گواہوں کی صورت میں یہ امکان بھی نہ رہے گا۔ لکھنے والوں کی اگرچہ یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بخوشی لکھیں اور گواہوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ بخوشی گواہی دیں۔ لیکن جن لوگوں کی یہ خدمت کر رہے ہیں اُن کے لئے اپنا وقت صرف کر رہے ہیں، اُن کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کاتب اور گواہ کو کسی طرح پریشان نہ کریں، بلکہ ان کو ہر قسم کی سہولت مہیا کریں۔ ایسا نہ کرنا گناہ ہے۔ جب کہ مؤمن کے لیے زیب یہی دیتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اللہ سے ڈرتا رہے اور گناہ سے بچتا رہے۔ احکام الٰہی کا پابند رہے کہ اللہ کی یہی تعلیم ہے اور اللہ تو ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

اس کے بعد آیت نمبر دو سو تراسی میں اس معاملہ کے متعلق ہدایت دی گئی، جو حالت سفر میں کیا جائے اور اس وقت کوئی لکھنے والا یا گواہ موجود نہ ہو۔ ایسی صورت میں مال قرض لینے والے کو اپنی کوئی چیز مال بیچنے والے کے پاس گروی رکھنا ہوگی کہ وہ چیز قرض وصول ہونے کی ضمانت ہوگی۔ اور اس بات کا ثبوت بھی کہ گروی رکھنے والے نے مال قرض لیا تھا۔ ظاہر ہے جو چیز گروی رکھی جائے گی وہ مال کی قیمت کے مساوی یا اس سے زیادہ ہوگی تاکہ قرض لینے والا مقررہ رقم ادا کرنے پر مجبور رہے۔ کیونکہ وہ کسی قسم کا فتنہ پیدا کرے گا تو مال فروخت کرنے والے کو اس چیز پر قبضہ کر لینے کا حق ہوگا۔ لیکن اس کے لئے قرض کی مدت ختم ہونے تک اس چیز سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی فائدہ طبعی ہے تو اس کی قیمت ادا

کرنا ہوگی مثلاً خریدار نے بطور ضمانت ایک بکری گروی رکھی جو دودھ دیتی تھی۔ مال بیچنے والا اس کا دودھ پیتا رہا۔ جب یہ بکری واپس کرنے کا وقت آئے گا تو جو کچھ اس کے کھلانے، پلانے اور خدمت پر اخراجات ہوئے وہ وضع کر کے دودھ کی باقی رقم ادا کرنا ہوگی۔ قرض وصول ہو جانے کے بعد مرتہن کی ذمہ داری ہے کہ اس کے پاس جو چیز بطور امانت بصورت گروی تھی وہ اس کو واپس کر دے۔ کسی قسم کا بہانہ یا حیل وحجت نہ کرے۔

معاملات میں ان اہم ہدایات کے اختتام سے قبل ایک اہم حکم کی مزید وضاحت فرمائی جارہی ہے کہ گواہوں کے لئے کسی حالت میں بھی گواہی کو چھپانا جائز نہیں۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے اپنے دل کو گنہگار بنالیا کہ حق بات کو دل میں چھپایا یہ سخت گناہ ہے۔ اے مؤمنو! تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ تمہارے کام چاہے ظاہر ہوں یا دلوں میں پوشیدہ اللہ تو سب کو خوب جانتا ہے۔ پس جس چیز کو اس نے ظاہر کرنے کا حکم دیا ہے اگر تم نے اس کو بندوں سے چھپا بھی لیا تو اللہ سے تو نہ چھپا سکو گے۔

فتنہ وفساد کا انسداد

اگر اسلام کے احکام کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جملہ احکام کا محور اور مقصود فتنہ وفساد کا انسداد ہے۔ کیونکہ اسلام ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانا چاہتا ہے جس میں بسنے والا ہر فرد بے خوف وخطر مطمئن زندگی گزار سکے۔ جس میں ہر شخص دن کے اجالے میں بلا خوف روزی کمائے اور رات کی تاریکی میں سکون سے سوئے۔ ایسا معاشرہ جس میں باہمی عداوتیں نہ ہوں۔ قتل وغارت اور لوٹ مار نہ ہو۔ مقدمہ بازیاں نہ ہوں۔ مال ومتاع اور عزت وآبرو محفوظ ہو۔ ہر طرح امن وامان ہی ہو۔ صرف محبت والفت کے پھول مہکتے رہیں کہ یہ دنیا اللہ کا لگایا ہوا وہ چمن ہے جس کی ایک ایک پتی اسے پیاری ہے۔ اسے اجاڑنے اور برباد کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔ فرمایا گیا:

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ (الاعراف:۸۵)

اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، اس کی اصلاح کے بعد

اس آیہ مبارکہ کے ذیل میں ضیاء الامت علامہ پیر محمد کرم شاہ صاحب نے ''ضیاء القرآن'' میں ایک نہایت ہی مفید نوٹ تحریر فرمایا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں:

> ''ہر قسم کی فساد انگیزی سے منع فرمایا جارہا ہے۔ چشموں کو بند کرنا، نہروں کو توڑ پھوڑ دینا، باغات کو اکھاڑ دینا، کھیتوں کو اجاڑ دینا، کارخانوں کو برباد کر دینا، تجارت وصنعت میں دھوکہ بازی کرنا، حکومتِ وقت کے خلاف بلاوجہ سازشیں کرنا، غرضیکہ ہر قسم کی تخریبی کارروائی جس سے ملک کی معاشی اور اقتصادی خوشحالی متاثر ہو یا اس کے سیاسی استحکام کو نقصان پہنچے۔ اسی طرح عقائد حقہ میں کجی، احکامِ شرع میں اپنی اغراض کے لئے تحریف، غیر اسلامی عادات واطوار کو اپنانا، اسلامی تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر غیر اسلامی تہذیب اور ملحدانہ تمدن کو اختیار کرنا یہ سب ممنوع ہے۔ اور یہ دونوں قسمیں قرآن کی اصطلاح میں فساد فی الارض کے عنوان کے نیچے مندرج ہیں۔

غرضیکہ فساد کسی بھی صورت میں ہو، کتنے ہی اس کے قومی وملکی فوائد ثابت کیے جائیں، کیسی ہی دراز قامت شخصیات

اس کی داعی اور محرک ہوں، بہر حال فساد ہی ہے۔ اللہ کے چمن کو کھلیان بنانے کے مترادف ہے جس کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔ قرآن کریم بار بار اس کی ممانعت کرتا ہے۔

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (القصص: ۷۷)

اور زمین میں فتنہ و فساد کی خواہش نہ کر بیشک اللہ فساد پھیلانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

بہر حال فتنہ و فساد ممنوع ہے۔ مفسدین کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔ آپ کہیں گے یہ اسلام ہی کی مخصوص خوبی نہیں بلکہ کسی مذہب میں فتنہ و فساد کی اجازت نہیں اور کوئی قوم اسے پسند نہیں کرتی۔ بلاشبہ یہ حقیقت ہے جس کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن اسلام اور دیگر مذاہب میں یہ فرق ہے کہ اسلام جن اعمال کو انسان کے لئے مضر اور ممنوع قرار دیتا ہے ان سے بچانے کا بھی پورا پورا انتظام کرتا ہے۔ جبکہ دیگر مذاہب ممانعت تو کرتے ہیں ناپسندیدگی کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن اپنے ماننے والوں کو ایسے اصول زندگی دینے سے قاصر ہیں جن کے ذریعہ ممنوعہ اور ناپسندیدہ امور کا خاتمہ ہو جائے۔ مثلاً شراب کی مضرتوں اور نقصانات کا تو اعتراف کیا جاتا ہے، لیکن اس کے استعمال پر پابندی نہیں۔ شراب کے بار ساری ساری رات کھلے ہیں۔ اور شراب کی حالت میں گاڑی چلانے کی ممانعت ہے اور اس قانون کی پابندی کرانے کے لئے باروں کے سامنے ہی پولیس، گاڑی چلانے والوں کی چیکنگ پر مامور ہے۔ کیا مضحکہ خیز قانون ہے۔ زہر کھانے سے نہیں روکتے، موت سے بچانا چاہتے ہیں۔ میرا مذہب زہر کا خاتمہ کر کے انسانوں کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔ شراب کو حرام کر کے شراب کی ذلت و خواری اور بربادی سے معاشرے کو محفوظ رکھتا ہے۔

فتنہ و فساد کا سبب

فتنہ و فساد کا سب سے بڑا سبب معاشی ناانصافی اور بدمعاملگی ہے کہ جس معاشرے میں دولت مند غریبوں کا خون چوس کر مزید دولت مند ہوتے چلے جاتے ہیں اور غریبوں پر ظلم و ستم عام ہو جاتا ہے۔ محنت کش اور مزدور کو ایک وقت کی روٹی حاصل کر لینا بھی دشوار ہوتی ہے۔ نوجوان بے روزگاری کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی معاشرے میں جرائم کا سیلاب آتا ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر دیتا ہے اور جس معاشرے میں معاشی امور میں انصاف پیدا کرنے کے لئے کوئی قانون نہیں ہوتا اسی میں مذہبی و خونی ہر قسم کے رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ دوستی محبت و الفت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور ہر شخص خود غرض نظر آنے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ معاشی تباہی، ملکی اور قومی تباہی کا بڑا سبب بنتی ہے۔ بدامنی اور لاقانونیت کے اس دور میں جو کچھ ہو رہا ہے، انسانی اقدار میں جو تبدیلیاں نظر آتی ہیں، خود غرض مفاد پرستی کے طوفان نے جس طرح تعلقات اور رشتوں کی زنجیروں کو توڑا ہے وہ سب معاشی ناانصافی اور بدمعاملگی ہی کا انجام ہے۔ جس میں پوری دنیا مبتلا نظر آتی ہے۔

اسلام فتنہ و فساد کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اس کا مکمل انسداد کرتا ہے۔ جس کے لیے سب سے پہلے معاشی انصاف اور معاشی معاملات میں محتاط طریقہ اختیار کرنے کے اصول متعین کئے گئے۔ سودی کاروبار کو یکسر ممنوع قرار دیا گیا۔ جوئے، سٹہ، رشوت کی کمائی کو حرام کیا گیا کہ دولت کمانے کے یہی وہ آسان ذرائع ہیں جن سے دولت مند مزید دولت مند ہوتا ہے۔ غریب پر حصول معاش کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی ذرائع معاشی ناانصافی کو جنم دیتے ہیں۔ انہی سے ایک

مخصوص ٹولہ پوری قوم اور ملک کے شعبہ معاشیات کو تلپٹ کر دیتا ہے۔ اس میں توازن اور مساوات ختم ہو جاتی ہے۔ حرام کی دولت پر عیش وعشرت کرنے والوں کو دیکھ کر پوری قوم میں ہوا وہوس کا مہلک مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ بدمعاملگی کے خاتمہ کے لئے اسلام تجارت و کاروبار میں دیانت، باہمی ہمدردی کا حکم دیتا ہے۔ قرض لین دین کی اجازت دیتا ہے تا کہ کم سرمایہ لوگ بھی بآسانی اپنی روزی کما سکیں۔ قرض خواہوں کو قرض داروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں قرض معاف کر دینے کی رغبت دی گئی اور اسے بہترین صدقہ قرار دیا گیا۔ حقیقت میں یہ تمام احکام فتنہ وفساد کے خاتمہ کے لئے احتیاطی تدابیر کے مترادف ہیں۔

زیر گفتگو آیات پر غور کیجئے تو آپ اندازہ کریں گے کہ معاملات میں کس قدر محتاط رہنے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ کمالِ احتیاط ہے کہ اگر تجارتی معاملہ قرض کا ہو تو جانبین کے درمیان جو بھی معاہدہ ہو اسے ضبط تحریر میں لایا جائے۔ اور صرف تحریر پر ہی اکتفاء نہ کیا جائے بلکہ دو گواہ بھی ہونے چاہئیں۔ اور جو معاملہ نقد ہو تو اگرچہ تحریر کی ضرورت نہیں لیکن گواہ اس پر بھی بنائے جائیں تا کہ کسی وقت بھی اختلاف کی صورت میں، جس کا بہت کم امکان ہے، صحیح فیصلہ ہو سکے اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ غور فرمایئے۔ ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کر لینے کی صورت میں کتنے اختلافات اور جھگڑے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ آج اکثر مقدمات تجارتی جھگڑوں سے متعلق ہی چلتے ہیں۔ اکثر قتل تجارتی معاملات پر ہی ہوتے ہیں۔ اکثر دشمنیوں کی بنیاد تجارتی معاملات ہی ہوتے ہیں۔ اسلام کے عطا کردہ اصول ان جھگڑوں سے نجات کا واحد ذریعہ ہیں۔ اندازہ لگایئے اگر معاشرے سے یہ اختلافات دور ہو جائیں تو معاشرہ کیسا پُر امن، پُر سکون ہوگا۔ پس بلاشک وشبہ اسلام کا معاشی نظام ہی فتنہ وفساد کے انسداد کا آسان اور یقینی ذریعہ ہے۔ اگر آج اجتماعی طور پر اس کو تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے تو انفرادی طور پر اس کے بعض حصوں کو اپنا کر بھی ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

میں ذاتی طور پر ایک ایسے بڑے متمول تاجر کو جانتا ہوں جنہوں نے چند سال میں بڑی ہی کاروباری ترقی کی۔ نہایت پھیلے ہوئے کاروبار کے باوجود میں نے ان صاحب کو ہر وقت بے حد مطمئن پایا۔ وہ پنج وقتہ نماز پابندی سے باجماعت مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ ہر سال عمرہ کرتے ہیں۔ اعزاء واقرباء احباب سے ملتے جلتے ہیں۔ مذہبی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ عام تاجروں کی طرح انہیں کبھی وقت نہ ہونے کا شکوہ نہیں۔ اکثر اپنے ذاتی کام خود کرتے ہیں۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ میرے شریک سفر ہو گئے۔ دوران سفر گفتگو کے علاوہ اور کیا کام ہوتا ہے۔ وہ میرے حالات معلوم کرتے رہے میں اُن کے۔ اُن سے میں نے اُن کے کاروبار کی ترقی اور ان کے مطمئن ہونے کا راز معلوم کیا تو انہوں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بتایا:

'' حضرت میں ایک غریب خاندان کا فرد ہوں۔ میں نے جوانی ہی سے تجارت شروع کی۔ باپ کی ایک چھوٹی سی دوکان سنبھالی۔ بس آپ لوگوں سے سنے ہوئے تجارت کے اسلامی اصولوں کو اپنایا۔ مثلاً میں نے کبھی گاہک کو جھوٹ بول کر خراب مال نہ دیا۔ کبھی گاہکوں سے سخت کلامی نہ کی۔ کبھی بنک سے قرضہ لے کر تجارت کو بڑھانے کا خیال تک نہ کیا۔ اور جب کاروبار بڑھا کئی دوکانیں ہو گئیں۔ فیکٹری ہو گئی تو ملازمین کو اچھی تنخواہیں دیں۔ ان کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ میرا یہ معمول ہے کہ میں ملازمین کو ان کی ماہانہ تنخواہ کے علاوہ جیب خرچ دیتا ہوں۔ بعض کو روزانہ اور بعض کو ہفتہ وار۔ نتیجتاً

میرے یہاں جو بھی ملازمت کرتا ہے وہ کبھی بھاگتا نہیں۔ میرے ملازمین میرے کہے بغیر محنت و مشقت سے کام کرتے ہیں۔ وہ میرے کاروبار کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اگر میں ہفتوں کی چھٹی بھی کرلوں تو ایک پائی کا نقصان نہیں ہوتا۔ اللہ نے مجھے سب کچھ عطا فرمایا ہے۔ میری نسلوں کے لئے کافی ہے۔ اس کا کرم ہے کہ اس نے مجھے ہوس میں مبتلا نہیں کیا۔ میرا نظریہ ہے کہ یہ بڑا کاروبار صرف میرے لئے نہیں بلکہ اس میں میرے ان تمام ملازمین کا حصہ اور حق ہے جو محنت و مشقت سے میرا ساتھ دیتے ہیں۔ مجھے اللہ کے فضل سے کسی کاروبار میں نقصان نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں کسی کا حق نہیں مارتا۔ وقت پر پورے حساب سے زکوٰۃ ادا کرتا ہوں۔ سائل اور غریب کو اللہ کا مہمان سمجھ کر اس کی مدد کرتا ہوں۔ یہ ہے راز میری ترقی کا۔

غور فرمایا آپ نے اگر انسان کوشش کرے تو اجتماعی معاشرہ خراب ہونے کے باوجود بھی اس کی گندگی سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ بس ایک مؤمن کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے احکام و تعلیمات پر اس کا مکمل یقین ہونا اور ان پر عمل کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اسلام کے عطا کردہ اصول زندگی، زندگی کی فلاح و بہبود کی ضمانت دیتے ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسے اصول زندگی ہوتے ہوئے ہم غیر اقوام کی بنائے ہوئے قوانین پر فریفتہ ہیں۔ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر غیر مہذب قوموں کی نام نہاد تہذیب پر مرتے ہیں۔ اپنے معاشی نظام کو فرسودہ کہتے ہیں اور اُس معاشی نظام کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس نے ہمیں مقروض اور بھکاری بنانے کے علاوہ اور کیا دیا ہے۔ زندگی میں اضطراب بھی ہے اور اس کا احساس بھی۔ لیکن افسوس اس سے نجات کے لئے ہم یقینی اور صحیح راہ اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین۔

کاتب و شاہد

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

اے ایمان والو! جب تم ایک مدت مقررہ تک قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔

یہ ایک قانون ہے جسے قانون کتابت کہیے یا قانون وثیقہ نویسی، جس کے نفاذ کے بعد ظاہر ہے کہ کاتب کی ضرورت پیدا ہوئی اور اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ عین ممکن تھا کہ کاتب اپنی اس حیثیت اور اہمیت کے سبب کبر و نخوت میں مبتلا ہو کر لوگوں کے ساتھ ناانصافی کرنے لگتے یا کتابت سے انکار کر دیا کرتے۔ اس طرح لوگوں کے لیے ایک شرعی قانون پر عمل بے حد دشوار ہو جاتا۔ کیونکہ نہ تو نزولِ قرآن کے دور میں ہر شخص لکھنا جانتا تھا اور نہ ہی آج تک سو فیصد لوگ لکھنا جانتے ہیں۔ علاوہ ازیں قانون کا اندازِ تحریر عام تحریر سے مختلف ہوتا ہے۔ جس کے ماہر ہر دور میں مخصوص لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے دور میں انہی لوگوں کو منشی، وثیقہ نویس کہا جاتا ہے۔ یا یہ کام رجسٹرار اور وکلاء انجام دیتے ہیں۔ قرآن کا یہ مزاج ہے کہ وہ جس قانون کو نافذ کرتا ہے اس پر عمل کی سہولتیں بھی فراہم کرتا اور ان کو بھی قانون کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے کہ قانون کتابت کو بیان فرما کر کاتب کو بھی ہدایات دی جارہی ہیں۔ فرمایا گیا:

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ

اور چاہیے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے، تو اسے چاہئے کہ وہ لکھ دے۔

کاتب کی دوذمہ داریاں ہیں ۔ایک یہ کہ تحریر میں ایسے مبہم الفاظ استعمال نہ کرے جس سے فیصلہ کرنے والے کو دشواری پیش آئے اور کسی کی حق تلفی ہو۔ بلکہ ایسے واضح اور صاف ستھرے الفاظ میں وثیقہ لکھے کہ قرض لینے اور دینے والے دونوں میں سے نہ کسی کی طرف داری ہو اور نہ کسی کی حق تلفی کا امکان پیدا ہو۔ کہ کسی کا نقصان کرنا یا کرانا بڑی ناانصافی اور ظلم ہے۔دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ جب ضرورت مند کاتب کے پاس معاہدہ لکھوانے آئیں تو اسے چاہئے کہ وہ انکار نہ کرے، نہ ان پر احسان جتلائے، بلکہ خوش ہو کر لکھے اور اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے اُسے علم عطا فرمایا جو ایک بڑی نعمت ہے۔اور اس کا نصف حصہ فن کتابت ہے۔

اللہ نے انسان کو جن انعامات سے نوازا ہے ان کے شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کرے۔دولت مند غریب کی مدد کرے،صحت مند معذور ومریض کی مدد کرے۔عالم جاہل کی مدد کرے۔پس اللہ نے جسے فن کتابت کی نعمت سے نوازا اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی مدد کرے۔

آج کل اگرچہ اسلامی قانون مکمل صورت میں کہیں زیرعمل نہیں تاہم معاہدوں اور وثیقوں کی تحریر، دنیاوی قوانین کا ایک اہم حصہ ہے۔اسی لئے معاہدہ نویسی اور وثیقہ نویسی ایک پیشہ بن گیا ہے اور کاتب ہر ملک میں اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی قانونی تحریر عدالتوں کے لئے قابلِ قبول ہوتی ہے۔ ججوں کے فیصلوں کا انحصار بڑی حد تک ان تحریروں پر ہی ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح معاشرے کے دیگر افرد بدعنوانیوں کا شکار ہیں اسی طرح کاتب بھی طرح طرح کی بدعنوانیوں میں مبتلا ہیں۔ دولت کی ہوس نے ان کے فن کے تقدس کو یکسر پامال کر دیا ہے۔وہ ایک شخص سے چند پیسے لے کر ایسے انداز پر قانونی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کہ دوسرے شخص کی بآسانی حق تلفی ہو جاتی ہے۔دولت کی حرص نے اس پیشہ کو اتنا خوار کر دیا کہ باقاعدہ مقررہ اوتھ کمشنرز کا ایک گروہ وجود میں آ گیا جن کا کام قسمیہ کاغذات تیار کرنا ہے۔ان کی ان قسمیہ تحریروں کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔اور وہ چند پیسوں میں ایسے سرٹیفکیٹ جاری کر دیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔لکھوانے والے کو وہ جانتے تک نہیں، وہ جو لکھواتا ہے یہ لکھ دیتے ہیں اور اپنی فیس وصول کر لیتے ہیں۔شرعی اعتبار سے ایسی قسمیہ تحریروں کی کوئی حیثیت نہیں۔ان کا لکھوانے والا اور لکھنے والا دونوں سخت گناہ گار ہیں۔اور ان سے حاصل شدہ دولت قطعاً حرام ہے۔پس مسلم،اوتھ کمشنرز کو یا تو اس پیشہ سے احتراز کرنا چاہیے اور یا شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داری پوری کرنا چاہیے۔اور لکھوانے والوں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے پیشہ ور لوگوں سے محتاط رہیں، جب وہ کوئی معاہدہ لکھوائیں، اللہ کا خوف دل میں رکھیں۔وہی بات لکھوائیں جو حقیقت ہو اور جو جانبین میں طے پا چکی ہو۔اس میں کمی زیادتی کا باہمی رضامندی کے بغیر کسی ایک کو اختیار نہیں۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ؕ

اور وہ شخص لکھوائے، جس پر قرض ہے اور اسے اللہ سے ڈرنا چاہیے جو اس کا رب ہے اور اس سے کچھ کم نہ کرے۔

درحقیقت اسلامی قانون پر عمل کا ذریعہ تقویٰ ہے کہ ہر فرد کو اللہ کے دربار میں پیشی اور اپنے اعمال کی جواب دہی کا

احساس ہو۔ تب ہی وہ اللہ کے احکام کی پابندی کر سکتا ہے اور معاشرہ ہر قسم کی بدعنوانیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ اور جہاں تقویٰ نہ ہو وہاں کتنی ہی قانون سازی کی جائے اور لوگوں سے اس پر عمل کی کوشش کرائی جائے ممکن ہی نہیں کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کا احساس کرے، حلال وحرام میں امتیاز کرے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

اور دو گواہ بنالو اپنے مردوں میں سے اور اگر دو مرد نہ ہوں، تو ایک مرد اور دو عورتیں، ان گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو کہ ان میں سے کوئی عورت بھول جائے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے۔

یہ قانون شہادت ہے جس کے نفاذ سے شہداء، گواہوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، کہ اب ان کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مقدمات کے فیصلوں کا انحصار تحریری معاہدوں کے باوجود گواہوں کی گواہی پر ہوتا ہے۔ لہذا شاہد، گواہی کی ذمہ داری قرار دی گئی کہ جب انہیں گواہی کے لئے طلب کیا جائے تو وہ گریز یا انکار نہ کریں۔ کیونکہ گواہی گواہ کے پاس درحقیقت اس شخص کی امانت ہے جس کو اس سے حق حاصل ہونے کا یقین ہو۔ اگر اس نے گواہی نہ دی تو گویا اس نے حق دار کے حلق کو تلف کیا۔ اسی لئے گواہی چھپانے کی بھی ممانعت کی گئی۔ اور اسے سخت گناہ قرار دیا گیا۔

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ

اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ گواہی کے لئے بلائے جائیں۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ

اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپاتا ہے تو بیشک اس کا دل گناہ گار ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب جانتا ہے۔

گواہ بننا نہ فن ہے نہ پیشہ۔ یہ تو اتفاقی بات ہے کہ کسی شخص نے چلتے پھرتے کسی معاملہ کو دیکھ لیا یا کسی بات کو سن لیا۔ بس وہ گواہ ہو گیا۔ اور اب اس پر بوقت ضرورت یا طلبی گواہی کا ادا کرنا لازم ہو گیا۔ ہاں اس صورت میں یہ ایک اعزاز ضرور ہے جب کہ کوئی اعتبار و اعتماد کر کے کسی کو گواہ بننے کی دعوت دے۔ دونوں صورتوں میں گواہی کا منصب منجانب اللہ عطا ہوا۔ اللہ کے اس عطیہ کو اللہ کی اس عطا کردہ امانت کو چھپانا، بڑا ہی ظلم ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

(البقرہ: ۱۴۰)

اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔

آج کل گواہ پیدا کرنے اور گواہی حاصل کرنے کا جو عام طریقہ رائج ہے وہ بھی ہمارے معاشرے کی دیگر بدکاریوں کی طرح ایک بدکاری ہے۔ کہ ہر شہر اور ہر دیہات میں جھوٹوں کا ایک ایسا ٹولہ وجود میں آ گیا ہے جن کا پیشہ گواہی دینا ہے۔

جو چاہے جیسی گواہی چاہے وہ چند پیسے دے اور ان جھوٹوں کو عدالت میں پیش کر دے اور یہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا اعلان کریں اور پھر بڑی ہی دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے رہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق کیا کہا جائے۔ کتنے ذلیل ہیں یہ لوگ کہ نہ صرف عدالت کے ججوں کو بلکہ اللہ اور اس کے رسول کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھوکوں اور جھوٹوں کی یہ ٹولی جس معاشرے میں موجود ہو اس معاشرے میں کسے انصاف مل سکتا ہے اور کون انصاف دلا سکتا ہے۔ اور جہاں عدل وانصاف نہ رہے وہاں امن وسکون کیسے میسر آ سکتا ہے۔

بہر حال کتمانِ شہادت بھی جرم ہے۔ اور جھوٹی گواہی دینا بھی جرم۔ اظہار حق سچی بات کہنا مؤمن کی شان ہے۔ اس سے اسلامی قوانین پر عمل میں سہولت وآسانی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر کاتب اور شہداء کے لئے ایک بڑی رکاوٹ اور پریشانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب وہ حق کی حمایت وطرف داری کے جذبہ سے کسی معاملہ میں شریک ہوتے ہیں تو انہیں کبھی حکام کی طرف سے اور کبھی مخالف گروہ کی طرف سے شدید تکالیف اور الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہیں لہذا قرآن کریم ایسے لوگوں کو واضح ہدایت دیتا ہے کہ:

وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ ۚ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَیُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اور تکلیف نہ دی جائے کسی لکھنے والے کو اور نہ کسی گواہ کو اور اگر تم ایسا کرو گے تو بیشک وہ تمہارا گناہ ہوگا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

کاتب اور گواہ کو تکلیف دینا یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف فیصلہ ہو، وہ ان کے دشمن بن جائیں اور طرح طرح سے انہیں ڈرائیں اور دھمکائیں۔ نیز حکام کی طرف سے ان کو بار بار عدالت کے چکر لگوائے جائیں۔ ان کا پیسہ اور وقت ضائع کرایا جائے۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ ان حالات میں نہ تو کاتب ہی عدل وانصاف کے ساتھ وثیقہ لکھیں گے اور نہ گواہ حق اور سچی گواہی دیں گے بلکہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے کترائیں گے۔ پس انصاف کو عام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کاتب وگواہ کو ستایا اور پریشان نہ کیا جائے اور اگر انہیں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو تو انہیں پورا پورا تحفظ فراہم کیا جائے۔

اسلام کے ان احکام پر غور کیجئے۔ کس قدر ان میں ربط ہے۔ اگر یہ ربط ختم ہو جائے تو اسلامی قوانین پر عمل ممکن نہیں رہتا۔ اسلامی نظام ایک جال کی طرح ہے جس کا ایک دھاگہ بھی کٹ جائے تو پورے جال کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اسلامی قوانین سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ مکمل طور پر اسلامی نظام کو اپنایا جائے۔ انسانیت کے لیے اسلامی نظام کی افادیت میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لیکن آج کل کس نے اس کو اپنایا ہے۔ کون سا ملک ہے جس میں مکمل اسلامی قانون نافذ ہے۔

شہادت کے معنی

ش، ہ، د سے ماخوذ تمام الفاظ میں، ح، ض، ر کا مادہ یعنی حاضری اور حضور کے معنی پائے جاتے ہیں۔ شہادت، شاہد، شہید، مشہد، مشہود۔ ان تمام الفاظ میں حضور کا مفہوم موجود ہے۔

شہادت، گواہی کسی واقعہ کو آنکھوں سے دیکھ کر بتانا عینی شہادت ہے۔ اور کسی بات کو اپنے کانوں سے سن کر بیان کرنا سمعی شہادت ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اشھَدُ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہنا شہادت کا رکن ہے کہ اس کے بغیر شہادت معتبر نہیں۔ نیز چونکہ شہادت میں حضور کا مفہوم موجود ہے لہٰذا شاہد، گواہ کے لئے لازمی ہے کہ اس نے اصل واقعہ خود دیکھا ہو یا جن باتوں کا تعلق سننے سے ہے، اس نے اس بات کو بلا واسطہ خود سنا ہو۔ کسی دوسرے سے سن کر بیان کرنا شہادت نہیں، خبر ہو گی۔ جو کتنی ہی سچی ہو اس پر قاضی کو فیصلے کا اختیار نہیں۔ اور شہادت کے لئے شاہد کا بذات خود قاضی کے پاس حاضر ہونا لازمی ہے۔ خط، ٹیلیفون، فیکس یا کسی دوسرے ذریعہ سے قاضی تک خبر پہنچا کر شاہد اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی قاضی ان ذرائع کو شہادت کا بدل قرار دے کر کوئی حتمی فیصلہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ دنیاوی قانون میں بھی آج تک کسی چیز کو چاہے وہ کتنی ہی معتبر اور یقینی کیوں نہ ہو شہادت کا بدل قرار نہیں دیا گیا۔ کہ اس صورت میں نہ صرف یہ کہ شہادت کا مفہوم ہی ختم ہو جاتا ہے بلکہ عدالت کا وقار اور قاضی کی حاکمانہ برتری بھی باقی نہیں رہتی۔

شرعاً جن امور میں شہادت مطلوب ہوتی ہے، ان میں شہادت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی پر فیصلوں کا انحصار ہے۔ حدود و تعزیرات سے متعلق امور ہوں یا معاملات و عبادات سے متعلق ہوں۔ جہاں بھی شہادت کو لازمی قرار دیا گیا ہے وہاں شہادت نہ ہونے کی صورت میں حکمِ قضا بھی تبدیل ہو جائے گا۔ مثلاً زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی گواہی لازمی ہے۔ اگر گواہوں کی تعداد پوری نہ ہو یا بالکل کوئی گواہ نہ ہو اور عورت یہ کہے کہ فلاں شخص نے مجھ سے زنا کیا ہے تو اگر زنا کے کچھ قرائن پائے گئے جن سے زنا ثابت ہوتا ہے، تب بھی حد زنا جاری نہ ہوگی، بلکہ قاضی اپنی صوابدید پر صرف سزا دے سکتا ہے۔ اور اگر قرائن بھی نہ پائے گئے تو سزا بھی نہیں دی جا سکتی۔

اسی بناء پر رؤیتِ ہلال کا مسئلہ بھی واضح ہے جس کو موجودہ دور میں خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ شریعت مطہرہ کو رؤیتِ ہلال کے ثبوت کے لئے شہادت مطلوب ہے اور شاہد کا قاضی کے سامنے حاضر ہونا لازمی ہے۔ اس کا بدل کوئی ذریعہ نہیں بن سکتا چاہے وہ کتنا ہی معتبر اور یقینی ہو۔ رؤیت یا عدم رؤیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا رؤیت ہلال کی شرعی شہادت پر ہی رمضان کے آغاز اور اختتام کا فیصلہ کیا جا سکے گا۔ یہ قدامت پسندی نہیں بلکہ ایک واضح شرعی اصول کی پابندی ہے جس سے آزادی اہل تقویٰ کے لیے ممکن نہیں اور اگر اس شرعی طریقہ کار کو ترک کر دیا جائے تو پھر کسی خود ساختہ طریقہ کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان شاء اللہ شہادت سے متعلق مزید تفصیلات ہم سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۳۵ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

عورت کی گواہی

آیت زیر گفتگو میں ہدایت کی گئی ہے کہ دو مردوں کے میسر نہ آنے کی صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے۔ ایک مرد کے مقابل دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم بظاہر یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ ایک عورت نصف مرد کے برابر ہوتی ہے، لہٰذا دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے مساوی قرار پائی۔ اس غلط فہمی کی بناء پر ہی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں مرد کی حیثیت عورت سے اتنی زیادہ ہے کہ عورت کو مرد کا نصف سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا اس قدر پروپیگنڈا کیا گیا کہ مسلمان

عورتیں تک اسلام میں اپنی حیثیت کے خلاف احتجاج کرنے لگیں اور یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اسلام عورت کو اتنا کمزور قرار دیتا ہے کہ ایک مکمل انسان کی حیثیت بھی اسے حاصل نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں، یہ اعتراض اسلام دشمنی کا ایک حصہ ہے جس کا مقصد مسلمان عورتوں کو دین سے متنفر اور دور کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم قرآن کریم کے اس ارشاد کی وضاحت کرتے ہوئے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عورت کی گواہی مرد کے مقابل نصف ہے، جیسا کہ آیت مذکورہ سے بھی ثابت ہے اور نبی مکرم علیہ السلام نے بھی اس کی وضاحت فرمائی کہ حدیث شریف میں ہے:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ںِالْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ اُضْحٰی اَوْ فِطْرٍ اِلَی الْمُصَلّٰی فَمَرَّ عَلَی النِّسَاءِ فَقَالَ یَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّیْ اُرِیْتُکُنَّ اَهْلَ النَّارِ فَقُلْنَ وَ بِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَ تَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ مَا رَاَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَ دِیْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ اَحَدُکُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِیْنِنَا وَ عَقْلِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَلَیْسَ شَهَادَةُ الْمَرْاَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ نُقْصَانُ عَقْلِهَا اَلَیْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَ لَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنْ نُقْصَانِ دِیْنِهَا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام عید الاضحیٰ یا عید الفطر میں عورتوں کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا، اے عورتوں کی جماعت، صدقہ کیا کرو کیونکہ میں نے تمہیں دوزخ میں دیکھا ہے۔ عورتوں نے کہا کس وجہ سے یارسول اللہ، آپ نے فرمایا تم بکثرت لعنت کرتی ہو اور خاوند کی نافرمانی کرتی ہو۔ میں نے تم سے زیادہ کسی کو دین اور عقل میں ناقص نہیں دیکھا، جو مرد دانا کی عقل پر غالب آنے والی ہو۔ عورتوں نے عرض کی یارسول اللہ، ہمارے دین اور عقل میں کیا کمی ہے۔ آپ نے فرمایا کیا عورت کی شہادت مرد کی شہادت کی نصف نہیں۔ عورتوں نے کہا، کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ عورتوں کی عقل کی کمی ہے اور فرمایا جب عورتوں کو حیض آتا ہے تو وہ نماز اور روزہ نہیں چھوڑتیں۔ عورتوں نے کہا، کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ ان کے دین کی کمی ہے۔ (بخاری، مسلم وغیرہ)

اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ انسان کی خلقت و جبلّت کو جاننے والا کون ہے۔ رسول نے جو کچھ بتایا وہ اللہ کے عطا کردہ علم ہی سے بتایا۔ پس رسول کا ارشاد اللہ ہی کا فرمان ہے۔ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک جیسا پیدا نہیں فرمایا۔ بعض کی قوت و طاقت بعض سے کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ کسی کی عقل بہت تیز اور کسی کی بہت کم، کوئی عقلمند کہلاتا ہے اور کوئی بیوقوف۔ کسی کی قوت حافظہ بہت زیادہ اور کسی کی بہت کم ہوتی ہے۔ کسی کی نظر بہت تیز اور کسی کی بہت کم۔ یہ بعض انسانوں کی بعض پر برتری یا توہین نہیں۔ سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ خالق حقیقی جانتا ہے کہ زندگی میں کس کو کیا کرنا ہے، پس اسی کے مطابق وہ اسے اعضا اور عقل و فہم عطا فرماتا ہے۔ اسی کی یہ حکمت ہے کہ اس نے عورت کو مرد کے مقابلہ پر ہر اعتبار سے نازک اور کمزور پیدا فرمایا۔

کیونکہ اس کے علم میں مرد وعورت کی ذمہ داریاں متعین ہیں۔ انہی کے مطابق اس نے ان دونوں جنسوں میں تفاوت رکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مشینری بنانے والا اس کے کام کے مطابق اس میں کل پرزے لگاتا ہے۔ اور اس کی قوت وطاقت کا تعین کر کے استعمال کرنے والوں کو ہدایت دیتا ہے کہ اس مشین سے صرف یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ اس پر بار ڈالا جائے گا تو اس کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اللہ نے مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں متعین کر دیں۔ اب عورت ان ذمہ داریوں کو چھوڑ کر یا ان سے آگے بڑھ کر اپنے جسم وعقل پر بوجھ ڈالتی ہے تو نہ صرف اس کا بلکہ پورے معاشرے کا نظام زندگی تہہ وبالا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ معاشرے کا ایک اہم جز ہے۔ نسل انسانی کی تباہی کا نہیں بلکہ فلاح وبہبود کا بھی اس پر دارومدار ہے۔ اللہ نے اسے کمزور ضرور بنایا ہے لیکن معاشرہ کا ایک ایسا اہم پُرزہ بنایا ہے کہ اگر وہ خراب ہو جائے تو پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔

غرضیکہ عورتوں کو بلاشبہ ناقص العقل پیدا فرمایا گیا۔ لیکن ان ذمہ داریوں کی تکمیل میں وہ ہرگز ناقص العقل نہیں جو اللہ نے اس کو سونپی ہیں۔ مثلاً گھر کا انتظام مرد کے بس کی بات نہیں وہ عورت ہی کر سکتی بچوں کی نگرانی اور تربیت جو عورت کر سکتی ہے وہ مرد ہرگز نہیں کر سکتا۔ باوجودیکہ مرد عورت سے جسمانی طور پر زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور عقلاً کامل ہوتا ہے۔ لیکن عورت اس وقت ناقص العقل ثابت ہوتی ہے جب وہ مردوں کا بوجھ اپنے سر پر اٹھانے کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہے۔ یہ بھی اس کے ناقص العقل ہونے ہی کا ثبوت ہے کہ جو ذمہ داریاں مردوں کی ہیں خواہ مخواہ ان کو قبول کرتی ہے۔ بچوں کا پالنا عورت کا کام ہے، وہ پالتی ہے لیکن معاش کا انتظام مرد کا کام ہے۔ خواہ مخواہ اس ذمہ داری کو بھی وہ اپنے سر لے لینا چاہتی ہے۔ ترقی کے نام پر آج عورت سے جو کام لئے جارہے ہیں یا اس نے انہیں خود قبول کیا ہے یہ حقیقت میں عورت پر بڑا ظلم ہے اس کی تخلیقی قوتوں سے بہت زیادہ اس پر بوجھ ہے۔ جس کا انجام بد بھی ظاہر ہے کہ جن ممالک میں عورتوں کا ملازمت کرنا، تجارت کرنا، اور مردوں کے شانہ بشانہ چلنا فیشن بن گیا ہے ان کی عائلی زندگی تہ وبالا ہو کر رہ گئی۔ بچے پیدا ضرور ہو رہے ہیں لیکن ان کی نگرانی اور تربیت کرنے والی ماں انہیں میسر نہیں آتی۔ شوہر کی نظروں میں بیوی کا کردار مشکوک اور بیوی کی نظروں میں شوہر کا۔ نتیجتاً نئی نسل پوری قوم کے لئے تباہی وبربادی کا پیغام بنی ہوئی ہے۔ اور کسی گھر میں شوہر وبیوی ایک دوسرے سے مطمئن نہیں۔ طلاق اور علیحدگی ایک معمول کی بات بن گئی ہے۔ یہ صورت حال کوئی معمولی نہیں۔ اس کے اثرات محدود نہیں۔ بلکہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہے، جبکہ اسلام نے عورتوں کی ذمہ داریوں کا تعین کر کے عورت کو مرد سے نہ تو کم مرتبہ قرار دیا ہے اور نہ ہی اس کی توہین کی ہے، بلکہ اس پر بڑا احسان کیا ہے کہ مرد کو اس کا سرپرست بنایا، جو معاش کی تمام ذمہ داریاں پوری کرنے کا پابند ہے اور عورت کو اس کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں بنایا جس کی محبت والفت اور گھریلو کاموں کی انجام دہی مرد کو اطمینان بخش زندگی فراہم کرتی ہے۔ اور بچوں کی بہترین تربیت انہیں مستقبل کی بہترین قوم بناتی ہے۔

شہادت ایک ذمہ داری ہے

شہادت ایک بڑی ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنے میں محنت بھی ہے اور بہت سے خطرات بھی، کہ شاہد کو گواہی ادا کرنے کے لئے جہاں بھی بلایا جائے گا، جب بھی بلایا جائے گا اسے جانا ہوگا اور وہ جس کے خلاف گواہی دے گا وہ ضرور اس کا

مخالف اور دشمن ہو جائے گا۔ اسلام نے عورت پر بڑا احسان کیا کہ اس محنت شاقہ اور خطرات سے اسے محفوظ رکھا۔ ایسے واقعات جن میں شاہد کے لئے بہت ہی خطرہ ہے۔ مثلاً زنا کے ثبوت میں عورت کو قطعاً ناقابل گواہی قرار دے دیا گیا کہ زنا کے اثبات کے لئے صرف چار مردوں ہی کی گواہی قابل قبول ہوگی۔ ایسے ہی حدود و قصاص کے دوسرے معاملات میں بھی عورت گواہ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ انہی معاملات میں گواہوں کے لئے زیادہ خطرہ اور دشواریاں ہوتی ہیں۔ یہ عورت کی توہین نہیں بلکہ اس کی تخلیقی نزاکت کے مطابق اس ذمہ داری سے آزاد رکھنے کی تدبیر ہے۔ ہاں لین دین قرض اور دیگر کاروباری معاملات نیز نکاح، طلاق وغیرہ جیسے امور میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی معتبر قرار دی گئی کہ ان معاملات میں اختلاف اس نوعیت کا نہیں ہوتا جس میں زیادہ خطرات ہوں۔ یہاں بھی عورت کی تخلیقی نزاکت کا لحاظ رکھا گیا کہ تنہا ایک عورت پر گواہی کا بوجھ نہیں ڈالا گیا بلکہ دو کو رکھا گیا۔ جس کی وجہ خود قرآن کریم نے بیان فرمادی کہ اگر ایک عورت اپنی تخلیقی کمزوری کی وجہ سے عدالت کے ماحول میں آکر گھبرا جائے، پریشان ہو جائے اور واقعہ بھول جائے تو اس کے لئے شریعت آسانی مہیا کرتی ہے کہ دوسری عورت موجود ہے، جو اسے یاد دلادے گی۔ اور چونکہ وہ بھی شرعاً مکمل گواہ ہے تو عدالت کو اس کی بات تسلیم کرنا پڑے گی۔

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھول جائے تو اس ایک کو دوسری یاد دلادے۔

وکلاء کا تجربہ شاہد ہے کہ اکثر عورتیں عدالت میں پہنچ کر گھبرا جاتی ہیں۔ بولنے سے پہلے رونا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ کیفیت خاص طور پر مسلمان عورتوں کی زیادہ ہوتی ہے کہ مسلم تہذیب میں پروردہ عورت کا چہرہ ہی نقاب میں نہیں ہوتا بلکہ حیاو شرم کا پردہ اس کے آواز کو اس قدر دبائے ہوتا ہے کہ اس کے لئے بولنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس گھبراہٹ اور پریشانی کی کیفیت میں اس کے لئے بیان دینا اور گواہی ادا کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ برابر کھڑی دوسری عورت کچھ اس کا تعاون کرتی ہے۔ دونوں مل جل کر گواہی کی ذمہ داری پوری کرتی ہیں۔ غور فرمائیے یہ عورت کی توہین ہے یا اس پر شریعت کا احسان اور ایک بڑی ذمہ داری پوری کرنے میں اس کا تعاون۔

ہاں اگر ایک عورت کسی حال میں گواہ بننے کی اہل نہ قرار دی جاتی تو کہا جا سکتا تھا کہ عورت کی توہین کی گئی ہے۔ جب کہ رضاعت، حمل، حیض اور ایسے دیگر زنانہ امور میں ایک ہی عورت یا چند عورتوں کی گواہی قابل قبول قرار دی گئی ہے۔ جبکہ ان کی گواہی سے مرد متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً

عَنْ عُقْبَةَ بْنَ الْحَارِثِ قَالَ تَزَوَّجْتُ اِمْرَاَةً فَجَاءَتْ اِمْرَاَةٌ فَقَالَتْ اِنِّیْ اَرْضَعْتُكُمَا فَاَتَيْتُ فَذَكَرْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ وَ كَيْفَ وَ قَدْ قِيْلَ دَعْهَا عَنْكَ۔

حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے شادی کی، تو ایک اور عورت نے آکر کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ میں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ پیش کیا، آپ نے فرمایا تم اس عورت کو نکاح میں کیسے رکھ سکتے ہو جبکہ یہ گواہی ہو گئی،

اس عورت کو طلاق دے دو۔ (بخاری شریف)

ایک عورت کی گواہی پر فیصلہ ہوااور حضرت عقبہ کو اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑی۔

بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ عورت تخلیقی اعتبار سے بہ نسبت مرد کے کمزور ہے۔اس کی خلقت اس کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے کی گئی۔آج عورت نے بہت ترقی کی،مرد کے مقابلے پر آنے کی پوری پوری کوشش کی ہے،لیکن پھر بھی نہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوسکی ہے اور نہ ہی مرد کے تعاون کی احتیاج سے آزاد ہوئی ہے۔ چند ہی ممالک ہیں جہاں عورتیں اعلیٰ عہدوں پر پہنچ سکی ہیں یا سخت جسمانی محنت کے کام کررہی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد گنی چنی ہے۔جس کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بطور مثال پیش نہیں کیا جاسکتا کہ استثنائی صورت سے کوئی کُلّیہ وضع نہیں ہوتا۔یوں تو بعض مرد بھی عورتوں کی طرح نازک ہوتے ہیں تو کیا آپ ان کو مثال بنا کر یہ کُلّیہ بنائیں گے ''مرد،عورت کی طرح ہوتا ہے''،ہرگز نہیں،تو چند عورتوں کو نظیر بنا کر یہ کُلّیہ کیسے بنایا جاسکتا ہے کہ ''عورت مرد کی طرح ہوتی ہے''۔

غرضیکہ شریعت مطہرہ نے عورتوں کو ان کی تخلیقی صلاحیت کے مطابق ذمہ داریاں سونپی۔ یہی اصولِ شہادت کے موقع پر نظر آتا ہے کہ شہادت کی اہمیت اور شاہد کی ذمہ داری اس واقعہ کے مطابق ہوگی۔جس کا عدالت کو فیصلہ کرنا ہے۔حدود، قصاص وغیرہ کے واقعات نہایت ہی نازک ہوتے ہیں۔ان میں شاہد کے لئے بہت خطرات بھی ہیں اور ذمہ داری بھی۔ عورت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔لہٰذا شریعت نے اس ذمہ داری سے اسے محفوظ رکھا۔لین دین وغیرہ کے واقعات میں اتنی نزاکت نہیں اتنے خطرات نہیں لہٰذا ان معاملات میں عورت کی گواہی کو بھی معتبر قرار دیا۔لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ایک مرد ہو اور دو عورتیں۔نہ ایک عورت ہو اور نہ ہی دو مردوں کی جگہ چار عورتیں اور رضاعت وغیرہ کا زیادہ تعلق عورتوں سے ہوتا ہے اور ان معاملات میں اختلافات خطرات کی حد تک نہیں پہنچتے۔لہٰذا ان میں صرف عورتوں کی گواہی بھی معتبر قرار دی گئی۔

ہم نے جو کچھ عرض کیا ہمیں یقین ہے کہ اس سے یہ غلط فہمی دور ہوگئی کہ ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم العیاذ باللہ عورت کی توہین ہے،ایسا ہرگز نہیں۔ عورت کے مقام کا جو تحفظ اسلام کرتا ہے اور عورت کو جو حقوق شریعت مطہرہ نے عطا فرمائے ہیں،اس کی نظیر کسی مذہب یا دنیا کے کسی قانون میں موجود نہیں لیکن اس کا کوئی جواب نہیں۔ کہ انسان مصیبت کو راحت کہے اور اسبابِ راحت کو مصیبت قرار دے۔آج کی عورت کا یہی حال ہے کہ مغربی تہذیب نے جن ذمہ داریوں تلے اسے دبا رکھا ہے وہ اسے ترقی سمجھ کر بخوشی اختیار کررہی ہے اور اسلام نے اس کی عزت وناموس،حُسن و نزاکت کے تحفظ کے لئے جو احکام دیئے اور اس کی تخلیقی قوت کے مطابق اسے جو ذمہ داریاں سونپیں انہیں عورت بے جا پابندی اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دے رہی ہے ۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

کرشمہ سازی غیر فطری اور غیر جبلی عمل ہے۔جس کا اثر نہایت ہی عارضی اور اُوپری ہوتا ہے۔جس سے کرشمہ ساز کو خود بھی تسکین نہیں ہوتی۔کیونکہ اس کا باطن اس کے ظاہر کی نفی کرتا ہے۔وہ بظاہر ہنستا یا اپنی کرشمہ سازی پر فخر کرتا ہے لیکن اس

کا دل روتا یا شرمندہ ہوتا ہے۔ اس کی محفلیں پُر رونق اور تنہائیاں پُر ہیبت ہوتی ہیں۔ اس کی جلوت روشن اور خلوت تاریک ہوتی ہے۔ ایسے شخص کی زندگی کامیابی و کامرانی سے کبھی ہمکنار نہیں ہو پاتی کہ وہ تہذیب و تمدن جو اپنی نہ ہو اس کو اپنانا کرشمہ سازی ہی ہے۔ جس کو اختیار کرنے والے کا نہ ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور نہ ہی مستقبل محفوظ۔

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا
(اقبال)

رہنِ مقبوضہ

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ

اور اگر تم سفر میں ہو اور تم نہ پاؤ لکھنے والا، تو رہن ہو قبضہ میں دیا ہوا پھر اگر تمہیں ایک دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کر دے، اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔

رہن، گروی رکھنا اصطلاحاً اس چیز کو رہن کہتے ہیں جو گروی رکھی جائے۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ وہ اپنے قوانین پر عمل کو ممکن و آسان بنانے کے لئے بطور بدل ایسے قوانین بھی دیتا ہے جن پر بصورت مجبوری عمل درحقیقت اصلِ قانون پر ہی عمل ہوتا ہے۔ مثلاً پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت حاصل کرنے کے لئے تیمم کا قانون دیا گیا۔ نماز چھوٹ جائے تو قضا کا قانون موجود ہے۔ کوئی روزہ رکھنے کے قابل نہ ہو تو کفارہ موجود ہے۔ کوئی صاحب نصاب نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ ادا کرنے سے قاصر ہو تو صدقہ و خیرات کے ذریعہ ثواب حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی حج کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو صرف نیت حج سے قیامت کے دن حاجیوں میں شامل ہو جائے گا۔ جملہ عبادات و معاملات میں یہی صورت موجود ہے۔ کیونکہ روحِ عبادت عبادت کی مخصوص صورت نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ اور خلوصِ نیت ہے۔

رہن بھی وثیقہ اور گواہوں کا بدل ہے، کہ اگر کسی کو وثیقہ لکھانے اور اس پر گواہ بنانے میں دشواری پیش آئے تو ان دونوں کا مقصد رہن سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس آسانی کو اگرچہ حالتِ سفر کے ذکر کے ساتھ بیان کیا گیا لیکن صرف ایسی صورت میں رہن کی اجازت نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ حالتِ سفر کا تذکرہ صرف اس لئے کیا گیا کہ عام طور پر وسائل کی کمی حالتِ سفر میں ہی ہوتی ہے۔ وثیقہ نویس اور گواہوں کے حاصل نہ ہونے کا بھی زیادہ امکان سفر ہی میں ہوتا ہے۔ بالخصوص نزولِ قرآن کے دور میں اکثر یہ اور اس جیسی بہت سی پریشانیاں سفر میں ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا اگر کوئی عام حالات میں بھی وثیقہ نہ لکھوائے اور اس پر گواہ مقرر نہ کرے تو رہن کی آسانی سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے بھی باہمی اختلاف کے امکان کو ختم کرنے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

رہن کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے نقد یا جنس کی صورت میں قرضہ لے اور اپنی کوئی چیز بطور ضمانت قرضہ دینے والے کے پاس رکھا دے۔ یہ چیز قرض خواہ کے پاس اس وقت تک بطور امانت محفوظ رہے گی جب تک مقررہ وقت پر

قرض دار قرضہ ادا نہ کر دے اس چیز کی قیمت قرض سے زیادہ ہو یا اس کے برابر، اور اگر قرض دینے والا راضی ہو تو کم قیمت کی چیز بھی گروی رکھی جا سکتی ہے۔ گروی رکھی ہوئی چیز چونکہ امانت کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا قرض خواہ کے لئے اس سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں۔ نیز وہ چیز اگر اس کے پاس تلف ہو گی تو اسے قیمت ادا کرنا ہو گی۔ اگر اس کی قیمت قرض کے مساوی تھی تو قرض ختم ہو جائے گا۔ اگر زیادہ تھی، تو قرض بھی ختم اور باقی رقم واجب الادا، اگر کم تھی تو قرضدار اپنی چیز کی قیمت وضع کر کے باقی رقم ادا کرے گا۔

رہن کو نبی مکرم علیہ السلام نے اپنے عمل سے سنت بنایا اور اس کے مسائل کی عملی وضاحت فرمائی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ بوقت وصال حضور علیہ السلام کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَدِرْعُهٗ مَرْهُوْنَةٌ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ بِثَلٰثِيْنَ صَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جب حضور علیہ السلام نے وفات پائی، اس وقت آپ کی ایک زرہ یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی، تیس صاع جو کے بدلے میں۔

(بخاری شریف)

اس یہودی کا نام ابوشحم تھا۔ حضور علیہ السلام کے وصال کے بعد یہ شرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا کہ آپ نے اپنے آقا ﷺ کے کئے ہوئے وعدوں کو بھی پورا کیا اور قرض بھی ادا کئے۔ یہ زرہ بھی آپ نے ہی یہودی کو تیس صاع جَو دے کر چھڑائی۔

بہرحال بیع وشراء اور دیگر معاملات میں ہی اختلاف بدامنی اور قتل و غارت کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا قرآن وحدیث نے ہمیں ایسے قواعد وضوابط عطا فرمائے جن کی پابندی ہر قسم کے اختلاف وانتشار سے محفوظ رکھنے کی ضمانت ہے۔ ان قواعد وضوابط کی تفصیلات سے فقہ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہم ان مسائل سے نہ تو واقف ہیں اور نہ ہی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اگر ان کو بیان بھی کیا جائے تو خیال کرتے ہیں کہ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ ظاہر ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اسلامی قانون پر عمل سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان مسائل پر عمل کا تو وہم وگمان تک نہیں رہا۔ اور یہ خیال تک نہیں آتا کہ ہمارے مذہب نے تجارت کے بھی کچھ اصول وضوابط مقرر کئے ہیں جن کی ہمیں پابندی کرنا چاہئے۔ تاکہ ہمارا یہ دنیاوی عمل بھی عبادت بن جائے۔ اللہ دین سے ہماری اس لاپرواہی کو دور کرے۔ آمین

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"سورۂ آلِ عمران"

مقالہ نمبر	آیات نمبر
13	100 تا 101
14	102 تا 105
15	118 تا 120
16	130 تا 145
17	149 تا 155
18	156 تا 200
19	254

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۱۳

آل عمران: ۱۰۰ تا ۱۰۱

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (آل عمران: ۱۰۰۔۱۰۱)

اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو ایک گروہ کا اہل کتاب میں سے تو وہ تمہیں لوٹا دیں گے تمہارے ایمان کے بعد کفر کی طرف۔ اور تم کیوں کر کفر کرو گے، حالانکہ تم پر پڑھی جاتی ہیں اللہ کی آیتیں اور تم میں اس کا رسول جلوہ فرما ہے۔ اور جس نے اللہ کا سہارا لیا تو بیشک اسے ہدایت کی گئی سیدھے راستہ کی۔

اے ایمان والو! اہل کتاب کے مکروفریب کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ ان کے شر سے بچتے رہو، یہ تو تمہارے ازلی دشمن ہیں۔ کبھی تمہیں ایسا مشورہ نہیں دے سکتے۔ جس میں تمہاری فلاح و بہبود ہو، پس اگر تم ان کی باتوں میں آ گئے اور ان کے کہے پر عمل کرنے لگے۔ تو یہ ڈاکو تمہارا ایمان تک لوٹ لیں گے اور تم اس عظیم دولت سے محروم ہو کر پھر کافر ہو جاؤ گے۔

ہونا یہی چاہیے کہ تم گمراہی اور کفر سے محفوظ رہو کیوں کہ تمہارے پاس اللہ کی وہ کتاب موجود ہے۔ جس کی تبلیغ و اشاعت

تا قیامت جاری رہے گی اور تم اس کی آیات سنتے ہی رہو گے۔ نیز تم میں اللہ کا وہ رسول موجود ہے جس کا ہر عمل قرآن کی تفسیر ہے۔ پس قرآن وسنت کے ہوتے ہوئے تمہارا کسی غیر کے کہنے پر عمل کرنا بعید از قیاس ہے۔ جب کہ تم سے اللہ یہ بھی وعدہ فرماتا ہے کہ اگر تم اس سے ہدایت طلب کرتے رہو گے اور اسی کے سہارے دین پر قائم رہنے کی کوشش کرو گے تو وہ تمہیں ضرور سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائے گا۔ اور دشمن کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

شانِ نزول

آیات بالا کی وضاحت کے لیے ان کا شان نزول بیان کرنا ناگزیر ہے۔ اوس وخزرج مدینہ کے ایسے دو بڑے قبیلے تھے جن میں پشتہا پشت سے باہمی عداوت اور جنگ چلی آرہی تھی۔ دونوں کا کوئی فرد اپنی اولاد کو دشمن سے انتقام لینے کی وصیت کیے بغیر نہ مرتا تھا۔ اہلِ عرب ان دونوں قبیلوں کا متحد ہو جانا ناممکن یقین کرتے تھے۔ لیکن اللہ کے دین کی تاثیر کا اندازہ لگایئے کہ جب اسلام کا آفتاب، اُفق مدینہ پر طلوع ہوا اور دشمنوں کو ملانے والے دلوں کو جوڑنے والے آقائے رحمت ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو دونوں قبیلوں کے لوگ مشرّف باسلام ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ناممکن، ممکن بن گیا۔ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اب وہ ایک دوسرے کو گلے لگاتے، ساتھ اٹھتے، ساتھ بیٹھتے، ساتھ کھاتے، ایک ہی در کے بھکاری، ایک ہی آقا کے غلام تھے

بد خُلق جو تھے وہ نیک ہوئے، لڑتے تھے ہمیشہ جو ایک ہوئے
جھگڑے تو نے آ کر میٹ دیئے، تری فہم و ذکاء کیا کہنا

اوس وخزرج کا شیر وشکر ہونا، حاسدین کے لیے ناقابل برداشت تھا، کہ شیطان کے لیے مسلمانوں کا میل ومحبت، اتحاد واتفاق ہی سب سے زیادہ ناپسند اور ناگوار ہوتا ہے۔ وہ امت کو اس نعمت سے محروم کرنے کے لیے ہر قسم کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ پس ایک دن یہ شیطان بوڑھے یہودی شعث ابن قیس کی صورت میں جارہا تھا کہ اس نے اوس وخزرج کو ایک جگہ بیٹھے دیکھا جو پیار ومحبت کی باتیں کررہے تھے۔ اور ان کے چہروں پر اسلام کا نور چمک رہا تھا۔ دل ان کے مطمئن تھے۔ اس بوڑھے پر یہ سماں نہایت ناگوار گزرا۔ اس نے ایک نوجوان یہودی کو بلایا اور اس سے کہا تو ان لوگوں کو وہ اشعار سنا، جس سے ان کے دل میں جنگ بُعاث کی یاد تازہ ہو جائے۔ بُعاث اوس وخزرج کے درمیان ایک نہایت ہی خوں ریز جنگ ہوئی تھی جس میں اوس نے خزرج پر فتح پائی تھی۔ جس کی یادیں بڑی ہی دلخراش تھیں۔ اس یہودی نے ایسے اشعار پڑھے کہ دونوں قبیلوں کے مرجھائے ہوئے زخم پھر ہرے ہو گئے۔ ان میں ٹیسیں اٹھنے لگیں اور آناً فاناً محبت کی نظریں نفرت کی نظروں میں بدل گئیں۔ دونوں میں سخت کلامی کا آغاز ہوا اور نوبت بایں جارسید کہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو دوڑے اور مسلح ہو کر آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ کسی نے دوڑ کر نبی مکرم علیہ السلام کو خبر دی۔ آپ فوراً موقع پر پہنچے۔ یہ دیکھ کر آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا کہ جنہیں ایک دوسرے پر قربان ہونے کی تعلیم دی گئی تھی وہ ایک دوسرے کی قربانی کرنے کے لیے آمنے سامنے صف بستہ ہیں۔ آپ دونوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے، اور فرمایا ''کیا تم میرے ہوتے ہوئے لڑو گے، اور کیا تم ہدایت پر آ کر پھر گمراہ ہوئے جاتے ہو''۔ غلاموں کے لیے تو آقا کی موجودگی کافی تھی۔ اس ارشاد نے تو آگ پر پانی کا کام کیا۔ فریقین نے

ہتھیار پھینکے۔ایک دوسرے سے چپٹ کر چیخیں مار مار کر رونے لگے۔اس احساس پر اُفسردہ و شرمندہ تھے کہ ہم کس دولت سے محروم ہوئے جا رہے تھے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کوئی دن نہ دیکھا، جس کا اول ایسا شر ہوا اور اس کے آخر میں ایسی خیر۔ بلاشبہ یہ اثر تھا معلم کامل ﷺ کی تربیت و تعلیم کا۔

بچھڑے ہوؤں کو کس نے ملایا تیرے بغیر   اجڑے ہوؤں کو کس نے بسایا تیرے بغیر

بہرحال یہ واقعہ ہمیں ایک نہایت اہم اصول زندگی کے حصول کا سبب بنا۔ جس کو آیات مذکورہ میں بیان کیا گیا، کہ یہود و نصاریٰ کو کبھی دوست نہ جانو، وہ تمہارے ایسے ابدی دشمن ہیں کہ تم نے ان پر اعتماد کر کے ان کے مشوروں پر عمل کیا تو وہ تمہیں اپنا جیسا یعنی کافر بنا کر چھوڑیں گے۔

خطرناک دشمن

یوں تو ہر کافر مسلمان کا دشمن ہے۔ کیونکہ اسلام اور کفر دو متضاد عقیدے ہیں۔ جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اسلام نور ہے، کفر ظلمت ہے نور، ظلمت پر غالب تو آتا ہے۔اس کو اپنے اندر سمو تو لیتا ہے لیکن اس سے سمجھوتا نہیں کرتا۔ اسلام کفر پر غالب آتا ہے۔کافروں کو مسلمان بنالیتا ہے۔لیکن کافر سے سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ کہ نور و ظلمت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ پس ہر کافر مسلمان سے بچنے، بھاگنے کی فکر میں رہتا ہے۔ یا اپنی بقاء کے لیے اس کو مٹانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔لہٰذا وہ کبھی مسلمان کا دوست نہیں بن سکتا۔ سب ہی کافر مسلمان کے دشمن ہوتے ہیں۔ میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے "الکفر ملة واحده" کفر، چاہے کسی نام سے کسی شکل میں ہو، مسلمانوں کے لیے ایک ہی ملت ہے۔ یعنی سب ہی مسلمانوں کی دشمنی پر متحد و متفق ہیں۔لیکن ان میں خطرناک ترین دشمن یہودی ہیں۔ جو اہلِ کتاب ہونے کے باوجود نبی مکرم علیہ السلام کے دور سے آج تک نہایت ہی مکاری اور چال بازی کے ساتھ اسلام کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ کیونکہ یہ وہ قوم ہے جس کی سرشت میں حق دشمنی شامل ہے۔حتیٰ کہ ان ظالموں نے ہر دور میں انبیاء کرام علیہم السلام پر نہ صرف مظالم ڈھائے بلکہ ان میں سے اکثر کو قتل تک کر ڈالا۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ان کی اس بدخوئی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ کس قدر مکار قوم ہے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

(آل عمران: ۱۸۱۔ ۱۸۳)

بیشک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا کہ اللہ مفلس ہے، حالانکہ ہم غنی ہیں۔ ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا۔ نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) اور ہم کہیں گے کہ (اب)

چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ بے شک اللہ نے ہم سے اقرار لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں حتیٰ کہ وہ ہمارے پاس ایک قربانی لائے جس کو آگ کھا لے۔ آپ فرما دیجئے، تمہارے پاس مجھ سے پہلے رسول آ چکے دلیلوں کے ساتھ اور اس معجزے کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو، تو تم نے انہیں کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو۔

یہ ایک جھلک ہے اس مکار قوم کے حیلے بہانوں کی، کہ کبھی تو انہوں نے دعوتِ حق کو یہ کہہ کر رد کیا کہ "کیا ہم اس اسلام کو قبول کریں اور اس قرآن پر ایمان لائیں جو اللہ کو قرض دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ گویا اللہ فقیر و مفلس ہے اور ہم غنی ہیں (العیاذ باللہ) اور کبھی انہوں نے اللہ پر الزام تراشی کرتے ہوئے اسلام قبول کرنے سے اس طرح انکار کیا کہ" اللہ نے ہم سے اقرار لیا ہے کہ ہم صرف ایسے رسول پر ایمان لائیں گے جس کی قربانی کو آسمان کی آگ کھا جائے گی"۔ یہ سب ان کی بیہودہ گوئی ہے۔ ان ظالموں نے پہلے کب رسولوں اور نبیوں کی اتباع و پیروی کی۔ ان کی تو تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کو انہوں نے ستانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی بلکہ بعض کو تو قتل کر ڈالا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے بزعم خود اسی لیے سولی پر چڑھایا کہ اللہ کی کتاب انجیل لے کر آئے تھے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتے اور نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کی خوشخبری سناتے تھے۔ ان کی انہی بدکاریوں کے باعث ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان پر ذلت و خواری مسلط کر دی گئی کہ دنیا کی ہر قوم عزت حاصل کر سکتی ہے، سوائے یہود کے۔

وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ (البقرہ:۶۱)

اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور غربت اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے، یہ (سب کچھ) اس لیے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق، یہ (سب کچھ) اس لئے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (آل عمران:۱۱۲)

مسلط کر دی گئی ان پر ذلت، جہاں کہیں وہ پائے گئے سوائے اس کے کہ اللہ کے عہد سے یا لوگوں کے عہد سے انہیں کہیں پناہ مل جائے اور یہ مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے اور مسلط کر دی گئی ان پر محتاجی، یہ (سب کچھ) اس لئے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے اور قتل کیا کرتے تھے انبیاء کو ناحق، یہ

(سب کچھ) اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔

سزائے جرم سے جرم کی سنگینی کا اندازہ کر لیجئے کہ یہ قوم ہر دور میں اتنے سنگین جرائم میں مبتلا رہی کہ اس پر دائمی ذلت اور غربت مسلط کر دی گئی۔ اپنی طویل تاریخ میں یہ اللہ کے اس عذاب سے نہ کبھی نجات پا سکے ہیں اور نہ پا سکتے ہیں۔ کل بھی ذلیل و محتاج تھے اور آج بھی ذلیل و محتاج ہیں۔ اور مستقبل اس سے بھی زیادہ بھیانک ہوگا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہم نے قرآن کریم کی وہ آیات نقل کی ہیں جن میں یہودیوں کی دائمی ذلت و مسکنت کا اعلان کیا گیا ہے۔ بحمد اللہ ہمارا اس پر ایمان ہے کہ قرآنِ کریم کا ہر اعلان حق اور سچ ہے۔ اس کی بیان کردہ کسی بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ چاہے ہماری عقل اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ یہودیوں کی ذلت و مسکنت سے متعلق یہ غلط فہمی عام ہوتی جا رہی ہے کہ ''اس زمانہ میں یہودی نہ تو ذلیل ہیں، کیونکہ وہ ایک ملک کے حاکم ہیں اور نہ ہی غریب ہیں، کیونکہ وہ دنیا کی دولت مند قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ بلکہ دنیا کی تجارت پر انہی کا تسلط ہے''۔ اس غلط فہمی کی وجہ یا تو کم علمی ہے اور یا اس پروپیگنڈے کا اثر جو اسلام کے دشمنوں کی جانب سے اسلام کے خلاف بڑی شدومد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور اسلام کے خلاف کسی سازش کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ آیئے اس غلط فہمی کو دور کر لیجئے۔ کہ اس کے باعث قرآن کے ایک اہم اور واضح اعلان میں شک و شبہ پیدا ہوتا ہے جو کفر ہے، اللہ اس سے محفوظ رکھے۔

اقوام عالم میں یہودیوں کی تاریخ طویل ترین ہے۔ لیکن ہر دور میں یہ ذلیل و خوار نظر آتے ہیں۔ کبھی ان کی صورتیں مسخ کی گئیں اور انہیں بندر و خنزیر کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ کبھی ان پر صاعقہ (کڑک) اور پتھروں کی بارش کا عذاب نازل ہوا۔ تو کبھی عیسائیوں نے ان کا قتل عام کیا اور کبھی یہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ غرضیکہ ہر دور میں ذلیل و خوار ہی ہوتے رہے۔ اب چند سال سے ایک قطعہ ارض کے مالک بنے بیٹھے ہیں، وہ بھی کس طرح اور کیسی سازش ہے، اس پر تاریخ گواہ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عرب کی مسلم حکومتیں دن بدن کمزور ہوتی چلی گئیں۔ صیہونی طاقتوں کو وہاں خلل اندازی کے مواقع میسر آنے لگے اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی سازش کے ذریعہ مسلمانوں کا ایک مقدس مقام بیت المقدس یہودیوں کے حوالہ کر دیا اور اس طرح مسلم ممالک کے بیچوں بیچ مسلمانوں کے اس ابدی دشمن کو بٹھا دیا۔ تاکہ مسلم ممالک میں مزید انتشار پیدا ہو اور وہ ہمہ وقت خوفزدہ رہیں۔ اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔ لیکن اللہ کی طرف سے جس کے لئے دائمی ذلت مقدر کر دی گئی ہے وہ کیسے باعزت ہو سکتا ہے۔ یہودی حاکم ہونے کے باوجود بھی باعزت نہ ہو سکے۔ یہ اپنے داتاؤں کے در کے بھکاری ہی رہے۔ نہ تو اپنے ملک کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے آزاد کر سکے اور نہ مستحکم۔ چالیس سالہ دور میں ایک دن بھی اسرائیل میں امن و سکون کا دن نہیں دکھایا جا سکتا۔ اتنے طویل دورانیہ میں ملک میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ جنہوں نے اس حکومت کو قائم کیا تھا اب وہ اس سے اپنا ہاتھ کھینچ رہے ہیں اور یہودی ذلت و خواری کے ساتھ اپنے دشمنوں سے ہاتھ ملانے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اسرائیل ایک چھوٹا سا ملک مزید چھوٹا ہو رہا ہے اور ان کا یہ عارضی اقتدار اب خطرے میں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یروشلم ہمیشہ یہودیوں کا مقتل بنا ہے۔ یہ سرزمین ہمیشہ یہودیوں کے خون کی پیاسی رہی ہے۔ جب یہ

زمین پیاسی ہوتی ہے تو یہودیوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور پھر ان کا قتل عام ہوتا ہے۔ اور یہ زمین سیراب ہوتی ہے۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ نہ جانے کتنے یہودی روزانہ مارے جاتے ہیں اور اس زمین کی پیاس بجھتی ہے۔ اب پھر صلاح الدین ایوبی کا دور واپس آیا ہی چاہتا ہے کہ ایک ایک یہودی قتل ہوگا اور ایک مدت دراز کے لیے یروشلم کی زمین ان کے خون سے سیراب ہو جائے گی۔ فلسطینیوں کا قتل عام کرنے والے، ان کو دہشت گرد قرار دینے والے آج ان کا حق تسلیم کرنے اور انہیں حاکم ماننے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ذلت وخواری نہیں تو کیا ہے۔ پس قرآن کریم کا اعلان حق ثابت ہوا۔

اسی طرح یہودیوں پر مسکنت، غربت ومحتاجی کا اعلان بھی حق ہے کہ اولاً تو یہ پروپیگنڈا ہی یکسر غلط ہے کہ یہودی دنیا کی متمول ترین قوم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی حکومت امریکہ ویورپ کے سہارے ان سے بھیک مانگ کر نہ چلاتے رہتے۔ اور ان کے ملک میں نہ جہالت ہوتی نہ کوئی بھکاری ہوتا۔ دوسرے اگر آپ ان ممالک کے بھکاریوں کی تفصیلات کا مطالعہ کریں جن میں یہودیوں کی بڑی تعداد موجود ہے، تو آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ان بھکاریوں میں اکثریت یہودیوں کی ہے۔ پس ان کی دولت مندی کا غلط ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ ان میں جو دولت مند نظر آتے ہیں وہ بھی بظاہر دولت مند ہیں کہ یہ صرف سودی کاروبار کے ذریعہ اپنی دوکان چمکائے بیٹھے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ یہودیوں سے بڑی سود خور قوم کوئی نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ پوری دنیا کو یہودیوں نے ہی سود کی لعنت میں مبتلا کیا ہے۔ سودی کاروبار کرنے والوں کو اگر آپ باعزت سمجھتے ہیں تو یہ بڑی ہی غلط فہمی ہے۔ پھر تو انسانوں کا خون پینے والا ہر شخص باعزت کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اور ظلم وستم ہی عزت کا ذریعہ سمجھا جانے لگے گا۔

بہرحال قرآن کریم کا اعلان حق ہے کہ یہودی ہمیشہ ہمیشہ ذلت ومسکنت میں مبتلا رہیں گے۔ نزول قرآن سے قبل بھی ان کا یہی حال تھا۔ زمانہ سلیمان علیہ السلام کے تقریباً چار سو برس بعد ایک مصری بادشاہ نے بیت المقدس پر حملہ آور ہو کر یہودیوں کا قتل عام کیا۔ بخت نصر شاہ بابل نے ان کو پسپا کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً ایک ہزار برس قبل انطاکیہ کے بادشاہ نے اس قوم کی خوب مرمت کی۔ چالیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور اتنوں ہی کو غلام بنالیا۔ رومیوں نے انہیں تخت وتاراج کیا۔ غرضیکہ یہودیوں نے ہمیشہ بیت المقدس پر حکومت کرنے اور اس کو اپنی پناہ گاہ بنانے کی کوشش کی، لیکن ہر دور میں ذلیل وخوار ہوتے رہے۔ موجودہ صورت حال ایسی نہیں، جس سے قرآن کے فیصلے پر شک وشبہ کر کے کوئی اپنا ایمان برباد کرے۔ بلکہ یقین کامل کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب حق اپنی عملی صورت میں ظاہر ہو کہ حالات حق پر ہمارے ایمان کو مضبوط سے مضبوط تر کر رہے ہیں۔

غرضیکہ قرآنی ہدایت یہ ہے کہ اہل کتاب چاہے یہودی ہوں یا نصاریٰ زندگی کے کسی شعبے میں ان کی بات نہ مانو۔ یہ نہ کبھی تمہارے ہمدرد ہوئے ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ آج ہماری ذلت وخواری کا بڑا سبب قرآن کی اس ہدایت ہی کی مخالفت ہے کہ ہمارے سیاسی ومعاشی مشیر یہود ونصاریٰ ہیں۔ ہم انہیں اپنا ہمدرد سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان کی حمایت کو ہم نے اپنی قوت وبقاء کا ذریعہ سمجھ لیا ہے، جبکہ حالات وواقعات ثابت کر رہے ہیں کہ ہمدردی کا دم بھرنے والے درحقیقت وہ ڈاکو ہیں جو نہ صرف ہم سے ہماری عزت چھین رہے ہیں بلکہ ہمارے مالی ذرائع پر بھی قابض ہوتے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں مذہبی اعتبار سے بھی

مفلوج وکمزور کررہے ہیں۔ ان کی ہمدردی درحقیقت ہمیں غلام بنانے کی ایک سازش ہے۔ پس اگر ہم اپنی عزت وآبرو، مال و دولت اور دین وایمان کی بقا چاہتے ہیں تو صرف اور صرف قرآنی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں اپنے دشمن کو پہچاننا اور اپنے آپ کو متحد و منظم کرکے اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

یہود ونصاریٰ کی مسلمانوں سے عداوت اہلِ ایمان کو ان سے ہوشیار رہنے اور قطع تعلق کرنے کی ہدایت پر ان شاء اللہ ہم مزید گفتگو سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۱ کے ذیل میں اگلے صفحات پر کریں گے۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

یَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَیَا سَیِّدَ الْبَشَرْ
مِنْ وَّجْہِکَ الْمُنِیرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَرْ!
لَا یُمْکِنُ الثَّنَآءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر



ترجمہ

اے صاحب جمال اور انسانوں کے سردار۔ آپ کے نورانی چہرے سے تو چاند کو روشنی بخشی گئی ہے۔ جیسا کہ آپ کی تعریف کا حق ہے ایسی تعریف ممکن نہیں۔ خدائے ذوالجلال کے بعد آپ ہی سب سے بڑے ہیں۔ یہی مختصر بات ہے۔



مقالہ ۱۴

آل عمران: ۱۰۲ تا ۱۰۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ
اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ
النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ
مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ
وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ (آل عمران: ۱۰۲۔۱۰۵)

اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا، اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو اور مضبوطی سے پکڑلو، اللہ کی رسی اور جدا جدا نہ ہونا۔

اور یاد رکھو اللہ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی کہ تم تھے (آپس میں) دشمن، پس اس نے الفت پیدا

کر دی تمہارے دلوں میں، تو بن گئے تم اس کے احسان سے بھائی بھائی، اور تم (کھڑے) تھے دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تو اس نے بچالیا تمہیں اس (میں گرنے) سے یونہی بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں تا کہ تم ہدایت پر رہو۔

ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت، جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا، اور روکا کرے بدی سے، اور یہی لوگ کامیاب وکامران ہیں۔

اور نہ ہونا چاہیے ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے اور اختلاف کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد بھی جب آ چکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں۔ اور ان لوگوں کے لئے ہے بہت بڑا عذاب۔

اہل ایمان کو زندگی کے وہ اصول بتائے جار ہے ہیں جن کو اپنا کر وہ ایک باعزت و باوقار قوم بن سکتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم تقویٰ ہے۔ جسے ساری زندگی اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی کہ اسی سے باہمی الفت ومحبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ عزت نفس اور عزت انسانیت کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ تہذیب وتمدن کے اصولوں کی پابندی کا خیال رہتا ہے اور یہی خوبیاں اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا گیا اور افتراق میں مبتلا ہونے کی ممانعت کی گئی کہ تقویٰ اختیار کر لینے کے باوجود اجتماعی اور قومی مفاد کے لیے مرکزیت ضروری ہے۔ لہذا امت مسلمہ کا مرکز "اللہ کی رسی" کو قرار دیتے ہوئے اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنے کا حکم دیا گیا اور افتراق جو مقتضائے تقویٰ کے خلاف ہے، اس کی ممانعت کر دی گئی۔ اسی موقع پر یہ بھی یاد دلا دیا گیا کہ دیکھو اسلام سے قبل تم کس طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ بھائی بھائی کا دشمن تھا۔ جونہی اسلام کے دامنِ رحمت میں تم نے پناہ لی سب بھائی بھائی ہو گئے۔ ایک دوسرے پر اپنا جان و مال قربان کرنے لگے۔ اسلام سے پہلے اپنی بد عملی و بدکرداری کے سبب تم جہنم کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ اچانک کسی نے تمہارے سامنے اللہ کی رسی ڈالی اور جونہی تم نے اسے پکڑا تم جہنم کی آگ سے بچ گئے۔ پس اسی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو۔ دنیا وآخرت کی بھلائیاں تمہیں نصیب ہوں گی۔ تقویٰ اور اعتصام بحبلِ اللہ چونکہ ہر دور کے اہل ایمان کے لیے ضروری ہے لہذا ہدایت کی گئی کہ ان اصولوں کی بقا، اشاعت اور تبلیغ کے لئے ہمیشہ ایک ایسی جماعت موجود رہے جو نیکی کی طرف بلانے، بھلائی کے کام کرنے کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کی ذمہ داری پوری کرتی رہے۔ پھر اہلِ ایمان کو نصیحت کی گئی کہ تم ان لوگوں کی طرح تفرقہ میں مبتلا نہ ہو جانا جو روشن دلائل ملنے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے۔ کیونکہ ایسے لوگ عذاب الٰہی کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

آیات کے مفہوم سے آپ نے اندازہ کیا کہ یہاں درحقیقت تین چیزیں بیان کی جا رہی ہیں جو امت مسلمہ کے لئے نہایت اہم ہیں۔ ثمرات ایمان کا ذریعہ ہیں۔

تقویٰ، اِعتصام بحبلِ اللہ، جماعتِ مبلغین

ہم انہی تینوں امور پر قدرے وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

تقویٰ: (معنی ومفہوم)

''تقویٰ'' کا لفظ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع ہے۔ اسی لیے اس کی تعریف میں متعدد اور مختلف اقوال ہیں۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

معصیت پر اصرار کو ترک کرنا اور اپنی عبادات پر اعتماد نہ کرنا، تقویٰ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک:

تقوی یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اختیار نہ کرو، اور یہ یقین رکھو کہ تمام کام اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تقوی یہ ہے کہ لوگ تمہاری زبان پر فرشتے تمہارے اعمال میں اور مالک عرش تمہارے باطن میں عیب نہ دیکھے۔

حضرت علامہ واقدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

تقویٰ یہ ہے کہ جس طرح تم مخلوق کے لیے اپنے ظاہر کو مزین کرتے ہو اسی طرح تم اپنے باطن کو اللہ کے لیے مزین وآراستہ کرلو۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تقوی دو قسم کا ہے ظاہری اور باطنی۔ ظاہری تقوی یہ ہے کہ تیرا ارادہ اور ہر حرکت اللہ کے لیے ہو اور باطنی تقویٰ یہ ہے کہ تیرے دل میں اللہ کے سوا کسی کا دخل ممکن نہ ہو۔

حضرت یونس بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تقویٰ ہر مشتبہ چیز سے بچنے اور ہر لمحہ اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کو کہتے ہیں۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تقویٰ سے زیادہ آسان چیز میں نے نہیں دیکھی کہ جو چیز دل میں کھٹکی اس کو میں نے چھوڑ دیا۔ جیسا کہ نبی مکرم علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ'' جس چیز کے حلال ہونے میں تمہارے دل میں شبہ ہو، اس کو چھوڑ دینا ہی تقویٰ ہے''۔

حضرت محمد بن حنیف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

تقوی نام ہے ہر اس چیز سے کنارہ کش ہونے کا، جو اللہ سے دور کر دے۔

حضرت قاسم بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تقویٰ آداب شریعت کی حفاظت کا نام ہے۔

یہ تھے چند اقوال اسلاف کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے، جن کا ماخذ قرآن وحدیث ہے۔ الفاظ وعبارت میں اختلاف ہے لیکن سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ جس کو سمجھنے کے لیے درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

ضیاء الامت پیر کرم شاہ صاحب تفسیر ضیاء القرآن میں رقمطراز ہیں:

''تقویٰ کا لغت میں تو یہ معنی ہیں ''جَعْلُ النَّفْسِ فِیْ وِقَایَةٍ مِمَّا یَخَافُ'' نفس کو ہر ایسی چیز سے محفوظ رکھنا جس سے ضرر کا اندیشہ ہو۔ اور عُرفِ شرع میں تقویٰ کہتے ہیں ہر گناہ سے اپنے آپ کو بچانا۔ اس کے درجے مختلف ہیں۔ ہر شخص نے اپنے درجے کے مطابق اس کی تعبیر فرمائی ہے۔ میرے نزدیک سب سے مؤثر اور آسان تعبیر یہ ہے۔ ''اَلتَّقْوٰی اَنْ لَّا یَرَاکَ اللّٰهُ حَیْثُ نَهَاکَ وَلَا یَفْقُدُ حَیْثُ اَمَرَکَ'' یعنی تقویٰ یہ ہے کہ تیرا رب تجھے وہاں نہ دیکھے جہاں جانے سے اس نے تجھے روکا ہے۔ اور اس مقام سے تجھے غیر حاضر نہ پائے جہاں حاضر ہونے کا اس نے تجھے حکم دیا ہے۔

(ضیاء القرآن)

ان تمام ارشادت کا خلاصہ یہ ہوا کہ تقویٰ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کی جائے اور شریعت مطہرہ نے مؤمن کے لیے جو حدود متعین کر دیئے ہیں ان میں رہ کر وہ زندگی بسر کرنے کا عادی ہو جائے۔ یہی تقویٰ ہے۔ جس کا قرآن کریم بار بار اہل ایمان سے مطالبہ کرتا ہے اور اُسے اختیار کرنے کی تاکید فرماتا ہے۔ حتی کہ عبادات کی فرضیت کا منشاء و مقصد بھی اسی تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کی فرضیت اسی لیے ہے کہ ان کی پابندی کرنے والا متقی بن جائے۔ غیب کی جن باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا وہ بھی حصول تقویٰ ہی کا ذریعہ ہیں۔ مثلاً اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر ایمان، بعث بعد الموت، اللہ کے دربار میں حاضری، اعمال کا حساب و کتاب، جزاء و سزا پر یقین وغیرہ یہ تمام عقائد وہ ہیں جن پر یقین کرنے والا از خود متقی بن جاتا ہے۔ جتنا یقین کامل ہوتا ہے اتنا ہی تقویٰ مکمل ہوتا ہے۔

علاماتِ تقویٰ

قرآن کریم کی ابتدائی آیات ہی میں اللہ رب العزۃ نے متقین کی کچھ علامات بیان فرمائیں۔ جن سے تقوی کا مفہوم مزید واضح ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝۳ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ (البقرہ: ۳۔۵)

(متقین وہ ہیں) جو ایمان لائے غیب پر اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں اور (متقین) وہ ہیں جو ایمان لائے اُس پر (اے حبیب علیہ السلام) جو اتارا گیا ہے، آپ پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے، اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں، وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے، اور وہی دونوں جہاں میں کامیاب ہیں۔

یہ علامات و خصوصیات ان متقین کی ہیں جنہیں تقویٰ کا وہ ادنیٰ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو ایمان کا فوری مقتضی اور لازمی نتیجہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر تقوے کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ہر مؤمن اپنی استطاعت کے مطابق اپنے لیے عمارت تعمیر کرتا ہے۔ کسی کی عمارت بہت حسین و خوبصورت اور عالی شان ہوتی ہے اور کسی کی معمولی۔ کوئی اتنا اونچا

پہنچتا ہے کہ اللہ کا محبوب و مقرب، ولی اور دوسروں کا حاجت روا بن جاتا ہے اور کوئی صرف اپنی ذات ہی کے لیے سکون و طمانیت مہیا کر پاتا ہے۔ بہر حال کامیاب دونوں ہی طبقے ہوتے ہیں۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ السَّآىٕلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ (البقرہ:۱۷۷)

نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور سب نبیوں پر اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں۔ اور جو صبر کرنے والے ہیں مصیبت میں اور سختی میں جہاد کے وقت، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں، اور یہی لوگ حقیقی پرہیز گار (متقی) ہیں۔

یہاں بنیادی خوبیوں کے ساتھ ان خوبیوں کا بھی ذکر ہے جن سے تقویٰ کی معمولی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ یعنی اللہ کی رضا کے لیے اپنے مال کو خرچ کرنا، نماز کی پابندی کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، وعدوں کو پورا کرنا اور ہر مصیبت و سختی پر صبر کرنا۔ جو مؤمن اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا اس نے اپنے لیے تقویٰ کا ایسا گھر تعمیر کر لیا جس میں وہ دنیا میں بھی پناہ لے سکتا ہے اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ کے معنی اور متقین کی علامات پر غور کرنے کے بعد یہ واضح ہو گیا ہے کہ در حقیقت تقویٰ اللہ کی خوشنودی حاصل کر لینے کا نام ہے۔ جس کا ذریعہ ہر حال میں شریعتِ مطہرہ کی پابندی ہے۔ جس قدر اس پابندی میں کمال حاصل ہوگا اسی قدر تقویٰ حاصل ہوتا رہے گا۔ حتی کہ مؤمن بندہ ان متقین کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے جو اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔ جنہیں حیات طیبہ نصیب ہوتی ہے۔ جن کو نہ کوئی ڈر ہوتا ہے اور نہ ہی غم، جن کو مژدہ سنایا گیا۔

وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۲۸﴾ (اعراف:۱۲۸)

اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے (مخصوص ہے)

فوائدِ تقویٰ

مؤمنین سے تقویٰ مطلوب ہے۔ جس کا قرآن کریم بار بار نہایت تاکید کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہ اس قدر اہم کیوں ہے، اس کا فائدہ کیا ہے، اگرچہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل کا عہد اور عزم کر لینے کے بعد کسی بھی عمل کے فائدے کو معلوم کرنے کا خیال غیر ضروری ہے کہ اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ بندہ اپنے مالک کے

احکام کا پابند ہے لیکن یہ کرم ہے رب کریم کا کہ اس نے اپنے احکام کے فوائد بھی بیان فرما دیئے تاکہ تعمیل کرنے والا زیادہ امتحان میں مبتلا نہ ہو۔ بلکہ عمل کا فائدہ جان لینے کے بعد وہ مزید شوق و ذوق کے ساتھ عمل کرتا رہے۔ پس تقویٰ جو اعمال کا مجموعہ ہے، قرب الٰہی کا زینہ ہے اس کے بے شمار فوائد بیان کیے گئے۔ چند ملاحظہ ہوں۔

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ (البقرہ:۲۱۲)

آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لیے دنیا کی زندگی اور یہ مذاق اڑاتے ہیں ایمان والوں کا، حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے قیامت کے دن اور اللہ روزی تو جسے چاہے بے حساب دیتا ہے۔

آیت مبارکہ میں ''کفروا'' سے مراد، صرف اللہ اور رسول کے منکرین ہی نہیں ہیں۔ بلکہ اس دائرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر تکبر کرتے ہیں اور اس کے احسانات کا انکار کرتے ہیں۔ ان سب کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی دولت، عزت و شہرت اور قوت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت شعار بندوں کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے واضح الفاظ میں ان لوگوں کو بتایا کہ جنہیں تم اس فانی دنیا میں فانی چیزوں کا سہارا لے کر حقیر سمجھ رہے ہو۔ کل قیامت کے دن ان متقین کی شان دیکھنا کہ یہ تم سے بہت بلند ہوں گے رہی یہ بات کہ دنیا میں تمہارے پاس دولت بہت ہے۔ تو یہ کوئی معیارِ فضیلت و عزت نہیں، یہ تو ہماری حکمت ہے۔ کہ ہم جسے چاہتے ہیں بے بہا بغیر حساب دولت دیتے ہیں۔ پس حصول دولت تمہارا کمال نہیں جس پر تم ناز کرتے ہو۔ ہاں حصولِ تقویٰ مومنین کا کمال ہے، جس کا انہیں ضرور اجر ملے گا۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۷﴾ (النساء:۷۷)

(اے حبیب علیہ السلام) فرما دیجئے دنیا کا سامان بہت قلیل ہے (جس پر تم ناز کرتے ہو) اور آخرت زیادہ بہتر ہے، اس کے لیے جو تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہے اور نہیں ظلم کیا جائے گا تم پر کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر۔

غرضیکہ تقویٰ کا فائدہ تو قیامت میں نظر آئے گا جب اس دنیا کے متکبرین چند روزہ زندگی اور معمولی ساز و سامان پر ناز کرنے والے ذلیل و خوار ہوں گے اور متقین اللہ کے فضل و کرم پر ناز کرتے ہوئے جھوم رہے ہوں گے، کامیابی و کامرانی ان کے قدم چوم رہی ہوگی، ان کے لیے خوشخبری ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۷﴾ (التوبہ:۷)

بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۳۶﴾ (التوبہ:۳۶)

اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

دنیا و آخرت کی بھلائیوں کے حصول کا ذریعہ تقویٰ ہے۔ پُر فضا جنت متقین کا ٹھکانہ ہے۔ موت کے وقت سہولت و

آسانی اور عزت افزائی ان پر اللہ کا خصوصی کرم ہے۔ ملاحظہ کیجیے ارشاد باری تعالیٰ اور قدم اٹھایئے، منزل تقویٰ کی طرف۔

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾ (النحل: ۳۰-۳۲)

اور پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے، کہ وہ کیا ہے جو اتارا تمہارے رب نے انہوں نے کہا (سراپا) خیر جنہوں نے اچھے کام کیے، اس دنیا میں بھی ان کے لیے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بھی ان کے لئے بہتر ہے اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر (ان کے لئے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں، جن میں وہ داخل ہوں گے رواں ہوں گی، ان کے نیچے نہریں، ان کے لیے وہاں ہر وہ چیز ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یوں بدلہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں۔ (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو) سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں ان (نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے۔

کیا عظیم فائدہ ہے تقویٰ کا کہ موت ہی کے وقت جنت میں داخل ہونے کی خبر مل گئی۔ اب حشر کے دوران حساب و کتاب کا کیا خوف باقی رہا۔ اور جس جنت میں دخول کی خبر دی گئی وہ اس دنیا کے محلات اور عالی شان مکانوں جیسا کوئی مکان نہ ہوگا۔ بلکہ

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾ (الزمر: ۲۰)

البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے، ان کے لیے بالا خانے ہیں جن کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں، رواں ہیں جن کے نیچے نہریں یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے جس کے حصول کا ذریعہ تقویٰ ہی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۰﴾ (حجرات: ۱۰)

اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

تقویٰ کے یہ فوائد اُخروی ہیں جو بلا شبہ عظیم ہیں کہ اس سے بڑی اللہ کی کوئی نعمت نہیں کہ بندے کو آخرت کی نجات اور کامیابی و کامرانی کا یقین ہو جائے۔ لیکن اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو دنیاوی طور پر بھی بالکل محروم نہیں رکھا۔ اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے صلہ میں دنیاوی فوائد کا بھی وعدہ فرمایا۔ تقویٰ اختیار کرنے والوں سے رزق کی فراوانی اور مصائب

سے نجات مشکلات میں آسانی کا وعدہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ

(الطلاق:۳)

اور جو ڈرتا رہتا ہے اللہ سے بنا دیتا ہے، اللہ اس کے لیے نجات کا راستہ اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے، جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا ﴿۴﴾ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ﴿۵﴾

(الطلاق:۴،۵)

اور جو ڈرتا رہتا ہے اللہ سے تو وہ اس کے کام میں آسانی پیدا فرما دیتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور جو ڈرتا رہتا ہے اللہ سے اللہ دور کر دیتا ہے اس کی برائیوں کو اور (قیامت کے دن) اس کے اجر کو بڑا کرے گا۔

مشکلات سے نجات، رزق میں فراخی، مہمات میں آسانی کا ذریعہ تقویٰ قرار دیا جا رہا ہے۔ پس اہلِ ایمان اگر اللہ کے حکم کے مطابق تقویٰ اختیار کر لیں تو دنیا کی یہ نعمتیں ان کا مقدر ہیں۔ یہ اس رب کا وعدہ ہے جو اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا۔ ہم اگر اپنے اسلاف کے حالات زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ حقیقت کھلم کھلا نظر آتی ہے، کہ انہوں نے تقویٰ ہی کے ذریعہ دشمنوں کے خوف بیماریوں کے دکھ اور ہر قسم کی مشکلات سے نجات پائی انہیں اس طرح رزق نصیب ہوتا رہا کہ وہ بھی نہ جان پاتے تھے کہ یہ ابر رحمت کس طرف سے برس رہا ہے۔ بڑی بڑی مہمات کو انہوں نے اللہ ہی کے دربار میں سربسجود ہو کر سر کیا۔ اسی لئے انہیں عزت نصیب ہوئی۔ وہ باوقار زندگی بسر کرتے رہے۔ دنیا والوں پر ان کا رعب و دبدبہ قائم رہا اور اگر آج ہم اپنی حالت پر غور کریں اور اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو سب کچھ اس کے برعکس ہے۔ ہم پر مشکلات آتی ہیں تو اللہ کے دربار میں اپنے گناہوں کی توبہ کرنے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرنے کے بجائے ہم مزید مکر و فریب اختیار کرتے ہیں اور مکڑی کے جالوں کا سہارا لے کر مشکلات سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا انجام ہمارے سامنے ہے کہ مشکلات کم نہیں ہوتیں، بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح حصولِ دولت کے لیے ہم کیا کچھ نہیں کرتے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے علاوہ سارے جتن کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ حلال و حرام کا امتیاز بھی نہیں رکھتے۔ آج حصول دولت کے بڑے ذرائع سود، رشوت ہے جسے اہلِ ایمان کے لیے حرام قرار دیا گیا۔ لیکن ہمیں اس کی کیا پروا۔ ہماری نظر تو صرف اور صرف دولت کے ڈھیروں پر ہے۔ یہی حال ہماری انفرادی و اجتماعی مہمات کا ہے، جن کے لیے ہم اپنی قوت و طاقت یا تدابیر پر کلی اعتماد کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف رجوع کرنا کسرِ شان سمجھا جاتا ہے۔

دوستو! جب تک امت مسلمہ کے پاس تقویٰ تھا تو عزت و عظمت، وقار، رعب، دبدبہ، دولت ہر میدان میں کامیابی و بلندی، سب کچھ تھا۔ اور جونہی مسلمان اس ہتھیار سے محروم ہوا اور مادی ہتھیاروں پر اعتماد کرنے لگا وہ ہر چیز سے محروم ہو گیا۔ دیکھ لیجئے آج (۱۹۹۵ء) مسلمانوں کے لیے کیسا ذلت و خواری کا دور ہے، ہر طرف مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا

ہے، انہیں دہشت گرد اور بنیاد پرست کہا جا رہا ہے۔ لیکن نہ کوئی مسلم حکومت صدائے احتجاج بلند کر سکتی ہے اور نہ ہی سونے کی کانیں اور تیل کے کنوئیں کام آ رہے ہیں۔ تقویٰ چھوٹا تو سب کچھ ہونے کے باوجود ہم محتاج ہیں، بھکاری ہیں۔ کاش ہم قرآن پر غور کریں اللہ کے وعدے پر اعتماد کریں تو پھر ہمارے دن واپس آ سکتے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

جَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتْلُوْا عَلٰى هٰذِهِ الْاٰيَة "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" حَتّٰى فَرَغَ مِنَ الْاٰيَةِ ثُمَّ قَالَ يَا اَبَاذَرٍّ! لَوْ اَنَّ النَّاسَ كُلَّهُمْ اَخَذُوْا بِهَا كَفَتْهُمْ۔

حضور علیہ السلام نے مجھے یہ آیت سنائی "وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" اور جب آپ فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا، اے ابوذر! اگر سب لوگ اس پر عمل کرنے لگیں تو یہ آیت ان سب کے لئے کافی ہے۔ (ابن کثیر)

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ، میرے بیٹے کو دشمنوں نے قید کر لیا ہے۔ اس کی ماں سخت بے چین و پریشان ہے۔ حضور فرمائیے میں کیا کروں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اِتَّقِ اللّٰهَ وَاصْبِرْ وَ اٰمُرُكَ وَ اِيَّاهَا اَنْ تَسْتَكْثِرَ مِنْ قَوْلِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ اللہ سے ڈرو، صبر کرو، میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو حکم دیتا ہوں کہ تم کثرت سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد کیا کرو۔ ارشاد نبوی سن کر عوف واپس آئے اور بیوی کو حضور علیہ السلام کا حکم سنایا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا کہ آپ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ بہت عمدہ ہے۔ پھر دونوں نے اس وظیفہ کا ورد شروع کر دیا جس کی برکت سے اللہ نے عوف کے بیٹے کی رہائی کا سبب پیدا فرمایا کہ دشمن ان کی نگرانی سے غافل ہو گئے اور وہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلے۔ ساتھ ہی دشمن کی بہت سی بھیڑ بکریاں بھی ہانک لائے اور بخیر و عافیت گھر پہنچے۔ (ماخوذ از ضیاء القرآن)

اگر یقین کامل ہو تو تقویٰ ایسا تیر بہدف عمل ہے، جس سے دنیا و آخرت میں کامیابی، کامرانی میسر آتی ہے۔ مشکلات و آفات دور ہوتی ہیں۔ غربت و تنگدستی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ خوشحالی نصیب ہوتی ہیں۔ دنیا کے دشوار کام سہل و آسان ہو جاتے ہیں۔ تقویٰ سے باہمی نفرتیں اور عداوتیں مٹتی ہیں۔ محبت و الفت سے بھری پر سکون زندگی میسر آتی ہے۔ متقیوں کے چہرے، نور ایمان سے چمکتے ہیں۔ ان میں اپنوں کے لیے کشش اور دشمنوں کے لیے رعب ہوتا ہے۔ متقی ہی اللہ کے نزدیک مکرم و معزز ہوتے ہیں، وہی اللہ کے مقرب اور مخصوص بندے ہیں۔

تقویٰ، انبیاء و اولیاء کی رفعت و بلندی کا ذریعہ ہے۔ جبکہ انبیاء کا تقویٰ وہبی اور عطیہ الٰہی ہوتا ہے۔ اور اولیاء و صالحین کا کسبی یعنی اپنے ریاض و مجاہدے سے حاصل کردہ ہوتا ہے۔ پس جو تقوے کی نعمت سے مالا مال ہو کر دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کا خواہاں ہے، اسے متقین کے دامن سے وابستہ ہونا چاہیے۔

اعتصام بحبل اللہ

''اعتصام'' کسی چیز کو اس قدر مضبوط پکڑنا کہ کسی حال میں چھوٹنے نہ پائے۔''حبل'' رسی آیت مبارکہ میں حکم دیا جا رہا ہے کہ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو''۔حضرت علی، ابن مسعود، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم نے نبی مکرم علیہ السلام کا ارشاد بیان کیا کہ ''حَبْلُ اللّٰهِ الْقُرْآن''اللہ کی رسی قرآن ہے۔بعض حضرات نے دین اور بعض نے نبی مکرم علیہ السلام کی ذات مقدس کو اللہ کی رسی قرار دیا۔تینوں باتوں کا مفہوم ایک ہی ہے کہ قرآن وسنت ہی کا مجموعہ دین ہے۔اور ارشاد باری تعالیٰ کا منشاء یہی ہے کہ دین وشریعت کی پابندی کرتے رہو، دیگر آیات میں اسی حکم کا اس طرح اعادہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَ سَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ (النساء:۱۴۵۔۱۴۶)

بیشک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔دوزخ (کے طبقوں میں) سے اور ہرگز نہ پائے گا تو ان کا کوئی مددگار، مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ کا (دامن رحمت) اور خالص کر لیا اپنا دین اللہ کے لئے، تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں۔اور عطا فرمائے گا اللہ مومنوں کو اجر عظیم۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ (الحج:۷۸)

پس صحیح صحیح ادا کیا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ، اور مضبوط پکڑ لو اللہ کا (دامن رحمت)

ان دونوں آیتوں میں،''اعتصام باللہ'' یعنی اللہ کو مضبوط پکڑنا۔اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنا۔اللہ کو مضبوط پکڑنا۔دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔یعنی'' دین کا پابند ہونا، اس ارشاد کا فائدہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ (آل عمران:۱۰۱)

جو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اللہ (کے دامن رحمت) کو تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ تک۔

جس نے اللہ کو مضبوط پکڑ لیا، یعنی دین کا پابند ہو گیا وہ اُس صراط مستقیم کو پالے گا جو اُسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔یعنی اس کی دنیا بھی بن جائے گی اور آخرت بھی۔اللہ اور اس کے رسول کی اُسے خوشنودی نصیب ہو جائے گی۔اِسی مفہوم کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ (النساء:۱۷۵)

تو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ (کی رسی) کو تو عنقریب داخل کرے گا انہیں اپنی رحمت اور فضل میں اور پہنچائے گا انہیں اپنی طرف لے جانے والی سیدھی راہ پر۔

اب آیت زیر گفتگو کا مفہوم واضح ہے کہ پوری امت مسلمہ کو متحد و منظم کرنے کے لیے ایک قانون، ایک نظام حیات پر متفق ہونے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس حکم کی تعمیل نہ کرنے کی صورت میں جو تفرقہ پیدا ہوتا ہے اس میں مبتلا ہونے کی واضح ممانعت فرمائی گئی۔ ارشاد ہوا ''وَلَا تَفَرَّقُوْا'' اور فرقوں میں نہ بٹو کہ افتراق قوم کی تباہی، ذلت و خواری کا باعث بنتا ہے۔ فرمایا گیا:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (انفال:۴۶)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نہ جھگڑو، ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور اکھڑ جائے گی تمہاری ہوا اور صبر کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

''اِعتصام'' ہو یا ''اطاعت'' دونوں ایک ہی ہیں۔ ان سے روگردانی کمزوری اور تباہی کا سبب ہے۔ حقیقت میں یہ وہ نسخہ کیمیا ہے جو قوم کو متحد و منظم کر کے ایک آہنی دیوار بنا دیتا ہے۔

اِتحاد

قومی اتحاد کی کشش اور اس کے بہترین نتائج ایک نا قابل انکار حقیقت ہیں۔ اسی لیے ہر دور میں اس کے حصول کی کوششیں جاری رہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اس گوہر نایاب کو تلاش کرنے کے لیے غوطہ زنی کرتے رہے۔ ماضی میں وہ کامیاب ہوئے یا ناکام رہے، اس سے قطع نظر ہم اپنے دور کا اگر مشاہدہ کریں تو تسلیم کرنا پڑے گا

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اتحاد کے حصول کے لئے آج کیا کیا جتن نہیں ہو رہے۔ پانی کی طرح اس مقصد کے لئے دولت بہائی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی تنظیمیں قائم ہیں۔ ملکی سطح پر نت نئے ناموں سے جماعتیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن انجام کار جو اتحاد کا نعرہ بلند کرتا میدان میں آتا ہے وہ خود ہی ایک پارٹی بن جاتا ہے۔ اور افتراق میں اضافہ کے سوا کوئی کارنامہ انجام نہیں دے پاتا۔ ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالیے یا اپنے گرد و پیش پر کہیں کسی ملک اور کسی قوم میں آپ کو اتحاد نظر نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چند لوگ مل کر اتحاد کا فارمولا وضع کرتے ہیں اور پوری دنیا کو اس پر لبیک کہنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جبکہ دوسرے لوگ کوئی اور فارمولا پیش کر دیتے ہیں۔ اسی طرح پارٹیاں بنتی رہتی ہیں، قائم رہتی ہیں اور مقصد حاصل نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ کسی انسان یا کسی گروہ کا بنایا ہوا نظام یا دستور العمل کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ اس کو پوری قوم یا ملک کے تمام لوگ قبول کر لیں، یہ صرف آفاقی نظام اللہ کے عطا کردہ اصولِ زندگی ہیں جو ہر قسم کے ذہنوں کے لئے قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ خالق سے بہتر اپنی مخلوق کی فطرت کو کوئی نہیں جان سکتا۔ پس خالقِ انسان نے انسان کی فطرت کے عین مطابق نظامِ حیات عطا فرمایا۔ جو اس سے روگردانی کرتا ہے درحقیقت اس کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہیں، اسی لیے قرآن کریم منکرین کو جانوروں سے بدتر قرار دیتا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۡ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ

اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا٘ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَاؕ اُولٰٓىٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّؕ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۝ (الاعراف:۱۷۹)

اور بیشک ہم نے پیدا کئے ہیں جہنم کے لیے بہت سے جن اور انسان ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے، ان کی آنکھیں (تو) ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں ان سے، ان کے کان (تو) ہیں لیکن وہ سنتے نہیں ان سے، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، یہی لوگ تو غافل ہیں۔

اتحاد جو انسان کی اہم ترین ضرورت بھی ہے اور ہر شخص اس کا خواہاں اور متلاشی بھی ہے۔ اسلام اس کے حصول کا نہایت آسان طریقہ بتاتا ہے کہ آفاقی نظام حیات کو مضبوطی سے پکڑلو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں دین کے پابند ہو جاؤ۔ اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو پس تم متحد ہو جاؤ گے اور دشمن کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے زیادہ مضبوط ثابت ہو گے۔ اگر آج ہم اپنے افتراق وانتشار کے اسباب پر غور کریں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایمان کے دعوے کے باوجود ہم اپنی زندگی کے اکثر شعبوں میں دین سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہم نے اپنے معاشی نظام کی بنیاد سود کو بنا رکھا ہے۔ معاشرتی طور طریقے مغربی تہذیب کے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے حکام یا تو اپنے انداز فکر کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، یا غیر مسلموں کے اشاروں پر ہمیں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرز زندگی اور دین سے دور ہونے کی سزا ہمیں یہ مل رہی ہے کہ ہم دولت کی فراوانی، اڑتالیس ملکوں سے زیادہ پر حکمرانی، اور سائنس اور دور حاضرہ کے دیگر علوم میں کامرانی کے باوجود حقیر ہیں، خوار ہیں۔ غیر مسلموں کے در کے بھکاری ہیں۔ سیاسی ومعاشی اعتبار سے غیروں کے غلام ہیں۔ دہشت گرد کہلاتے ہیں۔ رجعت پسند، بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ اے اللہ تو ہی ہمارے حال پر رحم فرما اور اپنی رسی کو مضبوط پکڑنے کی توفیق و ہمت عطا فرما۔

ضروری وضاحت

یہاں ہم دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں جن سے بہت سے شکوک وشبہات رفع ہو جائیں گے۔ جو اتحاد کی خواہش رکھنے والوں کے ذہنوں میں اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

اولاً، یہ کہ آیتِ مبارکہ میں خطاب اہلِ ایمان کو ہے۔ یعنی مؤمنین کو خصوصی طور پر حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ کی رسی کو پکڑ کر متحد ہو جاؤ اور مؤمنین ہی کو افتراق سے باز رہنے کی ممانعت کی جا رہی ہیں یعنی مطلوب قرآنی "اتحاد بین المسلمین" ہے تمام انسانوں، مسلم وغیر مسلم کو متحد کرنا مقصود نہیں کیونکہ اسلام وکفر تو ضدین ہیں، ان کا اجتماع تو اسی طرح ناممکن ہے جس طرح دن، رات یا روشنی اور تاریکی کا۔ اسلام نور ہے جو ظلمت وتاریکی یعنی کفر کو اپنے اندر جذب کر کے اس کا خاتمہ تو کر سکتا ہے لیکن اس کے وجود کی بقا کے لیے اس سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ پس مؤمنین کو غیر مؤمنین کے ساتھ اتحاد کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے۔ اسلام کا پیغام عام انسانوں کے لیے ہے، وہ سب کو ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن اس کے احکام اور ان کی برکتیں انہی خوش نصیبوں کے لیے ہیں جو اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ واضح قرآنی فیصلہ ہے کہ مؤمنین ایک قوم ہے جس کی وحدت کا مرکز "حبل اللہ" یعنی قرآن ہے جبکہ کافر ایک علیحدہ قوم ہے۔ جس کا "حبل اللہ" سے کوئی تعلق وواسطہ نہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۝

(تغابن: ۲)

(اللہ) وہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا، پھر تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن اور اللہ تم جو کرتے ہو خوب دیکھ رہا ہے۔

یہی دوقومی نظریہ کہلاتا ہے جس کی بنیاد پر اہلِ اسلام کو کفار سے علیحدہ اپنی حکومت قائم کرنے اور اپنی مملکت کی حدود متعین کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ اپنے ملک میں اسلامی نظام نافذ کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق آزادانہ پُرسکون زندگی بسر کر سکیں اور اگر وہ یہ نہیں کرتے تو پھر مسلم مملکت کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

بہرحال اتحادِ امت مسلمہ کا مطلوب ومقصود ہے۔ جس کے لیے اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا گیا۔ یہ ذہن نشین رہے کہ بات اہل ایمان کی ہو رہی۔ ہر کلمہ پڑھنے والے کی نہیں، کیونکہ ایمان کے دعویدار ایسے بے شمار ہیں جو کلمہ پڑھتے ہیں بظاہر عبادتیں کرتے ہیں، مسلمانوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن کسی ایسے عقیدے کے منکر ہیں جو قرآن وسنت سے واضح طور پر ثابت ہے۔ یہ شرعاً اہل ایمان میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اور ان سے اتحاد تو درکنار، کسی قسم کے تعلق کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ مثلاً وہ لوگ جو حضور علیہ السلام کے خاتم النبیین ہونے کے منکر ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے اور دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کا انکار کرتے ہیں، جنت ودوزخ، جن وملائکہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ نبی مکرم علیہ السلام کی شان میں بیباکانہ گستاخی کرتے ہیں اور اسی قسم کے تمام باطل فرقے جن کے مرتد ہونے پر امت کا اجماع ہے، دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ان سے اتحاد کی خواہش یا تو وہ کر سکتا ہے جو قرآن وسنت سے قطعاً نابلد ہو اور یا انہی جیسا کوئی بے دین یہ تصور بڑا ہی غلط اور دین کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے کہ ''ہر کلمہ گو مسلمان ہے'' لہٰذا کسی کلمہ پڑھنے والے کو کافر یا مرتد نہ کہا جائے۔ غرضیکہ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ کر متحد ہو جانے کا حکم صرف ان مؤمنین کے لیے ہے جو قرآن وحدیث کے مطابق مؤمن ہیں۔

دوسری وضاحت یہ ضروری ہے کہ آیت مبارکہ میں ''اعتصام'' کے بعد افتراق کی ممانعت کی گئی ہے جس کے لئے ''وَلَا تَفَرَّقُوْا'' ارشاد ہوا، افتراق اور اختلاف میں بہت فرق ہے۔ افتراق ایسی گروہ بندی ہے جس کی بنیاد انانیت اور نفسانیت ہو جس کی انتہا یہ ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے ایمان، عزت وآبرو، جان ومال کا دشمن ہو جائے اور ہر گروہ اپنی بقا کے لیے قتل وغارت تک سے گریز نہ کرے۔ اس افتراق کا انجام سوائے تباہی کے کچھ نہیں۔ قرآن کریم اس کی ممانعت فرماتا ہے، لیکن اختلاف کی ممانعت نہیں۔ کہ نظریاتی اختلاف یا اختلاف رائے ایک فطری عمل ہے، جس پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اگر اس میں انانیت اور نفسانیت کا عنصر شامل نہ ہو اور قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے ہو تو یہ مضر نہیں بلکہ نبی مکرم علیہ السلام کے ارشاد ''اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ'' کے مطابق مفید، باعث رحمت ہے۔ قرآن وحدیث میں جن احکام ومسائل یا عقائد کی وضاحت نہیں ان کو سمجھنے میں ہر دور میں اختلاف رہا ہے اور ہر ذی علم نے اپنی اپنی فہم کے مطابق اس کی تعبیر کی ہے۔ جو تعبیر قرآن وسنت سے ہٹ کر کی گئی وہ مردود اور ناقابل عمل رہی لیکن جو تعبیرات قرآن وسنت کی روشنی میں کی گئیں وہ

مختلف ہونے کے باوجود مبرور اور قابل عمل رہیں۔ یہی صورت آئمہ اربعہ کے اختلاف میں موجود ہے کہ انہوں نے شرعی مسائل کی قرآن وسنت اور عمل صحابہ کی روشنی میں واضح صورت امت کو پیش کی۔ جس نے جو بھی طریقہ عمل متعین کیا وہ بلاشبہ حق اور صحیح ہے۔ یہ امت میں افتراق نہیں بلکہ اختلاف رائے ہے جس کے سبب قرآن وحدیث پر غور وفکر اور تحقیق کا دروازہ کھلا اور نت نئے پیش آمدہ مسائل کا حل مل سکا۔ اگر اس اختلاف پر پابندی عائد کر دی جاتی تو دین منجمد ہو کر رہ جاتا اور بیشتر مسائل پر عمل کی کوئی صورت نہ نکلتی۔ اسی طرح بعض عقائد کی تعبیر میں اختلاف ہوا اور آج تک ہے۔ لیکن اگر اس کو افتراق کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو مضر نہیں بلکہ مفید ہے۔ فقہی اختلاف اور عقائد کے اختلاف کے سبب اگر کسی امام کی اقتداء میں کوئی نماز نہیں پڑھتا تب بھی اس سے امت کے اتحاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ان اختلافات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گھر میں بسنے والے چند افراد کے درمیان امور خانہ میں اختلاف ہو۔ لیکن دشمن کے مقابلے میں وہ سب متحد نظر آئیں۔ اور مل کر اپنے گھر کی حفاظت کریں۔ امت کے درمیان مسائل وعقائد کا چاہے کتنا ہی اختلاف ہو، لیکن قرآن وحدیث کے واضح احکام پر اتفاق ہو اور دین کی حفاظت کے لیے سب متحد ہوں تو ''ولا تفرقوا'' کی قرآنی ممانعت پر عمل ہو جاتا ہے۔

جماعتِ مبلغین

آیت مذکورہ میں ایک ایسی جماعت کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا ہے جو احکام دین کی تبلیغ ودعوت کی ذمہ داری پوری کرتی رہے۔ کیونکہ قرآن کا پیش کردہ نظامِ حیات کسی قوم کے ساتھ مخصوص یا وقت کے ساتھ محدود نہیں۔ یہ بنی نوع انسان کے لئے تا قیامت پیغامِ ہدایت ہے۔ جبکہ انبیاء ورسل کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا۔ پس اس پیغام کی اشاعت وتبلیغ کے لئے ایسی جماعت کا ہر دور میں ہونا ضروری ہے جو لوگوں کو اس پر عمل کی دعوت دیتی رہے۔ انہیں نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے جو ہر شخص کو نہیں سونپی جا سکتی۔ بلکہ اس عظیم اور مشکل کام کے لئے ایک مخصوص جماعت ہونا چاہیے جو اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے اپنے آپ کو اس کا اہل بنائے۔ یعنی وہ علم دین پر پوری طرح عبور حاصل کرے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (توبہ:۱۲۲)

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مؤمن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے تو کیوں نہ نکلیں ہر قبیلہ سے چند آدمی تا کہ تفقہ حاصل کریں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تا کہ وہ نافرمانیوں سے بچیں۔

آیت مختصر ہے لیکن اس میں جماعت مبلغین کے قیام کا طریقہ، مبلغین کی قابلیت وصلاحیت اور ان کی ذمہ داری کو بیان کر دیا گیا۔ کہ یہ ذمہ داری ہر شخص کی نہیں کہ وہ تبلیغ کے لئے نکل کھڑا ہو۔ اس طرح تو تمام دنیاوی نظام برباد ہو جائے گا، نہ کوئی تجارت کرے گا، نہ زراعت کی اہم ذمہ داری سنبھالے گا۔ وہ نظامِ حیات کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے جو اپنے ماننے والوں کو صرف ایک ہی طرف لگا دے۔ اور معیشت ومعاشرت کی دیگر ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ہدایت نہ دے۔ ہاں جو

نظام ہر شخص کو اس کی صلاحیت، ضرورت اور حالات کے مطابق ذمہ داریاں پوری کرنے کی اجازت دے وہ ایک کامیاب اور کامل نظام کہلایا جا سکتا۔ اسی لئے اسلام بعض ذمہ داریاں تو ہر فرد پر عائد کرتا ہے۔ جن کو دوسری ذمہ داریاں پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے لیکن بعض ذمہ داریاں ایسی ہیں جن کو قبول کرنے والا دوسری ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر پاتا۔ پس اسلام نے ایسی ذمہ داریوں کو امت پر بطور فرض کفایہ عائد کیا ہے کہ اگر چند افراد ان ذمہ داریوں کو انجام دے لیتے ہیں تو دوسرے اس فریضہ سے نہ صرف سبکدوش ہو جاتے ہیں بلکہ ثواب میں برابر کے شریک قرار دیے جاتے ہیں۔ تبلیغ ایسی ہی ذمہ داری ہے۔ اس کو انجام دینے کے لئے سب کام چھوڑ کر ہر فرد کو دوڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ چند افراد کا اس اہم کام کو اپنے ذمہ لے لینا پوری امت کی طرف سے کافی ہوگا۔ لہٰذا حکم دیا گیا کہ ہر خاندان و قبیلے سے چند آدمی اس ذمہ داری کے لئے اپنے آپ کو وقف کریں۔ اور اس کام کو انجام دینے کا عزم کریں۔ وہ پہلے اپنے اندر اس کی قابلیت وصلاحیت پیدا کریں کہ کوئی کام قابلیت کے بغیر انجام نہیں دیا جاتا۔ جس طرح ہر شخص ڈاکٹر، ہر شخص وکیل و انجینئر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہرا یرا غیرا مبلّغ بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ''ہر فنِ رارجال'' کے مطابق مبلِّغ وہی شخص ہو سکتا ہے جو قرآن کے مقرر کردہ معیار کے مطابق قابلیت وصلاحیت رکھتا ہو۔

مِعیارِ مبلّغ

قرآن کریم مبلّغ کا جو معیار مقرر کرتا ہے۔ وہ سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت کے ایک جملہ میں بیان کر دیا گیا ''لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ'' تاکہ وہ دین میں تفقہ حاصل کریں۔ یعنی تبلیغ کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے پہلے ''تفقہ فی الدین'' ضروری ہے۔ دین کا علم نہیں کہ علم تو کتابوں کے مطالعہ سے، علماء کی تقاریر سننے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تبلیغ کے لئے کافی نہیں تبلیغ کے لئے ''تفقہ'' کی ضرورت ہے۔ یعنی دین کی سمجھ۔ ایسی قابلیت ہو کہ بوقت ضرورت قرآن و حدیث کی روشنی میں ہر قسم کے مسائل حل کرنے اور ہر قسم کے سوال کا جواب دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یہ قابلیت اسی شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث سے متعلق تمام علوم پر عبور حاصل کرے۔ وہ صرف ونحو کے قواعد سے واقف ہو۔ لغت وادب، فصاحت و بلاغت کے اصولِ جانتا ہو، اصولِ قرآن و اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ جیسے اہم فنون پر اسے پوری طرح عبور ہو کہ یہ تمام علوم ہی ''تفقہ فی الدین'' کا ذریعہ ہیں۔ ان کے بغیر دین کی تبلیغ تو درکنار دین کے بنیادی مسائل سے بھی بخوبی واقفیت ممکن نہیں۔

اللہ رب العزت نے انبیاء کرام علیہم السلام کو تبلیغ دین کی ذمہ داری سونپی تو خود ہی انہیں ''تفقہ فی الدین'' کا ملکہ عطا فرمایا کہ کسی انسان سے اگر وہ یہ قابلیت حاصل کرتے تو اس کا کمال حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ انسان کا علم چاہے کتنا ہی ہو بہرحال نامکمل و ناقص ہوتا ہے۔ جبکہ منصب نبوت کی نسبت سے انبیاء کے لئے علم کامل ضروری تھا۔ حضور نبی کریم علیہ السلام کو خود قرآن کریم نے ''امی'' کہا، لیکن اس کے باوجود آپ کے علم کی کوئی حد وانتہاء نہ تھی۔ یہ فضل الٰہی تھا کہ آپ کو امی ہونے کے باوجود ہر قسم کے علوم سے نوازا گیا اور ''معلمِ کامل'' بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ پس آپ نے تبلیغِ دین کی ذمہ داری پوری کرنے کا حق ادا کیا۔ اور جب آپ نے یہ ذمہ داری اپنے صحابہ کو سونپی تو معجزانہ طور پر ان میں ''تفقہ فی الدین'' کی پوری

پوری صلاحیت بھی پیدا فرمادی کہ انہوں نے نہ اساتذہ سے ہماری طرح علم حاصل کیا، نہ فنون کی کتابیں پڑھیں، لیکن انہی کے بیان کردہ نکات جملہ فنون کی بنیاد قرار پائے۔ اور انہی کے اقوال واعمال پر علم دین کا دارومدار ہے۔ گویا نبی مکرم علیہ السلام کا علم عطیہ الٰہی ہے۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا علم عطائے رسول ہے۔ صحابہ کرام حضور علیہ السلام کی موجودگی میں اور آپ کے بعد جہاں جہاں پہنچے تبلیغ دین کی ذمہ داری پوری کرتے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے یہ فریضہ اپنے بعد والوں کو سونپا۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا، کہ اللہ کا دین قیامت تک کے لئے ہے اس پر عمل کرنے والوں میں تو زیادتی اور کمی ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی۔ لیکن اس کی شعاعوں میں نہ کبھی کمی ہوئی ہے نہ ہوگی، یہ وہ سورج ہے جس پر کبھی بادل نہیں چھاتا۔

بہر حال مطالبہ الٰہی یہ حکم ہے کہ ہر دور میں دین کی تبلیغ ہونا چاہیے۔ اور یہ قرآن ہی کی ہدایت ہے کہ تبلیغ ہر فرد کی ذمہ داری نہیں بلکہ اس کے لئے ایک مخصوص جماعت ہونا چاہئے جنہیں "تفقہ فی الدین" حاصل ہو۔ بحمد اللہ، امت نے ہر دور میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے دینی مدارس قائم کیے۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے بچوں کو وقف کیا۔ اپنی دولت صرف کی اور ایسی جماعت تیار کی جاتی رہی جس کے افراد نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین کا پیغام پہنچایا۔ اپنوں کو نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے روکا۔ غیروں کو توحید قبول کرنے اور دامنِ رسالت میں پناہ لینے کی دعوت دی۔

لیکن افسوس کہ بعض لوگوں نے حکم الٰہی کی غلط تعبیر کی اور مبلغ کے لیے قرآن کے بیان کردہ معیار "تفقہ فی الدین" کو فراموش کر دیا۔ اور ایک "تبلیغی نصاب" بشکل کتاب ہر شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے سر پر تبلیغ کی پگڑی باندھ دی۔ "تفقہ فی الدین" تو درکنار مبلغ کے لئے عام تعلیم کی شرط بھی نہ رکھی گئی۔ ایسے لوگوں تک کو یہ اہم منصب سونپ دیا گیا جو اپنی زبان بھی لکھنا پڑھنا تک نہیں جانتے۔ انہیں تو شخصی ضرورت کے بھی پورے مسائل نہیں معلوم و دیگر اہم مسائل پر گفتگو کیا کر سکتے ہیں۔ کسی سوال کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ بطور ثبوت ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

میں کسی مسجد میں نماز سے فارغ ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک صاحب نے لوگوں کو روکا اور کھڑے ہو کر وضو کا طریقہ بیان کرنے لگے۔ مجمع میں سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت صاحب، دانت میں سے کتنا خون نکلنے پر وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ جواب ملا، بھائی ہم سوالوں کے جواب دینے نہیں آئے بس جو بیان ہو رہا ہے اس پر عمل کیجئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جس شخص کو ایسا معمولی مسئلہ نہیں معلوم اسے تبلیغ کرنے کے لئے نکلنے کی جرات کیسے ہوئی۔ میں کھڑا ہوا، مسئلہ کی وضاحت کی اور ان صاحب سے کہا کہ برائے مہربانی آپ کسی مدرسے میں داخل ہو کر دین کی مکمل تعلیم حاصل کیجئے، پھر مبلغ بنیئے۔

غرضیکہ تبلیغ جیسی اہم ذمہ داری جاہلوں کو سونپ دینا نہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی ہے بلکہ اس عظیم منصب کی تحقیر و تذلیل ہے جو انبیاء کا، صحابہ کا منصب ہے، جو انبیاء کی وراثت ہے اور حضور علیہ السلام نے علماء دین کو اس کا وارث قرار دیا ہے۔ وہی اس منصب کی حفاظت کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ پس جاہل مبلغین کی محفلوں میں شریک ہونا، ان کی باتوں پر توجہ دینا، دین وایمان کے لیے اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کسی اناڑی ڈاکٹر سے علاج کرانا جان کے لیے خطرناک ہے۔ اللہ ایسے لوگوں سے محفوظ رکھے اور علماء کی صحبت ورفاقت نصیب کرے۔

مبلّغ کی ذمہ داری

جو شخص علم دین حاصل کر لینے اور ''تفقہ فی الدین'' کی صلاحیت پالینے کے بعد تبلیغ کرنے کے قابل ہوگیا۔ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے۔ جیسا کہ آیت زیر گفتگو میں مذکور ہے۔ نیز دوسرے مقام پر اسی کا اعادہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔

دعوت الی الخیر ایک عام جملہ ہے۔ جس میں امر بالمعروف، نیکی کا حکم کرنا اور نہی عن المنکر، برائی سے روکنا شامل ہے۔ مبلّغ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ لوگوں کو بھلائی کی طرف مائل کرے اور برائیوں سے متنفر کرے اور اگر ممکن ہو تو ایسی قوت حاصل کرے جس سے وہ امت کو نیکیوں کا پابند کر سکے اور برائیوں سے بچا سکے۔ یعنی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ وہ احکام الہیہ کو نافذ کر سکے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری پوری کرنے کا حق ادا ہو سکے۔ گویا آیہ مبارکہ میں تبلیغ کرنے والوں کو ملکی سیاست میں حصہ لینے کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ کہ کمال تبلیغ یہ ہے کہ معروف کا حکم اور منکر کی نہی کی ذمہ داری قوت و طاقت کے ذریعہ پوری کی جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ مبلّغ بذات خود نیکیوں کو پسند کرے ان پر عمل کرے اور برائیوں سے خود بچے اور ان سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرے۔ جیسا کہ میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ

تم میں سے جو برائی دیکھے اسے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ (مسلم)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اگرچہ مبلّغ کی ذمہ داری ہے لیکن عام طور پر نیکیوں پر عمل اور برائیوں سے نفرت ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے۔ کہ اس کے بغیر وہ تقویٰ حاصل نہیں ہوتا جو اہل ایمان سے مطلوب ہے۔ جس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ عام مسلمانوں کو برائیوں سے نفرت کی تاکید کرتے ہوئے میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا:

مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِىْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِىْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَمُوْتُوْا۔

کسی خاندان کا آدمی ان کے درمیان گناہ کرتا ہے اور وہ اسے روکنے کی طاقت رکھتے ہوں اور نہ روکیں تو اللہ ان سب پر مرنے سے پہلے عذاب نازل فرمائے گا۔ (ابن ماجہ)

غرضیکہ مبلغین یعنی علماء دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ دعوت الی الخیر کا فریضہ جس طرح بھی ہو سکے ادا کرتے رہیں۔ اگر ان کے پاس اقتدار وحکومت کی طاقت ہو تو وہ لوگوں کو قانون کے ذریعہ معروف یعنی نیکیوں کا پابند بنائیں اور برائیوں سے روکیں۔ ورنہ اپنے قلم اور زبان سے اس ذمہ داری کو پورا کریں۔ اور اگر ایسا ناسازگار وقت آ جائے کہ وہ اتنا بھی نہ کر سکیں تو کم از کم برائیوں سے نفرت کریں اور انہیں دل سے برا جانیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حق گوئی اور حق پر عمل کرنا بعض اوقات نہایت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ ایسے مجاہدین سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے سولی کے پھندے پر بھی اس ذمہ داری کو پورا کیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہما کی باوقار شخصیات سے کون واقف نہیں۔ لیکن ان حضرات نے جیل اور کوڑوں کی سزا صرف اور صرف اپنی حق گوئی ہی کے صلہ میں پائی۔ انہوں نے موت کو باطل پرستی پر ترجیح دی۔ ایسے بے شمار حضرات ہیں جن کا تذکرہ تاریخ میں محفوظ ہے اور انہی کے ایثار وقربانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اس دین متین کے وارث وامین ہیں۔ اللہ ہمیں بھی اس کی اشاعت وحفاظت کا حوصلہ عطا فرمائے۔

طریقہ تبلیغ

اسلام کی اشاعت وحفاظت اور بقا کا واحد ذریعہ تبلیغ ہے۔ ''لا اکراہ فی الدین'' کے قرآنی اصول کے مطابق نہ تو کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی طمع یا لالچ کے سبب مسلمان ہونا قابل اعتبار ہے۔ پس تبلیغ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے یہ دینِ مبین اطراف عالم میں پھیلا اور پھیل سکتا ہے۔ نبی مکرم علیہ السلام نے خود اس کا اہتمام فرمایا۔ آپ کے بعد صحابہ کرام نے اور ان کے بعد اسلاف نے سب سے زیادہ اسی پر توجہ دی۔ اسی لیے قرآن کریم نے اس کا نہایت مؤثر اور کامیاب طریقہ متعین فرمایا۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۲۵ (النحل:۱۲۵)

بلاؤ لوگوں کو اپنے رب کی راہ (دین) کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور (بوقت ضرورت) ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کرو جو بڑا ہی پسندیدہ (اور شائستہ) ہو۔ بیشک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جو بھٹک گیا اس کے راستہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو۔

حکمت، موعظہ حسنہ اور پسندیدہ انداز سے مجادلہ، یہ تبلیغ کے مؤثر وکامیاب طریقے ہیں۔ حکمت کے جو معنی بیان کیے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے تبلیغ کا طریقہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اسلامی احکام کو علمی انداز سے ایسے نقلی وعقلی دلائل سے بیان کیا جائے جو مخاطب کی عقل کے مطابق ہوں تاکہ وہ انہیں سمجھ سکے اور قبول کر سکے۔ نیز انداز گفتگو میں موعظہ حسنہ کا لحاظ رہے۔ یعنی مبلغ کا چہرہ پرکشش ہو اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ میں نرمی مخاطب کے لیے اظہار ہمدردی ومحبت ہو۔

اسلام قبول کرنے اور شرعی احکام کی پابندی پر دنیا وآخرت کی کامیابی وکامرانی کی بشارت ہو۔ نہ قبول کرنے والوں کے لئے، افسوسناک وغمناک انداز پر عذاب الٰہی سے اِنذار ہو۔ اندازِ بیان میں فلسفیانہ انداز کی خشکی نہ ہو بلکہ حکیمانہ انداز پر دل لبھانے والی باتیں، دلائل کے ساتھ ہوں۔ یہ ہے حکمت وموعظہ حسنہ جس سے ایک مبلِّغ کامیاب ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخاطب سے بحث ومباحثہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔ اس کو مجادلہ کہا جاتا ہے۔ مبلِّغ کی کوشش تو یہی ہونا چاہیے کہ مجادلہ کی ضرورت پیش نہ آئے لیکن اگر نوبت آ ہی جائے تو اس میں بھی طریقہ احسن اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ یعنی مجادلہ میں اپنی علمی برتری یا افرادی قوت کا مظاہرہ نہ ہو بلکہ نرمی وہمدردی کے ساتھ مخاطب کی بات اور اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صرف حق ثابت کرنا اور اللہ کے دین کو پہنچانا مقصود ہو جس کے لئے بڑی ہی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے حد قوت برداشت درکار ہوتی ہے کہ مخاطب کی کسی بات پر غصہ آنا تو درکنار چہرے پر اس کے اثرات بھی نمودار نہ ہونے پائیں۔

یہ ہے مؤثر وکامیاب طریقہ تبلیغ جو مبلِّغ یہ طریقہ اپنا سکے وہی اس اہم کام کی طرف قدم بڑھائے اور جو اس کا پابند نہ رہ سکے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ دین کی خدمت کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے۔ مبلِّغ اول معلم کامل ﷺ نے اس انداز کو جس کمال کے ساتھ اپنایا اس کی بے شمار مثالیں آپ کی سیرت مقدسہ میں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سخت کلامی کرنے والوں سے نرم گفتگو، عداوت کرنے والوں سے اظہار محبت، ضرورت مند ومحتاج اور مجبور دشمنوں پر شفقت، پتھر برسانے اور زخمی کرنے والوں کے لئے دعائیں اس انداز تبلیغ ہی کا حصہ ہے۔ نیز آپ نے اسی کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَ سَكِّنُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔

آسانی پیدا کرو، مشکل میں نہ پھنساؤ، تسکین دو اور نفرت پیدا نہ کرو۔

اس ارشاد کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ فرمان مبلِّغ کے لیے ایک رہنما اصول ہے کہ حکمت وموعظہ حسنہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مبلِّغ کے اندازِ تبلیغ سے مخاطب یہ محسوس کرے کہ دین پر عمل کرنا آسان ہے۔ اس میں کوئی دشواری نہیں۔ نیز مبلِّغ کی باتیں سن کر اُسے ایسا سکون محسوس ہو جو اسے دین پر عمل کی طرف مائل کرے۔ اس کے دل میں دین کی محبت اور اس پر عمل کا جذبہ پیدا ہو۔ تبلیغ کا ایسا مشکل انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے مخاطب مزید دین سے دور ہو یا متنفر ہو جائے۔ مثلاً ایک صاحب کو ہم نے دیکھا کہ یورپ میں وہ لوگوں کو سختی سے حکم دیتے تھے کہ تقریر نیچے بیٹھ کر سنی جائے، کھانا نیچے بیٹھ کر کھایا جائے۔ چند دن بعد لوگوں نے ان کی محفل میں صرف اس لئے آنا چھوڑ دیا کہ نیچے بیٹھنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ہونا یہ چاہیے کہ جو لوگ دین سے دور ہوں انہیں فرائض وواجبات کی تبلیغ کی جائے۔ جب وہ ان کے پابند ہو جائیں تو سنن ومستحبات پر عمل کی ترغیب دلائی جائے۔ یہی حکمت اور موعظہ حسنہ ہے۔ یہی مطلوب قرآن ہے اور یہی معلم کامل ﷺ کا اسوہ ہے۔ اسی پر عمل پیرا ہو کر صحابہ کرام نے تبلیغ کی اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسلام پھیلایا۔ اسی کو ہمارے اسلاف نے اپنایا اور کامیاب ہوئے۔ اس عنوان کو ہم نے اپنی کتاب ''وراثت انبیاء'' میں مزید تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

دینی تعلیم وتربیت

دینی تعلیم وتربیت بھی درحقیقت تبلیغ ہی کی ایک قسم ہے۔جس کا ہر مسلمان ذمہ دار ہے۔مثلاً والدین اولاد کی، شوہر بیوی کی، ہر بڑا اپنے چھوٹوں کی دینی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار ہے۔اس طرح کہ ان لوگوں کو جتنا دین آتا ہے وہ اپنے متعلقین کو سکھائیں۔یہ طریقہ کار ہر دور میں بڑا ہی موثر رہا ہے۔اور اسی سے ہر گھر میں اسلام کی شمع روشن ہوئی ہے۔نماز، روزہ اور دیگر عبادات کی اہمیت اور ان کی پابندی اور ان کا طریقہ، کھانے پینے کے آداب، بڑوں کا ادب واحترام، چھوٹوں پر شفقت ومحبت، والدین، اعزا، واقرباء کے حقوق، یہ اور ان جیسے اموراس قدر اہم ہیں کہ ایک مسلمان کو ہر وقت ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ان کی تعلیم کے لیے نہ کسی مبلغ کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی استاد کی۔گھر کا ہر بڑا بوڑھا والدین اتنی تبلیغ کے ذمہ دار ہیں۔آج جو لوگ دین کے بنیادی اور ابتدائی مسائل سے بھی ناواقف ہیں اور جو نوجوان بے راہ روی میں مبتلا ہیں۔ان کے ذمہ دار مبلغین اور علما نہیں بلکہ گھر کے بزرگ ہیں۔جنہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں لاپرواہی یا کوتاہی کی۔مسلم معاشرے میں ساری خرابیاں اسی لاپرواہی کا نتیجہ ہیں۔گھر کی چاردیواری سے جب دینی تربیت وتعلیم یافتہ بچے باہر آتے ہیں تو ایک پرسکون، پرامن معاشرہ وجود میں آتا ہے۔اور اگر گھروں ہی سے جاہل برآمد ہوتے ہیں تو کوئی مبلغ معاشرے کو بربادی سے نہیں بچا پاتا۔پس قرآنی ہدایت کے مطابق ہر فرد کو اپنی ذمہ داری نبھانا اور پوری کرنا چاہیے۔تاکہ پوری قوم کو باعزت اور پرامن زندگی میسر آسکے۔

بہرحال امت مسلمہ کی کامیابی وکامرانی، عزت وعظمت اور وقار کا دارومدار اس پر ہے کہ مومن "متقی" ہو۔اہل ایمان اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ کر متحد ومنظم ہوں۔دین متین کی بقاء کے لیے وہ تبلیغ واشاعت کا اہتمام کریں۔اللہ ہمیں ان بنیادی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

وَ مَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ

وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۱۵

آل عمران: ۱۱۸ تا ۱۲۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ
قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ
الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ
كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ
مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ
وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (آل عمران: ۱۱۸۔۱۲۰)

اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو، وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے کی، وہ پسند کرتے ہیں، جو چیز تمہیں ضرر دے ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں سے، اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لیے اپنی آیتیں، اگر تم سمجھ

دار ہو۔

سنو! تم تو ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے، اور وہ محبت نہیں کرتے تم سے اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو اور جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں۔ اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں، تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے (اے حبیب) آپ فرمایئے، مر جاؤ، اپنے غصہ (کی آگ میں جل کر) یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا۔ اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو خوش ہوتے ہیں اس سے، اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا مکر کچھ بھی، بیشک اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کئے ہوئے ہے۔

غیر مسلموں کو راز دار نہ بناؤ

اہل ایمان کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم غیر مسلموں کو اپنا راز دار اور مخلص دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ کبھی تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتے۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ وہ تمہیں کبھی بھی ستانے اور پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ ایسی ہر تدبیر اختیار کرتے ہیں جو تمہاری تکلیف اور ضرر کا سبب بنے۔ ان کے دل تمہارے لئے بغض و کینہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب کہ تمہیں ایمان کی فطرت نے اس قدر سادہ اور صاف قلب بنا دیا ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اور جملہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ لیکن غیر مسلموں کی یہ فطرت ہے کہ بظاہر وہ تم سے اظہار ہمدردی و محبت کرتے ہیں اور اپنی تنہائیوں میں وہ تم سے اس قدر حسد کرتے اور جلتے ہیں کہ غصہ کے مارے اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ پس تم انہیں ان کی حسد کی آگ میں جلنے اور غصہ میں مرنے دو۔ وہ تمہاری ترقی و کامیابی کو پسند نہیں کر سکتے۔ ان کی خوشی تمہاری تکلیف ہے تم صبر سے کام لو، اللہ کے احکام کے پابند رہو۔ تمہیں کسی مرحلہ پر ان کا مکر و فریب نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ ان سے نمٹ لے گا اور تمہیں کامیاب و کامران کرے گا۔ کیونکہ ان کے اعمال اللہ کے علم میں ہیں۔

آیات مذکورہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ اہلِ ایمان کو کافروں پر اعتماد کرنے انہیں اپنا راز دار بنانے کی ممانعت کی جا رہی ہے۔ کیونکہ جس طرح آگ و پانی کی تاثیر علیحدہ علیحدہ ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتی اسی طرح کفر و اسلام کی بھی تاثیر علیحدہ علیحدہ ہے جس کا انسان کے عادات واطوار پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ کفر تاریکی ہے، جس سے عیوب و نقائص ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پس کفر، کافر کو ضدی لالچی، حریص، حاسد، مکار، فریبی، دھوکا باز، چال باز، خودغرض، سیاہ قلب، فتنہ پرور اور فتنہ پرداز بناتا ہے۔ وہ کتنے ہی اچھے لباس میں کیوں نہ ہو لیکن اس کی یہ اندرونی برائیاں ختم نہیں ہوتیں۔ اس کی تربیت کتنی ہی اچھی ہو لیکن وہ ان عادات سے مبّرا نہیں ہو سکتا۔ آپ چاہے نبی مکرم علیہ السلام کے دور کے کفار کے حال پر غور کریں یا اپنے دور کے کافروں کی حرکات کا مشاہدہ کریں۔ کفر کی یہ تاثیر آپ کو ہر دور اور ہر جگہ کے کافروں میں نظر آئے گی۔ اسی حقیقت کو ان جملوں میں بیان کیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ

وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ

وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے کی وہ پسند کرتے ہیں وہ چیز جو تمہیں ضرر دے ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ اور جب وہ (کفار) تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے۔

پھر فرمایا گیا:

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا

اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف، خوش ہوتے ہیں اس سے۔

کفر کے ان اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ کافر کبھی بھی اہل ایمان کی بھلائی گوارا نہیں کرتے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(بقرہ:۱۰۵)

نہیں پسند کرتے ہیں وہ لوگ جو کافر ہیں، اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے (اے مسلمانوں) تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرمالیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ بڑا فضل (فرمانے) والا ہے۔

یہ ہے کفار پر کفر کا اثر، جب کہ اس کے بالکل برعکس اسلام نور ہے جو مسلمان کے دلوں کو چمکا دیتا اور صاف وشفاف کر دیتا ہے۔ اس میں نہ کینہ باقی رہتا ہے نہ بغض وعناد۔ وہ بالکل سادہ لوح ہو جاتا ہے ہر کسی سے محبت کرتا ہے۔ ہر ایک کی بھلائی چاہتا ہے۔ اس کے قلب کی وسعت کا تو یہ حال ہے کہ وہ جس طرح اپنے نبی اور ان کی دی ہوئی کتاب پر ایمان رکھتا ہے، اسی طرح وہ تمام انبیاء سابقین اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو مانتا ہے۔

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ

سنو تم ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو

اسلام تو مسلمان کو ہر کسی سے محبت والفت اور ہمدردی کا حکم دیتا ہے۔ وہ کفر اور اس کے اثرات سے مؤمن کے دل کو دھو دیتا اور پاک وصاف کر دیتا ہے، ہر کسی پر اعتبار واعتماد اس کا شعار بن جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسے مکر وفریب کی عادی قوم سے دور رکھا جائے۔ لہٰذا حکم دیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ

اے ایمان والو! غیروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔

کہ اگر تم نے ان کو اپنے راز بتا دیئے تو ایک نہ ایک دن وہ تمہیں ضرور نقصان پہنچائیں گے۔ پس ان کے مکر وفریب اور ان کے دلوں میں چھپی ہوئی عداوت کے شر سے بچانے کے لیے، اللہ تمہیں ہدایت فرماتا ہے کہ:

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾ (آل عمران: ۲۸)

نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست اور جس نے یہ کام کیا پس اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا مگر اس حالت میں کہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو۔ اور ڈراتا ہے اللہ تمہیں اپنی ذات (اپنے غضب) سے اور اللہ ہی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے۔

وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ (ھود: ۱۱۳)

اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا ورنہ تمہیں بھی آگ چھوئے گی، اور (اس وقت) نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار پھر تمہاری مدد بھی نہ کی جائے گی۔

ان آیات نے کفار سے موالات و مداہنت کی واضح ممانعت فرمائی۔ صرف اس لئے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ اس کے سادہ لوح مؤمن بندے مکار و چالاک کافروں کے فریب میں مبتلا ہو کر دنیا میں بھی خوار ہوں اور آخرت میں بھی مبتلائے عذاب ہوں۔ پس اگر اہلِ ایمان نے اس ہدایت پر عمل کیا تو وعدہ الٰہی ہے کہ کافر اپنی کثرت تعداد، قوت و طاقت اور دولت کی فراوانی کے باوجود مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُهُمْ شَیْـًٔا ؕ

اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو تمہیں ان کا مکر کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

کفار کی قوت و طاقت سے ذرا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں، درج ذیل آیات کا بغور مطالعہ کیجئے اور اپنے دل کو کفار کے رعب سے آزاد کیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۷﴾ (آل عمران: ۱۷۵۔۱۷۷)

یہ تو شیطان ہے جو (تمہیں) ڈراتا ہے اپنے دوستوں سے، پس نہ ڈرو ان (کافروں) سے، بلکہ مجھ سے ہی (اللہ سے ہی) ڈرا کرو، اگر تم (واقعی) مؤمن ہو۔ اور تمہیں وہ لوگ غم میں مبتلا نہ کریں جو جلدی سے کفر میں داخل ہوئے ہیں۔ بیشک یہ لوگ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت (کی نعمتوں) سے ذرا بھی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کو ایمان کے عوض خرید لیا ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے اللہ کو کچھ بھی اور ان کے لیے دردناک

عذاب ہے۔

مفہوم آیات واضح ہے کہ کفار درحقیقت شیطان کے دوست ہیں اور وہ ان کی ہر طرح مدد کرتا ہے۔ جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو اپنے دوستوں کی ظاہری قوت وطاقت سے مرعوب کرتا ہے۔ اللہ اہلِ ایمان کے دلوں سے ان کے خوف کو دور فرمانے کے لیے نہایت مشفقانہ انداز میں ہدایت فرماتا ہے کہ تم تو میرے ہو، پس تمہیں میرے سوا کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میری قوت ہر قوت پر غالب ہے۔ تم مجھ سے ڈرو تو میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گا۔ مجھے کافر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں تمہارے مقابلے پر انہیں دنیا میں بھی ذلیل وخوار کرتا رہوں گا اور آخرت میں بھی وہ عذاب عظیم میں مبتلا ہوں گے۔

تاریخ پر ایک نظر

ان ارشادات کی روشنی میں آپ اپنی تاریخ پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اہلِ ایمان کی کامیابی وکامرانی کی بنیاد اللہ رب العزت کی ان ہدایات پر عمل کرنا ہے کہ انہوں نے اسلام کے ازلی وابدی دشمنوں پر نہ کبھی اعتبار کیا اور نہ ہی ان سے غیر ضروری تعلقات بڑھائے، نہ ان کی قوت وطاقت سے وہ مرعوب اور خوف زدہ ہوئے۔ حضور نبی مکرم علیہ السلام کے تئیس سالہ دور میں شاید ہی کوئی دن ایسا ملے جس میں اعداءِ اسلام کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کوئی طوفان نہ آیا ہو، آپ کے مکی دور کو دیکھئے تو آپ کے اور صحابہ کرام کے لئے کفار مکہ کی طرف سے ہر روز ظلم وستم کے نت نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے۔ جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسی عظیم شخصیت کو مارنے پیٹنے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر طرح طرح سے ظلم وستم اسی طرح دیگر صحابہ کرام کو ستانے اور پریشان کرنے کی داستانیں، تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جن کو پڑھ کر آج بھی جسم کا رونگٹا رونگٹا کانپنے لگتا ہے۔ لیکن کفر کی قوت وطاقت ان حضرات کو نہ تو دین سے دور کر سکی اور نہ ہی خدمت دین اور اشاعت دین سے روک سکی، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ ان حضرات نے مصائب وآلام کو برداشت کیا، اعزاء واقرباء کو چھوڑا، نفع بخش کاروبار چھوڑے، مال واسباب چھوڑا، یہاں تک کہ گھر سے بے گھر ہو گئے لیکن کفار ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ان کے مشن سے انہیں نہ روک سکے۔ ایثار وقربانی کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو رومیوں نے جنگی قیدی بنا کر بنو کلب کے کسی شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ وہ انہیں لے کر مکہ آیا۔ عبداللہ بن جدعان نے انہیں خریدا اور آزاد کر دیا۔ انہوں نے مکہ ہی میں رہائش اختیار کر لی اور تجارت کرنے لگے۔ بہت دولت کمائی۔ مکہ کے دولت مند تاجروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نبی مکرم علیہ السلام نے جب اعلان نبوت فرمایا تو یہ مشرف باسلام ہوئے۔ زمانہ ہجرت آیا اور نبی کریم علیہ السلام مدینہ تشریف لے گئے۔ صہیب کو اگرچہ مکہ میں کوئی تکلیف نہ تھی، کاروبار چل رہا تھا، لیکن عاشق رسول تھے۔ لہٰذا حضور علیہ السلام کے بغیر زندگی بے کیف ہوگئی اور ہجرت کا فیصلہ کیا۔ جب آپ اپنے مال واسباب کے ساتھ مکہ سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہوئے تو کفار نے گھیر لیا اور کہا صہیب تم جاتے ہو تو جاؤ لیکن یہ دولت تم نے مکہ میں کمائی ہے ہم اسے نہیں لے جانے دیں گے۔ صہیب نے کہا اگر میں اپنی سب دولت تمہارے سپرد کر دوں تو کیا تم میرے راستہ سے ہٹ جاؤ گے۔ کافروں نے وعدہ کیا کہ ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔ آپ نے

اپنی ساری دولت ان کے سپرد کی اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے۔ حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے تو سب ماجرا بیان کیا۔ آپ نے فرمایا:

رَبِحَ صُھَیْبُ، رَبِحَ صُھَیْب بڑا نفع کمایا صہیب نے، بڑا نفع کمایا صہیب نے۔

اسی کے ساتھ حضرت عیاش بن ابی ربیعہ کا واقعہ بھی ملاحظہ ہو۔ جو مصائب و آلام کا شکار صرف اس لیے ہوئے کہ انہوں نے اپنی سادہ لوحی کی بناء پر کافروں پر اعتماد کیا اور ان کے چنگل میں پھنس گئے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ہجرت کی۔ دونوں قبا میں بنی عمرو بن عوف کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ابوجہل اور حارث ان کے رشتہ دار تھے جوان کا پیچھا کرتے ہوئے ان کی قیام گاہ تک پہنچ گئے اور دونوں نے عیاش کوان کی ماں کی ایسی درد بھری داستان سنائی کہ وہ حضرت عمرؓ کے منع کرنے کے باوجود مکہ واپس آنے پر آمادہ ہو گئے۔ قبا سے تھوڑی ہی دور نکل کر ایک مقام پر تینوں اپنی سواریوں سے اترے۔ ابوجہل اور حارث نے دھوکہ سے حضرت عیاش کو باندھا اور قیدی بنا لیا۔ مکہ میں داخل ہوئے تو لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ابوجہل ان کو مارتا اور کہتا جاتا تھا:

''اے مکہ والو! تم بھی اپنے احمقوں کے ساتھ یہی سلوک کرو جو ہم اپنے اس احمق کے ساتھ کر رہے ہیں''۔

غرضیکہ حضرت عیاش پر طرح طرح سے ظلم ڈھائے گئے اور کئی سال تک وہ کفار کی قید میں رہے۔ غزوہ بدر کے بعد ولید بن ولید نے حضور علیہ السلام کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے مکہ آ کر انہیں قید سے رہا کیا اور نبی مکرم علیہ السلام کے دربار میں لے کر حاضر ہوئے۔

مکی دور کے بعد مدینہ کے تیرہ سالہ دور کا جائزہ لیا جائے تو اس عرصہ میں بھی کوئی دن ایسا نظر نہیں آتا جس میں کافروں نے مسلمانوں کے خلاف کوئی نہ کوئی سازش نہ کی ہو۔ کبھی اندرون مدینہ منافقین اور یہودی سازشیں کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی بیرونِ مدینہ کفار مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ لیکن اہل ایمان نے اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کبھی بھی کفار کی کثرتِ تعداد یا قوت و طاقت کی پروا نہ کی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہے اور جب بھی کوئی طوفان آیا تو ڈٹ کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح انہوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ جس کی واضح مثال غزوہ بدر ہے۔ جس میں تین سو تیرہ بے سروسامان افراد ایک کثیر تعداد قوم سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور کامیابی و کامرانی ان کے قدم بوس ہوتی ہے۔ جس کا دنیاوی اصول کے مطابق شائبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن دنیا نے دیکھا اور مانا کہ اسلام کے مقابلے میں کفر کی حیثیت اس ریت سے زیادہ نہیں جو ہوا کے رخ پر اڑتا رہتا ہے۔

کفار سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نفرت اور عدمِ تعلق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے میدان بدر میں اپنے باپ کو دشمنوں کی صف میں دیکھا تو لپکے اور ایک وار میں گردن اڑا دی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے میدان بدر ہی میں اپنے بیٹے عبداللہ کو دشمنوں کی صف میں دیکھا تو تلوار تان کر دوڑے لیکن حضور علیہ السلام نے روک دیا کیونکہ آپ کو علم تھا کہ عبداللہ ایک دن مشرف باسلام ہوں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ حضرت مصعب ابن عمیر نے غزوہ

بدر کے قیدیوں میں اپنے بھائی ابوعزیز بن عمیر کو دیکھا کہ ایک انصاری اس کے ہاتھ پیر باندھ رہے ہیں تو آپ نے فرمایا بھائی اس کو خوب کس کر باندھنا کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس کی ماں بڑی دولت مند ہے فدیہ کی بھاری رقم وصول ہوگی۔ ابوعزیز بولا، اے مصعب تم تو میرے بھائی ہو، پھر بھی ایسی بات کر رہے ہو۔ آپ نے فرمایا میرے بھائی تم نہیں یہ انصاری ہیں جو تمہیں باندھ رہے ہیں۔ انہی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے غزوہ احد میں اپنے ایک بھائی عبید کو قتل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ماموں عاص ابن ہشام کو، حضرت علی، حضرت حمزہ، حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم نے اپنے قریبی رشتہ داروں عتبہ، شیبہ اور ولید وغیرہ کو میدان بدر ہی میں قتل کیا۔

غرضیکہ اہلِ ایمان کو یہ ہدایت کی گئی کہ کافروں سے دوستی و محبت نہ کریں اور انہیں اپنا رازدار نہ بنائیں کیونکہ کافر کبھی بھی مؤمن کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔ وہ جب بھی موقع پاتا ہے مسلمان کو دھوکہ دیتا اور اس کو نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ اگر کسی موقع پر کفار مسلمانوں سے خیر خواہی کا اظہار بھی کرتے ہیں تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی چال ہوتی ہے۔ ضرور ان کی اپنی غرض وابستہ ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی قرآنی ہدایت ہے جو مسلمانوں کے لیے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی اور قومی طور پر بھی قابل عمل ہے۔ یعنی مسلم حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی اس ہدایت کے مطابق مرتب کریں۔ یعنی غیر مسلموں پر اتنا اعتماد نہ کریں کہ اپنے ملکی اور قومی راز تک ان پر ظاہر کر دیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا اسلام مسلمانوں کو دیگر اقوام سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور غیر مسلموں سے ہر حال میں نفرت اور لاتعلقی کا حکم دیتا ہے تو اس سوال کے جواب کے لیے پہلے تعلقات کی اقسام کو سمجھ لینا چاہیے۔

تعلقات کی قسمیں

باہمی تعلقات کی متعدد قسمیں ہیں جن کو سمجھ لینے کے بعد غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

<u>موالات</u>: یعنی کسی سے ایسا تعلق قائم کر لینا کہ اس کو اپنے گھر، خاندان یا قوم کا حصہ سمجھ لیا جائے۔ اور اس سے ایسی بے تکلفی ہو جائے کہ ذاتی خاندانی یا قومی راز تک اس پر پوشیدہ نہ رہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کے تعلقات ایسے ہی دو شخصوں یا قوموں کے درمیان قائم ہو سکتے ہیں جن میں کوئی قدرِ مشترک ہو۔ یعنی یا تو ان کے درمیان خونی رشتہ پایا جاتا ہو یا مذہبی تعلق ہو۔ یا دونوں کی تہذیب ایک جیسی ہو۔

<u>مواسات</u>: یعنی دو شخصوں کے درمیان صرف اتنا تعلق ہو کہ وہ ایک دوسرے سے ہمدردی کے ساتھ پیش آئیں۔ بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اس نیت سے کہ دونوں ایک دوسرے سے جائز ذاتی یا قومی فوائد حاصل کر سکیں۔ یا اپنے مذہب کی تعلیم سے ایک دوسرے کو متاثر کر سکیں۔ حتی کہ دونوں کے درمیان تہذیب یا مذہب کا فرق ختم ہو جائے اور پھر ان میں موالات قائم ہو جائے۔

<u>معاملات</u>: یعنی سیاسی، تجارتی، معاشی اور دیگر دنیاوی امور کے لیے دو شخصوں کے درمیان تعلق ہو اور اس کا مقصد ان امور میں ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس قسم کے تعلقات میں شرعی حدود کا لحاظ لازمی ہے۔

<u>مدارات</u>: یعنی دینی اور مذہبی فوائد کے حصول کیلئے غیروں اور ظالموں کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا۔ اس قسم کے

تعلقات کی ضرورت صرف ان مسلمانوں کو پیش آ سکتی جو مغلوب ہوں، کمزور ہوں۔ مثلاً کافروں کی حکومت میں وہ رہتے ہوں، اقلیت میں ہوں اور وہاں انہیں اپنے مذہبی امور کی ادائیگی کے لئے کفار سے ایسا تعلق رکھنا پڑے جس کی وجہ سے وہ مذہبی امور میں مداخلت یا رکاوٹ پیدا نہ کرسکیں۔ لیکن اس تعلق کی بھی شرعی حد متعین ہے کہ کسی مذہبی فائدے کے لئے کوئی خلاف شرع عمل یا کافروں جیسا عمل اختیار نہ کیا جائے۔ اور نہ ہی ان کی تہذیب اور تمدن کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

مداہنت: ذاتی یا قومی منفعت اور دنیاوی فائدے کے حصول کے لیے دینی اور شرعی امور میں نرمی کرنا یا کفار کے ظلم وستم سے بچنے کے لیے شرعی احکام کو ترک کردینا یا ان پر مستقلاً چھپ کر عمل کرنا۔

مداہنت ان دونوں صورتوں میں سے کسی بھی صورت میں ہو جائز نہیں کہ پہلی صورت میں دنیاوی فوائد کو شرعی احکام پر ترجیح دینا ہے جو جائز نہیں اور دوسری صورت کہ کفار کے ظلم وستم کے خوف سے شرعی احکام کو ترک کیا جائے یا ان پر چھپ کر عمل کیا جائے۔ مثلاً اذان دینا اس لیے ترک کردی جائے کہ کافر اس کی اجازت نہیں دیتے یا مسجد میں نماز پڑھنا اس لیے چھوڑ دی جائے کہ کافر اس کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ یہ بھی جائز نہیں کیونکہ جس سرزمین پر مسلمان کے لیے اللہ کا نام لینا اور شریعت پر آزادی سے عمل کرنا ممکن نہ رہے وہاں مداہنت نہیں کی جائے گی، بلکہ وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہوگی۔ نبی مکرم علیہ السلام کا ارشاد ہے:

عَنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَنَا بَرِیْءٌ مِّنْ کُلِّ مُسْلِمٍ اَقَامَ مَعَ الْمُشْرِکِيْنَ

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بیزار ہوں جو مشرکوں کے یہاں اقامت کرے۔

یعنی مشرکین کے ملک یا شہر میں اس قدر مغلوب ومجبور ہو کر رہنا حضور علیہ السلام کو پسند نہیں کہ دین میں مداہنت کرنا پڑے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات زندگی گواہ ہیں کہ انہوں نے مصائب وآلام برداشت کیے لیکن کبھی مداہنت فی الدین کے مرتکب نہ ہوئے۔ بالخصوص اہل مکہ نے جو ظلم وستم ڈھائے۔ حضرت ابوبکر صدیق، ابوذر غفاری، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم نے جو مظالم برداشت کیے، ظالموں کی دنیا میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن کیا مجال کہ کسی نے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنا قدم پیچھے ہٹایا ہو۔ جس نے ایک مرتبہ "اللہ احد" کی صدا بلند کی وہ مار کھاتا رہا اور یہی نعرہ بلند کرتا رہا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت حبشہ کا ارادہ کیا تو ابن الدغنہ نامی کافر نے ان کو اصرار کر کے روک لیا اور اپنی پناہ میں لے لیا۔ آپ نے کفار کے مظالم سے بچنے کے خیال سے اپنے گھر کے صحن ہی میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی، وہیں آپ عبادت کرتے تھے۔ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے، چونکہ آپ بے حد خوش الحان تھے لہذا قرآن کریم سننے کے لیے آپ کے گھر کے اردگرد عورتوں، مردوں کا ایک مجمع ہو جاتا تھا۔ مکہ کے سرداروں کو خطرہ ہوا کہ کہیں ابوبکر سے تلاوت سن کر یہ لوگ اسلام قبول نہ کرلیں۔ چونکہ آپ ابن الدغنہ کی پناہ میں تھے، لہذا لوگوں نے اسی سے شکایت کی کہ

ابوبکر کو بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کرنے سے روکو یا اپنی پناہ اٹھالو تا کہ ہم خود ان کو روک سکیں۔ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر آپ اسی طرح قرآن پڑھتے رہے تو میں آپ سے اپنی پناہ اٹھالوں گا۔ آپ نے مومنانہ جرات کے ساتھ فرمایا اے ابن الدغنہ اگر تیری پناہ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دین کو چھپاؤں:

فَاِنِّیْ اَرُدُّ عَلَیْکَ جِوَارَکَ وَاَرْضٰی بِجِوَارِ اللّٰہِ تَعَالٰی

تو میں تیری پناہ تجھے لوٹاتا ہوں میرے لئے اللہ کی پناہ کافی ہے۔

یہی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر رونق افروز ہوتے ہیں تو سیاسی اعتبار سے انہیں اسلام اور مسلمانوں کے لیے نہایت خطرناک حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قبائل عرب کے مرتد ہوجانے کی خبریں ملتی ہیں۔ کذّاب مدعیانِ نبوت کا طوفان اٹھتا ہے۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ مرتدین کے مدینہ پر حملہ آور ہونے اور اسے تہس نہس کرڈالنے کے خدشات موجود ہیں۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے جب آپ مشاورتی کونسل سے مشورہ اور تجاویز طلب فرماتے ہیں تو تمام صحابہ حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے نرمی کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ بالخصوص یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ جیش اسامہ کی روانگی کا پروگرام ملتوی کردیا جائے تا کہ مدینہ کی پوری طرح حفاظت ہوسکے۔ لیکن اللہ اکبر، اس مرد مؤمن کی جرأت تو دیکھئے کہ آپ صحابہ کرام کے مشورے کے برعکس اعلان فرماتے ہیں" کہ اگر ابوبکر کی بوٹی بوٹی بھی کر دی جائے، تب بھی جیش اُسامہ حسب پروگرام روانہ ہوگا کیونکہ یہ نبی مکرم علیہ السلام کا فیصلہ ہے جس میں تبدیلی کا ابوبکر کو حق حاصل نہیں۔ نیز مرتدین کا مقابلہ کیا جائے گا۔ منکرین زکوٰۃ سے جہاد کیا جائے گا کہ ناموسِ رسالت کا تحفظ اور شرعی احکام کی پابندی کرانا ہی خلیفہ کا کام ہے"۔ اور آپ نے ایسا ہی کیا اگر اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مصلحت اور مداہنت کا شکار ہوجاتے تو آج دین کی شکل ہی بگڑ چکی ہوتی۔

بہرحال کفار کے ظلم وستم کے خوف سے دین کو چھوڑ دینے، یا مستقل چھپائے رکھنے کا کوئی جواز نہیں اور نہ ہی مداہنت کی دوسری صورت یعنی دنیاوی فوائد کے حصول کے لئے احکام شرع کی پابندی ترک کرنے کا کوئی جواز ہے۔ یہ صورت تو مسلمانوں کی مجبوری یا کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے ایمان کی کمزوری کے سبب پیش آسکتی ہے۔ کہ لالچ طبع مسلمان یا مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمان غیر مسلموں کی تہذیب اور ان کے تمدن کو صرف اس لئے اختیار کر لیتے ہیں کہ انہیں چند پیسوں کا فائدہ ہوتا ہے یا وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے اور اپنے مذہبی شعار کو خلاف فیشن سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

ہم نے یورپ وامریکہ اور دیگر غیر مسلم ممالک میں آباد ایسے بے غیرت مسلمان دیکھے ہیں جو صرف اپنے تجارتی اور کاروباری تعلق کی وجہ سے غیر مسلموں کے ساتھ کلبوں میں ناچتے، جوا کھیلتے اور شراب پیتے ہیں۔ انہیں بے شرم ماحول میں یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ یہ چیزیں ہمارے مذہب میں حرام ہیں۔ کیونکہ وہ خود ماحول سے متاثر ہوکر بے شرم ہوجاتے ہیں۔ دفاتر اور فیکٹریوں میں ملازمت کرنے والے بہت مسلمان رمضان میں صرف اس لئے روزہ نہیں رکھتے کہ انہیں یہ بتانے میں شرم آتی ہے کہ ہمارا روزہ ہے اس لیے ہم کچھ نہیں کھا، پی سکتے۔ یہ شرم مجبوری نہیں بلکہ بے شرمی اور ایمان کی کمزوری ہے۔ جبکہ بحمد اللہ انہی ممالک میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنے مذہب پر فخر کرتے، اپنے حقوق کے حصول کے لیے غیر مسلموں

سے قانونی جنگ کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو برملا مسلمان کہتے ہیں اور کھلم کھلا نماز روزے اور دیگر شرعی احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ بیشتر غیر مسلم ممالک میں مساجد موجود ہیں۔ دین کی تبلیغ واشاعت کے لئے ہندو پاک کے علماء کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور ان ممالک میں اسلام کا مستقبل تابناک ہے۔ اللہ ہمارے ان بھائیوں کو مزید ہمت عطا فرمائے اور دنیا وآخرت میں اجر عطا فرمائے۔

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت

باہمی تعلقات کی قسمیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ اب ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کفار کے ساتھ کس قسم کے تعلقات کی اسلام ممانعت کرتا ہے، تاکہ ذہن سے یہ خیال محو ہو جائے کہ العیاذ باللہ اسلام تنگ نظری کی تعلیم دیتا ہے اور غیر مسلم اقوام سے الگ تھلگ کر کے مسلمانوں کو سیاسی اور تجارتی امور میں ترقی سے روکتا ہے۔ جس کے لئے دنیا کی تمام اقوام سے تعلقات ناگزیر ہیں۔ خصوصاً موجودہ دور میں تو کسی سے تعلقات منقطع کر کے زندہ رہنا ناممکن ہے۔

قرآن کریم کی زیر گفتگو آیت پر غور فرمایئے۔ اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے غیروں کو ''بطانہ'' نہ بناؤ۔ نیز دیگر قرآنی آیات میں ''ولی'' یا ''اولیاء'' بنانے کی ممانعت ہے۔ ''بطانہ'' کا ترجمہ بھی آپ نے پڑھا کہ رازدار نہ بناؤ۔ صاحب روح البیان فرماتے ہیں۔

بِطَانَةُ الرَّجُلِ صَاحِبُ وَلِيْجَتِهٖ مَنْ يَّعْرِفُ اَسْرَارَهٗ ثِقَةً بِهٖ

آدمی کا بطانہ وہ خاص دوست ہے، جس پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اسے اپنا راز بتادے

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

بِطَانَةُ الرَّجُلِ خَاصَّتُهُ الَّذِيْنَ يَبْطُنُوْنَ اَمْرَهٗ

آدمی کا بطانہ وہ خاص لوگ ہیں، جو اس کی باتوں کو چھپا لیتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ فرماتے ہیں۔

''اے ایمان والو، غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ''

صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین رحمۃ اللہ علیہ وضاحت کرتے ہوئے حاشیہ پر رقمطراز ہیں۔

''ان سے دوستی نہ کرو، محبت کے تعلقات نہ رکھو، وہ قابل اعتماد نہیں ہیں''۔

مزید فرماتے ہیں:

''کفار سے دوستی ومحبت کرنا اور انہیں اپنا رازدار بنانا ناجائز وممنوع ہے''۔

میرے استاد علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً یہی ترجمہ کیا، لکھتے ہیں:

''اے ایمان والو! غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہاری تباہی میں کمی نہ کریں گے''۔

مفسر قرآن ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ مدظلہ العالی کا ترجمہ آپ نے پڑھا۔

''ایمان والو، نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو، وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں''۔

درحقیقت ''بِطانہ'' بَطَن سے ہے، جس کے معنی ''پیٹ'' اور بطانہ وہ چیز جو پیٹ سے لگی ہو۔ اسی لیے کپڑے کے استر کو ''بِطانہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی اندرونی حصہ۔ پھر بطور استعارہ یہ ہر اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جو چھپی ہوئی ہو۔ اور چھپانے والے کو راز دار کو بھی ''بِطانہ'' کہا جانے لگا۔ پس ارشاد باری تعالیٰ واضح ہے کہ کفار کو ''بِطانہ'' راز دار بنانے، ان پر اپنے معاملات میں اعتماد کرنے اور بھروسہ کرنے سے منع کیا جارہا ہے۔ دیگر قرآنی آیات میں ''ولی'' بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ''ولی'' ایسے مخلص دوست کو کہتے ہیں جس پر یہ اعتماد ہو کہ وہ ہر حال میں مددگار اور معاون ثابت ہوگا۔ یہی مُوالات ہے جو، از روئے شرع کفار کے ساتھ ممنوع ہے۔ جس کی وجہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ کافر فطری طور پر قابل اعتماد نہیں، وہ بظاہر مسلمان سے کتنا ہی قریب ہو بہر حال دشمن ہی رہتا ہے۔ جس کی نظیر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کے لئے وہی ہندو زیادہ خطرناک ثابت ہوئے جو برس ہا برس سے پڑوس میں رہتے تھے اور ان نسلوں سے مسلمانوں کے تعلقات تھے۔

امت مسلمہ پر قرآن کریم کا یہ احسان ہے کہ اس نے دشمن کی فطرت سے باخبر کر دیا تاکہ مؤمن ان کے فریب میں مبتلا نہ ہوں۔ اس حکم کا منشاء صرف اتنا ہے۔ یہ منشاء ہر گز نہیں کہ مسلمان ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں اور دنیا سے الگ تھلگ ہو کر زندگی بسر کریں۔ ایسا ہر گز نہیں۔ باہمی تعلقات کی دوسری قسموں کا تعلق بالکل جائز ہے۔ مُواسات، مُعاملات، مُدارات سب جائز ہیں۔ بلکہ اسلام نے کفار کے ساتھ جتنے تعلق کی اجازت دی ہے اور اس معاملہ میں جتنی وُسعت اختیار کی ہے اس کی نظیر کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ ان کے ساتھ کاروبار اور تجارت کرنے کی پوری اجازت ہے۔ غیر مسلم پڑوسی سے میل جول رکھنے اور بوقت ضرورت اس کی مدد کرنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کی تاکید کی گئی ہے۔ غیر مسلموں کے تہواروں پر انہیں مبارک باد دینا جائز ہے۔ اگر دنیاوی ضرورت ہو تو انہیں تحفے تحائف دینا بھی جائز ہے۔ بس ان کے ان کاموں میں شرکت کی اجازت نہیں جو ہمارے لئے شرعاً جائز نہیں۔ مثلاً ان کی پوجا پاٹ یا عبادت کے دیگر طریقوں میں شریک ہونا۔ ان کے ساتھ مل کر شراب پینا، ڈانس کرنا اور اسی قسم کی دوسری حرکتیں حرام ہیں۔ غیر مسلموں کو ملازم رکھنے یا ان کی ملازمت کرنے کی اجازت ہے۔ اس معاملہ میں صرف اتنی ممانعت ہے کہ کسی غیر مسلم کو ایسی ملازمت نہ دی جائے جس سے وہ تمام کاروباری یا سیاسی راز جان لے۔ کیونکہ وہ قابل اعتبار نہیں۔ اس راز سے وہ مسلمان کے دشمن کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اور ایسا ہی ہوتا ہے نیز مسلمان کافر کے یہاں کوئی ایسی ملازمت نہ کرے جو اس کے لیے شرعاً ممنوع ہو۔ مثلاً شراب بنانے، بیچنے یا اٹھانے کا کام کرنا جائز نہیں۔ جو مسلمان کافروں کو ملازم رکھیں انہیں اسلام تاکید کرتا ہے کہ وہ انہیں وہی مزدوری اور وہ تمام مراعات دیں جو مسلمان ملازموں کو دیتے ہیں۔ مسلمان پر جس طرح اپنے مسلمان بھائی کی عزت وآبرو کی حفاظت فرض ہے اسی طرح غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی حفاظت لازم ہے۔ جب کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں نہ ہوں۔ مثلاً جس طرح ایک مسلمان کا مال چوری کرنا حرام ہے اسی طرح غیر مسلم کا مال چوری کرنا بھی حرام ہے۔ جس طرح کسی مسلمان عورت سے

بدکاری حرام ہے اسی طرح غیر مسلم عورت سے بھی حرام ہے۔ غیر مسلم سے اگر کوئی وعدہ یا معاہدہ کیا جائے تو اس کا پورا کرنا اسی طرح لازم ہے جس طرح مسلمان سے کیے ہوئے وعدے اور معاہدے کا پورا کرنا لازمی ہے۔ اگر غیر مسلم کوئی امانت مسلمان کے پاس رکھے تو اس میں خیانت کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح مسلمان کی امانت میں حرام ہے۔ اگر کسی کافر سے قرض لیا جائے تو وقت مقررہ پر اس کا ادا کرنا اور اس کا شکر گزار ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح مسلمان سے قرض لے کر وقت مقررہ پر شکریہ کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ جو غیر مسلم ذمی ہوں۔ یعنی مسلم ممالک میں آباد ہوں ان کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے گی اور انہیں ان کے مذہبی شعار ادا کرنے کی پوری آزادی ہوگی، مسلمانوں کے لیے آپس میں سودی کاروبار کرنا حرام ہے۔ اسی طرح غیر مسلموں سے بھی سود لینا یا انہیں دینا حرام ہے۔ جب مسلمان بحالت جنگ غیر مسلم ملک فتح کریں تو ان کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ غیر مسلموں کے بچوں، عورتوں کا قتل عام کریں یا ان کی دوکانوں اور مکانوں اور فصلوں کو لوٹیں۔ نہ ہی انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں۔

اسلام کے ان احکام پر غور کیا جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ کیا اسلام نے غیر مسلموں سے قطع تعلق یا ان پر ظلم کا حکم دیا ہے۔ قرآن کریم کے اس ارشاد پر بھی غور کیجیے۔ فرمایا گیا۔

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝۸ (الممتحنہ:۸)

اللہ تمہیں نہیں منع کرتا کہ جن لوگوں (کفار) نے تم سے دین میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، (نہیں منع کرتا) کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ میں ان غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو مسلمانوں سے نہ تو جنگ کرتے ہیں نہ ان پر ظلم کر کے ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔ یہاں انصاف سے مراد حقوق اور مقدمات کا انصاف نہیں کہ ان حالتوں میں تو مسلمان کے لئے ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا لازم ہے۔ یہاں انصاف معاملات اور برتاؤ کا ہے کہ جو غیر مسلم، مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں، ان پر ظلم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کے ساتھ سختی کا معاملہ اور برتاؤ کیا جائے گا۔ لیکن جنہوں نے جنگ کی ہے نہ ظلم کیا ہے ان کے ساتھ معاملات اور برتاؤ بھی نرمی اور اچھائی کے ساتھ کیا جائے گا۔

دیکھیے آقائے رحمت ﷺ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی برتاؤ کی کیسی نظیر قائم فرمائی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام اہل طائف کے پاس پیغام رحمت لے کر پہنچے تو ان ظالموں نے نہ صرف آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ آپ پر پتھر برسائے۔ اتنے پتھر برسائے کہ آپ کا جسم مبارک لہو لہان ہو گیا۔ خون سے نعلین مبارک بھر گئیں۔ لیکن اس رحمت والے آقا ﷺ نے ان پر اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کی بجائے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔

کون نہیں جانتا کہ اہل مکہ نے نبی رحمت ﷺ اور ان کے صحابہ پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے۔ حتی کہ مکہ کی مقدس

سرزمین چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ لیکن کیا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا بتا سکتا ہے کہ آپ نے کسی مکی سے کوئی انتقام لیا ہو۔ اس کے برعکس آپ کی رحمت ان پر متواتر برستی رہی۔ جب حضرت ثمامہ بن آثال رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ کو غلہ فروخت کرنا بند کیا اور وہ بھوک سے تڑپنے لگے تو میرے آقا کے دربار میں حاضر ہو کر انہوں نے حضرت ثمامہ کی شکایت کی اور اپنی پریشانی کا رونا رویا۔ سرکار نے اپنے غلام حضرت ثمامہ کو حکم دیا کہ جس طرح تم اہل مکہ سے غلہ کی تجارت کیا کرتے تھے اسی طرح کرتے رہو۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا، جب مکہ فتح ہوا اور پتھر برسانے والے مجنون و دیوانہ کہنے والے۔ گالیاں دینے والے پیغام الٰہی کا مذاق اڑانے والے، ظالم آپ کے دربار میں بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ آج کا کوئی حاکم اگر اپنے دشمن کے ملک پر غلبہ پا لے تو نہ جانے دشمنوں کا کیا حال کرے۔ کیسے کیسے انتقام کی آگ بجھائے۔ لیکن دنیا آج تک دنگ ہے کہ آقائے رحمت ﷺ نے فتح مکہ کے بعد سب سے پہلا اعلان یہ فرمایا کہ:

"بچوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، بوڑھوں کو تکلیف نہ دینا، عورتوں کو قتل نہ کرنا، جو اپنا دروازہ بند کر لے، اس کے لیے پناہ ہے۔ سردار مکہ ابوسفیان کے گھر میں جو چھپ جائے اس کے لئے پناہ ہے اور جو ہتھیار نہ اٹھائے اس کے لیے پناہ ہے"۔

صرف یہی نہیں بلکہ پھر آپ نے اپنے دربار میں حاضر سُورماؤں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ بولو! آج تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو۔ جو کل تک گالیاں دیتے تھے آج ان کی زبانیں اقرار کرتی ہیں۔

خَيْرًا، اَخٍ كَرِيْمٍ وَ ابْنُ اَخٍ كَرِيْمٍ نیکی کی امید رکھتے ہیں، آپ شریف بھائی کے شریف بیٹے ہیں

جوابا رحمت کی برکھا برستی ہے اور اعلان ہوتا ہے۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَآءَ آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو

کیا غیر مسلموں اور وہ بھی دشمنوں کے ساتھ ایسے برتاؤ کی کوئی نظیر پیش کی جا سکتی ہے یہ بے نظیر، نظیر صرف کائنات کے لیے رحمت بن کر مبعوث ہونے والے نبی مکرم علیہ السلام نے قائم کی۔ اور اسی کی اتباع خلفائے راشدین اور ان کے بعد حکامِ صالحین کرتے رہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اہل ایمان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر غیر مسلموں سے موالات کی ممانعت فرمائی۔ کیونکہ ان کے کفر نے ان کو ناقابل اعتماد بنا دیا ہے۔ وہ نہ تو کبھی اہلِ ایمان کے بہی خواہ رہے اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ ان پر اعتبار کر کے اپنے راز تک انہیں بتا دیئے جائیں۔ پس اہلِ ایمان کو ان سے ہوشیار رہنا چاہیے تاکہ وہ ان کی شر انگیزی سے بچے رہیں۔ ہاں دنیاوی نظام کی بقاء اور دنیاوی امور جاری رکھنے کے لیے ان سے معاملات کرنے کی پوری پوری اجازت ہے۔ نیز تبلیغ دین کی نیت اور اسلام کے حُسنِ تعلیم و تربیت کے لیے ان سے مواسات اور ہمدردی کی بھی ممانعت نہیں۔ یہ ایک نہایت ہی منصفانہ حکم ہے جس پر کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اور اسی پر عمل میں مسلمان کی بھلائی ہے۔ انفرادی طور پر

بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔

ہر دور میں اور بالخصوص ہمارے دور میں مسلم حکمرانوں نے کفار کے ساتھ جس قسم کے روابط قائم کیے اور قرآنی حدود کو تجاوز کر کے ان پر جس طرح اعتماد کیا اس کا انجام ذلت وخواری، امت میں انتشار وافتراق کے سوا کچھ نہ ہوا۔ مسلم حکومتیں چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہوئیں۔ مسلمانوں کی دولت اور ان کے وسائل پر غیر مسلموں کا قبضہ ہوتا رہا اور ایک طاقتور قوم کو مکار قوم نے ایسا کھوکھلا کر دیا کہ آج وہ مکاروں کے ہاتھوں میں کھیلنے اور ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہو گئے۔ کاش اس صورت حال پر اب بھی مسلم حکمران غور کریں۔ اللہ کی ہدایت پر عمل پیرا ہو جائیں۔ تو کیا عجب کہ کریم آقا کرم فرمائے اور ہم دوبارہ باعزت وباوقار بن جائیں۔ اے اللہ توفیق عمل عطا فرما۔ آمین۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مقالہ ۱۶

آل عمران: ۱۳۰ تا ۱۳۵

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَۚ﴿۱۳۰﴾

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَۚ﴿۱۳۱﴾

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَۚ﴿۱۳۲﴾

وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَۙ﴿۱۳۳﴾

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَۚ﴿۱۳۴﴾

وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ۫ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۪ۙ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ﴿۱۳۵﴾

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَ
نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾
قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾
هَٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾
وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾
إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ
النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ
الظَّالِمِينَ ﴿١٤٠﴾
وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ﴿١٤١﴾
أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ
الصَّابِرِينَ ﴿١٤٢﴾
وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿١٤٣﴾
وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ
انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ
الشَّاكِرِينَ ﴿١٤٤﴾
وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا ۗ وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا
نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ﴿١٤٥﴾
(آل عمران: ۱۳۰ـ۱۴۵)

اے ایمان والو! دُگنے پر دُگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ

اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی تا کہ تم رحم کیے جاؤ۔

اور جلدی کرو اپنے رب کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان ہیں اور زمین، تیار کی گئی، ہے پرہیزگاروں کے لئے۔

جو خرچ کرتے ہیں آسانی اور تنگی میں اور غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اور وہ لوگ جب بے حیائی کا کام کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو اللہ کو یاد کر کے معافی مانگیں، اپنے

گناہوں کی اور کون ہے اللہ کے سوا جو گناہوں کو بخشتا ہے اور وہ جان بوجھ کر اپنے کیئے پر اصرار نہ کریں۔

ایسے لوگوں کا بدلہ ان کے رب کی بخشش ہے اور باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور کیا ہی اچھا بدلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا۔

بیشک تم سے پہلے (قانون قدرت کے) طریقے گزر چکے ہیں تو زمین میں چلو اور دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

یہ لوگوں کے لیے واضح بیان اور پرہیز گاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

اور سُستی نہ کرو اور غمگین نہ ہو، اور تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم (کامل) مؤمن ہو۔

اگر تمہیں زخم لگے تو تمہارے دشمنوں کو بھی اسی طرح زخم پہنچے اور ان دنوں کو ہم پھیرتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان اور تاکہ دیکھ لے اللہ ایمان والوں کو اور بنالے تم میں سے (کچھ لوگوں کو) شہید اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور اس لئے کہ اللہ مسلمانوں کو خالص کردے اور کافروں کو مٹادے۔

کیا تم نے گمان کرلیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تمہارے مجاہدین اور صبر کرنے والوں کو (ان کے غیروں سے) ممتاز نہیں کیا۔

اور بیشک تم موت کی تمنا کرتے تھے، اس کے ملنے سے پہلے تو اب تم نے اسے دیکھ لیا اور وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اور محمد (ﷺ معبود نہیں) صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول ہو چکے تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید ہوں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹے پاؤں پھرے گا تو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچائے گا اور عنقریب اللہ شکر گزاروں کو بدلہ عطا فرمائے گا۔

اور کسی جان کے لیے حکم الٰہی کے بغیر موت نہیں، (سب کی) اجل لکھی ہوئی ہے اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا، ہم اس میں سے اسے دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا ہم اس میں سے اسے دیں گے اور عنقریب ہم (اچھا) بدلہ دیں گے شکر گزاروں کو۔

یہ سورۂ آل عمران کی سولہ آیات ہیں جن میں ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا'' کے پیارے جملہ سے خطاب کرتے ہوئے، اللہ رب العزت ایمان والوں کو وہ خصوصی احکام و ہدایات دے رہا ہے جو ان کے کمالِ ایمان دنیا کی فلاح و بہبود اور آخرت میں بلند مراتب کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

ان آیات میں جو مضامین بیان ہو رہے ہیں انہیں ہم ہر آیت کے ذیل میں علیحدہ علیحدہ پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

حرمتِ ربوٰ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۚ

اے ایمان والو! دُگنے پر دُگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اہل ایمان کو سود کھانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ اور یہ ممانعت اس حال کے مطابق کی جا رہی ہے جو اس آیہ مبارکہ کے نزول کے وقت تھا۔ یعنی اہلِ عرب میں سود سے متعلق یہ خودساختہ قانون رائج تھا کہ اگر مقروض، قرض اور سود کی رقم وقت پر ادا نہ کر پاتا تھا اور مجبور ہو کر وہ مزید مہلت چاہتا تھا تو قرض دینے والا اس کو اس شرط پر مہلت دے دیتا تھا کہ سود دگنا ادا کرنا ہوگا۔ اور اس طرح بڑھتے بڑھتے بسا اوقات سود کی رقم دُگنی چوگنی حتیٰ کہ کبھی اصل رقم سے بھی زائد ہو جاتی تھی اور بے چارہ قرض دار ساری زندگی کے لیے قرض میں جکڑ جاتا تھا۔ یہ رواج صرف اس زمانہ ہی میں نہ تھا بلکہ ہمارے دور میں بھی سود کا قانون یہی ہے کہ اگر وقت پر سود ادا نہیں کیا جاتا ہے تو اس رقم پر بھی سود لگ جاتا ہے اور ہوتے ہوتے سود کی ہی یہ رقم اصل سے اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اسی کا سود ادا ہوتا رہتا ہے۔ اصل قرض کی ادائیگی کا وقت ہی نہیں آپاتا۔ دیکھ لیجئے ان ممالک کو جو نام نہاد بڑی طاقتوں یا بڑے ملکوں کے مقروض ہیں، سودی قرضوں ہی نے ان چھوٹے ممالک کو بڑے ممالک کا غلام بنا دیا ہے۔ وہ آزاد ہونے کے باوجود نہ اپنی معاشی پروگرام میں آزاد ہیں نہ ہی سیاسی امور میں۔ حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی آزاد نہیں۔ بس قرضداوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

بہر حال سود کا یہ قانون انسانوں پر ایک ظلم ہے جس سے اللہ اہلِ ایمان کو بچانے کے لیے حکم دیتا ہے کہ دُگنا، چوگنا سُود نہ کھاؤ۔ ''اضعافاً مضٰعفه'' کی قید احترازی یا اتفاقی نہیں بلکہ واقعی ہے کہ جیسا رواج ہے ایسا نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تھوڑا سود جائز ہے لے لیا کرو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بالکل نہ کھاؤ جیسا کہ ہم کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ کسی بچے کو مار رہا ہے تو کہیں بھائی اتنا نہ مارو۔ مطلب یہی ہے کہ اس کمزور پر ظلم نہ کرو، اسے نہ مارو۔ اسی طرح یہاں رواج کے مطابق فرمایا گیا کہ دوگنا، چوگنا سُود نہ کھاؤ۔ یعنی سُود بالکل نہ کھاؤ۔ جس کی وضاحت سورۂ بقرہ کی آیات میں موجود ہے۔ جو ترتیب قرآن میں اس آیت سے پہلے ہیں۔ لیکن نزول میں اس آیت کے بعد ہیں۔ فرمایا گیا۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ (البقرہ:۲۷۵)

جو لوگ سود کھایا کرتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔

اسی آیت میں آگے ارشاد ہوتا ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ:۲۷۵)

اور حلال فرمایا اللہ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔

پھر ارشاد ہوا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (البقرہ:۲۷۶)

اللہ سود کو مٹاتا اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔

پھر فرمایا جارہا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ:۲۷۸-۲۷۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم سچے مؤمن ہو۔
اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اور اگر تم (سودی کاروبار سے) توبہ کرلو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ذلیل وخوار کیا۔ حتیٰ کہ بطور سزا ان پر کئی حلال چیزوں کو بھی حرام فرمادیا۔ جس کا سبب ان کی نافرمانیاں تھیں جن میں ایک ان کی سودخوری کی عادت اور سودی کاروبار بھی تھا۔ فرمایا گیا:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء:۱۶۱)

اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کیے گئے تھے اس سے

ان آیات نے نہ صرف حرمت سود کی وضاحت کردی بلکہ سود کھانے والوں اور سودی کاروبار کرنے والوں کا انجام بھی بیان کردیا کہ قیامت کے دن یہ لوگ اپنی قبروں سے حیران و پریشان جھومتے ہوئے پاگلوں کی طرح اٹھیں گے، جیسے کہ شیطان نے انہیں لپٹ کر مجنوں و دیوانہ کردیا ہو۔ ان کی حرکتیں ایسی ہوں گی کہ دیکھنے والے انہیں پہچان لیں گے کہ یہ سودخور ہیں۔ اس بھیانک صورت کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مزید وضاحت فرمائی کہ "معراج کی شب میرا گزر ایسے لوگوں پر سے ہوا جن کے پیٹ "کالبیوت" گھروں کی طرح بڑے بڑے تھے اور باہر ہی سے ان میں سانپ نظر آرہے تھے۔ پس میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں تو انہوں نے بتایا کہ یہ سودخور ہیں۔ نیز قرآن کریم نے بتایا کہ اللہ سود کو مٹاتا ہے یعنی سود سے کتنی ہی دولت حاصل کرلی جائے وہ کافی نہیں ہوتی۔ سودخور دولت کی ہوس میں اتنا مبتلا ہوجاتا ہے کہ ہر وقت بھکاری ہی بنا رہتا ہے۔ میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے کہ "سود سے مال کتنا ہی بڑھ جائے آخر کار وہ گھٹتا ہی ہے۔"

آیت زیر گفتگو پر پھر نظر ڈالیے۔ سود، کھانے کی ممانعت کے بعد خاص طور پر دو ہدایتیں دی جارہی ہیں۔ اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔ اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

پہلی ہدایت کا منشاء یہ ہے کہ کامیابی و کامرانی اسی میں ہے کہ اللہ سے ڈر کر سودی کاروبار سے توبہ کرلی جائے کہ

انسان کی یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ سود معیشت کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے بغیر ملکی، قومی یا انفرادی طور پر معاشی آسودگی اور خوش حالی حاصل نہیں ہوسکتی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کہ معاشی فلاح ایسی دولت سے نصیب ہوتی ہے جس میں سود کی دولت شامل نہ ہو۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آج اکثر ممالک اور اکثر افراد بظاہر دولت کی فراوانی کے باوجود معاشی بدحالی میں صرف اس لئے مبتلا ہیں کہ وہ سودی لین دین میں ملوث ہیں۔ کوشش کے باوجود نہ ان کی حالت سُدھری ہے اور نہ سُدھر سکتی ہے۔ کہ وہ اللہ کے حکم سے کھلم کھلا بغاوت کر رہے ہیں اور اللہ باغیوں اور نافرمانوں کی مدد نہیں فرماتا۔ وہ ذلیل وخوار اور پریشان حال ہی رہتے ہیں۔

دوسری ہدایت کا منشاء یہ ہے کہ ایمان والو، جہنم تو ہم نے کافروں کے لیے بنایا ہے تم ایسے اعمال اختیار نہ کرو کہ کافروں کے ساتھ تمہارا ٹھکانہ ہو۔ یا کہیں ایسا نہ ہو کہ سود کھاتے کھاتے تمہارے دل اتنے سیاہ ہو جائیں کہ ان میں ایمان کا نور بالکل باقی نہ رہے۔ حتی کہ تم سود کو حلال سمجھنے لگو اور ایمان سے محروم ہو کر اسی حال میں مر جاؤ۔ اور پھر تمہارا ٹھکانہ وہی جہنم ہو جائے جو کافروں کے لیے بنائی گئی ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حرمت سود کی آیتوں میں یہ آیت نہایت ہی خوفناک ہے کہ اس میں اس خطرے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ سود خور کہیں کافر ہو کر نہ مرے کہ کافروں والی آگ اس کا ٹھکانہ بن جائے۔ (اللہ محفوظ رکھے)

غرضیکہ دیگر حرام چیزوں کی طرح سود کی حرمت نہایت واضح ہے۔ اس عنوان پر ہم سورۃ البقرہ کی آیات کے ذیل میں کافی تفصیل سے گزشتہ اوراق پر لکھ چکے ہیں۔ لہذا یہاں اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

اللہ و رسول کی اطاعت

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی تاکہ تم رحم کیے جاؤ۔

ہدایت بالکل واضح ہے کہ ایمان والو، اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحمت سایہ فگن ہو۔ اطاعت یعنی فرمانبرداری کا مطالبہ اللہ اپنے بندوں سے کرتا ہے جبکہ بندے آپس میں ایک دوسرے کو اپنا مطیع وفرمانبردار بنانا چاہتے ہیں۔ ہر بڑا چھوٹے سے، ہر طاقتور کمزور سے، ہر دولت مند غریب سے، ہر حاکم محکوم سے، ہر بادشاہ رعایا سے اطاعت وفرمانبرداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیونکہ بلاشبہ اطاعت دنیاوی نظام کے بقا کا ذریعہ ہے۔ جس گھر، شہر یا ملک کے لوگ اطاعت شعار نہ ہوں کسی کی اطاعت نہ کریں، کسی کو اپنا حاکم اور قائد تسلیم نہ کریں۔ کسی کے دیئے ہوئے نظام کی پابندی نہ کریں تو وہ انتشار و افتراق اور افراتفری کا شکار رہتے ہیں۔ باہمی اختلاف اور حقوق کے حصول کی جنگ انہیں کمزور اور ذلیل وخوار کر دیتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اطاعت انسان کی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے انسان ایسی قوت حاصل کرتا ہے جو اسے ہر قسم کی ذلت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اطاعت ہی معاشرے میں امن وسکون کا ذریعہ ہے۔ اسی سے انفرادی واجتماعی طمانیت نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے قوم میں نظم وضبط پیدا ہوتا ہے۔ اطاعت شعار لوگ دنیا والوں کی نظروں میں باوقار اور با

رعب ہوتے ہیں۔ظالموں کی نظریں ان پرنہیں اٹھ پاتیں۔وہ زندگی کے ہر میدان میں فلاح وکامیابی حاصل کرتے ہیں۔

لیکن انسان کے لیے انسان کی اطاعت کامیابی کی یقینی ضمانت نہیں۔کیونکہ انسان کے بنائے ہوئے اصول زندگی جن کی وہ دوسروں سے پابندی کرانا چاہتا ہے،کامیابی کی ضمانت نہیں دے سکتے کہ کسی انسان کو ایسا یقینی علم حاصل نہیں جس سے وہ دوسروں کی طبائع اور رجحانات کا صحیح صحیح اندازہ کر سکے۔یہ صرف اور صرف خالق انسان، اللہ وحدہ لاشریک ہے جس نے انسان کو ایسا نظام حیات عطا کیا جس کی پابندی انسان کے لیے دشوار بھی نہیں اور دنیا کی فلاح و بہبود کا یقینی ذریعہ بھی ہے۔

پس درحقیقت وہی اس لائق ہے کہ بندہ اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرے اور آپس میں اطاعت شعاری صرف اس حد تک رہے کہ خالق حقیقی کی نافرمانی نہ ہونے پائے،جیسا کہ فرمایا گیا''لَا طَاعَةِ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ''

بیٹا باپ کی اطاعت کرے،محکوم حاکم کا حکم مانے۔رعایا بادشاہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرے۔لیکن کسی کا کوئی ایسا حکم قابل تسلیم نہیں۔جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو۔تاکہ ہر کسی کی اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہو سکے۔

آیت مذکورہ میں اطاعت کا مطالبہ اہلِ ایمان سے کیا جارہا ہے کیونکہ ایمان درحقیقت وعدہ اطاعت ہے۔پس ہر مؤمن اس وعدے کا پابند ہے۔گویا یہ مطالبہ نہیں بلکہ وعدے کی یاددہانی ہے کہ اے ایمان والوتم نے تو ایمان کی صورت میں ہم سے وعدہ کیا ہے کہ'' اے اللہ ہمارے تمام اعمال تیرے احکام کے مطابق ہوں گے'' اسی وعدے کا اعلان مسلم اول ﷺ سے اس طرح کرایا گیا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾

لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ (انعام: ۱۶۳۔۱۶۴)

آپ فرمائیے، بیشک میری نماز اور میری قربانیاں (جملہ اعمال) میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

نہیں کوئی شریک اس کا مجھے یہی حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

مسلم اول ﷺ کا یہ اعلان صرف اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والے امت مسلمہ کے ہر فرد کے لئے ہے۔پس اے ایمان والو، اپنے اس عہد کو پورا کرو اور اللہ کی اطاعت کرو۔اور صرف اللہ کی نہیں بلکہ رسول کی بھی اطاعت کرو۔کیونکہ ہمارے تمام احکام تمہیں بواسطہ رسول ہی پہنچتے ہیں۔وہی ہمارے احکام تمہیں سناتا ہے۔وہی ہمارے احکام کی تمہارے سامنے وضاحت کرتا ہے۔وہی ہمارے احکام کی تعمیل کا تمہیں طریقہ بتاتا ہے۔پس تم اس کی بھی اطاعت کرو کہ اس کی اطاعت درحقیقت ہماری ہی اطاعت ہے۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰی فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْہِمْ حَفِیْظًا ﴿۸۰﴾

(النساء: ۸۰)

جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی اور جس نے منہ پھیرا تو (محبوب) ہم نے آپ کو ان کا پاسبان بنا کرنہیں بھیجا۔

گویا منشائے الٰہی یہ ہے کہ امتی رسول کو صرف پیغمبر، استاد یا معلم ہی کا مرتبہ نہ دیں، بلکہ اسے اپنا حاکم تسلیم کریں۔ یہ رسول کا وہ اعلیٰ منصب ہے، جس کو تسلیم کرنا ہر امتی پر فرض ہے۔ اسی لئے بعثت رسول کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی قرار دیا گیا کہ ''امتی رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کریں'' ارشاد ہوا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (النساء: ٦٤)

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے

پس جس شخص نے رسول کی اطاعت سے فرار اختیار کیا، اس کے لیے کہیں پناہ نہیں وہ کتنا ہی اللہ کی اطاعت کا دعویٰ کرے اسے مطیع تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ جب اس نے اللہ کا یہی حکم تسلیم نہ کیا تو دوسرے احکام تسلیم کرنے کا دعویٰ کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے۔ پس اطاعتِ رسول، اللہ کی اطاعت کا ذریعہ بھی ہے اور اللہ کی اطاعت بھی اور یہ اطاعت بالکل اسی طرح بلا تردد ہونا چاہیے جس طرح اللہ کے احکام کی اطاعت ہوتی ہے۔ یعنی رسول کے عطا کردہ احکام میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ کیا جائے۔ فرمایا گیا۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (الحشر: ٧)

اور رسول تمہیں جو دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔

پس رسول کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کی طرح فرض ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کہ اگر رسول کی اطاعت سے گریز اختیار کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ اللہ کی اطاعت نہیں ہو سکے گی بلکہ پورے دین سے ہاتھ دھونا پڑیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو اپنے اور انسان کے درمیان ایسا واسطہ ووسیلہ بنایا ہے کہ کوئی حکم بغیر رسول کے نہیں دیا گیا۔ پس جو بھی اللہ کے حکم کو لینا اور اس پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے مجبوراً رسول کا حکم پہلے ماننا ہوگا۔ نیز احکام الٰہی پر عمل کا طریقہ رسول ہی تعلیم فرماتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ کی پابندی اللہ کا حکم ہے۔ لیکن اس حکم کی تعمیل کا طریقہ رسول ہی نے سکھایا۔ جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو اللہ کے حکم کی تعمیل رسول کی اداؤں کے مطابق کرتے ہیں۔ یہی صورت تمام عبادات میں اختیار کرنا پڑتی ہے۔ گویا خود بخود اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اب کون ہے جو اطاعت رسول سے فرار اختیار کرے گا۔ اور جو اس قدر اہتمام کے باوجود بھی رسول کی اطاعت کے انکار کی جرأت رکھتا ہے تو وہ اہل ایمان کے اس گروہ سے خارج ہے جسے اللہ اپنی اور رسول کی اطاعت کا حکم دے رہا ہے۔

اطاعت کا نتیجہ

اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ ہی اس کا نتیجہ بھی بتا دیا گیا تا کہ اہل ایمان اس کے حصول کے لئے اطاعت و فرمانبرداری کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں ''لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ'' اے ایمان والو اگر تم نے اللہ اور رسول کی کما حقہ اطاعت کی تو رحمن ورحیم رب تم پر رحم فرمائے گا۔ یعنی تمہاری انگاروں بھری دنیا کو گل گلزار کر دے گا۔ تمہاری زندگی کے ہر مرحلے کو

تمہارے لیے سہل وآسان کر دے گا۔ تمہارے رزق میں اتنی برکت ہوگی کہ تمہیں حصولِ دولت کے لیے نہ سود کے کاروبار میں ملوث ہونا پڑے گا نہ رشوت اور دیگر حرام ذرائع سے دولت کمانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ تمہارے درمیان ایسا باہمی اعتماد، میل ومحبت پیدا ہوگا کہ تمہیں اپنے ذاتی مسائل یا قومی معاملات میں کسی کے در کا بھکاری بننا نہیں پڑے گا۔ تم ایسے متحد ومنظم ہو جاؤ گے کہ دشمن تمہاری طرف نظر اٹھاتے ہوئے بھی کانپے گا۔ تمہاری صحت وتندرستی تمہارا ظاہری حسن وجمال، تمہیں ایسا با رعب اور باوقار بنا دے گا کہ اپنوں کے لیے تم میں کشش ہوگی اور غیروں کے لئے خوف یہی ہے رحم کی بارش جو اللہ اور رسول کے اطاعت شعار بندوں پر بارہا برس چکی ہے۔ آج بھی برس سکتی ہے بشرطیکہ ہم مطیع وفرمانبردار بن جائیں، اور یہی ہے وہ ''حیوٰۃِ طیبہ'' جس کا وعدہ اہلِ ایمان سے کیا گیا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النحل: ۹۷)

جو بھی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم ضرور دیں گے انہیں ان کا اجر، ان کے اچھے کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے

یہ پُرسکون باعزت زندگی صرف مطیع وفرمانبردار بندوں کا نصیب ہے۔ دنیا کی کثیر سے کثیر دولت کے عوض بھی اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پس ''اے ایمان والو! تم اطاعت شعار بن جاؤ، اللہ کی بے بہا رحمت تم پر سایہ فگن ہوگی''۔

اعمال صالحہ میں جلدی

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

اور جلدی کرو اپنے رب کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین ہیں، تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لیے

اہلِ ایمان کو مغفرت وجنت کی طرف، سرعت، جلدی کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے اعمال صالحہ اور نیکیوں میں جلدی کرو جو گناہ کی بخشش اور دخولِ جنت کا ذریعہ بنیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگی کا یہ چراغ بجھ جائے اور تم دنیا سے گناہوں کا بوجھ لادے رخصت ہو اور آخرت میں بھی تم پر جنت کے دروازے بند ہوں۔ پس اعمالِ صالحہ میں جلدی کرو کہ یہی ایمان کا مقتضی اور اہل ایمان کا شعار ہے۔ فرمایا:

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۱۴)

ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے، اور جلدی کرتے ہیں نیکیوں میں اور یہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔

سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے، حضرت ابراہیم، لوط، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یونس اور زکریا علیہم السلام پر اپنے

خصوصی انعامات کا ذکر فرمایا۔ اور پھر بتایا کہ ان حضرات کی خوبی یہ تھی کہ:۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝

(انبیاء:۹۰)

بیشک وہ بہت جلدی کرتے تھے نیکیاں کرنے میں اور پکارتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے اور وہ ہمارے سامنے بڑا عجز و نیاز کرتے تھے۔

اعمال صالحہ میں سرعت و جلدی کن لوگوں کا وطیرہ ہے۔ اس کا جواب درج ذیل آیات سے حاصل کیجئے۔ فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۵۷

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۸

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝۵۹

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝۶۰

اُولٰۗىِٕكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝۶۱ (مومنون:۵۷۔۶۱)

بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈر رہے ہیں

اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں

اور وہ جو دیتے ہیں، جو کچھ دیتے ہیں۔

اس حال میں کہ ان کے دل ڈر رہے ہیں (اس خیال سے) کہ وہ (ایک دن) اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں

یہی لوگ جلدی کرتے ہیں نیکیاں کرنے میں اور وہ نیکیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں

اسی ہدایت کا اعادہ سورۂ حدید میں لفظ "سابقوا" سے کیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱ (الحدید:۲۱)

تیزی سے آگے بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کے برابر ہے۔ جو تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر یہ اللہ کا فضل ہے، عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے۔

اعمال صالحہ میں سرعت و سبقت کرنے والوں ہی کو مقرب بارگاہ ایزدی قرار دیا گیا۔ فرمایا گیا:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰ اُولٰۗىِٕكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱ (الواقعہ:۱۰۔۱۱)

اور نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے وہ سبقت کرنے والے ہوں گے (قیامت کے دن بھی) وہی

مقرب بارگاہ ہیں۔

ان تمام آیات مبارکہ سے منشاء الٰہی یہی ملتا ہے کہ مؤمن کو نیکیوں اور بھلائیوں میں سرعت کرنا چاہیے۔اس طرح کہ نیک کام کرنے کا جونہی موقع ہاتھ آئے اس کو ضائع نہ ہونے دے، اور اگر نیکی ایک ہو اور کرنے والے متعدد ہوں تو ہر ایک کو دوسرے سے آگے بڑھنے اور اس نیک کام میں حصہ لینے کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہر نیک کام مغفرت کا ذریعہ اور جنت کا زینہ ہے۔اس کے کرنے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی بڑی محرومی کا باعث بن سکتی ہے کو جو سانس اندر جاتا ہے اس کے باہر واپس آنے کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ نماز کا وقت ہوگیا یہ نہ سوچو کہ ابھی کافی وقت ہے، ابھی پڑھتا ہوں۔فوراً دوڑ واور اللہ کے دربار میں حاضر ہو جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ابھی ابھی کرتے کرتے محروم ہی رہ جاؤ۔ یہ ایک مثال پیش کی گئی ہر نیکی کے لئے ایسی ہی جلدی کرنا چاہیے۔ خاص طور پر ہم یہاں حج کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔اکثر لوگوں پر حج فرض ہوجاتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ ابھی تو عمر پڑی ہے، آخر عمر میں حج کریں گے تا کہ گناہ معاف کرا کے پاک وصاف ہو کر دنیا سے جائیں۔کس قدر اچھا خیال ہے لیکن شیطانی خیال ہے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اُس کی آخری عمر کب ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اگلا لمحہ ہی آخری ہو۔پس ایسے خیالات سے توبہ کرنا چاہیے اور اللہ کے حکم پر عمل کرنا چاہیے کہ '' دوڑ و مغفرت و جنت کی طرف'' اور '' فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ '' دوڑو بھلائیوں کی طرف۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ:

كَانُوْا اَحْرَصَ شَيْءٍ عَلَى الْخَيْرِ

صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین نیکیوں پر سب سے زیادہ حریص تھے۔

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی بھلائی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔بسا اوقات وہ نیک کام میں پہل کرنے یا زیادہ حصہ لینے کے لیے آپس میں لڑنے تک لگتے تھے اور یہ خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں تلواریں نہ نکل آئیں۔امام بخاری نے ہی یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا، کہ وہ مسجد میں حاضر ہوئے تو حضور علیہ السلام نماز پڑھا رہے تھے اور رکوع میں تھے۔ میں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کرلیا (تا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ رکوع کرنے کے ثواب سے محروم نہ ہو جائیں) نماز سے فارغ ہو کر میں نے حضور علیہ السلام کو یہ بات بتائی تو آپ نے فرمایا:

زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ

اللہ تمہاری حرص کو اور زیادہ کرے لیکن دوبارہ ایسا نہ کرنا

یعنی حرص تو اچھی بات ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ شرعی احکام کا لحاظ نہ رہے۔

جنگ بدر کے موقع پر نبی کریم علیہ السلام نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا '' اس جنت کی طرف تیزی سے دوڑو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ حضرت عمیر بن حمام نے یہ ارشاد سنا تو دوڑے ہوئے سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! کیا جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ آپ نے فرمایا بیشک، عمیر کے ہاتھ میں کھجوریں تھیں جو وہ کھا رہے تھے، کہنے لگے اگر میں یہ کھجوریں کھانے کی دیر تک زندہ رہا تو بہت دیر ہو جائے گی کھجوریں

پھینکیں اور تلوار لہراتے میدان جنگ میں کود پڑے۔ خوب لڑے اور بالآخر جس مقام کی آرزو لے کر گئے تھے اسے پالیا، یعنی شہید ہوگئے۔

تعمیر مسجد نبوی شریف کے موقع پر حضور علیہ السلام کے ہمراہ صحابہ کرام کا جو جوش و جذبہ اور مغفرت و جنت کی طرف دوڑنے کا جو منظر سیرتِ مبارکہ کی کتابوں میں محفوظ ہے، اس کے مطالعہ سے جسم کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات ''سَارِعُوْا'' اور ''فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ'' کے حکم پر کس طرح عمل پیرا تھے۔ خود میرے آقا ﷺ کے حال کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے۔ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ ایک بھاری پتھر اٹھا کر لارہے تھے کہ اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ دوڑے ہوئے حاضر ہوئے اور گزارش کی کہ اے میرے آقا یہ بھاری پتھر مجھے دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا ''جاؤ، کوئی اور پتھر اٹھالاؤ، تم مجھ سے زیادہ اللہ کی رحمت کے محتاج نہیں ہو'' تمام صحابہ ایک ایک پتھر اٹھاتے تھے لیکن حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو پتھر اٹھاتے اور کہتے ایک پتھر میرے حصہ کا ہے اور دوسرا میرے آقا ﷺ کی طرف سے ہے۔

غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال اسی لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر سبقت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت ابوبکر نے اپنا سب کچھ پیش کر کے اپنے بلند مقام کا تحفظ کیا اور حضرت عمر کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ابوبکر سے آگے نکلنا ممکن نہیں، رضی اللہ عنہما۔

غرضیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی کے بے شمار واقعات سے یہ واضح ہے کہ یہ حضرات دین کے معاملہ میں حریص رہے۔ اور بھلائیوں کی طرف دوڑنا ان کا شیوہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ صحابہ میں ناسازگار حالات کے باوجود جس قدر تیزی اور سہولت کے ساتھ تعمیری اور تبلیغی امور انجام پائے ان کی نظیر نہ بعد میں آنے والے مسلمانوں کی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ کسی دوسری قوم میں اس کی مثال پائی جاتی ہے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قرآنی ہدایت کا مقصد درحقیقت دین کے تعمیری امور اور تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری کو پورا کرنے میں سہولت و آسانی فراہم کرنا ہے کہ جب مؤمن بھلائی اور نیکی میں سرعت اور سبقت کے جذبہ سے سرشار ہو جاتا ہے تو اس کے لیے دینی امور میں رکاوٹوں کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو خس و خاشاک کر دیتا اور تیز سے تیز طوفانوں کو ڈھکیل دیتا ہے۔

تجزیہ

قرآنی ہدایت کا مفہوم اور اس پر صحابہ کرام کا عمل آپ کو معلوم ہوگیا۔ تو اب ہم اپنی زندگی کا تجزیہ کریں۔ سچ بتائیے کیا ہم میں تھوڑا سا بھی یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں سبقت اور سرعت کی ہدایت پر عمل کرتے ہوں۔ نہایت معذرت کے ساتھ جواباً عرض ہے کہ ہم میں ایسا کوئی جذبہ تو درکنار، اس کا تصور بھی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ہم دنیا کی دوڑ، دولت کی حرص میں ایسے مبتلا ہیں کہ حلال و حرام کا امتیاز کیے بغیر اپنی دنیاوی اغراض کی تکمیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب دنیا کی حرص حرام ہے تو اس کی تکمیل کے لیے بھی ہمیں حرام ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ آج ہم حریص ہیں کہ ہمارا مکان ہمارے خاندان اور پڑوس میں سب سے اونچا اور سب سے بڑا ہونا چاہیے۔ ہمارے پاس سامان تعیش سب سے مہنگا اور زیادہ

ہونا چاہیے۔ ہماری گاڑی جب روڈ پر آئے تو دوسروں کی حسرت ویاس بھری نظریں اس پر پڑنا چاہئیں ۔ ہمارا لباس نہایت ہی فاخرانہ ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہے ہماری حرص اور اس میں ہم سرعت وسبقت کرنا چاہتے ہیں ۔جس کے دو نقصان ہمارے سامنے ہیں۔اول یہ کہ ہم اس حرص کی تکمیل کے لئے کسی نہ کسی طرح دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔سود لیتے ہیں،سود دیتے ہیں۔ ہماری بوٹی بوٹی سودی قرضے میں جکڑی ہوئی ہے۔راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے لیکن حرص سے باز نہیں آتے۔ اپنی ان آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ہم نے رشوت کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔نہ ہم کوئی کام رشوت کے بغیر کرتے ہیں نہ ہمارا کوئی کام رشوت کے بغیر ہوتا ہے۔ ہر محکمہ رشوت کے کاروبار کا بازار بنا ہوا ہے۔حرام کے اس کاروبار نے ہمارے سکون وچین اور ہماری نیند کو چھین لیا ہے۔ رشوت کی دولت کا ڈھیر سمیٹ لینے کے باوجود اندر سے ہمیں کوئی پکارتا ہے کہ تو چور ہے۔ اور عنقریب تیری سزا کا وقت آنے والا ہے۔سود ورشوت کے دھندے نے ہمارے معاشرے کو کیسا متاثر کیا ہے۔بس اس کا اندازہ اس حالت سے کر لیجئے کہ آج کوئی کسی کا دوست نہیں، کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔سب دنیا کی دوڑ میں پھنسے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو دھکے دے کر خود آگے نکلنے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ دن بدن دینی امور کی انجام دہی دشوار سے دشوار تر ہوتی جاتی ہے۔ ہماری آبادیوں میں شاندار مکانات موجود ہیں۔لیکن ایک مسجد بنانے میں، کوئی دینی مدرسہ بنانے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔منتظمین، آئمہ، علماء چندے مانگتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی تعمیر مکمل نہیں ہو پاتی۔ چندہ دینے والے اللہ کے حکم کے مطابق سبقت وسرعت پر عمل کے بجائے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔شادی، بیاہ اور دیگر تقاریب پر دولت بہانے والے جمعہ کے جمعہ بھی مسجد کے لیے بیس روپے دینے سے گریز کرتے ہیں۔غرضیکہ دین میں حرص، دینی کاموں میں سرعت وسبقت کی ہدایت پر عمل نہ صرف مغفرت وجنت کے حصول کا ذریعہ بلکہ اس کے بے شمار دینی اور دنیوی فوائد ہیں۔اللہ عمل کی توفیق دے۔

جنت کی چوڑائی

آیت زیر گفتگو میں جنت کی چوڑائی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔کہ جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ یہی بات سورۂ حدید کی آیت میں بھی ہے جو آپ ابھی ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس ارشاد سے جنت کی عظمت کا اظہار مقصود ہے کہ تم اللہ کی بنائی جنت کو اس دنیا پر کسی طرح قیاس نہ کرو۔تمہاری نظر میں آسمان وزمین بہت بڑے ہیں لیکن جنت کی تو صرف چوڑائی ہی ساتوں آسمانوں اور زمین سے زیادہ ہے۔ پھر اس کی لمبائی کا کیا حال ہوگا کہ ہر چیز کی لمبائی وہی کہلاتی ہے جو چوڑائی سے زیادہ ہو۔اور یہ تو صرف اس جنت کی وسعت کا حال ہے جو متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ہم جیسے گناہگاروں اور طفیلیوں کو انشاء اللہ جو جنت ملے گی وہ اس کے علاوہ ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کیا جنت آسمان میں ہے۔آپ نے فرمایا جنت کس آسمان میں سما سکتی ہے جنت تو ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش اعظم کے نیچے ہے۔(تفسیر کبیر)

شاہ روم ہرقل کے قاصد تنوخی نے بیان کیا کہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں شاہِ روم کا ایک عریضہ لے کر حاضر ہوا جس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ مجھے اس جنت کی دعوت دیتے ہیں جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے

اگر جنت اتنی بڑی ہے تو پھر دوزخ کہاں ہے۔ حضور علیہ السلام یہ سوال سن کر مسکرائے اور فرمایا جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ (روح المعانی)

سبحان اللہ، کیسا پیارا حکیمانہ جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سورج کی روشنی پھیلتی ہے تو رات کا وجود تو ختم نہیں ہو جاتا۔ رات باقی رہتی ہے ہماری نظروں یا ہمارے ملک کے حدود میں نہیں تو دوسرے ملکوں میں تو ہوتی ہے اسی طرح جنت چاہے کتنی ہی وسیع ہے لیکن اللہ نے دوزخ کو بھی کسی نہ کسی جگہ رکھا ہے جو جنت کے نچلے حصہ میں ہے۔

بہر حال جنت کی چوڑائی کا ذکر اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ دنیا کی حرص میں مبتلا لوگ سمجھیں کہ اس دنیا سے بڑی بھی کوئی جگہ ہے، جہاں کے عیش و آرام، فرحت و سرور یا حسن و جمال، کسی خوبی کا بھی مقابلہ اس دنیا کی کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔ میرے آقا مالک جنت ﷺ کے چند ارشادات سنئے اور جنت کی طرف دوڑیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ''اللہ فرماتا ہے میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کی ہیں جن کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ان کا کسی انسان کے دل میں خیال آیا ہے۔ ان نعمتوں کا ذکر چھوڑ دو جن پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مطلع کر دیا ہے''۔ پھر آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی (ترجمہ) کسی انسان کو معلوم نہیں کہ ان کے نیک کاموں کے صلہ میں جو ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ (مسلم شریف)

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ''جنت میں ایک درخت ہے، ایک سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے گا۔ پھر بھی اسے طے نہ کر پائے گا''۔ (مسلم شریف)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ''جنتی لوگ جنت میں ایک دوسرے کے بالا خانے اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم لوگ آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو''۔ (مسلم شریف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ''صبح یا شام کے وقت اللہ کی راہ (جہاد) میں نکلنا دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہے۔ اگر جنت کی عورتوں میں سے کوئی زمین کی طرف جھانک لے تو دونوں (جنت و زمین) کی درمیانی جگہ کو چمکا دے گی اور دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو خوشبو سے بسا دے گی اور اس کے سر کا دوپٹہ دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہے''۔ (بخاری شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ''جنت میں کوڑا رکھنے کی جگہ دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہے''۔ (بخاری شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ''جو جنت میں داخل ہوگا وہ ناز و نعم میں رہے گا نہ اسے کوئی فکر ہوگی نہ اس کے کپڑے پرانے ہوں گے اور نہ اس کی جوانی ختم ہوگی''۔ (مسلم شریف)

''اے اللہ ہمیں اپنے پیارے محبوب علیہ السلام کی شفاعت نصیب فرما تاکہ ہم تیری جنت میں داخل ہو سکیں''۔

متقین کون ہیں:

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ

یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ (آل عمران: ۱۳۴)

جوخرچ کرتے ہیں آسانی اور تنگی میں اور غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر متقین کی صفات اور خوبیاں بیان کر کے اہل ایمان کو متقی بننے کی دعوت دی ہے۔ آیت مذکورہ میں تین خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔آسانی وتنگی، ہر دور میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، غصہ پی جانا، لوگوں کو معاف کر دینا۔اگر غور کیا جائے تو ان تینوں باتوں کا تعلق نفسِ امارہ سے ہے۔ جو نہایت ہی سرکش ہوتا ہے اور انسان کو ہمہ وقت برائیوں پر اکساتا رہتا ہے۔ بالخصوص ان تین باتوں سے وہ روکتا ہے۔اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کہ جب انسان پر آسودگی اور خوشحالی کا دور ہوتا ہے تو یہ نفس اس کو اتنا مغرور ومتکبر کر دیتا ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی مدد کرنے کی بجائے انہیں حقیر سمجھنے لگتا ہے۔انہیں اپنے در سے دھتکارتا ہے۔ دیگر صدقہ وخیرات کرنا تو درکنار وہ زکوٰۃ تک ادا نہیں کرتا جو فرض ہے۔اور جب انسان پر تنگی اور غربت کا دور ہوتا ہے تو یہ نفس اسے تلقین کرتا ہے کہ تو کسی کی کیا مدد کرے گا جب خود ہی تو محتاج اور ضرورت مند ہے۔ یہی نفس انسان کو تھوڑے سے غصہ کی حالت میں اتنا بھڑکا دیتا ہے کہ وہ بلا فرق مراتب کسی کا لحاظ کیے بغیر بدزبانی پر اتر آتا ہے۔حتیٰ کہ اسے خود اپنے فائدہ ونقصان تک کا خیال نہیں رہتا۔اور وہ کر بیٹھتا ہے جس پر بعد میں خود پچھتاتا ہے۔مثلاً کسی کو قتل کر دینا، اپنے مال واسباب کو تباہ کر دینا، بیوی کو طلاق دے دینا۔نیز یہی نفس ہے جو انسان کو معافی مانگنے سے روکتا ہے۔حالانکہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔لیکن نفس اسے اُکساتا اور بتاتا ہے کہ معافی ہرگز نہ مانگنا یہ تو تیری بڑی ہی توہین اور بے عزتی ہے۔لیکن جو لوگ نفس پر قابو پالیتے ہیں وہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے جب دولت ہوتی ہے تو خوب خرچ کرتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس سے بڑی ہماری خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ نے ہمیں محتاج نہیں بلکہ محتاجوں کا معاون ومددگار بنایا۔اور جب دولت نہیں ہوتی تب بھی اپنی ضرورت روک کر دوسروں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔خود بھوکے رہتے ہیں اور بھوکوں کو کھلاتے ہیں۔اس امید اور یقین کے ساتھ کہ کسی کی بھی دعا ہماری حالت کی تبدیلی کا ذریعہ بن سکتی ہے اور کسی وقت بھی اللہ ہم پر رزق کے دروازے کشادہ فرما سکتا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب رزق عطا فرماتا ہے۔انہیں جب غصہ آتا ہے تو وہ اپنے نفس پر قابو پاتے ہیں اور سخت بات کا سختی سے جواب دینے کے بجائے نرمی سے جواب دیتے ہیں۔اس طرح وہ خاندان اور معاشرہ میں دشمنی اور عداوت کے کانٹے بونے کی بجائے محبت والفت کے پھول برساتے ہیں۔اور ان کا کسی سے اختلاف ہوتا ہے تو فوراً ہی معافی مانگ کر باہمی انتشار وافتراق کو ختم کر دیتے اور دوسروں کو دور کرنے کے بجائے اپنے قریب کر لیتے ہیں۔ان خوبیوں سے چونکہ نفس اَمارہ کمزور ہوتا ہے اور اس کی سرکشی کا خاتمہ ہوتا ہے لہٰذا مومن کا تقویٰ بڑھتا ہے اور وہ متقین کی فہرست میں شامل کر لیا جاتا ہے۔متقین کی ان تینوں خوبیوں کا قدرے تفصیل سے مطالعہ کیجئے۔اللہ عمل کی توفیق دے۔

پہلی خوبی

آسانی یعنی خوشحالی۔تنگی یعنی غربت۔ ہر حال میں خرچ کرنا تقویٰ ہے کہ اللہ بندے کی نیت اور اخلاص پر اجر عطا

فرماتا ہے۔ پس اجر اسے بھی ملے گا جو ہزاروں کا مالک ہو کر ہزار خرچ کرتا ہے اور اسے بھی جو چند پیسوں ہی کا مالک ہے اور ان میں سے بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے۔ نیز اللہ دولت کی محبت کو پسند نہیں فرماتا۔ پس دولت مند خرچ کرے یا غریب دونوں ہی اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ دولت کی محبت میں مبتلا نہیں بلکہ ہر حال میں اللہ کی رحمت کے خواہاں ہیں۔

قرآن کریم کی اس ہدایت کے مطابق جس طرح دولت مندوں کو دولت خرچ کر کے حصولِ تقویٰ کی دعوت دی جا رہی ہے اسی طرح غریبوں اور تنگ دستوں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور متقی بننے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ پس نہ تو مؤمن دولت مند کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ دولت ہوتے ہوئے بخل کرے اور نہ ہی غریبوں کے لیے یہ بہانہ کام آئے گا کہ وہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں جب وہ خود ہی محتاج ہیں۔ جس طرح دولت مند کے لیے ہزاروں روپے خرچ کرنا دشوار نہیں اسی طرح ایک غریب کے لیے چند پیسے خرچ کرنا مشکل نہیں۔ پس ہر حال میں اللہ کی راہ میں خرچ کر کے مزید دولت و برکت کا امیدوار ہونا چاہیے۔ میرے آقا ﷺ کا ارشاد ہے۔

اِتَّقُوا النَّارَ وَ لَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ وَّ رَدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بِظِلْفِ شَاةٍ

تم جہنم کی آگ سے بچو اگرچہ ایک کھجور کا ٹکڑا ہی صدقہ دے کر اور سائل کو واپس کرو چاہے بکری کی کھری ہی دے کر

حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ صرف پیاز کی ایک گانٹھ خیرات کی (کہ اس وقت گھر میں اس کے سوا کچھ نہ ہوگا اور سائل آ گیا ہوگا) حضرت عبداللہ ابن عمر نے ایک مرتبہ صرف انگور کا ایک دانہ خیرات کیا (کہ آپ انگور کھا رہے ہوں گے ایک دانہ باقی رہ گیا ہوگا کہ سائل آیا ہوگا، کچھ اور نہ ہوگا آپ نے وہی دانہ اس کو دے دیا تاکہ حضور علیہ السلام کے ارشاد پر عمل ہو جائے)

حضرت ام مُجید رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی فقیر میرے در پر آتا ہے اور میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اس وقت شرم آتی ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو کچھ دے دو اگرچہ جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ (ابوداؤد)

ذرا غور فرمایئے ان صحابہ کو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی فقیر کو دروازے سے خالی واپس کرنے میں شرم آتی تھی۔ اور ہم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی فقیر کو دھتکار دیتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم نے کیا کیا۔ نیز حضور علیہ السلام نے بھی یہ نہ فرمایا کہ جب تمہارے پاس کچھ نہیں ہے تو شرم کی کیا بات ہے، مجبوری ہے۔ بلکہ فرمایا کچھ بھی دے دو چاہے جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن فقیر کو خالی واپس نہ کرو۔

غرضیکہ قرآن وحدیث کی یہ ہدایت امیر وغریب سب کے لیے ہے کہ وہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اللہ کی راہ میں ضرور خرچ کریں کہ اسی خوبی سے تقویٰ کی ابتداء ہوتی ہے۔ چونکہ سورۂ بقر کی آیات کے ذیل میں ہم اس عنوان کو گزشتہ صفحات پر تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسری خوبی

متقین کی دوسری خوبی ''غصہ پی جانا'' ہے۔غصہ انسان کی وہ بدترین حالت ہے جو اس کی صحت وتندرستی اور دنیا و آخرت کی تباہی وبربادی کا باعث بنتی ہے کہ جب انسان کو غصہ آتا ہے تو خون کی حدت زیادہ اور رفتار تیز ہو جاتی ہے۔جس کا اثر دل و دماغ تک پہنچتا ہے اور کبھی دل اتنا متاثر ہوتا ہے کہ حرکت بند ہو جاتی ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔اسی لیے ڈاکٹر دل کے مریضوں کو خصوصی ہدایت کرتے ہیں کہ وہ غصہ ہرگز نہ کریں۔اور کبھی دماغ اتنا متاثر ہوتا ہے کہ آدمی کو قطعاً احساس نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔اپنے ماں باپ پر غصہ اتار رہا ہے یا بیوی بچوں پر۔گھریلو جھگڑے، خاندانی قتل، بیوی کو طلاق، والدین کی بے عزتی، گھر کے سامان کی توڑ پھوڑ۔یہ سب غصہ ہی کے کارنامہ ہوتے ہیں۔اس لئے کہ غصہ کرنے والے کا دماغ بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔جب غصہ ختم ہوتا ہے تو سر پکڑ کر روتا ہے کہ میں نے کیا کر ڈالا۔غصہ جو کچھ بھی کراتا ہے اس سے یا تو انسان کا مستقبل خراب اور دنیا تباہ ہو جاتی ہے یا عاقبت برباد ہوتی ہے۔پس اللہ نہیں پسند کرتا کہ اس پر ایمان رکھنے والا شیطان کا آلہ کار بنے اور مجنون و دیوانہ ہو کر خود ہی اپنے آپ کو تباہ کر لے۔لہٰذا ''غصہ پی جانا'' متقین کی خوبی قرار دیا گیا۔تاکہ جو بھی اللہ کی رحمتوں کے حصول کے لئے تقوی اختیار کرتا ہے اسے اپنے نفس پر قابو کرنا اور غصہ کو ختم کر لینا چاہیے۔پھر وہ تقویٰ کے اگلے مراحل کی طرف قدم بڑھائے تو کامیاب ہوگا۔ورنہ خطرہ ہی ہے کہ وہ غصہ میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے اس کی ساری عبادتیں اور نیکیاں برباد ہو جائیں۔اللہ محفوظ رکھے۔معلم کامل ﷺ کی حیات مبارکہ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پایا جاتا جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ کبھی آپ غصہ سے بے قابو ہوئے، جبکہ ہمہ وقت آپ کا دشمنوں سے واسطہ پڑتا تھا۔جو آپ کو ایذائیں بھی دیتے تھے اور گستاخیاں بھی کرتے تھے۔صرف ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

حضرت زید بن سعنہ رضی اللہ عنہ یہودیوں کے ایک عالم تھے۔انہوں نے اپنے مشرف باسلام ہونے کا طویل واقعہ بیان کیا، جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے مجھ سے کچھ قرضہ لیا تھا۔ابھی طے شدہ مدت میں چند دن باقی تھے کہ ایک دن آپ ایک انصاری کے جنازے سے فارغ ہو کر قبرستان میں ایک دیوار کے قریب بیٹھنے کے لیے تشریف لائے۔میں سامنے آیا اور آگے بڑھ کر میں نے آپ کی قمیص اور چادر کھینچی اور نہایت ہی تندی وتُرشی سے کہا ''اے محمد کیا تو میرا حق ادا نہیں کرتا'' ''اے عبدالمطلب کے خاندان والو، خدا کی قسم تم حقوق کی ادائیگی سے گریز کرتے رہتے ہو'' یہاں حضرت عمر بھی موجود تھے انہوں نے میری یہ گستاخانہ باتیں سنیں تو تلوار تان لی اور بولے اے اللہ کے دشمن تو اللہ کے رسول سے ایسی گستاخی کر رہا ہے (حضور علیہ السلام کو اس وقت بھی غصہ نہ آیا) آپ مسکرائے اور حضرت عمر کو روکتے ہوئے فرمایا، ''اے عمر مجھے اور اسے بجائے سختی کے اس بات کی زیادہ ضرورت تھی کہ تم مجھے ادائے حق کی اور اسے نرمی سے تقاضا کرنے کی تلقین کرتے''۔آپ نے فرمایا ''اے عمر اب تم اس کو لے کر جاؤ اس کا قرضہ ادا کرو اور اسے بیس صاع کھجوریں زیادہ دو، کیونکہ تم نے اسے دھمکایا اور ڈرایا ہے''۔پس حضرت عمر مجھے اپنے ہمراہ لے گئے اور حضور علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق میرا حق ادا کیا۔میں نے ان سے پوچھا، اے عمر کیا تم مجھے پہچانتے ہو میں زید بن سعنہ ہوں۔آپ نے فرمایا، یہودیوں کا عالم۔میں نے کہا جی، آپ نے فرمایا، حیرت تورات کا عالم ہوتے ہوئے تم نے اللہ کے رسول کے ساتھ ایسی گستاخی کی۔میں نے کہا اے

عمر، جس وقت محمد ﷺ سے ملا، میں نے ان کے اندر وہ تمام خوبیاں پائیں جو تورات میں بیان کی گئی ہیں۔ بس دو خوبیاں باقی تھیں جو آج مجھے معلوم ہو گئیں۔ ایک یہ کہ میں نے ان کی پشت پر مہر نبوت دیکھ لی، دوسرے یہ کہ وہ غصہ پر پوری طرح قابو رکھتے ہیں۔ جیسا کہ تورات میں بیان کیا گیا ہے۔ پس اے عمر! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ مشرف با سلام ہوا۔ حضرت زید نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ تم اس پر بھی گواہ رہو کہ میں اپنا آدھا مال امت کے لیے صدقہ کرتا ہوں۔

غصہ

اس قسم کے متعدد واقعات موجود ہیں جن سے واضح ہے کہ میرے آقا رحمۃ للعلمین ﷺ نے کبھی غصہ نہ فرمایا اور آپ کیسے غصہ میں مبتلا ہوتے جبکہ غصہ تو شیطان دلاتا ہے اور آپ کا شیطان تو پہلے ہی آپ کا مطیع وفرمانبردار بنا دیا گیا ہے۔ اب آپ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں جن سے غصہ کی قباحتوں کا اندازہ کیجئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ

(بخاری شریف)

پہلوان وہ نہیں جو (کسی کو) بچھاڑ دے، پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ پس آپ نے فرمایا:

لَا تَغْضَبْ فَرَدَّ ذٰلِکَ مِرَارًا قَالَ لَا تَغْضَبْ

(بخاری شریف)

غصہ مت کرو اور آپ نے بار بار فرمایا غصہ مت کرو

حضرت عطیہ بن عروہ سعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّیْطٰنِ وَ اِنَّ الشَّیْطٰنَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَ اِنَّمَا تُطْفَئُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَتَوَضَّاْ

(ابوداؤد)

بیشک غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے پس جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کر لیا کرے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ وَهُوَ قَآئِمٌ فَلْیَجْلِسْ فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَ اِلَّا فَلْیَضْطَجِعْ

(ترمذی شریف)

جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے پس اگر غصہ ختم ہو جائے تو ٹھیک ورنہ لیٹ جائے۔

حضرت بز بن حکیم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصِّبْرُ الْعَسَلَ

بیشک غصہ ایمان کو اسی طرح خراب کر دیتا ہے جیسے ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے (مشکوٰۃ)

ایلوا سخت کڑوا ہوتا ہے۔ شہد میں تھوڑا سا بھی ڈال دیا جائے تو شہد کڑوا ہو جاتا ہے۔ ایمان میٹھا ہوتا ہے غصہ اس کو کڑوا کر دیتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کا حصہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

جس نے اپنا غصہ روکا تو قیامت کے دن اللہ اس سے اپنا عذاب روک لے گا۔ (مشکوٰۃ)

غصہ کا علاج

احادیث مذکورہ پر غور کیجئے نبی معظم علیہ السلام غصہ کی ممانعت بھی فرما رہے، اور اگر کوئی اس آفت میں مبتلا ہو ہی جائے تو اس کا علاج بھی بتا رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب غصہ آئے تو وضو کر لو کیونکہ غصہ شیطان دلاتا ہے اس سے خون کی حدت زیادہ ہو جاتی ہے اور وضو میں جن اعضاء پر پانی ڈالا جاتا ہے اس کا اثر پورے جسم پر ہوتا ہے۔ لہٰذا وضو سے خون کی گرمی معمول پر آ جاتی اور غصہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اگر غصہ باقی رہے تو بیٹھ جانا یا لیٹ جانا چاہیے کہ غصہ کی وجہ سے خون کی رفتار تیز ہو جاتی اور دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔ بیٹھنے یا لیٹنے سے آرام ملے گا اور خون و دل کا نظام ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ علاج تو جسمانی اور طبی ہے اس کے علاوہ آپ نے روحانی علاج بھی بیان فرمایا۔ کیونکہ مسلمان جب بھی کسی بیماری میں مبتلا ہوا سے دعا اور دوا دونوں کرنا چاہیں۔ پس آپ فرماتے ہیں۔

سلیمان ابن ضرر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام کے دربار میں دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور گردن کی رگیں پھول گئیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِنِّيْ لَاَعْرِفُ كَلِمَةً لَوْقَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ الَّذِيْ يَجِدُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ کلمہ یہ شخص کہہ دے تو اس کا غصہ چلا جائے گا، (فرمایا وہ کلمہ ہے) اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ (مسلم شریف)

پس جب بھی آپ کسی کو جھگڑا کرتے دیکھیں اسے اعوذ پڑھنے، وضو کرنے، بیٹھ جانے یا لیٹ جانے کو کہیں اور ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ یہ یاد رکھے کہ غصہ کا یہ علاج اس کے آقا ﷺ نے بتایا ہے۔ لہٰذا اس پر عمل کرنے میں وہ پس و پیش نہ کرے۔ فوراً عمل کرے انشاء اللہ غصہ کی جملہ آفات سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ کوئی ڈاکٹر یا حکیم آپ کو غصہ کا علاج نہیں بتا سکتا۔ یہ صرف معلم کامل ﷺ ہی کو اللہ کا عطا کردہ علم ہے کہ آپ نے ہر مرض کا یقینی علاج بیان فرمایا اور ہمیں وہ کچھ بتا اور سکھا دیا جو ہم کسی دوسرے ذریعہ سے نہ جان سکتے تھے اور نہ سیکھ سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد حق ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ

الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿﴾ (البقرہ:۱۵۱)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہ تھے۔

تیسری خوبی

متقین کی تیسری خوبی جو یہاں بیان کی گئی، یہ ہے کہ ''وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں'' غصہ کی حالت میں تو کسی کو معاف کر دینا بڑی بات ہے۔ عام حالت میں بھی آسان نہیں کہ معافی باہمی میل ومحبت کا ذریعہ ہے۔ اور ظالم شیطان میل و محبت برداشت نہیں کر پاتا۔ وہ معاف کرنے والوں کے دل میں وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ میرے معاف کر دینے سے لوگ مجھے کمزور، یا مجرم خیال کریں گے اور معافی مانگنے والے کے دل میں خیال پیدا کرتا ہے کہ میں کیوں معافی مانگوں۔ یہ تو میری بڑی ہی ذلت اور رسوائی ہے۔ غرضیکہ نہ معاف کرنے والا آسانی سے معاف کرتا ہے اور نہ غلطی کرنے والا آسانی سے معافی مانگتا ہے۔ حالانکہ صرف ایک جملہ زبان سے نکالنے کی دیر ہوتی ہے ''جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا''، یا ''مجھ سے غلطی ہوگئی میں معافی چاہتا ہوں''۔ صرف یہ جملہ کہنا ہی اتنا دشوار ہوتا ہے جیسے کسی پہاڑ کو توڑنا، کھودنا ہے اور اتنی سی بات نہ کہنے کی وجہ سے معمولی سا جھگڑا، خونی رشتوں، دوستی اور ہر قسم کے تعلقات کو ختم کر دیتا ہے اور زندگی بھر کے لیے دشمنی اور عداوت کا سبب بن جاتا ہے۔ اور شیطان یہی تو چاہتا ہے کہ خاندانوں، گھروں اور محلوں میں کسی نہ کسی طرح انتشار و افتراق رہے۔ جبکہ اللہ اپنے بندوں کا ملنا جلنا، ان میں میل ومحبت کو پسند فرماتا ہے۔ جس سے زندگی پُرسکون اور باوقار ہوتی، دین ودنیا کی بے شمار بھلائیاں نصیب ہوتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اہل ایمان میں معاف کر دینے کی عادت کو عام کرنے ہی کے لیے اسے متقین کی خوبی قرار دیتا ہے اور طرح طرح سے انہیں اس خوبی کو اپنانے کی ہدایت فرماتا ہے۔ فرمایا گیا:

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿﴾ (البقرہ:۲۳۷)

اور اگر تم معاف کر دو تو یہ بہت قریب ہے تقوی سے اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس (کے معاملات) میں بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ (تغابن:۱۴)

اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور بخش دو تو بیشک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (النور:۲۲)

اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم نہیں پسند کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ (الاعراف:۱۹۹)

قبول کرو معذرت اور حکم دو نیک کاموں کا اور منہ پھیر لو، جاہلوں سے۔

قرآن کریم کی اس ہدایت کا عملی نمونہ نبی مکرم علیہ السلام کی سیرت مبارکہ میں ہمیں ملتا ہے کہ آپ پیکر عفوورحمت نظر آتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مکی زندگی میں میرے آقا ﷺ پر اہل مکہ نے کیا کیا مظالم نہ ڈھائے۔ لیکن فتح مکہ کے دن آپ نے ''لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ'' فرما کر دنیا کے سامنے عفوودرگزر کی ایک نظیر قائم فرمادی اور ثابت کر دیا کہ اسلام کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ مظلوم کو ظالم کے پنجوں سے نجات دلاتا ہے۔ وہ شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے والوں کو معاف کر دینے کا حکم دیتا ہے۔ وہ طاقتور کو کمزور سے، اہل علم کو جاہلوں سے درگزر کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ آقاؤں کو تاکید کرتا ہے کہ اپنے خادموں اور ملازموں کی خطائیں اور کوتاہیاں معاف کرتے رہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور علیہ السلام کے ساتھ چل رہا تھا۔ آپ ایک نجرانی چادر اوڑھے تھے، جس کے کنارے موٹے اور کھردرے تھے۔ اچانک ایک بدوی (دیہاتی) آیا اور اس نے آپ کی چادر پکڑ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ کی نرم ونازک گردن چھل گئی۔ پھر وہ کہنے لگا کہ اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے، اس میں سے کچھ مجھے دیجئے کہ میں ضرورت مند ہوں، آقائے رحمت ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کو کچھ دے دیا جائے۔

جنگ احد میں کفار نے آپ پر سخت حملہ کیا۔ آپ کے جسم مبارک پر زخم آئے حتی کہ عبداللہ بن قمیہ نے آپ کا چہرۂ انور خون آلود کر دیا۔ آپ کے دندان مبارک کا ایک حصہ شہید ہو گیا۔ جانثاروں نے عرض کی یارسول اللہ! اب تو ان ظالموں کے لیے بددعا فرما دیجئے، لیکن پیکر حلم وعفو آقا ﷺ نے رب کے دربار میں ہاتھ اٹھائے اور عرض گذار ہوئے ''اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' اے اللہ، میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ لوگ مجھے نہیں جانتے۔

غورث بن حارث نے آپ کی تلوار نیام سے نکالی اور جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو تلوار تان کر بولا اے محمد آج تمہیں مجھ سے کون بچائے گا۔ آپ نے فرمایا ''اللہ''۔ غورث پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نبی مکرم علیہ السلام نے تلوار ہاتھ میں لیتے ہوئے فرمایا بتا اب تجھے، مجھ سے کون بچائے گا۔ غورث کانپتے ہوئے بولا میری جان آپ کے قبضہ میں، آپ چاہیں تو مجھے معاف کر دیں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا جاؤ، معاف کیا۔ غورث نے اپنی قوم میں آکر بتایا۔ آج میں ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو تمام دنیا کے انسانوں میں سب سے بہتر ہے۔

خیبر میں زینب نامی عورت نے آپ کو زہر دیا۔ لبید ابن عاصم نے آپ پر جادو کیا جس کا پورا حال آپ کو بذریعہ وحی بتا دیا گیا۔ لیکن آپ نے کوئی مواخذہ نہ فرمایا۔ سب کو معاف کیا۔ حتی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو، ان کا جگر چبانے والی ہندہ کو بھی معاف کیا۔ ہے دنیا میں ایسا کوئی حلم وعفو کا معلم جو اپنے عمل سے ثابت کرے کہ بخشش ومعاف کر دینا انسانی عظمت اور انسان کی بڑی خوبی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَانَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ وَّ مَازَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَّ مَاتَوَاضَعَ اَحَدٌ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ

صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا۔ معاف کر دینے والے کی اللہ عزت بڑھاتا ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے عاجزی کرنے والے کا اللہ مرتبہ بلند فرماتا ہے۔ (مسلم شریف)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ:

لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَجْزِى السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ يَصْفَحُ

حضور علیہ السلام برائی کا بدلہ برائی سے نہ لیتے تھے بلکہ معاف فرمادیتے اور درگزر سے کام لیتے تھے۔ (ترمذی شریف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ آیہ مبارکہ "ادفع بالتی ھی احسن" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلصَّبْرُ عِنْدَ الغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْاَسَآءَ ةِ فَاِذَا فَعَلُوْا عَصَمَهُمُ اللّٰهُ وَ خَضَعَ لَهُمْ عَدُوَّهُمْ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ قَرِيْبٌ (بخاری شریف)

بھلائی سے مراد غصہ کے وقت صبر اور برائی کے بدلہ میں معافی ہے۔ اگر لوگ ایسا کریں تو اللہ انہیں محفوظ رکھے ان کے دشمن کو نیچا کرے گویا وہ (دشمن) ان کا مخلص قریب دوست ہو جائے گا۔

غرضیکہ عفوودرگزر متقین کی خوبی ہے۔ بالخصوص غضب وغصہ کی حالت میں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ۚ﴿۳۷﴾ (الشوریٰ:۳۷)

اور جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور جب وہ غضبناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔

لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ عفوودرگزر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو مطلوب اور پسند ہے۔ لیکن شرعی امور میں کسی کو اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی کو معاف کرنے کی اجازت دے، مثلاً چور کو نہ تو قاضی معاف کرسکتا ہے اور نہ ہی وہ شخص معاف کرسکتا ہے جس کا مال چوری ہوا تھا۔ کیونکہ اگر ایسے جرائم کی معافی کا کسی کو اختیار دے دیا جاتا تب تو شاید ہی کوئی مجرم سزا پا سکتا۔ اور مسلم معاشرہ جو اسلام کی مقرر کردہ سخت سزاؤں ہی کے باعث جرائم سے پاک وصاف رہتا ہے۔ بدتری مجرموں سے بھرا معاشرہ ہو جاتا۔ جس کا اندازہ ان معاشروں کا حال دیکھ کر کیا جاسکتا ہے جن میں جرائم کی سزائیں نرم ہیں او مجرموں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً یورپ وغیرہ میں بڑے بڑے جرائم کی سزا چند برس جیل سے زیادہ نہیں اور جیل میں بھی قیدیوں کو ٹی وی تک کی عیاشی حاصل ہے۔ لہٰذا ان ممالک میں نہ چوروں کو کوئی سزا کا ڈر ہے اور نہ قاتل کو قتل ہوجا کا خوف۔ اسی لئے وہاں نہ کسی کی عزت وآبرو محفوظ ہے نہ مال و دولت۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جب بندۂ مؤمن کو متواتر حقیر وخوار کیا جاتا رہے اور ظالم اپنے ظلم پر اتنا جری ہو

معافی اس کے لئے اپنے عمل پر شرمندگی کا سبب بننے کے بجائے معاف کر دینے والے کی کمزوری اور حقارت کا باعث بنتی ہو تو عفوو درگزر سے افضل انتقام ہے۔ تاکہ مؤمن کی جرأت اور شجاعت کا بھی اظہار ہو جائے۔ ظلم کرنے والے کو پتہ چل جائے کہ مؤمن نہ تو حقیر و کمزور ہوتا ہے اور نہ ہی بزدل۔ وہ اپنی عزت و آبرو کو اللہ اور اس کے رسول کی امانت جانتا ہے۔ اور اس کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ نیز یہ انتقام ظالم کے ہاتھوں کو دوسروں کی طرف بڑھنے سے روکنے کا ذریعہ ہے جس سے معاشرہ اس ظالم اور دیگر ظلم کرنے والوں کے جبر و استبداد سے محفوظ ہو جائے گا۔ لیکن اس صورت میں بھی انتقام کی اجازت نہایت محتاط انداز میں دی گئی ہے۔ ایک ہدایت تو یہ کی گئی کہ انتقام اتنا ہی ہو جتنا ظلم ہوا ہے۔ اگر کسی نے تمہاری توہین اور بے عزتی کی ہے تو تم بھی اس کی اتنی ہی توہین و بے عزتی کرو جتنی اس نے کی ہے، یہ نہیں کہ تم غیظ و غضب میں مبتلا ہو جاؤ اور اس کا سارا مال و اسباب تک تباہ کر ڈالو۔ غیظ و غضب میں مبتلا ہونے کی اجازت نہیں دی جارہی صرف انتقام کی اجازت دی جا رہی ہے کہ اس میں بھی کچھ مصلحت اور حکمت ہے۔ دوسری ہدایت اس سلسلہ میں یہ کی گئی کہ اگر تم انتقام کے لیے تیار ہو اور تمہارا دشمن فوراً اپنی زیادتی کو تسلیم کر لے اور شرمندہ ہو جائے تو تمہارے لیے پھر وہی حکم ہے کہ اسے معاف کر دو کہ جو شرمندہ ہو گیا اس سے انتقام لینا مرد مؤمن کی شان نہیں۔ اس ضروری گفتگو کے بعد مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے، جن میں انتقام کی اجازت، انتقام کی حد کا تعین اور معاف کر دینے کی فضیلت موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾
وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾
وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾
اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾
وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿٤٣﴾ (الشوریٰ: ۳۹ تا ۴۳)

اور جب ان (مؤمنوں) پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا (مناسب) بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پس جو معاف کر دے اور اصلاح کر دے تو اس کا اجر اللہ پر ہے بیشک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد پس یہ لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں۔ بیشک ملامت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور جو شخص (ان مظالم) پر صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

محسنین

آیت زیر گفتگو کے آخر میں ارشاد ہوا "اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے" یہ جملہ قرآن کریم میں متعدد

مقامات پر موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ پس تم بھی احسان کر کے اللہ کے پسندیدہ اور محبوب بندوں میں شامل ہو جاؤ۔ گویا نہایت ہی مشفقانہ اور کریمانہ انداز سے اہلِ ایمان کو احسان کرنے اور محسن بننے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ایک انداز اس سے بھی پیارا اختیار کیا گیا۔ فرمایا گیا۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص:۷۷)

اور احسان کیا کر، جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے۔

احسان کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو معاف کر دینے کے بعد اس کو نوازنا۔ جب دشمن کو معاف کر دیا تو اب احسان کرو۔ اس کو دوست بنالو۔ جس نے تمہارا نقصان کیا تم نے اسے معاف کر دیا تو اب احسان کرو کہ اسے فائدہ پہنچاؤ۔ بغیر کسی طمع اور لالچ کے محتاجوں، ضرورت مندوں کی خدمت اور مدد کرو۔ گویا احسان جتنا اللہ کو پسند ہے اتنا ہی بندوں کے لیے مشکل اور دشوار بھی، لیکن قرآن کریم نے اس کو آسان کر دیا، ''تم احسان کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے''۔ بندۂ مؤمن اگر یہ سوچ لے کہ مجھ پر اللہ کے بے شمار احسانات ہیں۔ میں سارا دن نہ جانے اللہ کی کتنی حکم عدولی کرتا ہوں اور وہ مجھے معاف بھی فرماتا ہے اور اپنے احسانات بھی جاری رکھتا ہے تو اس کے لیے کسی کو معاف کر کے اسے نوازنا کوئی مشکل نہیں۔ اگر وہ یہ سوچے کہ میری قوت وطاقت، میرا مال ودولت، سب مجھ پر اللہ کا احسان ہے تو اس کے لیے ان ذریعوں سے کسی کی خدمت کرنا، کسی کی مدد کرنا اور کسی پر احسان کرنا دشوار نہیں رہتا۔ نیز فرمایا گیا۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ (بنی اسرائیل:۷)

اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہیں پہنچے گا اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی (تمہارے) نفسوں کو ملے گی۔

احسان کی دعوت تمہیں اس لیے دی جا رہی ہے کہ یہ تمہاری دنیا و آخرت میں بھلائی کا ذریعہ ہے، تمہیں ہی اس کا فائدہ ہوگا۔ اسی فائدے کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (نحل:۳۰)

جنہوں نے اچھے کام کیے اس دنیا میں بھی ان کے لیے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بھی (ان کے لئے) بہتر ہے اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر۔

احسان کرنے والوں کی دنیا سدھر جاتی ہے کہ نیکی و بھلائی دنیا کی بے شمار آفات ومصائب، تنگی وترشی کو بہا لے جاتی ہے۔ نیز احسان کرنے والا عقلمندوں کی نظروں میں قابل احترام و باعزت ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس کا ہر طرح تعاون کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ رہا معاملہ اس دنیا کے بعد کا تو احسان کرنے والے پر قیامت کے دن اللہ کا جو کرم ہوگا اور اس کی جو عزت افزائی کی جائے گی اس کا بیان تو در کنار تصور بھی ممکن نہیں۔

آخر میں ہم وہ مشہور واقعہ پیش کرتے ہیں جو آیت زیر گفتگو کی عملی تفسیر کا ایک نمونہ ہے۔ اور آیت کے منشاء و مفہوم

کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔صاحب روح المعانی نے اس واقعہ کونقل کیا ہے۔

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی آپ کو وضو کرانے کے لئے ایک برتن میں پانی لے کر آئی۔ اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹا اور حضرت امام پر گر گیا۔ جس سے آپ کو چوٹ بھی آئی اور کپڑے بھی گیلے ہو گئے۔ ظاہر ہے غصہ آنا ہی تھا لیکن جونہی آپ نے لونڈی کی طرف نظر اٹھائی وہ بولی ''وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ'' آپ نے فوراً نظر نیچی کی اور غصہ پی لیا۔ پھر وہ بولی ''وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ'' آپ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کیا۔ اللہ بھی معاف کرے۔ پھر وہ گویا ہوئی ''وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ'' آپ مسکرائے اور فرمایا جا میں تجھے اللہ کی رضا کے لیے آزاد کرتا ہوں۔

گناہگاروں پر کرم:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٥﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾ (آل عمران: ۱۳۶)

اور وہ لوگ جو بے حیائی کا کام یا اپنے اوپر ظلم کریں تو اللہ کو یاد کر کے معافی مانگیں اپنے گناہوں کی اور کون ہے اللہ کے سوا جو گناہوں کو بخشتا ہے اور وہ جان بوجھ کر اپنے کیے پر اصرار نہ کریں۔

ایسے لوگوں کا بدلہ ان کے رب کی بخشش ہے اور باغ ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے کیا ہی اچھا بدلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا۔

متقین کی خوبیاں بیان فرمانے کے بعد اُن گناہگار مؤمنین پر کرم کا دروازہ کھولا گیا جو فاحشہ یا ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ نادم وشرمندہ ہو جاتے ہیں اور اپنے رب کی پناہ حاصل کرنے کے لیے اس کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ اپنے گناہ کی معافی اس یقین کے ساتھ مانگنے لگتے ہیں کہ رب کے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں وہ ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ جان بوجھ کر اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے، ایسے لوگوں کے لیے مژدہ ہے کہ معافی مانگنے، شرمندہ ہونے والوں کی بخشش بھی ہوتی ہے اور ان کے لیے ایسی جنت کا بھی وعدہ ہے جس کے نیچے نہریں رواں ہوں گی اور جس میں داخلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ استغفار وتوبہ بڑی نیکی ہے۔ دیکھو مغفرت وجنت کی صورت میں اس کا کتنا اچھا بدلہ دیا جا رہا پس اے گناہگاروں آؤ اپنے رب کی پناہ میں آ جاؤ۔ اس سے معافی مانگ لو تم بھی متقین کی فہرست میں شامل کر لئے جاؤ گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ان دونوں آیتوں کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ دو صحابہ میں بے حد گہری دوستی تھی۔ اتنی کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں دیکھے جاتے تھے۔ ان میں ایک ثقفی اور دوسرے انصاری تھے۔ ایک مرتبہ ثقفی کو حضور علیہ السلام کے ہمراہ جہاد میں جانے کا موقع ملا۔ چلتے ہوئے انہوں نے اپنے انصاری دوست سے کہا میرے گھر کی ساری ذمہ داری تم پر ہے۔ اچھی طرح دیکھ بھال کرنا، اہل خانہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ دوست نے ذمہ داری قبول کی اور دوست کو اطمینان دلایا اور ثقفی چلے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں حسب وعدہ انصاری ان کے گھر آتے اور

دروازے سے ہی ان کی بیوی سے اس کی ضروریات معلوم کرتے اور جو بھی کام کاج ہوتا وہ کرتے رہے۔ ایک دن یہ دروازے پر کچھ دینے آئے ثقفی کی بیوی نے ہاتھ بڑھا کر ان سے وہ سامان لینا چاہا کہ انصاری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ فوراً ہی شرمندہ ہوئے اور سامان چھوڑ کر سیدھے آبادی سے باہر جنگل کی طرف چلے گئے۔ اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگے۔ چیخ چیخ کر روتے اور رب سے اپنی غلطی کی معافی مانگتے تھے۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ انصاری واپس آئے تو انہوں نے بیوی سے دوست کا حال پوچھا۔ بیوی نے جو واقعہ پیش آیا تھا وہ بتا دیا۔ اور کہا بس اسی دن سے آپ کے دوست صاحب نظر نہیں آئے۔ اب تو انصاری غصہ میں ثقفی کی تلاش میں دیوانہ ہو گئے۔ کہیں پتہ نہ چلا تو جنگلوں اور پہاڑوں میں تلاش کرنا شروع کیا کہ اچانک ایک پہاڑ سے آواز آئی "الہٰی میری ساری عمر کی کمائی لٹ چکی ہے میں نے اپنے دوست کی امانت میں خیانت کی ہے، میں مجرم ہوں اے رب تو مجھے سزا دے، یا بخش دے کہ تیرے سوا بخشنے والا کوئی نہیں" انصاری نے جب یہ جملے سنے تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ ثقفی کے قریب پہنچے تو انہیں سجدے میں پایا۔ اٹھا کر گلے لگایا اور بولے، چلو اس دربار میں چلتے ہیں جہاں سے مغفرت کا مژدہ ملتا ہے۔ دونوں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے ہی تھے کہ وحی نازل ہوئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ دونوں آیتیں پڑھ کر سنائیں اور فرمایا مبارک ہو تمہارا گناہ بخشا گیا۔ اس طرح قیامت تک آنے والے گناہگار مؤمنین کو مغفرت و بخشش کی خوشخبری نصیب ہوگئی۔ یہ صدقہ ہے ان صحابی کی لغزش کا، رضی اللہ عنہ۔

آیت میں فاحشہ اور ظلم دو لفظ آئے ہیں۔ فاحشہ گناہ کبیرہ، عملی گناہ اور متعدی گناہ (جس کا اثر دوسروں پر ہو) کو کہا جاتا ہے۔ اور ظلم گناہ صغیرہ، قولی گناہ اور ذاتی گناہ (جس کا اثر دوسروں پر نہ ہو) کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً زنا فاحشہ ہے اور زنا و بدکاری کی باتیں ظلم، جھوٹ، فاحشہ ہے۔ جھوٹوں کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا ان کی تائید کرنا ظلم ہے۔

استغفار

استغفار وہی کرتا ہے جو اللہ پر، اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اور جو کچھ رسول نے بتایا اور جو احکام دیئے ان کو حق جانتا ہے۔

استغفار وہی کرتا ہے جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور مالک حقیقی کے دربار میں حاضر ہو کر اعمال کی جوابدہی اور ان پر جزاء یا سزا کا یقین رکھتا ہے۔ نیز اس کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے اور وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

استغفار وہی کرتا ہے جو اپنے آپ کو حقیر و ذلیل جانتا ہے اور رب حقیقی کی قدرت کاملہ اور اس کی قوت پر یقین رکھتا ہے۔ نیز وہ ہمہ وقت رب کی رحمت کا امیدوار اور طلبگار رہتا ہے۔

استغفار وہی کرتا ہے جسے احکام شرع کا علم ہوتا ہے وہ حرام و حلال کو جانتا ہے یا کسی کے بتانے پر مان لیتا ہے۔ گویا وہ ہٹ دھرم یا ضدی نہیں بلکہ گناہ کو گناہ جان کر شرمندہ ہونے ہی میں اپنی عزت اور عافیت کا یقین کرتا ہے۔

استغفار کرنے والا گویا یقیناً مؤمن ہے اور استغفار کر کے اپنے ایمان کا ثبوت بھی فراہم کر رہا ہے۔ پس کیوں نہ اللہ رحیم و کریم کی رحمت اسے اپنی پناہ میں لے۔ پس انہی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ

الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾
وَاَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾
وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ
اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾
اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ
السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾
اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾
اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾
بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ
مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾
وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۘ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾
اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾
لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ (الزمر: ۵۳ تا ۶۳)

(اے محبوب علیہ السلام) آپ فرما دیجئے، اے میرے بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں۔ مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے یقیناً اللہ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بلا شبہ وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اور لوٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور اس کے فرمانبردار ہو جاؤ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی۔

اور پیروی کرو عمدہ کلام (قرآن) کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اس سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔

(اس وقت) کوئی شخص یہ کہنے لگے ہائے افسوس ان کوتاہیوں پر جو مجھ سے سرزد ہوئیں اللہ کے بارے میں اور میں تو تمسخر اڑانے والوں میں سے تھا۔

یا یہ کہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت دے دیتا تو میں ہو جاتا پرہیزگاروں میں سے۔

یا یہ کہنے لگے جب عذاب دیکھے، کاش مجھے ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں نیکوکاروں میں ہو جاؤں گا۔

ہاں ہاں آئی تھیں تیرے پاس میری آیتیں پس تو نے جھٹلایا اور تو گھمنڈ کرتا رہا اور تو کفر کرنے والوں میں سے تھا۔

اور قیامت کے دن آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانہ تکبر کرنے والوں کا۔

اور نجات دے گا اللہ متقیوں کو کامیابیوں کے ساتھ نہ چھوئے گی انہیں کوئی تکلیف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے وہی مالک ہے آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا وہی لوگ خسارے میں ہیں۔

ان آیات کو بار بار پڑھیے اور ان میں غور کیجیے تو آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ رحیم و کریم آقا بڑے مشفقانہ اور پراز حکمت انداز سے آپ ہی کو اپنے دریائے رحمت میں غوطہ زن ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ آیت کا پہلا ہی لفظ ''یعبادی'' ''اے میرے بندو'' کیسا وجد آفرین ہے۔ سوچئے تو کیا کرم ہے رب کا۔ کہ ہم گناہگاروں کو وہ اس پیار بھرے لفظ سے پکار رہا ہے گویا تڑپنے اور لرزنے والوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ تم سے گناہ تو سرزد ہو گیا لیکن اب بھی تم میرے ہو۔ مایوس نہ ہو۔ میرے سایہ رحمت میں پناہ لے لو۔ تم استغفار کرو تو میں تمہاری مغفرت کروں گا۔ بس دروازۂ رحمت بند ہونے سے پہلے میری طرف رجوع کرلو۔ عذاب کا وقت آنے سے پہلے احکامِ قرآن کے پابند ہو جاؤ۔ حسرت و یاس کا وقت آنے سے پہلے کامیابی و کامرانی کی طرف قدم بڑھاؤ۔ اے میرے بندو، میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہیں ایسا کامیاب و کامران کروں گا کہ کبھی تمہیں نہ کوئی تکلیف ہوگی اور نہ رنج و ملال تمہارے قریب آئے گا۔

پہلی آیت جس میں فرمایا گیا کہ ''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا مالک ہے'' اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام سے اس آیت کا مفہوم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: آج تک کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔ پھر فرمایا آسمانوں اور زمین کی کنجیاں یہ کلمات مبارکہ ہیں۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ. هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام سے مقالید کی تشریح معلوم کی تو آپ نے یہی کلمات دس مرتبہ صبح اور دس مرتبہ شام پڑھنے کی ہدایت کی۔

یہ کلمات ہم نے ضیاء القرآن سے آپ کے عمل کے لئے نقل کیے۔ صاحب ضیاء القرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری ان کلمات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''جو شخص اللہ کے رسول کی بتلائی ہوئی کنجیوں سے خزائن ارض و سما کے قفلوں کو کھولتا ہے اسی کا دامن بھرتا ہے اور وہی ان خزانوں کی قدر و قیمت کو پہچان سکتا ہے۔ اولوالعزم اولیاء کرام اپنے ہادی و مرشد کی

انہیں تعلیمات پر عمر بھر عمل پیرا رہے۔ ان وظائف واوراد کا پابندی سے ورد کرتے رہے۔ انہیں کی برکت سے حریم قرب کے دروازے ان کے لئے کھلتے گئے۔ یہ اپنی ہمت کے پروں سے ان رفعتوں پر آشیانے بناتے رہے۔ جہاں لوگوں کے طائر عقل وفکر کی رسائی ناممکن ہے۔ اے راہ عشق کے مسافرو! اے منزل محبت کے رہ نوردو! اٹھو ہمت سے کام لو۔ اپنے مرشد برحق کے بتائے ہوئے کلمات طیبات کو حرز جاں بناؤ۔ تمہیں بھی ان بلندیوں پر سرفراز کیا جائے گا۔ (ضیاء القرآن)

استغفار وہ پسندیدہ عمل ہے جسے اللہ اپنے بندوں سے چاہتا ہے۔ یہ عام مؤمنین کے لیے مغفرت ورحمت کا ذریعہ ہے۔ اولیاء وصالحین کے لئے بلندیٔ مراتب کا ذریعہ ہے اور انبیاء معصومین کے لئے ایک محبوب عبادت اور اللہ کے دربار میں ایک بہترین تحفہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً

واللہ! میں اللہ سے دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا ہوں۔ (بخاری)

بعض دیگر روایات میں سو مرتبہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ مقصد تعداد نہیں بلکہ یہ مقصود ہے کہ میں بکثرت استغفار کرتا ہوں۔ یہ اللہ کو پسند ہے۔ پس مجھے بھی پسند ہے۔ میرے غلاموں تم بھی پسند کرو کہ تمہاری ضرورت ہے لہذا ہر وقت اس عمل کو کیا کرو۔ یہ ایسا عمل ہے جو سوائے کفر وشرک کے ہر بد عملی کے داغ کو دھو دیتا اور مغفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایک روایت ملاحظہ ہو جو ہم گناہگاروں کے لئے بڑا سہارا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔ فرماتے ہیں ایک مرتبہ نبی کریم علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا:

''بنی اسرائیل کے ایک شخص نے ننادے قتل کئے۔ حتی کہ وہ اپنے اس عمل سے اُکتا گیا۔ کہ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا اسے اپنی موت نظر آنے لگی تھی، پس اسے اپنے گناہ کا احساس ہونے لگا اور وہ عذاب الٰہی سے نجات کا طریقہ معلوم کرنے کے لئے نکلا۔ ایک راہب کے پاس پہنچا اس کو اپنا حال بتایا۔ راہب نے اسے دھتکارا اور کہا اتنے پاپ کر کے اب انہیں معاف کرانے نکلا ہے تو ہرگز قابل معافی نہیں۔ اسی طرح مرے گا اور جہنم کی سزا پائے گا۔ اس شخص کو غصہ آیا بڑا مایوس ہوا اور خیال کیا کہ جب ننادے معاف نہیں ہو سکتے تو سو کیوں نہ پورے کر لیے جائیں۔ تلوار نکالی اور راہب کا صفایا کر ڈالا۔ پھر احساس توبہ بیدار ہوا اور اپنے کسی ہمدرد سے مشورہ کیا۔ اس نے بتایا تم فلاں گاؤں میں جاؤ وہاں اللہ کا ایک محبوب ومقرب بندہ رہتا ہے۔ یقیناً وہ تمہیں کوئی تدبیر بتائے گا۔ یہ شخص چل دیا۔ ابھی آدھا ہی راستہ ہوا تھا کہ موت نے آ دبوچا اور یہ اِس حال میں گرا کہ اِس کا رخ اللہ کے مقرب بندوں کی بستی کی طرف تھا۔ رحمت وعذاب کے فرشتے آ پہنچے اور اس کی روح لینے کے لئے آپس میں جھگڑنے لگے۔ پس اللہ نے اس شخص کی بستی کو حکم دیا کہ دور ہو جا اور یہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا اسے حکم دیا کہ قریب ہو جا۔ پھر فرشتوں سے فرمایا کہ دونوں بستیوں کا فاصلہ ناپو یہ جس بستی سے قریب ہو اسی کے مطابق اس کا انجام ہوگا۔ فاصلہ ناپا گیا تو یہ شخص اللہ کے نیک بندے کی بستی سے قریب تھا۔ پس اس کی روح

رحمت کے فرشتوں کو دی گئی اور اللہ نے اس کی بخشش فرما دی''۔ (بخاری و مسلم)

(ہم نے حدیث شریف کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے) اس واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ نیت استغفار و توبہ جب مغفرت کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ بندہ کیوں نہ بخشا جائے گا جو ہمہ وقت اپنے گناہوں پر نادم و شرمندہ ہو کر اللہ کے سامنے روتا اور استغفار کرتا رہتا ہے۔ میرے آقا ﷺ فرماتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَ اِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً

اس شخص نے گناہ پر اصرار نہیں کیا جو اللہ سے مغفرت طلب کرتا رہا چاہے وہ ایک دن میں ستر مرتبہ گناہ کا ارتکاب کرے۔ (ترمذی)

یعنی جو شخص کبھی کبھی گناہ کرتا ہے لیکن وہ کبھی بھی اپنے گناہ پر نادم نہیں ہوتا ہے۔ اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ گویا یہ شخص گناہ پر اصرار کر رہا ہے اور گناہ پر اصرار بدترین گناہ ہے۔ اور وہ شخص جو بار بار گناہ کرتا ہے لیکن اللہ سے استغفار کرتا رہتا ہے اس کو گناہ پر مُصر نہیں کہا جائے گا۔ کہ وہ نادم و شرمندہ ہوتا رہتا ہے جب بھی گناہ کے بعد استغفار کرتا ہے اللہ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ اور اس کا پچھلا گناہ مٹ جاتا ہے۔ منشاء ارشاد یہ ہے کہ استغفار قبول ہوتا ہے اور بندے کو معافی ملتی ہے۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر فرمایا گیا حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

کُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَّ خَیْرُ الْخَطَّآئِیْنَ التَّوَّابُوْنَ

ہر انسان خطا کار ہے لیکن خطا کاروں میں بہترین وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں (ترمذی)

استغفار صرف ذریعہ مغفرت ہی نہیں بلکہ اس کے اثرات انسان کی پوری زندگی پر ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ مخبر صادق ﷺ نے بتایا:

مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰہُ لَہٗ مِنْ کُلِّ ضِیْقٍ مَّخْرَجًا وَّ مِنْ کُلِّ ھَمٍّ فَرَجًا وَّرَزَقَہٗ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ

جس شخص نے استغفار کو اپنی عادت بنالیا اللہ اس کی تمام مشکلوں کو آسان فرما دیتا ہے اور ہر غم سے نجات عطا فرماتا ہے۔ اور اس کو بے گمان رزق عطا فرماتا ہے۔ (ابن ماجہ)

استغفار صرف وہی مفید نہیں جو بندہ خود کرتا ہے، بلکہ مر جانے کے بعد اگر اس کی اولاد بھی اس کے لئے استغفار کرتی ہے تو اس کا بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ الدَّرَجَۃَ لِلْعَبْدِ فِی الْجَنَّۃِ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اَنّٰی لِیْ ھٰذِہٖ فَیَقُوْلُ بِاسْتَغْفَارِ وَلَدِکَ لَکَ

بیشک اللہ کسی نیک بندے کے درجہ کو جنت میں بلند فرما دیتا ہے تو وہ (حیرت سے) پوچھتا ہے یارب یہ درجہ مجھے کہاں سے ملا۔ پس اللہ فرماتا ہے تیرے بیٹے کے تیرے لئے استغفار سے۔ (مشکوٰۃ)

پس اولاد کی تربیت ایسی کرنا چاہیے کہ وہ نمازی اور پرہیز گار بنیں اور والدین کے مرنے کے بعد ان کے لئے استغفار کرتے رہیں۔ کہ مرنے والے کے عمل واستغفار کا زمانہ تو ختم ہو گیا۔ اب اولاد کا استغفار ہی ان کو فائدہ پہنچائے گا۔ جس کی مرنے والوں کو اشد ضرورت بھی ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے بتایا۔

''قبر میں مردے کی حالت اُس ڈوبنے والے جیسی ہوتی ہے جو بچانے کی فریاد کرتا ہے۔ مردہ دعاؤں کا انتظار کرتا ہے چاہے اس کے زندہ والدین کی طرف سے ہوں یا بھائی یا دوست کی طرف سے اور جب یہ دعا اس کو پہنچتی ہے تو وہ اسے دنیا اور اس کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور بیشک اللہ اہل قبور کو زمین والوں کی دعائیں پہاڑوں جیسی کر کے پہنچاتا ہے اور بیشک مُردوں کے لئے زندوں کا تحفہ ان کے لئے استغفار کرنا ہے''۔ (مشکوٰۃ)

استغفار آسان لیکن اس قدر مفید عمل ہے کہ جس کے اعمال نامہ میں یہ کثرت سے پایا گیا اس کو نبی مکرم علیہ السلام مبارک باد دیتے ہیں۔ عبداللہ ابن بُسر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

طُوْبٰى لِمَنْ وَّجَدَ فِيْ صَحِيْفَتِهٖ اِسْتِغْفَارًا كَثِيْرًا۔

اس کو مبارک ہو جس نے اپنے نامہ اعمال میں (قیامت کے دن) استغفار کی کثرت دیکھی۔ (مشکوٰۃ)

''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ''

سیر و سیاحت

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ (آل عمران: ۱۳۷)

بیشک تم سے پہلے (قانون قدرت کے) طریقے گزر چکے ہیں۔ تو زمین میں چلو اور دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

یہ لوگوں کے لئے واضح بیان ہے اور ہدایت اور نصیحت ہے پرہیز گاروں کے لئے

آپ پڑھ چکے ہیں کہ پہلی آیت میں سود کی ممانعت کی گئی اور سود خوروں کو جہنم کی آگ سے بچنے کی ہدایت اس کے بعد متقین کی صفات بیان کی گئیں اور ان پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا۔ قرآنِ کریم کا انداز بیان یہی ہے کہ بُروں کے انجام کے ساتھ اچھوں کا انعام بھی بتایا جاتا ہے تاکہ بُرائی کے انجام بد سے بچا جائے۔ اور اچھائی کی رحمتوں اور برکتوں کے حصول کے لئے لپکا جائے۔ نیز قانونِ قدرت ازل سے یہی ہے کہ بروں کا انجام برا اور اچھوں کا انجام اچھا ہوتا ہے۔ اس قانون کے اٹل ہونے کا اگر کسی کو ثبوت چاہیے تو وہ صرف تاریخ کا مطالعہ ہی نہ کرے بلکہ اللہ کی زمین پر چلے اور ان آثار کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لے جو مدتیں گزر جانے کے باوجود بھی اپنے حسب حال بروں کے انجام بد یا اچھوں کے انجام خیر پر

گ اہ ہیں۔ اسی مقصد کے لئے قرآن کریم بار بار" سیروا فی الارض" کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ کی زمین پر موجود آثار کو حصول عبرت کے لئے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ فرمایا گیا:

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۱﴾ (انعام:۱۱)

(اے حبیب علیہ السلام) آپ فرمادیجئے سیر کروز مین میں پھر دیکھو کیسا ہوا انجام جھٹلانے والوں کا

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ (یوسف:۱۰۹)

اور آخرت کا گھر یقیناً بہتر ہے ان کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے

فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۳۶﴾ (النحل:۳۶)

پس سیر و سیاحت کروز مین میں اور دیکھو کس قدر عبرتناک تھا انجام جھٹلانے والوں کا

فَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِیَ ظَالِمَةٌ فَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِیْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾
(حج:۴۵-۴۶)

پس کتنی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تہ و بالا کر ڈالا۔ کیونکہ وہ ظالم تھیں تو وہ اب گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنوئیں ہیں جو بیکار ہو چکے ہیں۔ اور کتنے چونے سے بنے ہوئے مضبوط محل ہیں (جو ویران پڑے ہیں) کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ (ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ (حق کو) سمجھ سکتے۔ اور کان ایسے ہو جاتے جن سے یہ نصیحت سن سکتے حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوئیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۶۹﴾ (نمل:۶۹)

آپ فرمادیجئے سیر و سیاحت کروز مین میں پھر دیکھو کیسا ہولناک انجام ہوا مجرموں کا۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ (عنکبوت:۲۰)

آپ فرمایئے سیر و سیاحت کروز مین میں پھر دیکھو کس طرح اس نے مخلوق کی ابتداء فرمائی اسی طرح پیدا فرمائے گا دوسری بار بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِیْنَ ﴿۴۲﴾ (الروم:۴۲)

آپ فرمادیجئے سیر و سیاحت کروز مین میں پھر دیکھو کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے۔

ان میں سے اکثر مشرک تھے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۞ (الروم:۹)

کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں۔ تاکہ وہ دیکھتے کیسا ہوا انجام ان کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ زیادہ تھے ان سے طاقت میں اور انہوں نے خوب ہل چلائے زمین میں اور انہوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے اسے آباد کیا۔ اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر پس نہ تھی اللہ کی یہ شان کہ وہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہتے تھے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۞ (مومن:۲۱)

کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہ کی زمین میں تاکہ وہ دیکھتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ قوت کے لحاظ سے بھی زیادہ طاقتور تھے اور (چھوڑے ہوئے) آثار کے لحاظ سے بھی تو پکڑ لیا انہیں اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث اور نہیں ان کے لیے کوئی اللہ سے بچانے والا۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۞

(مومن:۸۲)

کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ انہیں نظر آجاتا کہ کیا انجام ہوا ان کا جو ان سے پہلے گزرے وہ لوگ ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں زبردست تھے۔ اور زمین میں اپنی نشانیوں کے لحاظ سے (بہت ہنرمند) پس یہ بتائیں کہ کیا فائدہ پہنچایا انہیں اس دولت نے جو وہ کماتے تھے۔

آیات مندرجہ بالا سے واضح ہے کہ اللہ رب العزۃ جل وعلا پسند فرماتا ہے کہ بندے زمین کی سیر و سیاحت کریں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ ہر دور میں سنت الٰہیہ یکساں رہی ہے۔ یعنی بدعمل اور بدکردار قوموں کی تباہی و بربادی اور باعمل و باکردار لوگوں کی کامیابی و کامرانی۔ امم ماضیہ کے لئے بھی یہی قانون قدرت تھا اور قیامت تک آنے والوں کے لئے بھی یہی قانون ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۞ (فاطر:۴۳)

پس تم نہیں پاؤ گے اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی اور تم نہ پاؤ گے اللہ کے قانون میں کوئی تغیر۔

اللہ کی زمین اُن آثار سے بھی بھری ہوئی ہے جو ذریعہ عبرت ہیں اور اُن آثار سے بھی جن کی زیارت سے ایمان

تازہ اور روح شگفتہ ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے عبرت ناک مقامات پر جانے کا بار بار عمومی حکم دیا تاکہ ان مقامات کو دیکھ کر اہل ایمان کا ایمان مزید پختہ ہو۔ اور غیر مؤمنین اپنی بغاوت وسرکشی سے باز آئیں جبکہ آثار مقدسہ میں سے صرف بعض مقامات کو ''شعائر اللہ'' قرار دے کر قرآن کریم نے خاموشی اختیار کی۔ مثلاً صفا ومروہ یا مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کا حکم۔ نیز حضور علیہ السلام نے بعض مقدس مقامات کے احترام اور ان پر حاضری کا حکم دیا۔ یا انہیں مقام قبولیتِ دعا قرار دیا۔ گویا اہل ایمان کو تمام مقدس مقامات پر حاضر ہونے اور اُن کا احترام کرنے کا اشارہ دے دیا گیا تاکہ دیکھا جائے کہ کون اللہ کے نیک بندوں اور ان کی طرف منسوب مقامات سے کتنی محبت کرتا ہے۔ کس کا ایمان اسے ان مقدس مقامات پر حاضری اور ان سے برکت حاصل کرنے کے لئے تڑپاتا ہے جو جتنا زیادہ ان کا احترام کرے گا، ان پر حاضری دے گا، اس کا ایمان اُتنا ہی تازہ اور قوی ہوگا۔ کہ ان مقامات پر حاضری سے ایمان کو غذا ملتی ہے۔ تازگی ملتی ہے۔ مقربین کا قُرب حاصل ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے قُرب کا ذریعہ ہے۔ پس اہل ایمان کو چاہیے کہ اگر اللہ توفیق دے تو زمین کی سیر وسیاحت کریں۔ مقامِ عبرت پر حاضری دے کر عبرت حاصل کریں اور مقدس مقامات، مزارات انبیاء واولیاء، شہداء وصالحین اور دیگر یادگاروں پر حاضر ہو کر ایمان تازہ کریں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ انبیاء واولیاء وصالحین کے مزارات پر حاضری دینے یا ان کی یادگاروں کی زیارت کرنے کے لئے سفر کرنا حرام ہے کیوں؟ اور کیسے حرام ہوا۔ معلوم نہیں جب اہرام مصر دیکھنے، مصر کے میوزم میں فرعون کی پڑی ہوئی لاش دیکھنے، بنی اسرائیل کے کھنڈرات دیکھنے، مدائن صالح وغیرہ دیکھنے کا حکم دیا جارہا ہے اور ان کا دیکھنا حصول عبرت کے لئے جائز ہے تو مقدس مقامات پر حاضری دینا حصولِ برکت کے لئے کیوں کر، ناجائز ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اولیائے کرام وصالحین کا یہ عمل رہا ہے۔

ہمارے علم کے مطابق اس غلط فہمی کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم نے مقاماتِ عبرت کی سیر وسیاحت تو حکم دیا ہے۔ لہٰذا وہ جائز ہے لیکن دیگر مقامات پر حاضری کا حکم نہیں دیا، لہٰذا وہ جائز نہیں۔ تو گزارش ہے کہ یہ اصول قا غلط ہے کہ جس کام کا قرآن حکم نہ دے وہ جائز نہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ ہر وہ کام جائز ہے جس کی اللہ یا اس رسول ﷺ نے ممانعت نہیں فرمائی۔ مثلاً وہ تمام چیزیں کھانا پینا جائز ہیں جن کی حرمت وممانعت قرآن وحدیث میں مو نہیں۔ کیونکہ شرعی اصول ہے کہ ''اَصْلُ الْاَشْیَاءِ اَلْاِبَاحَۃُ'' تمام چیزیں اصلاً مباح اور جائز ہیں عدمِ جواز کے لئے دلیل ضروری ہوتی ہے۔ جواز کی دلیل کی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں ابھی ہم عرض کر چکے ہیں کہ صفا ومروہ کو شعائر اور مقام ابراہیم مصلیٰ اور مشعرِ حرام کو مقامِ ذکر قرار دینا ان جیسے تمام مقدس مقامات کی حاضری کو محبوب وپسندیدہ سمجھ لینے کے لئے کافی ہے۔

دوسری وجہ شاید ایک حدیث مبارکہ کا غلط مطلب سمجھ لینا ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں فرماتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِیْ ھٰذَا وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ

اَلْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى

تین مسجدوں کے سوا سامان سفر نہ باندھا جائے میری یہ مسجد، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔ (مسلم)

اسی حدیث کی بناء پر بعض لوگ حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضری کے لئے سفر تک کو حرام کہتے ہیں (العیاذ باللہ) اس گمراہی کا سبب صرف یہ ہے کہ حدیث کا مطلب ومنشاء صحیح نہیں سمجھا گیا اور یہ خیال کر لیا گیا کہ حضور علیہ السلام ان تین مساجد کے علاوہ ہر قسم کے سفر کی ممانعت فرما رہے ہیں۔ حالانکہ اس بناء پر تو والدین کی زیارت کے لئے، مریض کی عیادت کے لئے، جنازے میں شرکت یا تعزیت کے لیے اور اسی قسم کے بہت سے سفر حرام قرار پائیں گے جبکہ ایسا ہرگز نہیں۔ حضور علیہ السلام کا منشاء ہرگز سفر کی ممانعت نہیں بلکہ مذکور مساجد کی عظمت وفضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ نیز یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کی مساجد میں صرف مسجد نبوی شریف، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کو فضیلت حاصل ہے کہ ان میں عبادت کا ثواب دیگر مساجد سے زیادہ دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ تمام مساجد اللہ کا گھر ہیں، کسی مسجد کو کسی مسجد پر کوئی فضیلت نہیں۔ لہٰذا ایسا ہرگز نہ کرو کہ اعتکاف کے لئے تراویح کے لئے جمعہ کی ادائیگی کے لئے اپنے شہر اور محلہ کی مسجد چھوڑ کر کسی دوسرے شہر یا محلے کی مسجد میں اس نیت سے جاؤ کہ وہاں ان عبادات کا ثواب زیادہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے یہ نذر بھی مانی کہ میں فلاں مسجد میں نماز ادا کروں گا تو اس کی یہ نذر بھی غیر شرعی ہوگی اور اس کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا۔ اس مفہوم کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّمَا يُسَافَرُ اِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْكَعْبَةِ وَ مَسْجِدِىْ وَ مَسْجِدِ اِيْلِيَاءُ

صرف ان مسجدوں کے لئے سفر کیا جائے مسجد الکعبہ، میری مسجد اور مسجد ایلیاء (بیت المقدس)

(مسلم شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو ان احادیث کے راوی ہیں اور جن سے نبی مکرم علیہ السلام کے ارشادات پر عمل میں کبھی کوتاہی نہیں ہوئی وہ خود کوہ طور کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔

بہر حال ممانعت صرف ان مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں عبادت کے لئے جانے اور یہ گمان کرنے کی ہے کہ وہاں ثواب زیادہ ہوگا۔ پس بزرگوں کے مزارات پر حاضری، دیگر مقدس مقامات کی زیارت، اولیاء کرام کے عرسوں میں شرکت کو ناجائز سمجھنا جہالت بھی ہے اور ضلالت بھی۔ بالخصوص نبی مکرم علیہ السلام کے دربار پر حاضری کے لئے سفر کو حرام کہنا تو ایمان کے لئے خطرہ ہے۔ اس قسم کے وہم وگمان سے بھی توبہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ آقائے رحمت ﷺ خود اپنے دربار میں حاضری کی دعوت دے چکے ہیں اور اس انداز سے کہ ہر مؤمن یہاں حاضری کی آرزو کرے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ زَارَ قَبْرِىْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِىْ

جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔ (مسلم شریف)

آقائے رحمت تو شفاعت کا یقین دلاتے ہوئے اپنے دربار کی حاضری کی دعوت دے رہے ہیں تو وہ کلمہ گو کیسا بدنصیب اور

ظالم ہے جوان کے دربار پر حاضری کے لئے سفر کو حرام قرار دیتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی دوسری روایت ہے کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ حَجَّ الْبَیْتَ وَ لَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ

جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت کے لئے نہیں آیا اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔

(مسلم شریف)

اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو نبی سے بے وفائی کرے۔ یقیناً اس سے بڑا ظالم وہی ہے جو لوگوں کو اس بے وفائی پر اکسائے اور آمادہ کرے۔ اللہ ایسی گمراہی سے محفوظ رکھے۔ اہل محبت وعقیدت کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ جب وہ سفر حج کرتے ہیں تو ان کی زبان پر یہی ہوتا ہے کہ ہم حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضری کے لئے جارہے ہیں۔ اور یہی حق ہے کیونکہ ارکان حج تو یقیناً مکہ میں ادا ہوتے ہیں لیکن ان کی قبولیت کی سفارش مدینہ منورہ سے ہوتی ہے اور جب تک سفارش نہ ہو، حج تو کیا کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوتا۔ ہمارا یہ یقین وعقیدہ بلا دلیل نہیں اس پر قرآن گواہ ہے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾ (النساء: ۶۴)

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھیں اپنے پر، حاضر ہوتے آپ کے پاس اور مغفرت طلب کرتے اللہ سے اور مغفرت طلب کرتے ان کے لئے رسول بھی تو وہ ضرور پاتے اللہ کو بہت توبہ قبول فرمانے والا رحم کرنے والا۔

غرضیکہ اللہ استطاعت دے تو خوب سیر وسیاحت کیجئے۔ بلا مقصد نہیں کہ جس کام کا کوئی مقصد نہ ہو۔ شریعت اس پر دولت خرچ کرنے اور وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ سیر وسیاحت کیجئے ان مقامات کی جن کو دیکھ کر عبرت حاصل ہو۔ اللہ کا خوف طاری ہو اور توبہ کی توفیق ہو۔ نیز سیر وسیاحت کیجئے ان مقدس مقامات کی جن پر حاضری سے ایمان تازہ ہو، برکتیں نصیب ہوں توبہ واستغفار قبول ہو، حاجات برآئیں، دل کو سکون میسر آئے۔ اگر اس نیت اور مقصد سے سیر وسیاحت کی جائے تو یقین جانئے کہ ہر لحہ عبادت میں گزر رہا ہے اور ہر پیسہ اللہ کی راہ میں صرف ہو رہا ہے۔ اللہ عمل کی توفیق دے۔

مژدہ کامیابی

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۹﴾
اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾
وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۱﴾
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ یَعْلَمَ

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾
وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾
(آل عمران: ۱۳۹ ۔ ۱۴۳)

اور سستی نہ کرو اور غمگین نہ ہو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم (کامل) مؤمن ہو۔

اگر تمہیں زخم لگے تو تمہارے دشمنوں کو بھی اسی طرح زخم پہنچے اور ان دنوں کو ہم پھیرتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان اور تاکہ دیکھ لے اللہ ایمان والوں کو اور بنا لے تم میں سے کچھ کو شہید اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

اور اس لئے کہ اللہ مسلمانوں کو خالص کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔

کیا تم نے گمان کر لیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تمہارے مجاہدین اور صبر کرنے والوں کو (غیروں سے) ممتاز نہیں کیا۔

اور بیشک تم موت کی تمنا کرتے تھے اس کے ملنے سے پہلے تو اب تم نے اسے دیکھ لیا اور وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔

مندرجہ بالا آیات اگرچہ خصوصی طور پر صحابہ کرام سے اس رنج والم کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئیں جو انہیں غزوۂ احد کی عارضی اور ظاہری شکست سے پہنچا تھا۔ نیز اس ارشاد سے ان کے مستقبل کے لئے عزائم کو بلند کرنا اور ان کی ہمت افزائی کرنا مقصود ہے۔ لیکن ان میں جو اصول بیان کیے گئے وہ قیامت تک آنے والے مؤمنین کے لئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کامیابی و کامرانی بالآخر مؤمن کامل ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ پس اُسے ماضی کے کسی صدمہ کا رنج و غم اتنا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ کے لئے کمزور ہو جائے۔ اور اس کی اس کمزوری سے اس کے مشن کو نقصان اور دشمن کو فائدہ پہنچے۔ بلکہ وہ یہ سوچ کر اپنی ہمت بلند رکھے کہ اگر مجھے صدمہ پہنچا ہے تو میں بھی دشمن کو بھی ایسا ہی صدمہ پہنچا چکا ہوں۔ یہ تو سنت الٰہیہ ہے کہ وہ کبھی کسی کو غلبہ دیتا ہے اور کبھی کسی کو۔ انجام کار غالب مؤمن ہی رہتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے پس کچھ کو وقتی طور پر مغلوب کر کے بلند ہمت دیکھنا چاہتا ہے اور کچھ کو شہید بنا کر حیات جاودانی سے سرفراز فرماتا ہے۔ اور اس طرح وہ مؤمن کے ایمان کو مزید پختہ کرتا اور کفار کو مٹا دیتا ہے۔ جنت کے حقدار وہی مؤمن قرار پاتے ہیں جو مجاہد بن کر اور مصائب پر صبر کر کے کافروں پر اپنی برتری ثابت کر دکھاتے ہیں۔ مؤمن شہادت کی تمنا رکھتا ہے تو کبھی کبھی اس کے سامنے اس کے ساتھیوں کو شہید کرایا جاتا ہے تاکہ جس موت کی وہ تمنا کرتا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اور اس کی آرزو حقیقت کا روپ اختیار کر لے۔

غلبہ مؤمن

سنت الٰہیہ یہی ہے کہ وہ مؤمنین ہی کو کامیاب کامران کرتا اور غلبہ دیتا ہے جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں فرمایا گیا، ''اور سستی نہ کرو، اور غمگین نہ ہو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم کامل مؤمن ہو''۔ نیز فرمایا:

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ

اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ (محمد:۳۵)

ہمت مت ہارو اور (کفار کو) صلح کی دعوت مت دو تم ہی غالب ہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔

لیکن اس کے لیے پہلی اور بنیادی شرط ''کمال ایمان'' ہے یعنی یہ وعدہ مؤمنین کامل سے ہے اور ان میں وَہن و حُزن بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ ''وَھن'' سستی، کمزوری یا پست ہمتی ہے۔ اور ''حُزن'' ماضی کے نقصان پر رنج والم میں مبتلا ہونا ہے۔ جب حزن کی مدت دراز ہوتی ہے تو وھن پیدا ہوتا ہے۔ یعنی انسان کو زیادہ رنجیدہ اور غمزدہ ہونا ست بنا دیتا ہے۔ کمزور اور کم ہمت کر دیتا ہے۔ اللہ مؤمنین سے غلبہ و کامیابی کا وعدہ فرماتا ہے۔ لیکن ان پر ذمہ داری عائد فرماتا ہے کہ وہ اپنے اندر کمال ایمان پیدا کریں۔ اور رنج والم میں مبتلا ہو کر پست ہمت نہ ہونے پائیں۔ دیکھو پچھلی امتوں میں مؤمنین کو نہایت ناموافق حالات میں کامیابیاں ہوئیں اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ کسی مرحلہ میں بھی نہ تو پست ہمت ہوئے نہ کمزور ہوئے نہ انہوں نے ظالموں کے جبر واستبداد سے مجبور ہو کر ہار مانی، بلکہ وہ اللہ سے دعائیں کرتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ درج ذیل آیت مبارکہ پر غور فرمایئے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ (آل عمران:۱۴۶۔۱۴۷)

اور کتنے نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے، پس نہ ہمت ہاری انہوں نے بوجہ ان تکالیف کے جو انہیں پہنچیں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ انہوں نے ہار مانی۔ اور اللہ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے اور نہ تھی ان کی گفتگو سوا اس کے کہ انہوں نے کہا اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کیں ہم نے اپنے کام میں اور ثابت قدم رکھ ہمیں اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر۔

ذرا غور فرمایئے کہ گزشتہ نبیوں کے غلاموں نے کیسی جرأت و ہمت کے ساتھ مصائب وآلام کا مقابلہ کیا۔ ہم خیر الامم (بہترین امت) ہیں۔ سید الانبیاء ﷺ کے غلام ہونے کا ہمیں شرف حاصل ہے۔ دنیا کو برائیوں سے پاک کر دینے اور نیکیوں سے شگفتہ کر دینے کی ہم پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ ہم کسی موقع پر بھی قدم پیچھے ہٹائیں اور پست ہمتی کا مظاہرہ کریں۔ نہیں نہیں ایسا ہرگز نہ کرنا۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ (النساء:۱۰۴)

اور ہمت نہ ہارو (دشمن) قوم کی تلاش میں اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو انہیں بھی دکھ پہنچتا ہے جیسے تمہیں دکھ پہنچتا ہے۔ اور تم اللہ سے اس (ثواب) کی امید رکھتے ہو جس کی وہ امید نہیں رکھتے اور اللہ سب کچھ

جاننے والا بڑا ہی دانا ہے۔

جب تک اہل ایمان، اللہ کی اس ہدایت پر عمل کرتے رہے یعنی نہ تو انہوں نے اپنے ایمان میں کمزوری پیدا ہونے دی اور نہ ہی وہ مصائب و آلام کے خوف وغم میں مبتلا ہو کر پست ہمتی کا شکار ہوئے۔ تاریخ شاہد کہ اس وقت تک وہ غالب رہے۔ کامیابی و کامرانی ان کے قدم چومتی رہی۔ جب ہم اُنہیں دشمن کے مقابلہ میں دیکھتے ہیں تو فاتح اور غالب پاتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے دور میں اور اس کے بعد جب بھی اسلام و کفر کی معرکہ آرائی ہوئی، فتح و نصرت کا سہرا اہلِ ایمان کے سر رہا۔ حتی کہ جس لشکر اسلام میں ایک صحابی مجاہد بھی شریک ہوئے۔ اس نے کبھی شکست نہ کھائی۔ بدر، خندق، حنین کے غزوات، یمامہ، قادسیہ اور نہاوند کی جنگیں محمد بن قاسم طارق غزنوی اور غوری کی فتوحات اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں۔ ان حضرات کے ایمان کامل تھے۔ ہمتیں بلند تھیں، زخموں سے بہتے خون کی، ان کی نظروں میں پانی اور پسینہ جیسی حیثیت تھی۔ ان کے دن میدان جنگ میں گزرتے تھے اور راتیں مصلے پر اللہ سے بھیک مانگتے بسر ہوتی تھیں۔ پس کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے۔ یہ باوقار اور بارعب تھے۔ دشمن ان کے نام سے کانپتے اور تھرتھراتے تھے۔

سنہ ۱۲ھ، خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور ہے۔ خالد بن ولید کی فتوحات کا شہرہ ہے۔ مدینہ اور شام کے درمیان واقع ایک شہر دومۃ الجندل کا حضرت خالد رضی اللہ عنہ رخ کرتے ہیں۔ وہاں کے سردار اکیدر کو اطلاع ملتی ہے تو وہ اپنی قوم سے کہتا ہے۔

> ''میں تمہاری نسبت خالد بن ولید سے بہت زیادہ واقف ہوں۔ آج دنیا میں ان سے زیادہ کوئی اقبال بلند اور فنون جنگ کا ماہر نہیں۔ جو قوم ان سے مقابلہ کرتی ہے وہ خواہ تعداد میں زیادہ ہو یا کم بہر حال پسپا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرو بلکہ ان سے صلح کر لو'۔

جب قوم نے اس کی بات نہ مانی تو وہ بھاگ نکلا۔ حضرت خالد کو اس کے بھاگنے کی خبر ملی تو آپ نے اپنے ایک سپاہی عاصم بن عمرو کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ جنہوں نے اس کو گرفتار کر کے حضرت خالد کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اس کی گردن اڑا دی۔ کیونکہ یہ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضور علیہ السلام کی اطاعت قبول کر چکا تھا۔ اور پھر اس نے بدعہدی اور بغاوت کی تھی۔

اس قسم کے ہزاروں واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں جو اہلِ ایمان کے رعب و دبدبہ کا ثبوت ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ہمت کی بلندی اور ایمان کا کمال ہی وہ ہتھیار ہیں جن سے مؤمن کو کامیابی و کامرانی نصیب ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ کامیابی و کامرانی یہ نہیں کہ دشمن کو تہس نہس کر دیا جائے بلکہ درحقیقت کامیابی و کامرانی یہ ہے کہ حق کی راہ نہ چھوٹے اور دشمن کی قوت و طاقت سر تسلیم خم نہ کرا سکے۔ جس کا درس حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دہکتے انگاروں پر لیٹ کر حضرت خباب نے پھانسی کے پھندے پر مسکرا کر، حضرت سمیہ نے نیزہ سے جسم گھائل کرا کر، حضرت یاسر نے دو اونٹوں سے اپنا بدن چروا کر، حضرت امام حسین نے کربلا میں اپنے نونہالوں اور جاں نثاروں کا خون بہتے دیکھ کر اور اپنی گردن کٹا کر دیا۔ بلاشبہ یہ سب فاتحین ہیں، کامیاب و کامران ہیں۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (مجادلہ:۲۲)

اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان سے اور وہ اس سے راضی ہو گئے یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں۔ سن لو اللہ ہی کا گروہ کامیاب وکامران ہے۔

اگر ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ہمارا ایمان ہی کامل ہے اور نہ ہی ہماری ہمت بلند ہے۔ آج ہمارا ایمان زیادہ سے زیادہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تک ہے۔ باقی زندگی کے تمام مراحل میں یا تو ہم آزاد وخود مختار ہیں کہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں قطع نظر اس سے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں کیا حکم دیا ہے اور یا ہم غیروں کے مقلد ہیں۔ غور فرمایئے۔ ہماری معیشت کی بنیاد سود پر ہے۔ ہماری معاشرت کا انداز مغربی ہے۔ ہماری حکومت کے ضابطے وقوانین خود ساختہ ہیں۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی ذاتی امور ہوں یا قومی ہر حیثیت میں ہم اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے آزاد ہیں۔ دنیا کو ہم نے دین سے علیحدہ کر رکھا اور دین ہمارے نزدیک ثانوی حیثیت میں ہے۔ ہمارے اندر وَھن نے اتنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں کہ ہم میں اپنے حقوق تک حاصل کرنے کی ہمت نہ رہی۔ ہم غاصبوں اور ظالموں سے مصالحت ہی کو بڑی کامیابی اور عافیت تصور کرنے لگے ہیں۔ آج جو مسلم ممالک قانونی طور پر آزاد ہیں وہ آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہیں۔ کیونکہ ان کے سربراہ بہرحال غلام ہیں اور اپنے آقاؤں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ہماری اس حالت کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ کہ ہم مغلوب ہیں، مجبور ہیں، غیروں کے در کے بھکاری ہیں۔ نہ ہمارا وقار ہے، نہ کہیں ہماری عزت ووقعت۔ یہ اس لیے نہیں کہ اللہ ہم سے اپنے وعدے کو پورا نہیں کر رہا۔ بلکہ اس لئے کہ ہم نے اللہ کی شرائط کو قبول نہیں کیا۔

گردش ایام

اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت، قوانینِ قدرت میں سے ایک قانون، یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کی کسی چیز کو ایک حالت پر نہیں رکھتا۔ ایک کلی کھلتی ہے، چند دن بعد پھول بن کر مہکتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھول مرجھا جاتا اور کوڑا کرکٹ بن جاتا ہے۔ مہین چاند چند دن بعد بڑا ہوتا اور ہماری تاریک راتوں کو منور کرتا ہے۔ ہمارے پھلوں کو متاثر کرتا ہے۔ ہمارے سمندروں میں طغیانی پیدا کرتا ہے اور پھر ہماری نظروں سے اُوجھل ہو جاتا ہے۔ ہر روز سورج کا طلوع پُرکشش ہوتا ہے، اس کا شباب بارعب ہوتا ہے اور اس کا غروب پیغامِ عبرت دیتا ہے۔ انسان بلاشبہ اشرف المخلوقات ہے۔ مخلوق میں سب سے زیادہ احسن اور اقوم (مضبوط) ہے۔ لیکن گردش ایام سے وہ بھی محفوظ نہیں۔ اگر وہ اپنی پیدائش کے مراحل پر غور نہیں کر پاتا تو وہ اپنی چند روزہ زندگی میں پیش آنے والے حالات پر ہی نظر ڈال لے۔ کہ کبھی دولت مند ہے تو کبھی غریب، کبھی صحت مند ہے تو کبھی بیمار۔ کبھی چہرے پر شباب کی بہار ہے تو کبھی بڑھاپے کی خزاں۔ کبھی حکومت وسلطنت کا تاج وتخت ہے تو کبھی قید وبند کی ذلت۔ کبھی عزت وعظمت کا کمال ہے تو کبھی ذلت وخواری کا زوال۔ پس جب ایام کی گردش انسان کو کسی ایک حال پر نہیں رہنے دیتی تو وہ کیوں خوشحالی کے ایام پر ناز وگھمنڈ کرتا ہے اور بدحالی کے دنوں میں واویلا مچاتا ہے۔ اسے ہر حال میں یقین رکھنا اور زبان سے اقرار کرنا چاہیے کہ:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾
تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ (آل عمران: ۲۶۔۲۷)

کہو، اے اللہ اے مالک سب ملکوں کے تو بخش دیتا ہے ملک جسے چاہتا ہے اور چھین لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے اور عزت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں ساری بھلائی ہے بے شک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے تو داخل کرتا ہے رات (کا حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن (کا حصہ) رات میں اور نکالتا ہے تو زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے۔

گردشِ ایام میں حکمت یہ ہے کہ انسان رب حقیقی کی قدرت کا اعتراف کرے اور جب اسے انعامات سے نوازا جائے تو وہ یہ خیال نہ کرے کہ یہ اس کی محنت یا حسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اور نہ ہی نعمت ملنے کے بعد وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ میں ہر طرح محفوظ ہوں اب مجھ سے میری یہ نعمت کوئی نہیں چھین سکتا۔ اور نہ ہی کسی نعمت سے محروم ہو جانے کے بعد اسے رنج والم میں اتنا مبتلا ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی رحمت ہی سے مایوس ہو جائے۔ بلکہ انسان کو ہر حال میں رب کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ جب اسے نعمتیں نصیب ہوں تو وہ شاکر بنے اور حقِ شکر ادا کرنے کی کوشش کرتا رہے اور جب اس پر مصائب و آلام کے دن آئیں تو وہ صابر بنے اور حق صبر ادا کرنے کی کوشش کرے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کسی کو ملک دے کر جب چاہتا ہے اس سے بلا وجہ چھین لیتا ہے اور کسی کو عزت دے کر بلا وجہ ذلیل کر دیتا ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں یہ تو قانون قدرت بیان کیا گیا۔ اس پر عمل جب ہی ہوتا ہے جب عمل کا سبب پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ (الانفال: ۵۳)

یہ اس لئے کہ اللہ نہیں بدلنے والا کسی نعمت کو، جس کا انعام اس نے فرمایا ہو کسی قوم پر یہاں تک کہ بدل ڈالیں وہی اپنے آپ کو اور بے شک اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہاں یہ اصول بیان کیا گیا کہ اللہ کسی کو نعمت سے نواز کر اس وقت تک اس سے محروم نہیں کرتا جب تک وہ اس نعمت کا اہل رہتا ہے۔ جب بندے خود ہی اپنی اہلیت اور صلاحیت ختم کر لیتے ہیں تو قانون قدرت حرکت میں آتا ہے اور خوشحالی، عزت وعظمت کے دن سلطنت وحکومت کا تاج آنا فانا ان نااہلوں سے چھین کر اللہ جسے چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔ اور دولت و قوت کے نشے میں مست ہو کر ظلم وستم کرنے والے دوسروں کے لئے نشان عبرت بنا دیئے جاتے ہیں۔ جب احکم الحاکمین کی عدالت سے کسی کی ذلت وخواری کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی قوت اس کے نفاذ کو نہیں روک سکتی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ﴿۱۱﴾ (الرعد:۱۱)

بیشک اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ اور جب اللہ فیصلہ فرما دیتا ہے کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ اور نہ ہی ان کے لیے اللہ کے مقابلہ میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے۔

حالت خواہ اچھی ہو یا بری۔ یعنی اصول یہ ہے کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر کسی کو نعمتوں سے اس وقت تک محروم نہیں کیا جاتا جب تک وہ منعم حقیقی کا شکر ادا کرتا رہتا اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا رہتا ہے اور نہ ہی کسی کو نعمتوں سے اس وقت تک نوازا جاتا ہے جب تک وہ اللہ کی بغاوت اور حکم عدولی سے باز آ کر توبہ نہیں کر لیتا۔

قرآن کریم میں ہماری ہی عبرت کے لئے امم ماضیہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ قوم نوح علیہ السلام، ثمود و عاد، بنی اسرائیل کے واقعات موجود ہیں۔ اللہ نے ان اقوام کو اپنی کن کن نعمتوں سے نہ نوازا۔ لیکن جب ان کی نافرمانی، نا اہلی، ظلم وستم اور تکبر وغرور حد سے متجاوز ہو گئے تو ان پر قانون گردشِ ایام یا قانون عروج وزوال نافذ ہوا۔ اور پھر ان کو ایسے عبرتناک عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ کہ ان کے ایامِ عروج وکمال افسانہ بن کر رہ گئے۔ اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے یہ نشانِ عبرت بنا دیئے گئے۔ لیکن انسان بڑا ہی ظالم ہے وہ ان واقعات کی صداقت کو تسلیم بھی کرتا ہے۔ تباہ شدہ اقوام کے کھنڈرات کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔ لیکن ان کی تباہی کے اسباب پر غور نہیں کرتا۔ اور نہ ہی ان سے خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ قانون گردش ایام سے محفوظ رہ سکے۔ قرآنِ کریم نے اہلِ ایمان کو خصوصی خطاب فرماتے ہوئے اس قانون سے آگاہ کیا تاکہ مؤمن بندے اس کی لپیٹ سے محفوظ رہ سکیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس دور کے مسلمان اس قانون سے خوفزدہ رہے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہے انہیں خوب نعمتوں سے نوازا گیا۔ انہیں حکومت وسلطنت کا تاج وتخت بھی دیا گیا۔ ان پر دولت وثروت بھی خوب برسائی گئی۔ ان کے دلوں کو علم وحکمت سے لبریز کر دیا گیا۔ غرضیکہ وہ عروج وکمال کی انتہاء پر پہنچے لیکن جونہی ان کے ایوانوں میں شراب کے جام چھلکنے لگے، عیش وعشرت کی محفلیں سجنے لگیں، ان کی تلواریں اپنوں ہی کی گردنیں کاٹنے لگیں۔ ظلم وستم، جبر واستبداد ان کی ادا بن گیا۔ مسجدوں کی بجائے انہوں نے قہوہ خانوں کو آباد کیا۔ غریبوں کا خون چوس کر وہ دولت کے ڈھیر سمیٹنے لگے۔ ان کے گھروں سے قرآن کریم کی تلاوت کی بجائے نغمہ وساز کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ مکر وفریب، سود، رشوت اور دیگر حرام ذرائع کو وہ اپنی معاشی ترقی کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ عریانی وفحاشی کو انہوں نے اپنی معاشرت اور تہذیب قرار دیا۔ انہوں نے دنیا کو دین سے علیحدہ کر لیا۔ دین کو پس پشت ڈال دیا۔ اور دنیا کو اپنا مقصدِ زندگی سمجھ بیٹھے۔ گویا انہوں نے ایامِ عروج میں مست ہو کر اللہ سے پوری طرح عملی طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ تو اللہ کا قانون، قانونِ گردشِ ایام حرکت میں آیا اور جو دن ان کے تھے وہ ان کے نہ رہے۔ اب یہ دن ان کے خلاف ہو گئے تاج وتخت بھی چھین لیا گیا۔ حکومت وسلطنت کا بھی خاتمہ ہوا۔ عزت وناموس بھی پامال ہوئی۔ حتیٰ کہ جن کو دیتے تھے انہی کے در کے بھکاری بن گئے۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ (حشر:۲)

پس عبرت حاصل کرو اے دیدہ بینار کھنے والو

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۲۶

بے شک اس میں بڑی عبرت ہے اس کے لیے جو اللہ سے ڈرتا ہے (النازعات:۲۶)

حضور علیہ السلام کی وفات کی خبر

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۴ (آل عمران:۱۴۴)

اور محمد (ﷺ معبود نہیں) صرف رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول ہو چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید ہوں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو الٹے پاؤں پھرے گا تو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچائے گا اور عنقریب اللہ شکر گزاروں کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کی آزمائش کا ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ خبر اڑی کہ حضور علیہ السلام شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کو اپنے آقا ﷺ سے جو محبت تھی۔ جیسا عشق، تعلق اور لگاؤ تھا اس کا مقتضیٰ یہی تھا کہ اس خبر سے ان میں ایک بھونچال آ جائے۔ افراتفری پیدا ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔ کہ کسی میں قوت فیصلہ نہ رہی کہ اب کیا، کیا جائے۔ صحابہ کا ایک گروہ تو وہ تھا جو حضور علیہ السلام کے گرد جمع تھے اور آپ کی حفاظت کر رہے تھے جن میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت قتادہ بن نعمان، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ ان حضرات کو کچھ خبر نہ تھی کہ میدان جنگ میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ اپنی جان پر کھیل کر آقا ﷺ کی جان بچانے میں مصروف تھے۔ کچھ نو مسلم میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ کچھ پہاڑوں میں پناہ لے رہے تھے۔ اور کچھ وہ بھی تھے جو مزید جوش کے ساتھ اپنی گردنیں کٹانے کے لئے اب بھی آگے بڑھ رہے اور کہہ رہے تھے کہ جب ہمارے آقا شہید ہو گئے تو اب زندہ رہنے کا کیا فائدہ۔ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ یہ کہتے ہوئے کفار پر حملہ آور ہوئے کہ حضور علیہ السلام کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔ آؤ ہم ان کے دین کے لئے اپنی جانیں قربان کریں۔ آپ میدان جنگ میں پہنچے خوب لڑے تیراسی زخم جسم پر آئے اور بالآخر جام شہادت نوش کیا۔ حضور علیہ السلام کی شہادت کی خبر شیطان نے اتنی تیزی سے پھیلائی کہ مدینہ تک پہنچ گئی۔ منافقوں کو موقع ہاتھ آیا۔ انہوں نے مدینہ کے گلی کوچوں میں شور برپا کر دیا وہ مسلمانوں کو ورغلا رہے اور کہہ رہے تھے، تم نے دیکھ لیا اگر محمد (ﷺ) سچے نبی ہوتے تو کیوں قتل کیے جاتے۔ پس اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے پرانے دین پر واپس آ جاؤ۔ غرضیکہ ایک عجیب افراتفری اور پریشانی کا عالم تھا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے صورت حال پر توجہ دی اور چیخ چیخ کر اعلان کیا کہ بھائیو منتشر نہ ہو۔ مایوس و ناامید نہ ہو۔ ہمارے آقا ﷺ زندہ ہیں، ہم میں موجود ہیں۔ تمہیں منظم ہونے کا حکم دیتے ہیں اور اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ اس اعلان کو جو سنتا وہ دوسرے کو بتاتا جاتا اور تھوڑی ہی دیر میں پروانے شمع رسالت کے گرد نظر آنے لگے۔ مایوسی

ونا امیدی کے بادل چھٹ گئے اور روشن مستقبل کی کرن چمکنے لگی۔ جب مسلمانوں کو قدرے اطمینان ہو گیا تو قرآن کریم کی آیت مذکورہ نازل ہوئی اور واضح کر دیا گیا کہ آج نہیں تو کل تمہارے محبوب آقا کو تم سے جدا ہونا اور اس دنیا سے جانا ہے۔ ہم نے تمہاری محبت کا تماشہ خوب دیکھا کہ آقا کی جدائی کی غلط خبر نے تمہیں کیسا بے خبر کر دیا۔ تمہیں اتنا بھی احساس نہ رہا کہ تم انبیاء سابقین علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہو، ان کے حالات جانتے ہو تمہیں خوب علم ہے کہ وہ اس عالم فانی میں ایک خاص مدت کے لئے آئے۔ اور بالآخر دنیا سے چلے گئے۔ ان میں سے کچھ پر طبعی موت آئی۔ کچھ شہید کیے گئے۔ کچھ کو اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے آسمان پر اٹھالیا۔ (حضرت عیسیٰ وادریس علیہما السلام) اور کچھ کو زمین پر ہی لوگوں کی نگاہوں سے روپوش کر دیا گیا۔ (حضرت خضر والیاس علیہما السلام) بہر حال سب ہی جا چکے۔ ہمارے محبوب نبی آخرالزماں ﷺ بھی رسول ہی تو ہیں۔ عبد ہی تو ہیں معبود تو نہیں۔ ''حی لا یموت'' صرف اور صرف خالق کی صفت ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ لہٰذا جیسے پچھلے انبیاء گزر چکے اسی طرح ایک دن ہم اپنے اس محبوب رسول کو بھی ضرور اپنی طرف بلالیں گے۔ یہ ہماری مرضی ہے کہ اس رجعت کا ذریعہ ہم طبعی موت کو بنائیں یا شہادت کو۔ لیکن بہر حال انہیں پردہ فرمانا ہے۔ اب تم اپنے متعلق بتاؤ کہ ان کے چلے جانے کے بعد تمہاری راہ کیا ہوگی۔ تم اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہو گے یا اس سے منہ موڑ لو گے۔ اور پھر کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ اگر تم نے دوسری راہ اختیار کر لی تو ہمارا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ کہ جو راستہ رسول نے تمہیں دکھایا ہے وہ تمہاری فلاح و بہبود کا راستہ ہے۔ پس اگر رسول کے تشریف لے جانے کے باوجود بھی تم اس پر قائم رہے تو تمہیں وہی اجر وثواب دیا جائے گا جو رسول کی موجودگی میں ملتا۔ اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ پس تمہیں اس وقت کے لئے تیار رہنا چاہیے جب تمہارے آقا تم سے پردہ فرمالیں گے۔

حضور علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کی خبر آپ کے پردہ فرمانے سے کئی سال قبل غزوۂ احد کے موقع پر دے دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ کسی مؤمن کو اس حقیقت پر شک نہیں ہو سکتا کہ حضور علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں، عبد ہیں، انسان ہیں اور ہر انسان کو موت آنی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ نبی کی موت حیاتِ جاودانی کا ذریعہ ہوتی ہے اس کا جسم تک اپنی اصل حالت پر رہتا ہے کہ اللہ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ نبی کے جسم کو کھائے۔ جس طرح اللہ نے نارِ نمرود پر حرام کر دیا تھا۔ کہ وہ خلیل کے جسم کو جلائے ہر چیز کی تاثیر اللہ ہی کی قدرت سے ہے۔ وہ جب چاہے جس چیز کی تاثیر تبدیل کر دے۔ آگ کی تاثیر جلانا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ختم کر دی گئی اس کپڑے کے لئے ختم کر دی گئی جس سے میرے آقا ﷺ نے ہاتھ صاف فرمائے۔ زمین کی تاثیر ہر جسم کو کھالینا یا خراب کر دینا ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کے مقدس اجسام کے لئے ختم کر دی گئی۔ تمام انبیاء کرام اپنے دنیاوی اجسام کے ساتھ اپنی قبور میں آرام فرما رہے ہیں جبکہ میرے آقا ﷺ قبر انور سے اپنی امت کا حال بھی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ امت کے گناہ گاروں کے لیے استغفار بھی کرتے ہیں۔ خوش نصیب غلاموں کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اور مقدر والے غلاموں سے مصافحہ بھی فرماتے ہیں تاہم موت کا مرحلہ ان پر بھی آیا۔ اور ہماری نظروں سے پردہ فرما گئے۔ ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ تمام صحابہ کو حضور علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کا یقین کامل تھا۔ قرآنِ کریم خبر دے چکا تھا۔ خود حضور علیہ السلام نے بار بار اپنی موت کا ذکر فرمایا تھا۔ لیکن صحابہ کرام کو

آپ سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ جس دن یہ حادثہ فاجعہ ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیامت بپا ہوگئی اور صحابہ کرام کی حالت ایسی ہو گئی تھی گویا انہیں آپ کی موت کا شان وگمان بھی نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی یہ فرماتے سنے گئے کہ '' اگر کسی نے کہا کہ محمد ﷺ کا انتقال ہوگیا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا'' ایسے نازک موقع پر اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حوصلہ دیا انہوں نے بمشکل حضرت عمر کو خاموش کیا۔ اور مجمع صحابہ میں قرآن کریم کی یہی آیت مذکورہ تلاوت فرمائی جسے سن کر صحابہ کو ہوش آیا۔ ان کی آنکھیں کھلیں۔ حضرت عمر اور بعض دیگر صحابہ نے کہا یہ آیت تو ہم بھول ہی چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی نازل ہوئی ہے۔ غرضیکہ اس آیت مبارکہ ہی نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حزن و دھن سے بچایا اور وہ دین کی خدمت اور اسلام کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہوئے۔

اسلام اللہ کی امانت ہے

افراد کے ذاتی مشن اور تحریکیں ان کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں جو ان کی موت کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے۔ اسلام کسی انسان کا ذاتی مشن نہیں، یہ وہ مکمل ضابطہ حیات ہے جو اللہ نے انسان کو دیگر بے شمار نعمتوں کی طرح عطا فرمایا۔ یہ انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے کہ اگر انسان اس سے محروم رہتا تو اسے زندگی بسر کرنے کے طریقے اور اصول میسر نہ آتے اور پھر وہ جانوروں کی طرح ایک مخلوق کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اللہ نے اپنی اس نعمت کا امین حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو بنایا۔ جو اللہ کی یہ امانت دنیا میں لے کر آئے۔ اور اللہ کی عطا کردہ تعلیمات کے مطابق انہوں نے اپنی قوموں کو اسلام پر عمل کرنے کی تعلیم دی۔ ہر نبی یہ امانت اپنی قوم کو سونپتا رہا اور جاتا رہا۔ حتیٰ کہ سید الانبیاء خاتم الانبیاء ﷺ یہ امانت دے کر مبعوث فرمائے گئے۔ آپ نے اللہ کے عطا کردہ علم غیر متناہی سے اپنی امت کو کچھ اس انداز پر تعلیم دی اور ان میں اسلام سے ایسی محبت پیدا فرمائی۔ کہ آپ کا ہر غلام اس امانت کا امین بننے کے لائق ہوگیا۔ اور اس نے اس کی حفاظت کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ لہٰذا حضور علیہ السلام کے بعد امانت الٰہیہ کی تعلیم واشاعت اور حفاظت کے لیے کسی نبی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اسی امانت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ۝۷۲ (احزاب: ۷۲)

ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے بیشک انسان بڑا ظالم اور نادان ہے۔

یہ امانت سب سے پہلے انسانِ اول ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام نے قبول فرمائی۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے سلسلہ انبیاء جاری فرمایا جو اسی امانت کو لے کر آتے رہے اور اپنی اپنی قوموں کو اس کے احکام پر عمل کی تبلیغ وہدایت کرتے رہے۔ نبی آخر الزماں ﷺ بھی اسی امانت کو لے کر آئے چونکہ آپ پر سلسلہ نبوت ورسالت ختم ہو رہا تھا۔ لہٰذا اللہ نے اپنی اس امانت کی حفاظت وبقا کا خود ذمہ لیا اور آپ کے غلاموں کو یہ صلاحیت واہلیت عطا فرمائی کہ انہوں نے ہر طوفان کا مقابلہ کر کے اس کی حفاظت بھی کی۔ اشاعت وتبلیغ بھی کی اسی لئے میرے آقا ﷺ نے اپنے دین کے مبلغین کو اپنا وارث قرار دیا۔

کہ یہ اس امانت کے امین ہیں جو آپ نے ان کو سونپی۔

غرضیکہ اسلام نبی کا ذاتی مشن اور ذاتی تحریک نہیں جو نبی کے چلے جانے کے بعد ختم ہو جائے۔ یہ اللہ کا دین ہے اس کی امانت ہے جس کی وہ خود حفاظت فرماتا ہے۔ پس مؤمنین کو ہدایت کی گئی کہ تم اپنے آقا کے چلے جانے کے بعد کفر کی طرف نہ لوٹو بلکہ مزید ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرو۔ کہ اب تم پر ہی اس امانت کی حفاظت کی ذمہ داری جو تمہارے آقا تمہیں دے کر گئے ہیں اگر تم نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا تو اللہ تم سے وعدہ فرماتا ہے۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحج:۴۰)

اور اللہ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا بیشک اللہ قوت والا سب پر غالب ہے۔

اس وعدہ الٰہی کے ہی باعث اہل اسلام کے سر بلند ہیں اور وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آج تک اسلام جس طرح محفوظ اور اپنی اصل حالت میں موجود ہے کوئی مذہب اس طرح موجود نہیں۔ نیز مسلمان اپنے مذہب ہی کے سہارے دنیا میں باقی اور زندہ ہیں۔ ان کی شناخت اور ان کا امتیاز اسلام ہی ہے جب کہ دیگر قومیں اپنے مادی وسائل پر نازاں ہیں اور ان کی شناخت ان کی زبان یا ان کے وطن سے ہے۔ کوئی امریکی ہے، کوئی یورپی، کوئی افریقی لیکن مسلمان صرف مسلمان ہے۔ اس کے تعلق کی بنیاد اسلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے دشمن ہر جگہ کے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ چاہے وہ انہی کا ہم وطن، ہم زبان اور ہم رنگ ہی کیوں نہ ہو۔

موت اور دنیا یا آخرت کی طلب

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝

(ال عمران:۱۴۵)

اور کسی جان کے لیے حکم الٰہی کے بغیر موت نہیں سب کی اجل لکھی ہوئی ہے۔ اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا ہم اس میں اسے دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا ہم اس میں سے اسے دیں گے۔ اور عنقریب ہم (اچھا) بدلہ دیں گے شکر گزاروں کو۔

آیت مبارکہ میں سنت الٰہیہ کے دو اصول بیان کئے جا رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ ”موت بغیر حکم الٰہی نہیں آتی“ دوسرا یہ کہ جو ’دنیا کا حریص ہوتا ہے اسے دنیا دے دی جاتی ہے اور جو آخرت کا طلبگار رہتا ہے وہ آخرت کی دائمی نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے“۔ ہم انہی دونوں امور کی وضاحت پیش کر رہے ہیں۔

موت

موت ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں ورنہ کفار نے جس ڈھٹائی کے ساتھ دیگر حقائق کا انکار کیا اس کا بھی انکار کر

دیتے لیکن اس کا انکار کسی کے بس کی بات نہیں کہ یہ تو ہر ایک کی گردن دبا لیتی ہے۔ نہ اس سے کوئی بچا ہے نہ بچ سکتا ہے۔ لیکن کافر موت کو ایک طبعی امر قرار دیتا ہے اور اس کے ظاہری اسباب کو ہی اصل سمجھتا ہے۔ اسی لئے اس کی زندگی پر موت کے یقین کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب کہ مؤمن قرآنی وضاحت کے مطابق موت سے متعلق دیگر حقائق کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم موت سے متعلق جو حقائق بیان کرتا ہے، وہ یہ ہیں۔

موت ہر جاندار کو آنی ہے

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

(آل عمران:۱۸۵)

ہر جاندار چکھنے والا ہے موت کا مزہ اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن، پس جو شخص بچالیا گیا آگ سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا، اور نہیں یہ دنیاوی زندگی مگر ساز و سامان دھوکہ میں ڈالنے والا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

(انبیاء:۳۵)

ہر جاندار چکھنے والا ہے موت کا مزہ اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے (آخر کار) تم سب کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۟ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ (عنکبوت:۵۷)

ہر جاندار چکھنے والا ہے موت کا مزہ پھر ہماری ہی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

ان آیات کے مطابق ہر نفس، ہر جاندار کے لئے موت کا آنا واضح ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ موت کے بعد سب کا انجام ایک جیسا ہو اور سب کو مردہ ہی کہا اور سمجھا جائے کہ اللہ قادر مطلق جسے چاہتا ہے ظاہری موت کے بعد ابدی زندگی سے نواز دیتا ہے اور اس کی قوتوں کو زندوں سے زیادہ قوی کر دیتا ہے۔ جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کہ ظاہری موت کے بعد ان کے جسم گلنے، سڑنے حتیٰ کہ بیماری اور کمزوری سے بھی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ زمین کے نیچے ان کی زندگی، زمین کے اوپر کی زندگی سے ہر طرح بہتر ہے اور شہداء جو انبیاء کرام علیہم السلام کی محبت و اطاعت میں اپنی گردنیں کٹاتے ہیں کہ انہیں مردہ کہنے یا سمجھنے کی بھی ممانعت ہے۔ اسی طرح اولیاء و صالحین میں سے اللہ جن کو چاہتا ہے، موت کے بعد اس زندگی سے بہتر زندگی عطا فرما دیتا ہے کہ وہ اپنے عقیدت مندوں کو فیض پہنچاتے اور ان کی مدد کرتے ہیں۔

موت سے کوئی بچانے والا نہیں

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ (النساء:۷۸)

جہاں کہیں تم ہو گے پالے گی تمہیں موت اگر چہ (پناہ گزیں) ہو تم مضبوط قلعوں میں

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ یُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةًؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ (۶۱) (انعام:۶۱)

اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان، یہاں تک کہ جب آ جائے تم میں سے کسی کی موت تو قبض کر لیتے ہیں اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ
الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸) (جمعہ:۸)

(اے حبیب علیہ السلام) آپ فرما دیجئے، یقیناً وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، وہ ضرور تمہیں مل کر رہے گی۔ پھر لوٹا دیا جائے گا تمہیں اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر چھپے اور ظاہر کو۔ پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان (اعمال) سے جو تم کرتے تھے۔

دنیا کی کوئی قوت یا حفاظت کا کوئی طریقہ موت سے نہیں بچا سکتا۔ بیماری کی حالت میں علاج کرانے کی اجازت ہے لیکن ڈاکٹر یا دوا کو موت سے نجات کا ذریعہ سمجھنا حرام ہے۔ جان کی حفاظت کے طریقے اختیار کرنا جائز ہے۔ لیکن ان طریقوں کو موت سے نجات کا سبب یقین کرنا حرام ہے۔ پس بیماری میں موت سے گھبرانا یا خطرات کے وقت موت سے بچنے کے لئے بھاگنا مؤمن کی شان نہیں۔ علاج مرض کی تکلیف سے نجات کے لئے ہے۔ موت سے نجات کے لئے نہیں۔ حفاظت دشمن کی سازشوں سے بچنے کے لئے ہے۔ موت سے بچنے کے لیے نہیں۔

موت بغیر حکم الٰہی نہیں آتی

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًاؕ (آل عمران:۱۴۵)

اور نہیں ممکن کہ کوئی مرے بغیر اللہ کی اجازت کے لکھا ہوا ہے موت کا مقرر وقت

وَ اللّٰهُ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۱۵۶) (آل عمران:۱۵۶)

اور (درحقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔

هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۵۶) (یونس:۵۶)

وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ (۲۳) (حجر:۲۳)

اور بیشک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی (سب کے) وارث ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ اِلَیْنَا الْمَصِیْرُ (۴۳) (ق ۴۳)

بیشک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف (سب کو) لوٹنا ہے۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٦٠﴾ (واقعہ:۶۰)

ہم نے ہی مقرر کی ہے تمہارے درمیان موت اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں۔

یہ چند آیات ہیں اُن متعدد آیات میں سے جن میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے کہ موت حکم الٰہی کے بغیر نہیں آتی۔ موت کے ظاہری اسباب اصل نہیں۔ اصل اللہ کا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات اسباب غیر مؤثر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مرض موت کا یقینی سبب قرار دیا جاتا ہے تو دیکھا گیا ہے اس مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود بہت لوگ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں کہ بہت لوگ ان کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ لیکن انہی میں سے کچھ لوگ زندہ بھی رہتے ہیں۔ ظاہر میں لوگوں کو ان کی زندگی پر حیرت ہوتی ہے وہ ان کے بچ جانے کے اسباب تلاش کرتے ہیں جبکہ سبب ایک ہی ہوتا ہے کہ ان کی موت کا اللہ کی طرف سے فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

مومن پر عقیدہ موت کا اثر

مؤمن موت پر یقین رکھتا ہے لیکن ان تمام حقائق کے ساتھ جن کو قرآن کریم نے بیان فرمایا۔ لہٰذا اس کی زندگی پر اس عقیدے کا بے حد اثر ہوتا ہے۔ وہ جری اور بہادر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے طوفانوں سے وہ بلاخوف ٹکرا جاتا ہے۔ کسی قوت و طاقت کو وہ اپنی نظروں میں نہیں لاتا۔ موقع پڑنے پر وہ گولی کے سامنے بھی سینہ تانے، اس یقین کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے کہ یہ گولی میری موت کا ذریعہ اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک اللہ کا حکم نہ آئے۔ اور اگر اللہ کا حکم ہو چکا ہے تو اس گولی سے بچ جانے اور بھاگ جانے کے باوجود بھی میں ایک لحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس عقیدۂ ایمان کے ساتھ اگر مؤمن کو یہ پتہ چل جائے کہ وہ شہادت کی راہ پر گامزن ہے اور شہادت اسے اپنی آغوش میں لینے کی منتظر ہے۔ تب تو اس کی شجاعت اور جرأت کی کوئی حد نہیں رہتی۔ کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس ظاہری موت کے صلہ میں حیات جاودانی میرا مقدر بن چکی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شہادت درحقیقت موت سے ابدی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ پس وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح اللہ اور اس کے رسول کے دشمن پر لپکتا ہے اور عارضی زندگی کی قربانی دے کر دائمی زندگی حاصل کرتا ہے۔

موت کا یہی تصور ہے جس نے اہل ایمان کو ہر دور میں اسلام کی بقا اور حفاظت کا حوصلہ دیا۔ اور دنیاوی و ظاہری اسباب کے فقدان یا کمی کے باوجود انہوں نے جس طرح دین کی حفاظت اپنے حقوق کے حصول اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے دشمن کا دلیری و جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا، اس پر دنیا والوں کو آج تک حیرت ہوتی ہے۔ اور وہ نہیں سمجھ پاتے کہ مسلمان موت کو کھلونا سمجھ کر اس سے کیسے کھیلتا ہے۔ کیا اسے اپنی جان پیاری نہیں ہوتی؟ کیا وہ دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتا؟

حضور علیہ السلام کے دور میں اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شجاعت کے واقعات سے تاریخ و سیر کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ شہدائے بدر کا تذکرہ پڑھئے یا شہداء احد کا، یا دیگر غزوات کے جاں نثاروں کا حال پڑھئے۔ سب میں ایک ہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ موت بغیر حکم الٰہی نہیں آسکتی۔ اس کا وقت مقرر ہے، جب کہ ایک دن مرنا ضرور ہے۔ اور جو موت اللہ کی راہ میں آئے حیات ابدی کا ذریعہ ہے۔ ہر صحابی کے نزدیک شہادت نعمت عظمیٰ تھی جو اسے پالیتا وہ اپنے آپ کو

کامیاب و کامران یقین کرتا اور جو اس سے محروم رہا اسے مرتے دم تک اس کا صدمہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوتے ہیں تو زبان سے آخری جملہ نکلتا ہے "فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَۃِ" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ کہلائے۔ ساری عمر جہاد کرتے رہے لیکن شہید نہ ہو سکے۔ موت کے وقت اپنے شہید نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

اس کے بعد بھی اہل ایمان نے ہر دور میں جرأت و شجاعت کی مثالیں قائم کیں اور اپنے اس خصوصی امتیاز کو باقی رکھا یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ غیر مسلم مسلمانوں سے خائف رہے اور آج بھی ہیں۔ کیونکہ آج ہم اپنے کردار میں کتنے ہی کمزور سہی لیکن بحمد اللہ بزدل نہیں ہیں۔ اگر آپ کو سیر فی الارض (دنیا دیکھنے) کا موقع ملا ہے تو ہماری تائید کریں گے کہ مسلمان جہاں جہاں آباد ہیں، دلیر ہیں، کسی سے دبتے نہیں۔ مذہبی حقوق کے حصول یا اپنی حق تلفی کے لئے وہ پوری جرأت کے ساتھ احتجاج کرتے ہیں اور اپنے وجود کو اسلام کے دشمنوں سے بھی تسلیم کرا کے رہتے ہیں۔ اسی لئے خود کو سپر پاور کہلانے والے بھی جتنے مسلمانوں سے خوفزدہ ہیں کسی اور قوم سے نہیں۔ وہ مسلمانوں کی جرأت و شجاعت پر دہشت گردی کا لیبل لگا کر یا ان کے درمیان انتشار و افتراق پیدا کر کے انہیں غلام بنا لینے کی سازش میں مصروف ہیں۔ تاکہ انہیں ان کے خوف سے نجات حاصل ہو سکے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ موت کے صحیح تصور نے امت مسلمہ کے ہر فرد کو اتنا جری اور بہادر بنا دیا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں اپنے اس خصوصی امتیاز کو ختم نہیں ہونے دیتا۔

دنیا یا آخرت کی طلب

آیت زیر گفتگو میں جو دوسرا اصول بیان کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ "جو کوئی اپنے اعمال کا اجر و بدلہ دنیا میں چاہتا ہے اللہ رب العزت اسے دنیا کا کچھ حصہ عطا فرما دیتا ہے اور جو اپنے اعمال سے صرف آخرت کا اجر و ثواب چاہتا اور اس کی امید رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں ثواب عطا فرماتا ہے۔

مؤمن کے کمال ایمان کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اس کی نظر ہمہ وقت اُخروی زندگی پر ہو، اسے ہر وقت آخرت کی فکر ہو۔ اس کا ہر عمل آخرت میں بھلائی اور کامیابی کے لئے ہو کہ جسے آخرت میں فوز و فلاح نصیب ہو گی اسے اس فانی دنیا میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ یونس میں اولیاء کرام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۴﴾ (یونس: ۶۲ تا ۶۴)

سنو، بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیزگاری کرتے رہے۔ انہیں کے لیے بشارت ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت میں نہیں بدلتیں اللہ کی باتیں یہی بڑی کامیابی ہے۔

مقام ولایت انہی اہلِ ایمان کو نصیب ہوتا ہے جو اسباب دنیا سے بے نیاز و بے فکر ہو کر صرف اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے عمل کرتے اور آخرت کی بھلائی کی آرزو رکھتے ہیں۔ پس اللہ ان کی آخرت بھی سنوار دیتا ہے اور دنیا کی تمام نعمتوں سے بھی نواز دیتا ہے۔ یہ ان کا زُہد و تقویٰ ہے کہ وہ دنیا کی تمام سہولتیں میسر آ جانے کے باوجود بھی ان سے دور اور بے نیاز رہتے ہیں۔ جب کہ اللہ کی مخلوق ان سے فیضیاب ہوتی ہے۔ اللہ کے یہ بندے دنیا سے چلے جاتے ہیں لیکن ان کا فیض جاری رہتا ہے۔ ان کی نسلوں کو ان کے صدقہ میں عزت و دولت نصیب ہوتی ہے۔ ان کے عقیدت مندوں کی ان کے واسطہ وسیلہ سے آرزوئیں پوری ہوتی ہیں۔ دلی تمنائیں برآتی ہیں۔ حضور غوث الاعظم، خواجہ غریب نواز، داتا گنج بخش، بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر بے شمار اولیاء کرام کے حالات زندگی اور ان کے مزارات مقدسہ سے جاری فیض اس حقیقت پر شاہد ہے تاہم یہ بلند مقام امت کے ایک مخصوص طبقہ کو نصیب ہوتا ہے۔ جب کہ عام مؤمنین بھی اگر دین کی پابندی کریں اور اس کے صلہ میں وہ اللہ سے دنیا و آخرت کی بھلائی طلب کریں تو اللہ اپنے فضل و کرم سے انہیں دنیا کی بھلائیاں بھی عطا فرماتا ہے اور آخرت کا اجر بھی۔ اور جو لوگ صرف دنیا کے طلب گار ہوتے ہیں انہیں دنیا تو مل جاتی ہے لیکن آخرت میں انہیں کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ سورہ بقر کی ان آیات پر غور فرمائیے:

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

(البقرہ:۲۰۰)

اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب دیدے ہمیں (سب کچھ) دنیا ہی میں اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

یہ مشرکین کا حال ہے جو آخرت پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ان کے لیے سب کچھ دنیا ہی کی زندگی ہے پس وہ حج کے بعد بھی اللہ سے صرف دنیا ہی کی طلب کیا کرتے تھے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دنیا کی حرص و ہوس میں ایسے مبتلا ہو گئے کہ انہیں اپنی دعاؤں میں بھی آخرت کا خیال نہیں آتا۔ جب اللہ سے مانگتے ہیں تو دولت کی فراوانی، تجارت و کاروبار میں برکت، عیش و عشرت کی زندگی ہی مانگتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کو دنیا تو مل جاتی ہے لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔ لیکن مؤمن بڑے فائدے میں رہتا ہے وہ اس طرح دعا کرتا ہے:

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

(البقرہ:۲۰۱)

اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔

پس یہ لوگ بڑے فائدے میں رہے۔ انہیں مژدہ دیا گیا کہ جو تم نے مانگا وہ ملے گا۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ (البقرہ:۲۰۲)

انہیں لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) بسبب ان کی (نیک) کمائی کے اور اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔

اے ایمان والو! تمہیں زیب تو یہی دیتا ہے کہ تم ان لوگوں میں شامل ہو جن کی نظر صرف آخرت پر ہوتی ہے جنہیں فکر صرف آخرت کی رہتی ہے اور جو اللہ سے آخرت ہی کی نجات کے طلب گار رہتے ہیں۔ پس اللہ ایسے لوگوں پر فضل فرماتا ہے ان کی آخرت سدھر جاتی ہے اور بطور انعام انہیں دنیا کی دولت، عزت، شہرت سب کچھ نصیب ہو جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی کے لئے دعا کیا کرو، کہ اگر صرف دنیا مانگی تو آخرت میں خالی ہاتھ نظر آؤ گے۔ اللہ محفوظ رکھے۔

وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۱۷

آل عمران: ۱۴۹ تا ۱۵۵

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا
خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾
سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ
مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ
عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ
ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾
اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ
لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾
ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآىِٕفَةٌ قَدْ

اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ ؕ یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ
الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ ؕ
یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ
الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَ لِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ
لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝
اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا
كَسَبُوْا ۚ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ (آل عمران: ۱۴۹ تا ۱۵۵)

اے ایمان والو! اگر پیروی کرو گے تم کافروں کی تو وہ پھیر دیں تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) تو تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔ بلکہ اللہ حامی ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔

عنقریب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس لئے کہ انہوں نے شریک بنا لیا اللہ کے ساتھ اس کو جس کے لئے نہیں اتاری اللہ نے کوئی دلیل اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور بہت بری جگہ ہے ظالموں کی۔

اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے، یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے، بعض تم سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ تمہیں آزمائے۔ اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم کو اور اللہ بہت فضل فرمانے والا ہے مومنوں پر۔

یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے کسی کو اور رسول بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے پس اللہ نے پہنچایا تمہیں غم کے بدلے غم تاکہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں، اور اللہ خبردار ہے اس سے جو کچھ تم کرتے ہو۔

پھر اتاری اللہ نے تم پر غم کے بعد راحت (یعنی) غنودگی، جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے، اور ایک جماعت ایسی تھی جسے فکر پڑی ہوئی تھی اپنی جانوں کی، وہ بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے ساتھ بلاوجہ دور جاہلیت کی بدگمانی۔ وہ کہتے تھے، کیا ہمارا بھی اس میں کچھ دخل ہے۔ آپ فرما دیجئے اختیار تو سب اللہ کا ہے۔ وہ چھپاتے ہیں اپنے دلوں میں جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں (اپنے دلوں میں) اگر ہوتا اس کام میں ہمارا کچھ دخل تو نہ مارے جاتے ہم یہاں

آپ فرما دیجئے اگر تم (بیٹھے) ہوتے اپنے گھروں میں تو ضرور نکل آتے وہ لوگ لکھا جا چکا تھا، جن کا قتل ہونا اپنی قتل گاہوں کی طرف (یہ سب مصائب اس لئے تھے) تاکہ آزما لے، اللہ جو کچھ تمہارے سینوں

میں ہے اور صاف کر دے جو تمہارے دلوں میں تھا اور اللہ خوب جاننے والا ہے سینے کے رازوں کو۔
بیشک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم میں سے اس روز جب مقابلہ میں نکلے تھے دونوں لشکر تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بے شک (اب) معاف کر دیا اللہ نے انہیں بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت حلم والا ہے۔

اتباع کفار سے بچو

اپنے آپ کو کافروں کی پیروی سے بچاؤ۔ اپنے معاملات میں ان کے مشوروں کو اہمیت نہ دو، ان کے نقش قدم پر نہ چلو، ان کے طرز زندگی، ان کے تہذیب وتمدن کو اختیار نہ کرو۔ کیونکہ وہ کبھی بھی تمہارے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ تمہارے ساتھ ان کے تعاون کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ تمہیں بھی کافر بنالیں یا کم از کم تم میں انتشار وافتراق پیدا کر کے تمہاری قوت کو ختم کر دیں۔ تمہیں عیش وعشرت کی زندگی کا عادی بنا کر ایسا کاہل اور کمزور کر دیں کہ وہ دندناتے رہیں۔ اور تم ان کے کفر کا مقابلہ نہ کر سکو۔

تمہیں کفار کی حمایت حاصل کرنے یا ان کو اپنا مشیر بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری عزت وناموس کا محافظ تو وہ اللہ ہے جس کی وحدانیت کا اقرار کر لینے کے بعد تم اس کی پناہ میں آ چکے ہو اور جس کے محبوب کا کلمہ پڑھ لینے کے بعد تم اس کے پیارے اور محبوب بن چکے ہو۔ وہ ہر حال میں تمہاری مدد فرمائے گا۔ اپنی تاریخ کو یاد کرو تو تمہاری ہمت افزائی ہوگی اور تمہیں اللہ کی مدد کا یقین کامل ہو جائے گا۔

ذرا غور کرو ۳ھ کے عظیم واقعہ "غزوۂ احد" پر کہ جب یک دم جنگ کا پاسہ پلٹ گیا، اس نازک موقع پر اللہ ہی نے مدد فرمائی۔ ورنہ وقتی طور پر کفار کو یہ موقع حاصل ہو چکا تھا کہ وہ مکہ واپس ہونے کی بجائے مسلمانوں سے پہلے مدینہ کا رخ کر لیتے اور اسلام کی پہلی ریاست کو تہس نہس کر ڈالتے لیکن انہوں نے مکہ کا رخ کیا۔ کچھ دور پہنچ کر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تو وہ واپس ہونے کا ارادہ کرنے لگے۔ پس اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کافروں کے دلوں میں ایک عجب سا خوف طاری کر دیا کہ وہ ہمت ہار گئے اور مکہ واپس چلے گئے۔

اس سے قبل جب بعض صحابہ نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر حضور علیہ السلام کے حکم کے برعکس پہاڑی کو چھوڑا اور کفار نے موقع پا کر پہاڑی کے پیچھے سے حملہ کر دیا تو جنگ کا نقشہ ایسا بدلا کہ الامان والحفیظ۔ ہر طرف مسلمانوں کے لاشے ہی لاشے نظر آ رہے تھے۔ کفار آگے پیچھے دونوں طرف سے حملہ آور تھے۔ ایسی بدحواسی اور ابتری کا عالم تھا کہ اپنے اور غیر میں امتیاز تک نہ ہو رہا تھا۔ خود مسلمان، مسلمانوں کی زد میں آ رہے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں ہی کی تلواروں سے شہید ہوئے اور حضرت حذیفہ چلاتے رہے کہ یہ میرے والد ہیں، ان کو چھوڑ دو۔ لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ غرضیکہ ستر صحابہ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اسی دوران ایک بڑی مصیبت یہ آن پڑی کہ منافقین و کفار نے حضور علیہ السلام کی شہادت کی خبر اڑا دی۔ بس پھر کیا تھا جو قدم میدان جنگ میں جمے ہوئے تھے وہ بھی اکھڑ گئے۔ اکثر حق پر جمے رہے۔ اللہ کے رسول ﷺ پر کفار نے یلغار کر ڈالی۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا۔ دندان مبارک کا ایک حصہ جھڑا،

مقدس ہونٹ پر زخم آیا۔ اس حال میں قائد اعظم ﷺ اپنے جانثاروں کو پکار رہے تھے لیکن کوئی سنوائی نہ تھی۔ بھاگے جا رہے تھے کوئی مڑ کر دیکھتا بھی نہ تھا۔ اس افراتفری اور غم واندوہ کے بعد اللہ نے مدد فرمائی اور مجاہدین کے کانوں میں آواز گونجنے لگی کہ آقا زندہ ہیں۔ اور پروانے شمع کے گرد جمع ہونے لگے۔ کفار اپنی کامیابی کے زعم میں مست ہو کر بھاگنے لگے۔

ابھی مسلمانوں کے لیے ایک اور صبر آزما مرحلہ تھا کہ جب یہ جانثار اپنے آقا ﷺ کی قیادت میں میدان کارزار کی طرف چلے کہ شہیدوں کی زیارت کریں، ان کی نماز جنازہ کا فریضہ ادا کریں۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے مٹی تلے چھپائیں تو دیکھنے والوں کی ہمتوں پر قربان جایئے کہ انہوں نے اپنے کسی بھائی کے ہاتھ کٹے دیکھے، کسی کا سر مبارک کہیں پڑا پایا تو کسی کا جسم مقدس نیزوں سے چھلنی دیکھا تو کسی کے ناک، کان، کلیجہ غائب دیکھا۔ ان میں سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ چچا کی نعش کو دیکھ کر پیکر صبر اللہ کے رسول ﷺ کی آنکھوں سے موتی جھڑنے لگے۔ آپ نے فرمایا:

رَحِمَکَ اللّٰهُ یَا عَمِّ لَقَدْ کُنْتَ وَصُوْلاً لِلرَّحِمِ فَعُوْلاً لِلْخَیْرَاتِ

میرے چچا اللہ آپ پر اپنی رحمت برسائے آپ نے صلہ رحمی کا حق ادا کر دیا اور نیکیوں پر عمل کر دکھایا۔

حضرت عبداللہ بن جحش، مبلغ اول ذوالہجرتین، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عباس بن عبیدہ، حضرت نعمان ابن اعرج، حضرت نعمان بن مالک، حضرت عمرو بن الجموح، حضرت ابوایمن، حضرت اوس بن ثابت، حضرت سعد بن خارجہ، حضرت مالک بن سنان، حضرت عتبہ بن الربیع اور دیگر شہداء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جنہوں نے اسلام پر اپنی جانیں نچھاور کر کے حیات جاودانی پائی۔ خاک وخون میں غلطاں ان کے مقدس جسم، میدان میں پڑے زبان حال سے پکار رہے تھے کہ ''مؤمن کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔ اس سے شجر اسلام کی آبیاری ہوتی ہے''۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ دیکھنے والوں کا اس وقت کیا حال ہوگا۔ وہ کیسے تڑپتے ہوں گے جسم، جنگ کی تکان سے پہلے ہی کیا کم چور، چور تھے۔ اس پر قیامت کا یہ منظر کس قدر نڈھال کر رہا ہوگا۔ کہ اللہ کو رحم آیا اور اس نے ان تھکے ماندے بندوں کی مدد فرمائی۔ انہیں اونگھ آنے لگی، سب کے سب کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ہم اونگھنے لگے یہاں تک کہ کئی بار تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹی اور میں نے اسے سنبھالا۔

ایسی حالت میں نیند کا آجانا بلاشبہ اللہ کی طرف سے نصرت تھی۔ بڑی نعمت تھی۔ نیند ایک نعمت ہے۔ ان سے پوچھیے جنہیں نرم وگرم بستروں پر گولیاں کھانے کے باوجود بھی نیند نہیں آتی۔ اللہ اپنی اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے خود ارشاد فرماتا ہے:

وجعلنا نومکم سباتا اور ہم نے تمہاری نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا (۳۰:عم۹)

نیند تفکرات سے نجات کا ذریعہ ہے، اس سے جسم کی طاقت بحال ہوتی ہے، قوت برداشت بڑھتی ہے، ذہنی سکون میسر آتا ہے۔ اس کے دوران سونے والا گناہوں سے محفوظ رہتا ہے۔ بلاشبہ یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت سے مضطرب مجاہدین احد کو نوازا گیا، ان کی مدد کی گئی۔ اس سے قبل غزوہ بدر میں بھی عین جنگ کی شب بھی مجاہدین کو اس نعمت سے نوازا گیا تاکہ وہ جنگ کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔

غزوۂ بدر کے ایک مجاہد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس شب میری نیند کا یہ حال تھا کہ کئی مرتبہ میں نے

اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار میں سو جاتا تھا یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

مددگار اللہ ہی ہے

دیکھا آپ نے اللہ کیسے مدد فرماتا ہے۔ آفات کا نہ آنا مدد نہیں کہ اس صورت میں تو مدد کا احساس ہی نہ ہوگا۔ آفات آنے کے بعد ان سے بچالینا ''مدد'' ہے۔ آفات تو آتی ہی ہیں۔ کبھی ابتلا و آزمائش کے لیے اور کبھی بدعملی کے سزا کے طور پر۔ مؤمن کا کمال یہ ہے کہ آفات آنے پر واویلا نہ کرے، غیروں کے در کا بھکاری نہ بنے، بلکہ اس رب کے حضور گڑگڑائے جو سب سے بڑی قوت والا ہے۔ جو احکم الحاکمین ہے۔ وہ تم سے مدد کا وعدہ فرماتا ہے۔ وہ ہر طرح سے مدد کرنے پر قادر ہے، ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ تم اس کے ہو تو اسی کے بنو، اسی پر بھروسہ کرو۔ ہرگز ہرگز غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دین فروشی نہ کرو۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ (آل عمران: ۱۲۶)

اور (حقیقت یہ ہے) کہ نہیں مدد مگر اللہ ہی کی طرف سے جو سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران: ۱۳)

اور اللہ مدد کرتا ہے اپنی نصرت سے، جس کی چاہتا ہے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ
عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ (آل عمران: ۱۶۰)

اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہارا (ساتھ) چھوڑ دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد، اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔

اللہ مدد فرماتا ہے۔ اس عنوان پر قرآن کریم کی متعدد آیات میں سے چند آیات پیش کی گئیں۔ اگر ہم انہی پر غور کر لیں تو یقین مستحکم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مزید برآں رب خیر الناصرین کا ایک مژدہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ (الروم: ۴۷)

اور اہل ایمان کی مدد فرمانا ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔

کتنا کریم ہے ہمارا رب کہ اس نے ہمیں نعمت ایمان سے بھی نوازا اور ہماری مدد کا بھی وعدہ فرمایا۔ تاکہ ہم اس کی اطاعت میں مادی و ظاہری وسائل کے ہونے، نہ ہونے کی پروا نہ کریں۔ اور اپنی بقا کے لیے غیروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں۔ لیکن ہمیں تو غیروں کے در کی ٹھوکریں کھانے میں مزا آتا ہے۔ ضرورت و مصیبت کے وقت ہم اس کا سہارا لینے کی بجائے غیروں کو پکارنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی۔ تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہوں یا ملک کو مستحکم کرنا چاہتے ہوں۔ ہر صورت میں ہم غیروں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ ان سے امداد طلب کرتے ہیں۔ وہ ہماری مدد کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ ہمیں اپنا غلام بنالیں اور ہم نام کے مسلمان رہ جائیں۔ یہی ہو رہا ہے آج تمام مسلم ممالک کا یہی حال ہے۔ آزادی تو برائے نام ہے۔ ہمیں ان کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے جو ہماری مدد کرتے ہیں۔ یہ غیروں کی مدد ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر مسلمان سود کی لعنت میں مبتلا ہے اور ہر زبان پر یہ بات ہے کہ سود کے بغیر معاشی شعبہ چل ہی نہیں سکتا۔ یہ کفر

کی پیروی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ امداد ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ معیشت، نظامِ تعلیم میں غیروں کی تقلید کے پابند ہیں۔ یہ امداد ہی کا نتیجہ ہے کہ ہماری گھروں کی تہذیب، رہن سہن کے طریقہ کفار جیسے ہو گئے ہیں۔ ہمارا لباس تک اپنا نہ رہا۔ انجام کار ہم مسلمان کہلانے کے باوجود قرآن وسنت پر مبنی ایک مکمل ضابطہ حیات پر عمل کے تصور تک سے محروم ہو گئے۔ آج جو مسلمان اپنے ہی ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں انہیں طرح طرح کچلا جاتا ہے، رجعت پسند کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر ہم کفر کی طرف لوٹ چکے ہیں۔ اب ہم میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت تک نہیں رہی۔ کیونکہ اللہ کی حمایت ونصرت پر یقین نہ رہا۔ پس:

اے ایمان والو! ہوش سنبھالو، کافر تمہارے دوست نہیں۔ وہ تو ازل سے تمہارے دشمن ہیں۔ ان کے لالچ میں مبتلا نہ ہو۔ وہ تمہیں جسمانی طور پر ختم کرنا چاہتے۔ وہ تمہاری متاعِ عزیز ایمان واسلام کے دشمن ہیں۔ اسے تم سے چھین لینے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ دیکھ لیجئے ان دشمنوں نے ترکی میں کس طرح اسلام پسند حکومت کا خاتمہ کیا۔ افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو ناکام بنانے کی یہ کیسی کوششیں کر رہے ہیں۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کو روکنے کے لیے یہ کیسے مستعد ہیں۔ جو ممالک اپنے یہاں برائے نام اسلامی نظام نافذ کر چکے ہیں وہاں اسلام کے دشمن کیا کیا سازشیں نہیں کر رہے ہے۔

اے ایمان والو! تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ تم اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے صرف اللہ کی حمایت و نصرت پر توکل کرو۔ اللہ کی اطاعت میں رخنہ ڈالنے والی ہر قوت سے ٹکرا جاؤ۔ سخت ضرورت کے باوجود ان کی مدد قبول نہ کرو۔ تب تمہیں عزت، وقار بھی نصیب ہوگا اور تم ہی کامیاب وکامران ہو گے۔ کہ وعدہ الٰہی ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۹)

اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی سربلند ہوگے اگر تم سچے مؤمن ہو۔

کسی فکر اور پریشانی کی ضرورت نہیں۔ سب سے عزیز دولت ایمان ہے اگر یہ محفوظ ہے تو کامیابی وکامرانی قدم بوسی کرے گی، سربلندی نصیب ہوگی، ان آیات پر غور کیجئے اور اپنی فکر و پریشانی سے نجات حاصل کیجئے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ (الطلاق: ۲۔۳)

اور جو (خوش نصیب) اللہ سے ڈرتا رہتا ہے، بنا دیتا ہے اللہ اس کے لیے نجات کا راستہ اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ بیشک اللہ اپنا کام پورا کرنے والا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم علیہ السلام نے مجھے یہ آیت سنائی اور فرمایا، اے ابوذر! اگر سب لوگ اس پر عمل کرنا شروع کر دیں تو یہ آیت ان سب کے لیے کافی ہے۔

بہر حال مؤمن کے لیے یہی زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے معاملات میں اپنے دین کے دشمنوں کو داخل نہ ہونے دے۔

اپنے رب پر بھروسہ کرے۔ اللہ اس کی انفرادی واجتماعی تمام مشکلات کو دور فرمائے گا۔

ناموس صحابہ اور قرآن کریم

آیات زیر گفتگو کو ذرا دوبارہ غور سے پڑھیے تو آپ کو یہاں ایک عنوان اور نظر آئے گا اور وہ ہے" ناموسِ صحابہ کا تحفظ" قبل اس کے کہ آیات مذکورہ کی روشنی میں ہم" ناموسِ صحابہ کے تحفظ" کی وضاحت کریں۔ تبرکاً ناموسِ صحابہ اور عظمتِ صحابہ کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

صحابیت، نبوت کے بعد انسانیت کا اعلیٰ ترین مقام ہے جس کا تعلق اعمال سے نہیں بلکہ نبی کی ذات سے ہے۔ یعنی وہ خوش نصیب مؤمن صحابی بن جاتا ہے جس نے حالت ایمان میں اپنے نبی کی ایک جھلک بھی دیکھ لی یا اسے ایک لمحہ کے لیے بھی نبی کی صحبت نصیب ہوگئی۔ یہ اللہ کی طرف سے نبی کا اعزاز ہے۔ اور نبی کا صدقہ ہے کہ اس کی زیارت کر لینے والا یا صحبت کا موقع پا لینے والا مومن تمام عبادت گزاروں اور اولیائے کرام سے مرتبہ ومقام میں افضل واعلیٰ ہو جاتا ہے۔ اس منصب کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اپنے نبی کے صحابہ کو خصوصی انعامات سے نوازے۔ لہذا ان پر ایک نہایت خصوصی انعام یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ انبیاء کی طرح معصوم نہیں ہوتے لیکن اللہ معصوم نبی کے طفیل انہیں ہر قسم کے گناہ اور برائی سے محفوظ فرما لیتا ہے۔

سید الانبیاء ﷺ کے جملہ صحابہ، انبیاء سابقین علیہم السلام کے صحابہ سے اسی طرح افضل واعلیٰ ہیں جس طرح خود نبی مکرم علیہ السلام افضل واعلیٰ ہیں، امت پر ہر صحابی کی عظمت کا اعتراف اور ان کا احترام واجب ہے۔ کیونکہ کوئی عبادت کسی مومن کو کسی صحابی۔ کے مرتبہ تک نہیں پہنچا سکتی۔ ان نفوسِ قدسیہ کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کیجئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (البقرہ:۲۱۸)

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم والا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ (الفتح:۱۸ تا ۲۰)

یقیناً راضی ہو گیا اللہ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ کی درخت کے نیچے پس جان لیا اس نے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ پس اس نے ان پر اطمینان اتارا اور بطور انعام انہیں یہ قریبی فتح بخشی اور بہت سا مالِ غنیمت بھی (عطا کیا) جس کو وہ (عنقریب) حاصل کریں گے۔ اللہ سب سے زبردست بڑا دانا ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم (اپنے اپنے وقت پر)

حاصل کرو گے۔ پس جلدی دے دی ہے تمہیں یہ صلح اور روک دیا ہے اس نے لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے اور تا کہ ہو جائے یہ (ہماری نصرت کی) نشانی مومنوں کے لیے اور تا کہ وہ تمہیں ثابت قدمی سے صراط مستقیم پر گامزن رکھے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۖۚ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (الفتح:٢٩)

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور وہ جو آپ کے ساتھی ہیں سخت (طاقتور) ہیں کفار کے مقابلہ میں، آپس میں بڑے رحم دل ہیں تو دیکھتا ہے انہیں کبھی رکوع کرتے ہوئے، کبھی سجدہ کرتے ہوئے، وہ طلبگار ہیں اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے ان کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ظاہر ہے یہ ان کی خوبیاں تورات میں ہیں اور ان کی خوبیاں انجیل میں بھی ہیں (یہ صحابہ) ایک کھیت کی طرح ہیں، جس نے نکالا اپنا پٹھا، پھر تقویت دی اس کو پھر مضبوط ہو گیا، پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اپنے تنے پر خوش کر رہا ہے بونے والوں کو تا کہ (آتش) غیظ میں جلتے رہیں کفار، اللہ نے وعدہ فرمایا ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، مغفرت کا اور اجر عظیم کا۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ (الحدید:١٠)

آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے (اپنے اموال) اللہ کی راہ میں۔ حالانکہ اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے قبل مال خرچ کیا اور جنگ کی ان کا درجہ بہت بڑا ہے ان سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور جنگ کی، (ویسے) سب کے ساتھ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے بھلائی کا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی خبردار ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓىِٕكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَ یُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (المجادلہ:٢٢)

تو ایسی قوم نہ پائے گا جو ایمان رکھتی ہو اللہ اور قیامت پر (پھر) وہ محبت کرے ان سے جو مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی، خواہ وہ (مخالفین) ان کے باپ ہوں یا ان کی اولاد ہوں، یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے خاندان والے ہوں، یہ (صحابہ) وہ لوگ ہیں کہ نقش کر دیا ہے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان اور تقویت بخشی ہے انہیں اپنے فیض خاص سے اور اللہ انہیں داخل کرے گا باغوں میں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہ (صحابہ) اللہ کا گروہ ہیں سن لو، اللہ ہی کا گروہ دونوں جہانوں میں کامیاب و کامران ہے۔

ناموسِ صحابہ اور احادیث

یہ چند آیات مبارکہ پیش کی گئیں جو بالاتفاق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل اور بلند مرتبہ و مقام کو واضح کرتی ہیں۔ افسوس کہ ان کی تفسیر کا یہ موقع نہیں تاہم آیات پر غور کرنے سے مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ اب آیئے دیکھیں صحابہ کے آقا ﷺ ان کے متعلق کیا فرماتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا:

لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَلَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهٗ

میرے کسی صحابی کو گالی نہ دو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی کوہِ احد کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان کے ایک صاع (مثلاً ایک کلو) یا آدھے صاع کے برابر بھی نہیں پہنچے گا۔ (مشکوٰۃ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

لَا تَمَسُّ النَّارُ مُسْلِمًا رَاٰنِیْ وَرَاٰی مَنْ رَاٰنِیْ

اس مسلمان کو جہنم کی آگ نہ چھوئے گی، جس نے مجھے دیکھا اور دیکھا اسے جس نے مجھے دیکھا (یعنی تابعی) (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْهُ غَرَضًا مِنْۢ بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ وَ مَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ وَ مَن اٰذَاهُمْ فَقَدْ اٰذَانِیْ وَ مَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللّٰهَ وَ مَنْ اٰذَی اللّٰهَ فَيُوْشِکُ اَنْ يَّاْخُذَهٗ

میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، میرے بعد انہیں (اپنی تنقید کا) نشانہ نہ بنا لینا جو ان سے محبت کرتا ہے تو مجھ سے محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے دشمنی رکھتا ہے تو مجھ سے دشمنی کی وجہ سے دشمنی کرتا ہے۔ اور جس نے انہیں تکلیف پہنچائی تو گویا مجھے تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی، اور جس نے اللہ کو تکلیف دی تو قریب ہے کہ اسے پکڑ لے (یعنی عذاب میں مبتلا کرے) (ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَثَلُ اَصْحَابِیْ فِیْ اُمَّتِیْ كَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ لَا یُصْلِحُ الطَّعَامُ اِلَّا بِالْمِلْحِ۔

میری امت میں میرے صحابہ کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک کھانا بغیر نمک کے ٹھیک نہیں رہتا۔

(ترمذی)

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر فرمایا۔ ہمارا نمک جا چکا اب ہم کیسے درست رہ سکتے ہیں۔

عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَا مِنْ اَصْحَابِیْ یَمُوْتُ بِاَرْضٍ اِلَّا بُعِثَ قَائِدًا وَّ نُوْرًا

میرے صحابہ میں سے جو بھی کسی زمین (شہر) میں فوت ہوگا تو وہ اس کے باسیوں کے لیے قائد اور نور بنا کر اٹھایا جائے گا قیامت کے دن۔

(ترمذی)

درج ذیل احادیث میں ہمارے لیے ہدایت ہے۔ جس کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے حکم دیا:

اِذَا رَاَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَسُبُّوْنَ اَصْحَابِیْ فَقُوْلُوْا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی شَرِّكُمْ۔

جب تم لوگوں کو دیکھو میرے صحابہ کو گالیاں دیتے ہوئے تو کہو:

اللہ کی لعنت ہو تمہارے شر پر۔

(ترمذی)

احادیث مقدسہ کا مفہوم واضح ہے۔ آیئے اب زیر گفتگو آیات میں نظر کریں۔ جن کو پڑھنے سے پہلی نظر میں تو یہی خیال ہوتا ہے کہ غزوۂ احد میں حضور علیہ السلام اور دیگر صحابہ کو جو تکالیف پہنچیں وہ بعض صحابہ کی غلطی کا نتیجہ تھیں۔ لیکن معاذ اللہ ایسا ہرگز ہرگز نہیں۔ آیات میں شک کے ظاہری سبب کے طور پر یہ ذمہ داری صحابہ پر ہی عائد کی گئی، لیکن اللہ نے فوراً ہی اس کا اصل سبب بیان فرما کر اپنے محبوب علیہ السلام کے ساتھیوں کی دلجوئی فرما کر اس خیال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ فرمایا گیا: ''لِیَبْتَلِیَكُمْ'' تاکہ اللہ تمہیں آزمائے۔ یہ سب کچھ تمہارے ارادے سے نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ نے اپنی حکمت کے مطابق تمہاری آزمائش کی اور اس آزمائش کے دوران جو بظاہر تم سے غلطیاں ہوئیں ''لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ'' بیشک تمہیں معاف کر دیا۔ یعنی ان غلطیوں کا داغ بھی تمہارے دامن سے صاف کر دیا۔ اب تم نہ تو داغدار ہو اور نہ ہی ناکام۔ آزمائش امتحان میں کامیاب ہو چکے۔

مذکورہ جملہ تاکیداً دو مرتبہ فرمایا گیا۔ تاکہ صحابہ کرام کی عظمت کو برقرار رکھا جائے اور کسی کو ان پر طعن کرنے یا انگشت نمائی کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس احتیاط خداوندی کے باوجود اگر کوئی بدنصیب صحابہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتا یا ان پر طعن کرتا ہے تو یہ اس کی جہالت یا صحابہ سے ازلی عداوت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ محفوظ رکھے ایسے بدعقیدہ، بدنصیب لوگوں سے۔ آمین بجاہ رحمۃ للعلمین۔

وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۱۸

آل عمران: ۱۵۶ تا ۱۶۰

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی
الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝
وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝
وَ لَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ ۝
اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ
عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۵۶ تا ۱۶۰)

اے ایمان والو! نہ ہو جاؤان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر کیا اور جو کہتے تھے اپنے بھائیوں سے جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں، یا ہوتے جہاد کرنے والے کہ اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تاکہ اللہ اس (خیال) کو حسرت (کا باعث) بنا دے ان کے دلوں میں اور (درحقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ، جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔

اور واقعی اگر تم قتل کر دیئے جاؤ اللہ کی راہ میں یا تم مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ کے حضور جمع کیے جاؤ گے۔

پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لئے اور اگر آپ ہوتے تندمزاج، سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ ان سے درگزر فرمایئے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور مشورہ کیجئے ان سے کام میں اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر بھروسہ کیجئے اللہ پر بیشک اللہ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔

اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔

موت کا ڈر

منافقین جو حقیقت میں کافر ہی تھے، اگرچہ بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے تھے ان کا عقیدہ باطلہ تھا کہ گھر میں بحفاظت رہنے سے موت ٹل سکتی ہے۔ لہٰذا جب مسلمان کسی مہم میں جایا کرتے یا حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی غزوے میں جاتے اور اتفاقاً دوران سفر ان کی موت آجاتی یا میدان جنگ میں شہید ہو جاتے تو یہ غمزدہ انداز میں کہتے پھرتے تھے کہ دیکھو وہ بیچارہ مر گیا۔ اگر نہ جاتا تو نہ مرتا۔ اس کے بوڑھے والدین آج روتے نہ ہوتے اس کے بچے یتیم نہ ہوتے، اس کی بیوی کا سہاگ نہ اجڑتا۔

اے ایمان والو! تم اس خیال میں ہرگز مبتلا نہ ہونا، ان کے دلوں میں تو اللہ نے یہ خیال اس لئے پیدا فرمایا کہ وہ حسرت و یاس میں تڑپتے رہیں کہ ان کے اس پروپیگنڈے کے باوجود اہل ایمان کے عمل میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی، وہ اسی طرح حضور علیہ السلام کے احکام کے مطابق مہمات کے لئے سفر کرتے ہیں۔ مزید جوش و جذبہ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ اگر بیٹا شہید ہو جاتا ہے تو باپ میدان میں کود پڑتا ہے، اگر ایک بھائی شہید ہو جاتا ہے تو دوسرا بھائی تلوار تان کر میدان میں آجاتا ہے۔ مائیں اپنے بیٹوں کو دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے کر کفار کے مقابلہ کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ مسلمان کا تو عقیدہ ہوتا ہے، اسے یہ یقین کامل ہے کہ موت و زندگی اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جب وقت آجاتا ہے تو گھر کی چاردیواری کیا، بند اور محفوظ قلعوں میں بھی موت کا فرشتہ آدبوچتا ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء:۷۸)

جہاں کہیں تم ہو گے آلے گی تمہیں موت اگرچہ تم (پناہ گزیں) ہو مضبوط قلعوں میں۔

اے ایمان والو! اللہ تمہارے ہر عمل کو دیکھتا ہے وہ ان کی حالت بھی دیکھتا ہے جو موت کے ڈر سے گھر میں چھپتے اور بزدلوں کی موت مرتے ہیں۔ اور وہ انہیں بھی دیکھتا ہے جو دلیری اور جرأت کے ساتھ اللہ کے دین کی حفاظت کے لیے نکلتے ہیں اور قتل کر دیے جاتے ہیں یا طبعی موت مر جاتے ہیں۔ ان کا یہی عمل ان کی مغفرت اللہ کی رحمت کے حصول اور کامیابی و کامرانی کا ذریعہ ہے۔ ان کا یہ انجام دنیا کی ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جن کی محبت منافقین کو گھروں سے نہیں نکلنے دیتی۔ بہر حال تم اپنے گھروں میں مرو یا ویسے ہی تمہیں کوئی قتل کر دے۔ موت آنی ہے ٹل نہیں سکتی۔ ایک دن ضرور سب کو اللہ کے دربار میں حاضر ہونا۔ پھر پتہ چل جائے گا کہ منافقوں کا کیا انجام ہوتا ہے اور مؤمنوں کو کس طرح سایہ رحمت میں پناہ نصیب ہوتی ہے۔

دو نظریے

آیت زیر گفتگو میں دو نظریے بیان کیے گئے۔ جو ایک واضح حقیقت موت سے متعلق ہیں۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ موت سے مفر نہیں۔ کتنے ہی جتن کر لئے جائیں موت آنی ہے۔ آج سائنس کے دور میں ایسی ادویہ تو تیار کر لی گئیں کہ خیال خام میں انسان کو طویل عرصہ تک زندہ رکھا جا سکتا ہے لیکن نہ تو اس کی قوت و طاقت اور جوانی جیسی رعنائی برقرار رکھنے میں کامیابی ہو سکی اور نہ ہی موت سے نجات دلائی جا سکی، بلکہ اس کے برعکس ہوا یہ کہ ان ادویہ سے زندہ رکھنے والوں کو ان کی بدحالی کے سبب زہر کے انجکشن دے کر مارنا پڑتا ہے۔ بہر حال موت ایک واضح حقیقت ہے لیکن انسان کی عقل و نظر پر اگر گمراہی کا پردہ پڑ جائے تو وہ موت کیا سورج کی روشنی کو بھی اختلافی مسئلہ بنا دیتا ہے۔

ماضی کے منافقین کفار و مشرکین ہوں یا آج کے دہریے۔ ان سب کا نظریہ ہے کہ انسان اگر احتیاط کرے اپنے تحفظ کا خیال رکھے تو موت کم از کم کچھ عرصہ کے لئے ٹل ضرور سکتی ہے۔ اسی نظریے نے گمراہ قوموں کو ایسا بزدل بنا دیا کہ وہ اپنے ملک و قوم کے تحفظ تک کے اہل نہ رہے۔ اور وہ اپنی اس نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے امن اور شانتی کے نعرے لگانے لگے۔ اور دین و مذہب، ملک و قوم کی حفاظت و بقا کے لئے جان کی بازی لگانے والے جرأت مندوں کو دہشت گرد اور ظالم و قاتل کہنے لگے۔

جبکہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہ درس دیا کہ موت آنی ہے اور مقررہ وقت پر آنی ہے۔ حفاظت کی کوئی تدبیر اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹال سکتی۔ پس اگر دین کی حفاظت کے لئے تمہاری ضرورت پیش آ جائے تو تم بلا تامل میدان میں نکل آؤ۔ اس دوران اگر تمہارا وقت آ گیا تو تم بڑے خوش نصیب ہو گئے کہ مرنا تو تھا ہی گھر میں بستر پر موت آتی تو نہ تو دنیا میں تمہارا کوئی ذکر ہوتا اور نہ ہی آخرت میں کوئی فائدہ پہنچتا۔ اللہ کی راہ میں موت آئی تو قیامت تک آنے والوں میں تمہارا چرچا رہے گا۔ حتیٰ کہ تمہیں مردہ کہنے اور سمجھنے پر بھی پابندی ہو گی اور آخرت میں حساب و کتاب کے بغیر تم جنت میں داخل کئے جاؤ گے۔

اس نظریے نے مسلمان میں جو جرأت و ہمت پیدا کی ہے اس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے اسلاف سے اسلام دشمن طاقتیں کس طرح کانپتی تھیں۔ اس سوال کے جواب سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش

نہیں۔ اور ہم جیسے گناہگاروں کو اس نظریے نے کتنی تقویت پہنچائی ہے اس کا اندازہ بس اس بات سے کر لیجئے کہ آج دشمن اتنا طاقتور ہے اور ہم اتنے کمزور ہیں۔ کہ اگر دشمن موت سے فرار کا نظریہ نہ رکھتا ہوتا اور اس نظریے نے اسے بزدل نہ بنا دیا ہوتا۔ تو ہمیں لقمہ بنالینا اس کے لئے کوئی دشوار نہ تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا رعب باقی ہے صرف اس لیے کہ دشمن خوب جانتا ہے کہ مسلمان کسی حال میں نہیں ڈرتا، اس کے عقیدے کے مطابق اس زندگی سے بہتر موت کے بعد کی زندگی ہے۔ پس اس پر قابو پانا آسان نہیں۔

ہمارے دور کے حالات شاہد ہیں کہ دشمن ہمیں مٹا دینے کی کسی تدبیر سے گریز نہیں کرتا۔ ہمارے ملکوں میں بدامنی اور انتشار پیدا کیا جاتا ہے۔ ہماری غربت سے فائدہ اٹھا کر ہمیں دولت کے لالچ میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ ہمیں بھاری قرضے دے کر ہمیں سود کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ مذہبی شعائر سے متنفر کرنے اور ہماری تہذیب وتمدن کو ختم کر دینے کے لئے نہایت مکر وفریب کے ساتھ ہمیں بدکاریوں میں مبتلا کیا گیا ہے۔ ہمارے سیاسی معاملات میں مداخلت کر کے ہمارے ملکوں کو غیر مستحکم کیا جا رہا ہے۔ اسلام کے خلاف لٹریچر کی بھرمار کر کے ہمارے نوجوانوں کو دین سے متنفر اور ذہنی طور پر مفلوج کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود ہم اپنے ان سپاہیوں کو سلام کرتے ہیں جن کی جرأت مندی نے آج بھی ہماری ساکھ کو بچایا ہوا ہے۔ اور وہ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ہر محاذ پر دشمن کا مقابلہ کر رہے اور اس کے حملہ کو غیر مؤثر بنا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی موت کا خوف نہیں۔

بہرحال مسلمانوں کو موت سے نہ ڈرنے کا نظریہ دیا گیا اور یہی مسلمانوں کی بقا کا ذریعہ ہے تاہم خودکشی کی ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ خودکشی کسی ناپسندیدہ چیز سے تنگ آکر یا کسی پسندیدہ چیز کے حصول میں ناکامی کے سبب اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دینا ہے۔ جو بزدلی ہے، کمزوری ہے۔ کہ مقصود حاصل کر لینے کی ہمت نہ تھی تو جان دے دی۔ جب کہ کسی مقدس مقصد کے حصول کے لئے اپنے آپ کو موت سے ٹکرا دینا جہاد ہے، شجاعت ہے بہادری ہے۔ اور اس میں جان دے دینا شہادت ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

(آل عمران:۱۵۹)

پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ان کے لیے اور اگر ہوتے آپ تند مزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ معاف کر دیجئے انہیں اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور مشورہ کیجئے ان سے کام میں اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر بھروسہ کیجئے اللہ پر بیشک اللہ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔

حضور علیہ السلام کے چند اوصاف

آیت بالا پر گفتگو اگرچہ اس کتاب کے عنوان میں نہیں آتی۔ کیونکہ اس میں خطاب بلاواسطہ اہل ایمان سے نہیں بلکہ

صاحبِ قرآن ﷺ سے ہے۔ لیکن اس کی اہمیت و افادیت کے باعث ہم نے اس کو شامل گفتگو کیا ہے۔ یہاں حضور علیہ السلام کے بعض ایسے اوصاف کا ذکر کیا جارہا ہے جن کا ہر کامیاب رہبر و رہنما میں پایا جانا ضروری ہے۔

فرمایا گیا: اے پیارے، اللہ کے بے شمار خصوصی انعامات میں سے آپ پر یہ بھی ایک انعام ہے۔ کہ آپ نرم مزاج ہیں، اگر آپ تند مزاج اور سخت دل ہوتے، تو نہ تو موجودہ لوگ آپ پر جان نثاری کے لئے تیار ہوتے اور نہ ہی بعد میں آنے والے آپ کے پیغام کو قبول کرتے اور آپ پر جانیں قربان کرتے۔ کیونکہ انسان فطرتاً حُسن پسند واقع ہوا ہے۔ اور زبان و دل کا حسن اس کی نرمی ہے۔ جو بھی چاہتا ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہوں وہ معاشرے میں عزت و وقار کی نظروں سے دیکھا جائے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کی زبان سے انگارے نہیں، بلکہ پھول جھڑیں۔ یعنی اس کی گفتگو میں ان درجہ نرمی ہو کہ ہر شخص اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر آمادہ ہو جائے۔ اور اس کا قلب اتنا نرم ہو کہ کسی کی معمولی تکلیف پر بھی تڑپنے لگے اور وہ لوگوں کی مدد کرنے پر مجبور ہو۔ اے پیارے محبوب علیہ السلام آپ کے اندر یہ خوبی، آپ کی دیگر خوبیوں کی طرح پورے کمال کے ساتھ موجود ہے۔ اسی لئے آپ محروم انسانیت لوگوں کو انسان گر بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اور آپ کے گرد جمع ہونے والے جس طرح آپ پر شیدا و فریفتہ ہیں اس کی نظیر کسی قائد و رہبر کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔

پس اے محبوب علیہ السلام، آپ کے وہ غلام کہ بظاہر جن کی غلطی سے میدانِ احد میں آپ کو تکلیف پہنچی، اب تک اس خیال سے افسردہ ہیں کہ شاید آپ ان سے ناراض ہیں۔ پس آپ ان کی دلجوئی فرمایئے اور اپنی زبانِ رحمت سے نہ صرف ان کی معافی کا اعلان کیجئے بلکہ ہم سے بھی ان کی بخشش طلب کیجئے۔ اگر چہ ہم تو پہلے ہی انہیں معاف فرما چکے ہیں لیکن آپ کے عاشقوں کو آپ کی جنبش لب کا انتظار ہے۔ جب تک آپ ان کے لیے اعلان معافی نہ فرمائیں گے ان بے چین دلوں کو سکون نہ ملے گا۔ اور پیارے! آپ غلاموں کی دلجوئی کے لئے ان سے مشورہ بھی کر لیا کیجئے اور جب آپ کسی کام کا عزم کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کر کے اس کو کر ہی ڈالا کیجئے۔ کیونکہ اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ جس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ ان کی مدد کرے۔ پس اللہ ان کی مدد فرماتا ہے اور وہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔

اے ایمان والو! نبی کے اندر جو خوبیاں ہیں وہ تم بھی اپنے اندر پیدا کرو۔ کیونکہ نبی کی حیات طیبہ تمہارے لئے "اسوۂ حسنہ" ہے۔ نیز ایک امتی کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے نبی کا عکس بنے۔ اس کا پیروکار رہو۔ پس جب تم آپس میں گفتگو کرو تو محبت بھرے الفاظ استعمال کرو۔ اور باہمی ہمدردی و محبت کے عادی ہو۔ کہ اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کرو۔ اور آپس میں درگزر سے کام لو۔ دوسروں کی چھوٹی غلطیوں کی گرفت نہ کیا کرو۔ نیز اپنے کاموں میں اپنے بڑوں اور چھوٹوں سے مشورہ کیا کرو۔ ان خوبیوں سے معاشرے میں اتحاد و یگانگت پیدا ہوتا ہے۔ اور انفرادی، قومی و اجتماعی رُعب اور وقار آتا ہے۔ اور جب تم کسی کام کا عزم مصمم کر لو۔ تو وسائل پر نظر کئے بغیر اللہ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا اور تم ضرور کامیاب ہو گے۔

اے ایمان والو! اللہ کا مددگار ہو جانا تمہارے لئے بڑی نعمت ہے کہ اللہ بڑی قوت والا ہے جس کا وہ مددگار ہو گیا، کوئی نہیں جو اس پر غالب آ سکے۔ اور اگر اللہ ہی نے تمہیں چھوڑ دیا تو تم کہیں کے نہ رہو گے۔ کوئی تمہاری مدد کر کے اللہ کا

مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور کوئی اس کی مرضی کے برعکس تمہیں کامیاب نہیں کر سکتا۔ پس تم اللہ پر بھروسہ کرو تاکہ تمہیں اس کی نصرت و حمایت نصیب ہو۔

آیئے اب ذرا ان خوبیوں پر قدرے وضاحت کے ساتھ غور کر لیں جو حضور علیہ السلام میں موجود ہیں اور جن کا ذکر آیت مذکورہ بالا میں کیا گیا ہے۔

نرمی

انسان کی یہ خوبی تمام خوبیوں کی اصل ہے، کہ اسی سے دیگر خوبیاں پیدا ہوتی۔ مثلاً خوش کلامی، بُردباری، تواضع اور انکساری، باہمی محبت والفت اور ہمدردی۔ اس کے برعکس سختی انسان کو خود غرض، ظالم، جابر، مکار اور فریبی بناتی ہے۔ نرمی اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، جس کے لیے قرآن کریم میں لطیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (الشوریٰ:۱۹)

اللہ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہی قوی (اور) زبردست ہے۔

علامہ ابن منظور رحمۃ اللہ علیہ ''لطیف'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ لطیف اس کو کہتے ہیں جس میں تین چیزیں جمع ہوں۔ جو کام کرے اس میں درشتی اور سختی نہ ہو، بلکہ نرمی اور رفق ہو۔ نیز وہ اپنے بندوں کی باریک سے باریک منفعتوں اور مصلحتوں پر آگاہ ہو اور جس کو کوئی نعمت عطا فرمانا چاہے اس کے عطا فرمانے پر قادر ہو۔

حضرت سید جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ لطیف اس کو کہتے ہیں جو تیرے دل کو ہدایت سے منور کر دے۔ غذا سے تیرے جسم کی نشوونما کرے۔ تجھے دنیا سے ایمان کے ساتھ نکالے اور جہنم کی آگ سے بچائے۔

انسان چونکہ صفات باری تعالیٰ کا عکس ہے۔ لہٰذا اللہ پسند فرماتا ہے کہ اس میں لطف و ملائمت اور نرمی پائی جائے۔ اسی لیے اس نے انسانوں کے رہبر و رہنما اور قائدین کو اپنی اس صفت کا پیکر بنا کر مبعوث فرمایا۔ حضور علیہ السلام جن کی ہر صفت ان کے منصب کی مناسبت سے کامل و اکمل ہے۔ اپنی اس خوبی میں بھی باکمال ہیں۔ اسی لئے آپ اگرچہ دُرشت اور سخت ترین قوم میں تشریف لائے لیکن اس قوم کے افراد جس بڑی تعداد میں آپ کے دامن سے وابستہ ہوئے اور آپ کے جانثار بنے اس کی نظیر انبیاء سابقین علیہم السلام کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ آپ خود نرم ہیں اور نرمی کی تعلیم دیتے ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَالَا يُعْطِيْ عَلَى الْعُنْفِ وَمَالَا يُعْطِيْ عَلٰى مَاسِوَاهُ

بیشک اللہ نرمی فرمانے والا ہے اور نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ نرمی پر دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا اور نرمی کے سوا کسی بات پر نہیں دیتا۔ (مسلم شریف)

حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ يُحْرَمُ الرِّفْقَ يُحْرَمُ الْخَيْرَ

جونرمی سے محروم کر دیا گیا وہ بھلائی سے محروم کر دیا گیا۔ (مسلم شریف)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے:

مَنْ اُعْطِیَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ اُعْطِیَ حَظَّهٗ مِنْ خَیْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَ مَنْ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنْ خَیْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ

جس کو نرمی سے کچھ حصہ دیا گیا اسے دنیا و آخرت کی بھلائی سے حصہ دیا گیا۔ اور جو نرمی سے محروم رکھا گیا وہ دنیا و آخرت کی بھلائی سے محروم رکھا گیا۔ (شرح السنہ)

خود پیکر رفق و رحمت ﷺ کی حیات مبارکہ کے حالات شاہد ہیں کہ آپ کبھی کسی سے سختی کے ساتھ پیش نہ آئے۔ اور آپ کی تعلیمات کی بنیاد بھی اسی رفق و نرمی پر ہے۔ مثلاً امیروں کو غریبوں پر شفقت و محبت کے ساتھ پیش آنے کا حکم، مردوں کو عورتوں سے مہربانی کرنے کا حکم، آقاؤں کو غلاموں کے ساتھ نرمی برتنے کا حکم، یتیموں پر شفقت اور ان کی سرپرستی کرنے کا حکم، بیماروں کی عیادت اور کسی کی موت پر مرحوم کے اعزاء سے تعزیت کا حکم۔ حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کی تعلیم، دشمنوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے کا حکم۔ یہ تمام تعلیمات درحقیقت نتیجہ ہیں آپ کی اس خوبی کا جس کو قرآن کریم نے "لِنْتَ" کے لفظ سے بیان فرمایا۔ پس

اے ایمان والو! رحیم و کریم اور لطیف رب تم سے یہ چاہتا ہے کہ تم بھی اپنے آقا ﷺ کی پیروی کرو اور اپنے اندر رفق و ملائمت پیدا کرو۔ جس سے تمہارے بیشتر باہمی اختلافات، باہمی نفرتوں کا خاتمہ ہوگا۔ تمہارے معاشرے میں امن و امان اور سکون پیدا ہوگا۔ تم اپنے خاندان اور قوم میں باعزت اور غیروں کی نظروں میں باوقار ہو جاؤ گے۔ اور اپنی ہر تحریک میں کامیاب و کامران ہو گے۔ اگر تم میں سے کسی کا دل سخت ہو اور وہ اس کو نرم کرنا چاہتا ہو تو اس کا طریقہ بھی اپنے آقا رحمۃ للعلمین سے ہی پوچھ لے۔ کہ ایک صحابی اللہ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے آپ کے دربار میں حاضر ہوئے اور اپنی قساوت قلب کی شکایت کی۔ طبیب القلوب آقا ﷺ نے انہیں علاج بتایا:

اِمْسَحْ رَأْسَ الْیَتِیْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْکِیْنَ۔ (مشکوٰۃ شریف)

یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور غریب کو کھانا کھلایا کرو۔

جس کا دل سخت ہوگا چند دن تو اسے اس عمل میں دشواری ہوگی، پھر وہ ہر کسی کے ساتھ نرمی اور محبت کا برتاؤ خود بخود کرنے لگے گا۔

خوش کلامی

یہ خوبی بھی انسان کی ان خوبیوں میں سے ہے جو اس کی عزت و وقار کی بنیاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام کو اس خوبی سے بھی خوب خوب نوازا تھا۔ جس کے لئے آیت مذکورہ میں "فظ" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جس کے معنی ہیں "ترش کلام، یا بیہودہ گو ہونا۔ اے حبیب علیہ السلام آپ سخت کلام نہیں بلکہ ہم نے اپنے کرم سے آپ کو ایسی مقدس زبان عطا فرمائی ہے جو موتی بکھیرتی ہے اور جو ایک مرتبہ آپ کی محفل میں شریک ہو کر آپ کا کلام سن لیتا ہے اگر اس کا مقدر خراب نہ ہو

تو وہ ہمیشہ کے لئے آپ کا اسیر بن جاتا ہے۔ یہ آپ کی شیریں کلامی ہی کا اثر ہے کہ مال و دولت کے متوالوں اور دنیا میں مست قوم کے دلوں سے آپ نے ان چیزوں کی محبت ایسی نکال دی کہ وہ آپ کے اشاروں پر اللہ کی راہ میں ہنستے مسکراتے اپنی گردنیں کٹانے لگے۔

نبی مکرم علیہ السلام ہی کے واسطہ جلیلہ سے اللہ نے یہ خوبی پیدا کرنے کا حکم عام بندوں کو دیتے ہوئے فرمایا:

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (بنی اسرائیل: ۵۳)

اور (اے حبیب) آپ حکم دیجئے میرے بندوں کو کہ وہ عمدہ باتیں کیا کریں بیشک شیطان فتنہ وفساد پیدا کرنا چاہتا ہے ان کے درمیان بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

نبی مکرم علیہ السلام جو کلام الٰہی کے شارح بھی ہیں اور عملی نمونہ بھی، اس حکم کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں۔ اس ارشاد کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو ہیں۔

مَنْ صَمَتَ نَجَا جو خاموش رہا نجات پا گیا (ترمذی)

یعنی بے شمار دنیاوی و اُخروی آفات سے اس کے لئے نجات کا مژدہ ہے جو غیر ضروری باتوں سے بچتا رہے۔ نیز عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر سوال کیا۔ ''یا رسول اللہ! نجات کا ذریعہ کیا ہے'' آپ نے فرمایا:

اَمْلِکْ عَلَیْکَ لِسَانَکَ وَلْیَسَعْکَ بَیْتُکَ وَ ابْکِ عَلٰی خَطِیْئَتِکَ

اپنی زبان کو قبضے میں رکھو (غیر ضروری باتیں نہ کرو) اور تمہارا گھر تمہارے لئے کافی رہے (بلا ضرورت گھر سے نہ نکلو) اور اپنی خطاؤں پر روتے رہو۔ (ترمذی)

علی ابن حسین رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ.

آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے بیکار باتوں کو چھوڑ دینا ہے۔ (ترمذی)

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔

یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَیَّ قَالَ فَاَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهٖ وَ قَالَ هٰذَا:

اے اللہ کے رسول سب سے خوفناک چیز کیا ہے جس سے آپ مجھے ڈراتے ہیں۔ راوی نے کہا حضور علیہ السلام نے اپنی زبان کو پکڑا اور فرمایا ''یہ''۔ (ترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِیِّ

مومن طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، بیہودہ گو اور بے غیرت نہیں ہوتا۔ (ترمذی)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَقَامُ الرَّجُلِ بِالصَّمْتِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً

آدمی کا خاموشی پر قائم رہنا ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔ (بیہقی)

غرضیکہ فحش کلامی، بدزبانی نہ اللہ کو پسند ہے نہ حضور علیہ السلام کو۔ کیونکہ یہ اسلامی تعلیمات کی روح کو ختم کر دیتی ہے۔ اور بدزبان شخص اسلام کی رحمتوں اور نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والوں میں میل ومحبت پیدا ہو۔ ان میں ایسی ہمدردی اور باہمی تعاون کا جذبہ ہو کہ وہ اپنے بے شمار مسائل سے خود ہی نمٹ لیں۔ لیکن ایک بدزبان شخص پورے مسلم معاشرے کو تباہ کر دیتا ہے اور لوگ اس کی وجہ سے باہم دست بگریباں ہو جاتے ہیں۔ پس

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق اپنی زبان پر قابو رکھنے کی کوشش کرو۔ جب ضرورت ہو تو بولو۔ اور جب بولو تو پہلے تو لو کہ تمہاری زبان سے نکلنے والے الفاظ کا کیا اثر ہوگا۔ ایسے الفاظ منتخب کرو جن سے سننے والے کو اپنی توہین وتحقیر کا احساس نہ ہو۔ اور وہ تم سے متنفر نہ ہو۔ یا لڑنے، جھگڑنے نہ لگے۔ ایسے الفاظ کا انتخاب کرو جن سے ادب واحترام اور پیار ومحبت کی مہک آئے۔ نہ ایسی باتیں کرو جن میں دوسروں پر لعن طعن ہو یا کسی کی غیبت، چغلی اور شکوہ ہو کہ ایسی باتوں سے خاندان، محلے اور معاشرے میں اختلاف وانتشار پیدا ہوتا ہے۔

خوش کلامی کی عادت انسان کو بچپن ہی سے ہوتی ہے۔ اگر کسی بچے سے اس کے والدین یا دوسرے بڑے بدکلامی کرتے ہیں۔ مثلاً آپس میں گالیاں دیتے ہیں، چیختے چلاتے رہتے ہیں تو بچوں میں بھی یہی بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور وہ بڑے ہو کر بھی اپنی زبان پر قابو نہیں کر پاتے۔ لہٰذا والدین اور بڑوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں سے ادب واحترام کے ساتھ بات کریں۔ نیز انہیں ایسے الفاظ تعلیم دیں جو زبان کو اچھا بناتے اور خوش کلامی کی عادت پیدا کرتے ہیں۔ جیسے سلام کرنے، ماشاءاللہ، سبحان اللہ، الحمدللہ وغیرہ جیسے الفاظ بولنے کی عادت پیدا کی جائے۔

قساوتِ قلب

یعنی دل کا سخت ہو جانا، جو تمام عیبوں کا باعث بنتا ہے۔ ظلم وستم، خودغرضی، حق تلفی کی عادت اور ایسے ہی تمام عیوب قساوتِ قلب ہی کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ سخت دل انسان نہ تو اچھا حاکم بن سکتا ہے نہ اچھا شوہر اور باپ نہ ہی اچھا بھائی اور رشتہ دار۔ وہ زندگی کے کسی شعبہ میں کامیاب نہیں رہتا ہر کوئی اس سے نفرت کرتا، اس کا دشمن ہو جاتا اور کسی نہ کسی طرح اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ایسا شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے یا مر بھی جائے تو لوگ اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کی بجائے اس کی مصیبت پر خوش ہوتے اور اس کی موت کو اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے ایسے شخص کے لیے ''ویل'' تباہی کا اعلان فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۤىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الزمر: ۲۲)

بھلا وہ (سعادت مند) کشادہ فرمایا ہو اللہ نے جس کا سینہ اسلام کے لیے تو وہ اپنے رب کی طرف سے

دیئے ہوئے نور پر ہے پس ہلاکت ان سخت دلوں کے لئے جو اللہ کے ذکر سے متاثر نہیں ہوتے یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

یہ لوگ کتنے بدبخت ہیں جن کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کہ ان پر اللہ کے ذکر اور اس کی آیات کی تلاوت تک کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ ایسے غافل ہو گئے کہ کبھی انہیں اپنے خالق و مالک کا خیال تک نہیں آتا۔ پس ان لوگوں کے لیے ''ویل'' تباہی و بربادی کے سوا کیا رہا۔ یہ دنیا میں بھی تباہ و برباد ہیں اور آخرت میں بھی۔ العیاذ باللہ نبی جو اپنی امت کے لئے رحمت بن کر آتا ہے۔ بالخصوص نبی آخرالزماں ﷺ جو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گئے اس بدترین عیب میں کیسے مبتلا ہو سکتے تھے۔ اگر ان میں یہ عیب پایا جاتا تو لوگ کیسے ان پر جانیں نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوتے۔ ان کی تو خوبی یہ ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (التوبہ: ۱۲۸)

بیشک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے گراں گزرتا ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑنا بہت خواہشمند ہے تمہاری بھلائی کا مومنوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔

کیسا رحم دل ہے یہ رسول (ﷺ) کہ جب بھی کسی کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ ہمہ وقت اس فکر و تدبیر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح انسان کو چین و سکون نصیب آجائے۔ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس کے باعث دنیا کی ہلاکت اور آخرت میں جہنم کی آگ اس کا مقدر بنے یہ کیفیت تو اس رسول رؤف و رحیم ﷺ کی عام انسانوں کے لئے ہے جبکہ مؤمنوں پر تو ان کی نظر کرم بے حد و بے حساب ہے۔ مؤمن دنیاوی تکالیف میں مبتلا ہو یا اخروی خطرہ اس کو لاحق ہو، وہ جسمانی بیماری کا شکار ہو یا روحانی امراض کا، یہی رسول کریم ﷺ اس کا سہارا بنتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں جو کچھ سکھایا وہ باعث رحمت ہے ان کی اتباع و پیروی ہمارے لئے دنیا میں عزت و عظمت اور آخرت میں نجات کی ضمانت ہے۔ ان سے تعلق اور ان کا سہارا ہماری تکلیفوں کا مداوا ہے۔ ان کے در سے ہماری مرادیں پوری ہوتی ہیں ؎

ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آ گئے ہیں سب غم بھلا دیئے ہیں

اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہو گا
رو، رو کے مصطفیٰ نے دریا بہا دیئے ہیں

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
دریا بہا دیئے ہیں دُربے بہا دیئے ہیں

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

دھارے چلتے ہیں عطا کے وہ ہے دریا تیرا
تارے کھلتے ہیں سخا کے وہ ہے ذرّا تیرا

اغنیاء پلتے ہیں در سے وہ ہے باڑا تیرا
اَصفیاء چلتے ہیں سر سے وہ ہے رَستا تیرا

تیرے ٹکڑوں پہ پلے غیر کی ٹھوکر پہ نہ ڈال جھڑکیاں کھائیں کہاں چھوڑ کے صدقا تیرا

(اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ)

آیئے رؤف ورحیم آقا ﷺ کے ارشادات ہی کی روشنی میں ان کے قلبِ رحمت کو دیکھیں۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحیم آقا ﷺ نے ہمیں رحیم بننے کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ اللہ اس پر رحم نہیں فرمائے گا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

بچوں پر شفقت کا اندازہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بیان کردہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام کسی بچے کو بوسہ دے رہے تھے کہ ایک دیہاتی دیکھ کر تعجب سے کہنے لگا، آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں، حیرت ہے، ہم نے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا:

اَوْ اَمْلِكُ لَكَ اَنْ يَنْزِعَ اللّٰهُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ

میں کیا کروں کہ اللہ نے تمہارے دل سے رحمت وشفقت کو نکال دیا ہے۔

تیموں پر آپ کی شفقت کا اندازہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے کیجئے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهٗ اَوْ لِغَيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا، خواہ یتیم اپنا ہو یا غیر جنت میں اس طرح ہوں گے۔

"ھکذا" فرماتے ہوئے آپ نے اپنی شہادت کی اور درمیانی انگلیوں کو قریب رکھتے ہوئے وضاحت کی کہ ہم دونوں اس قدر قریب ہیں جتنی یہ دونوں انگلیاں۔

بیٹیاں، جنہیں اہل عرب زندہ دفن کر دیتے تھے۔ آقائے رحمت ﷺ کی شفقت کا فیض پاتی ہیں۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن میرے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کھانے کے لئے کچھ مانگا۔ اس کے ساتھ اس کی دو بچیاں بھی تھیں۔ اس وقت میرے پاس ایک ہی کھجور تھی وہ میں نے اسے دی، اس نے کھجور کے دو حصے کر کے دونوں بیٹیوں کو کھلا دی اور خود کچھ نہ کھایا۔ جب نبی مکرم علیہ السلام تشریف لائے تو میں نے آپ کو یہ واقعہ بتایا۔ آپ نے فرمایا:

مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهٗ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ

جوان لڑکیوں کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوا اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کی تو وہ قیامت کے دن اس کے لئے جہنم کی آگ سے آڑ ہوں گی۔

یعنی بیٹیوں کے ساتھ بھلائی کرنے والا جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِيٍّ

رحمت نہیں نکالی جاتی مگر بدبخت آدمی سے۔

احادیث وسیر کی کتابوں میں بے شمار ایسی احادیث اور ایسے واقعات موجود جو حضور علیہ السلام کے قلب مبارک کی نرمی کو واضح کرتے ہیں۔ اس عنوان پر ہماری کتاب ''اچھا برتاؤ'' کا مطالعہ بھی بے حد مفید ہوگا۔ اور یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نبی مکرم علیہ السلام کی تعلیم کا منشاء یہی ہے کہ آپ کے غلام محبت والفت کے بندھن میں بندھ جائیں۔ جو کہ انفرادی دکھوں کا مداوا ہے اور اس کو اجتماعی اور قومی وقار اور سربلندی نصیب ہوتی ہے۔

عفوودرگزر

آیت زیر گفتگو میں نبی مکرم علیہ السلام کو خصوصی طور پر اُن صحابہ کرام کو معاف کر دینے اور ان سے درگزر کرنے کا حکم دیا گیا۔ جن کے سبب آپ کو غزوۂ احد میں تکلیف پہنچی، جبکہ اللہ نے پہلے ہی ان کی معافی کا اعلان فرما دیا۔ جیسا کہ ہم سطور بالا پر عرض کر چکے ہیں۔ یہ حکم درحقیقت حضور علیہ السلام کی صفت عفو کو اجاگر کرنے اور غلاموں کو اپنے اندر یہ خوبی پیدا کرنے کی تعلیم کے لئے دیا گیا۔

میرے آقا ﷺ میں یہ صفت بھی آپ کی دیگر صفات کی طرح اپنے پورے کمال کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ آپ پیکر عفو وکرم ہیں۔ اپنوں کی خطاؤں کو درگزر کر دینا ہی نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی معاف کر دینا آپ کی عادت کریمہ تھی۔ اللہ رب العزت جل مجدہ نے آپ کی وساطت سے اہل ایمان کو بھی یہ خوبی اختیار کرنے کا حکم دیا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (المائدہ، ۱۳)

پس (اے محبوب علیہ السلام) آپ معاف فرماتے رہئے اور درگزر فرمایئے (دشمنوں کو) بیشک اللہ پسند فرماتا ہے احسان کرنے والوں کو۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (الاعراف:۱۹۹)

(اے حبیب علیہ السلام) معذرت قبول فرمایئے۔ (خطاکاروں سے) اور حکم دیجئے نیک کاموں کا اور نادانوں کی طرف سے رخ انور پھیر لیجئے۔

نبی کریم علیہ السلام نے حکم الٰہی کی تعمیل کا جو عملی نمونہ پیش فرمایا اس کا اندازہ درج ذیل چند واقعات سے کیجئے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی مکرم علیہ السلام نے کبھی کسی سے اپنی ذاتی حق تلفی کا انتقام نہ لیا۔ بلکہ آپ بڑی بڑی گستاخیاں کرنے والوں اور ایذائیں پہنچانے والوں کو معاف فرما دیا کرتے تھے۔ ہاں احکام الٰہی سے بغاوت کرنے والوں کے لیے آپ بہت سخت گیر تھے۔ اور ان سے ضرور انتقام لیتے تھے۔

چند واقعات

سیرت طیبہ کی کتابوں میں وہ دل دوز واقعات موجود ہیں جو حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کو ابتداء اسلام میں مکہ میں پیش آئے۔ خود کائنات کے آقا ﷺ پر کیا نہ بیتی۔ آپ کو مجنون و دیوانہ کہا جاتا، راہ چلتے آپ کے نورانی جسم پر کوڑا کرکٹ اور گندگی پھینکی جاتی۔ راستے میں کانٹے بچھائے جاتے۔ جن سے بسا اوقات آپ کے پائے مبارک زخمی ہو جاتے۔ کعبہ میں کئی مرتبہ حملہ کر کے آپ کو قتل کر دینے کی کوشش کی گئی لیکن آپ کا رویہ یہ تھا کہ خباب بن الارث رضی اللہ عنہ نے بیان

کیا کہ اہل مکہ کے مظالم سہتے سہتے ہم سب بے حد تنگ آ چکے تھے۔ آخر کار میں ایک دن حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی یارسول اللہ آخر یہ ظلم وستم ہم کب تک برداشت کریں۔ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ مستجاب الدعوات ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ ان ظالموں یعنی مشرکین مکہ کے لئے بددعا فرمادیں۔ حضرت خباب فرماتے ہیں، اس وقت میرے آقا ﷺ سر مبارک کے نیچے اپنی چادر رکھے کعبہ کے سایہ تلے آرام فرما رہے تھے۔ میری بات سن کر آپ تیزی سے اٹھے، آپ کے چہرہ انور کا رنگ بدل گیا یعنی غصہ کی وجہ سے آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا اور آپ نے فرمایا: اے خباب تم نے یہ کیا کہا، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم سے پہلے لوگوں کے جسموں پر لوہے کی کنگھیاں چلائی گئی ہیں، جس سے ان کی کھال ٹکڑے ٹکڑے ہوکر جھڑ جاتی تھی۔ ان کے سر پر آرے رکھ کر انہیں دوٹکڑے کردیا جاتا تھا، پھر وہ حق کو نہ چھوڑتے تھے۔ اے خباب، اللہ دین اسلام کو کمال تک پہنچائے گا۔ حتی کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ (اور ایسا ہی ہوا)

حضور علیہ السلام نبوت کے دسویں سال قبیلہ بنوثقیف کو دعوت اسلام پہنچانے کے لئے طائف تشریف لے گئے جہاں آپ کو سخت اذیت پہنچی کہ ان ظالموں نے آپ کو مارا پیٹا اور اتنا پتھراؤ کیا کہ آپ کا جسم مبارک لہولہان ہوگیا۔ جوتے خون سے بھر گئے۔ آپ نے ان لوگوں سے بچنے کے لئے ایک باغ میں پناہ لی۔ آپ کی اس حالت کو دیکھ کر فرشتے بھی کانپ اٹھے اور پہاڑوں کے فرشتے نے حاضر خدمت ہوکر عرض کی یارسول اللہ! اگر اجازت ہو تو میں ان ظالموں پر اخشبین پہاڑ الٹ دوں۔ آپ نے فرمایا میں نہیں چاہتا کہ وہ ہلاک ہوجائیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے بندے پیدا فرمائے گا جو صرف اسی کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں گے۔

غزوہ انمار (ربیع الاول ۳ھ) حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام کے ہمراہ دوران سفر کسی جگہ قیام فرمایا، آپ کسی ضرورت سے تنہا تشریف لے گئے، دعثور بن حارث نے آپ کو تنہا دیکھا تو موقع غنیمت جانا، تلوار لے کر دوڑا آیا اور آپ کے سامنے تلوار تان کر کھڑا ہوگیا۔ بولا، اب تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ آپ نے نہایت اطمینان واعتماد سے فرمایا ''اللہ'' دعثور پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ حضور علیہ السلام نے تلوار اٹھائی اور فرمایا اب تو بتا تجھے کون بچائے گا؟ وہ بولا کوئی نہیں۔ آپ نے تلوار پھینکی اور فرمایا، جا معاف کیا۔ یہ جملہ سنتے ہی دعثور کی دنیا بدل گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے آپ کے دامن سے وابستہ ہوگیا، ایمان لے آیا۔

غزوہ احد (شوال ۳ھ) آپ کو معلوم ہے کہ اس غزوہ میں حضور علیہ السلام کو کتنی تکلیف ہوئی۔ جلیل القدر صحابہ شہید ہوئے۔ آپ پر پے در پے وار کیے گئے، چہرہ مبارک زخمی ہوا، مقدس دانت شہید ہوا جب کسی نے گزارش کی کہ یارسول اللہ ان ظالموں کے لیے بددعا فرمایئے۔ تو آپ نے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ اے اللہ میری قوم کو معاف کردے، کیونکہ وہ جانتے نہیں۔

میرے آقا ﷺ کے عفو ودرگزر کا بے مثال واقعہ وہ ہے جو فتح مکہ کے دن پیش آیا۔ کہ اللہ کے رسول نبی رحمت ﷺ کعبہ کے سامنے اپنی اونٹنی پر رونق افروز ہیں۔ آپ کے گرد آپ کے پروانے ہیں اور ان کے چاروں طرف وہ مجرم

ہیں جنہوں نے مکی زندگی میں آپ کو ستانے، پریشان کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔ کونسا ظلم تھا جو آپ پر اور آپ کے غلاموں پر نہ ڈھایا گیا ہو۔ ذلت و خواری کا کونسا برتاؤ تھا جو نہ کیا گیا ہو۔ آج اللہ نے دشمنوں پر آپ کو غلبہ عطا فرمایا۔ اگر آپ کا ایک اشارہ ہوتا تو انتقام لینے میں کوئی دیر نہ لگتی۔ صحابہ حکم کے منتظر تھے۔ لیکن پیکر عفو و کرم، رحمت عالم ﷺ کو کسی کا ایک قطرۂ خون بہانا گوارا نہ ہوا۔ آپ نے اہل مکہ سے سوال کیا بتاؤ، آج تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو۔ سب بیک زبان بولے آپ کریم ہیں کریم کے بھائی ہیں، آپ نے فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ فَاذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے جاؤ تم آزاد ہو۔

حتیٰ کہ آپ نے دشمنوں کے گھروں کو پناہ گاہ بنا دیا۔ بالخصوص ابوسفیان (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے متعلق فرمایا جو ابوسفیان کی پناہ میں آئے، اس کو بھی کچھ نہ کہا جائے، ہندہ نے غزوہ احد میں آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو صرف قتل ہی نہ کرایا بلکہ آپ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ آپ کے ناک، کان، انگلیوں کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا۔ اور خوشی میں دیوانہ وار ناچی۔ یہی ہندہ چہرے پر نقاب ڈالے کلمہ پڑھتی آپ کے دربار میں حاضر ہوئی۔ آپ اس کا اسلام بھی قبول فرما لیتے ہیں۔ صرف اتنا فرمایا کہ "آئندہ تم میرے سامنے نہ آنا"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ خاص خادم رسول ﷺ جنہوں نے دس سال شب و روز آپ کی خدمت انجام دی، بتاتے ہیں کہ اس طویل عرصہ میں میرے آقا ﷺ نے مجھ سے

فَمَا قَالَ لِيْ اُفٍّ وَّلَا لِمَ صَنَعْتَ وَلَا اَلَّا صَنَعْتَ۔

کبھی اف تک نہ کہا۔ نہ یہ کہ کیوں کیا اور کیوں نہ کیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ صحابہ نے آپ کی خدمت میں مشرکین کے لئے بددعا کرنے کی درخواست پیش کی۔

قَالَ اِنِّيْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَّ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً

آپ نے فرمایا مجھے لعنت کرنے کے لیے مبعوث نہیں کیا گیا میں تو رحمت بانٹنے کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ:

لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَجْزِی السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ يَصْفَحُ

حضور علیہ السلام کبھی برائی کا بدلہ برائی سے نہ لیتے تھے۔ بلکہ آپ معاف فرما دیتے اور درگزر فرماتے۔

اور اب ملاحظہ ہو، اس پیکر عفو ﷺ کا پیغام ہمارے نام راوی ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا:

مَانَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَّالٍ وَّ مَازَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ

صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا درگذر اور معافی سے سوائے عزت کے اللہ کچھ زیادہ نہیں کرتا اور تواضع کرنیوالے کے اللہ درجے بلند کرتا ہے۔

اے ایمان والو! آقا ﷺ کے اس ارشاد پر غور کرو اور اپنے خیالات کا جائزہ لو۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم پر صدقہ وخیرات کرنا حتیٰ کہ فریضہ زکوٰۃ ادا کرنا، کس قدر دشوار اور بار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ آقا ﷺ کے ارشاد کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صدقہ دینے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے ہمارے مال میں کمی ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے چھوٹوں اور برابر والوں سے تو درکنار، اپنے بڑوں تک سے معافی مانگنے میں شرم آتی ہے، یا کسی کو معاف کر دینا ہم اپنی کمزوری اور ذلت سمجھتے ہیں۔ جبکہ نبی مکرم علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یہی ذریعہ عزت ہے۔ ہمیں لوگوں سے تواضع، عاجزی وانکساری سے پیش آنے میں بےحد تکلیف ہوتی ہے ہم اس کو اپنی حقارت خیال کرتے ہیں جبکہ اسی سے عظمت وبلندی ملتی ہے، اللہ اپنے پیارے محبوب علیہ السلام کے عفوودرگذر کے صدقہ میں ہمیں بھی اس خوبی کا عادی بنادے۔ اور ہم غلاموں کو آقا ﷺ کی اتباع وپیروی کی توفیق نصیب فرما۔ آمین۔

استغفار

آیت زیر گفتگو میں نبی مکرم علیہ السلام کو غلاموں کے لئے استغفار کرنے یعنی طلبِ مغفرت کا حکم دیا گیا۔ یہاں ہم استغفار کے متعلق چند باتیں عرض کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بالخصوص صحابہ اور عموماً پوری امت کے لئے حضور علیہ السلام کو طلب مغفرت کا حکم دینے میں کیا حکمت ہے، جبکہ مغفرت وبخشش فرمانے والا اللہ ہے۔

اللہ پسند فرماتا ہے کہ بندے اس سے طلب مغفرت کرتے رہیں کہ یہ اعترافِ عبدیت اور اظہارِ عبدیت کا نہایت ہی واضح طریقہ ہے۔ اس لئے مختلف انداز سے ہمیں یہ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۵۔۱۳۶)

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی برا کام کر بیٹھیں یا ظلم کریں اپنے آپ پر (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگنے لگتے ہیں اپنے گناہوں کی، اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا اور نہیں اصرار کرتے اس پر جو ان سے سرزد ہوا اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں یہ وہ (نیک بخت) ہیں جن کا بدلہ بخشش ہے، اپنے رب کی طرف سے اور جنت جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ہمیشہ رہیں گے ان میں کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (المائدہ: ۷۴)

تو کیا اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے اور کیا نہیں بخشش طلب کرتے اس سے اور اللہ بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ (الانفال:۳۳)

اور نہیں ہے اللہ انہیں عذاب دینے والا حالانکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ (فصلت:٦)

آپ فرما دیجئے میں (بظاہر) تمہاری طرح انسان ہی ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی اللہ ہے۔ پس متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف اور مغفرت طلب کرو اس سے اور ہلاکت ہے مشرکین کے لیے۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (المزمل:۲۰)

اور اللہ سے مغفرت طلب کیا کرو بیشک اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ان آیات میں استغفار کا مطالبہ عام مسلمانوں سے کیا جا رہا ہے جبکہ رب غفور رحیم کو استغفار اتنا پسند ہے کہ اپنے معصوم نبی ﷺ کو بھی اس کا حکم فرمایا۔ تاکہ آپ کے درجات مزید بلند ہوں۔ نیز آپ کا استغفار امت کے استغفار کی قبولیت کا وسیلہ بن جائے۔ اور استغفار کرنا سنت قرار پائے۔ ارشاد ہوا:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ۝ (المؤمن:۵۵)

پس (اے محبوب) آپ صبر فرمایئے، بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے خلافِ اولیٰ کاموں پر استغفار کرتے رہیے اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے شام کے وقت اور صبح کے وقت۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ۝ (محمد:۱۹)

پس (اے محبوب) آپ جان لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے خلافِ اولیٰ کاموں سے استغفار کرتے رہئے نیز مغفرت طلب کریں مؤمن مردوں اور عورتوں کے لئے اور اللہ جانتا ہے تمہارے چلنے پھرنے اور آرام کرنے کی جگہوں کو۔

نبی مکرم ﷺ کے چند ارشادات کی روشنی میں استغفار کی اہمیت کا اندازہ کیجئے۔ خود آپ کو یہ عمل اتنا محبوب ہے کہ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آپ فرماتے ہیں، قسم ہے اللہ کی:

اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً

میں دن بھر میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا اور اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ (بخاری)

تا کہ میرے مراتب بلند ہوں۔امت پر استغفار کی اہمیت واضح ہو اور میرا یہ عمل غلاموں کے لئے سنت بن جائے۔اور اس پر جو عمل کرے اس کے گناہ معاف اور توبہ قبول ہو جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔

لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَذَهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ وَلَجَآءَ بِقَوْمٍ يُّذْنِبُوْنَ فَيَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ فَيَغْفِرَ لَهُمْ

اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تمہیں ختم کر دے۔اور ایسی قوم لے آئے جو گناہ کرے اور اللہ سے طلب گار مغفرت ہو، پھر اللہ انہیں بخش دے۔ (مسلم)

حدیث کی وضاحت

اس حدیث مبارکہ کی وضاحت ضروری ہے تا کہ قارئین کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔بظاہر مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ العیاذ باللہ گناہ کرنے چاہئیں تا کہ اللہ سے استغفار کیا جائے۔ورنہ اللہ ہمیں ہلاک کر کے کوئی دوسری قوم پیدا فرما دے گا۔جو گناہ کرے اور طلب گار مغفرت ہو۔ایسا ہر گز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور ساری مخلوق اللہ کی صفات کا مظہر ہے۔اگر اللہ ہمیں پیدا نہ فرماتا تو اس کے خالق ہونے کا کیسے پتہ چلتا وہ رازق ہے جس کے لئے رزق اور مرزوق یعنی جسے رزق دیا جائے ،کی ضرورت ہے۔وہ شافی ہے جس کے لیے مرض اور مریض کی ضرورت ہے۔وہ دافع البلاء ہے جس کے لئے بلا اور اس شخص کی ضرورت ہے جو بلاؤں میں مبتلا ہو۔غرضیکہ اللہ نے اپنی ساری مخلوق کو اپنی صفات کے مظاہر ے ہی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔تا کہ اس کی معرفت حاصل کی جا سکے۔پس اللہ غفار ہے تواب ہے بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔وہ پسند فرماتا ہے کہ اس سے طلب مغفرت کی جائے۔توبہ کی جائے وہ بخشنے اور توبہ قبول کرنے کو پسند فرماتا ہے۔پس انسان قصداً نہیں بلکہ سہواً اور خطاءً گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اس کی صفت غفار و تواب کے مظاہرے کا ذریعہ ہے۔اسی لئے اس نے انسان کو علاوہ انبیاء کرام علیہم السلام کے نیکی و برائی کی قوت بخشی ان دونوں قوتوں کے باوجود جو انسان اعمال صالحہ کرتا ہے وہ فرشتوں سے افضل قرار پاتا ہے۔کیونکہ فرشتوں کا تقویٰ جبری ہے کہ ان کو خلاف تقویٰ عمل پر قدرت ہی نہیں اور انسان کا تقویٰ اختیاری ہے کہ وہ خلاف تقویٰ عمل پر قدرت کے باوجود تقوی اختیار کرتا ہے اور جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ اس پر نادم و شرمندہ ہو کر اللہ سے توبہ کر لیتا ہے اور طلب گار مغفرت ہوتا ہے۔

مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَّخْرَجًا وَّ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَّ رَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (ابن ماجہ)

جس شخص نے استغفار کو اپنا وطیرہ بنا لیا تو اللہ اس کی تمام مشکلات کو آسان فرما دیتا ہے اور ہر غم سے نجات عطا فرما دیتا ہے۔اور اس کو رزق ایسے ذرائع سے دیتا ہے جن کا اسے گمان تک نہیں ہوتا۔

کیونکہ مشکلات میں مبتلا ہونے غم آنے ،رزق میں تنگی و بے برکتی پیدا ہونے کا سبب دراصل انسان کا گناہ اور برائیوں میں

مبتلا رہنا ہے۔ پس جو مسلمان اپنے گناہگار ہونے کا احساس کر لیتا، اُن سے تائب ہو جاتا اور اللہ سے طلب گار مغفرت ہو
ہے تو اللہ رحیم وکریم اس کے لئے رحمت وکرم اور برکت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ پھر اس کی زندگی میں سکون وطمانیت او
آسائش کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ اور اسے حیٰوۃ طیبہ نصیب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاۙ وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (الطلاق:۲)

اور جو اللہ سے ڈرتا رہتا ہے، بنا دیتا ہے اللہ اس کے لیے نجات کا راستہ اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے
جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

نیز فرمایا گیا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً (النحل:۹۷)

جو نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مؤمن ہو تو ہم اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّةً

گناہ پر اصرار نہیں کیا اس شخص نے جو اللہ سے طلب مغفرت کرتا رہا چاہے دن بھر میں ستر بار گناہ
کرے۔ (ابوداؤد)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بار بار گناہ کیا جائے اور استغفار کرتا رہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ بڑا ہی غفور رحیم ہے
بندہ کتنا ہی گناہ کرے اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ بخشتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ
الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾ (الزمر:۵۳)

(اے محبوب) آپ فرمایئے، اے میرے بندوں جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنی جانوں پر مایوس نہ
ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے بیشک اللہ تمام گناہ بخش دیتا ہے۔
بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

یَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِی الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اَنّٰى لِیْ هٰذِهٖ فَیَقُوْلُ
بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ

نیک بندے کے درجات کو بلند فرماتا ہے تو وہ (حیرت) سے کہتا ہے، یہ درجہ مجھے کیسے مل گیا پس اللہ
فرماتا ہے، یہ مرتبہ تجھے اس طلب مغفرت سے ملا جو تیرے بیٹے نے تیرے لئے کی۔ (مشکوٰۃ)

عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

طُوْبٰى لِمَنْ وَّجَدَ فِي صَحِيْفَتِهٖ اِسْتِغْفَارًا كَثِيْرًا۔

خوشخبری ہے اس کے لئے جس نے اپنے نامہ اعمال میں استغفار کی کثرت پائی۔ (ابن ماجہ)

یہ ہے اس استغفار کے فضائل، فوائد اور اہمیت جس کا حکم اللہ جل مجدہٗ نے اپنے معصوم ومحبوب نبی علیہ السلام کو بھی دیا اور آپ سے سفارش فرمائی کہ آپ اپنے غلاموں کے لئے بھی ہم سے طلب مغفرت کیا کیجئے۔ جیسا کہ آیت زیر گفتگو میں موجود ہے۔ نیز گناہگاروں کی طلب مغفرت کے لئے حضور علیہ السلام کے دربار میں حاضری کا حکم دیتے ہوئے بتایا گیا مغفرت اسی وقت ہوگی جب رسول استغفار فرمادیں گے، جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ (النساء: ٦٤)

اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنے آپ پر حاضر ہوتے آپ کے پاس اور مغفرت طلب کرتے اللہ سے نیز مغفرت طلب کرتا ان کے لئے رسول تو وہ ضرور اللہ کو پاتے بہت توبہ قبول فرمانے والا نہایت رحم کرنے والا۔

گویا اللہ پسند فرماتا ہے کہ اس سے مغفرت بواسطہ وسیلہ رسول طلب کی جائے کیوں؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کی تفصیل تو ہماری کتاب ''تبلیغی کتاب'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے، یہاں مختصر جواب یہ ہے کہ:

اللہ رب العزت جل مجدہ کو یہ پسند ہے کہ اپنے بندوں کو جو بھی وہ مانگیں اپنے نبی کی معرفت عطا فرمائے کہ محبوب کی یہ عزت افزائی ہے۔ کہ بندوں کو اس کے در کا بھکاری بنایا جائے، حتیٰ کہ اللہ کی حکم عدولی اور گناہ کرنے والے بھی اسی در پر حاضر ہوں۔ اگر رسول ان سے راضی ہوگئے اور انہوں نے سفارش کردی تو چھٹکارا، ورنہ محرومی۔ پس:

اے ایمان والو! رسول سے غلامی کا رشتہ مضبوط رکھو، ان سے محبت کر کے ان کی اتباع وپیروی کے ذریعہ ان کی سنتوں کو اپنا کر ان کے ذکر کی محافل منعقد کر کے، ہمہ وقت ان پر درود بھیج کر تا کہ تم پر ان کی نظر کرم رہے کہ اس زندگی میں بھی انہیں کے در سے بھیک ملتی ہے۔ اور حشر میں بھی انہی کی پناہ میں آنا ہوگا۔

سائلو دامن سخی کا تھام لو — کچھ نہ کچھ انعام ہو ہی جائے گا
آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ ان سے — پھر نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا
لا و رب العرش جس کو جو ملا ان سے ملا — بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ مَّعْدِنِ الْجُوْدِ وَالْكَرَمِ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْن

مشورہ

آیت زیرِ گفتگو میں اللہ رب العزت جل مجدہ نے اپنے محبوب علیہ السلام کو غلاموں سے مشورہ کرتے رہنے کا حکم دیا۔ یعنی جہاد، حکومت اور دیگر اہم امور میں آپ اپنے غلاموں کی رائے بھی معلوم کرلیا کیجئے۔

عام طور پر مشورہ اس لیے کیا جاتا ہے، کہ مشورہ لینے والے کو اپنے ارادے پر پوری طرح یقین نہیں ہوتا وہ تذبذب اور شش و پنج کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے۔ اپنے اعتماد کے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد اگر وہ ان کی تائید حاصل کر لیتا ہے تو اپنے کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے اور اگر اس کے مشیر مخالفت کرتے ہیں تو وہ ناکامی کے خوف سے اپنا ارادہ تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن یہ صورت حال نبی مکرم ﷺ کے لئے موزوں قرار نہیں دی جاسکتی، کیونکہ آپ کا کوئی عمل، ارادہ وحی الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ آپ کا اجتہاد بھی اللہ کی رضا کے مطابق ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى ۝ (النجم: ۲۔۳)

اور وہ (محبوب علیہ السلام) تو بولتے ہی نہیں اپنی خواہش سے نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ میری عادت تھی کہ حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے میں جو کچھ سنتا لکھ لیا کرتا تھا۔ بعض احباب نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تم حضور کی ہر بات لکھ لیتے ہو، حالانکہ آپ انسان ہیں، کبھی غصہ میں بھی کوئی بات فرما دیا کرتے ہیں۔ پس میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ چند دن بعد حضور علیہ السلام نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم حسب معمول میری باتیں کیوں نہیں لکھ رہے۔ میں نے جو وجہ تھی بتادی۔ پس آپ نے فرمایا:

اُکْتُبْ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا خَرَجَ مِنِّیْ اِلَّا الْحَقُّ۔

لکھا کرو، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری زبان سے کبھی کوئی بات حق کے سوا نہیں نکلی۔

پس جب آپ کی کوئی بات بغیر وحی الٰہی کے نہیں ہوتی تو آپ کا کوئی عمل یا اس کا ارادہ وحی اور مرضی الٰہی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے اور اللہ کے حکم کی تعمیل کے لئے آپ کو کسی کے مشورے اور کسی کی تائید حاصل کرنے کی کیا ضرورت، اور اگر مشورہ منفی ہو تو آپ اسے کیسے تبدیل یا ترک کر سکتے ہیں۔ بات قابل غور ہے۔

بلاشبہ نبی مکرم علیہ السلام کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس کی وجہ وہ نہیں جس کی بناء پر عام لوگ مشورہ لیتے ہیں بلکہ آپ کو یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ آپ کی امت مشورے کی اہمت کو جانے اور ان فوائد کو حاصل کر سکے جو مشورہ لینے سے ہوتے ہیں۔ نیز یہ عمل آپ کی سنت قرار پائے۔ اور مشورہ لینے اور دینے والے دونوں کو دنیاوی فوائد کے ساتھ آخرت میں بھی اس کا اجر و ثواب ملے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کا دور اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ اس دور میں حلقہ بگوشان اسلام کی تالیف قلب، ہمت افزائی اور دلجوئی نہایت ضروری تھی۔ جس کے متعدد طریقوں میں سے ایک طریقہ مشورے کا بھی اختیار کیا گیا۔ صحابہ کرام کے لئے یہ نہایت ہمت افزا بات تھی کہ اللہ کے رسول اور ان کے آقا ﷺ کے دربار میں انہیں یہ اہمیت

حاصل ہو۔ کہ صرف کام کرنے کا حکم ہی نہ دیا جائے بلکہ بوقت ضرورت ان کی رائے بھی لی جائے۔ اس طریقہ سے ان میں خدمتِ دین اور دین کی جانثاری کا جوش و جذبہ دوبالا ہوتا رہا۔ اور وہ ہر کام کو صرف حکم کی تعمیل ہی نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیتے رہے۔

غزوہ بدر کے موقع پر جب حضور علیہ السلام نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ قریش کے تجارتی قافلہ کا پیچھا کر کے واپس چلا جائے۔ یا قریش سے مقابلہ کیا جائے۔ تو بعض صحابہ نے جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جو حضور علیہ السلام کو پسند نہ آیا۔ کیونکہ آپ کو اللہ کی طرف سے جنگ کا حکم مل چکا تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر حضرت مقداد رضی اللہ عنہم نے جب جنگ کی تائید میں پرجوش تقریریں کیں تو مخالف رائے دینے والے بھی جوش میں آ گئے اور جنگ ہوئی۔ کامیابی و کامرانی قدم بوس ہوئی۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب ''یوم الفرقان'' ملاحظہ ہو۔

بہرحال اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام سے اہم امور میں خصوصاً جنگوں کی تیاری کے موقع پر مشورہ فرماتے تھے اور جو رائے حکم الٰہی اور مرضی الٰہی کے خلاف نہ ہوتی آپ اس کو پسند فرماتے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ غزوۂ احزاب جسے غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے، کے موقع پر آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا اور تدبیر جنگ سے متعلق صحابہ کو رائے دینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اسی موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مدینہ اور دشمن کے درمیان خندق کھودنے کی تجویز پیش کی۔ اہلِ عرب کے لئے جنگ میں یہ تدبیر اختیار کرنا ایک بالکل نئی بات تھی کہ یہ اہل فارس ہی کا طریقہ تھا۔ لیکن حضور علیہ السلام نے اس رائے کو پسند فرمایا اور خندق کھودی گئی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی حضور علیہ السلام کو حدیبیہ تک پہنچنے سے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ اہل مکہ آمادہ جنگ ہیں وہ کسی صورت میں بھی مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اس وقت آپ نے صحابہ کی رائے طلب کی۔ صحابہ نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گزارش کی، یا رسول اللہ آپ آگے بڑھیں ہم عمرہ کرنے جارہے ہیں جنگ کا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن اگر اہل مکہ نے ہمیں روکا تو ضرور جنگ ہوگی۔ اس مشورے ہی کے مطابق حضور علیہ السلام نے دوبارہ سفر جاری کیا۔ حتی کہ حدیبیہ پہنچ کر آپ کو اللہ کا حکم وہیں ٹھہرنے کا ہوا۔ اور پھر جو ہوا وہ سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ غزوۂ احد کے لئے روانگی سے قبل آپ نے صحابہ کی رائے طلب فرمائی کہ مدینہ میں دشمن سے جنگ کی جائے یا مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ اور آپ اکثر صحابہ کے مشورے ہی کے مطابق مدینہ سے باہر جبلِ احد کی طرف تشریف لے گئے۔

مشورے کی اہمیت

مشورے کی اہمیت کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب علیہ السلام کو اس کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں قرآن کریم نے اسے مؤمنین کاملین کی خوبیوں میں سے ایک خوبی قرار دیا۔ ارشاد ہوا:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (الشوریٰ: ۳۷۔۳۸)

اور جولوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور وہ جب غضبناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کے سارے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا، اس سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

اس آیہ مبارکہ کی عملی تفسیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالاتِ زندگی میں دیکھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی امور میں اپنے احباب سے ہمیشہ مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور اجتماعی وقومی امور بھی مشورے ہی سے انجام دیتے تھے۔ خلفائے راشدین کا انتخاب امورِ مملکت کی انجام دہی کے لئے مشورے ہی سے عمل میں آیا۔ ان خلفاء نے باہمی مشاورت سے ہی امورِ مملکت انجام دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ نے اپنے دورِ خلافت میں ہر کام میں ایک نظم پیدا فرمایا۔ لہٰذا با قاعدہ جلیل القدر صحابہ پر مشتمل مجلس مشاورت قائم فرمائی۔ جس کے مشورے کی روشنی میں ملکی، سیاسی، جنگی اور قانونی معاملات کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ کسریٰ وقیصر کے مقابلہ کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنفس نفیس جانے کا فیصلہ فرمایا لیکن جب اس پر عمل کرنے کے لئے مجلس شوریٰ سے رائے طلب کی گئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی اور اس کو نامناسب قرار دیا۔ ممبرانِ شوریٰ نے آپ کی تائید کی لہٰذا اسی پر عمل ہوا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف نہ لے گئے۔ ہاں جب کبھی شوری نے کوئی ایسا مشورہ دیا جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف ہوا تو اس کو رد کر کے حکم الٰہی اور مرضی رسول پر عمل کیا گیا۔ مثلاً حضور علیہ السلام نے اپنی علالت سے چند روز پہلے شام کی طرف روانہ کرنے کے لئے لشکر تیار کیا تھا۔ جس کا سالار حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا تھا۔ اس لشکر میں جلیل القدر صحابہ اور تمام ہی ایسے بہادر سپاہی شامل تھے جن سے کفار کانپتے تھے۔ لشکر کی روانگی سے کچھ ہی پہلے حضور علیہ السلام دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت پر آنے کے بعد پہلا حکم اس لشکر کی روانگی کا دیا۔ صحابہ نے اس کو خلاف احتیاط سمجھا اور حضرت ابوبکر کو مشورہ دیا کہ اس لشکر کو فی الحال روک لیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور علیہ السلام کے وصال کی خبر سن کر مدینہ پر دشمن حملہ کر دے۔ اس صورت میں ہمارے لئے مدینہ کی حفاظت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ حضرت ابوبکر نے اس رائے کو رد کرتے ہوئے فرمایا ''اللہ کی قسم اگر مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس لشکر کی روانگی کے بعد مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑے گا یا مجھے زمین نگل جائے گی تب بھی اسے ضرور روانہ کروں گا اور حضور علیہ السلام کے ارادے کے خلاف ہرگز قدم نہ اٹھاؤں گا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا فیصلہ فرمایا تو صحابہ نے اس کو خلاف مصلحت قرار دیا۔ اور نرمی کا برتاؤ کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن آپ نے قرآن وحدیث کے فیصلے کے مطابق فرمایا کہ شریعت کے کسی رکن کا بھی منکر مرتد ہے۔ جس کی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے یا کسی کو شرعی حکم میں تبدیلی یا نرمی کرنے کا اختیار نہیں۔

غرضیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مشورے کے حکم پر ہمیشہ عمل کیا کرتے تھے اور ان کے بعد جب تک عوام و حکام علم دین سے واقف رہے اور ان میں شریعت پر عمل کرنے کا جذبہ بیدار رہا وہ اپنے ذاتی، اجتماعی امور باہمی مشاورت سے ہی انجام دیتے رہے۔ خصوصاً اسلامی ممالک کے حکام نے اس کا خاص خیال رکھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو حاکم نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا امین اور ان کے نفاذ کا نگران اور قوم کا خادم سمجھتے تھے۔ ان میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ قوم کے عطا کردہ

منصب کو اپنی آن و شان اور انانیت کے لئے استعمال کریں۔ اور عوام کے مطالبات اور مشوروں کو بے وقعت جان کر عارضی قوت کے ذریعہ دبا دیں۔

درحقیقت مشورہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک اہم جز ہے جس پر اسلامی حکومت کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ جب عوام باہمی مشورے سے اپنے حاکم اور اس کے لیے مشیروں کا صحیح انتخاب کرتے ہیں اور حاکم ان مشیروں کی اہمیت کو تسلیم کر کے ان کی آراء کے مطابق امور مملکت انجام دیتا ہے تو اللہ اس کا معاون و مددگار ہوتا ہے اور اسے حکومت کرنے کے لئے رہبری و رہنمائی عطا فرماتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

''جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر لے تو اللہ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی ہدایت مل جاتی ہے''۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

''جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین لوگ ہوں اور تمہارے مال دار سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں تو زمین کے اوپر رہنا تمہارے لئے بہتر ہے (یعنی زندہ رہنا بہتر ہے) اور جب تمہارے حکام بدترین ہوں، اور تمہارے مال دار بخیل ہوں اور تمہارے (انفرادی و اجتماعی) معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہے''۔

نیز مشورے کے عادی حکام سے عوام کی ہمدردی و محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ان کے حکم پر بلا چون و چرا عمل کرنے کیلئے آمادہ رہتے ہیں۔ نہ مخالفت ہوتی ہے نہ مطالبات ہوتے ہیں۔ نہ احتجاج کے لئے جلسوں، جلوسوں اور توڑ پھوڑ کی نوبت آتی ہے۔

مشورے کے فوائد

مشورہ عوام کو متحد و منظم رکھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ملک سیاسی انتشار و افتراق اور بد امنی سے محفوظ رہتا ہے۔ عوام اپنے مسائل کے لئے صرف حکومت پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ بیشتر مسائل کا حل وہ خود ہی اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کر کے تلاش کر لیتے ہیں۔

جس دور میں میرے آقا ﷺ نے حکم الٰہی کی تعمیل کر کے مشورے کے اصول کو متعارف کرایا، اس دور کے لوگوں کے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ حاکم محکوم سے، امیر غریب سے، بڑا چھوٹے سے رائے طلب کرے اور اس کی رائے کی روشنی میں کام کرنے کا فیصلہ کرے۔ وہ دور تو وہ تھا جس میں عام آدمی کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ باقاعدہ حکومتوں میں کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں تھیں جن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہی عوام کا مقدر سمجھے جاتے تھے۔ ان قوانین کی بنیاد شخصی اور وراثتی حکومت کی حفاظت پر قائم تھی وہ اپنی بادشاہت کے تحفظ کے لئے صرف ظالمانہ و جابرانہ اصولوں پر حکومت کیا کرتے تھے۔ نہ کسی کے حقوق کی ادائیگی کا خیال تھا اور نہ ہی کسی کی عزت و آبرو کا تصور۔ انسانوں کو غلاموں کی بھی نہیں بلکہ پالتو جانوروں کی حیثیت حاصل تھی کہ وہ اپنے کسی معاملہ میں اپنی مرضی یا خواہش کے دخل کا خیال تک نہ کر پاتے تھے۔ ان بادشاہوں کے حدود سے باہر، حکمراں قبائلی سردار تھے۔ جو قانون و اصول کے الفاظ تک سے واقف نہ تھے۔ ان کے پیش نظر

صرف اور صرف اپنی ذات تھی، اپنی خواہشات تھیں۔ عوام کا مال و دولت حتیٰ کہ عورتیں، بچے سب ان کے عیش و عشرت کی تکمیل کا سرمایہ تھے۔ اس دور میں صرف یونان کا خطہ ضرور ایسا تھا جہاں خود ساختہ جمہوریت کا نظام رائج تھا۔ وہ اتنا ناقص اور کمزور کہ ارسطو کے فلسفہ کا ایک حصہ بننے سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نظام کے نہ تو پیروکار رہے اور نہ ہی اس کی بنیاد پر دنیا میں کوئی مستحکم حکومت قائم ہوسکی۔

میرے آقا ﷺ نے مشورے کی بنیاد پر جس نظام حکومت کو متعارف کرایا اس نے تھوڑے سے ہی عرصہ میں بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کی جڑیں اکھیڑ دیں۔ وہ لوگ جو اپنے حاکموں کے سامنے آتے ہوئے کانپتے تھے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے۔ گویا کمزوروں کو قوت ملی، بے سہاروں کو سہارا ملا۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں۔ اپنے حقوق کے حصول کا احساس بیدار ہوا۔ عزتِ نفس پیدا ہوئی۔ بے جان انسان میں جان آئی اور ظلم و جبر کے خلاف ایک تحریک کا ایسا آغاز ہوا جس نے خدائی کے دعویداروں کو نیست و نابود کر دیا۔ غیروں نے اسے جمہوریت کا نام دیا اور قوت و طاقت کا سرچشمہ عوام کو قرار دے بیٹھے۔ جبکہ اہلِ ایمان نے اس کو باہمی ہمدردی و اخوت کا ذریعہ سمجھا اور حکام کی صحیح رہنمائی اور اصلاح کے لئے استعمال کیا۔ اور "لا حکم الا للہ" حکم صرف اللہ ہی کا ہے، کے عقیدے پر قائم رہے۔

امت مسلمہ کے ساتھ یہ ایک بڑا حادثہ ہوا کہ ان کے حکام نے اپنے اقتدار کی بقا اور اپنی من مانی کرنے کے لئے عوام کے ذہنوں سے شوریٰ کے اصل مقاصد کو نکال کر انہیں جمہوریت کے فریب میں مبتلا کر دیا۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے عطا کردہ ضابطہ حیات کو چھوڑ کر مسلمانوں کے لئے خود دستور سازی کرنے لگے۔ اور شوریٰ دستور ساز ادارے میں تبدیل ہوگئی۔ انجام یہ ہوا کہ کہیں حکام خود ساختہ دستور کے سہارے بادشاہ بن بیٹھے اور انہوں نے آزاد شدہ قوم کو پھر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ کچھ اپنے دورِ اقتدار کو اتنا طویل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ عوام میں ان پر تنقید کرنے یا ان کو تبدیل کر کے نئی قیادت لانے کی سکت ہی نہ رہی۔ اور کہیں انہی خود ساختہ قوانین نے ملک کو انارکی انتشار و افتراق کی آگ میں ایسا دھکیلا کہ ملک میں نہ سیاسی استحکام رہا نہ معاشی خوشحالی۔ نہ عزت و آبرو کا تحفظ۔ ایک سربراہ اپنی قانونی مدت اقتدار پوری نہیں کر پاتا کہ دوسرا اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے۔ روزمرہ کی یہ تبدیلی یا تو قوت و طاقت کے ذریعہ ہوتی ہے یا مکر و فریب سے، غرضیکہ شوریٰ کو جمہوری نظام میں تبدیل کر کے امت کو گرفتار مصائب و آلام کر دیا گیا۔ دشمنوں کے در کا بھکاری بنا دیا۔ وہ رعب و وقار جو مسلمان کا امتیازی نشان تھا ملیامیٹ ہوگیا۔ نیز اس تبدیلی سے قوم کی ایسی کردار کشی ہوئی کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن اور اخلاق سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ ہر شخص خود غرض، دولت کا لالچی، عیش و آرام پرست ہوگیا۔ محنت و محبت ایثار و قربانی کا جذبہ مجاہدانہ زندگی جو مؤمن کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ تھے ان کا خاتمہ ہوگیا۔ اب دشمن سے دفاع کے لئے لاکھوں افراد کی فوج تیار کی جانے لگی۔ جس پر قومی خزانے سے بے دریغ دولت خرچ ہوتی ہے۔ عوام کا پیٹ کاٹ کر ان کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں۔ پھر دشمن کا خطرہ نہیں ٹلتا۔ بلکہ دشمن جو چاہتا ہے ہمارے ملکوں کی سرحدوں میں کر گزرتا ہے۔ کیونکہ جب مؤمن اپنے اخلاق و کردار کی سرحد کا تحفظ کرنے میں ناکام رہتا ہے تو کوئی قوت و طاقت اس کی زمینی سرحدوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ یہ تاریخِ اسلام کی بولتی حقیقت ہے جس کا انکار بہرے ہی کر سکتے ہیں۔ غرضیکہ اسلام کے عطا کردہ سیاسی نظام سے شورائیت کے

خاتمہ ہی کے باعث آج دنیا بھر میں مسلمان فتنہ و مضطرب اور پریشان حال ہیں ان کے ممالک میں نہ امن و سکون ہے نہ معاشی وسیاسی استحکام جس کا دشمن خوب خوب فائدہ بھی اٹھا رہا ہے اور مذاق بھی اڑا رہا ہے۔ یاارحم الراحمین ہماری حالت پر رحم فرما۔ بجاہ رحمۃ للعلمین ﷺ

دو باتیں

مشورے کے سلسلے میں دو باتیں بے حد اہم ہیں۔ ایک یہ کہ مشورہ صاحبُ الراء لوگوں سے لیا جائے۔ یعنی ایسے لوگوں سے جو رائے دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں نیز وہ قابل اعتماد ہوں اور جس معاملے میں ان سے مشورہ لیا جا رہا ہے وہ اس کا پورا علم بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً صحت سے متعلق مشورے کی ضرورت ہو تو ایسے لوگوں کو تلاش کیا جائے۔ جو امراض اور ان کے علاج سے واقف ہوں، قانون کے متعلق رائے لینا ہو تو قانون دان لوگوں سے رابطہ کیا جائے۔ ملکی و قومی معاملہ ہو تو امور مملکت سے واقف لوگوں کو مشیر بنایا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہمیں نبی مکرم علیہ السلام کا ارشاد بتایا۔ کہ آپ نے فرمایا:

اِسْتَرْ شِدُوا الْعَاقِلَ وَلَا تَعْصَوْهُ فَتَنْدَمُوْا

عقلمند آدمی سے مشورہ لو اور اس کے خلاف نہ کرو ورنہ ندامت اٹھانی پڑے گی

ہم اسی لئے ندامت اٹھا رہے ہیں کہ اولاً تو ہم کسی سے مشورہ کرتے ہی نہیں، کرتے بھی ہیں تو مانتے نہیں۔ اپنی من مانی ہی کرتے ہیں۔ ہمارے حکام اپنا مشیران لوگوں کو بناتے ہیں جو چاپلوس اور خوشامدی ہوں۔ ان کا مشورہ ''جی حضور'' سے آگے نہیں بڑھتا۔ اپنے منصب کے تحفظ، مراعات کے لالچ میں یہ ظالم کبھی نہیں سوچتے کہ سرکار کے اس فیصلے سے قوم کو ملک کو کیا نقصان ہوگا۔ یا خود سرکار کا کیا حشر ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ مشورہ دینے والے پر بھی بڑی اہم ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ اِذَا اسْتُشِيْرَ فَلْيُشِرْهُ بِمَا هُوَ صَانِعٌ لِنَفْسِهٖ

جس سے مشورہ کیا جائے وہ امین ہے جب اس سے مشورہ کیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس معاملہ میں جو اپنے لئے کرتا وہی کرنے کا مشورہ دے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اُفْتِيَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ اِثْمُهٗ عَلٰى مَنْ اَفْتَاهُ وَ مَنْ اَشَارَ عَلٰى اَخِيْهِ بِاَمْرٍ يَّعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِيْ غَيْرِهٖ فَقَدْ خَانَهٗ

بغیر علم کے فتویٰ دینے کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہو گا۔ اور جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسے کام کا مشورہ دیا جس کے برعکس کرنے میں بھلائی تھی تو اس نے خیانت کی۔

یعنی اگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور وہ نہ جانتا ہو تو فقیہ بننے کے بجائے اس کو اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ گر اس نے غلط مسئلہ بتا دیا۔ تو اس پر جتنے لوگ عمل کریں گے اس کا وبال ان مفتی صاحب پر ہوگا۔ اور اگر کسی سے کوئی رائے طلب کی

جائے تو اسے صحیح رائے دے دینا چاہیے ورنہ وہ اللہ کے یہاں بددیانت لوگوں میں شامل ہوگا۔

پس مشورہ دینے کا موقع ووٹ وغیرہ کے ذریعہ عوام کو ملے یا عوامی نمائندے اسمبلی میں اپنی رائے کا اظہار کریں انہیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ امین ہیں۔ اللہ انہیں دیکھ رہا اور ان کی بات سن رہا ہے۔ انہیں ایک دن اللہ کے دربار میں حاضر ہوکر جوابدہی کرنا ہوگی کہ وہ اپنی ذمہ داری سے دیانت کے ساتھ سبکدوش ہوئے تھے یا انہوں نے خوف ولالچ میں مبتلا ہوکر بددیانتی کی تھی۔ لہٰذا مشیر کو چاہیے کہ وہ اس منصب کو اس کی خوشنودی کے لیے استعمال نہ کرے جو اس سے مشورہ طلب کر رہا ہے بلکہ بلاخوف وخطر اور بلاطمع صحیح بات کہہ کر اللہ کی رضا حاصل کرے۔ کہ سب سے بڑا جہاد یہی ہے کہ حق بات کہی جائے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ

افضل جہاد کا ثواب اس شخص کو حاصل ہوگا جس نے جابر وظالم حاکم کے سامنے حق بات کہی

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے لکھا اس پر غور کرو ہم جانتے ہیں کہ ماحول بے حد خراب ہو چکا ہے۔ لیکن موتی حاصل کرنے کے لئے غوطہ لگانے کے سوا چارہ بھی نہیں۔ تقویٰ، اللہ کی رضا، ایسے انمول موتی ہیں جن کے حصول کے لئے مؤمن کسی خطرے سے گریز نہیں کرتا۔ اگر چند مجاہد، دیانت وحقانیت کی شمع روشن کردیں تو پوری ملت کو تاریکی سے نجات دلا سکتے ہیں اور یہ ان کا ایسا عظیم احسان ہوگا کہ قوم اَسلاف کی طرح انہیں بھی کبھی فراموش نہ کرے گی۔ نسلیں گزرتی رہیں گی لیکن ان کا ذکر خیر جاری رہے گا۔ نیز تمہارے ہی نام یہ پیغامِ الٰہی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ (محمد:۷)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کروگے، تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

اے اللہ صدقہ ان کا جنہوں نے تیرے دین کی مدد کی اور تو نے ان کے قدموں کو مضبوط فرمایا۔ ہمیں بھی جرات دے کہ تیرے دین کی مدد کرسکیں اور ہمارے قدموں کو بھی جمادے کہ ہم باطل کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکیں۔ اے اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔ آمین بجاہ رحمۃ للعالمین۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

مقالہ ۱۹

آل عمران: ۲۰۰

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝

(آل عمران: ۲۰۰)

اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلے میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لئے اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ۔

اے ایمان والو! تمہاری دنیوی واخروی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ یہ چار خوبیاں ہیں۔

صبر، مصابرہ، رباط، تقویٰ

جس مؤمن میں یہ چار خوبیاں پیدا ہو گئیں وہ دنیا میں بھی کامیاب و کامران ہے اور آخرت میں بھی۔ کیونکہ یہی خوبیاں ہیں جو جملہ احکام شرع پر عمل کا ذریعہ ہیں۔ ان خوبیوں والا مؤمن نمازی بھی ہوگا، غازی بھی، مجاہد بھی ہوگا، متقی بھی۔ اس کا ہر عمل اللہ اور رسول کی رضا کے مطابق ہوگا۔ پس اسے دنیوی زندگی میں سکون میسر آئے گا۔ وہ ہر حال مطمئن رہے گا۔ معاشرے میں اس کی عزت ہوگی۔ دنیا سے جانے کے بعد خیر اور بھلائی سے اس کا ذکر کیا جائے گا۔ یہی تو دنیا کی کامیابی ہے۔ اس زندگی کے

بعد کے تمام مراحل بھی اس کے لئے سہل وآسان ہوں گے۔

سکرات موت کی تکلیف سے نجات

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (الفجر:۲۸)

اے نفس مطمئن واپس چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

اس صدا سے سکراتِ موت کی تکلیف ختم ہوگی، قبر میں سوال وجواب کے وقت وہ چہرہ انور سامنے ہوگا، جس کی رضا کے لئے مؤمن نے ان خوبیوں کو اپنایا۔ انہی کا ساتھ اور سہارا میدان حشر میں ہوگا نہ حساب کی فکر نہ کتاب کا غم۔ نہ میزان پر گھبراہٹ اور نہ پل صراط پر خوف

رضا پل صراط سے اب وجد کرتے گزرئے ۔۔۔ کہ ہے رَبِّ سَلِّم صدائے محمد (ﷺ)

غرضیکہ دنیا بھی کامیاب اور آخرت بھی کامیاب۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے حبیب گرامی ﷺ کے توسط سے ان عظیم خوبیوں سے آگاہ کردیا۔ اے اللہ اب تجھ سے التجا ہے کہ ہمیں ان خوبیوں کو اپنانے کی بھی ہمت وتوفیق عطا فرما۔ آمین بجاہ رحمۃ للعلمین۔

صبر

صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں قرآن وسنت کی اصطلاح میں نفس کو خلاف شرع چیزوں سے روکنے کو صبر کہا جاتا ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

صبر علی الطاعات: یعنی جن کاموں کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ان کی پابندی کتنی ہی دشوار اور مشکل معلوم ہو۔ لیکن ان کے خلاف کرنے سے نفس کو روکے رکھنا مثلاً نماز کی پابندی کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اللہ کی مخلوق سے اچھا سلوک کرنا۔ لوگوں کی غلطیاں معاف کردینا۔ والدین کی خدمت کرنا، حلال کو اختیار کرنا سود، رشوت وغیرہ کی دولت سے بچنا اور دیگر شرعی احکام کی پابندی، اپنی ضرورت یا ماحول کے تقاضوں کے باعث کتنی ہی دشوار کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی کسی شرعی حکم کو ترک نہ کرنا صبر ہے۔

صبر عن المعاصی: نفس کو ان چیزوں سے روکنا جن سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔ چاہے کتنی مرغوب اور پسند ہوں یا دشوار ہوں۔ مثلاً بدکاری، شراب، جوا، خنزیر، یا غصہ پر قابو پانا لوگوں کی غیبت کرنا، کسی کو ستانا، بدزبانی، بدکلامی کرنا بدامنی وانتشار پھیلانا وغیرہ تمام ممنوعہ امور سے باوجود دشواری اور بظاہر نقصان کے بچنا صبر ہے۔

صبر عن المصائب: یعنی مصیبت وتکلیف کے وقت واویلا نہ کرنا مثلاً کسی مالی نقصان پر کسی بیماری پر کسی جانی نقصان پر آپے سے باہر نہ ہو بلکہ ان کو برداشت کرتے ہوئے اللہ ہی کے دربار میں رونا اور دعا کرنا اور یہ یقین رکھنا کہ اللہ ہی نجات دینے والا ہے، صبر عن المصائب ہے۔

صبر، انبیاء علیہم السلام کی سنت، اولیاء وصالحین کی عادت ہے جو اس کا عادی ہو جاتا ہے وہ پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے مصائب وآلام بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے عزائم پختہ ہوتے ہیں وہ پیچھے دیکھے بغیر اپنی منزل

کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نہ اس کی نیند میں خلل آتا ہے نہ کھانے پینے میں فرق پڑتا ہے۔ نہ اس کا وقت ضائع ہوتا ہے، نہ صحت متاثر ہوتی ہے کیونکہ وہ مصائب و تکالیف کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیتا ہے اور ان پر صبر کر کے اللہ سے ان پر اجر کا یقین رکھتا ہے۔

صبر کے فضائل وفوائد تفصیل کے ساتھ ہم گزشتہ اوراق میں لکھ چکے ہیں یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری اضافہ ہوگا۔ لہٰذا ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو آپ ان اوراق پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔

مصابرہ

مصابرہ کا مادہ صبر ہی ہے حروف کی زیادتی اصل معنی میں زیادتی اور شدت کا فائدہ دیتی ہے۔ پس مصابرہ، صبر میں مبالغہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی خوب صبر کرو۔ ڈٹ جاؤ۔ نیز صبر ذاتی اور انفرادی عمل ہے جب کہ مصابرہ ان مصائب کا مقابلہ کرنا ہے جس سے اجتماعی و قومی نقصان ہو۔ لہٰذا یہاں اس کے معنی ہیں ''دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ جانا'' یہ لفظ قرآن کریم میں ایک ہی جگہ صرف اس آیت میں آیا ہے۔

مصابرہ، دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ جانا، مؤمن کی شان ہے مؤمن کی آن ہے۔ مؤمن کی بقا اور عزت و وقار کا ذریعہ ہے۔ اسی سے اسلام کا تحفظ ہے یہی دین کی بڑی خدمت ہے۔ اسی لئے حکم الٰہی ہے عمل نبوی ہے۔ سنت صحابہ ہے۔ طریقہ تابعین و صالحین ہے۔ جس پر ہماری تاریخ گواہ ہے۔ غزوۂ بدر و احد تبوک و حنین اور دیگر غزوات کا حال پڑھیے۔ خلفاء راشدین کے دور میں جو جنگیں ہوئیں۔ ان کے بعد جس دور میں بھی اسلامی احکام کے مطابق اہلِ ایمان نے جہاد کیا ان میں مجاہدین کے مصابرہ کے حالات پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اور اپنے حال پر غور کر کے شرمندگی سے سر جھک جاتا ہے۔

رِباط

رِباط کے لغوی معنی ہیں باندھنا۔ قرآن و حدیث میں یہ لفظ دو معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک اسلامی مملکت کی حفاظت کے لئے جنگی گھوڑے اور جنگی سامان کے ساتھ ہمہ وقت مسلح رہنا۔ یعنی جنگ کے لئے تیار رہنا۔ دوسرے نفس کو باندھے رکھنا۔ یعنی برائیوں عیش و آسائش کا عادی نہ ہونے دینا۔ احکام شرعیہ بالخصوص نماز کا پابند بنانا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا کہ ''جو شخص حالت رباط میں مر جائے تو وہ جو کچھ عمل صالح دنیا میں کیا کرتا تھا ان سب اعمال کا ثواب اس کو مرنے کے بعد بھی ملتا رہے گا۔ اور اس کا رزق بھی جاری رہے گا۔ (یعنی اس کی اولاد کبھی تنگی رزق میں مبتلا نہ ہوگی) اور وہ شیطان (یا سوال قبر) سے محفوظ رہے گا۔ اور قیامت کے دن اللہ اس کو ایسا مطمئن اٹھائے گا کہ محشر کا اسے کوئی خوف نہ ہوگا۔

حضرت ابوسلمہ بن الرحمٰن رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ''میں تمہیں وہ چیز بتاتا ہوں جس سے اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا اور تمہارے درجات بلند فرمائے گا۔ وہ یہ ہیں وضو کو اچھی طرح کرنا باوجودیکہ سردی یا کسی تکلیف کے سبب وضو کرنا دشوار ہو۔ مسجد کی طرف (نماز باجماعت کے لئے) کثرت سے (پابندی سے) جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔'' ذلکم الرباط ''یہی رباط فی سبیل اللہ ہے۔

آیت زیر گفتگو میں دونوں معنی لئے جا سکتے ہیں۔یعنی جہاد کی تیاری اور نماز کی پابندی دونوں ہی مؤمن کی کامیابی کا ذریعہ ہیں لیکن ہماری تحقیق کے مطابق یہاں جہاد کی تیاری کا حکم ہے۔جبکہ نماز کی تاکید اور اس کا ذریعہ فلاح ہونا قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہو چکا ہے۔درج ذیل آیہ مبارکہ ہمارے اس خیال کی بنیاد ہے۔

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۞ (الانفال:۶۰)

اور تیار رکھو ان کے لئے قوت وطاقت اپنی استطاعت کے مطابق اور بندھے ہوئے گھوڑے تاکہ تم خوفزدہ کردو اپنی جنگی تیاریوں سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور دوسرے لوگوں کو ان کھلے دشمنوں کے علاوہ تم انہیں نہیں جانتے البتہ اللہ انہیں جانتا ہے اور جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا اجر تمہیں پورا دیا جائے گا اور (کسی طرح) تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

آیت مبارکہ واضح ہے کہ اہل ایمان کو ہر وقت کفار کے مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہیے کیونکہ کافروں کی طرف سے کسی وقت بھی اسلامی مملکت پر حملہ ممکن ہے۔اس مقصد کے لئے دیگر جنگی سامان کا رکھنا ضروری ہے۔لیکن گھوڑے بھی تیار بندھے رہنا چاہئیں۔کہ سواری کے بغیر جنگ ممکن نہیں۔

حضور علیہ السلام کا نماز کا ''رباط'' فرمانے کا منشاء یہ نہیں کہ اس آیت میں رباط سے مراد نماز ہے۔بلکہ فرمان کا مفہوم یہ ہے'' کہ نماز بھی رباط ہی ہے،یعنی جہاد کی تیاری ہی ہے۔کیونکہ نماز کی پابندی سے مؤمن جس نظم وضبط ،محنت اور مشقت کا عادی ہو جاتا ہے اس کا پورا فائدہ اسے میدان جہاد میں ہی ملتا ہے۔

تقویٰ

یعنی اللہ سے ڈرنا،وہ ڈرنا نہیں جو کسی ظالم وجابر سے ہوتا ہے۔بلکہ وہ ڈرنا جو غلام کا آقا سے ہوتا ہے۔یا جو محبوب کا محب سے ہوتا ہے یعنی اس کی ناراضگی اور ناراضگی کے نتیجہ میں اس کی سزا سے ڈرنا۔مؤمن کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اللہ کی رضا اور اس کا حکم معلوم کرے تاکہ اس کا کوئی عمل رب کی مرضی کے خلاف نہ ہونے پائے۔بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ ہر حال میں احکام شرع کی پابندی کرنا۔

تقویٰ،قرب الٰہی کا ذریعہ ہے بندہ جتنی احکام شرع کی پابندی کرتا ہے،اسی کے مطابق وہ تقوے کے مراتب حاصل کرتا جاتا ہے اس عنوان پر ہم خاصی تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق پر کر چکے ہیں۔جس کا مطالعہ آپ بھی کر چکے ہوں گے لہٰذا اعادہ غیر ضروری ہوگا۔

قابل غور

آیت زیر گفتگو میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ جہاد کے لئے تیار رہنے کے حکم سے پہلے صبر اور مصابرہ کا حکم

دیا گیا۔ کیونکہ مؤمن اگر روزمرہ کی زندگی میں صبر کا عادی نہ ہو تو وہ جنگ کے میدان میں ہرگز ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً جو روزمرہ کی زندگی میں بھوک برداشت نہ کر سکے کوئی جسمانی تکلیف برداشت نہ کر سکے۔ اپنے کسی عزیز یا دوست کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کا عادی نہ ہو۔ تو وہ میدان جنگ میں ان سب حالات کا مقابلہ کیسے کرے گا۔ اسی لئے ہماری تمام عبادتوں میں جُہد محنت و مشقت کا جوہر پایا جاتا ہے۔ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ پھر ہر موقع پر ایثار و قربانی کی تلقین بالخصوص ایام حج میں منیٰ، عرفات و مزدلفہ کا قیام، حالتِ احرام میں رمی جمرات یہ جملہ احکام ہماری قوت برداشت بڑھانے ہی کے لئے ہیں۔ تاکہ ہم وقت آنے پر پوری طرح مصابرہ کر سکیں۔ نیز اسی لئے میرے آقا ﷺ نے اپنے لئے اور نہ ہمارے لئے عیش وعشرت کی زندگی کو پسند فرمایا۔ آپ کے شب و روز اور رہن سہن کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہماری صحیح رہبری ہوگی اور ہمیں اس عنوان پر بھی آپ کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ نصیب ہوگا۔

دنیا پر رحمت و برکت کی برسات برسانے والے آقا ﷺ کے دولت کدے میں دو، دو ماہ، آگ نہ جلتی تھی، صرف کھجوروں اور پانی پر گزارہ ہوا کرتا تھا۔ بروایت خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ نے دسترخوان پر اہتمام کے ساتھ کبھی کھانا تناول نہ فرمایا۔ نہ باریک روٹی (چپاتی) کھائی۔ آپ نے کبھی فاخرانہ یا پُرتکلف لباس زیب تن نہ فرمایا۔ سونے کے لیے نرم و نازک گدے استعمال نہ فرمائے۔ اکثر کھجور کی چٹائی پر آرام فرماتے کہ اٹھتے تو مقدس پیٹھ پر چٹائی کے نشان بنے ہوتے۔ کبھی آپ نے پوری رات آرام نہ فرمایا۔ رات کا اکثر حصہ اللہ کی یاد اور عبادت میں گزرتا۔ حتیٰ کہ آپ کے مقدس پیروں پر ورم آجاتا۔ اپنے اہل وعیال کے لیے بھی آپ نے کبھی عیش وعشرت کی زندگی کو پسند نہ فرمایا۔ ہماری ماؤں کے لیے چھوٹے چھوٹے حجرے تھے جن کی دیواریں قدِ آدم سے قدرے اونچی اور چھت کھجور کے پتوں کی تھی۔ چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر کا کام خود ہی کرتی تھیں۔ چکی چلاتی اور آٹا پیسا کرتی تھیں۔ پانی بھر کر لاتی تھیں اور ان کے باپ ﷺ غلام اور لونڈیاں تقسیم فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ بہت ہی ہمت کر کے ایک باندی کا سوال بھی کیا تو رد فرماتے ہوئے وظیفہ بتا دیا کہ یہ پڑھا کرو۔ تکان دور ہو جائے گی۔ انہی چہیتی بیٹی کا ایک واقعہ بروایت حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کتب احادیث میں موجود ہے۔ آپ بتاتے ہیں کہ:

جب حضور علیہ السلام سفر کے لئے تیاری فرماتے تو سب سے اخیر میں بیٹی حضرت فاطمہ سے ملاقات کرتے اور واپسی پر پہلے مسجد تشریف لاتے پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر ان سے ملاقات کے لئے تشریف لے جاتے۔ اس کے بعد ازواج مطہرات کے پاس جاتے تھے ایک مرتبہ آپ کسی غزوے سے واپس تشریف لائے تو حسبِ معمول صاحبزادی کے گھر پہنچے، دیکھا کہ ان کے دروازے پر پردہ لٹکا ہوا تھا اور حَسن وحُسین چاندی کے کنگن پہنے کھیل رہے تھے۔ آپ نے نہ بیٹی سے ملاقات کی اور نہ نواسوں کو گود اٹھایا۔ دروازے سے ہی واپس ہو گئے۔ مزاج شناس بیٹی سمجھ گئیں کہ حضور کو گھر کی زینت اور بچوں کا زیور پسند نہ آیا۔ آپ نے پردہ پھاڑ دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لئے حسنین روتے ہوئے دربار میں حاضر ہوئے۔ آپ نے بچوں سے کنگن لئے اور فرمایا۔ ثوبان یہ زیور فلاں شخص کے بچوں کو دے آؤ وہ ضرورت مند ہیں۔ میں پسند

نہیں کرتا کہ میرے اہل بیت زیب و زینت کی زندگی کے عادی بنیں۔ثوبان، فاطمہ کے لئے لکڑی کے دانوں کا ایک ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ۔ علیہ السلام

یہ ہے کائنات کے آقا ﷺ کی حیاتِ مقدس کا ایک نمونہ یہ بھی واضح رہے کہ آپ کی زندگی کا یہ طرز نہ تو جبری تھا اور نہ روایتی یعنی اس لئے نہ تھا کہ اس دور میں سب ہی ایسی زندگی بسر کرتے تھے۔ایسا ہرگز نہ تھا۔اس وقت بھی لوگ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔قیصر و کسریٰ جیسے عیاش بادشاہ موجود تھے۔خود اہل مکہ و مدینہ کسی سے کم نہ تھے اور نہ ہی اس انداز زندگی کا سبب آپ کی غربت تھی۔قسم خدا کی میرے آقا غریب نہ تھے۔ان کے خزانوں سے تو نہ جانے کس کو کیا نصیب ہوا۔اور آج تک ان کے خزانوں کے دہانے امت کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔بلکہ آپ اپنے اس طرز زندگی کے متعلق خود فرماتے ہیں کہ ''میرے رب نے مجھ سے فرمایا، پیارے اگر تم چاہو تو میں وادی مکہ کو تمہارے لئے سونا بنا دوں، مگر میں نے عرض کیا۔میرے رب میں یہ نہیں چاہتا میں تو چاہتا ہوں کہ ایک دن کھانا کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔جب بھوکا رہوں تو تیرے آگے عاجزی و زاری کروں اور جب سیر ہو جاؤں تو تیری حمد اور شکر کروں۔اس انداز زندگی میں جو محنت و مشقت سے بھری ہوئی تھی۔میرے آقا ﷺ کی مصلحت یہی تھی کہ آپ کے غلام محنت و مشقت کے عادی ہوں، جُہدِ مسلسل کو اپنائیں ان میں قوت برداشت پیدا ہوتا کہ وہ ایسا مصابرہ کریں کہ بڑی سے بڑی طاقت ان سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جائے۔

غرضیکہ جہاد کی تیاری کے حکم سے پہلے صبر و مصابرہ کا حکم دیا گیا کہ جب تم میں یہ دو خوبیاں پیدا ہو جائیں تو اب تمہیں رباط زیب دیتا ہے کہ ان خوبیوں کے بغیر جہاد کی تیاری کوئی معنی نہیں رکھتی اور جب تم رباط کے اہل ہو گئے تو تقویٰ اختیار کرو۔یعنی تمہارا جذبہ جہاد، کفار کی طرح ذاتی انتقام، قوت و طاقت کے مظاہرے یا حصول دولت یا ہوس اقتدار کے لئے نہ ہو۔بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لئے ہو۔دین کی بقا اور حفاظت کے لئے ہو۔نیز دورانِ جہاد تم سے کوئی خلافِ شرع حرکت سرزد نہ ہو۔نماز نہ چھوٹے۔ان طریقوں کی خلاف ورزی نہ ہو جن کو اختیار کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا۔مثلاً جوشِ انتقام یا غصہ میں دشمن کے مقتولین کا مُثلہ نہ کرنا، یعنی ان کے ناک کان نہ کاٹنا، ان کے چہروں کو نہ بگاڑنا، ان لاشوں کی بے حرمتی نہ کرنا، گھوڑوں سے انہیں نہ روندنا۔ان کی عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا۔گھروں میں گھس کر لوٹ مار نہ کرنا۔فصلوں کو تباہ نہ کرنا۔درختوں کو نہ کاٹنا۔آبادیوں اور جنگلوں میں آگ نہ لگانا۔زخمیوں اور قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ان کے علاج، کھانے وغیرہ کا خیال رکھنا کہ یہ جہاد ہے۔آج جیسی دہشت گردی نہیں، جہاد عبادت ہے۔اس کا ایک مقدس مقصد ہے جس کے حصول کے بعد کسی قسم کی جارحیت و زیادتی کی اجازت نہیں۔اللہ رب العزت جل مجدہ کا ارشاد ہے۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۝۱۹۰ (البقرہ:۱۹۰)

اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جوتم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی مت کرو بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

جہاد تو اللہ کی عبادت ہے جس کا مقصد دہشت گردی نہیں بلکہ مؤمن کی اپنی عزت و آبرو کا تحفظ اور اسلام کی بقا ہے۔اس مقصد میں کامیابی کے بعد کسی قسم کی زیادتی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

بہرحال رباط سے قبل صبر و مصابرہ کا حکم رباط کی اہلیت وصلاحیت پیدا کرنے کے لئے دیا گیا اور رباط کے بعد تقویٰ اختیار کرنے کا حکم رباط کی قبولیت کے لئے دیا گیا۔اور ان چاروں خوبیوں کے پیدا ہونے کے بعد کامیابی و کامرانی کی ضمانت دی گئی۔

جہاد کی تیاری

اختصار کے ساتھ یہاں یہ بتانا بھی موزوں ہوگا کہ مجاہد اعظم ﷺ نے جہاد کی تیاری سے متعلق ہمیں کیا تلقین فرمائی۔ پس چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ بِنَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ الْاَجْرُ وَالْغَنِيْمَةُ

گھوڑوں کی پیشانی سے قیامت تک کے لئے بھلائی باندھ دی گئی ہے۔ثواب اور مال غنیمت (کی صورت میں) (مسلم)

اس دور میں مجاہدین کے لیے گھوڑا نہایت اہم سواری تھا۔لہذا میرے آقا ﷺ نے اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں خیر ہے،اس اعتبار سے کہ ذریعہ ثواب و بلندیٔ مراتب ہے ان مجاہدین کے لئے جو اس پر سوار ہو کر جہاد کریں اور شہید ہو جائیں اور ذریعہ حصولِ مالِ غنیمت ہے ان مجاہدین کے لئے جو زندہ رہیں اور غازی کہلائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْبَرَكَةُ فِيْ نَوَاصِي الْخَيْلِ

برکت گھوڑوں کی پیشانی میں ہے (جو جہاد کے لئے رکھے جائیں) (مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) گھوڑا روکے رکھا،اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے۔

فَاِنَّ شَبْعَهٗ وَ رِيَّهٗ وَ رَوْثَهٗ وَ بَوْلَهٗ فِيْ مِيْزَانِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

تو قیامت کے دن اس کا کھانا اس کا پانی اس کی لید ھ اور اس کا پیشاب بھی میزان میں ہوگا۔ (بخاری)

یعنی مجاہد کی دیگر نیکیوں کے ساتھ ان سب کا بھی وزن ہوگا۔اور مجاہد کو ان کا اجر ملے گا۔

حضرت وہب بن جشمی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اِرْتَبِطُوا الْخَيْلَ وَامْسَحُوْا بِنَوَاصِيْهَا وَ اَعْجَازِهَا اَوْ قَالَ اَكْفَالِهَا وَ قَلِّدُوْهَا وَلَا

(نسائی)

تُقَلِّدُوْهَا الْاَوْتَارَ

(جہاد کے لئے) گھوڑے پالا کرو اور ان کی پیشانیوں اور پیٹھوں پر ہاتھ پھیرا کرو یا فرمایا کولھوں پر ہاتھ پھیرا کرو۔ اور انہیں ہار پہنایا کرو اور تانت کے ہار نہ پہنایا کرو (کہیں زخمی نہ ہو جائیں)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

لَا سَبَقَ اِلَّا فِیْ نَصْلٍ اَوْ خُفٍّ اَوْ حَافِرٍ

(مال و دولت یا کسی چیز میں بھی) سبقت لے جانے کی کوشش جائز نہیں، سوائے تیر اندازی یا اونٹ یا گھوڑا دوڑانے میں (ترمذی)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ عَلِمَ الرَّمْیَ ثُمَّ تَرَکَهٗ فَلَیْسَ مِنَّا اَوْ قَدْ عَصٰی

جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اسے چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں یا اس نے نافرمانی کی (مسلم)

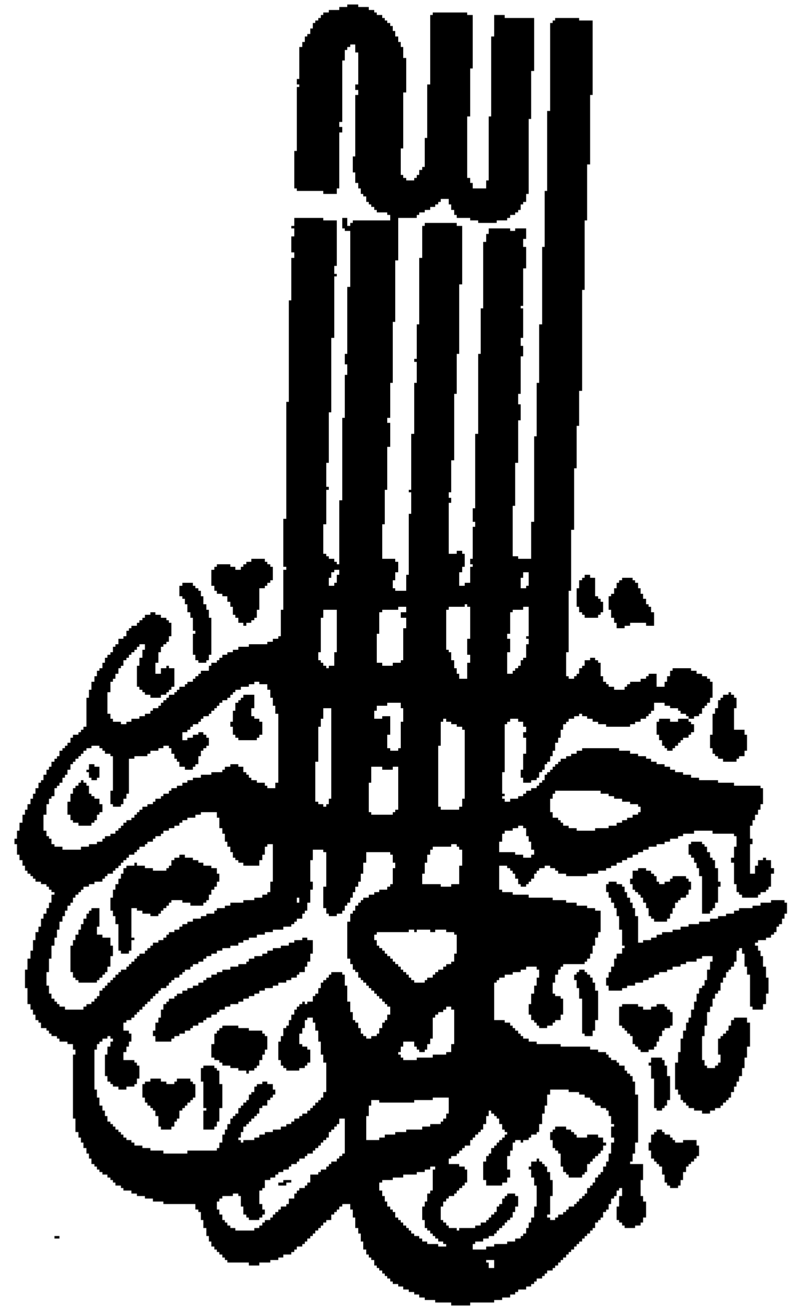
بہر حال قرآن و حدیث سے واضح ہے کہ مؤمن کو ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اس تیاری کے سلسلے میں گھوڑے پالنے اور تیر اندازی وغیرہ کی تربیت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا۔ جس میں نزول دورِ قرآن کی رعایت کی گئی ہے۔ لیکن یہ چیزیں مقصود نہیں بلکہ مقصود تیاری کی ہدایت ہے لہٰذا ہر دور میں مسلمانوں کو اپنے دور کی ضرورت اور رواج کے مطابق تیاری کرنا چاہیے۔ ہمارے دور میں فوجی تربیت حاصل کرنا اس زمانہ کا اسلحہ خریدنا اور اس کو استعمال کرنے کی تربیت حاصل کرنا اسی حکم کی تعمیل ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ امت کے ہر فرد کو جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے مسلم ممالک میں فوجی تربیت لازمی ہونا چاہیے۔ عوام کو اسلحہ رکھنے کی عام اجازت ہونا چاہیے۔ عوام کو عیش و عشرت، زیب و زینت کے سامان پر دولت بہانے کے بجائے اسلحہ کی خریداری کے لئے اپنی آمدنی کا ایک حصہ مخصوص کرنا اور اس سے اسلحہ خریدنا چاہیے۔ کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ ہوگا۔ لیکن شریعت کے اس حکم سے ناجائز فائدہ حاصل نہ کیا جائے۔ یعنی مقدس مقصد کے لئے حاصل کردہ تربیت اور اسلحہ کو دہشت گردی، ذاتی و سیاسی انتقام اور اپنی ہی زمین پر بدامنی پھیلانے کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ یاد رکھئے مجاہد سے اس کی اپنی قوم مطمئن اور پُرسکون ہوتی ہے اور دشمن خوفزدہ۔ اور یہی ہونا چاہیے کہ مجاہدین اپنی قوم کے مال و دولت، ان کی عزت و آبرو ملک کی سرحدوں کے ایسے محافظ بنیں کہ ان کے بھائی پُرامن زندگی بسر کریں۔ آرام کی نیند سوئیں اور ان کی سرحدوں کی طرف کسی کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی مجال نہ ہو۔ اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"سورۃ النسآء"

مقالہ نمبر	آیات نمبر
20	19 تا 28
21	29 تا 33
22	43
23	59
24	71 تا 76
25	94۔101 تا 104
26	135
27	136 تا 143
28	144 تا 149



مَولَایَ صَلِّ وَسَلِّم دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیبِکَ خَیرِ الخَلقِ کُلِّھِمِ
مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الکَونَینِ وَالثَّقَلَینِ
وَالفَرِیقَینِ مِن عُربٍ وَّمِن عَجَمِ

صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم

مقالہ ۲۰

النساء: ۱۹ تا ۲۸

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا
بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ
فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾
وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا
مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾
وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾
وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ
وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ

الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ وَ
رَبَآىٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ٘-فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ
بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ٘-وَ حَلَآىٕلُ اَبْنَآىٕكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْۙ-وَ اَنْ تَجْمَعُوْا
بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَؕ-اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاۙ(۲۳)
وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْۚ-كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْۚ-وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا
وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَؕ-فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ
مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةًؕ-وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ
الْفَرِیْضَةِؕ-اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا(۲۴)
وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ
اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِؕ-وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْؕ-بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍۚ
فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ
مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍۚ-فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ
نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِؕ
ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْكُمْؕ-وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّكُمْؕ-وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ(۲۵)
یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ یَتُوْبَ عَلَیْكُمْؕ-وَ اللّٰهُ
عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ(۲۶)
وَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْكُمْ- وَ یُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا
(النساء:۱۹۔۲۸)
عَظِیْمًا(۲۷)یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْۚ-وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا(۲۸)

کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی اور نہ روکے رکھو
اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لئے
سوا اس صورت کے کہ وہ کھلی
انہیں تاکہ لے جاؤ، کچھ حصہ اس (مہر وغیرہ) کا جو تم نے دیا ہے، انہیں
پھر اگر تم انہیں ناپسند کرو تو
بدکاری کا ارتکاب کریں اور زندگی بسر کرو، اپنی عورت کے ساتھ عمدگی سے
(تمہارے لئے) خیر کثیر،
(صبر کرو) شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو، اور رکھ دی ہو اللہ نے اسی میں
ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال
اور اگر تم ارادہ کرلو، کہ بدلو ایک بیوی پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے
(زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی
سے کوئی چیز، کیا تم لینا چاہتے ہو، اپنا مال، بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کرکے
(تنہائی میں) ایک دوسرے
طرح) اور کیوں کر (واپس) لیتے ہو تم مال کو، حالانکہ مل جل چکے ہو تم
سے نکاح کر چکے تمہارے باپ
سے اور وہ لے چکی ہیں تم سے پختہ وعدہ اور نہ نکاح کرو جن (عورتوں)
بے حیائی اور نفرت کا تھا اور بہت
دادا، مگر جو ہو چکا اس سے پہلے (وہ معاف ہے) بے شک یہ کام بہت

ہی برا طریقہ تھا۔

حرام کردی گئیں ہیں تم پر، تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں، اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں، اور بھانجیاں، اور تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا، اور تمہاری بہنیں رضاعت سے، اور مائیں تمہاری بیویوں کی اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو، اور اگر تم نے صحبت نہ کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر، اور بیویاں تمہارے ان بیٹوں کی، جو تمہاری پشتوں سے ہیں اور (یہ بھی حرام ہے) کہ جمع کرو تم دو بہنوں کو مگر جو گذر چکا (وہ معاف ہے)

بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے، اور (حرام ہیں) خاوندوں والی عورتیں مگر (کافروں کی وہ عورتیں) جو تمہاری ملک میں آ جائیں، فرض کیا ہے اللہ نے (ان احکام کو) تم پر اور حلال کردی گئی ہیں، تمہارے لئے علاوہ ان کے تا کہ تم طلب کرو (ان کو) اپنے مالوں کے ذریعہ پاکدامن بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے،

پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے، ان سے تو دو ان کے مہر، جو مقرر ہیں، اور کوئی گناہ نہیں تم پر جس چیز پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ مقرر کئے ہوئے مہر کے بعد،

بے شک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے اور جو نہ رکھتا ہو تم میں سے اس کی طاقت کہ نکاح کرے آزاد مسلمان عورتوں سے تو وہ نکاح کرے، جو تمہارے قبضہ میں ہیں تمہاری کنیزیں جو مسلمان ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو بعض تمہارا، بعض کی جنس سے۔ تو نکاح کرلو، ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اور دو ان کو مہر، ان کے دستور کے موافق (تا کہ نکاح سے) وہ پاکدامن بن جائیں، نہ زنا کار اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار، اور جب وہ نکاح سے محفوظ ہو جائیں، پھر اگر وہ ارتکاب کریں بدکاری کا، تو ان پر، اس سزا کا نصف ہے، جو آزاد عورتوں کے لئے ہے

یہ (لونڈیوں سے نکاح کی اجازت) اس کیلئے ہے جسے خطرہ ہو، بدکاری میں مبتلا ہونے کا، تم میں سے، اور تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لئے، اور اللہ غفور رحیم ہے، اللہ چاہتا ہے کہ کھول کر بیان کردے (اپنے احکام) تمہارے لئے، اور چلائے تم کو ان (کامیاب لوگوں) کی راہوں پر جو تم سے پہلے گذر چکے، اور اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور اللہ سب کچھ جاننے والا، بڑا دانا۔ ہے اور اللہ چاہتا ہے، کہ اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو پیروی کررہے ہیں اپنی خواہشات کی کہ تم (حق سے) بالکل منہ موڑ لو، اللہ چاہتا ہے، کہ ہلکا کردے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) اور پیدا کیا گیا ہے انسان کمزور۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے

انسان کی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے، اسلام میں اصول اور ہدایات موجود ہیں، کیونکہ یہ خلاق حقیقی کا عطا کردہ

قانون ہے جو انسان کی فطرت اور مزاج کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے، لہٰذا اسی کے عطا کردہ اصول زندگی اپنانے میں کامیابی و کامرانی یقینی ہے۔ جبکہ دنیا والے جو قانون گڑھتے ہیں، وہ ان کی اپنی عقلی صلاحیتوں کے مطابق ہوتے ہیں، جن سے ان کی ذاتی اغراض بھی وابستہ ہوتی ہیں، وہ انسان کے فطری تقاضوں کو نہ جانتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی برسر اقتدار آتا ہے، وہ پہلے قانون کو ختم کر کے نیا قانون پیش کر دیتا ہے، اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہی بہترین قانون ہے، جبکہ انسانوں کے بنائے ہوئے سب قانون ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، سب تیر نشانہ پر لگانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کسی کا بھی تیر نشانہ پر نہیں بیٹھتا، اور انسان ان شکاریوں کے ہاتھوں یا تو تباہ و برباد ہوتا رہتا ہے، اور یا تڑپتے، تڑپتے اپنی زندگی کے دن پورے کر کے چل بستا ہے، لیکن خالق حقیقی کا عطا کردہ قانون اٹل ہے، کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے، ہر دور کے انسانوں کے لئے قابل عمل ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

(الانعام: ۱۱۵)

اور مکمل ہوئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے، نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کو اور وہی ہے سب کچھ سننے والا اور جاننے والا۔

قانون الٰہی مکمل ہے، اس کی بنیاد صدق و عدل پر ہے، نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، بلکہ کوئی اس کو تبدیل بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ سمیع و علیم رب کا قانون ہے، وہ خود اس کی حفاظت فرماتا ہے، اور وہ حفاظت فرمانے پر پوری طرح قادر ہے۔

بہر حال اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہبری و رہنمائی کرتا ہے، جبکہ انسان کی زندگی کا اہم ترین شعبہ اس کی اہلی اور عائلی زندگی ہے، یہ اگر اچھی ہو تو انسان زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب رہتا ہے اور جسے گھر میں سکون میسر نہ آئے، وہ کہیں سکون نہیں پاتا، ہر کام میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، چونکہ جسے اپنے اہل وعیال کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں ہوتا، وہ ذہنی مریض ہو جاتا ہے، شہوات کا شکار ہو جاتا ہے، اب وہ اپنے لئے سکون کی تلاش میں من مانی کرتا ہے، تاجر ہوتا ہے تو مال کی ہوس میں مبتلا ہو کر بد دیانت بن جاتا ہے، حاکم ہوتا ہے تو اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہو کر ظالم و جابر بن جاتا ہے، ملازم ہوتا ہے تو ذہنی آسودگی کے حصول کے لئے کاہل اور کام چور بن جاتا ہے، اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی کوشش میں، رشوت، سود، جوئے وغیرہ کی حرام کمائی میں ڈوب جاتا ہے، غرضیکہ جسے گھر میں سکون میسر نہیں وہ کہیں سکون نہیں پاتا، اُسے کہیں باعزت زندگی میسر نہیں آتی، گھر کا سکون انسان کی اپنی بے راہ روی سے برباد ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے عائلی زندگی کے شعبہ کے لئے بھی ہماری رہنمائی فرمائی، اور کامیابی و کامرانی کی ضمانت دی۔

آیات مذکورہ میں اسی شعبہ سے متعلق بعض احکام دیئے گئے ہیں، چونکہ یہ دس آیات ہیں، ہم قارئین کی آسانی کے لئے مناسب سمجھتے ہیں، کہ ہر آیت پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کریں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا

بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ
فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝

اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لئے کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی اور نہ روکے رکھو انہیں تاکہ لے جاؤ، کچھ حصہ اس (مہر وغیرہ) کا جو تم نے دیا ہے، انہیں سوا اس صورت کے کہ وہ کھلی بدکاری کا ارتکاب کریں اور زندگی بسر کرو، اپنی عورتوں کے ساتھ عمدگی سے پھر اگر تم انہیں ناپسند کرو تو (صبر کرو) شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو، اور رکھ دی ہو اللہ نے اسی میں (تمہارے لئے) خیر کثیر۔

اے ایمان والو:۔ کافروں کی طرح تمہارے لئے حلال نہیں کہ عورتوں کو تم سامان اور مال و دولت کی طرح وراثت کا ایک حصہ سمجھ کر، ان کے وارث بن بیٹھو جیسا کہ آقائے انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل صدیوں سے یہ طریقہ جاری تھا کہ عورت کو جائیداد کی طرح سمجھا جاتا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماں کا ایسے ہی وارث بن بیٹھتا تھا، جیسے وہ باپ کی دوسری متروکہ چیزوں کا وارث ہوتا تھا، پھر وہ اگر چاہتا تو اپنی ماں سے خود جبراً نکاح کر لیتا تھا، یا اس کو اپنے قبضہ میں رکھتا تھا، دوسرا نکاح نہ کرنے دیتا تاکہ اس کے شوہر یا اس کے میکے والوں کی دی ہوئی اس کی ذاتی دولت گھر سے باہر نہ جانے پائے اور عورت کے مرنے کے بعد اس کا بھی یہی وارث ہو جائے اور اگر ماں کے پاس دولت نہ ہوتی تو وہ اپنی مرضی سے جس سے چاہتا اس کا نکاح کر دیتا تھا اور بطور مہر بھاری رقم وصول کر لیتا تھا، غرضیکہ عورت کو اپنی ذات پر کوئی حق حاصل نہ تھا، یہ بیہودہ غیر انسانی رسم صرف قبائل میں ہی نہ تھی بلکہ اس دور میں جو قومیں مہذب کہلاتی تھیں، مثلاً یونان و روم کے لوگ، ان میں بھی یہی رواج تھا۔

عورت وراثت نہیں

اسلام، جس کا قانون صدق و عدل پر مبنی ہے، اس ظالمانہ رواج کا کس طرح متحمل ہو سکتا تھا لہٰذا واضح حکم دیا گیا کہ عورت وراثت نہیں، وہ شوہر کے مرجانے کے بعد آزاد ہے، اپنی دولت کی خود مالک ہے، اپنے نفس کی خود مالک ہے، جیسے چاہے دولت کو استعمال کرے اور جس سے چاہے نکاح کرے، بیٹا اسے اپنی منکوحہ نہیں بنا سکتا نہ جبراً اور نہ عورت کی رضا و رغبت سے کہ پہلی صورت ظلم کی اور دوسری صورت بے حیائی اور بے غیرتی کی ہے اور اسلام دونوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اور نہ ہی یہ اجازت ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو نہ تو آباد کرے اور نہ ہی طلاق دے کر آزاد کرے کہ زمانہ جاہلیت میں بہت لوگ اپنی دولت مند بیویوں کے ساتھ یہ حرکت کرتے تھے تاکہ وہ ان کے مال کے وارث بن سکیں، یا تو اس طرح کہ عورت اسی حال میں مرجائے اور یا مجبور ہو کر، شوہر کو بھاری رقم ادا کرے اور آزادی حاصل کرے، کبھی طلاق تو دیدی جاتی تھی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مطلقہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی، یہ عورتوں پر صریح ظلم تھا، اسلام نے عورتوں کو اس سے بھی نجات دلائی، ہاں ایک صورت ہے وہ بھی نہایت منصفانہ، جس کو شریعت میں خُلع کہا جاتا ہے کہ عورت فاحشہ مبینہ ہو، یعنی یا تو مرد کی نافرمان، بدزبان اور بداخلاق ہو، یا کسی غیر مرد سے اس کا تعلق ہو، اس صورت میں اجازت ہے کہ شوہر اس کو علیحدہ کر دے اور اگر وہ طلاق طلب کرے تو شوہر اس سے رقم لے کر طلاق دیدے، لیکن اس صورت میں بھی ظلم کی اجازت نہیں بلکہ رقم کا

شریعت نے تعیین کیا ہے کہ طلاق کے لئے شوہر عورت سے صرف اتنی رقم کا مطالبہ کرسکتا ہے جتنی بطور مہر اس نے عورت کو دی تھی اور اگر مہر کی رقم ادا نہ کی تھی جیسا کہ آج کل عام رواج ہے، جو عورت کی رضا کی صورت میں جائز ہے، تو شوہر صرف عورت سے مہر معاف کر دینے کا مطالبہ کرسکتا ہے، یعنی وہ کہہ سکتا ہے کہ تم اپنا مہر معاف کر دو، جو میرے ذمہ ہے، تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔

نیز ہمارا دین رحمت، ہماری عائلی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے واضح ہدایت دیتا ہے کہ بیوی کے ساتھ معروف برتاؤ کرو، یعنی اس کا نان ونفقہ اپنی استطاعت کے مطابق، اس کے مطالبہ کے بغیر خوشی کے ساتھ دیا کرو، اس سے اظہار ہمدردی ومحبت کیا کرو، اس کی محبت، اطاعت اور وفاداری حاصل کرنے کے لئے، اس کی تعریف کیا کرو کیونکہ عورت فطرتاً تعریف پسند ہوتی ہے، بالخصوص اپنے حسن اور اپنے لباس کی تعریف سننے کی اس میں بے حد خواہش رہتی ہے، بہر حال ''معروف'' کا لفظ نہایت وسیع ہے، جس میں ہر وہ جائز طریقہ شامل ہے جو عورت کی خوشنودی اور گھر کے سکون کا ذریعہ ہو، اس کو اختیار کرنا چاہئے اس کی وضاحت حضور علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ سے حاصل کیجئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی مکرم علیہ السلام نے فرمایا، بیشک عورت پسلی سے پیدا کی گئی، لہٰذا تمہارے لئے کبھی بالکل سیدھی نہیں ہوسکتی۔

فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ وَّاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا

پس اگر تم اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس سے اور اس کی کجی دونوں سے فائدہ حاصل کرو اگر تم اسے بالکل سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ ڈالو گے اور اس کا توڑنا طلاق ہے (مسلم)

گھر کو پرسکون بنانے کے لئے کیسی اچھی تعلیم دی جارہی ہے کہ عورت کی فطرت کو سمجھنا چاہئے اس کی فطرت یہ ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ ٹیڑھا پن ضرور ہوتا ہے کیونکہ وہ پیدا ہی پسلی سے کی گئی، اس کا اثر ختم نہیں ہوا ہے، ہر عورت میں موجود ہے، اگر تم اس کو بالکل سیدھا کرنا چاہو تو یہ ناممکن ہے۔ پسلی کو سیدھا کرو گے تو سیدھی نہ ہوگی، ہاں ٹوٹ جائے گی، عورت کا بھی یہی حال ہے بالکل سیدھی تو ہونے سے رہی، ٹوٹ سکتی ہے یعنی تم مجبور ہو کر اسے طلاق دے سکتے ہو پس مؤمن کو چاہئے کہ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ذہن میں رکھے اور بیوی کی بُری عادتوں کو ختم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ، اپنے اندر حلم اور برداشت کا مادہ پیدا کرے اور اس کی کجی کو برداشت کرے، اس کے سوا گھر میں سکون کی کوئی صورت نہیں، رہی طلاق اور دوسری عورت سے نکاح، یہ تو نہایت ہی نامعقول علاج ہے کیونکہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر عورت میں کجی بتائی ہے، اگر کسی نے بیوی کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر لیا، تو عین ممکن ہے کہ اس میں پہلی سے زیادہ کجی ہو، تو بہتر ہے کہ طلاق دے کر مزید اُلجھنیں پیدا کرنے کی بجائے معلّمِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کیا جائے یعنی عورت کی کجی کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کی جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی راوی ہیں کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لَا يَضُرَّكَ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقاً رَضِىَ مِنْهَا اٰخَرَ

کوئی مؤمن کسی مؤمنہ بیوی کو دشمن نہ جانے، اگر اس کی ایک عادت ناپسند ہے تو دوسری سے خوش بھی ہوگا۔ (مسلم)

کیسا پیارا ارشاد ہے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا اکثر شوہر و بیوی میں لڑائی جھگڑے اسی لئے ہوتے ہیں کہ شوہر بیوی کی بُری عادت کو برداشت نہیں کر پاتا اور لڑنے لگتا ہے، مارنے لگتا ہے، طلاق تک نوبت آجاتی ہے لیکن اس کو بیوی کی اچھائیوں اور خوبیوں کا احساس نہیں رہتا جبکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کسی میں صرف عیب ہی عیب ہوں کوئی کمال اور اچھائی نہ ہو، مثلاً ایک عورت کھانا اچھا پکاتی لیکن کپڑے سینا نہیں جانتی تو اس کے شوہر کو چاہئے کہ اس کے اچھے کھانے کھا کر خوش ہو اور کوشش کرے کہ اسے کپڑا سینا بھی آجائے اور اگر نہیں آتا اور وہ سیکھنا بھی نہیں چاہتی تو اس کام کے لئے کوئی دوسرا انتظام کرے، غرضیکہ گھر کا سکون چاہئے تو غیظ و غضب سے نہیں صبر و برداشت سے ہی حاصل ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَاناً اَحْسَنُهُمْ خُلُقاً وَّخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ

مسلمانوں میں کامل ایمان والے وہ ہیں، جو اخلاق کے اچھے ہیں اور تم میں سے اچھے وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے ہیں۔ (ابوداؤد)

ہم طویل عبادت کو کمال ایمان کا ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ ایمان بخشنے والے آقا ﷺ حسن اخلاق کو ایمان کی تکمیل کا ذریعہ قرار دے رہے ہیں اس میں بھی وضاحت فرماتے ہیں کہ صرف دوسروں سے اخلاق کے ساتھ پیش آنے والا، اچھا نہیں ہوسکتا اچھا تو وہ ہے، با اخلاق تو وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہو اور بیوی اس کے حسن اخلاق کی گواہی دے۔

میری ماؤں، اپنی بیویوں کے ساتھ بھی حضور علیہ السلام کے حسن سلوک کی ایک جھلک ملاحظہ ہو کہ اس کے بغیر مضمون کا یہ حصہ نامکمل و تشنہ ہی رہے گا۔

ایک مرتبہ، اتفاق سے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضور علیہ السلام سے قدرے اونچی آواز میں بات کر رہی تھیں کہ اچانک ان کے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آ گئے، آپ حضور علیہ السلام کی آڑ میں چھپ گئیں، حضرت ابوبکرؓ یہ کہتے ہوئے واپس باہر تشریف لے گئے کہ بیوقوف اللہ کے رسول ﷺ کا ادب نہیں کرتی، حضور علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا" عائشہ میں نے تم کو بچالیا" حضرت عائشہؓ نے شرم سے گردن نیچی کر لی۔

میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ ازواج تھیں، بیک وقت نو تھیں، سیرت مقدسہ کی کتابیں گواہ ہیں کہ کبھی آپ نے نہ کسی بیوی کو مارا، نہ کسی پر غصہ کیا، ہمیشہ ان سے مسکرا کر گفتگو فرماتے تھے، اُن کی دلجوئی کرتے تھے، گھر میں تشریف لاتے، تو گھر کے کام میں تعاون فرماتے تھے جبکہ دنیوی اعتبار سے آپ نے اپنی ازواج مطہرات کو کوئی عیش و عشرت کا کبھی سامان مہیا کیا، نہ ان کے پاس اچھے کپڑے تھے، نہ زیب و زینت سے آراستہ مکانات، نہ زیورات بلکہ اچھی غذا تک مہیا نہ تھی، اس کے باوجود آپ کی ازواج آپ سے خوش اور آپ ان سے مطمئن تھے، گھر میں کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہوا، صرف اور صرف اس لئے

کے اللہ کے ارشاد "عاشروھن بالمعروف" پر آپ کا عمل تھا اللہ ہمیں بھی اپنے گھروں کو پُرسکون بنانے کے لئے صبر و حلم کی نعمت عطا فرمائے آمین۔

اگر بیوی پسند نہ ہو، اگر بیوی کو اس کے کسی عیب کی وجہ سے تم ناپسند کرتے ہو تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اس کو طلاق دے دی جائے اور دوسری بیوی تلاش کی جائے۔ عائلی زندگی کا سکون اسی میں ہے کہ جسے رفیقہ حیات بنایا ہے اس کو ساری زندگی رفاقت میں رکھا جائے کہ رفاقت کا عرصہ جتنا طویل ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی محبت بڑھتی ہے اور گھریلو حالات پُرسکون ہوتے ہیں۔ دوسری بیوی کر لینے کے بعد زندگی از سر نو شروع ہوتی ہے، جتنے برس گزرے وہ بیکار ہو گئے، اب پھر دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہونے میں اپنا وقت صرف کریں گے، نیز یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ دوسری بیوی میں کوئی عیب نہ ہوگا، ممکن ہے جو عیب پہلی بیوی میں تھا وہ دوسری میں نہ ہو لیکن دوسرے عیب تو ہو سکتے ہیں شاید پہلی سے زیادہ اس میں عیب ہوں، پس ایک بیوی سے نالاں ہو کر دوسری بیوی لانا حصولِ اطمینان کی ضمانت نہیں، اس کی ضمانت تو قرآن کریم کی تعلیم میں ہے کہ کوشش کرو کہ بیوی کی جو باتیں تمہیں ناگوار ہے وہ کسی طرح ختم ہو جائے اور یہ سوچ کر اسے برداشت کرتے رہو کہ ممکن ہے کہ اللہ نے میری کوئی بھلائی اسی سے وابستہ کی ہو اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو میں اس بھلائی سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔

مشاہدہ یہی ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کی بدزبانی، کاہلی، بے نمازی وغیرہ ہونے سے تنگ ہوتا ہے، تاہم اعتراف کرتا ہے کہ گھر میں اس کا قدم آنے کے بعد مالی خوشحالی ملی، مسرت و شادمانی ملی، اولاد صالح ملی، وغیرہ وغیرہ، مختصر یہ کہ اللہ نے جس کے ساتھ جوڑ ملایا ہے، اس کو توڑا، اور چھوڑا نہ جائے کہ اللہ ہی اپنی حکمتوں کو بہتر جانتا ہے، بندے کو اس کا فیصلہ قبول کرنا اور اسی پر صبر و شکر بجالانا چاہئے۔

وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾

وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

اور اگر تم ارادہ کر لو کہ بدلو ایک بیوی کی پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز، کیا تم لینا چاہتے ہو، اپنا مال، بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے (زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی طرح) اور کیونکر (واپس) لیتے ہو تم مال کو، حالانکہ مل جل چکے ہو تم (تنہائی میں) ایک دوسرے سے اور وہ لے چکی ہیں تم سے پختہ وعدہ

طلاق بطریقہ سراحا جمیل

اور تم بلا قصور اپنی بیوی کو چھوڑنا چاہتے ہو، تو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی طرح یہ بیہودہ حرکت نہ کرو کہ تم اس پر کوئی تہمت لگا کر اسے مجبور کر دو کہ شرمندہ ہو کر تم سے طلاق کا مطالبہ کرے اور تم اپنی چال بازی میں کامیاب ہو جاؤ کہ اب اس سے طلاق کے بدلے دولت کا مطالبہ کرو اور جب وہ تمہارا مطالبہ پورا کر دے، تو تم اس کو آزاد کر دو۔ تم تو اس نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے غلام ہو، جس نے انسان کو انسانیت کے اصول سکھائے اور جانوروں جیسی زندگی سے نجات دلائی، مکر و فریب اور ظلم وستم کا خاتمہ کیا، تمہیں تو اللہ کی رضا کے لئے، اپنے آقا کی تعلیمات کا نمونہ بننا چاہئے، شرافت کا پیکر ہونا چاہئے، دولت کے متوالے ہو کر کسی کی عزت سے نہ کھیلو، پس تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ اگر تم نے بیوی کو چھوڑنے اور دوسری بیوی لانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے، تو تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن انسانیت اور شرافت کے ساتھ کہ بیوی کو آزاد کر دو، نہ اس پر کوئی تہمت لگاؤ، نہ ہی اس سے مال کا مطالبہ کرو، چاہے تم نے اس کو نقد، جائیداد، زیورات، کپڑوں وغیرہ کی صورت میں کتنی ہی دولت دی ہو، اللہ اپنے حکم کی تعمیل کی تمہیں جزا بھی دے گا اور دولت بھی کہ وہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

جب ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ السلام سے آپ ﷺ کی ازواج مطہرات نے کچھ سامانِ آسائش کا مطالبہ فرمایا، تو آپ ﷺ کو اپنی ازواج کے مطالبہ پر ناگواری ہوئی، اللہ نے ارشاد فرمایا ''اے پیارے محبوب آپ اپنی ازواج سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیا کا عیش آرام پسند کرتی ہو تو میں تمہیں دے کر بڑی خوبصورتی اور اچھی طرح رخصت کئے دیتا ہوں، اس آیت مبارکہ کا جملہ

وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا

اور پھر میں تمہیں رخصت کردوں بڑی خوبصورتی کے ساتھ

قابل غور ہے، نبی کو طلاق دینے کی اجازت کے ساتھ، اچھے برتاؤ کا بھی حکم دیا جا رہا ہے، جس سے تمہیں یہ حکم دینا ہے کہ طلاق کا فیصلہ کر لینے کی صورت میں دل آزاری نہ کرو بلکہ ''سراحا جمیلا'' ملحوظ رکھو، عورت کو چھوڑ دے کر رخصت کرو، اس سے لینے کی تدبیریں نہ کرو، ذرا سوچو تو صحیح کہ اس نے تمہارے لئے کتنی بڑی قربانی دی کہ وہ تمہارے ساتھ خلوت صحیحہ کر چکی ہے، اپنا جسم تمہارے سپرد کر چکی ہے اور اس محبت والفت کے ماحول میں اس نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ تم بھی اس سے بیوفائی نہ کرو گے، اگر تم اس سے وعدہ شکنی کر کے اس کا دل توڑ رہے ہو تو مزید کوئی مکاری کر کے اس کو عزت و دولت سے تو محروم نہ کرو اور اگر تم اس پر کوئی تہمت نہ بھی لگاؤ، تب بھی اس سے کوئی مالی مطالبہ نہ کرنا کہ اس صورت میں بھی اسے مالی نقصان تو ہو گا ہی لیکن اس کی عزت بھی محفوظ نہ رہے گی کہ اس کے گھر والے یا جنہیں بھی خبر ہو گی، یہی تو کہیں گے کہ اس نے ضرور کوئی نازیبا حرکت کی ہے، جبھی تو دولت دے کر شوہر سے آزادی حاصل کی ہے، بس صرف خلع یعنی مہر واپس لے کر طلاق دینے کی صورت وہی ہے جو اوپر ذکر چکی ہے، اگر عورت ''فاحشہ مبینہ'' میں مبتلا ہوئی ہو، ایسی صورت میں مرد کو اپنا ادا کردہ مہر واپس لینے، یا اپنے ذمہ واجب مہر معاف کرانے کا حق پہنچتا ہے کیونکہ عورت خود ایسی حرکت میں مبتلا ہوئی ہے جس کے سبب وہ کسی ہمدردی کی مستحق نہیں رہی، یہ عدل وانصاف پر مبنی ہے یہ ادین'' فالحمد للّٰہ رب العلمین''

طلاق سے متعلق یہ ہدایت اسلامی قانون کی رحمت کا ایک حصہ ہے، جس نے عورت کو نہ صرف مالی نقصان سے بچایا، بلکہ اس کی عزت وآبرو کی بھی حفاظت کی، ذرا غور کیجئے کہ اگر ایک ظالم مرد، اپنی بیوی پر تہمت لگا کر اسے علیحدہ کر دیتا ہے اور طلاق دینے پر مال لئے بغیر آمادہ نہیں ہوتا، تو عورت اپنی آزادی کے لئے اسے دولت دے کر مالی مشکلات میں مبتلا ہوئی، اور جو تہمت اس پر لگ چکی، اس کے سبب کوئی دوسرا مرد اسے قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا، نتیجۃً یہ بیچاری بیوہ اور

دونوں کی خواہشات کا شکار ہوتی اور مجبور ہو کر یا تو بدکاری کی راہ لیتی اور یا تڑپ تڑپ کر مر جاتی، جیسا کہ آج کل ان ممالک میں عام ہے جہاں عورت کی آزادی کے نعرے لگائے جاتے ہیں جنہیں جاہل تہذیب وتمدن کا گہوارہ سمجھتے ہیں اور بسیار کوشش کے بعد ان ممالک میں آباد ہو کر وہ اپنی تہذیب، اپنے تمدن سے محروم ہو جاتے اور جانوروں جیسی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے زیادہ عورت کی حمایت، اس کی عزت وآبرو کی حفاظت دنیا کا کوئی قانون نہ کر سکا اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنے خزانہ رحمت سے جتنا مالا مال کیا، کوئی نہ کر سکا، پس میری بہنوں کو ناز کرنا چاہئے کہ اللہ نے انہیں دولت اسلام سے نوازا اور اس پر اظہار شکر کے لئے شریعت مطہرہ کا پابند ہونا چاہئے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝

اور نہ نکاح کرو جن (عورتوں) سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا مگر جو ہو چکا اس سے پہلے (وہ معاف ہے) بے شک یہ کام بہت بے حیائی اور نفرت کا تھا اور بہت ہی برا طریقہ تھا۔

ماں سے حرمتِ نکاح

باپ، دادا، یا نانا کی منکوحہ، جو تمہاری سوتیلی مائیں تھیں، ان کے مر جانے یا طلاق دے دینے کے بعد بھی تمہارے لئے حرام ہیں کہ ماں کے تقدس کا یہ تقاضا ہے کہ جب وہ ماں بن گئی تو ہمیشہ ماں ہی رہے گی، چاہے اس نے تمہیں جنم نہ دیا ہو، اسے بیوی بنا لینا نہایت بے شرمی اور بے حیائی کا عمل ہے، وہ مذہب جو حیاء وشرم کو ایمان کا جزو قرار دیتا ہے، دیگر بے حیائی کے کاموں کی طرح اس بے حیائی کی بھی اجازت نہیں دے سکتا، زمانہ جاہلیت کے لوگ چونکہ زندگی کے اصولوں سے آزاد تھے ان کے پاس کوئی ضابطہ حیات نہ تھا، انہیں حلال وحرام کا کوئی امتیاز نہ تھا وہ تو اپنی خواہشات کے غلام تھے، ان کا ہر کام اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے ہوتا تھا، لہٰذا ان میں درندگی تھی، بے حیائی وبے شرمی تھی، جس کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنی سوتیلی ماؤں تک کو اپنی ہوس کا نوالہ سمجھتے تھے اور ان سے نکاح کر لیتے تھے، اہل ایمان خوش نصیب ہیں کہ وہ ایسے نبی کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو گئے، جس نے انہیں خالق حقیقی کے احکام پہنچائے، پس ان احکام کے پہنچانے کے بعد تم نے ایسا کیا تو گویا تم عذاب الٰہی کو دعوت دو گے اور جہنم کی راہ لو گے، ہاں اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، وہ رب رحیم وکریم معاف فرماتا ہے، اب جس کے پاس ایسی عورت ہے وہ اس سے علیحدہ ہو جائے اور اس سے چھینا ہوا تقدس اسے واپس کر دے۔

بحمد اللہ مسلمان تو، شمع اسلام روشن ہوتے ہی اس بے شرمی کے عمل سے محفوظ ہیں اس دور میں بھی مسلمان کے اندر بہر حال اتنی حیاء وشرم موجود ہے کہ وہ ایسی حرکت نہیں کرتا، لیکن وہ مسلمان بہر حال قابل افسوس ہیں، جو ایسی حرکت کرنے والے غیر مسلموں کو، اپنے سے بہتر سمجھتے اور ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہوتے ہیں، عزیزو! وہ قوم کسی طرح بھی قابل احترام نہیں ہو سکتی، جس کے یہاں نہ صرف کھانے پینے میں حلال وحرام کا تصور نہ ہو، بلکہ وہ اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی ماں، بہن، بیٹی تک میں امتیاز نہ کرتے ہوں بلکہ اب تو ہوس نفس کا حال یہ ہے کہ عورت کے لئے مرد اور مرد کے لئے عورت کی شرط بھی نہ رہی بلکہ ہم جنسی کا ذوقِ خبیث زور پکڑ رہا ہے اور ہم جنس جوڑوں کو قانونی حیثیت دیدی گئی ہے اور

انہیں وہی قانونی مراعات اور تحفظ حاصل ہے جو مرد وعورت کے جوڑے کو حاصل ہوتا ہے، زمانہ جاہلیت میں بھی یہ بدفعلی موجود تھی لیکن نہ اس کو اچھا سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی اسے شوہر و بیوی کی حیثیت دی جاتی تھی، علم وتہذیب کے دعویدار کس قدر گھناؤنے ہیں، الامان، الحفیظ۔

اسلام ان فواحش اور جانوروں جیسی حرکات کی اجازت نہیں دیتا، اس نے تو اپنے ماننے والوں کو تہذیب وتمدن کا وہ حسن بخشا ہے جو کسی قوم کو نصیب نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝ (النحل: ۹۰)

بیشک اللہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو، بھلائی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے، برے کاموں سے اور سرکشی سے اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔

یہ اصول اسلامی قوانین کی بنیاد ہیں اسی لئے اسلام نے جس طرح کھانے، پینے اور زندگی کے دیگر امور میں حلال و حرام کا امتیاز پیدا کیا اسی طرح خواہش نفس کی تکمیل یا افزائش نسل کا مقصد حاصل کرنے کے لئے بھی واضح ہدایات دیں، اولاً تو جنسی خواہش کو ہم جنس سے پورا کرنے کی سخت ممانعت فرمائی، اس کے لئے صرف عورت کو مخصوص کیا گیا اور عورت میں بھی ہر عورت سے اس عمل کی اجازت نہ دی گئی بلکہ جن عورتوں کا تقدس اور احترام اس عمل سے مانع ہے ان کو مردوں کے لئے حرام قرار دیا گیا، اب آیئے ان آیات پر گفتگو کریں، جن میں محرمات کا تفصیلی ذکر ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۟ۙ

حرام کر دی گئیں ہیں تم پر تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری بہنیں رضاعت سے اور مائیں تمہاری بیویوں کی اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پار رہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو اور اگر تم نے صحبت نہ کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر اور بیویاں تمہارے ان بیٹوں کی، جو تمہاری پشتوں سے ہیں اور (یہ بھی حرام ہے) کہ جمع کرو تم دو بہنوں کو مگر جو گزر چکا (وہ معاف ہے) بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔

اے ایمان والو:۔ تم پر جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے، ان کی حرمت تین قسم کی ہے

حرمت نسب، حرمت رضاعت، حرمت مصاہرت

حرمت نسب

یعنی وہ عورتیں جن سے تمہارا رشتہ، عزت و احترام کا رشتہ ہے، تقدس کا رشتہ ہے، جس کا تقاضا ہے کہ ان کو بیوی کی حیثیت نہ دی جائے بلکہ احترام کے ساتھ ان سے محبت کی جائے، ان کی خدمت کی جائے، یہ سات قسم کی عورتیں ہیں۔

1۔ ماں، سگی ہو یا سوتیلی، اس میں دادی، نانی اور اس سے اوپر تک سب شامل ہیں اور وہ بھی جن کو خصوصی طور پر قرآن کریم نے ماں قرار دیا ہے یعنی نبی مکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی ازواج مطہرات کہ ارشاد ہوا:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب:۶)

نبی (کریم علیہ الصلوۃ والسلام) مومنوں کی جانوں سے زیادہ ان کے قریب ہیں اور ان کی بیویاں ان (مومنین) کی مائیں ہیں۔

کہ مسلمانوں پر نبی ﷺ کی بیویوں کا احترام واجب ہے، جس کا مقتضی ہے کہ ان سے نکاح بھی حرام ہو، تاہم ان کے لئے شرعی احکام وہی ہیں، جو دوسری عورتوں کے لئے ہیں مثلاً پردے وغیرہ کے احکام

اس قسم کی حرمت میں وہ عورتیں شامل نہیں جن سے ظہار کیا جائے، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ کسی عورت کو ماں کی طرح یا ماں کہہ دیا تو اس سے نکاح حرام سمجھا جاتا تھا، شریعت مطہرہ میں نہ ماں کہنے سے کوئی عورت ماں بن جاتی ہے، نہ بیٹی کہنے سے بیٹی اور نہ ہی کوئی بچہ بیٹا کہنے سے بیٹا ہو سکتا ہے۔ ظہار سے طلاق بھی واقع نہیں ہوتی، ہاں شریعت نے اس کو غلط بات قرار دیا ہے، جس سے روکنے کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے یعنی اس کے کسی حصہ کو ماں جیسا کہہ دے یا اسے اپنی ماں کہہ دے تو اسے کفارہ ادا کرنا ہوگا نیز جس عورت سے باپ نے العیاذ باللہ زنا کیا وہ بھی حرام ہے۔

2۔ بیٹی، اس میں پوتی، نواسی، نیچے کی سب عورتیں شامل ہیں۔

3۔ بہن سگی ہو یا سوتیلی۔

4۔ پھوپھی، اپنی ہو یا باپ، ماں، وغیرہ کی ہوں سگی ہو یا سوتیلی۔

5۔ خالہ، اپنی ہو یا باپ، ماں، وغیرہ کی ہوں سگی ہو یا سوتیلی۔

6۔ بھتیجی، یعنی بھائی کی بیٹی بشمول اس کی اولاد کے۔

7۔ بھانجی، یعنی بہن کی بیٹی بشمول اس کی اولاد کے۔

جن عورتوں سے یہ رشتے العیاذ باللہ زنا سے قائم ہوئے، وہ بھی حرام ہیں۔

حرمت رضاعت

یعنی جن عورتوں سے کسی عورت کا دودھ پینے کی وجہ سے رشتہ قائم ہوا وہ بھی حرام ہیں، یعنی ساتوں رشتے کی عورتیں

جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہ رضاعت کی نسبت سے بھی حرام ہوں گی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔

يَحْرِمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يُحْرِمُ مِنَ النَّسَبِ

رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ (بخاری شریف)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حرمت رضاعت کسی عورت کا دودھ پینے سے اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے جبکہ دودھ، دودھ پینے کی مدت میں پیا گیا ہو، جسے مدت رضاعت کہا جاتا ہے، جو امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک ڈھائی سال ہے، اس عمر کے اندر چاہے ایک ہی مرتبہ بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو، رضاعت ثابت ہو جائے گی لیکن اس عمر کے بعد پیا تو رضاعت کا رشتہ قائم نہ ہوگا، یہ رشتہ بھی ایسا ہی مقدس ہے جیسا نسبی رشتہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل مبارک سے واضح ہے کہ آپ اپنی رضاعی ماں حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کا احترام نسبی ماں ہی کی طرح کرتے تھے، لہٰذا اس نسبت سے قائم شدہ رشتوں کے شرعی احکام بالخصوص نکاح کے سلسلے میں وہی ہیں جو نسبی رشتوں کے لئے ہیں، مثلاً:

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میرے رضاعی چچا آئے اور مجھ سے ملنے کی اجازت چاہی، تو میں نے انہیں منع کر دیا کہ جب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت نہ کرلوں، اجازت نہیں دے سکتی۔ جب آپ تشریف لائے تو میں نے پوچھا، آپ نے فرمایا وہ تو تمہارے چچا ہیں، انہیں اجازت دے دینا چاہئے تھی میں نے عرض کیا، یارسول اللہ، مجھے عورت نے دودھ پلایا تھا، کسی مرد نے تو نہیں پلایا، آپ نے فرمایا، وہ تمہارے چچا ہیں وہ تمہارے پاس آسکتے ہیں اور یہ واقعہ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد کا ہے۔

حرمت مصاہرت

یعنی وہ عورتیں جو تعلق نکاح سے حرام ہوئی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ عورتیں جو ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

بیوی کی ماں (ساس) بیوی کی بیٹی، جو پہلے شوہر سے ہو لیکن یہ اس صورت میں حرام ہوں گی جب بیوی سے صحبت کی ہو، لیکن اگر صحبت سے پہلے ہی منکوحہ مرگئی یا اسے طلاق دے دی، تو اس کی بیٹی سے نکاح جائز ہے، بیٹے کی بیوی (بہو) یہی حکم پوتوں اور نواسوں کی بیویوں کا ہے۔

دوسری وہ عورتیں ہیں جو اس وقت تک حرام ہیں، جب تک بیوی نکاح میں ہے لیکن بیوی کے مر جانے یا اسے طلاق دے دینے کے بعد وہ حلال ہو جاتی ہیں، وہ یہ ہیں، بیوی کی بہن (سالی) پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی۔

حرمت مصاہرت کی حکمت حیا و شرم کا تحفظ ہے مثلاً بیوی کے ہوتے ہوئے اس کی بہن کو بھی بیوی بنا لینا کس قدر بے شرمی کا عمل معلوم ہوتا ہے، یہی صورت دوسرے رشتوں میں بھی ہے۔

اہل ایمان کو ہدایت کی گئی کہ اب دور جاہلیت جیسا کوئی عمل نہ دہرایا جائے، یہ تم پر ہمارا کرم ہے کہ کفر کی حالت میں تم سے جو کچھ ہوا وہ ہم نے معاف کر دیا لیکن مومن ہونے کے بعد وہ عمل جاری نہ رہے گا، یعنی جس کے نکاح میں کوئی ایسی عورت آچکی ہے، جو محرمات میں سے ہے، اسے چاہئے کہ اب وہ اس کو علیحدہ کر دے۔

ضحاک فیروز دیلمی نے اپنے باپ کی روایت بیان کی کہ جب میں مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں دو سگی بہنیں تھیں، میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا تو آپ نے فرمایا ان میں سے ایک کو چن لو (یعنی دوسری کو طلاق دیدو) بہر حال جو ہو چکا سو ہو چکا، نہ وہ جاری رکھو اور نہ آئندہ کرو، ماضی کا عمل معاف کہ جس اللہ پر تم ایمان لائے ہو، وہ ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةًؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا۝

اور (حرام ہیں) خاوندوں والی عورتیں مگر (کافروں کی وہ عورتیں) جو تمہاری ملک میں آجائیں، فرض کیا ہے اللہ نے (ان احکام کو) تم پر اور حلال کر دی گئی ہیں، تمہارے لئے علاوہ ان کے تا کہ تم طلب کرو (ان کو) اپنے مالوں کے ذریعہ پاک دامن بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے، ان سے تو دو ان کے مہر، جو مقرر ہیں اور کوئی گناہ نہیں تم پر جس چیز پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ مقرر کئے ہوئے مہر کے بعد، بے شک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔

جن عورتوں کے شوہر لاپتہ ہوں

محرمات مذکورہ کے علاوہ وہ عورتیں بھی حرام ہیں، جن کے خاوند بقید حیات ہوں اور انہوں نے طلاق دے کر ان عورتوں کو آزاد نہ کیا ہو، چاہے ان کا پتہ ہو یا نہ ہو، بہر حال انہیں دوسرے نکاح کا حق حاصل نہیں، جب تک طلاق نہ ہو جائے، ایسی عورت سے نکاح کرنا حرام ہے، اور اگر کر لیا تو ظاہر ہے کہ حرام کاری ہوتی رہے گی۔

اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ طلاق دینے کا حق صرف مرد کو حاصل ہے، عورت کو نہیں، موجودہ دور میں عورتیں اللہ اور اس کے رسول کے اس حکم کو العیاذ باللہ اپنی حق تلفی یا اپنے اوپر ظلم تصور کرتی ہیں، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں، یہ حکم بھی شریعت مطہرہ کے دیگر احکام کی طرح عین فطرت کے مطابق ہے اور انسان کی فطرت کو اس کے خالق حقیقی اللہ رب العزت سے بہتر کوئی نہیں جانتا اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین صرف اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ وہ غیر فطری ہوتے ہیں، قانون ساز انسان کی فطرت سے ناواقف ہوتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کے عطا کردہ قوانین فطری ہیں، جن کو بے چون و چرا وہ انسان قبول کرتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، ایمان جتنا قوی ہوتا ہے، اتنا ہی قوانین پر اطمینان ہوتا ہے اور ان پر عمل کرنا بھی آسان ہوتا ہے، طلاق کا قانون عورتوں کی فطرت کے عین مطابق ہے کہ عورت چاہے کتنا ہی علم حاصل کر لے کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے لیکن اس کی دو فطری کمزوریاں ختم نہیں ہوتیں، ایک اس کا ناقص العقل ہونا، اسی لئے وہ مرد کی طرح دور اندیش اور دور نظر نہیں ہوتی، اس کے مستقبل کے پروگرام بہت ہی قریبی وقت تک کے لئے محدود ہوتے ہیں، دوسرا عورت نہایت ہی مغلوب الغضب ہوتی ہے کہ اسے غصہ بہت جلد آتا ہے اور غصہ کی

حالت میں اس کے سوچنے سمجھنے تک کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایسے فیصلے کر بیٹھتی ہے جس پر وہ بہت جلد نادم و شرمندہ ہونے لگتی ہے، طلاق کا فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں اس سے صرف دو افراد کی زندگی متاثر نہیں ہوتی بلکہ دو خاندانوں پر اثر پڑتا ہے، اور اگر بچے بھی موجود ہوں تو سب سے زیادہ وہ متاثر ہوتے ہیں اور ہمہ قسم کے انتظام مہیا کئے جانے کے باوجود ان کی تربیت ایسے انداز پر نہیں ہوتی جیسی والدین کی نگرانی میں ہوتی ہے یہ اہم فیصلہ کرنے کا حق مرد کو دیا گیا لیکن ساتھ ہی مختلف انداز سے مرد کو یہ اختیار استعمال کرنے سے روکا بھی گیا مثلاً طلاق کو ''ابغض مباحات'' قرار دیا گیا کہ جائز اختیارات میں بدترین اختیار جسے نہ اللہ پسند فرماتا ہے نہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ ہی اچھے لوگ، یہ تو مردوں کے لئے بری عورتوں سے اور عورتوں کے لئے بُرے مردوں سے چھٹکارے کا واحد ذریعہ ہے اس لئے اس کو جائز قرار دیا گیا اور اس کا اختیار مرد کو اس کے حلم و بردباری، دینداری اور دور اندیشی کی خوبیوں کی بنیاد پر دیا گیا کہ ہر مرد میں یہ خوبیاں ہونی چاہئیں اور ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے کوئی مرد اپنے اس اختیار کا غلط استعمال نہیں کرے گا۔

اگر یہ حق عورت کو بھی حاصل ہوتا، جس کا مغلوب الغضب اور ناقص العقل ہونا مسلم ہے، تو پھر معمولی جھگڑوں پر بنتے بستے گھر اجڑتے رہتے، خاندانی رشتے ٹوٹتے رہتے اور مسلم ممالک یا مسلم معاشرے میں طلاق کے حادثات میں جو آج تک کمی نظر آتی ہے اور گھروں میں سکون پایا جاتا ہے، وہ موجود نہ ہوتا، جیسا کہ مغربی ممالک کا حال ہے، جن کے یہاں شریعت تو کوئی نہیں، وہی انسانوں کے گڑھے ہوئے غیر فطری قوانین ہیں، جن کے ذریعہ مرد و عورت کی برابری کا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دیگر معاملات کی طرح عورت کو مرد ہی کی طرح طلاق دینے کا حق دیا گیا، جس کے نتیجہ میں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، اس سے خود قانون نافذ کرنے والے پریشان ہیں کہ طلاق ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے، حتیٰ کہ مرد اگر عورت کو اس کے دوستوں کے ساتھ گھومنے، ڈانس کرنے، کسی دوسرے شہر یا ملک ہفتوں کے لئے جانے سے روکے تو عورت اس کو طلاق کا نوٹس دے دیتی ہے اور قانونی کارروائی کے بعد طلاق نافذ ہو جاتی ہے، انجام یہ ہوتا ہے کہ قانون کے مطابق اب عورت کی معاشی، رہائشی ہر قسم کی ذمہ داری انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہے ملک زیر بار ہوتا ہے، نیز تنہا مرد مختلف قسم کے جرائم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور تنہا عورت مختلف قسم کے جرائم کا شکار ہوتی ہے اور اگر بچے موجود ہوتے ہیں تو وہ اٹھارہ سال تک کی قانونی عمر تو مجبوراً ماں یا باپ کے ساتھ گزارتے ہیں پھر اسی راہ پر چل پڑتے ہیں جس پر ایک عرصہ سے وہ اپنے والدین کو دیکھتے چلے آرہے ہیں۔

یہ بھیانک صورت صرف اس لئے پیدا ہوئی کہ عورت کو طلاق کا اختیار دیا گیا، کیا ایک مسلمان عورت اس کو پسند کر سکتی ہے، ہرگز نہیں، جب نہیں، تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ وہ ایسے رحمت والے دین سے وابستہ ہے جو اس کی عزت و آبرو کا محافظ ہے۔

علاوہ ازیں یہ کس نے کہا کہ عورت اس معاملہ میں بالکل مجبور ہے کہ وہ مرد کے ظلم و ستم سہتی رہے، مار کھاتی رہے، اس کی عیاشیاں برداشت کرتی رہے اور اگر علیحدہ ہو جائے تو ساری زندگی تڑپتی رہے کیونکہ مرد طلاق دینے کے لئے تیار نہیں، نہیں، ایسا ہرگز نہیں، ایسی صورت اگر واقعی پیدا ہو جائے تو شریعت مطہرہ نے ''خلع'' کا قانون دیا ہے کہ عورت مرد سے مہر

پیچھا نہیں چھٹتا، واپس کرے، یا معاف کر کے یا مزید کچھ دے کر طلاق کا مطالبہ کرے اور اگر وہ طلاق نہ دے تو عدالت سے رجوع کرے، تو جج قانونی طور پر مرد کو طلب کرے، طلاق دینے پر مجبور کرے اور عورت اس سے نجات حاصل کر سکے۔

بہر حال جب تک طلاق نہ ہو جائے دوسرا نکاح حرام ہے اور اہل ایمان کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہدایت فرماتا ہے" کہ "ان عورتوں سے نکاح نہ کرنا جن کے خاوند موجود ہوں"

ہاں ان عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے، جو جہاد میں کامیابی کے بعد بطور مال غنیمت مجاہدین کو ملیں، ان کے شوہر اپنے ملک میں موجود ہیں اب چونکہ یہ مسلم ملک میں آ گئیں لہذا اسلامی قانون کے مطابق ان کا نکاح خود بخود ختم ہو چکا، اسلام نے انہیں جیل میں سڑانے کی بجائے، مسلمانوں کی ملکیت قرار دے کر آرام کی زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کیا، اب اگر یہ مسلمان ہو جائیں تو ان سے ان کا مالک بھی صحبت کر سکتا اور اگر وہ چاہے تو کسی سے ان کا نکاح بھی کر سکتا ہے، لیکن ایک ماہ کے استبراء یعنی ایک ماہواری گزر جانے کے بعد تاکہ اس کے حاملہ نہ ہونے کا یقین ہو جائے اور وہ حاملہ ہے تو وضع حمل بچہ پیدا ہونے کے بعد۔

غلام اور باندی

میدان جہاد سے جو کافر مرد اور جو کافر عورتیں پکڑی گئیں، ان کو غلام اور باندی بنا لینا ظلم نہیں بعینہ عدل ہے۔ وہ اللہ کی اطاعت اور غلامی سے اتنے باغی ہو چکے تھے کہ انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا، ان کی جانیں لیں، اب ان کو یہ سزا دینا عین انصاف ہے کہ جب وہ مغلوب و مجبور ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے ہیں تو وہ ساری زندگی اللہ کے بندوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور غلامی کریں اور یہ سزا، اس سزا سے بہتر ہے جو اس دور میں انسانوں کی ہمدردی کے دعویدار، دشمن کو قیدی بنا کر جیلوں میں دیتے ہیں، جہاں نہ ان کے کھانے پینے کا انتظام ہوتا ہے، نہ انہیں لباس مہیا کیا جاتا ہے، نہ ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے، نہ ان کی کوئی خواہش نفس پوری کرنے کا کوئی موقع فراہم کیا جاتا ہے بس وہ جانوروں کی طرح بے بسی کی حالت میں محنت و مشقت کرتے، بیگار بھگتتے مر جاتے ہیں، جبکہ مسلمانوں کو غلام و باندی دینے والے آقائے رحمت نے غلاموں اور باندیوں کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہ رکھا کہ ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرنے، ان کو مارنے، پیٹنے، انسانی قوت سے زیادہ محنت و مشقت کرانے، ننگا، بھوکا رکھنے کی اجازت نہ دی، جیسا کہ آج کل مہذب ممالک کی جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے، یہاں غلام بنانے کا مقصد انسانوں کو تکلیف میں مبتلا کرنا نہیں، بلکہ قیدیوں سے بہتر زندگی مہیا کرنا اور اللہ کے باغیوں کو بغاوت کی سزا بصورت غلامی دینا ہے تاکہ کفر کا سر نیچا ہو اور کافروں کا تکبر ختم ہو، ذرا ملاحظہ فرمائیے، غلاموں پر آقائے رحمت کی شفقت و محبت اور پھر سر بلند کر کے دنیا کو للکاریئے کہ کیا کسی قوم کی ماضی کی تاریخ یا موجودہ دور میں کسی ملک کے قانون میں دشمن کے گرفتار شدہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی یہ مثال موجود ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لِلمَملُوکِ طعامُہٗ و کِسوتُہٗ و لَا یُکَلَّفُ مِنَ العَمَلِ اِلَّا مَا یُطِیقُ

مالک پر غلام کا روٹی کپڑا فرض ہے اور غلام سے صرف اتنا کام لیا جائے جو اس کی طاقت کے موافق ہو۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَخَاهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهٗ فَاِنْ كَلَّفَهٗ مَا يَغْلِبُهٗ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ

(یہ غلام) تمہارے بھائی ہیں، جن کو اللہ نے تمہارے قبضہ میں دیا ہے پس جسے اللہ نے اس کے بھائی کا مالک بنایا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنے غلام کو وہی کھلائے، جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اس سے ایسا کام نہ لے، جس کے بوجھ تلے وہ دب جائے اور اگر ایسا مشکل کام ہو تو اس (غلام) کی خود مدد کرے۔ (مسلم و بخاری)

آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اسلام نے غلامی کے رواج کو اپنا کر، غلاموں کے مظلوم طبقہ پر کتنا احسان فرمایا ہے کہ غلامی کے تصور اور غلاموں کی حیثیت کو یکسر تبدیل کر دیا، اہل ایمان کو یہ ہدایات دے کر دنیا کی تمام قوموں کو دعوت فکر دی کہ تم غلاموں، باندیوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے، ان پر ظلم و ستم کرتے ہو، نہ کھانے کو دیتے ہو، نہ پہننے کو، ان سے جانوروں کی طرح بیگار لیتے ہو لیکن ہمارا دین رحمت انہیں بھی انسان قرار دیتا ہے یہ ہماری ہی طرح انسان ہیں، ہم ان کے مالک اس لئے نہیں بنے کہ ان ہی سے اپنی خدمت لیں بلکہ بحیثیت مالک ہم پر بھی ان کی کچھ ذمہ داریاں کہ انہیں اپنی ہی طرح کا انسان سمجھیں، ان کو وہی کھلائیں جو ہم خود کھاتے ہیں، وہی پہنائیں جو ہم خود پہنتے ہیں، ان میں قوت و طاقت اتنی ہی ہے، جتنی تم میں ہے لہٰذا تم ان سے اتنا ہی کام لو، جتنا تم خود کر سکتے ہو، اور اگر کام ان کی قوت سے زیادہ ہو تو تم خود بھی ان کے ساتھ لگو، ان کی مدد کرو۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ کسی غلطی پر اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ میں نے پیچھے سے آواز سنی، ''اے ابو مسعود جان لو کہ تمہیں جتنا اس غلام پر اختیار ہے۔ اس سے زیادہ اللہ کو تم پر اختیار ہے'' میں نے مڑ کر جو دیکھا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رونق افروز تھے، میں نے فوراً عرض کیا، یا رسول اللہ! میں اسے اللہ کی رضا کے لئے آزاد کرتا ہوں، آپ نے فرمایا، اگر تم ایسا نہ کرتے، تو دوزخ کی آگ تمہیں جلاتی۔''

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن اپنے غلام کو ڈانٹا، اس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں حاضر ہو کر میری شکایت کر دی، جب میں حاضر دربار ہوا تو آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ابوذر، تم میں اب تک جاہلیت موجود ہے، یہ غلام تمہارے بھائی ہیں، پس اللہ نے تمہیں ان پر فضیلت دی ہے، اگر تمہیں اپنا کوئی غلام پسند نہ ہو، تو اسے بیچ دو لیکن اللہ کے بندوں پر ظلم نہ کرو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہو کر کسی نے سوال کیا، یا رسول اللہ! ہم اپنے غلام کو کتنی بار معاف کریں، آپ خاموش رہے، اس نے دوسری بار سوال کیا پھر بھی آپ خاموش رہے، اس نے پھر تیسری مرتبہ سوال کیا، تو آپ نے فرمایا ''ہر روز ستر مرتبہ معاف کیا کرو'' (ستر کا ارشاد تعداد نہیں،

بلکہ یہ ہدایت مقصود ہے کہ غلاموں کو معاف ہی کرتے رہا کرو)

دنیا سے رخصت ہوتے وقت میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلاموں کو جو وصیت فرما رہے تھے اس کا آخری جملہ بھی یہی تھا، جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار دہرایا:

الصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

نماز کی پابندی اور غلاموں کے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھو۔

آقائے رحمت ﷺ کی انہی ہدایات کا یہ نتیجہ تھا کہ مدینہ منورہ میں صحابہ کرام کے درمیان، آقا و مولیٰ کا کوئی امتیاز نہ رہا تھا، پہچانا بھی نہ جا سکتا تھا کہ کون آقا ہے، کون غلام ہے، مسجد میں سب کے سر ایک اللہ کے دربار میں ایک ساتھ جھکتے تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں سب مل جل کر بیٹھے نظر آتے تھے، مولیٰ و غلام سب ایک برتن میں کھاتے تھے، بازاروں، کھیتوں میں سب مل جل کر کام کرتے تھے، جہاد کے لئے صفوں میں سب ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوتے تھے۔

آقائے انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ حسن سلوک کے باب کا آغاز، اعلان نبوت سے قبل ہی ہو چکا تھا کہ آپ ﷺ نے قریش کے مشہور ''معاہدہ فضول'' میں پوری طرح حصہ لیا اور نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی، جس کا مقصد مظلوموں کو سہارا دینا ہی تھا ان مظلوموں میں غلاموں اور باندیوں کا ایک بڑا طبقہ بھی تھا، جن پر ان کے آقا ظلم وستم کیا کرتے تھے اور یہ تنظیم انہیں اس سے روکنے کی کوشش کرتی تھی اس دوران ہی غلاموں نے آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا تھا، اسی لئے جب آپ ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا تو قریش کے رئیسوں سے پہلے، قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے آپ ﷺ کے پیغام کو قبول کیا چنانچہ زید بن حارثہ، خباب بن الارت، بلال حبشی، یاسر یمنی، عمارہ، صہیب رومی، ابوفکیہ، عامر بن فہیرہ، سالم، کنیزوں میں لبینہ، زنیرہ، ہندیہ، ام عبیس اور سمیہ رضی اللہ عنہم، ابتدائے اسلام ہی میں مشرف با سلام ہوئے اور سب نے ہی اپنے کافر آقاؤں کے مظالم سہے، سوائے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے کہ وہ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ رحمت میں ہی پرورش پا رہے تھے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کے مطالعہ سے آپ پر یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ جس طبقہ کو غلامی کا نام دیا گیا، وہ اگرچہ ہمیشہ کے لئے جاری ہے لیکن آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ہمیشہ کے لئے اپنی رحمت کے سایہ میں لے کر جس راحت و عافیت کی ضمانت دی ہے وہ اسے کہیں نصیب نہ ہو سکتی تھی، بالفرض اگر غلامی کا یہ سلسلہ ختم کر دیا جاتا تو دشمن کے گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کا ٹھکانہ جیل خانہ ہوتا، جہاں باوجود تمام ضروریات کی فراہمی کے انہیں قید و بند کی صعوبت ضرور برداشت کرنا ہوتی، نیز وہ ہر قسم کی تربیت سے محروم رہتے اور نہ ہی انہیں مسلمانوں کے اخلاق و کردار کا مطالعہ کر کے، اسلام سے مشرف ہونے کا موقع نصیب ہوتا، پس اس طبقہ کو غلاموں اور باندیوں کا نام دے کر، جیل کی زندگی سے بہتر زندگی فراہم کی گئی، جو نہ ظلم ہے نہ ہی غلام پسندی، بلکہ دنیا کو غلاموں کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم ہے اور اللہ سے بغاوت کرنے والوں کے لئے عبرت کا ذریعہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی قبول کر لیں قبل اس کے کہ ان کی گردنوں میں بندوں کی غلامی کا طوق ڈال دیا جائے۔

غلامی میں بتدریج کمی:۔ اسلام نے اگرچہ بیشمار، مصلحتوں اور حکمتوں کی بناء پر غلاموں اور باندیوں کا سلسلہ جاری رکھا لیکن اس کو کم کرنے کے لئے، اہل ایمان کو ایسی تعلیم اور ترغیب دی کہ اسلامی حکومت اور مسلم معاشرے میں اس کمزور طبقہ کی بہتات نہ ہونے پائے، اسی مقصد کے حصول کے لئے درج ذیل احکام نافذ کئے گئے۔

1۔ اسلامی قانون کے مطابق، غلام و باندی صرف ان مردوں کو اور عورتوں کو بنایا جا سکتا ہے، جنہیں غیر مسلموں سے شرعی جہاد کے بعد گرفتار کیا گیا ہو، جبکہ ماضی میں ہر طاقتور کمزور کو غلام بنالیتا تھا، جس کی نظیر قرآن کریم سے بھی ملتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے چند ٹکوں میں فروخت کیا اور وہ بازار مصر میں بحیثیت غلام فروخت ہوئے، فرعون نے بنی اسرائیل کی پوری قوم کو غلام و باندی بنا رکھا تھا۔ ظہور اسلام کے وقت بھی پوری دنیا میں یہ رواج موجود تھا، ڈاکو، بچوں کو اٹھا لاتے، بازار میں بیچ دیتے اور وہ ہمیشہ کے لئے غلام بن جاتے، عورتوں کو اٹھا کر فروخت کر دیا جاتا اور وہ ہمیشہ کے لئے باندیاں بن جاتیں، یا جو بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا اس ملک کی پوری آبادی کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیتا، رومی، ہر غیر رومی کو غلام ہی سمجھتے تھے، قیصر و کسریٰ کے یہاں آزادوں سے زیادہ غلاموں، باندیوں کی تعداد تھی، خود قریش ہر نچلے قبیلہ کے لوگوں سے غلاموں جیسا برتاؤ کرتے تھے، غرضیکہ اسلام نے غلام سازی کے اس دائرے کو محدود کیا، اور صرف ان غیر مسلموں کو غلام بنانے کی اجازت دی، جو جنگ میں کامیابی کے بعد گرفتار کئے جائیں، اس میں بھی کمی کے لئے تین طریقے رکھے گئے، (1) ان جنگی قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے، جن کا مطلوبہ فدیہ دینے پر ان کے وارث راضی ہو جائیں، (2) مسلمان قیدیوں کے بدلے میں انہیں آزاد کر دیا جائے، (3) ان پر احسان کر کے بلا معاوضہ انہیں چھوڑ دیا جائے، ان تینوں صورتوں پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام نے اکثر مواقع پر عمل فرمایا، اندازہ فرمایئے، اس طریقہ کار سے غلاموں کی تعداد کتنی کم ہوگئی۔

2۔ شریعت مطہرہ نے غلاموں اور باندیوں کی آزادی کو، عبادت، صدقہ اور دنیا و آخرت کی فلاح و نجات کا ذریعہ بنایا، اسی لئے کہ غلاموں میں اضافہ نہ ہو، کمی ہوتی رہے، ذرا اندازہ فرمایئے، اللہ اور اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اہتمام کس طرح فرمایا، قرآن کریم نے جن اعمال صالحہ کو ''عَقَبَہ'' یعنی وہ راستہ جو پہاڑ کی بلندی کی طرف لے جاتا ہے، قرار دیا، ان میں سب سے پہلے ''فَکُّ رَقَبَةٍ'' یعنی غلامی سے کسی کو آزاد کرانا ہے، یعنی غلام کو آزاد کرنا اتنا عظیم عمل صالح ہے، جو مؤمن کو تقویٰ کی بلندی پر پہنچاتا ہے، نیز قرآن کریم نے جن غلطیوں اور گناہوں پر کفارہ مقرر فرمایا، اس میں غریبوں کو کھانا کھلانا، روزے رکھنا یا ''تحریر رقبة'' غلام آزاد کرنا ہے مثلاً قسم کے کفارے کی ایک صورت غلام آزاد کرنا ہے، ظہار کے کفارے میں ایک صورت غلام آزاد کرنا ہے، قتل خطاء یعنی کوئی کسی کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور اس کے وارثوں کو دیت بھی ادا کرے، اگر کسی ایسے مؤمن کو قتل کر دیا جو دشمن ملک میں رہتا تھا تو کفارہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَیُّمَا رَجُلٍ اَعْتَقَ اِمْرَاءً مُسْلِماً اِسْتَنْقَذَ اللّٰهُ لِکُلِّ عَضْوٍ مِّنْهُ عَضْوًا مِّنْهُ مِنَ النَّارِ

جس شخص نے کسی مسلمان غلام کو آزاد کیا، اللہ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں، آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو آگ سے نجات دے گا۔ (مسلم)

اسی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ جب تک غلاموں کا رواج رہا اور مسلمانوں کے پاس غلام و باندی موجود رہے، وہ انہیں کفاروں کی صورت میں یا، اللہ اور رسول ﷺ کی رضا کے لئے آزاد کرتے رہے، خود آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ غلام آزاد کئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو اس عمل میں اتنے حریص تھے کہ اپنی دولت کا بڑا حصہ آپ نے غلاموں کو آزاد کرنے پر صرف کیا، جن میں نہایت مشہور صحابہ کرام شامل ہیں، مثلاً حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہی آزاد کیا تھا، علاوہ ازیں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے انہتر غلام آزاد کئے، اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ستر، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صرف اپنی شہادت کے دن دوران محاصرہ بیس غلام آزاد کئے، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے سو، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک ہزار، ذوالکلاع حمیری نے صرف ایک دن میں آٹھ ہزار، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار غلام آزاد کئے، دیگر صحابہ کرام اوران کے تابعین نے حصول ثواب کے لئے جو غلام آزاد کئے ان کی تعداد علیحدہ ہے۔

للہ انصاف کیجئے کہ اسلام نے غلامی کو فروغ دیا یا بتدریج اس کا خاتمہ کیا، اگر فروغ دیا ہوتا، تو آج تک ہمارے پاس غلام و باندیاں موجود ہوتیں لیکن ایسا نہیں ہے، بدنصیبی سے اب شرعی جہاد کا سلسلہ بھی منقطع ہے، لہٰذا دشمن کے گرفتار شدہ لوگوں کو غلاموں و باندی نہیں بنایا جا سکتا، اب تو ہماری جنگیں بھی غیر شرعی ہوتی ہیں، لہٰذا گرفتار شدگان کے ساتھ بھی غیر شرعی سلوک کیا جاتا ہے کہ انہیں جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے، اسلام نے تو انسانوں کو قید و بند کی صعوبتوں سے ہی نجات دلانے کے لئے، غلامی کو ترجیح دی اور غلاموں، باندیوں کو ان کے مالکوں کے گھروں کا فرد بنادیا۔

باندیوں سے صحبت

ایک وضاحت مزید ضروری ہے کہ اسلام باندیوں سے ان کے مالکوں کو صحبت کی اجازت دیتا ہے اور باندیوں کی تعداد کا بھی کوئی تعین نہیں، یعنی ایک شخص جتنی چاہے باندیاں رکھ سکتا ہے، شریعت مطہرہ کے اس قانون سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کو ہمیشہ بے حد تکلیف رہی ہے اور انہوں نے اسے مسلمانوں پر طعنہ زنی کا ایک تیر بنا رکھا ہے جبکہ دین سے ناواقف ہمارے مسلمان بھائی بھی اس معاملہ میں تذبذب کا شکار رہتے ہیں، نہ جانے کیوں جبکہ اللہ نے اگر ایک آسانی دی ہے تو اس پر تذبذب کی کیا ضرورت ہے، موقع ملے تو اس سے فائدہ حاصل کرنا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے، بہرحال ہم اس کی وضاحت کئے دیتے ہیں تاکہ کم از کم اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے حضرات مطمئن ہو جائیں اور اگر موقع ملے تو وہ دوسروں کو مطمئن کر سکیں، غور فرمائیے۔

اللہ رب العزت جل مجدہ نے جن عورتوں کو ہمارے لئے حلال کیا، ان سے ہمیں صحبت کرنے کی اجازت کیوں ملی جبکہ انہیں عورتوں پر نکاح سے پہلے نظر ڈالنا بھی حرام تھا، آپ کہیں گے نکاح ہوا، یعنی ایجاب وقبول ہوا، مہر مقرر ہوا، دو گواہ بنائے گئے، اس کے بعد وہ عورت میری بیوی ہوگئی اور میں نے اس سے اپنی خواہش پوری کی، آپ کے اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ عورت کے حلال ہونے کی علت نکاح کو قرار دیتے ہیں، بڑی عجیب بات ہے، آخر دو لفظوں، مہر میں، گواہوں کی موجودگی میں، ایسی کونسی تاثیر ہے کہ ایک عورت ایک غیر مرد کے لئے حلال ہوگئی اور وہ اس کے سپرد کر دی گئی، ایسا ہرگز

نہیں، یہ الفاظ کا جادو نہیں، مہر کا اثر نہیں، گواہوں کا کمال نہیں، یہ صرف اللہ کی اجازت اور اس کے فضل کا نتیجہ ہے، مرد و عورت کا جوڑا بنانا تھا، نسلِ انسان کو جاری رکھنا تھا، اس کے لئے خالق حقیقی نے یہ طریقہ متعین فرما دیا، جس کی پابندی اہل ایمان کے لئے لازمی قرار پائی، اگر وہ کوئی دوسرا طریقہ مقرر فرماتا تو اس کو اختیار کرنا پڑتا، پس علت اللہ کا حکم ہے نکاح نہیں، نکاح تو حکمت باری تعالیٰ پوری کرنے کا ایک ذریعہ ہے، پس جس اللہ نے نکاح کے ذریعہ مرد کے لئے عورت کو حلال کر دیا، اسی اللہ نے بغیر نکاح کے باندیوں کو ان کے مالکوں کے لئے حلال کیا، جبکہ انہی باندیوں سے کوئی دوسرا استفادہ کرنا چاہے تو اسے ان کے مالک کی اجازت کے بعد ان سے نکاح کرنا ہوگا، جیسا کہ اگلی آیات میں آ رہا ہے اور مالکوں کو ان سے نکاح کی ضرورت یوں نہیں، کہ انہوں نے انہیں اپنی قوت بازو یا دولت کے ذریعہ حاصل کیا ہے، مزید وضاحت کے لئے شریعت مطہرہ ہی کے دوسرے حکم پر غور کر لیجئے کہ وضو یا غسل کے لئے پانی ضروری ہے لیکن پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کی اجازت دی گئی اور اس سے وہی طہارت حاصل ہوتی ہے جو پانی سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ حصولِ طہارت کی علت پانی نہیں ہے، اللہ کا حکم ہے، پانی موجود ہے تو اللہ کا حکم ہے کہ پانی سے طہارت حاصل کرو، ورنہ مٹی سے طہارت حاصل کر لو اور وہ بھی اس طرح کہ ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیر لو اور ایک مرتبہ کہنیوں پر پھیر لو اور ہاتھوں کو جھاڑ لو کہ مٹی ملنے کی ضرورت نہیں، بس حکم ہے، جس کی تعمیل ہی عبادت ہے، اسی طرح حکم ہے کہ آزاد عورتوں سے استفادہ کے لئے نکاح کرو اور باندیوں کے مالک ہو تو بغیر نکاح استفادہ کر لو، غالبًا بات واضح ہو گئی۔

رہا معاملہ غیر مسلموں کا، تو ان کے کس کس اعتراض کا آپ جواب دیں گے، اس اعتراض کے جواب میں صرف یہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ ہم جو بھی کرتے ہیں کم از کم اپنے قانون کی پابندی کے ساتھ کرتے ہیں، جبکہ تمہارے یہاں تو کوئی عائلی قانون ہی نہیں کہ عورت سے صحبت کے لئے یکسر نکاح کی ضرورت ہی نہیں، صحبت پہلے ہوتی ہے، بچے پہلے ہو جاتے ہیں، پھر نکاح کیا جاتا ہے، صرف ملکیت میں شرکت کے لئے۔

باندیوں کے ساتھ مالکوں کو صحبت کرنے کی اجازت دینے میں بھی بڑی عظیم حکمت پنہاں ہے کہ جو عورتیں مسلمانوں کی کفالت میں آ گئیں اور وہ ان کی ضروریات پوری کرنے کے ذمہ دار ہو گئے، اب اگر ان سے غیر عورتوں جیسا سلوک کیا جاتا تو ممکن تھا کہ وہ اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لئے مسلم معاشرے کو بربادی میں مبتلا کر دیتیں، یا اپنے مالکوں ہی کو گناہ میں مبتلا کر دیتیں، پس اللہ نے بڑا فضل فرمایا کہ ان عورتوں کو گناہ سے بچانے اور ان کی وجہ سے دوسروں کو گناہ سے محفوظ رکھنے کا اہتمام فرما دیا اور اجازت دیدی کہ جو ان عورتوں کی دیگر ضروریات کے ذمہ دار قرار دیئے گئے ہیں، وہی ان کی خواہش نفس بھی پوری کریں کہ یہ بھی ایک فطری اہم ضرورت ہے۔

اے ایمان والو:۔ اسلام کے احکام پر ذہن و قلب کے اطمینان کے ساتھ عمل کرو، کسی قسم کے تذبذب میں مبتلا نہ ہو کہ یہ اس اللہ کا عطا کردہ، مکمل ضابطہ حیات ہے، جو انسان کا خالق ہے اور انسان کی فطرت، ضرورت اور صلاحیت کو خوب جانتا ہے، پس اس نے جو کچھ عطا فرمایا، وہ تمہاری فطرت، ضرورت اور صلاحیت کے عین مطابق ہے، اس پر عمل تمہاری طمانیت و نجات کا ضامن ہے، اے اللہ ہمیں ہر قسم کے شکوک و شبہات سے محفوظ فرما اور اپنے عطا کردہ نظام کو اپنانے کی توفیق عطا فرما۔

آیئے، آیت زیر گفتگو کی طرف پھر رجوع کریں، ارشاد ہوتا ہے:

اے ایمان والو:۔ جن محرمات کا ذکر کیا گیا، ان کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، ان سے تم اپنے مال کے ذریعہ، یعنی مہر مقرر کر کے نکاح کر سکتے ہو لیکن تمہاری نیت درست ہونی چاہئے کہ نکاح کا مقصد صرف خواہش نفس کی تکمیل اور عیاشی نہ ہو بلکہ اس لئے نکاح کرو کہ تم غلط روی سے بچے رہو، نیز تمہاری نسل جاری ہو اور نہ ہی اپنے مال کے ذریعہ بدکاری کرنے کی غرض سے عورتیں تلاش کرو اور جب تم نکاح کر لو اور بیوی سے لطف اندوز ہو جاؤ تو بد دیانتی نہ کرنا بلکہ جو مہر مقرر کیا ہے، وہ ادا کر دینا کہ اس کا ادا کرنا فرض ہے، ہاں اس میں تمہیں اضافہ کا اور عورت کو کمی کرنے کا اختیار ہے، اے ایمان والو، تم جو بھی عمل کرو گے وہ اللہ سے چھپا نہیں رہ سکتا کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے اور اپنے احکام کی حکمت کو بھی جانتا ہے، پس تمہارا کام تعمیل ہے۔

مہر اور اس کے احکام

اس موقع پر مہر سے متعلق مختصر گفتگو کرنا مناسب ہوگا، پس اولاً ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مہر کی مقدار کیا ہے، پھر مہر سے متعلق چند شرعی احکام بیان کریں گے۔

ہمارے دور میں مختلف خاندانوں اور مختلف ممالک میں آباد مسلمانوں میں مہر کی ایک متعینہ مقدار رائج ہے، ملکی سکہ کے مطابق کہیں پچیس، کہیں اکتیس اور کہیں اکیاون ہے، یہ مقدار تو مختلف ہے لیکن اس میں دو باتیں ضرور مشترک ہیں، ایک تو یہ کہ مہر کم سے کم مقرر کیا جائے، دوسرے یہ کہ دنیا کی ہر چیز کے دام بڑھ سکتے ہیں لیکن عورت کی حیثیت میں اضافہ نہیں ہو سکتا مہر کی رقم زائد نہیں ہو سکتی، جو صدیوں سے رائج ہے، وہی رہے گا، کمی کی گنجائش ہی نہیں اور زیادتی کی اجازت رواج نہیں دیتا، ہم نے جنوبی افریقہ میں ایک نکاح پڑھایا، لڑکا، لڑکی دونوں کا متمول خاندان سے تعلق تھا، اب پتی نہیں تو کروڑ پتی تو ضرور تھے، ہم نے مہر پوچھا، تو جواب ملا، وہی پچیس رینڈ (رینڈ وہاں کا سکہ ہے) ہمیں بڑی حیرت ہوئی نکاح تو پڑھا دیا کہ بہر حال ہو جائے گا پھر ہم نے لڑکے کے پچھتر سالہ دادا سے پوچھا آپ کا مہر کتنا تھا، جواب ملا "وہی پچیس رینڈ" اب تو اور بھی حیرت بڑھی، ہم نے پوچھا، جناب جب آپ دولہا بنے تھے اس وقت آپ کا جوتا کتنے کا خریدا گیا تھا، انہوں نے کہا اس وقت تو جوتا بہت عمدہ ایک رینڈ کا مل جاتا تھا، اب ہم نے تقریر شروع کر دی اور مہر کی شرعی مقدار واضح کرنے کے بعد کہا کہ کس قدر ظلم ہے کہ جب جوتا ایک رینڈ کا آتا تھا اس وقت بھی مہر پچیس رینڈ ہوتا تھا اور اب کوئی جوتا تو سو رینڈ سے کم کا نہیں ملتا لیکن مہر وہی چل رہا ہے، ہر چیز کی قیمت بڑھی لیکن عورت کی حیثیت اور وقعت نہ بڑھی، اب سنا ہے وہاں مہر ایک ہزار رینڈ مقرر کیا جانے لگا ہے، الحمد اللہ ہماری تبلیغی کوشش سے بعض دیگر ممالک میں بھی مہر کی مقدار بدلی ہے اور اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے، جو اگرچہ کم ہے لیکن پھر بھی غنیمت ہے، مزید تعجب اس بات پر ہے کہ لوگ مہر کی مقدار تو بہت کم پسند کرتے ہیں جبکہ تحائف و جہیز وغیرہ دینے میں کوئی کمی نہیں کرتے، مہر میں کمی کا سبب بھی بڑا عجیب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مہر فاطمی ہے، سنت بھی ہے اور ادائیگی میں بھی آسان ہے، بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اگر مہر فاطمی ہے تو پھر جہیز فاطمی اور تحائف علوی کیوں نہیں، علاوہ ازیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی پیروی کا خیال صرف مہر کے موقع پر ہی کیوں آتا ہے، بچیوں کی پرورش اور تربیت کے لئے ان کو نمونہ

کیوں نہیں بنایا جاتا، یہ سب عذر لنگ ہے بات صرف یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو صرف ایک رواج سمجھ لیا ہے اور ان کے نزدیک اس کی کوئی وقعت اور اہمیت نہیں ہے نہایت بے دلی سے برائے نام وہ اس کی تعمیل کر لیتے ہیں جبکہ ان کے نزدیک اپنے رسم ورواج نہایت اہم ہیں نہایت فراخ دلی سے وہ ان کو ادا کرتے ہیں، دین کے احکام کی بے وقعتی اور بے حرمتی باعث شرم اور جرم نہیں، اپنے رسم ورواج سے کمی میں ناک کٹتی ہے اللہ ہدایت دے۔

شریعت مطہرہ نے مہر کی مقدار کا کوئی تعین نہیں کیا، جیسا کہ قرآن کریم کی زیر گفتگو آیت مبارکہ ہی میں موجود ہے کہ جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں" ان سے اپنے مالوں کے ذریعہ نکاح کرو" اگلی آیت میں آ رہا ہے اگر مالی مجبوری کے سبب کوئی آزاد مسلمان عورت سے نکاح نہ کر سکے تو اسے کسی باندی سے نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ شرعاً اس کا مہر، آزاد عورت کے مہر سے آدھا ہوتا ہے، ان احکام سے واضح ہے کہ مہر کی رقم اتنی وقیع ہونی چاہئے جس کو مال کہا جا سکے، پچیس، تیس روپے کی رقم کی ہمارے دور میں کیا حیثیت ہے، نیز اس مال کی مقدار کا تعین شریعت نے لڑکا، لڑکی یا ان کے ورثاء کو سونپا ہے تا کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق خود طے کر لیں، ایسی رقم طے کریں جس سے ان کی دنیاوی مالی حیثیت کا بھی اظہار ہو اور دینی وقعت کا بھی پتہ چلے یعنی یہ کہ انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل اور رسول کی سنت کی پیروی کو وقعت دی۔

میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم، جن کا عمل قرآن کریم کی تفسیر اور جن کی زندگی ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے، آپ ﷺ کو اگر چہ مقدار مہر متعین کر دینے کا پورا پورا اختیار تھا لیکن آپ ﷺ نے بھی ایسا نہ کیا بلکہ خود نکاح کئے تو حالات کے مطابق، عورتوں کی خاندانی حیثیت کے مطابق مہر مقرر فرمایا، اکثر ازواج مطہرات کا مہر، ساڑھے بارہ اوقیہ مقرر کیا گیا، جو پانچ سو درہم کے مساوی ہوتے تھے اور یہ رقم اس دور میں ایک معقول رقم تھی، جس کو دولت کہا جاتا تھا، ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر تو چار ہزار درہم مقرر ہوا تھا، جو اگر چہ نجاشی شاہ حبشہ نے ادا کیا تھا لیکن آپ ﷺ نے اسے قبول فرمایا اگر مہر میں زیادہ رقم کا تعین جائز نہ ہوتا تو یقیناً آپ ﷺ اس کی اجازت نہ دیتے، اپنی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چار سو مثقال چاندی مقرر فرمایا تھا جو ڈیڑھ سو تولہ چاندی کے مساوی بنتا ہے، اس دور میں یہ ایک معقول دولت تھی، آپ بھی مہر فاطمی مقرر کریں، مقدار کو نہ دیکھیں وقعت کو دیکھیں، اس وقت ڈیڑھ سو تولہ چاندی کی جو وقعت تھی اس کو حاصل کرنے کے لئے آج کل کم از کم ڈیڑھ ہزار تولہ چاندی کی ضرورت ہوگی، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، جن کے لئے مہر کی یہ رقم کوئی معمولی نہ تھی ان کے پاس کوئی دولت نہ تھی انہوں نے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آغوش رحمت میں پرورش پائی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ اپنے دور خلافت میں انہیں معلوم ہوا کہ لوگوں میں، مہر بڑی مقدار میں مانگنے اور ادا کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے پس آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک مجلس میں اعلان فرمایا کہ چالیس اوقیہ، سے زیادہ کوئی مہر مقرر نہ کرے اور جو اس سے زیادہ مقرر کرے وہ بیوی کو صرف چالیس اوقیہ ادا کرے باقی بیت المال میں جمع کرائے، اس اعلان پر ایک عورت نے اعتراض کیا اور کہا یہ ہرگز جائز نہیں ہے، جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمارے مہر کی مقدار کا تعین نہیں کیا تو خلیفہ کو کیا حق ہے اور نہ ہی چالیس اوقیہ عورت کو ادا کر کے بقیہ رقم بیت المال میں جمع کرانے کا کوئی جواز ہے کہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْــًٔا

اور دے چکے ہو تم اسے (بیوی کو) ڈھیروں مال تو اس مال سے کچھ واپس نہ لو۔

آیت مبارکہ میں "قنطار" ڈھیروں مال دینے کا جواز بھی ہے اور واپس لینے کی ممانعت بھی، جب شوہر ہی کو واپس لینے کا اختیار نہیں جس نے دیا ہے تو بیت المال میں جمع کرا دینے کا جواز کس طرح ہو سکتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ایک عورت کا یہ اعتراض سنا تو اپنے اعلان پر اصرار نہ کیا بلکہ فرمایا" اللہ کا شکر ہے کہ ہم میں ایسی عورت موجود ہے جو سچ کہہ رہی ہے اور مرد غلطی پر ہے۔"

بہر حال شریعت مطہرہ نے مہر کی مقدار کا کوئی تعین نہیں کیا اور نہ ہی قرآن وسنت سے کوئی ایسا مفہوم ملتا ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ مہر کم سے کم مقرر کرنا چاہئے، بالخصوص اتنا کم کہ اس کی کوئی وقعت ہی نہ رہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو، وقعت واہمیت دینا مؤمن کے ایمان کی علامت ہے، اہل ایمان کو اپنی اس علامت کی حفاظت کا بہر حال خیال رکھنا چاہئے۔

پس اگرچہ مہر کی مقدار کا کوئی تعین نہیں لیکن آئمہ فقہ نے ہماری آسانی کے لئے کم از کم مہر کی مقدار کا تعین کیا ہے، زیادتی کا نہیں، حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک کم از کم مقدار دس درہم ہے، جس میں اس بات کا لحاظ موجود ہے کہ اس دور میں یہ رقم وقیع رقم تھی جس کو آپ نے اپنے دور کے لحاظ سے متعین فرما دیا، اب ہم اپنے دور کے لحاظ سے خود ایک وقیع رقم کا تعین کر سکتے ہیں۔

مہر ادا کرنا بحکم الٰہی واجب ہے، مقررہ مہر میں مرد اگر چاہے تو اضافہ کر سکتا ہے اور عورت اگر چاہے تو کمی کر سکتی یا پورا مہر بھی معاف کر سکتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا ۝ (النساء:۴)

اور دیا کرو (اپنی) بیویوں کو ان کے مہر خوشی خوشی پھر اگر وہ تمہیں کچھ بخش دیں اپنی مرضی سے تو اسے کھاؤ لذت حاصل کرتے ہوئے، خوشی سے۔

مقرر مہر کا ادا کرنا تمہارے ذمہ واجب ہے اور واجب کی ادائیگی کو بوجھ نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ خوش ہو کر ادا کرنا چاہئے لہٰذا مہر خوش ہو کر ادا کرو، اگر مہر معجّل ہے تو عورت کے مطالبہ پر فوراً ادا کرنا ہوگا اور اگر مہر مؤجل ہے تو طلاق یا موت کی صورت میں ادا کرنا ہوگا اور اگر مرد ہی پہلے وفات پا گیا اور اس نے بیوی کا مہر ادا نہ کیا تھا تو اس کے ترکہ میں وراثت جاری ہونے سے پہلے دوسرے قرضوں کی طرح مہر ادا کیا جائے گا اور بیوی کو حق حاصل ہے کہ مہر معجّل ہو یا مؤجل، چاہے تو سب معاف کر دے اور چاہے تو کچھ معاف کر دے مرد کی زندگی ہی میں معاف کرے یا اس کے مرنے کے بعد معاف کرے لیکن اپنی خوشی اور مرضی سے، مرد کسی قسم کا اس پر جبر کر کے مہر معاف نہیں کرا سکتا اور جب بیوی خوشی سے معاف کرے تو اس کو ہنسی خوشی کھانے کی

اجازت ہے، مہر کا ادا کرنا اسی صورت میں واجب ہوتا ہے کہ جب عورت سے مباشرت یا خلوت صحیحہ، یعنی مباشرت کا ماحول ہو جائے اگر اس صورت سے قبل ہی طلاق ہوگئی یا عورت مرگئی تو نصف مہر ادا کرنا واجب ہوگا آپ نے غور فرمایا، اسلام کے قوانین کس قدر عدل وانصاف پر مبنی ہیں، ان میں ہر کسی کے حقوق کی ادائیگی کا کس قدر اہتمام موجود ہے، یہ ہماری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم ایسے دین رحمت سے منہ موڑ کر، غیروں کے در سے بھیک مانگتے ہیں، اللہ عمل کی توفیق دے۔

وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

اور جو نہ رکھتا ہو تم میں سے اس کی طاقت کہ نکاح کرے آزاد مسلمان عورتوں سے تو وہ نکاح کرے، جو تمہارے قبضہ میں ہیں تمہاری کنیزیں جو مسلمان ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو بعض تمہارا، بعض کی جنس سے تو نکاح کرلو، ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اور دو ان کو مہر ان کے دستور کے موافق (تاکہ نکاح سے) وہ پاکدامن بن جائیں، نہ زناکار اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار، اور جب وہ نکاح سے محفوظ ہوجائیں، پھر اگر وہ ارتکاب کریں بدکاری کا، تو ان پر، اس سزا کا نصف ہے، جو آزاد عورتوں کے لئے ہے یہ (لونڈیوں سے نکاح کی اجازت) اس کے لئے ہے جسے خطرہ ہو، بدکاری میں مبتلا ہونے کا تم میں سے اور تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لئے اور اللہ غفور رحیم ہے۔

اَلْمُحْصَنٰتُ الْمُؤْمِنٰتُ

جن عورتوں کو تمہارے لئے حلال کردیا گیا ہے ان سے نکاح کرو کہ نکاح کرنا بھی عبادت ہے اور بقول حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ''نوافل سے افضل نکاح'' ہے کیونکہ اس سے انسان کے ذہن کو یکسوئی حاصل ہوتی ہے، برائی وبدکاری کے خیالات سے نجات ملتی ہے، وہ نظر بازی سے محفوظ رہتا ہے اس میں حلم وبردباری پیدا ہوتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

يَامَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَآءَ ةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرَجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّومِ فَاِنَّهُ لَهُ وِجَآءٌ

اے نوجوانو! تم میں سے جو طاقت رکھتا ہو وہ ضرور نکاح کرے، کیونکہ نکاح نظر کو نیچا کردیتا اور شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہے اور جس میں نکاح کی طاقت نہ ہو، اسے چاہئے کہ روزے رکھے کیونکہ یہ روزے ہی

اس کی حفاظت تیں۔ (بخاری شریف)

نکاح کرو "اَلْمُحْصَنٰتُ الْمُؤْمِنٰتُ" ایسی آزاد مومنات عورتوں سے، جو پاکدامن ہوں اور ہمیشہ پاکدامن رہیں کیونکہ نکاح عیش و عیاشی کا ذریعہ نہیں ہے، اس میں بے شمار حکمتیں پنہاں ہیں، پس ایسی عورتیں تلاش کرو جن سے یہ حکمتیں حاصل ہوسکیں مثلاً وہ تمہارے گھر کی اچھی مالکہ بنیں، تمہارے خاندان کا اچھا فرد بنیں، تمہارے بچوں کی اچھی ماں بنیں، اسی لئے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، راوی ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ

عورت سے چار وجہوں سے نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال، اس کے خاندان، اس کے حُسن اور اس کے دین کی وجہ سے، پس تم دین والی اختیار کرو۔ (بخاری شریف)

عورت کے انتخاب میں دین کو بنیاد بناؤ، دیندار بیوی تلاش کرو، نکاح کے سارے مقاصد پورے ہو جائیں گے، گھر جنت بن جائے گا، خاندان میں محبت والفت کے گل کھلیں گے، بچے اچھے انسان بنیں گے، صرف تمہیں ہی نہیں، دیندار عورت کا فائدہ پورے معاشرے کو ہوتا ہے۔

اگر تم آزاد عورت کے اخراجات پورے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تو باندی سے نکاح کرلو کیونکہ باندی کا مہر بھی آزاد عورت سے آدھا ہوتا ہے، آزاد عورت کا نان نفقہ دیگر اخراجات بھی زیادہ ہوتے ہیں، کچھ اس کے خاندان کا بھی بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے، باندی سے نکاح کرنے سے ہر قسم کی ذمہ داریوں میں کمی ہو جاتی ہے، پس تم باندی سے نکاح کرلو، جہالت زدہ لوگوں کی طرح باندی سے نکاح کو معیوب نہ جانو، وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں، ان سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں، اگرچہ شرعاً باندی کی اولاد اس کے مالک کی غلام ہوگی لیکن اسلام غلامی و آزادی کو اہمیت نہیں دیتا بلکہ اہم دین ہے اگر اولاد غلام بھی ہو جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ دیندار ہونا چاہئے، اسی لئے مومنہ باندی سے نکاح کرنا بہتر ہے تاکہ اولاد میں ایمان محفوظ رہے، بہرحال باندی سے نکاح میں کوئی عیب نہیں، باندیوں سے نکاح ان کے مالک کی اجازت سے کرو، اگر تم نے خود ہی اس سے نکاح کی بات کرلی اور وہ راضی ہوگئی، تو نکاح نہ ہوگا کیونکہ باندی، غلام کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں وہ مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کرسکتے، جب تم نکاح کرلو، تو اس کا مقرر مہر بغیر کسی ٹال مٹول کے ادا کردو، کہیں باندی خیال کرکے اس کی حق تلفی نہ کرنا، باندی کا مہر بھی اس کے مالک ہی کو ادا کرنا ہوگا، باندی سے نکاح کی اجازت تو ہے لیکن یہ خیال ضروری ہے کہ وہ باندی، چال چلن اور کردار کی اچھی ہو، پاکدامن ہو، زانیہ نہ ہو کسی اور کے عشق میں مبتلا نہ ہو۔

آیت زیر گفتگو میں ضمناً باندی کی سزا کا بھی ذکر کردیا گیا کہ اگر باندی کا نکاح ہو جائے اور پھر بھی وہ بدکاری میں مبتلا ہو، تو اس کی سزا، آزاد عورت کی سزا سے نصف ہوگی، پس مسئلہ یہ ہے کہ غلام یا باندی، شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ دونوں صورتوں میں ان کی سزا ایک ہی ہے، اور وہ پچاس کوڑے۔

اہل ایمان کو باندیوں سے نکاح کرنے کی اجازت صرف انتہائی ضرورت کی صورت میں دی گئی ہے جبکہ بے حد

مجبوری ہو اور زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، اس صورت میں بھی بہتر یہی قرار دیا گیا کہ باندی سے نکاح کی بہ نسبت صبر بہتر ہے، اللہ ہر قسم کے گناہوں کو بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۞

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۞

اللہ چاہتا ہے کہ کھول کر بیان کر دے (اپنے احکام) تمہارے لئے اور چلائے، تم کو ان (کامیاب لوگوں) کی راہوں پر جو تم سے پہلے گزر چکے اور اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور اللہ سب کچھ جاننے والا، بڑا دانا ہے، اور اللہ چاہتا ہے کہ اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو پیروی کر رہے ہیں اپنی خواہشات کی کہ تم (حق سے) بالکل منہ موڑ لو، اللہ چاہتا ہے کہ ہلکا کر دے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) اور پیدا کیا گیا ہے انسان کمزور۔

عائلی زندگی

عائلی زندگی انسانی زندگی کا نہایت اہم حصہ ہے، اس میں عدم توازن، انسان کی زندگی کے تمام شعبوں میں عدم توازن کا باعث بنتا ہے، اسی لئے اللہ پسند فرماتا ہے کہ وہ اس سے متعلق احکام واضح طور پر بیان کر دے وہ احکام جو ماضی میں مؤمن اقوام کو بھی دیئے گئے اور وہ ان کی تعمیل کر کے کامیاب و کامران زندگی بسر کر چکے ہیں، پس اے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والو تمہارے لئے بھی یہی زیب دیتا ہے کہ کامیاب اسلاف کے نقش قدم پر چلو تا کہ، اللہ کی رحمت تمہارے بھی شامل حال ہو، تمہارے معاشرے میں امن وسکون ہو، تم ایک دوسرے کی عزت وآبرو کے محافظ بنو، ان لوگوں کی زندگی سے تم ہرگز متاثر نہ ہونا، جو خواہشات کا شکار ہو کر جانوروں جیسی عادتوں میں مبتلا ہیں، ان کے یہاں محرم وغیر محرم، اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز نہیں، یہ صرف جنس مخالف ہی سے اپنی شہوت پوری نہیں کرتے بلکہ ان کی ہوس نے انہیں ہم جنسی جیسے بدترین عمل تک میں مبتلا کر دیا ہے، ان کی عریانیت فحاشی جسے وہ اپنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جس میں ڈھکیل دینے کے لئے شیطان اپنی پوری قوت استعمال کرتا ہے، یہ عورتوں، مردوں کا اختلاط، یہ کلبوں میں، اپنے غیر کے امتیاز کے بغیر ننگے ڈانس، یہ مردوں اور عورتوں کے دوستی کے نام پر ناجائز تعلقات، انسانی تہذیب وتمدن نہیں ہو سکتا یہ سب شہوت وخواہشات کی تسکین کے گھناؤنے ذرائع ہیں، یہ غیر مہذب قومیں اپنی ظاہری چمک دمک، عیش وعشرت کے فریب میں تمہیں بھی پھانس لینے کی پوری پوری کوششیں کرتی ہیں اے میرے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دامن سے وابستہ ہو جانے والے میرے بندوں ہوشیار، رہو، ایسے لوگوں کے قریب بھی نہ جانا کہ جس ذلت وخواری کی دلدل میں یہ خود پھنسے ہوئے ہیں، تمہیں بھی اسی میں ڈھکیل دیں گے، پس تم ان سے بچتے رہو۔

قرآن کریم نے جو مذکورہ بالا احکام تمہیں دیئے، ان میں تمہاری طبعی کمزوری کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اللہ سے زیادہ تمہاری استطاعت کو جاننے والا، اور کون ہوسکتا ہے، پس تم ان احکام کی تعمیل کرو، تم یہاں آسانی بھی پاؤ گے اور آسائش بھی، ان سے تمہاری ضرورت بھی پوری ہوگی اور عزت ووقار بھی نصیب ہوگا، پس عمل بھی کرو اور دعا بھی کیا کرو کہ اے رحیم وکریم خالق، تو ہمیں اپنے احکام کی تعمیل کی توفیق نصیب فرما اور ان کی برکتیں عطا فرما، آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۲۱

النساء: ۲۹ تا ۳۳

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ
تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا (۲۹)
وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
یَسِیْرًا (۳۰)
اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا
كَرِیْمًا (۳۱)
وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ
لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْــٴَـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ
عَلِیْمًا (۳۲)
وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ

فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۟ (النساء:۲۹-۳۳)

اے ایمان والو! نہ کھاؤ، اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو، تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ ہلاک کرو، اپنے آپ کو بے شک اللہ تمہارے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے اور جو ایسا کرے گا سرکشی اور ظلم سے تو ہم اسے آگ میں ڈال دیں گے اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے اور اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے جن سے تمہیں روکا گیا ہے (تو سے) ہم مٹا دیں گے، تمہارے (نامہ اعمال سے) تمہاری برائیاں اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ، اور نہ آرزو کرو اس چیز کی، بزرگی دی ہے اللہ نے جس سے تمہارے بعض کو بعض پر، مردوں کے لئے حصہ ہے، اس سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور مانگتے رہو اللہ سے اس کا فضل وکرم بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے اور ہر ایک کے لئے ہم نے بنا دیئے وارث، اس مال سے جو چھوڑ جائیں، ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور وہ لوگ جن سے بندھ چکا ہے تمہارا عہد وپیمان تو دو انہیں ان کا حصہ بیشک اللہ ہر چیز کا مشاہد فرمانے والا ہے۔

آیات بالا میں اہل ایمان کو درج ذیل ہدایات دی جارہی ہیں۔

اپنے اموال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ، اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کبائر سے بچتے رہو، دوسروں کی نعمتوں پر نظر نہ رکھو، وارثت میں جو حصہ جس کا مقرر ہے، اس پر راضی رہو اور شکر ادا کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۟ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۟

اے ایمان والو! نہ کھاؤ، اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو، تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ ہلاک کرو، اپنے آپ کو بے شک اللہ تمہارے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے اور جو ایسا کرے گا سرکشی اور ظلم سے تو ہم اسے آگ میں ڈال دیں گے اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے۔

اے ایمان والو:۔ اپنے مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ، اس طرح کہ تم اپنی محنت ومشقت سے کمائی ہوئی دولت کو، ناچ گانے، شراب اور دیگر غیر شرعی کاموں میں صرف نہ کرو، نہ ہی دولت کو بے جا ضرورت سے زائد خرچ کرو کہ اللہ اسراف کو پسند نہیں فرماتا اور نہ ہی کسی دوسرے کا مال چوری، ڈکیتی، غصب، حق تلفی، رشوت، سود اور دیگر غیر شرعی طریقوں سے حاصل کر کے کھاؤ کہ دوسروں کا مال، عزت وآبرو بھی حقیقت میں تمہارے ہی ہیں، ہاں باہمی مرضی سے تمہیں ایک دوسرے سے تجارت کرنا، ایک دوسرے کی ملازمت اور دیانت ومحنت کے ساتھ ان ذرائع سے دولت کمانا تمہارے لئے جائز ہے، اسی میں برکت ہوتی ہے، اسی سے عزت ملتی ہے، اسی سے معاشرے میں امن وسکون ہوتا ہے۔

نیز تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو یعنی مصائب و آلام، دنیاوی الجھنوں اور پریشانیوں سے تنگ آ کر اقدام خودکشی نہ کرو کہ یہ نہایت ہی بزدلی کی حرکت ہے، دنیا و آخرت کو برباد کر لینا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو قتل کرو کہ انسان، انسان کا خون بہانے اور ایک دوسرے کو خوفزدہ کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، وہ تو اس زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، اسے ہمدردی و محبت کا پیکر ہونا چاہئے، جیسے تمہارا خالق ہر حال میں تم پر رحم فرماتا اور مہربانی کرتا ہے۔

اور اگر تم ان واضح ہدایات کے باوجود، سرکشی اور ظلم سے باز نہ آئے، اپنی من مانی کرتے رہے، رزق حلال وحرام میں امتیاز نہ کیا، قتل و غارت گری سے باز نہ آئے، تو سن لو اللہ تمہیں جہنم میں دھکیل دے گا، اس پر یہ کام دشوار نہیں، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اِسراف

اپنی کمائی کو "باطل" سے کھانے کا ایک غیر شرعی طریقہ اسراف ہے، یعنی دولت کو یا تو بے جا خرچ کرنا یا بے بہا خرچ کرنا، جیسا کہ آج کل خصوصاً شادی، بیاہ وغیرہ کے موقع پر اکثر ہوتا ہے، اسراف چاہے دنیاوی امور میں ہو یا دینی امور، ناپسندیدہ، ناجائز اور حرام ہے، اللہ جل مجدہ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ﴿۱۴۱﴾ (انعام:۱۴۱)

اور فضول خرچی نہ کرو بیشک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ (اعراف:۳۱)

اے آدم کی اولاد! پہن لیا کرو، اپنا لباس (پاکیزہ) ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو بیشک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

اپنے نیک وپسندیدہ بندوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

(فرقان:۶۷)

اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچ کرتے ہیں نہ کنجوسی (بلکہ) ان کا خرچ کرنا اسراف اور بخل کے درمیان اعتدال سے ہوتا ہے۔

مؤمن کو کمانا بھی اللہ کے حکم کے مطابق اور خرچ بھی اللہ ہی کے حکم کے مطابق کرنا چاہئے کیونکہ حصول دولت کا ذریعہ قوتِ بازو یا دیگر انسانی کمال نہیں بلکہ رزّاق، حقیقتاً اللہ ہی ہے، جو اپنے فضل سے، جسے جتنا چاہتا ہے، رزق عطا فرماتا ہے، پس یہ اس کا حق ہے کہ اس کی عطا کردہ دولت اس ہی کی مرضی کے مطابق خرچ کی جائے، اس حق کو سوائے مؤمن کے کون پہچان سکتا ہے، لہٰذا اہل ایمان ہی سے مطالبہ ہے کہ "اپنے اموال کو ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ" اسراف نہ کرو، میانہ روی اختیار کرو، اس حکم کی تعمیل سے بے شمار برائیوں کا سدِّ باب ہوتا ہے کیونکہ جن کو اللہ نے دولت دی ہے، جب وہ اس کو صرف

ریاء ونمود کے لئے بے بہا خرچ کرتے ہیں تو غریبوں میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ ان کا پیمانہ صبر جب لبریز ہو جاتا ہے تو وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے چوری، ڈکیتی، جیسے جرائم پر مجبور ہو جاتے ہیں، غریب ملازمین حرص وہوس میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ رشوت جیسے گھناؤنے جرم کے ذریعہ امیروں جیسی زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں، جن کے پاس چند پیسے آجاتے ہیں وہ راتوں رات امیر بننے کی ہوس میں، سودخوری اور جوئے بازی کی راہ پر چل پڑتے ہیں، گویا چند لوگوں کے اِسراف اور فضول خرچی نے مسلم معاشرے کا نظم درہم برہم کر ڈالا، پس اللہ کی نظروں میں یہ مجرم ہیں، جنہیں اللہ پسند نہیں فرماتا، یہ لوگ تو شیطان کے بھائی ہیں، جو مسلمانوں کے معاشی نظام کو برباد کر کے انہیں اپنا محتاج اور دستِ نگر بنالینا چاہتے ہیں، اے ایمان والو تمہاری خوبی تو یہ ہے کہ:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ (بنی اسرائیل:۲۶۔۲۷)

اور دیا کرو، رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی نہ کیا کرو بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکر گزار ہے۔

اسلامی تعلیمات کا بنیادی عُنصر، اعتدال اور میانہ روی ہے، عبادات ہوں یا معاملات، سب میں میانہ روی اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی، مؤمن کو نہ یہ اجازت ہے کہ وہ دنیا کے جھمیلوں اور عیش وعشرت میں ایسا مبتلا ہو کہ اللہ کو فراموش کر بیٹھے اور نہ ہی اس حال کو پسند کیا گیا کہ دنیا کو چھوڑ کر رُہبانیت اختیار کرے، نہ اہل وعیال کے حقوق ادا کرے، نہ والدین اور دیگر رشتہ داروں کے، نہ ہی دنیا کی دیگر ذمہ داریوں کو پورا کرے، بس عبادت میں ایسا مصروف ہو جائے کہ شب وروز مصلّی ہی پر گزریں، یہ نہ تقویٰ ہے، نہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کا ذریعہ بلکہ مؤمن کا اعلیٰ تقویٰ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر عمل کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق بنائے اور یہی میانہ روی ہے، شیطان مؤمن کو یا تو بخیل وکنجوس بنانے کی کوشش کرتا ہے اور یا اِسراف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دونوں ہی طریقے میانہ روی سے دور کرتے ہیں، اسی لئے اللہ ان دونوں طریقوں کی ممانعت فرماتا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ (بنی اسرائیل:۲۹)

اور نہ بنالو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا، اپنی گردن کے اردگرد اور نہ ہی اسے بالکل کشادہ کر دو، ورنہ تم بیٹھ جاؤ گے ملامت کئے ہوئے، تھکے ہوئے۔

کنجوسی بھی نہ کرو کہ اہل وعیال اور دیگر اہل حقوق کی حق تلفی کے مجرم بن جاؤ اور اسراف بھی نہ کرو، کہ دوسروں کے محتاج ہو جاؤ اور ہر کسی کی باتیں اور طعنے سننے پڑیں۔

بہرحال اسراف، دوسروں کی حق تلفی، معاشرے میں حرص وہوس کا باعث بنتا ہے، لہٰذا یہ بھی مال کو ''باطل'' طریقے سے کھانے، خرچ کرنے کا ایک طریقہ ہے جس کی سختی سے ممانعت کی گئی، اس جرم کے مرتکب افراد سے اللہ نے اپنی

ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور انہیں شیطان کا بھائی قرار دیا گیا، پس اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ اپنے اخراجات میں اعتدال کو ملحوظ رکھیں اور:

وَلَا تُطِیْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

(الشعراء:۱۵۱۔۱۵۲)

اور نہ پیروی کرو، حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی جو فساد برپا کرتے رہتے ہیں زمین میں اور اصلاح (کی کوشش) نہیں کرتے۔

نیز ہر نماز کے بعد دعا کیا کرو، وہی، جو اسراف سے بچنے کی تاکید فرمانے والے رحیم و کریم رب نے تعلیم فرمائی کہ اگر سہواً تم سے اسراف ہو جائے تو ہمارے ہی دربار میں حاضر ہو کر یوں عرض کرو:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ

اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کی ہم نے اپنے کام میں اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر۔

دوسروں کا مال باطل سے کھانا

اسلامی تعلیم کے اعتبار سے مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عزت آبرو، مال و دولت کا محافظ ہے تا کہ مسلمانوں میں آپس میں، خوف و ہراس پیدا نہ ہو، انہیں ایک دوسرے سے خطرہ لاحق نہ ہو، اس لئے قرآن کریم نے ''اموالکم'' کا جملہ استعمال فرمایا کہ درحقیقت، تمہارے بھائی کا مال بھی تمہارا ہی ہے، پس جس طرح تم اپنا نقصان پسند نہیں کرتے اسی طرح اپنے بھائی کا بھی نقصان تمہیں گوارا نہیں ہونا چاہیے تم نہیں چاہتے کہ تمہیں کوئی دھوکا دے، تو تم کیسے پسند کرتے ہو کہ تم کسی کو دھوکا دو، تم نہیں چاہتے کہ کوئی تمہارا مال غصب کرے، تو تم کیسے کسی کا مال غصب کرنے کی تدبیریں کرتے ہو، تم نہیں چاہتے کہ کوئی سود کی صورت میں تمہارا خون چوسے، تو تم یتیم کے مال پر قبضہ کی جرأت کیسے کرتے ہو، پس

اے ایمان والو:۔ دوسروں کو دھوکا دے کر، ان کا مال غصب کر کے، انہیں سودی کاروبار میں مبتلا کر کے اپنا پیٹ نہ بھرو، دوسروں کو رشوت کے عذاب میں مبتلا کر کے جہنم کا راستہ اختیار نہ کرو، معاشرے میں معاشی بحران پیدا کر کے اپنی زندگی کو اجیرن نہ بناؤ، یہ تمام اعمال باطل ہیں، باطل سے پیٹ نہ بھرو، اللہ کے احکام پر عمل کرو۔

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (بقرہ:۱۸۸)

اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقے سے اور نہ رسائی حاصل کرو، اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک، تا کہ یوں کھاؤ، کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)

جولوگ، اموال بالباطل کھاتے ہیں، ان میں، بدترین وہ ہیں جو یتیم کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم کی آگ قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ (النساء:۱۰)

بیشک جولوگ کھاتے ہیں، یتیموں کے مال ظلم سے، وہ تو بس کھا رہے ہیں، اپنے پیٹوں میں آگ اور وہ عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی ہوئی آگ میں۔

کوئی یتیم کا مال ہڑپ کرے یا دیگر غیر شرعی ذرائع سے دولت حاصل کرے، بہرحال وہ نہایت ہی بڑا مجرم ہے، کہ پورے معاشرے کو اس نے فتنہ وفساد میں مبتلا کر دیا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے اوپر بھی ظلم ڈھایا ہے کہ ایسا شخص کتنی ہی عیش وعشرت کی، شان وشوکت کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن نہ تو عوام میں اس کی قدر ومنزلت رہتی ہے اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اس کا کوئی عمل قابلِ قبول ہوتا ہے، وہ نمازوں کی پابندی کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، حج وعمرہ کرتا ہے لیکن ظالم حرام کی دولت سے ہی سب کچھ کرتا ہے، وہ اپنی اولاد کو بڑی آسودہ زندگی مہیا کرتا ہے، ماں باپ کو اچھا کھلاتا، اچھا پہناتا ہے اعزاء واقارب، غرباء ومساکین کی مدد بھی خوب کرتا ہے لیکن سب حرام کی دولت سے، کتنا بڑا مجرم ہے، یہ شخص کہ خود بھی حرام کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی حرام میں مبتلا کر دیتا ہے، اس کی بدنصیبی کا اندازہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں کیجئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، بیشک اللہ پاک ہے اور پاک ہی کو پسند فرماتا ہے (یعنی حرام کی دولت کمانے والے، کھانے اور کھلانے والے کا کوئی عمل قابل قبول نہیں) اور بیشک اللہ نے اہل ایمان کو وہی حکم دیا، جو اپنے رسولوں کو دیا کہ فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ (مؤمنون:۵۱)

اے (میرے) پیغمبرو، پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو۔

اور اہل ایمان کو حکم دیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ:۱۷۲)

اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں۔

پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک آدمی کا ذکر سنایا، جو طویل سفر کرتا ہے، بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود ہیں، اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا ہے "یارب" (بڑی عاجزی وانکساری سے دعائیں کرتا ہے) حالانکہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام اور اسے حرام غذا کھلائی جاتی ہے، "فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ" بھلا ایسے شخص کی دعا کیسے قبول کی جائے۔ (مسلم)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِّيَ بِالْحَرَامِ

وہ جسم جنت میں داخل نہ ہوا جو حرام روزی سے پلا ہے۔ (مشکوٰۃ)

اللہ محفوظ رکھے رزق حرام سے، یہ ایک ایسی بلا ہے جس میں ایک مرتبہ مبتلا ہو جانے کے بعد انسان کا اس سے نکلنا ممکن نہیں رہتا، ایک دلدل ہے، جس میں قدم رکھنے والا، اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے جب تک کہ کوئی مضبوط قوت اس کا ہاتھ نہ تھام لے، پس جو بھی اس دلدل میں دھنسا ہوا ہے، اسے چاہئے کہ اولاً خود کوشش کرے، توبہ کرے حرام خوری سے باز آئے اور سہارا لینے کے لئے کسی کا ہاتھ تھام لے، اللہ کے نیک بندے کا، ولی کامل کا ہاتھ کہ یہ ہستیاں، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے گناہ گاروں کو سہارا دینے پر متعین ہیں، یہ ہر قسم کے خوف وغم سے آزاد وہ اللہ کے بندے ہیں، جو خوف زدوں، غم زدوں کو، خوف وغم سے آزاد کراتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا رِزْقًا وَّاسِعًا مُّبَارَكًا حَلَالًا طَيِّبًا اِنَّكَ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ

تجارت

تجارت حصول رزق کا ایک وسیع میدان ہے، جس میں روزی کمانے کے تمام شعبے موجود ہیں، صنعت وحرفت ہو یا ملازمت، یہ سب ذرائع حقیقتاً تجارت ہیں، صنعت وحرفت کا تو بالواسطہ، تجارت ہونا ظاہر ہے، عام طور پر ملازمت کو تجارت نہیں سمجھا جاتا، اس لئے ملازمین، اپنے آپ کو تاجروں سے ایک علیحدہ طبقہ سمجھتے ہیں اور بعض ممالک میں ملازمت کو تجارت سے زیادہ باعزت پیشہ خیال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ یکسر غلط ہے اولاً تو اس لئے کہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا۔ ملازمت، درحقیقت تجارت ہی کا ایک شعبہ ہے کہ تاجر مخصوص اشیاء فروخت کر کے دولت کماتا ہے جبکہ ملازم اپنی آزادی، اپنے وقت، اپنے ہنر وفن یا علم کے ذریعہ محنت ومشقت کر کے دولت کماتا ہے، ثانیاً یہ کہ اگر ملازمت کو تجارت سے علیحدہ مان لیا جائے تو تاجر ملازم سے افضل قرار پاتا ہے کہ تجارت کا متعدد بار قرآن کریم میں ذکر موجود ہے، نیز یہ انبیاء ورسل کی سنت ہے، اولیاء وصالحین کا ذریعہ معاش ہے، اسی لئے احادیث مبارکہ میں تاجروں کے فضائل موجود ہیں اور تجارت کو افضل ترین پیشہ قرار دیا گیا ہے، پس ملازمین کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ خود کو تاجروں ہی میں شمار کریں اور اپنے پیشہ کو تجارت سے علیحدہ نہ سمجھیں۔

حضرت مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کسی نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے اور بیشک اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی کمائی کھایا کرتے تھے، (آپ کا معجزہ تھا کہ لوہا آپ کے ہاتھ میں نرم ہو جاتا تھا، پس آپ زرہیں بنا کر فروخت فرماتے تھے) (بخاری)

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا گیا کہ کونسا ذریعہ معاش پاکیزہ (حلال) ہے تو آپ نے فرمایا:

عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهٖ وَكُلُّ بَيْعٍ مَّبْرُوْرٍ

آدمی کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور ہر جائز تجارت۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ (ترمذی)

بہت سچے اور دیانت دار تاجر (کا حشر) نبیوں، صدیقوں، اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

حضرت عبید بن رفاعہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلتُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَبَرَّ وَصَدَقَ

قیامت کے دن (بددیانت) تاجروں کا حشر نافرمانوں کے ساتھ ہوگا سوائے اس کے، جو ڈرتے ہوئے حرام سے بچے، جھوٹی قسم نہ کھائے اور سچ بولے۔ (ترمذی)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْهُ لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللّٰهِ وَلَمْ تَزَلِ الْمَلٰٓئِكَةُ تَلْعَنُهٗ

جو شخص عیب دار چیز بیچے اور اس کا عیب ظاہر نہ کرے ہمیشہ اللہ کے غضب میں رہے گا اور ہمیشہ فرشتے اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔ (ابن ماجہ)

یہ ہے، روزی کمانے کا وہ وسیع میدان، جس میں رزق کے خزانے دبے ہوئے ہیں، پس

اے ایمان والو:۔ حرام کی کمائی سے بچو اور اس میدان میں کود پڑو، محنت ومشقت تم کرو، روزی ہم دیں گے جتنا پسینہ بہاؤ گے اتنی ہی برکت ہوگی، اتنا ہی سکون میسر آئے گا کہ حلال رزق کھا کر انسان کو ایسا سرور محسوس ہوتا ہے، جس کے مقابلے میں دنیا کا تمام عیش کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور دیکھو یہ تجارت بھی تب ہی سودمند، نفع بخش ہوتی ہے جب مال فروخت کرنے والا اور خریدنے والا دونوں مطمئن ہوں اور یہ اطمینان اسی وقت حاصل ہوگا جبکہ دونوں ہی دیانت سے سودا کریں اور اگر دھوکہ بازی اور بددیانتی اختیار کی تو نہ ہی اطمینان میسر آئے گا اور نہ ہی برکت نصیب ہوگی۔

آیت زیر گفتگو میں "لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" کے معنیٰ یہ ہیں، اپنے آپ کو قتل نہ کرو، اپنے مسلمان بھائیوں کو قتل نہ کرو، اپنی بدکرداری سے اپنی عزت وآبرو پامال نہ کرو، ہم ان تینوں عنوانات پر مختصر گفتگو کرنا چاہتے ہیں:

خودکشی

اپنے آپ کو قتل کرنا، خودکشی ہے، چاہے کسی طرح ہو، گردن میں پھندا ڈال کر، زہر کھا کر، گولی مار کر، یہ اور ان جیسے تمام طریقے، جن سے موت واقع ہو جائے، خودکشی ہے، جس کا سبب کسی نہ کسی قسم کی تکلیف، مثلاً بیماری، بے روزگاری وغیرہ سے نجات حاصل کرنا ہوتا ہے، یا کسی ناکامی کا صدمہ یا شرمندگی برداشت نہ کر سکنے کے باعث کی جاتی ہے، بہرحال سبب کوئی بھی ہو، یہ اللہ کے فیصلوں سے فرار کی کوشش ہے، اس کی شان رحیمی وکریمی کا عملی انکار ہے، نہایت ہی کم ہمتی اور بزدلی ہے لہٰذا اسلام اس کو بدترین گناہ قرار دیتا ہے اور اس کے مرتکب کا ٹھکانہ جہنم بتاتا ہے کیونکہ انسان کا جسم اور اس کی جان اللہ کی ملکیت ہے، یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے انسان کو خوبصورت جسم دیا، صحیح اعضاء دیئے اور ان میں جان ڈالی، پس انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے ہر عضو کو اللہ ہی کی مرضی کے مطابق استعمال کرے، ورنہ یہی اعضاء قیامت کے دن اس کے خلاف گواہی دیں گے، فرمایا گیا:

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النور: ۲۴)

وہ یاد کریں، اس دن کو جب گواہی دیں گے، ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر، ان اعمال پر جو وہ کرتے تھے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (یس: ۶۵)

آج (قیامت کے دن) مہر لگا دیں گے ہم ان کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پیر، اس کی جو وہ کمایا کرتے تھے۔

گویا یہ اعضاء پہچانتے ہیں کہ ان کا خالق کون ہے، مالک کون ہے، انسان بڑا ظالم ہے، جو اپنے خالق و مالک کو بھول کر ان اعضاء کو اپنا سمجھ بیٹھتا ہے اور جسے چاہتا ہے استعمال کرتا ہے، یہ تو ہمارے پاس اللہ کی امانت ہیں، ہم پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ ان کی خدمت کریں اور ان کو اصل مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کریں، ہم صرف ان کے امین ہیں مالک نہیں اسی لئے شریعت اجازت نہیں دیتی کہ کوئی اپنے جسم کا کوئی حصہ فروخت کردے یا کسی کو ہبہ کردے، نہ زندگی میں ایسا کرسکتا ہے اور نہ بعد موت کسی کو ایسا کرنے کی وصیت کرسکتا ہے، پس جس چیز کے ہم مالک ہی نہیں، ہمیں اس کو ضائع کردینے کا کیسے حق مل سکتا ہے، جس نے اس جسم کو ضائع کیا، یعنی خودکشی کرلی، گویا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی کھلی بغاوت کی، اب اس کی سزا یہی ہوسکتی ہے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہو، نیز دیگر گناہوں سے تو توبہ کی جاسکتی ہے کہ توبہ کا وقت ملتا ہے، یہ ایسا گناہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی توبہ کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے، اب اس کا مرتکب جہنم کی آگ سے، اللہ کے عذاب سے کس طرح بچ سکتا ہے۔

وہ مسلمان نہایت ہی احمق ہے، جو مصائب و آلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے، خودکشی جیسا مذموم عمل اختیار کرے کہ اس پر تو اللہ کا بڑا ہی کرم ہے کہ اس کے تو مصائب بھی، اس کے گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا کہ

لَا يُصِيْبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ وَّصَبٍ وَّلَا نَصَبٍ وَّلَا سَقَمٍ وَلَا حَزَنٍ حَتَّى الْهَمَّ يَهُمُّهُ اِلَّا كُفِّرَ بِهٖ مِنْ سَيِّئَاتِهٖ

مسلمان پر جو مصیبت آتی ہے، بیماری ہو، تھکاوٹ ہو، تکلیف ہو، غم ہو، یا کوئی بھی پریشانی ہو، اللہ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (مسلم)

کیسا خوش نصیب ہے مسلمان کہ اس کی تکالیف بھی اس کے لئے گناہوں سے نجات کا باعث بنتی ہیں دیگر احادیث میں ہے کہ مسلمان کو اگر کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ اس پر بھی اسے اجر دیتا اور اس کا مرتبہ بلند کردیتا ہے لیکن کیسا ظالم ہے وہ مسلمان جو اللہ کے سایہ رحمت میں پناہ گزیں ہونے کے بجائے اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور بدنصیب بن جاتا ہے، جہنم کا سزاوار ہو جاتا ہے۔

آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں اپنے غلاموں کی بدعملی سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور جو اپنے غلاموں کی بخشش پر حریص ہیں، خودکشی کرنے والے کا خود ہی انجام بیان فرماتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا'' جس شخص نے، اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر مار ڈالا، اسے جہنم میں گرایا ہی جاتا رہے گا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور جس شخص نے زہر کھا کر اپنی جان دی تو اس کے ہاتھ میں زہر ہوگا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو لوہے کے کسی ہتھیار سے مار ڈالا، تو وہ ہتھیار جہنم میں اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور وہ اس کو اپنے پیٹ کے اندر جھونکتا رہے گا، (العیاذ باللہ)، (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جو شخص، اپنے آپ کو گلا گھونٹ کر مار ڈالے، وہ دوزخ میں بھی اپنا گلا گھونٹتا رہے گا اور جو اپنے آپ کو نیزہ مار کر مر جائے، وہ دوزخ میں بھی اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا، (بخاری)

اے ایمان والو! مصائب وآلام سے گھبرا کر، ناکامی ونامرادی پر شرمندہ ہو کر، اپنی جان نہ لو، بلکہ ان کو بھی اللہ کی رحمت جانو، کہ وہ تمہارے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں، ان پر صبر کرو، تو اللہ ان کے بدلے تمہیں بے شمار نعمتوں، راحتوں اور خوشیوں سے نوازے گا۔

مسلمان بھائی کو قتل کرنا

اسلام مسلمانوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیتا ہے کہ وہ بظاہر علیحدہ علیحدہ افراد ہیں لیکن حقیقت میں ایسی ایک جان ہیں کہ ان کی جان، ان کا مال، ان کی عزت وآبرو، سب کی مشترک ہے، ان کا آرام سب کا آرام ہے، ان کی تکلیف، سب کی تکلیف ہے، وہ ایک دوسرے کے جان ومال اور عزت وآبرو کے محافظ بھی ہیں اور معاون ومددگار بھی، ان سے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی کو تکلیف پہنچائیں گے، یا کسی کی جان لیں گے، یہی وجہ ہے کہ اگر مسلم معاشرہ صحیح ہو اور تمام مسلمان دین کے پابند ہوں تو اس میں جو امن، سکون، چین، بے خوفی نظر آتی ہے، اس کی نظیر کسی دوسری قوم کے معاشرے میں نہیں مل سکتی، یہ نتیجہ ہے، معلم کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا، جنہوں نے مسلمانوں کے مابین، امیر وغریب، حاکم ومحکوم، رنگ ونسل، زبان، آقا وغلام کی تفریق مٹا کر انہیں ایک جان کر دیا، انہیں سیسہ پلائی دیوار کی طرح مضبوط قوم بنا دیا، بطور نمونہ آپ ﷺ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضاً ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ

مسلمان، مسلمان کے لئے دیوار کی طرح ہے، جو ایک دوسرے کو مضبوط کرتا ہے پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کیا۔ (بخاری ومسلم)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى

عَضُواً تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰی

تم مسلمانوں کو آپس میں، مہربانی محبت وشفقت کرتے ہوئے ایسا دیکھو گے، جیسے ایک جسم کہ جب ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے، تو سارے اعضاء ایک دوسرے کو بے خوابی اور بخار کی طرف بلاتے ہیں۔
(بخاری ومسلم)

یہ بھی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُوْنَ كَجَسَدٍ وَّاحِدٍ اِنَ اشْتَكٰى عَيْنُهٗ اِشْتَكٰى كُلُّهٗ وَاِنِ اشْتَكٰى رَاْسُهٗ اِشْتَكٰى كُلُّهٗ

ایمان والے آپس میں ایک جسم کی طرح ہیں کہ اگر آنکھ کو تکلیف ہو جائے تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر سر کو تکلیف ہو جائے تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے۔ (مسلم)

اندازہ لگائیے، جس مذہب کی یہ تعلیم ہو وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے ماننے والے، آپس میں سیاسی، معاشی، یا ذاتی دشمنی کی بناء پر ایک دوسرے کا خون بہائیں، اسی لئے از روئے قرآن شریعت اسلامیہ نے اس کی سخت سزا مقرر فرمائی، واضح رہے کہ اسلامی سزائیں واقعی بہت سخت ہیں، قاتل کو مقتول کے بدلے قتل کر دینے، چور کا ہاتھ کاٹ دینے، زانی کو سو کوڑے مارنے یا سنگسار کرنے کی سزائیں، لیکن ان کا مفاد عظیم ہے کہ اول تو صرف اسلامی قانون کے نفاذ سے ہی جرائم ختم ہو جاتے ہیں کہ کسی کو ہمت ہی نہیں پڑتی کہ ایسی سخت سزا کے ہوتے ہوئے جرم کرے اور اگر کوئی جرم کرتا بھی ہے تو وہ اس سزا کے ملنے کے بعد دوسروں کے لئے عبرت بن جاتا ہے اور کوئی دوسرا اس جرم کے ارتکاب کی ہمت نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ آج بھی جن ممالک میں اسلامی قانون نافذ ہے، وہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں اور جہاں مجرموں کے لئے جیلوں کی شاندار عمارتیں موجود ہیں اور ان میں ہر قسم کا آرام مہیا ہے وہاں جیلیں بھری ہوئی ہیں اور ان سے باہر جرائم کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے، بعض ممالک جن میں موت کی سزا کو انسان پر ظلم تصور کیا جاتا ہے اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس سزا کے بغیر، امن وامان کا حصول ناممکن ہے۔

بہرحال اسلام جو بالخصوص مؤمنون کے لئے رحمت ہے، قاتل مؤمن کی، جو کسی مسلمان بھائی کو قتل کرے، جو سزا مقرر کرتا ہے، قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں ملاحظہ فرمایئے، فرمایا گیا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٩٢﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا

عَظِيْمًا۝ (النساء: ۹۲۔۹۳)

اور نہیں (جائز) کسی مؤمن کے لئے، کہ کسی مؤمن کو قتل کرے، مگر غلطی سے اور جس نے کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کیا، تو (سزا یہ ہے) آزاد کرے مسلمان غلام کو، اور خون بہا ادا کرے مقتول کے گھر والوں کو، مگر یہ کہ وہ خود ہی معاف کر دیں پس اگر (مقتول) مؤمن ہو، تو قاتل آزاد کرے ایک مسلمان غلام، اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ ہو چکا ہے، تمہارے اور اس کے درمیان معاہدہ، تو قاتل خون بہا دیدے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے ایک مسلمان غلام اور جو غلام نہ پا سکے، تو روزے رکھے دو ماہ کے لگا تار، (اس گناہ کی) توبہ اللہ کی طرف سے (یہی مقرر ہے) اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو شخص قتل کرے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر تو اس کی سزا جہنم ہے، ہمیشہ رہے گا اس میں اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اسے اپنی رحمت سے دور کر دے گا اور تیار کر رکھا ہے، اس نے اس کے لئے دردناک عذاب۔

آیات مذکورہ کی قدرے وضاحت ضروری ہے تاکہ اس عبرتناک سزا کو سمجھنے میں آسانی ہو، ابتدائی جملہ تو واضح ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ مسلمان کو قاتل بننا ہی نہیں چاہئے کہ وہ تو امن کا علمبردار ہے، فتنہ وفساد، اس کو کسی صورت میں زیب نہیں دیتا اور اگر کوئی قاتل بن ہی گیا، تو وہ سزا سن لے، اب وہ مسلم معاشرے کا باعزت فرد نہیں، بلکہ مجرم ہے، جسے سزا بھگتنا ہوگی، اس جرم کی دو صورتیں ہیں، قتل خطاء اور قتل عمد۔

قتل خطاء:۔ قتل خطاء یعنی غلطی سے کسی کا قتل ہو جانا، مثلاً کفار کے ساتھ جنگ ہو رہی تھی، اتفاق سے مجاہد کی زد میں اس کا اپنا ہی مسلمان بھائی آ گیا، کوئی شکار کا نشانہ کر رہا تھا کہ نشانہ غلط ہوا اور اپنا ہی ساتھی مارا گیا یہ اور اس جیسی صورت قتل خطاء کی ہیں اس کی تین صورتیں ہیں:

1۔ مقتول عام مسلمان ہو، غلطی سے مارا گیا، تو قاتل کی سزا یہ ہے کہ ایک مسلمان غلام یا باندی آزاد کرے اور اس کے وارثوں کو شریعت کی مقرر کردہ دیت، خون بہا بھی ادا کرے، ہاں اگر وارث خون بہا معاف کر دیں تو یہ ان کی مہربانی ہے، جس پر اسے شکر گزار ہونا چاہئے۔

2۔ مقتول مسلمان ہو لیکن کافروں کے ملک میں، ان کے ساتھ رہتا ہو، ایسے شخص کو غلطی سے مار دیا، تو سزا یہ ہے کہ ایک مسلمان غلام یا باندی آزاد کرے، دیت نہیں ہے، کیونکہ خون بہا کے طور پر جو دولت ادا کی جائے گی، اس سے کافروں کو فائدہ ہوگا، جو دشمن ہیں۔

3۔ مقتول مسلمان ہو یا کافر، لیکن اس کا تعلق ایسی غیر مسلم قوم سے ہو، جس کے اور مسلمانوں کے درمیان، امن و امان کا معاہدہ طے پا چکا ہو، ایسی صورت میں قاتل کو مقتول کے وارثوں کو خون بہا بھی ادا کرنا ہوگا اور ایک مسلمان غلام یا باندی کو بھی آزاد کرنا ہوگا۔

غلام یا باندی کا آزاد کرنا تینوں صورتوں میں موجود ہے لیکن یہ جب ہی ممکن ہے کہ قاتل کے پاس غلام یا باندی ہو، اگر نہ ہو، اور خریدنے کی قوت بھی نہ ہو، یا نہ مل سکے، جیسا کہ ہمارے دور میں ہے کہ اب تو غلام و باندی کا سلسلہ ہی ختم ہو چکا ہے تو ایسی صورت میں قاتل کو خود جسمانی تکلیف اٹھانی پڑے گی اور وہ یہ کہ وہ لگا تار دو مہینے کے روزے رکھے، اگر بلا عذر شرعی اس نے روزہ چھوڑ دیا، تو پھر شروع کرے اور دو مہینے تک رکھے۔

دو صورتوں میں قاتل خون بہا بھی ادا کرے گا، جس کو قرآنی اصطلاح میں دیت کہا جاتا ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس دیت کا تعین فرمایا کہ ایک انسان کا خون بہا سو اونٹ ہیں، اگر کسی ملک میں اونٹوں کا لین دین نہ ہوتا ہو، تو اونٹوں کی قیمت معلوم کی جائے گی اور سو اونٹوں کے مساوی ملکی سکہ میں دیت ادا کی جائے گی، یہ بات قابل غور ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دیت کا تعین اونٹوں سے کیا ہے، درہم و دینار وغیرہ سے نہیں کیونکہ ہر دور میں اور ہر ملک میں سکہ کی قیمت یعنی قوت خرید گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، دیت اگر ایسے وقت ادا کی گئی جب سکہ کی قوت خرید گھٹی ہوئی ہے تو اس کے مطابق انسان کی قدر بھی گھٹ جائے گی، وہ جو انسان کی قدر و منزلت بلند کرنے کے لئے تشریف لائے کیسے گوارا فرما سکتے تھے کہ کسی حال میں بھی انسان کی قدر و منزلت کم ہو، پس اونٹوں کا تعین فرمایا، جس کی قیمت ہر آنے والے دن بڑھتی ہے، اس طرح ہر دور میں انسان کی قدر و منزلت بڑھ رہی ہے۔

قتلِ عمد

یعنی کسی مسلمان بھائی کو مسلمان جانتے ہوئے، قصداً اور ظلماً قتل کرنا، اس کا باعث سیاست ہو، معیشت یا ذاتی عداوت، نیز قتل کی کوئی صورت بھی اختیار کی جائے، دھاردار آلے سے قتل کیا جائے، گولی مار کر، گلا گھونٹ کر یا زہر وغیرہ دے کر، ایسے قتل کی دنیاوی سزا تو قاتل کا پتہ چل جانے کے بعد، صورت قتل کے مطابق، شرعی قانون سے دی ہی جائے گی لیکن آخروی سزا بڑی ہی بھیانک ہے کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اللہ کا غضب اور لعنت اس پر ہوتی رہے گی، (الامان والحفیظ) وہ لوگ اس سزا پر غور کریں اور اللہ کا خوف کریں جو مالی جھگڑوں، سیاسی اختلافات کی بناء پر قتل و غارت گری کو معمولی سمجھتے اور اپنے ہی بھائیوں کا چین و سکون پامال کرتے ہیں۔ جیسا کہ آج کل مسلم ممالک میں عام ہو رہا ہے۔

قاتل کی یہ سزا یقینی ہے، لیکن اگر اس نے توبہ کر لی تو اسے اور عام مسلمانوں کو اللہ سے ہی امید رکھنی چاہئے کہ وہ رحیم و کریم، جس نے توبہ کے بعد ہر قسم کے گناہ بخش دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اس بدنصیب کی بھی توبہ قبول فرمائے گا کہ جو رب کریم کفار و مشرکین کو ایمان قبول کرنے کے بعد بخش دیتا ہے، وہ مؤمن کو تائب ہونے کے بعد ضرور معاف کر دے گا، نیز اسی رب غفور و رحیم کے محبوب کا مژدہ ہے کہ "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہو جاتا ہے، جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں، یہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، جو بلا شبہ حق ہے، تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ گناہ کر لیا جائے، اس سہارے کہ توبہ سے چھٹکارا مل ہی جائے گا۔

اب آیئے دیکھیں، آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم، مؤمن کو قتل کرنے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، حضرت

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِی الدِّمَآءِ

قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں کے درمیان قتل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ (مسلم شریف)

کسی کو قتل کرنا، اللہ کے نزدیک اس قدر مبغوض و ناپسندیدہ ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے یہی مقدمہ نمٹایا جائے گا، یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ حدیث شریف ہی سے ثابت ہے کہ "قیامت کے دن سب سے پہلے بندوں سے نماز کے متعلق سوال کیا جائے گا" پس معلوم ہونا چاہئے کہ دو میں سے پہلے کون سا سوال ہوگا تو احادیث کی کتب شرح میں اس کی تفصیل موجود ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق اللہ میں اولاً نماز کا سوال ہوگا اور حقوق العباد میں اولاً قتل مؤمن کے متعلق سوال ہوگا، پس مؤمن کو چاہئے کہ نماز کی پابندی کرے اور قتل مؤمن جیسے بدترین عمل سے بھی بچا رہے بلکہ ایسے لوگوں اور ایسی تنظیموں سے بھی دور رہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کو قتل و غارت پر آمادہ کرتی ہوں۔

حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ حَمَلَ عَلَیْنَا السِّلَاحَ فَلَیْسَ مِنَّا

جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (بخاری شریف)

نہایت قابل غور ارشاد ہے امت کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو امت سے خارج قرار دے رہے ہیں جو امتی ہو کر، اپنے بھائی پر ہتھیار اٹھائے، یعنی ارادۂ قتل کرے، یہ وعید صرف ارادہ قتل پر ہے، اگر ارادے کی تکمیل ہوگئی اور مسلمان بھائی کو قتل کر دیا، تب تو بہت ہی برا کیا، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ یَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَاِنَّ رِیْحَهَا تُوْجَدُ مِنْ مَسِیْرَةِ اَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا

جس نے کسی معاہد کو قتل کیا، وہ جنت کی مہک تک نہ پائے گا اور بیشک جنت کی مہک چالیس برس کے راستے تک پہنچتی ہے۔ (ترمذی)

معاہد، وہ شخص ہے، جس سے یا اس کی قوم و حکومت سے مؤمن کا یا مؤمن قوم و حکومت کا معاہدہ ہو چکا ہو کہ وہ ایک دوسرے کی جان و مال کی حفاظت کریں گے، جس نے اپنے معاہد کو قتل کر دیا، وہ جنت کی مہک تک نہ پائے گا، تو کیا حال ہوگا، اس شخص کا جس نے اپنے مسلمان بھائی کو قتل کر دیا کہ اس سے تو رشتہ اسلام کا ہے، جو تمام رشتوں سے مضبوط تر ہے۔ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت بھی فرما دی کہ جنت کی مہک کے لئے جنت سے بہت قریب ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ تو چالیس برس کی مسافت تک پہنچتی ہے، پس جو شخص بھی اس سے محروم کیا جائے گا، گویا وہ جنت سے چالیس برس کی مسافت سے زیادہ دور رہے گا، کس قدر بدنصیب ہوگا، ایسا شخص کہ اس نے صرف جنت کے حصول کے لئے ہی تو ایمان اور اسلام قبول کیا تھا اور اپنے ایک احمقانہ عمل سے اس نے اپنی ساری زندگی کی محنت رائیگاں کر دی، اللہ محفوظ رکھے۔

قتلِ عمد کی تاریخ

قتل عمد کی تاریخ بہت پرانی ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِّنْ دَمِهَا لِاَنَّهٗ كَانَ اَوَّلَ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ

جس شخص کو بھی ظلماً قتل کیا جاتا ہے، اس کا گناہ آدم علیہ السلام کے اس پہلے بیٹے پر ہوتا ہے، جس نے سب سے پہلے قتل کو ایجاد کیا تھا۔

اس پہلے قاتل کا نام ''قابیل'' تھا جس کا واقعہ قرآن کریم، سورۂ مائدہ کی آیات، ۲۸ تا ۳۱ میں موجود ہے، جس کی تفصیلی بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یوں ہے کہ حضرت حواء کے بطن سے ہر مرتبہ دو بچے پیدا ہوتے تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی، حضرت آدم علیہ السلام، ایک جوڑے کے لڑکے کا نکاح دوسرے جوڑے کی لڑکی کے ساتھ کرتے تھے، آپ کے زمین پر تشریف لانے کے ایک سال بعد، قابیل اور ان کی بہن اقلیما، پیدا ہوئے پھر ہابیل اور اس کی بہن یوذا پیدا ہوئے، چاروں کے جوان ہوجانے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ قابیل کی شادی یوذا سے اور ہابیل کی شادی اقلیما سے ہوگی، لیکن ہابیل نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کیا اور کہا کہ میں تو اپنی بہن یوذا سے ہی شادی کروں گا کیونکہ وہ بہت حسین تھی جبکہ اقلیما ایسی نہ تھی، آدم علیہ السلام نے فرمایا، اب فیصلہ اس طرح ہوگا کہ تم دونوں، اللہ کے دربار میں قربانی پیش کرو، جس کی قربانی قبول ہوگی، اس کی شادی یوذا سے ہوگی اور اس وقت قربانی قبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ آسمان سے ایک آگ اترتی تھی، اس سے جس قربانی کا گوشت جل کر خاکستر ہوجاتا، وہی مقبول سمجھی جاتی تھی، پس قابیل و ہابیل نے قربانی دی، اور ہابیل کی قربانی قبول ہوگئی، قابیل نے اس فیصلہ کو بھی قبول نہ کیا اور وہ اپنے بھائی، ہابیل کو قتل کردینے پر آمادہ ہوگیا اور بالآخر ایک دن اس نے اپنا ارادہ پورا کرلیا اور ہابیل کو پتھر سے، لوہے سے، یا گلا گھونٹ کر (مختلف روایات ہیں) مار دیا، اب قابیل، مقتول کی لاش ٹھکانے لگانے کے لئے پریشان ہونے لگا (شاید اس وقت تک کوئی مرا نہ ہوگا اور انسان کو دفن کرنے کا طریقہ معلوم نہ ہوا ہوگا) پس اللہ نے ایک کوے کو بھیجا، جو زمین کھودنے لگا، قابیل نے بغور دیکھا تو سمجھ گیا اور اپنی کم عقلی پر نادم ہوا اور اس نے بھی ہابیل کی لاش کو زمین کھود کر دفن کردیا۔

یہ ہے قتل عمد کی ابتداء، اور اسی سے قاتل کے خائب و خاسر ہونے کا بھی آغاز ہوتا ہے کہ تاریخ انسانیت میں کبھی کوئی قاتل اپنے مقصد میں کامیاب و کامران نہ ہوسکا، دنیا میں اس کی عزت و آبرو برباد ہوئی، سب نے اس پر ملامت کی اور اسے ظالم و جابر کہا اور آخرت میں اس کا ٹھکانہ جہنم کی آگ قرار پائی۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ (الشعراء:۲۲۷)

اور عنقریب جان لیں گے، جنہوں نے ظلم و ستم کئے کہ وہ کس (بھیانک) جگہ لوٹ رہے ہیں۔

قتلِ عزت

''وَلَاتَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' کا ایک معنیٰ ،مفسرین نے ،اپنی یا اپنے بھائیوں کی عزت وآبرو قتل کرنا کے بھی کیا ہے، یعنی اہل ایمان کو ہدایت کی جارہی ہے کہ اپنی یا اپنے بھائیوں کی عزت وآبرو کا قتل نہ کرو، پس آیئے، اس موضوع پر بھی مختصر گفتگو ہو جائے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ عزت وآبرو کو پسند کرتا ہے اور اسے اپنی ہر چیز سے زیادہ عزیز و اہم سمجھتا ہے، اس کے حصول اور اس کی حفاظت کے لئے ،وہ اپنے مال ودولت ،اولاد ووطن ،ہر چیز کی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے، لیکن دنیا کے جتنے ذرائع سے عزت حاصل کی جاتی ہے، وہ حقیقت نہیں ہوتی ،خود فریبی ہوتی ہے، اس میں ثبات نہیں ہوتا، وہ عارضی اور وقتی ہوتی ہے، اس کی بات ہی کرنا بے سود و بے فائدہ ہے، آیئے اس عزت وآبرو کی بات کریں، جو ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے، دائمی ہوتی ہے، دنیا میں بھی ہوتی ہے، آخرت میں بھی، یہ وہ عزت ہے جو اسلام کے ناطے سے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مؤمن کو بطور تحفہ دی جاتی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (فاطر:١٠)

جو عزت کا طلب گار ہو (وہ جان لے) کہ ہر قسم کی عزت اللہ ہی کے لئے۔

کسی ذریعہ سے، کسی در کا بھکاری بننے سے ،عزت نہیں ملتی، یہ خیال خام ہے کہ دولت مندوں ،حاکموں ،یا دنیاوی قوت وطاقت رکھنے والوں کی چاپلوسی اور فرمانبرداری سے عزت مل سکتی ہے، ہرگز نہیں ،عزت کا خزانہ تو اللہ کے پاس ہے، پس اسی سے عزت کی بھیک مانگا کرو اور کہا کرو:

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۔

اے اللہ تو جسے چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔

پس اے اللہ، میں تیرے محبوب کا غلام ہوں، جسے تو نے بہت عزت دی، واسطہ، عزت رسول ﷺ کا، مجھے بھی عزت والا بنادے، آمین۔

رسول ﷺ کی غلامی کے صدقے اہل ایمان کو جو عزت نصیب ہے، دنیا والے اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں، عزت دینے والا اس کا اعلان فرماتا ہے اور قیامت تک باقی رہنے والی کتاب، قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (منافقون:٨)

اور ساری عزت تو صرف اللہ کے لئے اور اس کے رسول ﷺ کے لئے اور مسلمانوں کے لئے ہے، مگر منافقین (اس حقیقت کو) جانتے ہی نہیں۔

اے ایمان والو:۔ تمہاری عزت حقیقت میں عزت ہے، بڑی نعمت ہے، اللہ کا عطیہ ہے، اس کی حفاظت کرو، بدکرداری سے نہ اپنی عزت کا قتل کرو اور نہ ہی اپنے مسلمان بھائیوں کی عزت کو پامال کرو، ایسا کرو گے تو عیش وعشرت، آسائش وآرام

کے سارے اسباب کے باوجود دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی، اور ایسا ہی ہو رہا ہے کہ آج تم مادی و ظاہری وسائل کے مالک ہوتے ہوئے بھی غیروں کے محتاج کر دیئے گئے ہو، آزاد ہوتے ہوئے بھی غلام ہو، جبکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ

تا داغ غلامی تو داریم
ہر جا کہ می رویم پادشاہیم

لیکن اس کے برعکس ہو رہا ہے، بادشاہت کے صرف جبے رہ گئے، جھولیاں غیروں کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں، در، در کی ٹھوکریں ہیں، ہر ایک کے سامنے کاسہ گدائی پھیلا ہوا ہے، یہ ہے بدکرداری کا انجام، یہ ہے قتل عزت۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا۝

اور اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے جن سے تمہیں روکا گیا ہے جس سے ہم مٹا دیں گے، تمہارے (نامہ اعمال سے) تمہاری برائیاں اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ۔

اے ایمان والو:۔ تمہارے لئے ایک مژدہ، ایک خوشخبری ہے، کہ تمہارا مہربان رب تم سے وعدہ فرماتا ہے کہ اگر تم کبائر سے بچتے رہو، تو ہم تمہارے باقی گناہ (صغائر) اپنے فضل وکرم سے تمہارے اعمال ناموں سے مٹا دیں گے اور تمہیں دنیا و آخرت میں باعزت بنا دیں گے، پس آؤ ماضی کے کبائر سے توبہ کر لو اور مستقبل میں کبائر سے بچنے کا عزم کر لو، اللہ کو بخشتے دیر نہیں لگتی، وہ بڑا ہی غفور اور رحیم ہے۔

اجتناب

گناہ سے اس حال میں بچنا کہ گناہ کرنے کی قوت موجود ہو، وسائل موجود ہوں، ماحول موجود ہو اور پھر مؤمن محض، اللہ اور رسول ﷺ کی ناراضگی کے سبب بچا رہے۔

ہر گناہ برا ہے

آیت مبارکہ میں گناہ کبیرہ سے اجتناب کا ذکر فرمایا گیا ہے، جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ گناہ صغیرہ بھی ہوتے ہیں گویا گناہ کی دو قسمیں ہیں، گناہ کبیرہ، گناہ صغیرہ، قبل اس کے کہ ہم گناہ کبیرہ کی تفصیل پیش کریں، یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہ کسی قسم کا بھی ہو، معمولی نہیں ہوتا، کیونکہ گناہ نام کا ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی اور حکم عدولی کا، جو ہر صورت میں نہایت سخت جرم ہے، جیسا کہ علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ ''اللہ و رسول ﷺ کی ہر نافرمانی اور اس کی مرضی کی، مخالفت کبیرہ ہی ہے، جس سے مؤمن کو بچنا چاہئے۔''

خوب فرمایا کسی بزرگ نے کہ چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ کی مثال ایسی ہے، جیسے چھوٹا بچھو اور بڑا بچھو، یا آگ کا بڑا انگارا اور چھوٹی چنگاری، بچھو چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، انسان کو تکلیف پہنچاتا ہے، آگ کا انگارا ہو یا چنگاری، جلاتی ہی ہے، پس

گناہ بڑا ہو یا چھوٹا، بہرحال اللہ اور رسول ﷺ کی ناراضگی کا باعث ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے گناہ کبیرہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا، ''کُلُّ مَانُھِیَ عَنْہُ فَھُوَ کَبِیْرَۃٌ'' جس کام سے شریعت مطہرہ میں منع کیا گیا ہے، وہ گناہ کبیرہ ہے۔

محمد بن کعب قرظی رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ اللہ کی سب سے بڑی عبادت، گناہوں کا ترک کرنا ہے جو لوگ، نماز و تسبیح کے ساتھ گناہوں کو نہیں چھوڑتے ان کی عبادات قبول نہیں ہوتیں۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا اور معمولی سمجھو گے، اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہوگا، نیز بعض بزرگوں کا قول ہے کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے، جو انسان کو کافرانہ عقائد و اعمال کی دعوت دیتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ بڑے گناہ سات ہیں، آپ نے فرمایا'' سات نہیں، سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا''

حضرت امام حجر مکی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب'' الزواجر'' میں کبیرہ گناہوں کی ایک فہرست بیان کی ہے، ان کی تعداد چار سو ساٹھ تک پہنچی ہے اور ہر گناہ کی انہوں نے تشریح کی ہے۔

بہرحال گناہ کوئی بھی ہو، برا ہے، ہاں گناہوں کی سزا، ان کے برے نتائج میں فرق ضرور ہے، اسی لئے ان کی دو قسمیں کردی گئیں، جن گناہوں کی سزائیں سخت اور نتائج و اثرات بہت خراب ہیں، انہیں کبیرہ اور جن کی سزائیں کم اور نتائج و اثرات کچھ زیادہ برے نہیں، انہیں صغیرہ قرار دیا گیا، یہی صغیرہ گناہ، معمولی سمجھ کر اگر مستقل کئے جائیں تو کبیرہ بن جاتے ہیں، رہی بات اثرات کی تو کم اثر ہو یا زیادہ بہرحال مؤمن کے دامن پر ایک داغ کی مانند ہوتے ہیں، داغ چھوٹا ہو یا بڑا برا ہی لگتا ہے، اسی طرح گناہ بڑا ہو یا چھوٹا، مؤمن کے لئے زیب نہیں دیتا، نیز یہ صغائر ہی دل پر سیاہ نقطہ پیدا کرتے ہیں، جن کی عادت مؤمن کے پورے دل کو سیاہ کردیتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ'' مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے، تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ واستغفار کرلیتا ہے تو یہ نقطہ صاف ہوجاتا ہے، ورنہ یہ بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ پورے دل کو سیاہ کردیتا ہے اور اسی کو قرآن کریم نے'' رین'' فرمایا ہے،'' کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ'' یعنی ان کے دل زنگ آلود ہوگئے، ان کے اعمال بد کی وجہ سے۔''

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا، جس میں نصیحتوں کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ'' انسان جب اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، تو اس کے مداح بھی، اس کی مذمت کرنے لگتے ہیں اور دوست بھی دشمن ہوجاتے ہیں، گناہ سے بے پرواہی انسان کی دنیا و آخرت میں بربادی کا باعث بنتی ہے۔''

گناہِ کبیرہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف مقامات پر بہت سے گناہوں کو گناہِ کبیرہ فرمایا ہے، کہیں تین، کہیں چھ، کہیں سات کی تعداد بیان فرمائی۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقتاً گناہِ کبیرہ کی کوئی تعداد متعین نہیں، بس مؤمن کو ہر گناہ سے بچنا

چاہئے، بالخصوص ان گناہوں سے، جن کی قرآن کریم نے سزا مقرر فرمائی، یا جس کے مرتکب پر اللہ نے لعنت فرمائی، یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید بیان کی گئی کہ یہ اعمال تو یقیناً گناہ کبیرہ ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں، جن سے اس قسم کے گناہوں کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ'' سات مہلک چیزوں سے بچو، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ کیا ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ کا شریک ٹھہرانا، جادو کرنا اور اس کو قتل کرنا جس کا خون اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کی وجہ سے، سود کھانا، یتیم کا مال ہضم کرنا، کفار سے لڑائی کے دن میدان چھوڑ کر بھاگ جانا، ایمان دار، بے خبر، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔ (بخاری ومسلم)

ایک موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، گناہوں میں جو سب سے بڑے ہیں، میں تمہیں ان سے باخبر کرتا ہوں، وہ تین ہیں، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی، جھوٹی گواہی یا جھوٹ بولنا، (بخاری ومسلم)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا، پھر آپ ﷺ سے سوال کیا گیا، اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے، فرمایا کہ تم اپنے بچے کو اس خوف سے مارڈالو کہ وہ تمہارے کھانے میں شریک ہوگا، پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کونسا، گناہ بڑا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنا، (بخاری ومسلم)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: یہ گناہ کبیرہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالیاں دے، صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالیاں دے سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں جو کسی دوسرے کے والدین کو گالیاں دے گا تو وہ اس کے بدلے میں اس کے والدین کو گالیاں دے گا تو گویا اس نے اپنے ہی والدین کو خود گالیاں دلائیں (کہ نہ یہ کسی کے والدین کو گالیاں دیتا اور نہ اس کے بدلے اس کے والدین کو گالیاں دی جاتیں) (بخاری ومسلم)

دیگر روایات کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان اعمال کو بھی گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، جھوٹی قسم کھانا، اپنی ضرورت سے زیادہ پانی روک رکھنا اور ضرورت مند کو نہ دینا، جادو سیکھنا تاکہ جادو کرے، شراب نوشی کو آپ نے اکبر الکبائر فرمایا، بیت اللہ کی بے حرمتی کرنا۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جس شخص نے جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلمان بھائی کا حق مارا، اللہ اس کے لئے دوزخ واجب کردیتا اور جنت حرام کردیتا ہے، عرض کیا گیا، حق میں کوئی معمولی سی چیز ہو، آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں چاہے، پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی ہو۔ (مسلم)

علمائے اسلاف (اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے) نے ہمارے لئے دین کے تمام مسائل کو آسان فرمادیا، گناہ کبیرہ کے سلسلے میں بعض علماء نے بڑی محنت ومشقت سے قرآن وحدیث، اقوال صحابہ وغیرہ کا مطالعہ کرکے، کبائر کی فہرست مرتب کردی، ہم یہاں مختلف علماء کرام کی مرتب کردہ فہرست کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارے لئے بھی ان گناہوں سے

بچنا آسان ہو اور ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ رہے۔

کبائر کی فہرست

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جھوٹ باندھنا، صحابہ کرام کو سب وشتم کرنا، اولیاء و صالحین اور علماء دین کی توہین کرنا یا انہیں حقیر سمجھنا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، اللہ کے عذاب سے بے خوف ہونا، قرآن کریم بھول جانا (حفظ یا ناظرہ) بلا عذر نماز قضا کرنا، وقت سے پہلے نماز پڑھنا، رمضان کے روزے بلا عذر شرعی چھوڑنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، فرضیت حج کی شرائط پورے ہو جانے کے باوجود حج نہ کرنا، احکام شرع کی توہین کرنا، قرآن کریم کی بے حرمتی کرنا، ناپاکی کی حالت میں قرآن کریم کی تلاوت کرنا، بے وضو قرآن کریم کو چھونا، اللہ کی ذات وصفات میں بلا علم بحث کرنا، مکروہ اوقات میں نماز پڑھنا، مکروہ وممنوع ایام میں روزہ رکھنا، ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا، مساجد کی بے حرمتی کرنا، غیر مسلموں کی تعریف اور مسلمانوں کی برائی کرنا، عورتوں کا بے پردہ گھر سے باہر نکلنا، عورت کا شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھنا، عورت کا تنہا یا غیر محرم کے ساتھ سفر کرنا، عورت کا غیر مردوں کے سامنے زیب وزینت کے ساتھ آنا، عورت کا مردوں جیسا لباس پہننا یا بال کٹوانا، غیر عورت سے تنہائی میں ملنا، غیر عورتوں کو نظر جما کر دیکھنا، دوسروں کے گھروں میں جھانکنا، قتل ناحق کرنا، زنا، ہم جنسی، شراب پینا، چوری کرنا، کسی پر تہمت والزام لگانا، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی قسم کھانا، یتیم یا کسی کا بھی مال غصب کرنا، سود کھانا، والدین کی نافرمانی کرنا، بلا عذر گواہی کو چھپانا، قطع رحم کرنا، ناپ تول میں خیانت کرنا، عیب دار مال دھوکے سے فروخت کرنا، چیزوں میں ملاوٹ کرنا، مسلمان کو ناحق مارنا، رشوت لینا، رشوت دینا، حاکموں سے چغلی کرنا، نیکی کی تبلیغ نہ کرنا، قدرت کے باوجود برائی سے نہ روکنا، حیوان، کیڑوں مکوڑوں کو جلانا، بلا عذر شرعی خنزیر یا مردار کا گوشت کھانا، جادو کرنا، حالت حیض میں وطی کرنا، چغلی کر کے مسلمانوں کو لڑانا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، مسلمان کو گالیاں دینا یا بے عزتی کرنا، پیشاب کی چھینٹوں سے نہ بچنا، بوقت ضرورت علم چھپانا، جاندار کی تصویر بنانا، تکبر وغرور کرنا، غیر اللہ کو سجدہ کرنا، کاہن، نجومی اور غیر مسلموں سے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا، منتر وغیرہ کرانا اور اس کا یقین کرنا، دو چہروں والا ہونا، یعنی کسی سے ہمدردی اور دوستی کا اظہار کرنا اور دل میں اس کی دشمنی رکھنا، نشہ آور چیزیں، بھنگ، چرس، مروانہ وغیرہ استعمال کرنا، گمراہی اور بدعت کی اشاعت کرنا، نیکی کر کے احسان جتلانا، دوسروں کے عیب تلاش کرنا، لوگوں کے متعلق بدگمانی کرنا، دوسروں کی باتیں چھپ کر سننا، کسی پر لعنت کرنا، سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرنا، مردوں کا سونے کی انگوٹھی، چین وغیرہ پہننا، امانت میں خیانت کرنا، کسی کے راز کی بات دوسروں کو بتانا، بدفالی لینا، وصیت کے ذریعہ وارثوں کی حق تلفی کرنا، شراب یا دیگر حرام چیزوں کا کاروبار کرنا، سودی کاروبار کرنا، لوگوں کو دھوکا دینا، ناچ گانے کی محفلوں میں شریک ہونا، ادا نہ کرنے کی نیت سے کسی سے قرض لینا، عورت کا شوہر کی نافرمانی کرنا، شوہر کا بیوی کو نماز اور دیگر فرائض سے روکنا، بلا عذر جمعہ، عیدین کی نماز چھوڑنا، شریعت کے کسی حکم کی تحقیر کرنا یا مذاق اڑانا، جوئے یا لاٹری وغیرہ سے دولت کمانا، جوا کھیلنا۔

یہ مختصر فہرست مفید ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر برائیوں کو معمولی سمجھا جائے، حق یہی ہے کہ ہر گناہ بڑا

ہی سمجھنا اور اس سے بچنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے کہ گناہ اُس مالک حقیقی کی نافرمانی ہے، جو ہمارے ہر حال کو دیکھتا اور جانتا ہے، وہ ہم سے ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر ہے، وہ غفور ورحیم بھی ہے اور اس کی پکڑ بڑی سخت ہے، اس کے عذاب اور قہر سے بچانے والا کوئی نہیں، نیز یہ اُس آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہے جنہیں اپنے غلاموں کی برائیوں میں مبتلا ہونے سے تکلیف پہنچتی ہے، قیامت کے دن جب ہمیں ان کی شفاعت کے حصول کے لئے، ان کے دربار میں حاضر ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا، تو ہم کیا منہ لے کر ان کا سامنا کریں گے، پس مؤمن کو زیب یہی دیتا ہے کہ وہ کبیرہ وصغیرہ کا امتیاز کئے بغیر ہر گناہ سے بچتا رہے۔

اے ایمان والو! اپنا یا اپنے بھائیوں کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ، ہم نے تمہارے لئے تجارت کے وسیع میدان میں رزق کے خزانے پنہاں کر رکھے ہیں، باہمی رضامندی، محنت ومشقت اور دیانت کے ساتھ، ان چھپے خزانوں سے اپنی روزی حاصل کرو اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو قتل کرو، نہ ظالم وجابر بن کر اپنے کسی مسلمان بھائی کو قتل کرو کہ وہ اس فتنہ وفساد کو پسند نہیں کرتا، اس نے اپنے محبوب ترین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت والفت کی برکھا برسانے کے لئے مبعوث فرمایا، دیکھو ان ہی کی تعلیم سے وہ جو مدتوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ان کے دامنِ رحمت میں پناہ گزین ہو کر ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کی خوبی کے مالک بن گئے، پس اللہ چاہتا ہے تم بھی میل ومحبت کی زندگی بسر کرو اور باہمی اختلافات کے باعث، لڑائی، جھگڑوں اور قتل وغارت کی نوبت نہ آنے دو اور نہ ہی اپنی حکم عدولی اور بدکرداری سے اپنی یا اپنے بھائیوں کی عزت پامال کرو کہ مؤمن کی عزت، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی امانت ہے، جس کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہے، پس تم اپنی عزت وآبرو کی بھی حفاظت کرو اور اپنے مسلمان بھائیوں کی عزت وآبرو کے بھی محافظ بنو، بڑوں کا احترام کرو، برابر والوں سے محبت ودوستی کرو، چھوٹوں پر شفقت کرو، عورتوں کو ان کی عمر کے لحاظ سے ماں، بہن اور بیٹی جانو، پھر دیکھو تمہارے معاشرے میں کیسا سکون ہوگا، کیسا امن وامان ہوگا، تمہارا وقار کیسا بلند ہوگا، دشمن تم سے کیسا مرعوب ہوگا کہ تمہاری طرف نظر اٹھانے کی بھی ہمت نہ کر پائے گا اور اپنی ایمانی وروحانی قوت بڑھانے کے لئے اللہ سے ڈرو اور گناہوں سے دور رہو، پھر ''مُدْخَلًا کَرِیْمًا'' تمہارا منصب ہوگا۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۝ وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا۝ (النساء: ۳۲۔۳۳)

اور نہ آرزو کرو اس چیز کی، بزرگی دی ہے اللہ نے جس سے تمہارے بعض کو بعض پر، مردوں کے لئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور مانگتے رہو اللہ سے اس کا فضل وکرم بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے اور ہر ایک کے لئے ہم نے بنا

دیئے وارث، اس مال سے جو چھوڑ جائیں، ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور وہ لوگ جن سے بندھ چکا ہے تمہارا عہد و پیمان تو دو انہیں ان کا حصہ بیشک اللہ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے۔

اللہ رب العزت جل مجدہ کا شکر ہے کہ اس نے انسان کو کمالات سے نوازا، کوئی انسان نہیں جس میں کوئی نہ کوئی کمال موجود نہ ہو،'' وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ '' کا عظیم منصب اولاد آدم کے لئے، کسی خاص نوع انسان کے لئے نہیں، مرد و عورت، امیر و غریب، عالم و جاہل، صحت مند و بیمار، طاقتور و کمزور، کالے، گورے، غرضیکہ سب ہی کو تاج شرافت سے نوازا گیا ہے، ہاں اس نے اپنی بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کی بناء پر سب کو یکساں نہ رکھا، کسی کو مرد بنایا، تو کسی کو عورت کسی کو دولت سے نوازا، تو کسی کو علم سے، کوئی خوبصورت ہے تو کوئی بدصورت، کسی میں کوئی کمال ہے، تو کسی میں کوئی لیکن کمال و خوبی سے کوئی محروم نہیں لیکن انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہے، اسے اپنے اندر کوئی خوبی نظر نہیں آتی دوسروں کے کمالات پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتا رہتا ہے، عورت کی آرزو ہوتی ہے، کاش میں مرد ہوتی، غریب کی آرزو ہوتی ہے، کاش میں امیر ہوتا، محکوم کی تمنا ہوتی ہے کاش میں حاکم ہوتا، ہر شخص دوسروں کے کمالات کا آرزومند رہتا ہے اور یہ آرزو اسے ناشکرا، حاسد اور فتنہ پرداز بنا کر تباہی کے گڑھے پر لا کھڑا کرتی ہے۔

اللہ نے انسان کو جن بے شمار نعمتوں اور کمالات سے نوازا ہے، وہ دو قسم کے ہیں اختیاری و غیر اختیاری۔

غیر اختیاری امور

غیر اختیاری امور و کمالات وہ ہیں جو بندہ سعی و عمل یا محنت و کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا، خالق حقیقی نے جسے چاہا جو کمال عطا کر دیا، کوئی کتنا ہی تڑپے اور دوسرے سے اس نعمت کو چھین لینا چاہے تو ممکن نہیں کہ اسے وہ نعمت مل جائے، جو اس کے حصہ میں نہیں مثلاً کسی کا مرد ہونا، کسی کا اعلیٰ خاندانِ نبوت میں یا اعلیٰ خاندانِ حکومت میں پیدا ہونا، کسی کا گورا ہونا، کسی کا خوبصورت ہونا، کسی کا خوش الحان ہونا یہ اور ان جیسی بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو اللہ کی عطا کردہ ہیں کوئی دوا یا کوئی علاج ایسا نہیں جس کے ذریعہ کوئی ان نعمتوں کو حاصل کر لے، جس میں وہ نہیں ہیں ایسے ہی کمالات کے متعلق اہل ایمان کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ تم اپنے دل میں اس قسم کی لایعنی اور بیکار آرزو پیدا نہ ہونے دو اس سے تمہارے اندر ناشکری اور حسد کے جراثیم بڑھیں گے اور یہ دونوں ہی عیب تمہاری مزید تباہی کا باعث ہوں گے کہ ناشکری اللہ کی رحمت کا دروازہ بند ہو جانے کا سبب ہے اور حسد کی آگ میں جلنے والا جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے کمزور ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا'' کون ہے جو مجھ سے ان احکام کو لے اور ان پر عمل کرے یا اس شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرے'' پس میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! میں ہوں، آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے پانچ باتیں بتائیں (ان میں سے ایک یہ ہے)

تَكُنْ اَغْنَى النَّاسِ وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ

تم دنیا کے غنی ترین لوگوں میں ہو جاؤ گے، اگر ان نعمتوں پر خوش رہو جو اللہ نے تمہاری قسمت میں لکھ دی

ہیں۔ (ترمذی)

پس مؤمن کو چاہئے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکرادا کرے، عورت شکرادا کرے کہ اللہ نے اسے عورت بنایا، کیا پتہ کہ اللہ اسے مرد بنا دیتا تو وہ مرد کی ذمہ داریاں پوری کرسکتی یا نہ کرسکتی، بدشکل شکرادا کرے کہ اللہ نے اسے ایسی شکل و صورت عطا فرمائی، اگر اسے حسن دے دیا جاتا تو ممکن تھا کہ وہ کسی بڑے فتنے یا گناہ میں مبتلا ہو جاتا، غرضیکہ جو چیزیں غیر اختیاری ہیں، ان کی تمنا میں تڑپتے رہنے کی بجائے اپنے اندر وہ خوبی پیدا کرنی چاہئے جس سے دنیا وآخرت میں اس کی قدر و منزلت بڑھے، ورنہ یہ آرزو اسے لے ڈوبے گی۔ اہلِ ایمان کو یہ ہدایت اسی لئے دی گئی ہے کہ اس پر عمل سے بہت سی برائیوں اور فتنوں کا سدباب ہوگا۔

اختیاری امور

اللہ کی بے شمار نعمتیں وہ ہیں، جنہیں بندہ اپنی صلاحیتوں سے محنت وکوشش سے حاصل کرسکتا ہے، پس دوسروں میں انہیں دیکھ کر رشک وحسد کرنے کی بجائے، کمرِ ہمت باندھو، اٹھو اور دوسروں کی جن نعمتوں کو تم پسند کرتے ہو، تم بھی ان کے لئے سعی کرو، اللہ تمہارا حامی وناصر ہوگا اور تم ان نعمتوں کو چند دن کی جدوجہد کے بعد حاصل کرلو گے، اگر تمہیں کسی کا علم پسند ہے، تو تمہیں اجازت ہے کہ تم بھی حصول علم کی کوشش کرو، اگر تمہیں کسی کی دولت پسند ہے بشرطیکہ وہ حلال ذرائع سے حاصل کی گئی ہو تو تم بھی کوشش کرو اور دولت مند بن جاؤ اس سے تمہیں کون روکتا ہے اللہ اور رسول کے یہاں تو محنت ومشقت کرنے والے کی بڑی قدر و منزلت ہے اور اس میں مرد وعورت برابر ہیں کہ مرد جو مال و دولت یا علم یا منصب و مرتبہ حاصل کرے وہ اس کا مالک ہے اور عورت جو کچھ حاصل کرے وہ اس کی مالکہ ہے، ان اختیاری امور کے لئے کاہلی، کم ہمتی یا بے غیرتی کے سبب جدوجہد نہ کرنا اور اسے تقدیر کا فیصلہ قرار دے دینا، ایک بڑا فریب ہے، مؤمن کو جدوجہد کا حکم دیا گیا ہے اور ان امور میں جدوجہد ہی مقدر کو بنانے اور سنوارنے کا ذریعہ ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (عنکبوت:٦)

اور جو شخص کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لئے کوشاں ہے بیشک اللہ تو غنی ہے تمام کائنات سے۔

پس مؤمن کو جدوجہد اور کوشش کرکے ان نعمتوں کے حصول کی طرف بڑھتے رہنا چاہئے، جن کو وہ پسند کرتا ہے، لیکن اس سعی کے باوجود اسے یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ محنت ومشقت کے باوجود بھی اللہ کے فضل وکرم کے بغیر کامیابی ممکن نہیں، لہٰذا اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی کہ ''وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِه'' اپنی تدابیر، محنت ومشقت کے ساتھ ساتھ اللہ سے کامیابی وکامرانی کی بھیک بھی مانگتے رہو۔

مرد وعورت کی برابری

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ

مردوں کے لئے حصہ ہے، اس سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا۔

مرد و عورت کی مساوات اور برابری کا موضوع ہر دور میں نہایت اہم رہا ہے، خصوصاً ہمارے دور میں یہ ایک طوفان ہے جس نے امت مسلمہ کی خواتین کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ ان کی خاص تعداد اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ "اسلام عورت کو مرد کی باندی قرار دیتا ہے، جبکہ مغرب کی نام نہاد تہذیب اسے مردوں کے برابر حق دلاتی ہے" یہی غلط فہمی انہیں شریعت مطہرہ کے احکام سے بغاوت پر آمادہ کر رہی ہے اور دن بدن عورتیں دین سے دور ہوتی چلی جا رہی ہیں ہم گزشتہ اوراق پر اگرچہ اس عنوان پر کافی لکھ آئے ہیں لیکن عنوان کی اہمیت کے پیش نظر یہاں بھی چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں، امید تو یہی ہے کہ تکرار نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو بھی مفید ہی ہوگی۔

پہلے آیت مبارکہ کے مفہوم پر غور کر لیجئے "اکتساب" کا معنیٰ کمانا اور حاصل کرنا ہے مطلب یہ کہ مرد جو کچھ کمائیں وہ ان کا ہے اور عورتیں جو کچھ کمائیں وہ ان کا ہے، یہ کمائی چاہے دینی اعتبار سے، احکام شرع کی پابندی اور عبادت کی صورت میں ہو، یا دنیوی اعتبار سے، تجارت و ملازمت کے ذریعہ دولت کے حصول کی صورت میں ہو، پہلی صورت میں مفہوم یہ ہے مردوں کو عبادت کا جو ثواب ملتا ہے وہی عورتوں کو بھی ملتا ہے، پس اللہ کے نزدیک مرد و عورت برابر قرار پائے، تو عورتوں کو چاہئے کہ وہ بھی مردوں کی طرح دین کی پابندی کریں، صرف نماز، روزے کی صورت میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے جملہ امور و معاملات میں اور دوسری صورت میں مفہوم یہ ہے کہ جو دولت مرد کماتے ہیں اور وہ اس کے مالک ہوتے ہیں، اسی طرح جو دولت عورتیں کماتی ہیں، وہ اس کی خود مالک ہیں، اپنی مرضی سے مردوں کی طرح اسے خرچ کرنے کا انہیں اختیار ہے، وہ اپنی مرضی سے اپنے کپڑے بنائیں، جوتے خریدیں، مکان بنائیں، کسی سے نہ اجازت کی ضرورت ہے، نہ کسی کو اس میں مداخلت کا حکم ہے، گویا دو باتیں واضح ہوئیں۔

ایک عورت کو "اکتساب" کی اجازت ہے، ظاہر ہے جب اکتساب کی اجازت ہوئی تو اس کے طریقے سیکھنے کی بھی اجازت ہوئی، یعنی عورت، وہ علم و فن حاصل کر سکتی ہے، جس سے اس کے لئے اکتساب ممکن ہو، گویا اسلام عورت پر ہرگز پابندی عائد نہیں کرتا کہ وہ علم حاصل نہ کرے یا کوئی فن نہ سیکھے، وہ جو بننا چاہتی ہے اس کے مطابق علم و فن سیکھنے کا اسے اختیار ہے اس کے لئے کوئی شرعی حکم ایسا نہیں جو اس راہ میں رکاوٹ بنے، مثلاً پردہ جس کا حکم شریعت نے عورت ہی کے فائدے کے لئے دیا ہے کہ اسلام عورت کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا اور اس کے حسن و جمال کی قدر بڑھانا چاہتا ہے، جو پردے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے ممکن ہی نہیں لیکن یہ پردہ نہ عورت کو گھر سے باہر نکلنے سے روکتا ہے، نہ ہی کالج و یونیورسٹی میں علم و ہنر سیکھنے سے۔ بات بالکل واضح ہے کہ مرد و عورت، انسان کی علیحدہ علیحدہ قسمیں ہیں، یعنی انسان دو قسم کا ہوتا ہے مرد اور عورت لہٰذا دونوں کے لئے تعلیمی ادارے، تجارتی مراکز وغیرہ بھی علیحدہ علیحدہ ہونا چاہئیں اور عورتیں اپنے اداروں میں جتنی ترقی چاہیں کریں شریعت ہرگز نہیں روکتی، پس عورتوں کو چاہئے کہ وہ مردوں کے اداروں میں گھس کر ان کی بری نظروں کا شکار اور

تماشہ بننے کے بجائے اپنے اداروں کو استعمال کریں اور اگر کہیں خواتین کے لئے کوئی ادارہ نہ ہوں تو وہ اپنی قوت استعمال کریں اور منتظمہ کو ادارہ قائم کرنے پر مجبور کریں کہ ان کے حقوق میں سب سے اہم حق یہی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کے لئے ان کے علیحدہ ادارے ہوں تا کہ وہ پوری آزادی اور یکسوئی سے وہاں علم حاصل کر سکیں۔

موجودہ دور میں عورتوں کی تعداد مردوں سے چار گنا زیادہ ہے، پس ظاہر ہے کہ ان کی ضروریات بھی زیادہ ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کل تجارت کا دارو مدار، عورت کی مطلوبہ اشیاء پر ہی ہے آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ زنانہ لوازمات زندگی، دوکان پر جس کثرت سے نظر آتے ہیں، اتنی مردوں کے استعمال کی اشیاء نظر نہیں آتیں، گویا عورتوں کے لئے میدان تجارت زیادہ وسیع ہے، پس وہ اپنی دوکانیں، مارکیٹیں کھول سکتی ہیں، فیکٹریاں بنا سکتی ہیں، شریعت کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی، یہی حال ہنر کا ہے مثلاً جب اکثریت عورت کی ہے تو ڈاکٹروں کی ضرورت بھی زیادہ ہے، بالخصوص نسوانی امراض کے لئے، پس عورتوں کو یہ ہنر حاصل کرنا چاہئے، اپنے ہسپتال کھول کر، اپنی صنف کی خدمت کریں اور خوب دولت بھی کمائیں، کون روکتا ہے۔

دوسرے، اللہ نے عورت کو حق ملکیت دیا، اسے جو دولت مہر کی صورت یا تحائف کی صورت میں شوہر سے ملی ہے، یا اس کے والدین نے اسے دولت یا زیورات وغیرہ دیئے ہیں، وہ وارث بھی ہے، اسے وراثت میں جو کچھ حاصل ہوا ہے، یا اس نے تجارت کر کے، ملازمت کر کے پیسہ کمایا، یہ سب اسی کا ہے، وہ اس کی مالکہ ہے، اس پر اس دولت کے شرعی حقوق بھی واجب ہیں یعنی وہ خود ہی زکوٰۃ ادا کرے گی وہ صدقہ، خیرات بھی اپنی مرضی سے کرے گی، قربانی بھی خود کرے گی، دنیوی کاموں میں بھی اسے پورا اختیار ہے کہ جیسے چاہے وہ اپنا مال خرچ کرے۔

ان تمام اختیارات کے باوجود بھی عورت اللہ کا شکر ادا نہیں کرتی کہ کسی معاملہ میں وہ مرد کی باندی نہیں بنائی ہے، اس کے برعکس مرد پر اس کی ذمہ داری ضرور ڈالی گئی ہے کہ مرد کو عورت کا ''قوّام'' محافظ و نگراں بنا دیا گیا کہ وہ اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے، مال و دولت کی حفاظت کرے، اس کے نان ونفقہ کا انتظام کرے، اس کی ناز برداریاں کرے ان تمام ذمہ داریوں کے بدلے عورت سے مرد کو عزت دلائی گئی ہے کہ عورت پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے شوہر کا احترام کرے اور جس قدر ممکن ہو اس کی خدمت کرے۔

غرض ایسی کوئی بات نہیں کہ عورت مرد سے کم تر ہے یا اس کی باندی ہے اس کے لئے کوئی جواز نہیں کہ وہ مرد کی برابری کا مطالبہ کرے کہ برابری تو پہلے ہی حاصل ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ''برابری کا مطالبہ'' تو عنوان ہے، حقیقت میں یہ کوشش ہے مغرب کی طرز زندگی اختیار کرنے کی۔ وہ تہذیب جس میں عورت کی قدر تو بڑی بات، انسانی اقدار ہی مفقود ہو چکی ہیں ہمارے خیال میں تو عورت پر جو ظلم یہاں ہوتا ہے، مسلم ممالک اور مسلم معاشرے میں اس کی کوئی نظیر نہیں، یہاں وہی دور جاہلیت کے طور طریقے ہیں، جن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو نجات دلا دی، پس مسلمان عورتوں کو چاہئے کہ وہ اس نجات دہندہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر غور کریں، ان حقوق کا پورا پورا فائدہ حاصل کریں جو انہیں شریعت مطہرہ نے دیئے اور باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے دین کا علم حاصل کریں اللہ اور اس کے رسول

کے احکام کی پابندی کریں، اسی میں عافیت وخیریت ہے، دین ودنیا کی فلاح وبہبود ہے، اللہ عمل کی توفیق دے، آمین

آیت زیر گفتگو میں اہل ایمان کو ایک ہدایت وراثت کے متعلق بھی دی جارہی ہے کہ وراثت میں مرد کا دوگنا حصہ اور عورت کا ایک حصہ عین انصاف ہے اور اس میں اللہ کی بے شمار حکمتیں ہیں، پس اہل ایمان کو قانون وراثت پر شکوک وشبہات کرنے کی بجائے اسے اللہ کا حکم سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے اور جو کچھ اللہ نے جسے دلایا ہے اسے شکر ادا کر کے قبول کر لینا چاہئے۔ اللہ ہی اپنی حکمتوں کو بہتر جاننے والا ہے۔

اے ایمان والو! اللہ تمہیں وہ اصول زندگی عطا فرماتا ہے جو انفرادی واجتماعی طور پر تمہاری زندگی کو پُر امن اور پُر سکون بنانے کے ضامن ہیں، یہ اصول دنیا میں تمہارے لئے عزت وعظمت کا ذریعہ ہیں اور آخرت میں نجات کا پس تم انہیں اپناؤ آپس میں میل ومحبت کے ساتھ باہمی حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے زندگی بسر کرو، اللہ تم پر رحم فرمانے والا ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۲۲

النساء: ۴۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ (النساء: ۴۳)

اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جبکہ تم نشہ کی حالت میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو زبان سے کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں مگر یہ کہ تم سفر کر رہے ہو یہاں تک کہ تم غسل کر لو، اور اگر تم بیمار ہو، یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے یا ہاتھ لگایا ہو تم نے (اپنی) عورتوں کو پھر تم نہ پاؤ پانی تو تیمم کر لو پاک مٹی سے (اس طرح کہ) ہاتھ پھیرو تم اپنے چہروں پر اور اپنے بازوؤں پر بے شک اللہ معاف فرمانے والا، بہت بخشنے والا ہے۔

آیت مبارکہ میں اہل ایمان کے لئے دو ہدایتیں ہیں، نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، ناپاکی کی حالت میں نماز نہ

پڑھو۔

بحالت نشہ نماز

نماز "احکم الحاکمین اللہ رب العالمین" کے دربار میں حاضری کا عمل ہے مؤمن کی معراج ہے اس کا اس طرح اہتمام ہونا چاہئے کہ اس کی اہمیت وعظمت کا عملی اعتراف فراہم ہو لہٰذا حکم دیا گیا کہ اس عالی دربار میں حاضری سے قبل اچھی طرح اپنی حالت کا جائزہ لے لو باہوش و باحواس ہو، عقل ودل حاضر اور یکسو ہو، بظاہر جسم، کپڑے، نماز کی جگہ پاک وصاف ہو، نیز مستحب یہ ہے کہ ایسی حالت میں نماز ادا کی جائے، جب نمازی کا جسم تکان، نیند وغیرہ کی وجہ سے ست نہ ہو، تر وتازہ اور ہشاش وبشاش حال میں سکون کے ساتھ اللہ کے دربار میں حاضر ہونا چاہئے، جیسا کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِذَا نَعِسَ اَحَدُكُمْ فِى الصَّلٰوةِ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَاِنَّهُ لَا يَدْرِىْ لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبَّ نَفْسَهُ

اگر تم میں سے کسی کو نماز میں نیند آنے لگے تو اسے کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہئے، یہاں تک کہ نیند دور ہو جائے کیونکہ نیند کی حالت میں وہ سمجھ نہ سکے گا (کیا کہہ رہا ہے) ممکن ہے وہ تو بہ واستغفار کی بجائے اپنے آپ کو گالی دینے لگے۔

یعنی اگر نماز کا وقت ختم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو تو نماز اونگھتے اور جھومتے نہیں پڑھنا چاہئے، ممکن ہے ایسی حالت میں کوئی ایسی غلطی ہو جائے جس سے نماز فاسد ہو جائے مثلاً الفاظ قرآن کی صحیح ادائیگی نہ ہو، یا سرکار ﷺ کے ارشاد کے مطابق توبہ واستغفار کی بجائے اپنے آپ کو ہی گالیاں دینے لگے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اِذَا حَضَرَ الْعَشَاءُ فَاُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَابْدَءُوْا بِالْعَشَاءِ

اگر رات کا کھانا تیار ہو اور نماز کی اقامت ہو جائے تو پہلے کھانا کھالو۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا:

لَا صَلٰوةَ بِحَضْرَةِ طَعَامٍ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْاَخْبَثَانِ

نہ کھانے کے وقت نماز پڑھو اور نہ اس حال میں کہ نمازی، پیشاب و پاخانہ روکے ہوئے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ معمول تھا کہ اگر کھانا سامنے آجاتا تھا تو آپ پہلے کھانا کھاتے تھے، یہاں تک کہ جماعت شروع ہو جاتی تھی اور امام کی قرأت کرنے کی آواز آنے لگتی تھی۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ نماز کی اہمیت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو نہایت ہی طمانیت وسکون کی حالت میں پڑھا جائے، اگر نیند آرہی ہو، تو پہلے سو جاؤ تا کہ تر وتازہ ہو جاؤ اگر کھانے کا وقت ہو گیا اور بھوک لگ رہی ہے تو پہلے کھانا کھالو تا کہ نماز میں بھوک کی وجہ سے جلدی نہ کرو اور دل کھانے کی طرف مائل نہ ہو اگر پیشاب و پاخانہ کی حاجت محسوس ہو رہی ہو تو اس

سے فارغ ہولو کہ یہ اور ان جیسی تمام ضروریات نماز کی یکسوئی کو ختم کر دیں گی اور نماز میں وہ خشوع وخضوع پیدا نہ ہو سکے گا جو مؤمن کی کامیابی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، جیسا کہ سورۂ مؤمنون میں مؤمن کی کامیابی کے ذرائع بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے خشوع ہی کو ذریعہ کامیابی بتایا گیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ (المؤمنون: ۱۔۲)

بیشک دونوں جہاں میں کامیاب ہو گئے وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں عجز و نیاز (خشوع) کرتے ہیں۔

حضرت مسلم بن یسار رحمۃ اللہ علیہ، ایک دن بصرہ کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے اسی دوران مسجد کا ایک ستون زور سے گرا کہ قرب وجوار کے لوگ آواز سن کر جمع ہو گئے لیکن آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں سے پوچھنے لگے، یہ کیا ہوا، یہ کب گرا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نماز میں خشوع وخضوع یہ ہے کہ نمازی کو اپنے دائیں بائیں کی خبر نہ ہو۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نماز کے دوران ہاتھ ہلا دیا۔ ایک بزرگ نے دیکھ لیا جب میں نماز سے فارغ ہوا تو وہ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا یہ کیسی نماز ہے۔ ہمارے مسلک میں تو نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب بندہ نماز کے لئے کھڑا ہو تو پتھر کی طرح بے حس وحرکت ہو جائے۔

یہ ہے نماز میں خشوع، یکسوئی، توجہ الی اللہ، جس کو پیدا کرنے ہی کے لئے یہ اجازت دی گئی کہ اگر نماز کا وقت ختم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو تو تمام ضروریات ولوازمات سے فارغ ہو جانے کے بعد بندہ معبود کے دربار میں حاضر ہو۔ اب اس کا صرف جسم ہی نماز میں نہ ہو بلکہ دل ودماغ بھی نماز میں ہو، تب یہ نماز مؤمن کی معراج بنتی ہے۔

ان احکام سے ایسے لوگ اپنی اصلاح کر لیں تو مناسب ہوگا جو نماز کو صرف ایک ذمہ داری سمجھ کر پڑھتے ہیں نہ انہیں اپنی کیفیت کا احساس ہوتا ہے نہ آدابِ محفل کا خیال ہوتا ہے اور نماز کے لئے دوڑتے ہیں اور اسی کو بڑا تقویٰ سمجھتے ہیں۔ یاد رکھئے، تقویٰ، اللہ اور اس کے رسول کے جملہ احکام کی پابندی اور ان کا لحاظ رکھنے کا نام ہے صرف جماعت سے نماز ادا کر لینے سے تقویٰ حاصل نہیں ہوتا، کسی نے ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ ایک صاحب اپنی اہلیہ کے ہمراہ بس اسٹاپ پر کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے کہ عشاء کی اذان ہوئی۔ حضرت بیوی کو تنہا چھوڑ مسجد کی طرف دوڑے اور نماز بمعہ وظائف کے ادا کرنے کے بعد کافی دیر میں واپس آئے تو دیکھا کہ بیوی بے چاری کھڑی رو رہی ہے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ کوئی ڈاکو آیا اور گن دکھا کر اس کے زیورات لے بھاگا۔ غور فرمائیے یہ دینداری ہے یا غیر ذمہ داری اور حماقت، ایسے ہی لوگوں نے دین کی پابندی کو مشکل بنا دیا ہے اور ان کے ایسے ہی اعمال دوسرے لوگوں کی دین سے دوری کا سبب بن رہے ہیں۔

نشہ صرف جسم ہی کو نہیں بلکہ دل ودماغ کو بھی اتنا متاثر کرتا ہے کہ آدمی کو یہ تک پتہ نہیں رہتا کہ وہ کیا بول رہا ہے ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى'' کی ہدایت کے سبب نزول کا بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے یہ حرمت شراب سے قبل کی بات

ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر پر احباب کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد دستور کے مطابق شراب کا دور چلا، اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا، جھومتے، جھامتے، سب نماز کے لئے صف بستہ ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امامت کی، سورۂ کافرون تلاوت کی، نشہ میں چاروں ''لا'' چھوڑ گئے، ظاہر ہے پوری صورت کے معنیٰ بدل گئے اور نماز فاسد ہوگئی، پس اللہ نے حکم دیا کہ ''نشہ کی حالت میں نماز کے قریب تک نہ جاؤ'' یہ حقیقت میں حرمت شراب کا دوسرا مرحلہ تھا کہ اس سے پہلے بتایا جاچکا تھا کہ شراب کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے، بعض صحابہ نے تو اسی وقت شراب چھوڑ دی تھی اور وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ ام الخبائث حرام ہونے والی ہے اس دوسرے مرحلہ کی ہدایت آنے کے بعد اکثر صحابہ نے شراب سے توبہ کر لی اور چند ہی دن بعد حرمت شراب کا واضح حکم نازل ہو گیا جو سورۂ مائدہ میں ہے انشاء اللہ ہم اس موضوع پر اسی آیت کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ ہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ آیہ مبارکہ دیگر قرآنی آیات کی طرح خاص موقع پر نازل ہوئی ہے لیکن اس کا حکم عام، قیامت تک کے اہلِ ایمان کے لئے ہے یعنی ہمیشہ کے لئے یہ قانون ہے کہ نشہ کی حالت میں یا نشہ جیسی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے، مثلاً اگر کوئی بدنصیب مسلمان شراب پی لے اور وہ نمازی بھی ہو تو وہ نماز کے قریب بھی نہ آئے جب تک کہ ہوش وحواس درست نہ ہو جائیں، اسی طرح وہ منشیات جو عقل میں فتور پیدا نہیں کرتے لیکن مقدار سے زیادہ ان کا استعمال قلب کو متاثر کرتا اور جسم کو مضمحل بھی کر دیتا ہے، ان کے استعمال سے اگر یہ کیفیت پیدا ہو جائے، تب بھی اس وقت تک نماز نہیں پڑھنا چاہئے جب تک کہ حال معمول پر نہ آ جائے تا کہ نماز میں خلل واقع نہ ہو، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، پس نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھنے کا حکم آج بھی ہے، مؤمن کو ان منشیات سے بچنا چاہئے، جو عقل میں فتور پیدا کرتے ہیں لیکن اگر غلطی سے ان کا استعمال کر لیا گیا تو بہرحال اللہ کے دربار عالی، میں اس وقت تک حاضر نہیں ہونا چاہئے جب تک کہ نماز میں یکسوئی حاصل نہ ہو۔

بحالت ناپاکی نماز

ناپاکی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ طہارت نماز کی شرط اول ہے اسی لئے عورت کے لئے ایام حیض کی نماز معاف ہے اور ایام نفاس میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، قضاء کا حکم ہے مرد کے لئے کوئی حالت ایسی نہیں جس کے سبب نماز معاف ہو، بہرحال طہارت نماز کی شرط اول ہے، نیز اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عام حالات میں بھی مسلمانوں کے لئے طہارت کو پسند فرمایا اور پاک وصاف رہنے کا حکم دیا کہ مؤمن کا جسم، کپڑے، رہنے کی جگہ پاک و صاف ہونا چاہئے، اللہ رب العزت نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نزول قرآن کے ابتدائی دور ہی میں حکم دیا:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ (مدثر:۴)

اے حبیب علیہ (الصلوٰۃ والسلام) اور اپنے لباس کو پاک رکھئے۔

نیز، اللہ جل مجدہ صاف ستھرا رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ (بقرہ:۲۲۲)

بیشک اللہ پسند فرماتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور پسند فرماتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔

میرے آقا شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طہارت کو "شَطْرُ الْاِیْمَانِ" نصف ایمان قرار دیا، نیز آپ ﷺ نے فرمایا راوی ہیں حضرت جابر رضی اللہ عنہ:

مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلٰوةُ وَ مِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ

نماز جنت کی چابی ہے اور نماز کی چابی طہارت ہے۔ (مشکوٰۃ)

صفائی کی دعویدار تو دوسری قومیں بھی ہیں لیکن ان کے یہاں صرف ظاہری صفائی کا اہتمام ہے، مدتوں نہاتے نہیں، صرف گیلے تولیہ سے جسم صاف کیا اور پرفیوم مل لیا، کپڑوں میں خوشبو تو مہکتی ہے لیکن گندگی اور غلاظت سے بھرے ہوتے ہیں کہ ان کے یہاں استنجاء کا تصور تک نہیں، اسے صفائی تو کہہ سکتے ہیں، طہارت نہیں، اسلام جس طہارت کا حکم دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس طرح پاکیزگی حاصل کی جائے کہ ظاہری جسم پر نظر آنے والی یا نظر نہ آنے والی نجاست و گندگی کا اثر تک باقی نہ رہے، حتیٰ کہ بغلوں کے اور زیر ناف بالوں کے صاف کرنے، ناخن کاٹنے کا حکم دیا گیا تاکہ ان میں نجاست باقی رہ جانے کا امکان نہ رہے، کپڑوں کی پاکیزگی کا طریقہ ایسا رکھا گیا کہ ان میں نجاست کے اجزاء تک باقی نہ رہیں، نیز طہارت کو نصف ایمان قرار دیا گیا، غسل و وضو کرنے والوں کو اجر و ثواب کا مژدہ دیا گیا تاکہ مسلمان پاکیزہ رہنے کی کوشش کریں، بے غسل رہنا تو درکنار بے وضو رہنا بھی پسند نہ کریں، پس یہ کیسے ممکن تھا کہ نماز جیسی اہم عبادت ناپاکی کی حالت میں ادا کرنے کی اجازت دے دی جاتی، لہٰذا حدث اصغر کی صورت میں وضو کرنے کا حکم دیا گیا، یعنی جب تم پیشاب، پاخانے سے فارغ ہو یا ہوا خارج ہوئی ہو، یا خون نکلا ہو، تو تم بے وضو ہو، بہتر ہے کہ بے وضو نہ رہو، فوراً وضو کرلو اور اگر تم نماز پڑھنا چاہتے ہو، قرآن کریم چھونا چاہتے ہو، تب تو تمہارے لئے وضو کرنا فرض ہے، اگر تم نے بغیر وضو کے یہ کام کئے تو سخت گناہ ہے اور اگر قصداً ان کاموں کے لئے وضو نہ کیا اور خیال کیا کہ (العیاذ باللہ) وضو کا ان کاموں سے کیا تعلق تو تم نے کفر کیا اور حدث اکبر کی صورت میں ان کاموں کے لئے تم پر غسل فرض ہے، یعنی جب تم اپنی بیوی سے عملِ زوجیت کرو، یا بحالت خواب ایسا عمل ہو (احتلام) تو تم پر غسل فرض ہو گیا، بہتر یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، اس ناپاکی کو دور کردو کہ جب تک مؤمن ناپاک رہتا ہے زمین پر بوجھ بنا رہتا ہے اور رحمت کے فرشتے اس سے دور رہتے ہیں۔

جنابت کی حالت دور کرنے کے لئے غسل فرض کئے جانے میں بظاہر ایک حکمت یہ نظر آتی ہے کہ انسان کی منی اس کے جسم کا ایک نہایت ہی قوی جوہر ہے، جس کے خارج ہونے کے بعد جسم میں تکان اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے، جس کا دیر تک رہنا بھی جسم کے لئے مضر ہے، غسل کرنے اور جلدی غسل کرنے سے یہ تکان ختم ہو جاتی ہے اور انسان تازہ دم ہو کر اپنے دینی اور دنیوی کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں غسل و وضو صحت کے لئے بھی نہایت مفید ہیں۔

شریعت مطہرہ نے طہارت کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ ایسی بیماری کی صورت میں جس کے لئے پانی کا استعمال مضر ہو یا، حالت سفر میں پانی میسر نہ ہو تب بھی بظاہر طہارت حاصل کر لینے کا اہتمام کیا جائے، جس کا ذریعہ تیمم کو قرار دیا گیا، ظاہر ہے تیمم سے غسل و وضو کے فوائد تو نہیں حاصل ہوتے لیکن اللہ کے حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے اور تعمیل حکم ہی کا نام اسلام ہے، انشاء اللہ تیمم سے متعلق تفصیلی گفتگو سورۂ مائدہ کی آیتِ تیمم کے ذیل میں کی جائے گی۔

اے ایمان والو: تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ نماز کی عظمت اور اس کے تقدس کا خیال رکھو، جس کا مقتضی یہ ہے کہ حالت سکر، نشہ کی حالت میں اس کے قریب بھی نہ جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو جائے جو تمہارے ایمان ہی کے لئے خطرہ بن جائے اور نہ ہی ناپاکی کی حالت میں اس کے قریب جاؤ کہ جو اللہ طہارت و پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے، وہ ہرگز گوارانہیں کرتا کہ اس کے دربار، میں بندہ ناپاکی کی حالت میں کھڑے ہو کر اس کا مقدس کلام پڑھے، وہ کلام جس کو ناپاکی کی حالت میں پڑھنا اور چھونا دونوں حرام ہیں، ہاں اگر کوئی بغیر وضو ہے تو پڑھ سکتا ہے لیکن چھو پھر بھی نہیں سکتا، طہارت کا حصول یقیناً پانی ہی سے ہوتا ہے لیکن اللہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ تم اس کے احکام کے کس قدر پابند ہو لہٰذا ایسی صورت میں کہ پانی کا استعمال کسی بیماری کے سبب تمہارے لئے تکلیف دہ ہو یا باوجود کوشش کے پانی میسر نہ ہو، تمہارے رب نے تمہارے لئے حصول طہارت کا ذریعہ تیمم کو قرار دیا ہے، جو پاک مٹی یا مٹی کی جنس مثلاً پتھر، ریت وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے، حدثِ اصغر اور حدثِ اکبر دونوں کے لئے اس کا طریقہ ایک ہی ہے کہ ایک مرتبہ ہاتھوں کو مٹی پر مار کر منہ پر پھیرلو اور ایک مرتبہ ہاتھوں کو مٹی پر مار کر پورے ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیرلو، بس وضو یا غسل ہو گیا، اے ہمارے بندوں ہمارے اس حکم سے اندازہ لگاؤ کہ ہم کیسے غفور و رحیم ہیں، ہمیں تم سے صرف اپنی اطاعت و فرمانبرداری کرانا مقصود ہے، کسی پریشانی یا تکلیف میں ہم تمہیں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہیں دشواری میں مبتلا نہیں فرماتا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ



مقالہ ۲۳

النساء:۵۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (النساء:۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں، پھر اگر تم جھگڑنے لگو کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور رسول کی طرف۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر، یہی بہتر ہے اور بہت اچھا ہے اس کام کا انجام۔

اطاعت

اطاعت وفرمانبرداری انسان کی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر نہ تو کسی گھر کا نظم ونسق چل سکتا اور نہ ہی کسی ملک کا، اگر گھر میں چھوٹے بڑوں کی اطاعت نہ کریں تو پورا گھر تتر بتر نظر آئے گا اور اگر ملک میں رعایا حکومت کی فرمانبردار نہ ہو تو پورا ملک بدامنی وانتشار کا گہوارہ بن جائے گا۔

اطاعت

اطاعت ہر انسان کی خواہش ہے، ہر بڑا چاہتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، ہر طاقتور چاہتا ہے کہ کمزور اس کا مطیع ہو، ہر حاکم چاہتا ہے کہ رعایا اس کی فرمانبرداری کرے، والدین اپنی اولاد کی اطاعت پر ناز کرتے ہیں، شوہر اپنی بیوی پر جب ہی قربان ہوتا ہے، جب وہ اس کی مطیع وفرمانبردار ہو حکام اپنی رعایا کی فرمانبرداری ہی پر عیاشی کرتے ہیں، ایسے ایسے قوانین گڑھے جاتے ہیں جن سے قوم جکڑی رہے، کسی کو مجال اف نہ ہو، سوشلزم اور کمیونزم جیسے ظالمانہ نظام حکومت اسی ہوس اطاعت کا نتیجہ ہیں کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ حکام نے روٹی، کپڑا اور مکان کے لالچ میں مبتلا کر کے اپنی قوموں کو غلامی کی زنجیروں میں ایسا جکڑا کہ وہ ظلم وستم ہی کو اپنا حق سمجھنے لگے۔

اسی لئے ہر دور میں یہ مسئلہ رہا ہے کہ کون کس کی اطاعت کرے، تاریخ انسانیت میں کبھی دولت وطاقت کو اطاعت کا معیار سمجھا گیا اور انسانوں نے دولت مندوں اور طاقتوروں کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ انسانی حقوق تک سے محروم کر دیئے گئے، انہیں صرف اپنی دولت پر ہی نہیں بلکہ اپنی عزت آبرو پر بھی اختیار نہ رہا، انسانیت ایسی ذلیل وخوار ہوئی کہ انسانوں کو انسانوں کے سامنے سجدے کرنے پڑے، انسانوں کا خون چوسنے والے یہ شہنشاہ و بادشاہ، تکبر وغرور کے دلدل میں ایسے پھنسے کہ انہیں اپنے علاوہ کوئی بڑا نظر ہی نہ آتا تھا اسی لئے انہوں نے خدائی تک کے دعوے کر ڈالے۔

اسلام انسان کی فطرت وضرورت کو پامال نہیں کرتا، بلکہ فطری تقاضوں کی تکمیل اور ضروریات کے حصول کے لئے اس کی صحیح رہبری کرتا ہے، اطاعت جو انسان کی فطرت بھی ہے اور ضرورت بھی، اسلام اسے پامال نہیں کرتا بلکہ مزید ابھارتا ہے اور مؤمن کو اطاعت گزار و اطاعت شعار بننے کی تاکید کرتا ہے اور ساتھ ہی اس الجھن کو بھی ختم کرتا ہے کہ کس کی اطاعت کی جائے، پس حکم دیا گیا کہ

اے ایمان والو! تم تین کی اطاعت کرو، اللہ کی، رسول ﷺ کی اور اپنے حکام کی، کہ حقیقتاً تو اطاعت صرف ایک اللہ ہی کی ہوگی لیکن تم میں بلاواسطہ اللہ کے احکام لینے اور اس کی مرضی جاننے کی صلاحیت نہیں، پس اللہ نے تم پر کرم کیا اور اپنے احکام تم تک پہنچانے اور ان پر عمل کا طریقہ سکھانے کے لئے تم میں رسول مبعوث کیا گیا، جو بظاہر تمہاری طرح انسان ہے لہٰذا تم اس کی فرمانبرداری اختیار کرو اور رسول کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ رسول کے ذریعہ تمہیں جو نظامِ حیات دیا گیا ہے، وہ قیامت تک محفوظ رہے گا اور اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ سکھانے والوں کا سلسلہ جاری رہے گا، یہ لوگ رسول کے خلفاء اور نائب ہوں گے، یہی تمہارے امیر اور اصل حکام ہیں لہٰذا رسول کے بعد تم ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرو تاکہ تم رسول کے فرمانبردار رہو اور بواسطہ رسول ہمارے مطیع بندے بنو۔

اللہ کی اطاعت

انسان اشرف المخلوقات ہے، اس کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے، قرآن تو انسان کو انسان کی غلامی اور ظلم وستم سے آزاد کرانے کے لئے نازل ہوا، انسانوں کی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے نہیں، پس حکم دیا گیا کہ اے ایمان والو! تم ہمارے ہو، اور یہ کائنات جسے ہم نے تمہاری چاکری کے لئے پیدا کیا ہے، یہ بھی ہماری ہے،

پس تم بھی ہمارے بنو، ہماری اطاعت وفرمانبرداری کرو، ہمارے احکام کی تعمیل کرو، یہی تمہارے لئے بڑا اعزاز ہے، یہی تمہارا تاجِ شرافت ہے، پس سنو:

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

(الانعام: ۶۲)

پھر لوٹائے جائیں گے اللہ کی طرف، جو ان کا حقیقی مالک ہے۔ سن لو۔ حکم اسی کے لئے ہے اور وہ سب سے تیز حساب کرنے والا ہے۔

اس رب جلیل کی اطاعت کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے جو تمہارا مالک حقیقی ہے، جس کے دربار میں تمہیں ضرور جانا ہوگا ساری کائنات اس کی محکوم ہے، اس سے زیادہ جلد اعمال کا حساب لینے والا کوئی نہیں۔ اے ایمان والو! یہی رب مستحق ہے کہ تم اسی کی اطاعت وفرمانبرداری کرو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

(یوسف: ۴۰)

نہیں ہے حکم (کا اختیار کسی کو) سوائے اللہ کے اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو یہ دین قیم ہے اور لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

یعنی جس دین کی حقانیت، روشن دلائل سے واضح ہو چکی ہے اور تم نے اس کو قبول بھی کرلیا ہے، وہ کیسے تمہیں سوائے اللہ کے کسی اور کا مطیع وفرمانبردار بننے کی تعلیم دے سکتا ہے، پس اس حقیقت کو تسلیم کرو کہ اللہ کے سوا کسی کا حکم اس کائنات میں نہیں چلتا، لہٰذا تم بھی اسی کے حکم کو مانو اور اسی کی عبادت اختیار کرو۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾

(قصص: ۷۰)

اور وہی اللہ ہے، نہیں کوئی معبود سوائے اس کے اسی کے لئے ہے ہر قسم کی تعریف دنیا میں اور آخرت میں اسی کے لئے حکم ہے اور اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، نہ کوئی ایسا ہے کہ غلام بن کر تم اس کی تعریفیں کرو، ہر قسم کی تعریف کا مستحق تمہارا خالق حقیقی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، پس وہی اس لائق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اس کا حکم چل رہا ہے اور بالآخر تمہیں اس کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

(قصص: ۸۸)

اور نہ پکارو (بناؤ) اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوا اس کی ذات کے، اسی کے لئے حکم ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔

امیروں، دولتمندوں، شہنشاہوں، بادشاہوں، یا کسی اور کی پوجا نہ کرو، اللہ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ سب ایک دن ہلاک ہو جانے والے ہیں صرف اللہ کی ذات باقی رہنے والی ہے۔ اسی کی حکمرانی تسلیم کرو، ایک دن اسی کے دربارِ عالی میں سب کو جمع ہونا ہے۔

ایمان والوں کے لئے کتنا بڑا اعزاز ہے کہ انہیں دنیا والوں کی تابعداری سے نجات دلا کر صرف اس ایک اللہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا، جو بلاشبہ سب سے بڑا ہے، دنیا والے کسی بڑے سے نسبت پیدا کر کے بڑے بنتے ہیں اور اپنی بڑائی پر بڑا فخر کرتے ہیں، تم اس بڑے کے مطیع ہو جاؤ جو سب سے بڑا ہے، پھر تم سے بڑا کوئی نہ ہو سکے گا۔ ''وھو خیر الحاکمین''، ''اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ۔''

رسول ﷺ کی اطاعت

اور ''رسول ﷺ کی اطاعت کرو'' قرآن کریم میں (غالباً) سولہ مقامات پر ''اطیعوا اللّٰہ'' فرمایا گیا ہے اور ہر مقام پر اسی کے ساتھ ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' بھی موجود ہے کیونکہ اہل ایمان کو حقیقت میں تو اللہ ہی کی اطاعت کرنا ہے لیکن یہ بغیر واسطہ رسول کے ممکن نہیں کہ اللہ نے رسول کو اپنے احکامات بندوں تک پہنچانے اور ان کی تشریح اور عملی تعلیم دینے کی ذمہ داری سونپی ہے، پس جب تم اللہ کی اطاعت کرو گے تو پہلے تمہیں رسول کی اطاعت کرنا ہوگی۔ لہٰذا رسول کو صرف پیغمبر نہیں بلکہ تمہارا مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) قرار دیا گیا۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول ﷺ مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ ہی کے حکم سے۔

رسول ﷺ کی اطاعت کو غیر اللہ کی اطاعت نہ سمجھنا، بلکہ

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:۸۰)

جس نے اطاعت کی رسول ﷺ کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی۔

کیونکہ رسول ﷺ کو، رسالت و نبوت کا عظیم منصب ہم نے سونپا ہے اور اس کی مناسبت سے ہم نے ہی اُن کو بلاواسطہ علم عطا فرمایا ہے وہی سب سے زیادہ ہمارے قریب ہے، اُس سے بہتر ہمارے احکام کی تشریح کوئی نہیں کر سکتا، نہ ہی اس سے زیادہ ہمارے احکام پر کوئی عمل کر سکتا ہے، اُس کا ہر لفظ قرآن کی تشریح ہے، اُس کا ہر عمل قرآن کی تفسیر ہے، اُس کا ہر کام قرآن کی عملی تربیت، ''وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝'' اس کی شان ہے، ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرآن'' اس کی ادا ہے، پس اے ایمان والو، تم اس معلم کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک، ایک ادا کی پیروی کرو، بلا تامل، بالکل مطمئن ہو کر۔

وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر:۷)

اور رسول جو تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

رسول ﷺ معصوم ہوتا ہے، اس سے کسی معاملے، بالخصوص امور شریعت میں غلطی کا احتمال و شائبہ بھی نہیں، لہٰذا تم

بلا تامل اس کی فرمانبرداری و پیروی کرو، اس کی ہر ادا پر عمل ہماری رضا کا سبب اور ہماری ہی اطاعت ہے، اور اگر اس رسول کے دامن کو چھوڑ کر تم نے دنیا والوں کی اطاعت اختیار کر لی، تو بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے، در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرو گے۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (انعام: ۱۱۷)

اور اگر تم اطاعت کرو گے اکثر لوگوں کی جو زمین میں ہیں تو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے، وہ تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ تو صرف اندازے ہی لگاتے رہتے ہیں۔

یہ حکام، بڑی طاقت کے دعویدار، ان کے پاس کیا ہے، صرف ظن و گمان، اندازے اور تخمینے، انہی سے یہ انسانوں کے لئے قانون سازی کرتے رہتے ہیں اسی لئے تو ان کا کوئی قانون اٹل نہیں ہوتا، ایک قانون بناتے ہیں وہ ناکام ہو جاتا ہے تو دوسرا بنا لیتے ہیں وہ بھی ناکام ہوتا ہے تو تیسرا، بس یہی کرتے رہتے ان کا عمل ثابت کرتا ہے کہ ان کے پاس انسانیت کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام نہیں جس کے مطابق یہ قوم کی رہنمائی کریں، بس اپنے گمان، خیال اور اندازوں سے لوگوں کو غلام بنائے رکھنے اور اقتدار پر جمے رہنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں، تم ان کے فریب میں ہرگز مبتلا نہ ہونا، ورنہ اپنی اصل منزل، رضائے الٰہی سے دور ہو کر ذلیل و خوار ہو جاؤ گے ہم نے تمہیں اس ذلت و خواری سے محفوظ رکھنے ہی کے لئے اُس رہبر کی اطاعت کی ہدایت کی ہے، جس کا دیا ہوا قانون، آخری ہے، قیامت تک کے لئے ہے اپنی افادیت کے اعتبار سے، ہر دور کے لوگوں، دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والوں کی کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے۔ کیونکہ یہ قانون اس کے ظن و گمان اور اندازوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کا ماخذ، منبع، وہ علم یقینی ہے جو اللہ علیم و خبیر نے اسے عطا فرمایا ہے، پس اس میں نہ تو غلطی کا امکان ہے نہ حالات کے مطابق کسی کمی اور زیادتی کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اگر تم نے اس قانون کو اپنا لیا، تو اللہ تمہاری کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے، اس قانون کی پابندی کر لو، قرآن کھول کر دیکھو، تمہیں دنیا ہی میں کیسے کیسے مژدے سنائے جا رہے ہیں۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (النساء: ۱۳)

اور جو شخص فرمانبرداری کرے گا، اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی، داخل فرمائے گا اسے اللہ باغوں میں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں، اور یہی ہے بڑی کامیابی (دنیا و آخرت کی)۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ (النور: ۵۲)

اور جو شخص، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے، اور ڈرتا رہتا ہے اللہ سے، اور بچتا رہتا ہے اس کی (نافرمانی سے) پس یہی لوگ کامیاب ہیں (دنیا و آخرت میں)۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (الاحزاب:۷۱)

اور جو شخص اطاعت کرتا ہے، اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی تو وہی پاتا ہے بڑی کامیابی (دنیا و آخرت میں)۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا (الفتح:۱۷)

اور جو شخص اطاعت کرتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کی داخل فرمائے گا، اسے اللہ باغوں میں کہ جاری ہوں گی ان کے نیچے نہریں اور جو شخص روگردانی (نافرمانی) کرے گا، اسے اللہ دردناک عذاب دے گا۔

اے ایمان والو! تمہارا مُطاع حقیقی، اللہ ہے اور اُس کی اطاعت کا وسیلہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لہٰذا تم غیروں سے بھیک مانگنے کی بجائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے غلام بن جاؤ، ساری دنیا تمہارے در کی بھکاری ہو جائے گی دیکھو انہیں جو گمراہی کی تاریکی میں بھٹک رہے تھے، انسانیت سے بہت دور ہو چکے تھے، تکبر وغرور نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا، عیش وعشرت اور عیاشی ان کا مقصد زندگی تھا، دوسروں کو لوٹنا، ستانا، ظلم وستم کرنا، ان کا مشغلہ تھا کہ آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور چمکا پس جن کا مقدر چمکا وہ سیدھی راہ پر پلٹے، دنیا کے آقاؤں کو ٹھوکر مار کر، اس آقا کی پناہ میں آئے جس نے انہیں آقا بنا دیا، یہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت و پیروی اور غلامی ہی کا تاج ہے کہ آج تک بلالِ حبشی، زید بن ثابت، صُہیب رومی، سَلمانِ فارسی، عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہم، ہمارے آقا ہیں، ہمارے سر کا تاج ہیں، ان کا احترام ہمارے ایمان کا جز ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اسی غلامی نے ''اَفْضَلَ الْخَلْقِ بَعْدَ الْاَنْبِيَاءِ'' کا شرف بخشا، حضرت عمر فاروق، اسی غلامی کے سبب دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے ایسے حکمران بنے کہ دنیا کو حکمرانی کے ڈھنگ سکھا گئے، حضرت عثمان غنی نے اسی غلامی پر اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ حتیٰ کہ جان کی قربانی بھی پیش کر دی، حضرت علی کو اسی غلامی نے ابوتراب، اسد اللہ اور حیدر کرار بنا دیا اور جملہ صحابہ کرام کے لئے یہی غلامی، مُطاع حقیقی اللہ رب العزت جل وعلا کی طرف سے اعلان خوشنودی ورضا کا سبب بنی۔

''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ''

اُولِي الْاَمْر کی اطاعت

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اہل ایمان کو ''اُولِي الْاَمْر'' کی اطاعت کا حکم دیا گیا، یعنی ان لوگوں کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے جو رسول ﷺ کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد، اللہ اور اس کے رسول کے احکام نافذ کرنے اور ان پر عمل کرانے کے ذمہ دار ہوں۔ ظاہر ہے یہ وہی لوگ ہوں گے، جو قرآن وسنت کو جانتے بھی ہوں اور اس پر عمل کر کے ''اَتْقٰی'' کے منصب کو حاصل کر چکے ہوں، یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خُلفاء اور ان کے بعد وہ نائبین ہیں جنہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ''وارثِ انبیاء'' قرار دیا۔ امت مسلمہ کے دینی ودنیوی امور کی سربراہی کا حق

صرف انہی حضرات کو حاصل ہے کیونکہ مسلمانوں کو زندگی بسر کرنے کے لئے نہ کسی قانون سازی کی اجازت ہے اور نہ ہی ضرورت، ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کا عطا کردہ قانون، نہایت مکمل ہے۔ اسلامی سربراہ مملکت کو امت کے اہل خرد و علم کے مشورے سے اپنے دور کے مطابق طریقہ نفاذ مرتب کرنا ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری وہی سربراہ انجام دے سکتا ہے، جو خود اسلامی قانون کا عالم ہو، خدا ترس ہو، متقی و، دیانت دار ہو اور اس کے مشیر بھی انہی خوبیوں کے مالک ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد صحابہ کرام نے اپنا امیر اس شخصیت کو منتخب کیا جو ان میں سب سے افضل، اتقی اور سب سے زیادہ دین جاننے والے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو ان کی امارت وخلافت کو تسلیم کرنے کی وجہ بیان کر کے قیامت تک کے لئے استحقاق امارت کی بنیادی وجہ متعین فرمادی کہ ”جس شخص کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمارے دینی امور سونپے اور نماز کا امام بنایا، اس سے زیادہ ہمارے دنیوی امور کی سربراہی کا کون مستحق ہو سکتا ہے“ یعنی سب سے اہم سربراہی تو نماز کی سربراہی یعنی امامت ہے، پس جو مسلمانوں کی امامت کا اہل ہے، وہی مسلمانوں کی امارت کا بھی اہل ہے۔ نیز خلیفہ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیفہ اور مسلمانوں کے امیر کی ذمہ داری اور حیثیت واضح فرمادی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ فَاِنِّي قَدْوُلِّيْتُ عَلَيْكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ فَاِنْ اَحْسَنْتُ فَاَعِيْنُوْنِيْ وَاِنْ اَسَاءْ تُ فَقَوِّمُوْنِيْ

اے لوگوں مجھے تمہارا حاکم مقرر کیا گیا ہے۔ حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں پس اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دینا۔

پھر آپ نے اپنی امارت کے بنیادی مقاصد بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

وَاَطِيْعُوْنِيْ مَا اَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَلَا طَاعَةَ لِيْ عَلَيْكُمْ

اے لوگو! میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فرمانبردار ہوں۔ اور جب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری فرمانبرداری نہیں۔

آیت زیر گفتگو میں، جن ”اولی الامر“ کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے وہ وہی ہیں جو خلیفہ اول کے نقش قدم پر ہوں، جو حصولِ اقتدار کے بعد خود کو حاکم نہیں بلکہ احکم الحاکمین کا بندہ، رسول کا غلام اور مسلمانوں کا خادم سمجھتے ہوں اور جو دوسروں ہی کو قانون کی پابندی کا حکم نہ دیتے ہوں، بلکہ عوام سے زیادہ خود قانون کے پابند ہوں۔ اسی لئے قرآن کریم ”اولی الامر“ کی اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ ہی وضاحت فرماتا ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

اگر (تمہارے اور حکام کے درمیان) کسی چیز میں اختلاف ہو جائے۔ تو اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کی طرف رجوع کرو۔

اختلاف کی صورت میں حکام کو کسی قانون سازی کا اختیار نہیں اور عوام کو احتجاج، بدامنی اور انتشار و افتراق میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ حکام و رعایا، سب اللہ کے بندے، رسول ﷺ کے غلام ہیں، باہمی اختلاف کا فیصلہ حاصل کرنے کے لئے انہیں قرآن وسنت کی ہی طرف رجوع کرنا چاہئے اگر امیر کا حکم اس کے مطابق ہو تو قوم کو سرِ تسلیم خم کر دینا چاہئے۔ ورنہ اطاعت واجب نہیں۔ امیر کو اپنا حکم واپس لے لینا چاہئے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امیر کی اطاعت کے لئے ایک بنیادی اصول متعین فرما دیا ہے کہ ''لَا طَاعَةَ لِلْمَخْلُوْقِ فِیْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ'' کہ جس کا حکم ماننے میں اللہ کی نافرمانی ہو، اس کی اطاعت واجب نہیں۔

موجودہ دور میں مسلم ممالک کے حکمران نہ ''اولی الامر'' ہیں اور نہ ہی ان کے زیر حکومت ممالک، اسلامی ممالک ہیں۔ چاہے وہ اپنے ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے کتنے ہی بلند و بانگ دعویٰ کریں۔ نہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کے پابند رہے، نہ ہی عوام۔ لہٰذا وہ شرعاً ''اولی الامر'' نہیں اور نہ ہی ان کی اطاعت کر کے قرآن کریم کے اس حکم پر عمل ہو سکتا ہے کیونکہ ان کا حکم ہی قرآن وحدیث کا حکم نہیں ہوتا۔ اب تو دستور ساز اسمبلیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن کے ذریعہ اپنی عقل کے مطابق یا غیروں کے دستور کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے قانون بنایا جاتا ہے اور اس کی پابندی پر امت کو مجبور کیا جاتا ہے۔ پس جو پسند کرتا ہے وہ تسلیم کرتا ہے اور جو پسند نہیں کرتا، وہ مخالفت کرتا ہے احتجاج کرتا ہے۔ اگر اس میں حکام سے زیادہ قوت ہوتی ہے تو وہ حاکم کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ورنہ جبراً اسے بھی سرِ تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے، چونکہ حکام اللہ اور رسول ﷺ کے مطیع نہیں ہوتے۔ لہٰذا اللہ کے بندے بھی زیادہ دیر ان کی فرمانبرداری نہیں کرتے۔ نتیجتاً مسلمانوں کے ملک بدامنی و افتراق اور معاشی بدحالی کا شکار ہیں اور وہ قوم جس کے نام سے کسی دَور میں غیر مسلم کانپا کرتے تھے، آج ذلیل وخوار ہے، اسے دہشت گردوں میں شمار کیا جا رہا ہے۔

آج اگر کسی ملک کے مسلمان اپنے حاکم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو اسے ہرگز بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ وہ قابل تعریف ہیں، قابل تقلید ہیں کہ وہ بدکردار حاکم سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، دین کی بقاء کے لئے، قربانیاں پیش کرتے ہیں اسوۂ حسین (رضی اللہ عنہ) پر عمل پیرا ہیں، کیا کہیں گے آپ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو، انہوں نے یزید کی مخالفت کیوں کی، اس کی بیعت سے انکار کیوں کیا، حتیٰ کہ اپنی جان کی بازی لگا دی۔ جبکہ یزید مسلمان تھا، جبکہ انہی حسین نے اور ان کے بھائی امام حسن رضی اللہ عنہ نے یزید کے باپ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کی تھی، لیکن یزید کی اطاعت قبول نہ کی۔ صرف اس لئے کہ وہ بدکردار تھا، بدعمل تھا، شرابی تھا، اللہ اور اس کے رسول کا باغی تھا۔ آج مسلم ممالک کے حکام کے عمل و کردار کا جائزہ لینا ہوگا۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے باغی ہیں تو ان کی اطاعت حرام ہے اور بغاوت عین شریعت کے مطابق ہے اور اسوۂ حسین پر عمل ہے۔ اے اللہ ہمیں ہمت و توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے باغیوں کی غلامی سے آزاد ہو کر تیرا کلمہ بلند کر سکیں یا اللہ ہم تیرے احکام کی تعمیل کریں اور تعمیل کرنے والوں کو اپنا حاکم و امیر بنائیں۔ آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۲۴

النساء: ۷۱ تا ۷۶

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝ وَ اِنَّ مِنْكُمْ
لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ
شَهِيْدًا ۝ وَ لَىِٕنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ
يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ
اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ
النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ
اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا

اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ (النساء:۷۱ تا ۷۶)

اے ایمان والو! ہوشیار رہو پھر (وقت پر) نکلو ٹولیاں بن کر یا نکلو سب مل کر ۔ اور بیشک تم میں سے کچھ ضرور دیر لگائیں گے پھر اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت تو وہ کہے احسان فرمایا اللہ نے مجھ پر کہ میں ان کے ساتھ (جنگ میں) حاضر نہ تھا اور اگر ملے تمہیں فضل (فتح اور مال غنیمت) اللہ کی مہربانی سے تو ضرور کہے۔ جیسے نہ تھی تمہارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی، کاش میں بھی ہوتا ان کے ساتھ تو حاصل کرتا بڑی کامیابی ۔ پس چاہئے کہ لڑا کریں اللہ کی راہ میں (صرف) وہ لوگ جنہوں نے بیچ دی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض اور جو شخص لڑے اللہ کی راہ میں پھر (خواہ) مارا جائے یا غالب آئے تو (دونوں حالتوں میں) ہم دیں گے اسے بڑا اجر ۔ اور کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جنگ نہیں کرتے ہو ۔ اللہ کی راہ میں ۔ حالانکہ کئی بے بس مرد، عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آکر) عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! نکال ہمیں اس بستی سے، جس کے بسنے والے ظالم ہیں اور بنادے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی دوست اور بنا دے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار جو ایمان لائے ہیں وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں وہ جنگ کرتے ہیں طاغوت کی راہ میں ۔ تو (اے ایمان والو) لڑو شیطان کے حامیوں سے بیشک شیطان کا مکر کمزور ہے۔

اس کائنات کا مالک حقیقی اللہ رب العزت جل مجدہ نہیں پسند فرماتا کہ اس کے بندے ظلم وستم کا شکار ہوں ان کے حاکم ایسے لوگ بنیں جو انہیں اپنی ذاتی اغراض اور ہوس کی بھینٹ چڑھائیں، وہ پسند نہیں فرماتا کہ اس کے بندوں کو ایسی راہ پر ڈالا جائے، جو اس کے غضب اور اس کے عذاب کی طرف لے جائے، وہ پسند نہیں فرماتا کہ اس کی پیدا کردہ اس حسین وجمیل کائنات کو فتنہ وفساد برپا کرنے والے تباہ کر ڈالیں ۔ پس اس نے انسان کو ظالموں، جابروں کے چنگل سے نجات دلانے، اس کائنات کو امن وسکون کا گہوارہ بنانے کے لئے، ان نفوس قدسیہ کو مبعوث فرمایا جنہیں نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ ان حضرات نے اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں سے ہر دور میں ایسے افراد کا ایک لشکر تیار کیا جو اللہ کی زمین پر اللہ ہی کے قانون پر عمل کریں اور ساری دنیا میں اسے نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کریں ۔ یہی گروہ، گروہِ مومنین، کہلاتا ہے ۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی مقصد کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا گیا۔ آپ نے کم مدت میں قیامت تک کے لئے، اللہ کے سپاہیوں کا ایسا لشکر تیار کر دیا جو ہر دور میں، اللہ کی زمین سے فتنہ وفساد پیدا کرنے والوں کو مٹانے اور اللہ کے بندوں کو ظلم وستم سے نجات دلانے کا ذمہ دار قرار پایا۔ گویا ہر مومن اللہ کا سپاہی ہے، ماضی کا ہو، حال کا یا مستقبل کا، اس کی ذمہ داری ہے کہ جہاں اور جب بھی اللہ کے باغی سر اٹھائیں اور اللہ کے دین، اللہ کے قانون کو مٹانے کا عزم کریں تو یہ سپاہی نکلے، ایسے باغیوں کو کچلے، مظلوموں کا سہارا بنے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرے، اسی مقصد کے حصول کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ

اے ایمان والو! تم اللہ کے سپاہی ہو۔ اچھا سپاہی کبھی عیش وعشرت اور عیاشی میں مبتلا نہیں ہوتا، وہ کبھی ایسا عمل نہیں کرتا، جس سے اس کی قوت وطاقت میں کمی آئے، وہ تو ہر وقت اپنی سرحدوں کی حفاظت کی فکر میں رہتا ہے، وہ تو ہر وقت دشمن کی گھات میں رہتا ہے، اس کا کوئی لمحہ غفلت کی نیند کا نہیں ہوتا، پس اے میرے محبوب کے غلاموں تم اچھے سپاہیوں کی طرح ''خُذُوْا حِذْرَکُمْ'' ہر لمحہ اور ہر آن ہوشیار رہو، مسلح رہو، تم سے کسی وقت تمہارا ہتھیار چھوٹنے نہ پائے، اپنی دولت کو اسباب عیش جمع کرنے میں صرف نہ کرو، دشمن کے خلاف ہتھیار حاصل کرنے پر صرف کرو، اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کرو کہ ہر محاذ پر دشمن کا مقابلہ کر سکو، اتنا علم حاصل کرو کہ دشمن علمی محاذ پر تمہیں شکست نہ دے سکے، محنت ومشقت کر کے خوب دولت کماؤ کہ دشمن تمہیں دولت کے لالچ میں مبتلا کر کے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے نہ روک سکے، جنگی اسلحہ جمع کرو کہ دشمن اسلحہ کی جنگ میں تم پر غالب نہ آ سکے۔ تم میں سے مخصوص افراد پر مشتمل تمہاری فوج نہ ہو، بلکہ تمہارا ہر فرد مرد، عورت، بچے، سب فوجی ہوں۔ کاروباری اوقات میں تم ایک محنتی دیانت دار قوم نظر آ ؤ، اوقات نماز میں تمہارے سر اللہ کے دربار میں جھکے ہوں اور دین کی حفاظت کے موقع پر تم بہادر سپاہیوں کی فوج بن کر دشمن کو تہس نہس کر کے داد شجاعت حاصل کر و یا اپنی جانیں قربان کر کے مقام شہادت حاصل کرو۔

تنہا جنگ نہ کرو

جب وقت جنگ آ جائے اور اسلام کے دشمنوں سے سوائے جنگ کے کوئی چارہ نہ رہے تو یہ اصول یاد رکھنا کہ کبھی تنہا مقابلے کے لئے نہ نکل پڑنا کیونکہ تمہارا رحیم رب تم پر ہرگز ایسی ذمہ داری عائد نہیں کرتا جس کی تم میں قوت نہ ہو اور نہ ہی وہ تمہیں ہلاکت کے منہ میں ڈالنا پسند فرماتا ہے پس جب تم دشمن کے مقابلے کے لئے نکلو تو ٹولیاں بنا کر نکلنا یا سب کے سب مل کر دشمن پر حملہ آور ہونا اس کے لئے ضروری ہے کہ اے میرے سپاہیو! تمہارے دل ایک دوسرے سے ملے ہوں، تمہارے قدم ایک ساتھ اٹھیں، تم نظم وضبط کے عادی بنو، تمہاری صفیں ایسی منظم ہوں کہ کوئی طوفان ان کو حرکت تک نہ دے سکے، تم اپنی جگہ سے نہ ہلنے والے ایسے پہاڑ بنو جس سے ٹکرانے والی ہر قوت پاش پاش ہو جائے، اپنے اتحاد، نظم اور ضبط کے باوجود یہ نہ بھولنا کہ تمہاری صفوں میں ایسے منافق، ایسے غدار بھی ہوں گے جو اپنے جان و مال، اہل وعیال سے دین کی بہ نسبت زیادہ محبت رکھتے ہیں جس کے سبب ان کا ایمان کمزور ہو گیا ہے، ان کی غیرت مٹ چکی ہے، انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس تک نہیں رہا ہے، ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ، میدان جنگ میں جانے سے ٹال مٹول کرتے رہتے ہیں اور اگر تمہیں دشمن کی طرف سے کوئی وقتی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار تک نہیں کرتے بلکہ یہی کہتے ہیں کہ ''اگر ہم بھی میدان جنگ تک پہنچ جاتے تو ہمارا بھی یہی حال ہوتا'' اور اگر تمہیں اللہ کے فضل وکرم سے فتح وکامیابی نصیب ہوتی ہے، عزت ملتی ہے، مال غنیمت ہاتھ آتا ہے، تب بھی یہ تمہاری خوشی سے خوش نہیں ہوتے بلکہ اتنے خود غرض ہیں کہ اس وقت بھی اپنا ہی رونا روتے اور کہتے ہیں'' کاش ہم بھی ان لوگوں کے ساتھ چلے جاتے تو آج فتح کا سہرا ہمارے سروں پر بھی ہوتا اور

مال غنیمت میں ہم بھی حصہ دار بنتے'' اے اللہ کے سپاہیو! ایسے لوگوں سے غافل نہ ہونا کہ ان سے بے خبری تمہاری ساری قوت کو ختم کر سکتی ہے، تمہاری عزت کو ذلت میں، تمہاری فتح کو شکست میں اور تمہاری خوشحالی کو بدحالی میں بدل سکتی ہے۔ یہ خود بزدل ہیں کہیں ایسا نہ ہو تمہیں بھی بزدل بنا دیں۔

اے ایمان والو! وہ اللہ کی راہ میں کیا جنگ کریں گے جنہیں اپنا مال و دولت عزیز ہو، جو اپنے بیوی، بچوں کی محبت میں گرفتار ہوں۔ وہ کیا میدان جہاد میں آئیں گے جنہیں دنیا کے عیش و عشرت نے پہلے ہی بزدل بنا دیا ہے۔ میدان جہاد میں تو وہ آتا ہے جو دنیا کی زندگی کو پہلے ہی آخرت کی زندگی کے عوض فروخت کر چکا ہے۔ اس نے اپنی منزل دنیا کی ترقی نہیں آخرت کی نجات بنالی ہے، جو اس دنیا کو ایک کھیتی سمجھ کر اس سے اللہ کی رضا کا پھل حاصل کرنا چاہتا ہے، جس کے نزدیک دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی اللہ کی بندگی اور رسول کی غلامی ہے۔ یہی اس کی عزت ہے، یہی اس کی دولت ہے اس کی حفاظت کے لئے وہ باہمت ہوتا ہے، بہادر ہوتا ہے، نہ مصائب و آلام سے ڈرتا ہے، نہ موت سے، اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا، اس کے نزدیک بستر کی موت سے کہیں بہتر میدان جہاد میں شہید ہو جانا ہوتا ہے، شہادت کے بلند مرتبہ ہی کی تلاش میں وہ اللہ کے دشمن کے سامنے سینہ تان کر آتا ہے۔ پس وہ قتل کر دیا جائے، یا فاتح بن کر زندہ لوٹ آئے، دونوں حالتوں میں فائدے ہی میں رہتا ہے۔ اسی کے لئے ''فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا'' کا مژدہ ہے، شہید ہوا تو حیات جاوداں پا گیا۔ قیامت تک کوئی نہ مردہ کہہ سکتا ہے، نہ خیال کر سکتا ہے، زندہ واپس لوٹا تو عزت پائی، مال غنیمت سے حصہ پایا، خوشحالی ملی، غازی کہلایا، مجاہد بن گیا، مال و دولت، کاروبار، اہل و عیال، سب کچھ مل گیا۔

یہ مقصد ہے کہ اس دنیا میں حق کا بول بالا ہو
خدا کہتا ہے کہ مقصودِ زمین و آسماں تم ہو
شہادت کی دکان پر بزدل گاہک نہیں آتے
زہے جرأت خریدار حیاتِ جاوداں تم ہو
جہاں تم ہو وہاں جور و استبداد ناممکن
کسی دشمن کا امکان ہی نہیں رہتا جہاں تم ہو
(احسان دانش)

☆☆☆

مسلمانوں کا خوں ضائع نہ ہوگا
پیمبر کے علَم بردار ہم ہیں
لگاؤ ہے صحابہ کی روش سے
نبی کے حاشیہ بردار ہم ہیں
کسی عنواں سے بھی ظالم نہیں ہیں
خدا کے خوف کا اظہار ہم ہیں
حریفوں کو شکست فاش دیں گے
جلال حیدرِ کرار ہم ہیں
قسم ہے غازیان سربکف کی
غلام سیدِ ابرار ہم ہیں
(شورش کاشمیری)

شہیدوں کا خون دیوار ہے دشمن کے رستے میں
یہ وہ دیوار ہے جس میں جڑی ہیں قوم کی آنکھیں
اسے ڈھانا تو کیا، اس سے ٹکرانا بھی ناممکن ہے
کسی کا اس سے کترا کر نکل جانا بھی ناممکن ہے

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آسان نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذان ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سَیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
(اقبال)

بے بسوں کی حمایت کے لئے جنگ

تمہاری حمیت وغیرت کو کیا ہو گیا کہ تمہارے بے بس مرد، عورتیں، بچے دین کے دشمنوں کے مظالم سہتے سہتے تنگ آچکے ہیں حتیٰ کہ وہ ہم سے دعائیں کر رہے ہیں کہ ”یارب ہمیں ظالموں کی بستی سے نکال لے، ہمیں کوئی حمایتی اور مددگار عطا فرمادے“ کیا ان بے بسوں کی آہیں، پکاریں تم تک نہیں پہنچتیں تمہاری ذمہ داری ہے کہ اگر کسی بستی میں، ہمارے نام لیواؤں پر ظلم ہو رہا ہے تو تم اٹھو اپنے بے بس بھائی، بہنوں اور بچوں کی مدد کو پہنچو۔ اس وقت تک قتال کرو جب تک تم انہیں نجات دلانے میں کامیاب ہو جاؤ اسلاف نے اسی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری پوری کی لیکن شومیٔ قسمت کہ آج وہ جن کو اللہ نے دولت بھی دی ہے، قوت بھی دی ہے، وسائل بھی ان کو حاصل ہیں، آسائش وآرام اور عیش وعشرت میں مست ہیں، اپنی ذمہ داری سے غافل ہیں، انہیں نہ کشمیری بھائی، بہنوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، نہ انہیں فلسطینیوں کی تباہی وبربادی نظر آتی ہے، نہ ان کے کانوں تک ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کی آہیں پہنچتی ہیں، مسجدیں شہید کی جارہی ہیں، عورتوں کی عزت وآبرو لوٹی جارہی ہے، مسلمانوں سے ایمان کی دولت چھینی جارہی ہے، ”مظلوم اللہ سے مدد کی بھیک مانگ رہے ہیں“ لیکن اللہ کے سپاہی خوابِ غفلت میں پڑے سو رہے ہیں۔ اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا۔ وقت کی پکار ہے، امت کو تمہاری ضرورت ہے، عیش وعشرت کے قلعوں سے باہر آؤ، سیاسی حیلہ بازی چھوڑو، تم اللہ کے سپاہی ہو، اللہ کے مظلوم بندوں کی مدد کو پہنچو۔

اے ایمان والو! تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس خلوص سے ہتھیار اٹھاؤ، خلوص سے دشمن کے مقابلہ پر آؤ،

جہانگیری کے لئے نہیں، شخصی اقتدار کے استحکام کے لئے، مال و دولت لوٹنے کے لئے، صرف اللہ کے حکم کی تعمیل کے لئے، اللہ کی رضاء کے لئے کہ مؤمن کا مقصدِ جہاد، اس کے سوا کچھ نہیں۔ جبکہ کفار دنیاوی مقاصد کے لئے مال و دولت کی ہوس پوری کرنے کے لئے، دنیا کو اپنے زیرِ پا کرنے کے لئے، شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ کتنے ہی کر و فر سے تمہارے سامنے آئیں، ان کے پاس کتنا ہی اسلحہ کیوں نہ ہو، ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اللہ کے سپاہیوں کے سامنے، ان کی کوئی حیثیت نہیں ''اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطَانِ کَانَ ضَعِیْفًا'' ان کی ساری تدبیریں رائیگاں ہوں گی، وہ اللہ کے شیروں کے سامنے ٹک نہ سکیں گے۔ پس اے ایمان والو! اپنی ذمہ داری پوری کرو، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا۔

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ



مقالہ ۲۵

النساء: ۹۴، ۱۰۱ تا ۱۰۴

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ (النساء: ۹۴)

اے ایمان والو، جب تم اللہ کی راہ میں سفر کے لئے نکلو تو خوب تحقیق کرلو، اور نہ کہو اسے جو تم پر سلام بھیجتا ہے کہ تم مؤمن نہیں ہو تم تلاش کرتے ہو دنیاوی زندگی کا سامان پس اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں۔ ایسے ہی (کافر) تم بھی تھے، اس سے پہلے، پھر احسان فرمایا اللہ نے تم پر، پس خوب تحقیق کرلو، یقیناً اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ

فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا
فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىٕكُمْ وَ لْتَاْتِ طَآىٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْا
حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ
فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ
كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا
مُّهِیْنًا ﴿۱۰۲﴾ فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ
فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَ لَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ
الْقَوْمِ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا
یَرْجُوْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۰۴﴾ (النساء: ۱۰۱ تا ۱۰۴)

اور جب تم سفر کرو، زمین میں تو نہیں ہے تم پر کوئی حرج، اگر تم قصر کرو نماز، اگر ڈرو تم اس بات سے کہ تکلیف پہنچائیں گے تمہیں کافر بیشک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں اور (اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) جب آپ ان میں موجود ہوں اور قائم کریں آپ ان کے لئے نماز تو چاہئے کہ کھڑا ہو ایک گروہ ان سے آپ کے ساتھ اور وہ پکڑے رکھیں اپنے ہتھیار، پس جب سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں گے اور آ جائے دوسرا گروہ جس نے (ابھی) نماز نہیں پڑھی ہے پس (اب) وہ نماز پڑھیں گے، آپ کے ساتھ اور لئے رہیں اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار تمنا کرتے ہیں کافر، اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے اسلحہ سے، اور اپنے ساز و سامان سے تو وہ ٹوٹ پڑیں تم پر یکدم اور نہیں کوئی حرج تم پر، اگر ہو تمہیں تکلیف بارش کی وجہ سے یا تم بیمار ہو تو اتار دو اپنے ہتھیار اور ہوشیار رہو بیشک اللہ نے کافروں کے لئے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے) پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو ادا کرو نماز، بیشک نماز فرض کی گئی ہے مسلمانوں پر اپنے، اپنے وقت پر اور نہ کمزوری دکھاؤ (دشمن) قوم کی تلاش میں اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو انہیں بھی دکھ پہنچتا ہے جیسے تمہیں دکھ پہنچتا ہے اور تم امید رکھے ہو اللہ سے اس (ثواب) کی جس کی وہ امید نہیں رکھتے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، بڑا دانا ہے۔

خیال رہے کہ آیت نمبر ۹۴ کے بعد ہم نے ان چند آیات کو چھوڑا ہے جن میں خطاب خصوصاً اہل ایمان سے نہیں بلکہ ان میں جہاد اور مجاہدین کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے بعد آیت نمبر ۱۰۱ تا ۱۰۴ دوبارہ خطاب اہل ایمان سے ہو رہا ہے، لہٰذا انہیں برائے گفتگو شامل کر لیا ہے۔

نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فتح خیبر کے بعد اس کے قرب و جوار میں آباد قبائل کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے لشکر روانہ فرمائے انہی میں ایک لشکر غالب بن فضالہ لیثی کی قیادت میں فدک کی طرف بھی روانہ

فرمایا، جس میں حضرت اُسامہ بن زید بھی بحیثیت سپاہی شریک تھے۔ فدک کے قبیلہ نبی مرہ کو غزوۂ خیبر اور قلعہ خیبر کی فتح کی اطلاع پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور وہ مسلمانوں سے خوفزدہ ہو چکے تھے۔ جب انہیں اطلاع ملی کہ اب لشکر اسلام ان کی طرف بھی آرہا ہے تو وہ بستی خالی کر کے بھاگ گئے۔ لیکن ایک صاحب جن کا نام مرداس تھا، نہایت مطمئن اپنے گھر میں بیٹھے رہے کیونکہ وہ پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ بستی خالی ہونے کے بعد، وہ لشکر اسلام کو بستی میں داخل ہوتے دیکھنے کے جذبہ میں اپنی بکریاں، اونٹ لے کر ایک پہاڑ پر جا بیٹھے اور لشکر اسلام کا انتظار کرنے لگے۔ جونہی انہوں نے نعرۂ تکبیر کی صدا سنی، مرداس بھی مسرت و شادمانی میں جھومتے، پرجوش نعرہ لگاتے پہاڑ سے اتر آئے، نہ جانے کتنی مدت بعد اس عاشق کی یہ آرزو پوری ہوئی تھی کہ کاش میں بھی اللہ کا کلمہ بلند کروں اور کاش میں بھی اس نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کروں جس کو دیکھے بغیر میں نے اس کا کلمہ پڑھا اور غلامی قبول کی ہے۔ ابھی تکمیل آرزو کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے تھے کہ بیچارے حادثہ کا شکار ہو گئے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے انہیں پہاڑ سے اترتے دیکھ لیا، اُسامہ نوجوان تھے۔ خیبر فتح کر کے آرہے تھے، جذبہ جہاد کمال جوش پر تھا، ایسی حالت میں یہ خیال تو آ ہی نہ سکتا تھا کہ کفر کی تاریکی میں ڈوبی بستی میں بھی تو اسلام کی شمع ٹمٹما سکتی ہے اور ہمارے نعرے کا جواب دینے والا ہمیں سلام کرنے والا، شاید اسی شمع کا علمبردار، اسی کا محافظ ہوگا جو نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیل چکا ہوگا۔ آج وہ ہمیں دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا، یہ بھی ہماری طرح ایک مجاہد ہی ہے، ہماری طرح ایک عاشق، ایک غلام ہے، اگر اُسامہ کو یہ سب کچھ سوچنے کا موقع ملتا، تو وہ یقیناً اسے گلے لگاتے اور آقا کے قدموں تک پہنچا دیتے، لیکن آہ! اُسامہ کو سوائے اس کے کچھ خیال نہ آیا۔ کہ یہ بھی کوئی کافر ہی ہے، یہودی ہے جو اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے ہم سے دھوکا کر رہا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی دوسرا اس کی طرف بڑھے کیوں نہ میں ہی اس کی گردن اڑا کر اپنا ثوابِ جہاد بڑھالوں اور اس کے مال و دولت سے اسلامی خزانہ میں اضافہ کر دوں۔ غرضیکہ اسامہ تلوار تانے آناً فاناً مرداس کے سر پر جا پہنچے۔ انہوں نے مزید بلند آواز سے کلمہ پڑھنا چاہا۔ لیکن اُسامہ نے ہمیشہ کے لئے ان کی آواز ہی ختم کر دی۔ دوسرے ساتھیوں نے جب یہ حال دیکھا، تو ان میں اختلاف ہوا۔ بعض حضرات اُسامہ کے عمل کو جائز، جبکہ بعض نے ناجائز کہا اور اسے اپنے ہی بھائی کا قاتل قرار دیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے اس حادثہ پر اظہار افسوس کیا اور حضرت اُسامہ کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔

بے احتیاطی کا سدباب

ان آیات کے سبب نزول کے ذیل میں مفسرین کرام نے یہ واقعہ اور اس جیسے دیگر واقعات تحریر فرمائے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آیہ مبارکہ کے نزول سے قبل ایسے کئی حادثات رونما ہو چکے تھے اور اب وقت آگیا تھا کہ قیامت تک کے لئے ایسی بے احتیاطی کا سدِّ باب کر دیا جائے لیکن ان واقعات سے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی ان کو صحابہ پر طعن کا بہانہ بنانا چاہئے بلکہ ان حالات اور اس ماحول پر غور کرنا چاہئے جن میں یہ حادثات پیش آئے ایسے اکثر واقعات تو دورانِ جہاد پیش آئے، جبکہ جنگی ماحول کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ ہر غیر معروف شخص کو دشمن سمجھا جائے، ہاں چند واقعات ایسے بھی ہیں جو مدینہ منورہ ہی میں ہوئے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ کہ صحابہ کرام اسلام کے اس ابتدائی دور میں، اس قدر جوشِ ایمان میں

سرمست رہا کرتے تھے کہ کسی ایسے شخص کو وہ مؤمن ماننے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے جس کے ایمان کی تصدیق نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نہ کر چکے ہوں یا جس کے ایمان لانے کی خبر عام نہ ہو چکی ہو ایسے شخص کا اچانک ظاہر ہو کر کلمہ پڑھنا یا سلام کرنا اس کے جان و مال کی حفاظت کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔ دوسرے اس لئے کہ یہ دور ایسا تھا کہ ہر طرف سے اسلامی ریاست اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف مختلف انداز سے سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ پس جب بھی صحابہ اپنے درمیان کسی کافر یا کسی غیر معروف شخص کو پاتے تو اگر قتل نہ بھی کرتے تھے، تب بھی ان کے ہاتھ اپنی تلواروں تک ضرور پہنچ جاتے تھے اس خیال سے کہ یہ شخص دشمن کا کوئی جاسوس نہ ہو اور ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے گویا ایسے جتنے واقعات بھی کتابوں میں موجود ہیں وہ دوران سفرِ جہاد پیش آئے یا احتیاط کے نتیجہ میں پیش آئے، پس صحابہ کرام کے متعلق کسی غلط فہمی کی گنجائش ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مناسب وقت آیا اور بذریعہ وحی اس بے احتیاطی کا سد باب کیا گیا تو صرف اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے اللہ نے اپنا حکم نازل فرمایا۔ صحابہ کے اس عمل پر کوئی وعید نہ فرمائی گئی اور نہ ہی اسے گناہ یا نافرمانی قرار دیا گیا۔ صرف مستقبل کے لئے ہدایات جاری فرمائی گئیں، آیت نمبر ۹۴ پر دوبارہ بغور نظر ڈالئے تو آپ ہماری تائید کریں گے۔ پس پہلی ہدایت یہ دی جارہی ہے کہ

اے ایمان والو:۔ جب تم کس انجان شخص کو اعلان اسلام کرتے، کلمہ پڑھتے دیکھو یا سنو۔ بالخصوص حالتِ سفر میں ایسا واقعہ پیش آئے تو صرف جوش میں فیصلہ نہ کرو، احتیاط ہی کا خیال نہ کرو بلکہ اس معاملہ کو بہت اہم سمجھو اور ''فتبینوا'' یعنی تحقیق کرو، خوب تحقیق کرو۔ اگر کسی کا اسلام ثابت ہو جائے تو اسے گلے لگالو اور تحقیق کے بعد بھی مسلمان ہونا ثابت نہ ہو تو شرعی قانون کے مطابق عمل کرو کہ بلا تحقیق کسی کی جان لے لینا اور اس کے مال و دولت پر قبضہ کر لینا تو بڑی بات ہے، مؤمن کو تو کسی معاملہ میں بھی زیب نہیں دیتا کہ وہ عجلت کرے۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلْاَ نَاۃُ مِنَ اللّٰہِ وَالْعُجْلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ

اطمینان اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔ (ترمذی)

یعنی اللہ پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے ہر کام کرنے سے پہلے سوچیں، غور کریں، خوب تحقیق کریں۔ پھر اللہ پر بھروسہ کر کے عمل کریں۔ تاکہ ان کا کوئی عمل اس کے حکم کے خلاف نہ ہو، ان کا کوئی کام ان کے لئے مضر اور نقصان دہ نہ ہو۔ جبکہ شیطان کی کوشش ہوتی ہے، کہ بندہ بغیر سوچے سمجھے کام کر ڈالے تاکہ اسے نقصان پہنچے یا اللہ کے حکم کے خلاف ہو جائے کہ شیطان تو مؤمن کا کھلا دشمن ہے۔ وہ کب پسند کرے گا کہ مؤمن کو کامیابی کی خوشی یا اللہ کی رضا نصیب ہو۔ پس اے ایمان والو تم جو کام بھی کرو، چاہے وہ دین کا ہو یا بظاہر دنیا کا، سفر میں ہو یا حضر میں، بالخصوص کسی کے ایمان قبول کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ ہو۔ ہر کام میں اللہ کا پسندیدہ طریقہ اختیار کرو یعنی پہلے مطمئن ہو جاؤ، اس کے پس و پیش پر خوب غور کر لو، انجام کو سوچ لو، ضروری تحقیق کر لو پھر اطمینان سے قدم اٹھاؤ۔

اے ایمان والو:۔ بلا تحقیق کسی سلام کرنے والے یا کلمہ پڑھنے والے کے ایمان کا انکار نہ کرو نہ اسے کافر جانو اور نہ اس کی

جان، اس کے مال کو حلال سمجھو۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر دو باتوں کی وضاحت نہایت اہم ہے۔ سلام کرنا، بلا تحقیق کسی کے ایمان کا انکار کرنا۔

سلام کرنا

ہر قوم اور مذہب کے لوگوں میں باہمی ملاقات کے وقت کچھ اچھے الفاظ بولنے کا رواج ہے لیکن اسلام نے اس موقع کے لئے جو جملہ مقرر فرمایا ہے، ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' قرآن کریم نے اس کے لئے ''تحیۃ'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، یعنی درازی عمر کی دعا۔ ارشاد ہے:

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ (النساء:۸۶)

اور جب تمہیں سلام دیا جائے کسی لفظ دعا سے تو تم (جواب) سلام دو ایسے لفظ سے جو بہتر ہو، بیشک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

طریقہ سلام کی تعلیم دینے والے، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ کو ''باہمی محبت'' کا ذریعہ قرار دیا۔ فرمایا:

لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى تَحَآبُّوْا اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ

جب تک ایمان نہ لاؤ گے جنت میں داخل نہ ہو گے اور جب تک آپس میں محبت نہ کرو گے کامل مؤمن نہ بن سکو گے کیا میں تمہیں ایسی بات بتاؤں جس پر عمل کرو تو آپس میں محبت پیدا ہو جائے گی، ایک دوسرے کو ''السلام علیکم'' کہا کرو۔ (ترمذی)

نیز میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کو نزول برکت کا ذریعہ فرمایا۔ راوی ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ، فرمایا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے:

يَابُنَيَّ اِذَا دَخَلْتَ عَلٰى اَهْلِكَ فَسَلِّمْ يَكُوْنُ بَرَكَةً عَلَيْكَ وَعَلٰى اَهْلِ بَيْتِكَ

اے بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو انہیں سلام کرو، تم پر اور تمہارے گھر والوں پر برکت نازل ہوگی۔ (ترمذی)

نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپس میں، ایک دوسرے کو سلام کرنے، گھر میں داخل ہوتے وقت، گھر سے نکلتے وقت، سلام کرنے، بچوں کو سلام سکھانے کی تعلیم دی اور بکثرت یہ جملہ کہتے رہنے کی تاکید فرمائی کیونکہ یہ دیگر قوموں میں رائج الفاظ کی طرح کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ یہ درازیِ عمر کی دعا، باہمی محبت پیدا کرنے کا ذریعہ، نزول برکت کا باعث ہے حتیٰ کہ یہ علامتِ ایمان ہے، ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا'' اس شخص کے ایمان کا انکار نہ کرنے کی ہدایت ہے جو سلام کے ذریعہ اپنے مؤمن ہونے کا اعلان کر رہا ہو پس جو شخص ''السلام علیکم'' کہے گا مسلمان، اسلامی لشکر، حکومت اسلامیہ کا سربراہ، سب ہی اس کے معاون و مددگار ہو جائیں گے، اس کی جان، اس کا مال محفوظ

ہو جائے گا، وہ اللہ کی اس کے رسول کی پناہ میں آ جائے گا۔ جو تلوار اس پر تنی تھی، اب وہی اس کی محافظ بن جائے گی لیکن یہ اس کے لئے ہے جو شرعی سلام کرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم کردہ سلام کرے، یعنی کہے ''السلام علیکم ورحمۃ'' یہی شرعی سلام ہے، اسی پر شریعت کے احکام نافذ ہوتے ہیں، اس رحمت بھرے جملے کو چھوڑ کر، جن لوگوں نے آج اپنے الفاظ گڑھ لئے ہیں۔ مثلاً صباح الخیر، صباح النور، مساء النور، وغیرہ وہ ان تمام برکات وتحفظات سے محروم ہیں۔ جن کا ذریعہ قرآن کریم اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کو قرار دیا۔

بلاتحقیق کسی کے ایمان کا انکار

آیت زیر گفتگو میں واضح ہدایت موجود ہے کہ جب کوئی تمہیں سلام کرے تو ''فتبینوا'' تحقیق کرو، بلاتحقیق اس کے ایمان کا انکار نہ کرو۔ یعنی تمہارے پاس جو بھی قابل اعتبار ذرائع موجود ہیں، ان سے تمہیں تحقیق کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر تحقیق سے ثابت ہو جائے کہ وہ واقعی مؤمن ہے، تو وہ تمہارا بھائی ہے اور اگر تحقیق سے ثبوت اس کے برعکس حاصل ہو یعنی یہ کہ وہ سلام صرف تمہیں دھوکا دینے کے لئے، تم سے اپنے جان ومال کے تحفظ کے لئے، یا تمہاری جاسوسی کے لئے کر رہا ہے تو اس کے ساتھ شرعی قانون کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص صرف سلام ہی نہیں کرتا بلکہ کلمہ بھی پڑھتا، مسلمانوں میں بالکل مسلمانوں کی طرح رہتا ہے۔ لیکن تحقیق سے ثابت ہوا کہ وہ العیاذ باللہ شراب، سود، یا اور کسی حرام کو، جس کی حرمت کا واضح اعلان قرآن کریم نے کیا ہے حلال سمجھتا ہے یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں کھلی گستاخی کرتا ہے، یا آپ کے آخری نبی ہونے پر یقین نہیں رکھتا، پس ایسے شخص کا ایمان، ایمان کی دیگر علامات ہونے کے باوجود بھی قبول نہ کیا جائے۔ قانون شریعت کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کیا جائے گا۔

اسی لئے تو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی مخالفت کے باوجود منکرین زکوٰۃ سے جہاد کے لئے، اسلامی لشکر روانہ فرمایا حالانکہ وہ تمام شرعی احکام کے پابند تھے، صرف زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر رہے تھے اور اسی لئے آپ نے مسیلمہ کذاب اور اس کے گروہ سے جہاد فرمایا کہ وہ دیگر عقائد اسلام کا تو اقرار کر رہے تھے، لیکن نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کو تسلیم نہ کرتے تھے اور اسی لئے پاکستان کی قومی اسمبلی نے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا کہ وہ مرزا غلام احمد کذاب کو نبی مانتے، مجدد مانتے، یا کم از کم مؤمن مانتے ہیں اور اسی لئے ان مرتدین کو حرمین شریفین میں داخلہ کی اجازت نہیں۔

یہ سب کچھ ہم نے اس لئے عرض کیا کہ ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا'' کے ارشاد سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کسی بھی سلام کرنے والے کو، کافر یا مرتد نہیں کہا جا سکتا، چاہے اہل علم کی تحقیق سے اس کا کفر یا ارتداد ثابت ہو چکا ہو، جیسا کہ بہت جاہل یہی کہتے سنے گئے ہیں کہ ''ہر کلمہ گو مسلمان ہے'' یہ جملہ بولنا بھی جائز نہیں کہ اس سے مرتدین کو بھی مسلمان سمجھنا ثابت ہوتا ہے جو خود اپنی جگہ کفر ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔

بلاتحقیق کسی چیز کی حِلّت کا انکار

قرآن کریم کے اسی ارشاد سے یہ بات بھی مفہوم ہے کہ جس طرح بلاتحقیق کسی سلام کرنے والے کے ایمان کا انکار

ممنوع ہے، اسی طرح بلا تحقیق کسی چیز کے حلال ہونے کا انکار بھی ممنوع ہے کیونکہ اصول شریعت یہ ہے کہ ''اصل الاشیاء الا باحۃ'' کہ اصلاً ہر چیز حلال ہے، صرف وہ چیزیں حرام قرار پائیں، جن کو شریعت مطہرہ، یعنی اللہ اور نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حرام فرما دیا۔ پس اگر حالات و ماحول کے مطابق تحقیق ضروری نہ ہو تو بلا وجہ اپنے آپ کو دشواری میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً آپ کسی مسلمان کے گھر کھانے پر مدعو ہیں، کسی مسلم ایئر لائن سے آپ سفر کر رہے ہیں، کسی مسلم ملک میں آپ مستقل یا عارضی مقیم ہیں۔ ان حالات میں اور اس ماحول میں آپ کا یہ سوال کہ گوشت حلال ہے یا نہیں، بڑا ہی عجیب ہوگا جبکہ اس کے برعکس یعنی کسی غیر مسلم کے گھر کھانا کھانے کا موقع آ گیا یا کسی غیر مسلم ایئر لائن سے آپ سفر کر رہے ہیں، یا کسی غیر مسلم ملک میں آپ مستقل یا عارضی مقیم ہیں۔ ان حالات اور اس ماحول میں آپ کے لئے یہ تحقیق کرنا واقعی لازمی ہے کہ گوشت یا دیگر اشیاء خورد ونوش حلال ہیں یا نہیں، گویا غیر مسلم ماحول میں ہر چیز بلا تحقیق کھا، پی لینا جائز نہیں اور مسلم ماحول میں تحقیق کرتے پھرنا بھی جائز نہیں کہ یہ بلا وجہ اپنے تقویٰ کا اظہار اور اپنے مسلمان بھائیوں پر عدم اعتماد ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ ہاں اگر کوئی مسلمان حرام اشیاء کا کاروبار کرتا ہے۔ مثلاً اس کی دکان یا ہوٹل پر شراب بھی ہوتی ہے تو ایسے شخص کے یہاں سے تو کوئی چیز بھی خریدنا جائز نہیں۔

اے ایمان والو:۔ بلا تحقیق کسی سلام کرنے والے یا کلمہ پڑھنے والے شخص کے ایمان کا انکار نہ کرو بالخصوص جبکہ تم سفر جہاد میں ہو، جہاں اس کو مؤمن تسلیم نہ کرنے کا مطلب اس کی جان لے لینا اور اس کے مال کو غنیمت بنا لینے کے سوا کچھ نہ ہوگا اگر تم یہ بے احتیاطی اس لئے کرتے ہو کہ اس طرح تمہیں اس شخص کا مال مل جائے گا تو تمہیں یہ خیال بالکل زیب نہیں دیتا کہ تم تو اس مذہب کے ماننے والے ہو جو رزّاق حقیقی اللہ ہی کو قرار دیتا ہے، یہ معمولی مال غنیمت حاصل کر لینے سے تمہیں خوشحالی کیا نصیب ہوگی، جب تک کہ اللہ ہی تم پر فضل فرما کر اپنے رزق کے دروازے تمہارے لئے نہ کھول دے۔ تم یہ بھی تو سوچو کہ ماضی میں خود تمہارا کیا حال تھا پھر اللہ نے تم پر کیسا کرم فرمایا، کہ نہ صرف تمہیں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں قبول کیا، بلکہ ان کے طفیل تمہاری ماضی کی غلطیاں بھی کالعدم کر دیں۔ اب تمہارے نامہ اعمال میں ان اعمال کا نشان تک موجود نہیں جو تمہارے لئے جہنم میں جانے کا ذریعہ ہو سکتے تھے۔ ہر لمحہ اس حقیقت کو ذہن میں رکھو کہ تم اس اللہ کے بندے ہو، جسے تمہارے ہر حال کی خبر ہے۔

اے ایمان والو:۔ تمہارا رحیم وکریم رب تمہاری سہولت کے لئے اجازت مرحمت فرماتا ہے کہ حالت سفر میں اگر تم نماز قصر کر لو، تو کوئی مضائقہ نہیں بالخصوص اس صورت میں جب تمہیں کفار کی طرف سے فتنہ وفساد کا خوف ہو کیونکہ کافر تو ہر دور میں تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ ان سے ہمیشہ ہی تمہیں خطرہ رہا ہے اور رہے گا۔

نمازِ قصر

قصر کے معنیٰ ہیں چھوٹا کر دینا۔ شرعی اصطلاح میں سفر کی حالت میں، چار فرضوں کی جگہ دو فرض پڑھنا قصر کہلاتا ہے۔ اسلام دینِ یُسر، آسانی کا دین ہے، اس کے تمام احکام آسان، انسان کی فطرت واستطاعت کے عین مطابق ہیں۔ ''يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ'' اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا،

رب کریم کا وعدہ ہے اور جملہ احکام شرع میں اس کی جھلک موجود ہے۔ جس شخص کو ان احکام کی تعمیل میں کچھ دشواری نظر آتی ہے، اس کا باعث اس کے ایمان کی کمزوری ہے، احکام میں دشواری نہیں۔ اسی بناء پر حالت سفر میں نماز قصر کرنے کا حکم دیا گیا۔ جس کی تعمیل احناف کے نزدیک واجب ہے، نیز یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے اور ہر سفر کے لئے ہے چاہے سفر دینی مقصد کے لئے ہو یا دنیاوی مقصد کے لئے۔ مثلاً حج کا سفر، یا علم دین کے حصول کے لئے سفر یا تجارت اور سیر و تفریح کے لئے سفر اور سفر میں مشقت، دشواری ہو یا نہ ہو۔ جیسے اونٹ کا سفر، پیدل یا بیل گاڑی وغیرہ سے سفر، کار یا ہوائی جہاز سے سفر، حالت خوف میں سفر ہو، یا امن و سکون کی حالت میں۔ غرضیکہ سفر ہو کہ قصر کا سبب صرف سفر ہے۔ اسی حکم کی وضاحت کے لئے چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

صَلٰوةُ السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ وَالْوِتْرُ فِي السَّفَرِ سُنَّةٌ

سفر کی نماز دو رکعتیں ہیں اور وہ مکمل نماز ہے ناقص نہیں اور وتر سفر میں سنت ہیں (واجب نہیں)۔

(ابن ماجہ)

قصر کو ناقص نماز نہ سمجھا جائے، حالت سفر میں یہ اسی طرح مکمل نماز ہے۔ جس طرح حالت حضر کی چار رکعتیں بلکہ یہی وہ تعداد ہے جو ابتداً فرض ہوئی تھی یعنی ابتداً ظہر، عصر اور عشاء کی دو، دو رکعتیں ہی فرض ہوئی تھیں۔ بعد ہجرت ان کو چار، چار کر دیا گیا۔ یہ روایت ہے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی۔ آپ ﷺ نے بتایا:

فُرِضَتِ الصَّلٰوةُ رَكْعَتَيْنَ رَكْعَتَيْنَ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَأُقِرَّتْ صَلٰوةُ السَّفَرِ وَزِيْدَ فِيْ صَلٰوةِ الْحَضَرِ

سفر اور حضر میں نماز دو، دو رکعت ہی فرض ہوئی تھی پس حالت سفر میں اسی طرح رکھی گئی اور حالت حضر میں زیادہ کر دی گئی۔ (مسلم شریف)

حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنٰى اٰمَنَ مَا كَانَ النَّاسُ وَاَكْثَرُهُ رَكْعَتَيْنِ

میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں۔ جبکہ آج سے زیادہ امن تھا اور ہماری تعداد بھی بہت تھی۔ (مسلم شریف)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بتاتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت ابوبکر نے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے منیٰ میں قصر پڑھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی چھ یا آٹھ سال تک قصر پڑھتے رہے (پھر انہوں نے مکہ میں نکاح کر لیا تھا لہٰذا حکمِ مسافر میں نہ رہے) حضرت حفص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما منیٰ میں دو رکعت پڑھتے اور اپنے بستر پر آرام کے لئے چلے جاتے۔

فَقُلْتُ اَیْ عَمّ لَوْ صَلَّیْتَ بَعْدَهَا رَکْعَتَیْنِ قَالَ لَوْ فَعَلْتُ لَا تْمَمْتُ الصَّلٰوۃَ

تو میں نے کہا اے چچا! کاش آپ اس کے بعد دو رکعت سنتیں بھی پڑھ لیتے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر مجھے یہی کرنا ہوتا تو میں فرض ہی پورے پڑھ لیتا۔ (مسلم شریف)

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اگر تمہیں کافروں کی طرف سے فتنہ میں پڑنے کا خوف ہو تو نماز قصر کر لو۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔" لیکن اب تو کوئی خوف نہیں، امن کا دور ہے۔

قَالَ عُمَرُ عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ فَسَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

فَقَالَ صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَیْکُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہاری طرح مجھے بھی تعجب ہوا تھا تو میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے تم پر صدقہ ہے تو اللہ کے صدقہ کو قبول کرو۔ (مسلم شریف)

غرضیکہ یہ حکم عام ہے ہر سفر کے لئے ہے، ہر دور کے لئے ہے، بندے کا کام بلا چون و چرا احکام کی تعمیل ہے کہ وہی مالک اپنے بندوں کی رضا حاصل کرتے ہیں جو بلا چون و چرا اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہے۔ اللہ اور رسول کی رضا کے حصول کے لئے یہی ضروری ہے کہ بلا چون و چرا ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ ہم بندے ہیں ہمارا کام عبادت ہے وہ معبود ہے، مالک ہے جیسے چاہے ہم سے اپنی عبادت کرائے ہمیں تو غرض قبولیت سے ہے یہ یوں اور وہ کیوں، بندے کے لئے زیب نہیں دیتا۔

چند مسائل قصر

احناف کے نزدیک شرعی سفر کی مدت تین دن کی مسافت ہے۔ یعنی وہی مسافر نماز قصر کر سکتا ہے جو اپنے شہر کی حد سے باہر اتنی دور کے لئے نکلے جہاں تک پیدل یا اونٹ پر سوار ہو کر تین دن میں پہنچا جا سکے۔ تین دن کا مطلب یہ نہیں کہ چوبیس گھنٹہ سفر ہی کرتا رہے بلکہ اس میں سونے، کھانے، پینے اور دیگر ضروریات کا وقت بھی شامل ہے۔ اس طرح ایک آدمی چھ یا آٹھ گھنٹہ سفر کرے گا۔ اس طرح یہ تقریباً چون میل، ساڑھے چھیاسی کلومیٹر ہے۔ جونہی مسافر اپنے شہری حد سے باہر ہوگا قصر شروع ہو جائے گی اور اگر اپنی منزل سفر میں قیام کا ارادہ پندرہ دن سے کم ہے تو نماز قصر ہی کی جائے گی۔ اگر پہلے ہی دن پندرہ دن سے زیادہ کا ارادہ کر لیا تو پوری نماز پڑھی جائے گی۔ لیکن ارادہ تو پندرہ دن سے کم تھا مگر اچانک کسی وجہ سے دو چار دن بڑھ گئے اور اسی طرح ہوتا رہا تو چاہے مہینوں گزر جائیں نماز قصر پڑھی جائے گی۔

دیگر تفصیلی مسائل فقہ کی کتابوں، بالخصوص "بہار شریعت" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یا سفر کے لئے روانہ ہونے سے قبل آپ جو انتظام کرتے ہیں۔ اس میں مسائل معلوم کرنے کو بھی شامل کر لیجئے اور تھوڑا وقت نکال کر اپنے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جایئے۔ وہ سب ضروری مسائل بتا دیں گے۔ کوشش کیجئے کہ نماز جیسی عبادت کسی حال میں ترک نہ ہونے پائے اور شریعت کے مطابق ادا کی جائے۔ اپنی سوچ اور عقل کو برائے مہربانی شریعت پر مسلط نہ کیجئے۔

اے ایمان والو:۔ نماز، ایک ایسا اہم فریضہ ہے جس کے ترک کرنے کی تمہیں کسی حال میں اجازت نہیں چاہے تم حضر میں ہو یا سفر میں، بیمار ہو یا صحت مند، امن کی حالت میں ہو یا خوف کی حالت میں، پس تمہیں تاکید کی جاتی ہے کہ جب تم میدانِ جہاد میں ہو، تب بھی یہ خیال نہ کرنا کہ جہاد تو خود عبادت ہے، اب نماز کی کیا ضرورت، نہیں جہاد تو کیا ہی نماز کی حفاظت کے لئے جاتا ہے۔ تو نماز چھوڑنے کی اجازت کیسے مل سکتی ہے ہاں ہم تمہیں اس موقع پر نماز ادا کرنے کا نہایت آسان طریقہ بتاتے ہیں۔

نمازِ خوف

نمازِ خوف کا طریقہ یہ ہے کہ مجاہدین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ایک جماعت دشمن کے مقابلہ پر رہے جبکہ ایک جماعت نماز ادا کرے۔ اس طرح کہ امام کے ساتھ ایک رکعت پوری کر کے یعنی دونوں سجدوں سے فارغ ہو کر بغیر سلام پھیرے یہ جماعت دشمن کے مقابلہ پر چلی جائے اور جو جماعت وہاں تھی وہ امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھے امام اپنی دو رکعتیں پوری ہونے پر سلام پھیرے اور یہ جماعت بغیر سلام پھیرے اپنی جگہ پر پہنچ جائے اور پہلی جماعت اپنی رکعت پوری کرنے کے لئے واپس آئے اور دوسری رکعت بغیر قرآت کے پوری کرے کیونکہ یہ ''لاحق'' ہو گئے اور سلام پھیر کر دشمن کے مقابلہ کے لئے پہنچ جائے اب دوسری جماعت اپنی پہلی رکعت پڑھنے کے لئے واپس آئے اور چونکہ یہ ''مسبوق'' ہو گی لہٰذا قرأت کے ساتھ اپنی نماز پوری کر کے سلام پھیر دے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نماز خوف ادا کرنے کا یہی طریقہ بیان فرمایا۔ آپ ﷺ کے بعد بھی صحابہ کرام نے اسی طرح نماز خوف ادا کی یعنی نماز خوف کا حکم صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے خاص نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے ہے۔ ہاں اب یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی امام کی اقتداء میں نماز ادا کی جائے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موجودگی میں کسی کو امامت کا حق نہ تھا لہٰذا ایک ہی جماعت ناگزیر تھی۔ اب اگر علیحدہ علیحدہ جماعت ہو تو یہ طریقہ نہ ہوگا بلکہ ایک امام کی اقتداء میں معمول کے مطابق ایک جماعت پوری نماز ادا کرے گی اور اس کے فارغ ہو جانے کے بعد دوسری جماعت اپنے امام کی اقتداء میں پوری نماز ادا کرے گی۔ یہ اس صورت میں ہے جب جنگ شروع نہ ہوئی ہو اگر جنگ شروع ہو چکی ہے تو جماعت نہیں کرائی جائے گی۔ وقت پر جس سپاہی کو جیسے موقع ملے، نماز پڑھ لے حتیٰ کہ اگر چھوٹ بھی جائے تب بھی گناہ نہیں۔ جنگ سے فارغ ہو کر ادا کر لی جائے جیسا کہ غزوۂ خندق کے دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی چار نمازیں قضا ہوئیں۔ آپ ﷺ نے فارغ ہو کر ادا فرمائیں کس قدر مکمل ہے۔ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، ہر حالت کے لئے اس میں رہبری و راہنمائی موجود ہے۔'' بیشک آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے''، صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔

اے ایمان والو:۔ تمہیں نماز کے علاوہ بھی کسی وقت اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہونا چاہئے۔ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو کہ ذکرِ الٰہی ہی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ ہے۔ اس سے قلب پر سرور رہتا ہے، اطمینان و سکون نصیب ہوتا ہے، رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے، آفات و بلیات دور ہوتی ہیں۔ جو رب کو یاد رکھتا ہے رب اسے یاد رکھتا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ (البقرہ:۱۵۲)

پس تم مجھے یاد کیا کرو، میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور میرا شکر ادا کیا کرو اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىٕنُّ الْقُلُوْبُؕ

(الرعد:۲۸)

جو لوگ ایمان لائے اور مطمئن ہوئے ہیں جن کے دل اللہ کے ذکر سے بغور سنو کہ اللہ کی یاد ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا

نماز ایسا فریضہ ہے، جس کا وقت مقرر کر دیا گیا پس تمہارے لئے لازم ہے کہ اسے وقت مقررہ پر ادا کرو۔ چاہے وہ وقت حالتِ سفر میں آ جائے، یا میدانِ جہاد میں۔ یہ ایک نظم ہے جس کا ہم تمہیں پابند کرنا چاہتے ہیں تاکہ تم زندگی کے ہر معاملہ میں نظم و نسق کے عادی بنو پس تمہیں یہ اجازت نہیں کہ جب چاہو اپنی آسانی کے مطابق اسے ادا کرلو۔ کبھی وقت سے پہلے اور کبھی وقت کے بعد۔ قرآن کریم کے اس واضح حکم کے بعد جو لوگ ایسا کریں گے وہ سخت گناہگار ہوں گے۔ اگر وقت سے پہلے نماز پڑھی گئی تو ادا ہی نہ ہوگی اور اگر وقت کے بعد پڑھی گئی تو قضا ہوگی ادا نہیں اور بلاوجہ، بلا عذر شرعی قصداً نماز قضا کرنے کا وبال اور گناہ سر پر رہے گا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بتاتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھ سے فرمایا: اے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ! تین کاموں میں دیر نہ کرو۔

اَلصَّلٰوۃُ اِذَا اَتَتْ وَالْجَنَازَۃُ اِذَا حَضَرَتْ وَالْاَیِّمُ اِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُوًا

نماز میں، جب اس کا وقت شروع ہو جائے اور جنازے میں، جب وہ تیار ہو اور بیوہ عورت کے نکاح میں، جب تمہیں اس کے لئے مناسب جوڑ مل جائے۔ (ترمذی شریف)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلْوَقْتُ الْاَوَّلُ مِنَ الصَّلٰوۃِ رِضْوَانُ اللّٰهِ وَالْوَقْتُ الْاٰخِرُ عَفْوُا اللّٰهِ

نماز کو ابتدائے وقت میں ادا کرنے میں اللہ کی خوشنودی ہے اور تاخیر میں معافی کی امید ہے۔

(مسلم شریف)

حضرت ام فروہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا گیا:

اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ قَالَ الصَّلٰوۃُ لِاَوَّلِ وَقْتِهَا

کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نماز کو اس کے ابتدائی وقت میں ادا کرنا۔

(ترمذی شریف)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے:

صلوۃً لوقتها الآخر مرّتین حتّی قبضهُ اللّٰهُ

ساری زندگی میں دو مرتبہ سے زیادہ نماز تاخیر سے ادا نہ فرمائی۔ (ترمذی شریف)

غرضیکہ اوقات نماز اللہ کی طرف سے متعین ہیں اور ان میں یہ سہولت دی گئی ہے کہ مسلمان وضو وغیرہ کر کے اطمینان سے نماز ادا کر سکے۔ اس کے باوجود اتنی تاخیر کرنا کہ وقت ختم ہونے کا اندیشہ ہونے لگے اور پھر جلدی جلدی پڑھی جائے۔ یہ قصداً تساہل ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن نے "ساھون" فرمایا اور ان کے لئے "ویل" ہلاکت و بربادی کا اعلان فرمایا ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔

اے ایمان والو: تم اللہ کے سپاہی ہو، تمہارا کام ہمہ وقت اللہ کے دشمنوں سے مقابلہ کرنا اور ان کا تعاقب کرتے رہنا ہے۔ تم دنیا کی مصروفیات یا آسائش میں مبتلا ہو کر اپنی اس ذمہ داری سے کبھی غافل نہ ہونا اور نہ ہی اس میں سستی کرنا شاید تمہارے سستی کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تمہیں یہ خیال ہونے لگے کہ یہ بڑی مخدوش اور تکلیف دہ ذمہ داری ہے تو تمہیں دیکھنا چاہئے کہ دشمن تو فتنہ و فساد اور تمہیں پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ کبھی اپنے کام میں تساہل نہیں کرتا، جب کہ اس کو بھی تو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، اس کو بھی تو اپنی جان کا خطرہ ہوتا ہے حالانکہ اس کے سامنے تمہیں پریشان کرنے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں جبکہ تمہیں جہاد کا حکم ایک عظیم مقصد کے لئے دیا گیا ہے اور وہ اللہ کی رضا کے لئے اس کی زمین پر امن و امان قائم کرنا اور اس کے کلمہ حق کو بلند کرنا ہے جس سے اللہ کی مخلوق کو پرسکون زندگی میسر آتی ہے۔ اے میرے بندو! اس مقدس مقصد کو سامنے رکھو اور دشمن کے تعاقب میں کبھی سستی نہ کرو۔ تم نے جس اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی اختیار کی ہے وہ بڑا ہی علیم اور حکیم ہے۔

وصلّی اللّٰهُ تعالی علی خیر خلقه سیّدنا مُحمّدٍ وّعلی اٰله واَصحابه اجمعین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مقالہ ۲۶

النساء: ۱۳۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

(النساء: ۱۳۵)

اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے انصاف پر قائم رہنے والے، گواہی دینے والے محض اللہ کے لئے۔ چاہے تمہیں گواہی دینا پڑے اپنے نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف، وہ دولت مند ہوں یا فقیر، پس اللہ زیادہ خیر خواہ ہے دونوں کا۔ تو انصاف کرنے میں خواہش نفس کی پیروی نہ کرو اور اگر تم ہیر پھیر کرو، یا منہ موڑو تو بیشک اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

اللہ جل مجدہ یہ پسند فرماتا ہے کہ اس کی زمین فتنہ وفساد سے مامون ومحفوظ رہے اور اس کی محبوب مخلوق انسان

پُر امن، پُرسکون زندگی بسر کرے۔ اسلام کے جملہ احکام کی بنیاد یہی حکمت ہے۔ عبادات سے متعلق احکام ہوں یا معاملات سے متعلق، اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ یہ سب انسان کو پُرسکون زندگی مہیا کرنے کے ذرائع ہیں جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ نماز کا حکم اسی لئے دیا گیا کہ مؤمن پابندیٔ وقت کا عادی بنے، مستعد رہے، اللہ کے دربار میں حاضری کا یقین اس کے دل و دماغ پر چھایا رہے، زکوٰۃ کا حکم اس لئے دیا گیا کہ مؤمن کے دل میں مال کی محبت پیدا نہ ہونے پائے، اپنے معاشرے کی خوشحالی کا جذبہ بیدار رہے، ایثار وقربانی کی عادت پیدا ہو، حج کا حکم اس لئے دیا گیا کہ دنیاوی امتیازات کو مٹا کر ایک مرکز سے وابستگی کا مظاہرہ کیا جائے اور اللہ احکم الحاکمین کی حاکمیت پر مکمل یقین کا احساس رہے، روزے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ خواہشات نفس پامال ہوں، قوتِ برداشت زیادہ ہو، جہاد کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ان خاردار وادیوں کو جن کے ظلم وستم، جبر واستبداد کے کانٹے انسانوں کے جسموں کو چھلنی اور ان کی عزت وآبرو کو تار تار کئے دیتے ہیں، ایسا پر بہار گلستان بنا دیا جائے جس کے سایہ دار درخت پریشانِ حال انسان کے لئے پناہ گاہ بن جائیں جس کی ٹھنڈی ہوائیں مردہ انسان میں جان ڈال دیں اور جس کے تروتازہ پھل مضمحل انسان کے لئے صحت افزا اور قوت بخش ہوں، باہمی معاملات میں دیانت کا حکم اس لئے دیا گیا تاکہ انسان کی انسیت پروان چڑھتی رہے، عداوت کے کانٹے اس کی فطرت کو زخمی نہ کرنے پائیں۔ زنا، جواء، شراب، سود، رشوت اور دیگر برائیوں کو اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ ان گھناؤنے اعمال میں مبتلا ہو کر تاجِ شرافت کا مالک انسان اس راہ پر نہ پڑ جائے جو اسے جنگل کے جانوروں سے جا ملائے۔ اسی طرح تمام احکامِ شرع کا آپ تفصیلی جائزہ لیجئے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ ربِ رحیم وکریم ان احکام کے ذریعہ امن وسلامتی کی زندگی فراہم کرنا چاہتا ہے آیتِ مذکورہ میں ایسے دو حکم دیئے جا رہے ہیں، جو ایسی زندگی کے حصول کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی

قیام بالقسط اور شہادت للہ

قیام بالقسط

قسط کے معنیٰ حق، عدل اور انصاف کے ہیں۔ مُقسط، انصاف کرنے والے کو کہتے ہیں لیکن قاسط کے معنیٰ اس کے بالکل برعکس ظالم ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝ (الجن: ۱۴۔۱۵)

اور بیشک ہم میں سے کچھ تو فرمانبردار ہیں اور کچھ ظالم پس جنہوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے راہ حق تلاش کر لی اور جو ظالم ہیں۔ وہ تو جہنم کا ایندھن ہیں۔

بس سورۂ جن ہی میں دو جگہ قاسطون کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ظالموں کے معنیٰ میں۔ لیکن قسط اور مُقسط کے الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔

قائم بالقسط یعنی حق وعدل پر قائم رہنا، اللہ رب العزت کی صفت ہے اور اللہ پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے بھی اپنے اندر یہ خوبی پیدا کریں یعنی ہر معاملہ میں عدل وانصاف کیا کریں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ (آل عمران:۱۸)

شہادت دی اللہ نے (اس بات کی) کہ بیشک نہیں کوئی معبود سوائے اس کے اور (یہی گواہی دی) فرشتوں نے اور اہل علم نے۔ (ان سب نے یہ بھی گواہی دی) کہ وہ قائم فرمانے والا ہے عدل و انصاف کو،نہیں کوئی معبود سوائے اس کے جو عزت والا ،حکمت والا ہے۔

اللہ کی ساری مخلوق ،اُس کی اسی صفت ،قائم بالقسط ہونے کا مظہر ہے اس نے جس کو جیسا پیدا کیا اور جس کو جو کچھ دیا ،وہ اس کا قسط اور عدل ہے۔ اعمال صالحہ پر جزاء ،اعمال سیئہ پر سزا ،کسی کو معاف کر دینا ،کسی کو عذاب میں مبتلا کرنا ،کسی کو دولت مند بنا دینا ،کسی کو غریب کر دینا ،کسی کو صحت بخشنا ،کسی کو بیماری میں مبتلا کر دینا ،کسی کو آنکھوں کا نور دنیا ،کسی کو اس سے محروم کر دینا ،کسی کو اولاد دینا ،کسی کو بے اولاد رکھنا ،غرضیکہ وہ تمام صورتیں ،جن کو ہم اچھا یا برا کہتے ہیں ،سب ہی اللہ کے عدل و انصاف کا مظہر ہیں۔ ’’تبارک اللہ احسن الخالقین۔‘‘

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَ یُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (النساء:۴۰)

بیشک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا (بلکہ) اگر معمولی سی (بھی) نیکی ہو تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور دیتا ہے ،اپنے پاس سے اجر عظیم۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْــٴًـا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ (یونس:۴۴)

یقیناً اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔

جو رب ہر قسم کی قدرت کے باوجود ،خود قائم بالقسط ہے اور اس کی کائنات کا پورا نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے وہ ہرگز پسند نہیں فرماتا کہ انسان ،جسے نہایت محدود آزادی دی گئی ہے وہ اپنی حدود سے تجاوز کرے اور اپنے ظلم و ستم اور ناانصافی سے اس کائنات کے نظام میں خلل پیدا کرے یہاں عدل و انصاف کے مالک نے ہر کسی کو مطمئن اور پرسکون رہنے کا حق دیا ہے۔ پس کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اس حق سے کسی کو محروم کرے۔ پس

اے ایمان والو: ۔تم ہمارے ہو ،ہمارے پیارے کے غلام ہو ،ہم تمہیں خصوصی ہدایت فرماتے ہیں کہ ’’كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ‘‘ہر حال میں ،زندگی کے ہر موڑ پر قسط ،عدل و انصاف اختیار کرو’’ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ‘‘اپنی خواہشات نفس کا شکار ہو کر عدل و انصاف سے محروم نہ ہونا کہ اس سے تمہاری زندگی میں توازن نہ رہے گا کہ اگر مؤمن میں عدل و انصاف کی خوبی نہ ہو تو اسے زندگی کا سکون میسر نہیں آسکتا۔ عیالی زندگی ہو یا خاندانی ،تجارتی امور ہوں یا سیاسی ،انفرادی معاملات ہوں یا قومی ،حقوق اللہ کی ادائیگی ہو یا حقوق العباد کی ،سب میں قسط کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ پس تم مضبوطی سے اس پر ڈٹے رہو ،اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ہم نے انبیاء و مرسلین کو معجزات اور اپنی کتابوں کے ساتھ اسی لئے مبعوث فرمایا کہ امتی ان کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ قسط کے عادی بن جائیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید:۲۵)

یقیناً ہم نے بھیجے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ہے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (اعراف:۲۹)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ ﷺ فرمائیے، حکم دیا ہے میرے رب نے عدل وانصاف کا۔

سورہ اعراف کی ہے۔ جس میں یہ حکم موجود ہے، گویا ایسے معاشرے اور ماحول میں عدل وانصاف کا اعلان کرایا گیا جہاں ظلم وستم ہی کو عدل وانصاف سمجھا جاتا تھا۔ اس قوم کو یہ پیغام دیا گیا، جسے نہ اللہ کے حقوق کا پتہ تھا، نہ بندوں کے حقوق کا جہاں پر فیصلہ ''ہویٰ'' کے مطابق کیا جاتا تھا اور اسے دوسروں سے تسلیم کرانے کے لئے تلواروں، اور قتل وغارت کا سہارا لیا جاتا تھا، جہاں ہر کمزور مظلوم تھا، ہر غریب غلام تھا، عورت مرد کی ملکیت تھی، جس کا مقصد وجود خواہش نفس کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے اور سوتیلی ماں کو بیوی بنا لینے والی قوم کا عدل وانصاف سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ ایسے ماحول میں عدل وانصاف کے اعلان کا حکم یہ پیغام دیتا ہے کہ اصلاحِ قوم کی خشت اول، قسط ہے یعنی جب تک قوم کا ہر ہر فرد چاہے وہ مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، انفرادی واجتماعی امور میں عدل وانصاف کا عادی نہیں بنتا اس وقت تک وہ ظلم وستم کے پنجے سے آزاد نہیں ہو سکتی، ذلت وخواری سے نجات نہیں پا سکتی، وہ چاہے قانونی طور پر آزاد ہو لیکن عملی طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوگی، ہمارے ان جملوں کو پڑھئے اور اپنے گرد وپیش کا مطالعہ کیجئے تو آپ ہماری تائید کریں گے۔

جو رب قائم بالقسط ہے اور جس نے اپنے انبیاء ورسل بالخصوص سید الانبیاء علیہم السلام کو قیام بالقسط کے لئے مبعوث فرمایا وہ اپنی آخری کتاب قرآن کے ذریعہ مقسطین سے اپنی محبت کا اعلان فرما کر انہیں عدل وانصاف کی دعوت دیتا ہے۔ صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا، پیارے! یہ یہود ونصاریٰ، بڑے ہی جھوٹے اور بہت ہی حرام خور ہیں، آپس میں جھگڑتے ہی رہتے ہیں اگر یہ آپ سے فیصلہ کرانے کے لئے حاضر ہوں تو آپ کو اختیار ہے چاہے آپ ان کا مقدمہ سنیں یا مسترد فرما دیں اگر آپ انہیں اپنے دربار سے دھتکار دیں گے تو یہ آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے لیکن

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (المائدہ:۴۲)

اگر آپ فیصلہ کریں تو فیصلہ فرمائیے ان میں انصاف سے بیشک اللہ، انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اگر مسلمانوں کے مابین کسی معاملے میں جھگڑا ہو جائے تو

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (حجرات:۹)

ان دونوں کے درمیان صلح کرادو، عدل سے اور انصاف کرو بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہ کی اور نہ ہی ظلم وستم کر کے انہوں نے تمہیں، تمہارے گھروں سے نکالا، اللہ تمہیں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے سے منع نہیں فرماتا۔

وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الممتحنہ:۸)

اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

غرضیکہ قسط، اللہ کی صفت ہے انبیاء ورُسُل علیہم السلام کی تعلیم ہے۔ اہلِ ایمان کو خصوصیت کے ساتھ اسے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ امن وامان کے علمبردار اور ذمہ دار ہیں اور گھروں میں، محلوں، شہروں اور ملکوں میں امن وامان کا قیام قسط کے بغیر ممکن نہیں۔ آج بدامنی اور انتشار وافتراق کا باعث یہی ہے کہ نہ تو افراد میں یہ خوبی پائی جاتی ہے اور نہ ہی ان کے قائدین اور حکام میں۔ اس خوبی کے فقدان کا سبب دولت کی طمع اور عیش وعشرت کی زندگی پسند کرنا ہوتا ہے انسان اگر اس دلدل میں پھنس جائے تو وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے، ہر کسی کا گلا دبانے لگتا ہے، حق تلفی اور ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ بظاہر تو اسباب عیش حاصل کرتا ہے لیکن پُرسکون زندگی سے محروم ہو جاتا ہے، اس کی عزت وعظمت پامال ہو جاتی ہے، رُعب و دبدبہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ آزادی کے باوجود، غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کبھی نفس کا غلام ہوتا ہے تو کبھی اپنے ہی دشمن کی غلامی کے شکنجہ میں جکڑا اس کے در پر ہاتھ جوڑے کھڑا نظر آتا ہے۔ آج امت مسلمہ اسی کیفیت کا شکار ہے۔

شہادت للہ

یعنی اللہ کے لئے گواہی دینا، کسی ایسی بات کا جان لینا جس کو دوسرا نہ جانتا ہو، شہادت ہے اور اس کا جاننے والا، شاہد گواہ کہلاتا ہے۔ اگر وہ بات مشاہدات یعنی دیکھی جانے والی چیزوں میں سے ہے تو اسے عینی شہادت کہتے ہیں مثلاً چاند دیکھنا، کسی کو چوری کرتے دیکھنا، کسی کو شراب پیتے دیکھنا اور اگر اس بات کا تعلق مسموعات یعنی سننے والی باتوں سے ہے۔ تو اسے سمعی شہادت کہتے ہیں مثلاً کسی کو کلمہ پڑھتے سنا، یا کسی شرعی حکم کا انکار کرتے سنا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں گستاخی کرتے سنا، اور دوسرے کو بتایا کہ فلاں شخص نے میرے سامنے ایسی بات کہی ہے۔

کسی چیز پر گواہ بن جانا، یعنی شاہد بن جانا، ایک اعزاز ہے کہ وہ اللہ کی ایک امانت کا امین بن گیا۔ بوقت ضرورت اس امانت سے سبکدوش ہونا یعنی گواہی دینا شاہد کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ (البقرہ:۲۸۳)

اور مت چھپاؤ گواہی والا جو شخص اسے چھپاتا ہے تو یقیناً گناہ کار ہے اس کا ضمیر۔

اہل جنت کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ (المعارج:۳۳)

اور وہ لوگ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں۔

چونکہ اکثر شرعی احکام اور شرعی حدود کے نفاذ کا دارومدار "شہادت" پر ہے۔ لہٰذا اسے ادا کرنے کی تاکید فرمائی گئی اور شاہد کے لئے متقی و پرہیزگار ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ شریعتِ مطہرہ میں ایسے شخص کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں جو فسق وفجور کا مرتکب ہو۔ پس ہمارے دور میں عدالتوں میں گواہی کا جو طریقہ کار رائج ہے، وہ قطعاً غیر شرعی اور افسوسناک ہے کہ احاطہ عدالت میں ہی چند پیسے دے کر مدعی اپنی مرضی کی گواہی حاصل کر لیتا اور اپنے حق میں گواہی دلا لیتا ہے۔ جبکہ گواہ ظالم کو اصل معاملہ کا علم تک نہیں ہوتا۔ اسی طریقہ کار نے عدالتی نظام کو تہس نہس کر رکھا ہے اور انصاف کو ناممکن بنا دیا ہے۔ ایسے گواہوں پر اللہ کی لعنت ہے کہ ایک طرف تو وہ جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں تو دوسری طرف نہ جانے کس کس کی حق تلفی کا وبال صرف چند پیسوں کے لئے اپنے سر پر لیتے ہیں۔ آج پیسے کمانے کے جو طریقے رائج ہیں، ان میں یہ بدترین طریقہ ہے۔ ایسے لوگ خود سزا کے مستحق ہیں۔ کہ ایسی گواہی کو "شہادتُ الزور" کہا جاتا ہے، جسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔

حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، ایک دن نماز سے فارغ ہو کر کھڑے ہوئے اور تین مرتبہ فرمایا:

عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْإِشْرَاكِ بِاللّٰهِ

جھوٹی گواہی شرک کے برابر کر دی گئی ہے۔

پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (حج:۳۰۔۳۱)

پس پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور بچو جھوٹی بات سے اللہ کی طرف مائل ہوتے ہوئے، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراتے ہوئے۔

اہلِ جنت کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ جنتیوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ (فرقان:۷۲)

اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب گزرتے ہیں کسی بیہودہ چیز کے پاس سے تو بڑے وقار سے گزر جاتے ہیں۔

گواہی اللہ کی امانت ہے اس کا امین ایسے ہی شخص کو تسلیم کیا جا سکتا ہے جو دین و دنیا کے ہر معاملہ میں امانت دار ہو اور اللہ و رسول کے احکام کا پابند ہو۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَآئِنٍ وَّلَا خَائِنَةٍ وَّلَا مَجْلُوْدٍ حَدًّا وَلَا ذِیْ غِمْرٍ عَلٰى اَخِيْهِ وَلَا ظَنِيْنٍ فِیْ وَلَآءٍ وَّلَا قَرَابَةٍ وَلَا الْقَانِعِ مَعَ اَهْلِ الْبَيْتِ

گواہی جائز نہیں خائن مرد اور خائنہ عورت کی اور نہ اس کی جس پر کوئی حد جاری ہو چکی ہو اور نہ اپنے

بھائی سے کینہ رکھنے والے کی اور نہ ولاء اور قرابت میں تہمت والے کی اور نہ گھر والوں کے خرچ پر گزارہ کرنے والے کی۔ (ترمذی شریف)

حدیث مبارکہ کی قدرے وضاحت ضروری ہے۔ خائن مرد وعورت سے مراد صرف وہ نہیں جو کسی کے مال میں خیانت کرے بلکہ یہ ہر خیانت کے لئے عام ہے۔ چاہے اللہ کا خائن اور خائنہ ہو مثلاً بے نمازی ہو، یا بندوں کا خائن و خائنہ ہو مثلاً کسی کا حق مارتا ہو صاحب مرقات نے اس کے معنیٰ فاسق کئے ہیں یعنی ہر وہ مرد اور عورت خائن وخائنہ ہے جو احکام شرع کا پابند نہ ہو۔ گویا فاسق مُعلِن گواہی کا اہل نہیں۔ جن لوگوں پر مثلاً زانی یا شرابی، حد جاری ہو چکی ہے ان کی گواہی بھی قابلِ قبول نہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم کا واضح حکم ہے ''لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا'' کہ ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ اس شخص کی گواہی بھی قابل قبول نہیں جو اپنے اس مسلمان بھائی سے کینہ رکھتا ہو۔ جس کے خلاف وہ گواہی دے رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے کینہ کی وجہ سے غلط گواہی دیدے۔ ایسے شخص کی گواہی بھی منظور نہیں جو اصلاً غلام تھا، اس کے مالک نے اسے آزاد کر دیا اب یہ شخص اپنے اصل مالک کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو اپنا سابق مالک بتاتا اور اس کا آزاد کردہ کہتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کی گواہی بھی قبول نہیں کی جاسکتی جو اپنا اصل نسب چھپاتا ہے مثلاً اصلاً وہ شیخ، پٹھان وغیرہ ہے اور اب سید بن گیا ہے کیونکہ یہ دونوں ہی جب اپنی نسبت ہی میں بددیانت ہیں تو ان سے سچی گواہی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اس شخص کی گواہی بھی ان لوگوں کے حق میں قبول نہیں جن کی دولت پر اس کا گزارہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح جس گواہی سے خود گواہ کو فائدہ پہنچے وہ گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ مثلاً باپ بیٹے کا، شوہر بیوی کا، بھائی بھائی کا یا اس کے برعکس گواہ نہیں بن سکتے۔ اسی طرح دشمن کی گواہی بھی دشمن کے لئے قبول نہیں کی جاسکتی۔

اندازہ کیجئے گواہ کی کتنی اہمیت ہے اور ہونی بھی چاہئے کہ گواہی درحقیقت قاضی، جج اور فیصلہ کرنے والے کی رہبری کرتی ہے اسی پر فیصلہ کے صحیح یا غلط ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر گواہ ہی کرایہ کا جھوٹا، بازاری ہو تو کیا حشر ہوگا، مدعی اور مدعیٰ علیہ کو کہاں سے انصاف ملے گا؟ کیسے کسی کو کسی کا حق دلایا جا سکے گا؟ یہی وجہ ہے کہ آج اصل مجرم دندناتے پھرتے ہیں اور ان کی جگہ بے گناہ لوگ سزائیں بھگتتے ہیں۔ کاش ایسی گواہی دینے والے یہ سمجھ لیں کہ ان کی گواہی پر بھی کوئی گواہ ہے۔ جس سے ان کی کوئی حرکت نہیں چھپ سکتی۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ (النساء: ۳۳)

بیشک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اے ایمان والو! تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لو۔ ہماری عبادت کرو تو ہمارے بندوں کو نہ بھولو، ان کی حق تلفی نہ کرو اور ہماری دی ہوئی نعمتوں میں مست ہو کر ہمیں نہ بھولو۔ جو ذمہ داریاں تم پر بحیثیت عبد، ہماری اور ہمارے رسول کی ہیں انہیں ٹھیک ٹھیک پورا کرو اور جو ذمہ داریاں تم پر ہمارے بندوں کی ہیں ان کے پورا کرنے میں بھی کوتاہی نہ ہونے پائے نیز تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ بحیثیت گواہ تم نہ تو گواہی کو چھپاؤ اور نہ ہی جھوٹی اور خلاف واقعہ گواہی دو، تمہارے ایمان کا تقاضا ہے کہ بوقت ضرورت یا طلب تم ضرور گواہی دو جو بغیر کسی لحاظ کے ہو، نہ اپنے

نقصان کا خوف ہو، نہ ماں، باپ یا اعزا واقارب اور احباب کی مخالفت کی پروا ہو، نہ ہی کسی امیر کبیر کا خوف ہو، نہ کسی غریب سے ہمدردی کا جذبہ ہو۔ تم نے جو کچھ دیکھا یا سنا اس کو بعینہٖ بیان کرو، تاکہ نہ تو کسی مجرم کے جرم کی تائید کے تم مرتکب ہو اور نہ ہی کسی کی حق تلفی کا سبب ہو۔ گواہی تمہاری امانت ہے اس کی ادائیگی کے وقت تمہیں کسی سے ہمدردی کا احساس کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو خود سب کا خیر خواہ ہے۔ دوسرے کے جرائم کو بھی جانتا ہے اور سب کے حقوق کو بھی۔ ظالم اور مجرم کو سزا دلانا ہی ان کی خیر خواہی ہے اور حقدار کو اس کا حق دلانا ہی خیر خواہی ہے۔ یہی عدل ہے، یہی انصاف ہے۔ اگر تم نے اپنی گواہی کے وقت اپنے فائدے کا خیال کیا یا رشتوں اور مرتبوں کا لحاظ کیا تو گویا تم نفس کی اتباع و پیروی میں مبتلا ہو گئے اور اتباع نفس نہ تمہارے اپنے لئے مفید ہے اور نہ ہی اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سو اتباع نفس "ہویٰ" کہلاتا ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (البقرۃ: ۱۲۰)

اور اگر تم نے پیروی کی ان کی خواہشات کی اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے تو نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○ (البقرۃ: ۱۴۵)

اور اگر تم نے پیروی کی ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آ چکا تمہارے پاس علم تو یقیناً تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

کسی کی خواہشات نفس کی پیروی کرنا درحقیقت اپنے ہی نفس کی پیروی ہے۔ جس کا انجام اللہ کی گرفت ہے، جس سے نجات دلانے والا کوئی نہیں۔ اس سے بڑا اپنے اوپر ظلم کیا ہو گا کہ تم اہل ایمان ہوتے ہوئے بھی اللہ کی گرفت میں اپنے آپ کو مبتلا کر لو۔ اس سے بڑی بدنصیبی اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ○ (القصص: ۵۰)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی اللہ کی جانب سے کسی رہنمائی کے بغیر بیشک اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

خواہش نفس کی اتباع ظلم کی وجہ بنتا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان اللہ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی سے بھی محروم ہو جاتا ہے جبکہ اللہ کے خوف سے اس کی اور اس کے رسول کی اتباع و پیروی تمہارے مرتبہ کو بلند کرتی ہے اتنا کہ اس زندگی میں تمہیں جنتی ہونے کا مژدہ سنا دیا جاتا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى ○ (النازعات: ۴۰-۴۱)

اور جو ڈرتا رہا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے اور اپنے نفس کو روکتا رہا (ہر بری) خواہش سے

یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

اے ایمان والو! خواہش نفس میں مبتلا ہو کر عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑو۔ اپنی گواہی کی ذمہ داری پوری کرنے میں نہ تو کوئی بہانہ بازی کرنا اور نہ ہی گریز۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ اس میں خواہشات کا تھوڑا سا دخل بھی تمہاری دنیا اور آخرت کی خرابی کا سبب بن سکتا ہے۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں:

لا يؤمن احدكم حتّى يكون هواهُ تبعا لما جئتُ به

تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش میرے حکم کی تابع نہ ہو جائے

پس اتباع نفس سے بچو اور اتباع رسول اختیار کرو اسی میں بھلائی ہے۔ اللہ توفیق عطا فرمائے آمین بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔

وصلّى اللّٰهُ تعالىٰ على خير خلقه سيّدنا محمّد وّعلى اله واصحابه اجمعين

وَاَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَقَطُّ عَيْنِیْ

وَاَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ

كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ترجمہ

میری آنکھوں نے کبھی آپ سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا،
عورتوں نے آپ سے زیادہ کوئی صاحبِ جمال نہیں جنا۔ آپ
کو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے۔
جیسے آپ اپنی مرضی کے مطابق پیدا کئے گئے ہوں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۲۷

النساء: ۱۳۶ تا ۱۴۳

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ
الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ
ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ
لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ
اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ
جَمِيْعَا ۝ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ
مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ

الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى
الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ مُّذَبْذَبِيْنَ
بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝

(النساء، ۴: ۱۳۶ تا ۱۴۳)

اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل فرمائی اللہ نے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی اس سے پہلے اور جو کفر کرے، اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت کے ساتھ تو وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا، بیشک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر بڑھتے گئے کفر میں نہیں سنت الٰہی ان کے متعلق کہ بخش دے انہیں اور نہ (یہ) کہ ہدایت دیدے۔ خوشخبری سنا دو منافقوں کو کہ بلاشبہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ منافق جو کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت (وہ سن لیں) عزت تو صرف اللہ کے لئے ہے سب کی سب۔ اور تحقیق اتارا ہے اللہ نے تم پر (یہ حکم) کتاب میں، کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جا رہا ہے ان کا اور مذاق اڑایا جا رہا ہے ان کا تو مت بیٹھو ان (مذاق کرنے والوں) کے ساتھ یہاں تک کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں ورنہ تم بھی انہی کی طرح ہو گے، بیشک اللہ اکٹھا کرنے والا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں، وہ جو انتظار کر رہے ہیں تمہارے انجام کا پس اگر تمہیں فتح ملے اللہ کی طرف سے تو وہ کہتے ہیں کیا نہ تھے ہم بھی تمہارے ساتھ اور اگر ہو کافروں کے لئے کچھ حصہ (کامیابی سے) کہتے ہیں کیا نہیں غالب آگئے تھے ہم تم پر اور (اس کے باوجود) کیا نہ بچایا تھا ہم نے تمہیں مؤمنوں سے پس اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن۔ اور ہرگز نہ بنائے گا اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں پر (غالب آنے کا) راستہ۔ بیشک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) اور جب کھڑے ہوتے ہیں نماز کی طرف تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر (صرف) لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہیں ذکر کرتے اللہ کا مگر تھوڑی دیر، ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں کفر و ایمان کے درمیان نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے اور جسے اللہ گمراہ کردے تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لئے ہدایت کا راستہ۔

آیات بالا کی پہلی آیت میں اہل ایمان کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تمہارے لئے صرف دعوئ ایمان ہی کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تم ایمانیات یعنی ان باتوں کا تفصیلی علم حاصل کرو جن پر کلمہ پڑھنے کے بعد تم نے یقین کرنے اور ان کو حق تسلیم کرنے کا اعلان کیا ہے تاکہ تم ان پر عمل کر کے اور ثابت قدم رہ کر مؤمن کامل بن سکو اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کن باتوں

کے انکار سے ایمان رخصت ہو جاتا ہے اور بندہ کلمہ پڑھنے اور مسلمانوں کی طرح عبادات و معاملات کرنے کے باوجود مؤمن نہیں رہتا یہ اس لئے تاکہ ہر مؤمن اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے اور ان لوگوں سے بچ سکے جو دعویٰ ایمان کے باوجود ایمان سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ ہدایت اُن اہلِ ایمان کے لئے بھی تھی۔ جن کے اسلام کا ابتدائی دور تھا اور انہیں ایمان کی تفصیل کا علم نہ تھا اور ان کے ہر دور کے اہلِ ایمان کے لئے بالخصوص ہمارے زمانہ کے مسلمانوں کے لئے جو مادر، پدر مؤمن تو ہیں لیکن ایمان کی تفصیل تو درکنار ایمان کی ابجد سے بھی واقف نہیں اور نہ ہی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بس ان کا ایمان کلمہ ہے، وہ بھی صحیح نہیں، کلمہ کے معنیٰ و مفہوم تک کا علم نہیں۔ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہر کلمہ پڑھنے والا مؤمن ہوتا ہے اس جہالت کے باوجود افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ تکبر و غرور میں اتنے مبتلا ہیں کہ دین کی بات بتانے والوں کے نہ خود قریب آتے ہیں اور نہ انہیں اپنے قریب ہونے دیتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر انہیں بتایا جائے کہ ایسی ایسی باتوں سے بچو ورنہ تم ایمان سے محروم ہو جاؤ گے تو منہ بگاڑتے اور بڑبڑاتے ہیں کہ ہمارا ایمان کون چھین سکتا ہے گویا ایمان ان کے باپ دادا کی وراثت ہے جس پر وہ قانونی اور عملی طور پر قابض ہیں۔ کون ان سے چھین سکتا ہے؟ یہ بڑی ہی گمراہی ہے۔ اللہ اس سے محفوظ رکھے۔ مؤمن کو تو چاہئے کہ وہ کلمہ پڑھنے کے بعد ان تمام بنیادی باتوں کا علم حاصل کرے جن پر کلمہ پڑھ کر وہ ایمان لانے کا اعلان کر رہا ہے۔ نیز ان باتوں کا علم حاصل کرے جن سے ایمان کی بقاء اور حفاظت کے لئے بچنا ضروری ہے۔ اللہ جل مجدہ اپنے فضل و کرم سے اہل ایمان کو ان بنیادی باتوں ہی کی تفصیل بتاتا ہے۔ فرمایا گیا، ایمان لاؤ۔

اللہ پر، اُس کے رسول پر، اُس کتاب پر جو رسول پر آہستہ آہستہ نازل ہوئی یعنی قرآن پر، ان کتابوں پر جو قرآن سے پہلے نازل ہوئیں۔

اور بچو ان چیزوں کے انکار سے جو کلمہ پڑھنے کے باوجود ایمان سے محرومی کا سبب بن جاتا ہے۔

اللہ کے انکار سے، فرشتوں کے انکار سے، کتابوں کے انکار سے، رسولوں کے انکار سے، آخرت کے دن کے انکار سے۔

یہ ہیں ایمانیات اور کفریات، ان کی قدرے تفصیل عرض کرنا ضروری ہے تاکہ منشائے قرآن پورا ہو سکے کہ ہر مؤمن ان باتوں کا علم حاصل کر سکے۔

اللہ پر ایمان لانا

یہ ہے کہ اس کے وجود اور وحدانیت کو تسلیم کیا جائے، نیز اس کی جملہ صفات پر یقین ہو مختصراً اس طرح کہ اللہ موجود ہے ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، ہماری ہر بات کو سنتا اور ہماری ہر حرکت کو دیکھتا ہے، ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں پوشیدہ باتوں تک کو جانتا ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی اور ختم ہونے والی ہے، اللہ یکتا و یگانہ ہے، اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں، وہی ہر چیز کا خالق و مالک اور پروردگار ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ہے، وہ زندہ ہے اور ہر چیز کو وہی زندگی بخشتا ہے اور جب چاہتا ہے فنا کر دیتا ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، وہ

ہمارے اعمال سے غافل نہیں، وہی احکم الحاکمین ہے، زمین وآسمان کا مالک حقیقی ہے، جسے چاہتا ہے عارضی اور وقتی حکومت و سلطنت عطا فرمادیتا ہے، جس سے چاہتا ہے ملک وحکومت چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت وعظمت سے نواز دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل وخوار کردیتا ہے، کائنات کی ہر چیز اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی جنبش نہیں کر پاتا، وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں، یہ آگ، پانی، ہوا سب اسی کے پیدا کئے ہوئے اور اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، اس نے ان چیزوں کو بندوں کے لئے پیدا فرمایا اور جب چاہتا ہے انہی چیزوں سے بندوں کو تباہ وبرباد کردیتا ہے، وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ نہ تو اس کے لئے کوئی کام دشوار ہے اور نہ ہی اسے کوئی کسی کام سے روک سکتا ہے، وہی معبود برحق ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ ساری مخلوق اُسی کی پاکی بیان کرتی ہے۔ اللہ ہی آسمان سے پانی برساتا اور زمین سے سبزہ و درخت، پھل، پھول اور اناج اگاتا ہے، اُسی نے دن رات پیدا کئے، کبھی دن کا بڑا ہونا، رات کا چھوٹا ہونا اور کبھی رات کا بڑا ہونا، دن کا چھوٹا ہونا، اُسی کی قدرت کا کرشمہ ہے، وہی رزاق ہے، بچے کے لئے ماں کی چھاتی میں دودھ کی نہریں جاری فرماتا ہے، اُسی نے اپنی جاندار مخلوق کے لئے زمین سے ہزاروں قسم کی غذائیں اگائیں، بچہ کو ماں سے دودھ مانگنے اور انسان و جانور کو اپنی غذا حاصل کرنے اور رزق تلاش کرنے کی ہدایت اسی نے دی، اُس کے خزانے میں نہ کبھی کسی چیز کی کمی ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے، وہ جسے جتنا چاہتا ہے رزق عطا فرمادیتا ہے، کسی کو امیر، کسی کو غریب بنادینا اس کی حکمت اور عینِ انصاف ہے، اللہ ہی نے زمین کی گہرائیوں اور سمندر کی تہہ میں انسان کے لئے خزانے پنہاں کئے اور اسی نے ان خزانوں تک رسائی کے لئے انسان کو عقل دی اور اُس کی رہنمائی فرمائی، اللہ ہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے اولاد دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے دونوں عطا فرمادیتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے موت دے دیتا ہے، کوئی دنیا میں آنے سے پہلے ہی مرجاتا ہے، کسی کی بچپن ہی میں موت آجاتی ہے کوئی جوانی میں اور کوئی بوڑھا ہوکر مرتا ہے، کوئی مرض سے، کوئی حادثہ سے مرتا ہے، تو کسی کی موت کا کوئی سبب نظر نہیں آتا، وہی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور سب اس کے دربار میں حاضر ہوں گے۔

اللہ کے رسول پر ایمان

اللہ نے انسان کی ہدایت ورہبری کے لئے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ جن میں باعتبار پیدائش سب سے پہلے اور باعتبار ظہور وبعثت سب سے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن انہیں اور ان سے پہلے جتنے انبیاء ورسل تشریف لائے، سب کو برحق تسلیم کرتا ہے، سب نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا اور تبلیغ ورسالت کی ذمہ داری کو پورا کیا، ہر رسول اپنی امت میں سب سے اعلیٰ وافضل ہوتا ہے، امتیوں پر اس کی اطاعت و پیروی لازم ہوتی ہے، گزشتہ انبیاء ورسل اپنی امتوں اور اپنے دور کے لئے مبعوث فرمائے گئے، اللہ کے آخری رسول، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء ورسل سے افضل واعلیٰ ہیں، وہ بنی نوع انسان کے لئے رسول ہیں کہ گزشتہ انبیاء ورسل بھی ان پر ایمان لائے اور قیامت تک پیدا ہونے والے ہر انسان کے لئے ان کو رسول تسلیم کرنا لازم قرار دیا گیا، ان کی اتباع وپیروی ہم پر فرض ہے، ان کا ہر قول اور ہر عمل اللہ کی مرضی کے مطابق اور اسی کے حکم سے ہے یعنی ان کا کہنا اللہ کا کہنا ہے، ان کا کرنا، اللہ

کی رضا کے عین مطابق ہے، اسی لئے ان کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے وہ بظاہر ہم جیسے انسان ہیں لیکن ہم جیسے عیوب سے پاک ہیں کہ بے عیب اللہ نے اپنے رسول کو بے عیب پیدا فرمایا، وہ سوائے اپنے رب کے کسی کے محتاج نہیں حتیٰ کہ وہ ان لوازمات کے بھی محتاج نہیں، جن کا عام انسان محتاج ہوتا ہے، سارے امتی اُن کے محتاج ہیں کہ جب تک اُن کی اطاعت نہ ہو، رب کی اطاعت ممکن نہیں جب تک وہ راضی نہ ہوں، رب کی رضا نصیب نہیں ہوسکتی جب تک وہ سفارش نہ کریں ہماری بخشش نہیں ہوسکتی، وہ معصوم ہیں یعنی اُن سے معصیت اور گناہ ممکن ہی نہیں، اسی لئے اللہ نے ان کی ہر بات اور ہر فیصلے کو تسلیم کرنے کا حکم دیا، وہ اُمّی ہیں یعنی حصولِ علم کے لئے الفاظ کی پہچان، کتابوں اور استاد کی احتیاج سے آزاد ہیں، اللہ نے انہیں بلا واسطہ علم عطا فرمایا اور استاد یا کہ ان کے علم کی کوئی حد، کوئی انتہا نہیں، ان سے کائنات کی کوئی چیز پوشیدہ نہ رہی، اللہ نے اپنے نبیوں کو ثبوت نبوت کے طور پر معجزات عطا فرمائے۔ تمام نبیوں کے معجزات برحق ہیں، ہر نبی کو اس کی ضرورت کے مطابق معجزات دیئے گئے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تمام معجزات بھی ملے جو پچھلے نبیوں کو عطا ہوئے تھے، ان کے علاوہ آپ کے معجزات کی گنتی اور شمار ناممکن ہے، آپ ﷺ خود پیکر معجزہ ہیں کہ آپ ﷺ کی ہر ادا اللہ کی قدرت کا شاہکار ونمونہ ہے، آپ ﷺ کا ایک خصوصی معجزہ معراج ہے جو آپ ﷺ کی خصوصیت ہے اور پوری انسانیت کی عظمت کا مظاہرہ ہے۔ نبی کی نسبت سے ہر چیز قابل احترام ہو جاتی ہے۔ جیسے مقام ابراہیم کہ قیامت تک مؤمنین کے لئے مصلی بنا دیا گیا، ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جن چیزوں کی نسبت ہوئی وہ سب ہمارے لئے قابلِ احترام ہیں، نبی کی اطاعت و پیروی سے انسان بلند مرتبہ ہو جاتا ہے لہٰذا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ صحابہ بلند مرتبہ اور قابلِ احترام ہیں، ان کا ہر عمل ہمارے لئے قابلِ تقلید ہے ان کے بعد تمام شہداء، اولیاء، علماء وصالحین کا احترام ہم پر لازم ہے، نبی بمقتضائے حکمت الٰہیہ، وقت مقررہ پر دنیا سے چلا جاتا ہے۔ قانون قدرت کے مطابق اسے موت آتی ہے لیکن اس کی تکمیل کے بعد اللہ اپنی قدرت سے اسے ہمیشہ کے لئے زندگی عطا فرما دیتا ہے، اس کا جسمِ مبارک زمین میں محفوظ ہوتا ہے، نہ گلتا ہے، نہ سڑتا ہے، زمین پر حرام ہے کہ وہ نبی کے جسم کو کھائے، جس طرح اللہ نے نارِ نمرود پر حرام کر دیا تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلائے یا ان کے جسم کو کوئی تکلیف پہنچائے۔ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں، اپنی قبر انور سے ہمارے حال کو ملاحظہ فرماتے ہیں، ہماری فریاد اور صلوٰۃ وسلام کو سنتے ہیں، ہمارے سلام کا جواب دیتے ہیں اور ان کے مقربین ان کے سلام کا جواب سنتے ہیں، وہ اپنے محبوبین سے مصافحہ بھی کرتے ہیں، جس خوش نصیب کو حالت خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، اس نے آپ ﷺ کی ہی زیارت کی کہ شیطان آپ ﷺ کی شکل نہیں بنا سکتا، مرنے کے بعد ہر شخص سے رب اور دین کے متعلق سوال کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا، اہلِ ایمان انہیں اپنے سامنے دیکھیں گے اور پہچانیں گے، ان کے نور سے مؤمن کی قبر روشن ومنور ہو جائے گی اور وہ قیامت تک کے لئے دلہن جیسی نیند سوئے گا، حشر کے دن سوائے نبی کے کوئی کام نہ آئے گا، پیاسوں کو وہ اپنے حوضِ کوثر سے سیراب کریں گے، گناہ گاروں کی بخشش کرائیں گے، میزان پر ہمارے گناہوں کا بوجھ کم اور نیکیوں کا وزن زیادہ انہی کی نظر کرم سے ہوگا، پُل صراط پر وہ ہماری حفاظت فرمائیں گے یہاں تک کہ ہم اس سے بعافیت گزر کر جنت میں داخل ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

قرآن پر ایمان

قرآن پر ایمان کا مطلب اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، جس میں کسی بھی اعتبار سے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اللہ نے اسے آہستہ آہستہ تیئس برس میں اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، یہ اللہ کی آخری کتاب ہے، جس پر عمل بنی نوع انسان کے لئے فلاح و کامیابی کا ضامن ہے، یہ جیسا نازل ہوا ویسا ہی آج تک ہے اور قیامت تک رہے گا، اس کے کسی حرف یا حرکت میں نہ تبدیلی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے کہ اس کا نازل فرمانے والا اللہ خود ہی اس کا محافظ ہے، اس میں جو کچھ ہے وہ ہر دور اور ہر مقام کے انسانوں کے لئے قابل عمل ہے، یہ انسان کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے، صرف اسی پر عمل کے ذریعہ انسان طمانیت و سکون کی زندگی حاصل کر سکتا ہے، اس کے احکام کی تشریح و تفسیر اُسی نبی کا حق ہے جس پر یہ نازل ہوا۔ پس نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے احکام پر عمل کا جو طریقہ بتایا اور سکھایا وہی حق ہے اور اللہ کی مرضی کے عین مطابق ہے کہ اس کے احکام پر عمل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رہبری و رہنمائی اور ہدایات کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ قرآن خصوصاً مؤمن کے لئے ضابطہ حیات بھی ہے اور روحانی و جسمانی امراض کی شفاء کا ذریعہ بھی، اس کی تلاوت باعث برکت اور ذریعہ اجر و ثواب ہے، اس پر عمل دنیا و آخرت کی فلاح کا ذریعہ ہے، یہ اللہ کا مقدس کلام ہے، اس کو ناپاکی کی حالت میں یا بغیر وضو کے ہاتھ لگانا حرام ہے۔

کتب سابقہ پر ایمان

اللہ نے جتنے نبی اور رسول مبعوث فرمائے انہیں اپنے احکام و پیغام کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں عطا فرمائے۔ جن کی صحیح تعداد اللہ ہی جانتا ہے۔ مشہور کتابیں چار ہیں تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام کو اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملی۔ قرآن کریم اللہ کی آخری اور سب سے افضل کتاب ہے جو اللہ کے آخری اور افضل نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ پچھلی تمام کتابوں پر ہمارا ایمان ہے وہ حق تھیں، ان کے احکام کی پابندی اُنہی امتیوں پر لازم تھی جن کے لئے وہ دی گئیں، نزول قرآن کے بعد ان کے احکام منسوخ ہو گئے، وہ قابل احترام ہیں لیکن اب قابل عمل نہیں نیز قرآن کریم کی حفاظت کا اللہ نے وعدہ فرمایا اور اس کا اہتمام کیا لہٰذا وہ آج تک اپنی اصل حالت میں ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گا لیکن دیگر کتابیں جو خاص وقت اور خاص امتوں کے لئے تھیں۔ ان کو اصل حالت میں رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ پس اللہ نے ان کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہ فرمایا لہٰذا ان میں خود ان کے ماننے والوں نے ہی اپنی خواہشات اور اپنی ضروریات کے مطابق ردو بدل کیا، تحریف کی اور اب وہ انسان کے بنائے ہوئے دیگر قوانین کی طرح ایک مذہبی قانون کے سوا کچھ نہیں، ان کی اصل حالت یکسر بدل چکی ہے، کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ ان کتابوں کا مطالعہ، کلامِ الٰہی سمجھ کر کرے، نہ ہی یہ جائز ہے کہ ان کے حکم کو قرآنی حکم سے بہتر یا افضل جانے۔

اللہ کا انکار

اللہ کے ساتھ کسی کو اس کی ذات و صفات میں شریک ٹھہرانا یا اس جیسا سمجھنا، شرک ہے جو حقیقت میں اللہ ہی کا انکار ہے کوئی شخص اگر دعویٰ ایمان کے باوجود اللہ کے خالق، مالک، قادر، رازق ہونے کا انکار کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج

قرار دیا جائے گا۔

فرشتوں کا انکار

فرشتے اللہ کی نورانی مخلوق ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے نظامِ کائنات کی مختلف ذمہ داری سونپی گئی ہے یہ معصوم ہوتے ہیں ان میں نہ گناہ کی قوت ہے اور نہ ہی انہیں اپنے کاموں پر کوئی اختیار یعنی ان کی اپنی کوئی مرضی یا خواہش نہیں ہوتی، یہ صرف اللہ کے حکم کے پابند رہتے ہیں جو کام جس کے سپرد کر دیا گیا بس وہ وہی کرتا رہتا ہے ان کی تعداد اللہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مشہور فرشتے چار ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام، حضرت عزرائیل علیہ السلام، اللہ کے نبیوں کے علاوہ اللہ کے نیک بندوں کے پاس بھی فرشتے آتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھتے اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔ فرشتوں کا یقین رکھنا ایمان کا جزو ہے، اس کا انکار کفر ہے۔

کتابوں کا انکار

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ پچھلی کتابوں پر اجمالی ایمان لانا فرض ہے جبکہ قرآن کریم کے ایک حرف پر یقین کرنا ایمان کا جزو ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جو کچھ بیان کیا گیا اس میں سے کسی بھی ایک چیز کا انکار کفر ہے۔ مثلاً معجزات انبیاء، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا، ان کا آسمان پر اٹھایا جانا اور وقت مقررہ تک کے لئے زندہ ہونا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ معراج، آپ ﷺ کا خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین، بشیر ونذیر، شاہد اور رؤف ورحیم ہونا، جنت ودوزخ کا وجود، حوض کوثر، میزان اور پل صراط کا ہونا، جو شخص ان چیزوں اور ان تمام واقعات واحکام میں سے جو قرآن کریم میں موجود ہیں، کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے یا ان کے منکر کو مؤمن مانتا ہے۔ وہ چاہے کتنا ہی متقی ہو، کتنا ہی بڑا عالم ہو، کتنا ہی مشہور ومعروف لیڈر، سماجی یا سیاسی کارکن ہو، مرتد ہے، شریعت مطہرہ کے قانون کے مطابق واجب القتل ہے۔ یہ حکم امت میں اختلاف کا سبب نہیں بلکہ امت کو احکام قرآن تسلیم کرنے پر متحد ومتفق رکھنے کے لئے ضروری ہے، فرقہ بندی کے انسداد کا ذریعہ ہے۔

رسولوں کا انکار

اللہ کے کسی رسول کو اس کے مرتبہ ومقام سے کم جاننا یا اس سے بلند کر دینا، کفر ہے، حقیقت میں انکار ہے۔ مثلاً رسول کو بالکل اپنا جیسا خیال کرنا، یا کسی نبی ورسول کو اللہ کا بیٹا اور اس کا ہمسر قرار دینا، عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دیئے جانے کا یقین کرنا، کسی نبی یا رسول بالخصوص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں گستاخی کرنا، کفر ہے اور ایسا شخص مرتد اور واجب القتل ہے۔

آخرت کا انکار

آخرت یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے دربار میں اعمال کے حساب وکتاب اور جزاء وسزا کے لئے حاضر ہونے کا یقین کرنا، اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ جس کو بے شمار دلائل کے ساتھ قرآن کریم نے ثابت کیا ہے جو انسان کو

برائیوں سے روکتا اور نیکیوں پر آمادہ رکھتا ہے۔ اس کا انکار حقیقت میں قرآن کے جملہ احکام کا انکار ہے۔ جو شخص اس اہم عقیدے کو خلاف عقل قرار دیتا اور اس کا انکار کرتا ہے، وہ کفر کرتا ہے، مرتد ہے، واجب القتل ہے۔

اے ایمان والو! تم نے کلمہ پڑھ لیا، تم مؤمن ہو گئے ہم تمہارا ایمان قبول بھی فرماتے ہیں لیکن تمہیں ہدایت کرتے ہیں کہ صرف کلمہ پڑھنے پر اکتفا نہ کر لینا بلکہ ان تمام چیزوں کی تفصیل جانو کہ جن پر کلمہ کے ذریعہ تم نے ایمان لانے کا اجمالی اعلان کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ عقائد تمہیں نہایت تفصیل سے معلوم ہونا چاہئیں جو ایمان کی بنیاد ہیں اور جن کا انکار جانتے ہوئے، قصداً یا نہ جانتے ہوئے سہواً کفر ہے۔ اگر تم سے یہ کفر سرزد ہو گیا اور تم نے اس سے توبہ بھی نہ کی تو تم گمراہی میں اتنی دور چلے جاؤ گے کہ تمہارا کلمہ پڑھتے رہنا، مسلمانوں جیسی زندگی بسر کرنا، دیگر احکام شرع کی پابندی کرنا، سب بے سود ہو جائے گا اور تمہارا ٹھکانہ جہنم کی آگ میں ہوگا۔ جن عقائد کی تفصیل جاننا اور ان پر یقین کا رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہیں:

اللہ پر ایمان لانا، رسول مکرم نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا، قرآن کریم پر ایمان لانا، انبیاء سابقین علیہم السلام پر ایمان لانا، تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا، فرشتوں پر ایمان لانا، آخرت کے دن پر ایمان لانا۔

اور دیکھو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو ایمان کو ایک مذاق بنا لیتے ہیں کہ اپنی ذاتی غرض پوری کرنے کے لئے ایمان لے آتے ہیں پھر کافروں سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے کفر کرنے لگتے ہیں پھر بوقت ضرورت مؤمن ہو جاتے ہیں اور پھر کفر کرنے لگتے ہیں ہم چونکہ اپنے بندوں کے لئے بڑے رحیم و کریم اور غفار الذنوب ہیں لہٰذا ہر مرتبہ کفر سے ان کی توبہ اور ان کے ایمان کو قبول فرما لیتے ہیں لیکن اس مذاق کا اکثر انجام یہی ہوتا ہے کہ کفر دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے ہمارے رحم و کرم سے محروم ہو جاتے ہیں پھر نہ ان کی بخشش ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں ہماری رضا کی راہ نصیب ہوتی ہے اور۔

اے ایمان والو! تم منافقوں جیسے عمل سے بھی بچتے رہنا کہ منافقین بڑے ہی دردناک عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں تم جانتے ہو منافق کون لوگ ہیں، وہ لوگ منافق ہیں جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں، ان جیسی بود و باش اختیار کر لیتے ہیں، وہ اسلامی تہذیب سے نفرت کرتے اور کفار کی تہذیب کو پسند کرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ انہیں کفار کی چمکتی دنیا بڑی پسند آتی ہے ان کا ظاہری عیش و عشرت بڑا بھاتا ہے، وہ خیال کرتے ہیں کہ کافروں کی دوستی سے انہیں بڑی عزت حاصل ہوگی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عزت دینے والا، اللہ کے سوا کوئی نہیں، عزت اُنہی کا مقدر ہے جو اللہ کو راضی کرتے ہیں، عزت دولت کے چند ٹکوں سے حاصل نہیں ہوتی چند روزہ عیش و عشرت والے باعزت نہیں، ظاہری چمک دمک والوں کے پاس عزت نہیں، عزت تو ایمان کی قوت سے حاصل ہوتی ہے، اُس رعب و دبدبہ والے باعزت ہوتے ہیں جن کے نام سے دشمن کانپنے لگے، باعزت تو وہ ہیں جنہیں طمانیت و سکون کے شب و روز میسر ہیں جو خالی پیٹ بھی آرام کی نیند سوتے ہیں، جنہیں اپنی گدڑیوں اور جھونپڑیوں میں بھی راحت نصیب ہوتی ہے، یہ عزت کافروں کے پاس کہاں، یہ تو اللہ کو راضی رکھنے والوں اور اس کے رسول کے دامن سے وابستہ رہنے والوں کا مقدر ہے۔

اے ایمان والو:۔ تم اللہ کی آیات پر ایمان لا چکے ہو، تم ان کے امین اور محافظ ہو لہٰذا تمہاری ذمہ داری ہے کہ جو لوگ ان

آیات کا انکار کریں، یا مذاق اڑائیں، ان پر تنقید کریں، ان میں سے کسی کو خلاف عقل قرار دیں، تم ان سے لاتعلق ہو جاؤ، ان کے ساتھ بیٹھنا، اٹھنا، کھانا، پینا تک تمہارے لئے جائز نہیں تا کہ تم ان کی بری صحبت کے اثرات سے محفوظ رہو، ہاں اگر وہ اپنی بدگوئی سے تائب ہو جائیں تو اللہ تو بہ قبول فرماتا ہے۔ تمہیں بھی اجازت دیتا ہے کہ اب ان سے نفرت نہ کرو، یہ منافق، یہ کافر جو آج اپنی حرکتوں پر نازاں اور مست ہیں انہیں اپنے انجام کا اسی دن پتہ چلے گا جب ہم ان سب کو جہنم کی آگ میں ڈالیں گے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جب یہ تمہاری فتح و کامرانی کو دیکھتے ہیں تو تم سے آ ملتے ہیں اور اگر انہیں کفار سے کسی فائدے کی امید ہوتی ہے تو ان سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور انہیں یہ کہہ کر مطمئن کرتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں سے صرف اس لئے ملے ہوئے ہیں کہ ہم ان میں سازشیں کر کے انہیں تمہارے مقابلہ پر کمزور کر دیں۔ یہ سب ان کی خیالی باتیں ہیں۔ قیامت کے ہی دن ان باتوں کا فیصلہ ہوگا۔ رہا دنیا کا معاملہ تو کفار بھول جائیں کہ وہ کبھی ہمارے نیک بندوں پر غالب آ سکتے ہیں کبھی وہ ایسی راہ نہیں پا سکتے جس پر چل کر وہ مؤمنین کاملین پر غالب ہو سکیں، منافقین اس قدر احمق ہیں کہ اللہ علیم و خبیر کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وقت آئے گا کہ انہیں اس حرکت کی سزا ملے گی ان کی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں سے فوائد حاصل کرنے کے لئے نہایت مجبوری اور ایک بوجھ سمجھ کر یہ نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن صرف دکھاوے کے لئے بس تھوڑی دیر کے لئے مسجد میں آئے اور بھاگے، یہ اللہ کا ذکر بالکل نہیں کرتے، یہ ظالم نہ ادھر کے ہیں نہ اُدھر کے، مسلمانوں میں ان کی عزت نہیں، کافر ان پر اعتماد نہیں کرتے، یہاں بھی ذلیل ہیں وہاں بھی ذلیل، یہ اپنی حرکتوں سے گمراہ ہو چکے ہیں اور سنت الٰہیہ یہ ہے کہ جنہیں اللہ اُن کی حرکتوں کے سبب گمراہ کر دیتا ہے تو پھر وہ ضلالت کی تاریکی میں ٹھوکریں ہی کھاتے رہتے ہیں انہیں کبھی ہدایت کی راہ نصیب نہیں ہوتی۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

خاتمہ بالخیر کیلئے

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا قَبْلَ الْمَوْتِ

وَارْحَمْنَا عِنْدَ الْمَوْتِ

وَلَا تُعَذِّبْنَا بَعْدَ الْمَوْتِ

وَلَا تُحَاسِبْنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ

اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ط

اے اللہ موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما۔ اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما۔ اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا۔ اور قیامت کے روز ہمارا حساب نہ لینا۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔



مقالہ ۲۸

النساء: ۱۴۴ تا ۱۴۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ
اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۴۴ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝۱۴۵ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ
لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۴۶ مَا يَفْعَلُ
اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝۱۴۷ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ
بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝۱۴۸ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ
تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝۱۴۹ (النساء: ۱۴۴: ۱۴۹)

اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ بنا دو اللہ کے لئے اپنے خلاف کھلی دلیل۔ بیشک منافق سب سے نچلے درجے میں ہوں گے دوزخ کے (طبقوں) میں سے اور ہرگز نہ پائے گا تو ان کا کوئی مددگار مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور

مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ کا (دامن رحمت) اور خالص کر لیا اپنا دین اللہ کے لئے، تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور عطا فرمائے گا اللہ مؤمنوں کو بڑا اجر۔ کیا کرے گا اللہ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر کرنے لگو اور ایمان لے آؤ اور اللہ بڑا ہی قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا ہے نہیں پسند فرماتا اللہ کہ بر ملا کہی جائے بری بات مگر (اس سے) جس پر ظلم ہوا اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اگر تم ظاہر کرو کوئی نیکی یا پوشیدہ رکھو اسے یا در گزر کرو (کسی کی) برائی سے تو بیشک اللہ درگزر فرمانے والا، قدرت والا ہے۔

کافروں کو دوست نہ بناؤ

ہدایت کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر، کافروں کو تم اپنا دوست نہ بناؤ'' اولیاء''یعنی انہیں ایسا مخلص دوست نہ سمجھو کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی معاملات میں ان پر اتنا اعتماد کر لو کہ انہیں وہ راز تک بتا دو جو صرف مخلص دوستوں کو بتائے جاتے ہیں تا کہ بوقت ضرورت ان کی ہمدردی حاصل ہو سکے اور ان سے تعاون مل سکے کیونکہ اسلام اور کفر ضد ہیں یہ ممکن ہی نہیں کہ کفر، اسلام کی ترقی یا تحفظ برداشت کرے۔ پس کافروں سے بھی توقع بے سود ہے کہ وہ کسی بھی مسلم کے خیر خواہ بنیں جبکہ دوستی کا مفاد تو خیر خواہی کے سوا کچھ نہیں۔ نیز ایمان قبول کر لینے کے بعد، مؤمن کی تہذیب اس کا تمدن، کفار سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے، کفار اپنے وضع کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ قوانین ان کی خواہشاتِ نفس کے مطابق ہوتے ہیں جبکہ مؤمن نفس کا غلام نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کا غلام ہوتا ہے اس کا ضابطہ حیات، اپنا وضع کردہ نہیں بلکہ اللہ اور رسول کا عطا کردہ ہوتا ہے۔ کافر اپنی ضروریات کے مطابق اپنے قوانین کو تبدیل کر لیتا ہے جبکہ مؤمن اسلامی ضابطہ کے سانچہ میں اپنی زندگی ڈھال لیتا ہے۔ یہی فرق مؤمن و کافر کے درمیان ایک موٹی اور مضبوط دیوار ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے بہت دور رکھتی ہے۔ اب اگر مؤمن اس دیوار کو پھاند کر کافر کو گلے لگا بھی لے، تب بھی کافر کے دل میں اس کے لئے خلوص اور سچی محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ اس کو چور وڈا کو سمجھتا ہے کہ دیوار پھلانگ کر آیا ہے یا مفاد پرست، غرض مند، ضرورت مند سمجھتا ہے اور وہ نہایت مکر و فریب سے اسے ذلیل و خوار کر ڈالتا ہے اس کی مادی امداد کر کے اسے اپنا غلام بنا لیتا ہے، اس میں اپنی عیش پرستی اور عیاشی کے جراثیم چھوڑتا ہے جس سے متاثر ہو کر وہ کافروں کی تہذیب کو اپنانے لگتا، ان کے عادات و اطوار کو پسند کرنے لگتا ہے اور اب اسے مسلمان کی ہر چیز جو حقیقتاً اس کی اپنی تھی، بری لگنے لگتی ہے، وہ اپنوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور دشمنوں پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔

اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو آج ایسے مسلمانوں کی کمی نظر نہیں آتی جو یا تو مغرب ممالک میں آباد ہوئے اور یا اُن ممالک سے تعلیم حاصل کر کے اپنے ملک میں پہنچے۔ انہیں عیسائیوں، یہودیوں اور غیر مسلموں کا انداز زندگی ایسا بھایا کہ وہ حلال و حرام کا امتیاز تک نہیں کرتے، ان کا لباس ان کا نہ رہا، ان کے رہنے سہنے کا طریقہ مسلمانوں جیسا نہ رہا، ناچ گانا، جواء، شراب تمام ہی غیر شرعی اطوار و عادات ان کی زندگی کا حصہ بن گئے۔ اگر کوئی مذہبی عمل ان کے گھروں میں نظر آتا بھی ہے تو وہ حکم الٰہی کے طور پر نہیں بلکہ باپ دادا کی رسم و رواج کے طور پر ہے مثلاً روزے نہیں رکھتے، تراویح نہیں پڑھتے لیکن عید

بڑے جوش وخروش کے ساتھ مناتے ہیں کہ یہ تو ایک تہوار ہے جو ہمیشہ سے ان کے خاندان میں منایا جاتا ہے، وہ عید بغیر نمازِ عید کے مناتے ہیں۔ ان کا یہ انجام صرف اس لئے ہوا کہ ان کی بود و باش غیر مسلموں کے ساتھ رہی، وہ اسلام کے نور سے کفار کا دل تو منور نہ کر سکے، کفر کی تاریکی میں خود ڈوب گئے، کفر کے زہر نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔

اس بھیانک انجام سے پہلے ہی اللہ اہلِ ایمان کو ہدایت کرتا ہے کہ کافروں کو جو سانپ کی طرح تمہارے دشمن ہیں، دوست نہ بناؤ۔ اگر تم نے اس ہدایت پر عمل نہ کیا تو تم خود اس تباہی و بربادی کے داعی اور ذمہ دار ہو گے جو اللہ کی طرف سے تم پر مسلط ہوگی۔ جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً تمہیں کسی وبائی مرض میں مبتلا کر دیا جائے، تم طوفان، سیلاب، زلزلے کا شکار ہو جاؤ، تمہارے درمیان ایسا انتشار پیدا ہو جائے کہ کسی کی جان، مال، عزت و آبرو محفوظ نہ رہے، طمانیت و سکون اور امن کی زندگی سے محروم ہو جاؤ کہ رات کی نیند تک میسر نہ رہے، آج کے مسلم ممالک کا حال اسی انجام کا واضح ثبوت ہے۔ اب تو تباہ حال مسلمان یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اے اللہ ہم مؤمن ہیں، تیرے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلام ہیں، ہم پر رحم فرما کیونکہ آج کے تڑپنے والے نے خود ہی تو اس عذاب کو دعوت دی ہے۔

تمہاری اس دوستی نے تمہیں منافقین سے جا ملایا۔ جب منافقین و کفار کا ٹھکانہ تو پہلے ہی ''ہاویہ'' جہنم کا نچلا طبقہ مقرر ہو چکا ہے اور وہ بے یار و مددگار کر دیئے گئے ہیں۔ اگر بظاہر دنیا میں وہ جھوٹی عزت و طاقت کے مالک ہیں تو یہ عارضی اور وقتی ہے۔ چند ہی روز بعد وہ دن آنے والا ہے، جب وہ بے سہارا ہوں گے، نہ عزت ہوگی، نہ طاقت، نہ ہی کوئی انہیں ان کے انجام بد سے نجات دلانے والا ہوگا کہ اللہ کے احکام کی مخالفت کا انجام نہایت ہی بھیانک ہوتا ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝ (توبہ: ۶۳)

کیا وہ نہیں جانتے کہ جو کوئی مخالفت کرتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ رہے گا۔ اس میں یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔

اے ایمان والو! اس بڑی رسوائی سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ ماضی کی بدعملی و بدکرداری سے توبہ کر لو، حال کے حالات کی اصلاح کر لو، مستقبل کے لئے احکام شرع کی پابندی کا عزم مصمم کر لو، خلوص کے ساتھ، صرف اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لئے تو تمہاری کایا پلٹ جائے گی، تنزل سے پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگو گے، حالات سدھرنے لگیں گے، عزت بحال ہونے لگے گی، ان لوگوں کی طرح کامیاب و کامران ہو جاؤ گے جو صف اول کے مؤمن کامل تھے، جن کو قدم قدم پر اللہ کی حمایت و نصرت نصیب تھی اور جن کے نعرۂ تکبیر سے کفر کے قلعوں میں زلزلہ آ جایا کرتا تھا۔ انہی سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ انہی کے طفیل اللہ قیامت تک آنے والے مؤمنین کاملین کے لئے اجر عظیم کا وعدہ فرماتا ہے۔

یہ عذاب تو تمہاری بدعملیوں کا نتیجہ ہے اور کفار و مشرکین اور منافقین پر عذاب کا سبب ان کا کفر، شرک اور نفاق میں مبتلا ہونا ہے جبکہ مؤمنین پر عذابِ الٰہی اُسی وقت آتا ہے جب اللہ و رسول کی حکم عدولی میں حد سے تجاوز کر جاتے اور کفار کی طرح جری ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو اور انسان اللہ کی نعمتوں پر شکر گزار ہوتا رہے اور ایمان قبول کر لے تو پھر اللہ کیوں کسی کو

عذاب میں مبتلا کرے گا کہ اللہ تو شکر گزاروں کی بے حد قدر فرماتا اور مزید انعامات سے نوازتا ہے وہ ہر کسی کے ایمان کی کیفیت اور دل کی حالت کو خوب جانتا ہے۔

دوستو! یہ صرف اسلام کا وسیع دامنِ رحمت ہے جس میں ہر انسان کے لئے جائے پناہ موجود ہے۔ کافر کلمہ پڑھ کر اس میں پناہ حاصل کر لیتا ہے جبکہ مؤمن ذلالت و گمراہی سے رجوع اور توبہ کر کے۔ وہ رب کریم و رحیم اپنے بندوں کو ''لاتقنطوا'' کی ہدایت فرماتا ہے اور ''اِنَّهٗ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا'' کا مژدہ دیتا ہے کہ بیشک وہ رب العالمین ہے اور اس کا محبوب رحمۃ للعالمین ہے جبکہ اسلام دین رحمت ہے۔ جس کی رحمت کا دروازہ ہر کسی کے لئے کھلا ہے۔ پس وہ انسان یقیناً بدنصیب ہے جو در در کی ٹھوکریں کھائے اور اس درِ رحمت کی طرف رُخ تک نہ کرے۔ بالخصوص وہ مؤمن تو بڑا ہی بدنصیب ہے جو اس در سے نکل کر خود ہی اپنے آپ کو رحمت سے محروم کر لے۔

اخلاص

آیت زیرِ گفتگو میں جہنم کی آگ سے ان لوگوں کی آزادی کا اعلان کیا گیا جو ماضی کی بدعقیدگی و بدعملی سے توبہ کر لیتے ہیں، اپنے اعمال کی اصلاح کر کے پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کے دامن رحمت میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں ''اخلصوا'' کے ذیل میں چند وضاحتی سطور پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اخلاص یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کی ملاوٹ سے بچا لینا مثلاً خالص دودھ، وہ جس میں پانی کی ملاوٹ نہ ہو اسی معنیٰ میں قرآن کریم میں ''خالص'' کا لفظ موجود ہے، فرمایا گیا:

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ (النحل:٦٦)

اور بیشک تمہارے لئے مویشیوں میں، ایک عبرت ہے ہم تمہیں پلاتے ہیں جو ان کے شکموں میں ہے، گوبر اور خون کے درمیان، ان کے درمیان سے نکال کر خالص دودھ جو بہت خوش ذائقہ ہے پینے والوں کے لئے۔

دودھ، گوبر اور خون کے درمیان ہوتا ہے۔ جگر خون کو رگوں کی طرف اور دودھ کو تھنوں کی طرف جاری کرتا ہے اور جب دودھ تھنوں سے باہر آتا ہے تو رب کریم کی قدرت سے اتنا صاف و شفاف ہوتا ہے کہ نہ تو اس کے رنگ میں خون کی آمیزش ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی بو میں گوبر کی بو کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جسم کے لئے نہایت ہی صحت بخش ہوتا ہے۔ جبکہ خون اور گوبر دونوں صحت کے لئے مضر ہوتے ہیں۔ گویا قدرت نے دودھ کو خون اور گوبر سے خالص کر کے ہمارے لئے بہترین غذا بنا دیا۔

انسان کے عمل کا اخلاص یہ ہے کہ اس میں نہ تو ریاء و نمود کی ملاوٹ ہو، نہ ہوا و حرص کا اثر ہو۔ مؤمن کا ہر کام اللہ، خالص اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لئے ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ

الْخَالِصُ (زمر: ۲۔۳)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہم نے اتاری ہے، آپ ﷺ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ پس آپ ﷺ عبادت کریں اللہ کی خالص کرتے ہوئے اسی کے لئے اطاعت کو، خبردار صرف اللہ ہی کے لئے۔ خالص اطاعت۔

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۙ (زمر: ۱۱)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) فرمائیے، مجھے حکم دیا گیا کہ میں اللہ کی عبادت کروں خالص کرتے ہوئے اسی کے لئے اطاعت کو۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ۙ (زمر: ۱۴)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) فرمائیے، میں اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اپنے دین کو۔

یہ اخلاص کی اہمیت ہے کہ اللہ اپنے پیارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتا ہے جبکہ اللہ ہی کے فضل سے یہ ناممکن ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی عبادت واطاعت میں خلوص نہ ہو۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ محبوب کے غلام اخلاص کی اہمیت کو جانیں اور اپنی عبادات واعمال میں خلوص پیدا کریں۔ اہلِ ایمان کو اخلاص کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

وَّ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ۲۹ (اعراف: ۲۹)

اور سیدھا کرو اپنے چہرے کو (قبلہ کی طرف) ہر نماز کے وقت اور عبادت کرو اس کی کہ خالص کرنے والے ہو تم اسی کے لئے عبادت کو۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المؤمن، ۱۴)

تو تم اللہ ہی کی عبادت کرو خالص کرتے ہوئے اسی کے لئے دین کو اگر چہ ناپسند کریں کفار۔

هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (المؤمن: ۶۵)

وہی ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے، پس اسی کی عبادت کرو، خالص کرتے ہوئے اسی کیلئے دین کو سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

مخلصین پر اللہ کی نوازشات

مخلصین پر اللہ کی نوازشات ملاحظہ فرمائیے۔ جھومئے اور اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔ تاکہ آپ بھی ان انعامات کے مستحق قرار پائیں۔ ان آیات سے پہلے مجرموں پر اللہ کے عذاب کا ذکر کیا گیا اور مخلصین کو اس سے

مستثنیٰ قرار دے کر ان پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا جاتا ہے:

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ رِزۡقٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمۡ مُّكۡرَمُوۡنَ ۝ فِىۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ۝ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيۡنَ ۝ يُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِكَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِيۡنٍ ۝ بَيۡضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۝ لَا فِيۡهَا غَوۡلٌ وَّلَا هُمۡ عَنۡهَا يُنۡزَفُوۡنَ ۝ وَعِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِيۡنٌ ۝ كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ مَّكۡنُوۡنٌ ۝ فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ اِنِّىۡ كَانَ لِىۡ قَرِيۡنٌ ۝ يَّقُوۡلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِيۡنَ ۝ ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيۡنُوۡنَ ۝ قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ ۝ قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ كِدۡتَّ لَتُرۡدِيۡنِ ۝ وَلَوۡلَا نِعۡمَةُ رَبِّىۡ لَكُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ۝ اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَ ۝ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝ لِمِثۡلِ هٰذَا فَلۡيَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ ۝ (الصافات: ۴۰ تا ۶۱)

البتہ اللہ کے مخلص بندے (اس عذاب سے محفوظ رہیں گے) وہی ہیں۔ انہیں وہ رزق دیا جائے گا۔ جس کی کیفیت (اللہ کو) معلوم ہے لذیذ پھل اور ان کا بڑا احترام واکرام کیا جائے گا۔ (اور وہ) نعمت کے باغوں میں ہوں گے، پلنگوں پر، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے پھرآئے جائیں گے ان پر چھلکتے جام، چشموں سے بھر کر، سفید بڑے لذیذ، پینے والوں کے لئے، نہ اس میں مضرصحت کوئی چیز ہے اور نہ وہ اس (کے پینے) سے مدہوش ہوں گے اور ان کے پاس ہوں گی نیچی نگاہوں والی، آہو چشم (عورتیں) گویا وہ (شترمرغ کے) انڈوں کی طرح، گرد وغبار سے محفوظ پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، سوال و جواب کریں گے، کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست (دنیا میں) میں تھا وہ کہا کرتا تھا کہ کیا تو (قیامت پر) ایمان لانے والوں میں سے ہے۔ (وہ کہا کرتا تھا) کیا جب ہم مریں گے اور مٹی اور (بوسیدہ) ہڈیاں ہو جائیں گے۔ کیا اس وقت ہمیں جزاء دی جائے گی ارشاد ہوگا، کیا تم (اس کا حال) دیکھنا چاہتے ہو۔ پس جب اس نے جھانکا تو دیکھا اپنے دوست کو جہنم کے وسط میں جنتی بول اٹھے گا بخدا تو تو مجھے ہلاک کرنا ہی چاہتا تھا اور اگر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی (آج) پکڑ کر لانے جانے والوں میں ہوتا (مخلصین کہیں گے) کیا اب تو ہمیں مرنا نہ ہوگا بجز اپنی پہلی موت کے اور نہ (اب) ہمیں عذاب دیا جائے گا۔ بیشک یہی وہ عظیم کامیابی ہے، ایسی ہی عظیم کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے۔

ارشاد باری تعالیٰ بالکل واضح ہے۔ ان آیات کو دوبارہ پڑھئے، ان پر غور کیجئے اور سرور حاصل کیجئے۔ آخری دو آیات نہایت ہی ایمان افروز ہیں کہ پہلی آیت میں جنت اور اس کی نعمتوں کے حصول کو بڑی کامیابی قرار دیا گیا جو نتیجہ ہے ''اخلاص'' کا اور دوسری آیت میں دعوت دی گئی کہ ایسا ہی کام کرنا چاہئے جس سے یہ کامیابی نصیب ہو یعنی ''اخلاص'' اختیار

کروتا کہ تم بھی کامیاب وکامران ہو جاؤ، اللهم اجعلنا من المخلصین۔

جہر

اللہ جہر کو پسند نہیں فرماتا۔ یعنی کسی سے ایسی سخت بات کہنا۔ جس سے اسے تکلیف ہو۔ اللہ کو پسند نہیں ہے کہ اس سے لوگوں کے دل ٹوٹتے ہیں، باہمی نفرت پیدا ہوتی ہے اور اللہ رحیم وکریم نہیں چاہتا کہ اس کے بندوں کے درمیان کسی بھی طرح نفرت وعداوت پیدا ہو۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے باہمی میل ومحبت کے ساتھ، ایک دوسرے کے معاون ومددگار بن کر زندگی بسر کریں۔ پس اہل ایمان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جور ویہ اللہ کو پسند نہیں تم بھی اسے اختیار نہ کرو، ہاں صرف مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ ظالم سے جیسی ترش روئی چاہے اختیار کرے اسے حق ہے کیونکہ ظالم اسے تکلیف پہنچا کر پہلے ہی اس کی حق تلفی کر چکا ہے اور اس کا دل دکھا چکا ہے۔ اے ایمان والو! اچھی طرح یقین رکھو کہ اللہ سب کی باتیں سننے والا اور سب کا حال جاننے والا ہے۔ وہ یہ سن رہا ہے کہ کون کس کا دل دکھاتا ہے وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ کون کس کی حق تلفی کرتا ہے۔ دیکھو کسی کی غیبت کر کے، اس کی عزت وآبرو کو پامال نہ کرو، کسی پر الزام تراشی کر کے، اس کے صاف وشفاف دامن کو داغدار نہ کرو، کسی کے متعلق بدگمانی کر کے، کسی کے عیوب تلاش کر کے اپنے آپ کو بے فائدہ وبے سود سوچ میں مبتلا نہ کرو، اللہ مظلوم کے حال کو بھی دیکھ رہا ہے۔ جسے ظالم کے ظلم کی شکایت کرنے کی اجازت تو دی گئی ہے لیکن اسے حد سے اتنا تجاوز نہ کرنا چاہئے کہ خود ہی ظالم بن جائے جبکہ مظلوم کے لئے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ بھی ظالم کو معاف کر دے کہ عفوودرگزر، اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ بندے کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر اخلاق ربانی پیدا کرے جو معاشرے میں رحم وکرم، محبت والفت اور باہمی تعاون وہمدردی کا ذریعہ ہیں، جسے اللہ پسند فرماتا ہے۔

مظلوم کو، ظالم کے ساتھ ''جہر'' کا رویہ اختیار کرنے کا حق تو دیا گیا ہے لیکن اس میں احتیاط کو لازمی قرار دیا گیا ہے کہ صرف انتقام ہو بدلہ ہو یعنی جتنا ظلم کیا گیا، بدلہ اس سے زیادہ نہ ہو جائے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝

(النحل:۱۲۶)

اگر تم سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر ہی بہتر ہے، صبر کرنے والوں کے لئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اَنَّ اَحْسَنَ النَّاسِ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْنَا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اَنَّ اَحْسَنَ النَّاسِ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَاؤُا فَلَا تَظْلِمُوْا

بے سوچے لوگوں کی پیروی نہ کرو کہ تم یہ کہو جیسے عام کہا جاتا ہے کہ اگر لوگوں نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تو ہم بھی اچھا برتاؤ کریں گے اور اگر لوگوں نے ہم پر ظلم کیا تو ہم بھی ظلم کریں گے تم تو اپنے آپ کو عادی بنالو کہ اگر لوگ تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں تو تم بھی اچھا برتاؤ کرو اور اگر لوگ برائی

کریں تو تم ظلم نہ کرو۔ (ترمذی)

بہرحال مظلوم کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ظالم کے ظلم کا لوگوں سے شکوہ کرے، یا قانونی حدود میں رہتے ہوئے اس سے انتقام لے لیکن یہ تلقین بھی کی گئی کہ مظلوم اگر صبر کرتے ہوئے ظالم کو معاف کردے اور اس کے ظلم سے درگزر کرے تو یہ بہت ہی بہتر ہے کیونکہ اللہ باوجود اس کے کہ بدلہ لینے اور سزا دینے پر قادر ہے لیکن پھر بھی وہ بے شمار مجرموں کو معاف فرما دیتا اور ان کے جرائم سے درگزر فرماتا ہے۔ پس اس کے مظلوم بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

اسلام کا یہ نہایت ہی حکیمانہ اور عادلانہ قانون ہے کہ ایک طرف تو مظلوم کو انتقام لینے کی اجازت دی جارہی ہے تو دوسری طرف اسے عفوودرگزر اور صبر کی تلقین کی جارہی ہے کہ انتقام مظلوم کا حق ہے وہ اسے ملنا ہی چاہئے لیکن اس سے مظلوم وظالم کے درمیان دشمنی وعداوت کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ نفرت کی آگ مزید بھڑکتی ہے جبکہ اگر مظلوم حوصلہ سے کام لے اور ظالم کو معاف کردے تو ظالم ہمیشہ کے لئے اس کا گرویدہ ہوجائے گا۔ فرمایا گیا:

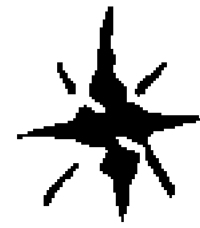
وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حم السجدہ:۳۴)

نیکی اور برائی برابر نہیں ہوتی برائی کا خاتمہ اس (نیکی) سے کرو جو بہتر ہے پس ناگاہ وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے ایسا ہوجائے گا گویا تیرا جانی دوست ہے۔

انتقام سے مظلوم کے جذبات کو تو تسکین ہوجاتی ہے لیکن معاشرے کو اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا جبکہ عفوودرگزر اور صبر باہمی نفرت کا خاتمہ کرتا ہے۔ جس سے پورے معاشرے میں مسرت وشادمانی کی لہر دوڑنے لگتی اور سکون پیدا ہوجاتا ہے۔

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

یَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَیَا سَیِّدَ الْبَشَرْ
مِنْ وَّجْہِکَ الْمُنِیْرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَرْ!
لَا یُمْکِنُ الثَّنَآءُ کَمَا کَانَ حَقَّہٗ،
بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر



ترجمہ:

اے صاحب جمال اور انسانوں کے سردار۔ آپ کے نورانی چہرے سے تو چاند کو روشنی بخشی گئی ہے۔ جیسا کہ آپ کی تعریف کا حق ہے ایسی تعریف ممکن نہیں۔ خدائے ذوالجلال کے بعد آپ ہی سب سے بڑے ہیں۔ یہی مختصر بات ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"سورۃ المائدہ"

مقالہ نمبر	آیات نمبر
29	1
30	2 تا 5
31	6 تا 7
32	8 تا 10
33	11
34	35
35	51
36	54 تا 56
37	57 تا 58
38	87 تا 89
39	90 تا 93
40	94
41	95 تا 100
42	101 تا 102
43	105
44	106 تا 108

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۲۹

المائدہ:۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ○ (المائدہ:۱)

اے ایمان والو! پورا کرو (اپنے) عہدوں کو حلال کئے گئے ہیں تمہارے لئے بے زبان جانور، سوا ان کے جن کا حکم (آگے) پڑھ کر تمہیں سنایا جائے گا نہ حلال سمجھو شکار کو، جب کہ تم احرام باندھے ہو بے شک اللہ، حکم فرماتا ہے جو چاہتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اہلِ ایمان کے لئے تین ہدایات ہیں۔ اپنے عہد پورے کرو، جن مویشیوں کو اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے، بس وہی حلال ہیں۔ حالت احرام میں تمہارے لئے شکار ممنوع ہے۔

ایفائے عہد

وعدہ پورا کرنا، صفات باری تعالیٰ میں سے ایک صفت ہے کہ اللہ رحیم وکریم نے اپنے فضل سے، اپنے وعدوں کو پورا کرنا اپنے اوپر لازم فرمالیا ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝
(آل عمران:۹)

اے ہمارے پروردگار! بے شک تو جمع کرنے والا ہے، سب لوگوں کو اس دن کے لئے نہیں کوئی شبہ جس (کے آنے) میں، بے شک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝
(آل عمران:۱۹۴)

اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ اپنے رسولوں کے ذریعہ اور نہ رسوا کر ہمیں قیامت کے دن بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم:٦)

یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ بے شک اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝ (الزمر:۲۰)

البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے، ان کیلئے بالا خانے ہیں، جن کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں یہ اللہ کا وعدہ ہے، بے شک اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں فرماتا۔

وعدہ خلافی ایک عیب ہے، جس کا باعث، یا مجبوری ہوتی اور یا مکاری کہ ایک شخص کسی سے ایسا وعدہ کر بیٹھتا ہے جس کو پورا کرنا اس کے لئے دشوار یا ناممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ مجبوراً وعدہ خلافی کرتا ہے اور یا کوئی وعدہ کر کے اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے، فائدہ حاصل کر لیتا ہے اور وعدہ پورا نہیں کرتا۔ یہ وعدہ خلافی بھی ہے، دھوکا دہی بھی اور مکاری بھی۔ بہر حال وعدہ خلافی عیب ہے اور اللہ ''سبحان'' ہے، ہر عیب سے پاک ہے، پس وہ وعدہ خلافی سے بھی پاک ہے، اس نے اپنے جن بندوں سے جزاء کا وعدہ کیا ہے وہ اسے ضرور پورا فرماتا ہے، چاہے جزاء دنیا میں ہو یا آخرت میں اور جن بندوں سے سزا کا وعدہ کیا وہ اسے بھی پورا فرماتا ہے، چاہے سزا دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ غرضیکہ اللہ پاک ہے ہر عیب سے وہ پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے بھی عیوب اور برائیوں میں مبتلا نہ ہوں بلکہ اس کی صفات کا آئینہ و مظہر بنیں۔ پس وہ حکم دیتا ہے کہ وعدوں کو پورا کیا جائے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ (اسراء:۳۴)

اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو، بیشک ان وعدوں کے بارے میں (قیامت کے دن تم سے) سوال کیا جائے گا۔

جو اہل ایمان دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہوئے اور جنت کے وارث قرار پائے، ان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾ (المؤمنون:۸)

وہ (مؤمن بھی بامراد ہیں) جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرتے ہیں۔

جن لوگوں کو جنت میں خصوصی اکرام و اعزاز سے نوازا جائے گا، ان کی صفات میں بھی امانت و عہد کی پاسداری کی صفت شامل ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ (معارج:۳۲)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی پاسداری کرتے ہیں۔

آیت زیر گفتگو میں، اہلِ ایمان کو اسی عہد کے پورا کرنے کا حکم ''اوفو بالعقود'' کے الفاظ سے دیا جارہا ہے۔

اقسام عہد:۔ علماء کرام و مفسرین عظام کی تصریح کے مطابق عہد کی دو قسمیں ہیں، ایک معبود اور عبد کے درمیان عہد، دوسرا بندوں کا آپس میں عہد، معبود و عبد کے درمیان ایک عہد تو وہ ہے جو بلا واسطہ عالم ارواح میں ہوا اور دوسرا عہد وہ ہے جو اس عالم میں بندوں نے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وساطت سے توحید و رسالت کا اعتراف کر کے کیا، عالم ارواح کے عہد کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚۛ شَهِدْنَا ۚۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ﴿۱۷۲﴾ (اعراف:۱۷۲)

اور (اے محبوب ﷺ) یاد کرو جب نکالا آپکے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنادیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب سب نے کہا بے شک تو ہی ہمارا رب ہے ہم نے گواہی دی (یہ اس لئے ہوا) کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

یہ عہدِ ربوبیت تھا، عہد توحید تھا، جو تمام اولاد آدم سے لیا گیا، جس کا مقصد واضح ہے کہ جب تم نے مجھے رب تسلیم کر لیا تو میں ہی اس لائق ہوں کہ تم میری عبادت کرو، میرا کسی کو ساجھی و شریک نہ ٹھہراؤ، میرے سوا کسی کو سجدہ نہ کرو، اس کے بعد ایک عہد اور لیا گیا جو انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ (آل عمران:۸۱،۸۲)

اور (اے محبوب ﷺ) یاد کرو جب لیا اللہ نے انبیاء سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو دوں میں تمہیں کتاب اور حکمت سے، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو، ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں، تو تم ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور مدد کرنا اس کی، فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اٹھالیا اس پر تم نے میرا بھاری ذمہ سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا (اللہ نے) فرمایا، تو گواہ رہنا اور میں (بھی)

تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں پھر جو کوئی پھرے اس (پختہ عہد) کے بعد تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان پر کرم فرمایا کہ عہدِ ربوبیت کی یاد دہانی کے لئے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو مبعوث فرمایا جن بندوں نے اس عہد کو یاد کیا وہ مؤمن ہو گئے، اسی کے ساتھ انہوں نے بواسطہ انبیاء، احکامِ الٰہیہ کی اطاعت اور سنتِ انبیاء کی اتباع وپیروی کا عہد کرلیا، یہی وہ عہد ہے جس کی خلاف ورزی کرنے والوں سے قیامت کے دن، مالک یوم الدین فرمائے گا۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۙ﴿۶۰﴾ وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۱﴾ وَ لَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾ (یٰسٓ: ۶۰۔ ۶۴)

کیا میں نے تمہیں یہ تاکیدی حکم نہ دیا تھا، اے اولادِ آدم! کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے (مگر) گمراہ کر دیا شیطان نے تم میں سے بہت لوگوں کو، کیا تم عقل وخرد نہیں رکھتے تھے، یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، آج اس کی آگ تاپو، اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے۔

مؤمن کلمہ پڑھ کر نبی کے دامن سے وابستہ ہو کر، نبی کی غلامی کا طوق پہن لینے کے بعد جو وعدہ کرتا ہے اس کے دو شعبہ ہیں، شعبہ عبادات اور شعبہ معاملات۔

شعبہ عبادات، یعنی ہم سوائے ایک اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں گے اور وہ بھی رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق کہ احکامِ الٰہیہ کی وہی تشریح صحیح اور حقیقی ہے جو رسول، اپنے قول وعمل سے کرتا ہے۔

شعبہ معاملات یعنی ہم زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کے بندوں سے وہی سلوک اختیار کریں، جس کا ہمیں اللہ نے بواسطہ رسول حکم دیا، مثلاً والدین واولاد، اہلِ خانہ وخاندان، اہلِ محلہ، اہلِ شہر کے ساتھ ہم وہی برتاؤ کریں گے جس کا اللہ ورسول نے ہمیں حکم دیا تجارت، سیاست اور حکومت کے جملہ امور ہم کتاب وسنت کے مطابق انجام دیں گے، پس اے ایمان والو!'' اوفوا بالعقود'' تم اپنے وعدوں کو پورا کرو کہ اللہ ایفائے عہد کرنے والوں کو اجرِ عظیم عطا فرماتا ہے:

وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۰﴾ (الفتح: ۱۰)

اور جس نے پورا کیا، اس عہد کو جو اس نے اللہ سے کیا ہوا ہے تو اللہ اسے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

ایفائے عہد کی اہمیت کا اندازہ اُس آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال سے کیجئے جن کی زندگی ہمارے لئے، بہترین نمونہ ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہر خطبہ میں فرمایا کرتے تھے:

لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَتَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ (بیہقی)

جو امانت دار نہیں، وہ کامل مؤمن نہیں اور جو وعدہ پورا نہیں کرتا، وہ پورا دیندار نہیں۔

تقویٰ وپرہیز گاری کے حصول کے لئے کتنی ہی سعی کیوں نہ کی جائے، اس وقت تک کوئی متقی و دیندار نہیں بن سکتا جب

تک کہ وہ ایفائے عہد کا عادی نہ ہو کیونکہ عہد شکنی تقویٰ کی ضد، یعنی نفاق کی علامات میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، ''جس شخص میں چار عیب ہوں، وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک ہو، اس میں نفاق کی علامت ہوگی، جب تک کہ وہ اس کو چھوڑ نہ دے'' وہ چار عیب یہ ہیں:

اِذَا ائْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ

جب اسکے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب جھگڑا کرے تو بیہودہ گوئی کرے (گالیاں بکے)۔

(بخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن ابوالحمساء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اعلانِ نبوت سے قبل کا واقعہ ہے کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک سودا کیا، کچھ رقم میرے ذمہ باقی رہ گئی، میں نے وعدہ کیا کہ میں ابھی لا کر دیتا ہوں، آپ ﷺ یہیں میرا انتظار کریں، میں گیا اور واپس آنا بھول گیا، تین دن بعد مجھے یاد آیا، واپس لوٹا تو میں نے آپ ﷺ کو اسی جگہ پایا، آپ ﷺ نے صرف اتنا فرمایا:

لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَيَّ اَنَا هٰهُنَا مُنْذُ ثَلٰثٍ اَنْتَظِرُكَ

تم نے مجھے دشواری میں مبتلا کر دیا میں یہاں تمہارا تین دن سے انتظار کر رہا ہوں۔ (کیونکہ وعدہ کر لیا تھا)۔

(ابوداؤد)

ایفائے عہد، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشمار خصوصیات میں سے ایک اہم ترین خصوصیت ہے، جسے آپ ﷺ نے نازک سے نازک ترین موقع پر بھی ترک نہ فرمایا، جس کا اندازہ اس دردناک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

واقعہ صلح حدیبیہ، سیرت مبارکہ کی تمام کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، اس موقعہ پر ایک دردناک منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ قریش کے نمائندے، سہیل بن عمرو قریشی سے معاہدے کی شقیں طے پا رہی ہیں، ابھی معاہدہ مکمل نہیں ہوا ہے کہ اچانک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نظر ایک بدحال شخص پر پڑی، جو پابہ زنجیر ہے اور گرتا، پڑتا رحمتہ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں پناہ حاصل کرنے کے لئے چلا آ رہا ہے، آپ ﷺ کے سامنے آ کر گر پڑتا ہے اور درد بھری آواز سے پکارتا ہے، یارسول اللہ! مجھے بچائیے، اپنی پناہ میں لے لیجئے، مظلوموں کے فریادرس، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس پر اپنا دامن رحمت ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ سہیل نے معاہدے کا کاغذ رکھا اور چلایا۔ اگر آپ ﷺ نے اس کو پناہ دی تو معاہدہ نہ ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا، یہ کون ہے؟ سہیل بولا، یہ میرا بیٹا ابوجندل ہے، جو مسلمان ہونے کی سزا بھگت رہا ہے، آپ ﷺ اس کو واپس کریں، ورنہ ہمارے درمیان معاہدہ ختم، آپ ﷺ نے فرمایا ہم ہرگز عہد شکنی نہیں کریں گے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اپنے مسلمان بھائی کی حالت زار دیکھ کر نہ رہا گیا، آپؓ نے تلوار نکالی، سہیل پر حملہ کرنا ہی چاہتے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے روکا اور حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تم واپس جاؤ، صبر کرو، اللہ تمہاری مدد فرمائے گا کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ابوجندل کو کھینچ کر لے جایا جا رہا ہے اور اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں وعدہ کے پابند غلام صحابہ کرام

پرنم آنکھوں سے یہ دردناک منظر دیکھتے اور تڑپتے رہ جاتے ہیں، یہ ہے ایفائے عہد کا نمونہ اور اس کی تعلیم، اہل ایمان کیلئے۔

عہد شکنی

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایفائے عہد کی جتنی تاکید کی اور اس پر اپنی رضامندی کا جس قدر اظہار فرمایا، اتنی ہی عہد شکنی کی مذمت فرمائی اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، قرآن کریم کی درج ذیل آیت ملاحظہ ہو:

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝

ہاں، کیوں نہیں، جس نے پورا کیا اپنا وعدہ اور پرہیز گار بنا تو بیشک اللہ محبت کرتا ہے، پرہیز گاروں سے۔

یہ تو ایفائے عہد پر اظہار رضامندی ہے، وعدہ پورا کرنے والوں کو متقی قرار دیا گیا، اور متقین سے اپنی محبت کا اعلان فرمایا گیا اب دوسرا رخ دیکھئے کہ وعدہ خلافی کرنے والوں کا کیسا برا انجام ہے۔ اسی آیت کے بعد فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝

(آل عمران: ۷۶، ۷۷)

بیشک جو لوگ خریدتے ہیں، اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت یہ وہ (بدنصیب) ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور اللہ ان سے بات نہ کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھے گا قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا انہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

غور فرمایئے، عہد شکنی اگرچہ ایک اخلاقی جرم ہے، جس پر کوئی حد یا تعزیر نہیں لیکن آیت مبارکہ میں جن سزاؤں کا ذکر کیا جارہا ہے، ان سے بڑی سزا کونسی ہوسکتی ہے، جرم تو ایک ہے لیکن اتنا مضر اور گھناؤنا کہ سزائیں پانچ ہیں، آخرت کی نعمتوں سے یکسر محرومی، رب رحیم وکریم ایسے شخص سے بات نہ کرے گا، اللہ کی نظر لطف وکرم سے بھی محروم رہے گا، گناہوں کی گندگی سے بھی اسے پاک نہیں کیا جائے گا، ان چاروں کے علاوہ دردناک عذاب میں بھی اسے مبتلا کیا جائے گا۔

جس شخص کے قلب میں ذرا بھی ایمان ہے، اس کے لئے ان سزاؤں پر غور کرلینا ہی اپنی اصلاح کے لئے کافی ہے، کاش ہم غور کریں۔ کہ آج ہمارے ماحول میں دیگر بداخلاقیوں اور برائیوں کی طرح، عہد شکنی بھی عام ہے اور اس قدر عام کہ اس پر اظہارِ افسوس تک کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی جبکہ کسی قوم کے باعزت وباوقار ہونے کی علامات میں سے ایک علامت اس قوم کے افراد کا، وعدہ کا پکا ہونا اور اسے پورا کرنا ہے کیونکہ عہد شکنی کے باعث قوم میں انتشار وافتراق پیدا ہوتا ہے، باہمی اعتماد ختم ہوجاتا ہے، باہمی ہمدردی وتعاون کا جذبہ ملیا میٹ ہوجاتا ہے اور اس طرح پوری قوم خودغرضی کا شکار ہوجاتی ہے، مکرو فریب کی عادی بن جاتی ہے اور غیروں کی نظروں میں ذلیل وخوار اور کمزور ہوجاتی ہے، پس

اے ایمان والو! ''اوفوا بالعقود'' اپنے معاہدوں، وعدوں کو پورا کرو تا کہ ذلت وخواری اور اس کے اسباب سے محفوظ رہو اور ایک بارعب، باوقار قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندگی بسر کرسکو۔

حلال مویشی

"ربنا ما خلقت ہذا باطلا" بیشک خالق کائنات نے اپنی مخلوق کا ایک ذرہ تک بیکار پیدا نہیں فرمایا اور نہ ہی ساری مخلوق صرف ایک مقصد کیلئے پیدا کی گئی بلکہ کسی کو کسی مقصد کیلئے اور کسی کو کسی مقصد کیلئے اور ہر مخلوق کی پیدائش کا صحیح مقصد وہی ہے جو اُس کے خالق نے متعین فرمایا اور اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعہ، انسان کو اس سے باخبر کیا، اب وہی انسان، حقیقتاً انسان ہے جو اپنے مقصد تخلیق کی تکمیل بھی کرتا ہے اور دوسری مخلوق کو اس کی پیدائش کے متعینہ مقصد کے مطابق استعمال کرتا ہے۔

جانور، اللہ کی مخلوق، جن کی پیدائش کے مختلف مقاصد ہیں، ان میں کچھ جانور وہ ہیں جنہیں خالق نے انسان کی غذا بنایا ہے اور کچھ وہ جن کا کھانا، انسان کے لئے حرام قرار دیا کیونکہ سبزیوں، پھلوں، پھولوں کی طرح، جانوروں کے اثرات بھی مختلف ہیں، کچھ مفید اور کچھ مضر ہیں۔ ان اثرات کو اللہ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے۔ پس جو جانور انسان کے جسم، صحت، عادات واطوار پر برا اثر ڈالتے ہیں، ربّ کریم نے ان کو حرام کر دیا اور جو جانور صحت افزاء، غیر مضر ہیں، ان کو حلال کر دیا گیا چونکہ ہر شے کی اصل حلت اور اباحت ہے، لہٰذا قرآن کریم نے اور صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جانوروں کو تفصیل سے بیان فرمایا جو حرام ہیں، ان کے علاوہ سب حلال قرار پائے اور اہلِ ایمان کو حکم دیا کہ

اے ایمان والو! یہ اللہ اور اس کے رسول کو اختیار ہے کہ وہ تمہیں حرام جانوروں کی تفصیل بتائے، پس تم کفار ومشرکین کی طرح نہ کسی حلال جانور کو اپنے لئے حرام قرار دو اور نہ ہی کسی حرام جانور کو حلال قرار دو، تم مؤمن ہو، ایمان قبول کرنے کے بعد تم نے اللہ اور رسول سے جو معاہدے کئے ہیں، ان میں ایک معاہدہ حلال وحرام سے متعلق بھی ہے، یہ بھی تمہارے "عقود" میں شامل ہے، پس تم اس معاہدے کی پابندی کرو اور حلال جانوروں کو کھاؤ، حرام جانوروں سے بچو۔

شکار کی ممانعت

اللہ کے بے شمار، احسانات میں سے، ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے جنگلی مگر حلال جانوروں کا شکار کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، جس کے باعث ہم روزمرہ کھائے جانے والے گوشت کے علاوہ دیگر جانوروں کے گوشت کی لذت بھی حاصل کرتے ہیں، نیز شکار ہمارے لئے ایک ذریعہ معاش بھی ہے لیکن کسی کام کے کرنے کی اجازت دینے والے کو، اس کام سے روک دینے اور ممانعت کر دینے کا بھی حق حاصل رہتا ہے اور اجازت سے فائدہ حاصل کرنے والوں کے لئے حکمِ ممانعت پر عمل، اسی خوشی کے ساتھ زیب دیتا ہے، جس خوشی کے ساتھ وہ اجازت پر عمل کرتے ہیں، پس اہلِ ایمان، جو اللہ کے مطیع وفرمانبردار بندے ہی ہوتے ہیں، زیادہ اس ذمہ داری کے اہل ہیں کہ انہیں اللہ اپنے احکام دے اور وہ ان کی تعمیل کریں، لہٰذا شکار کی ممانعت کا ایک مخصوص حالت میں حکم خصوصی طور پر اہلِ ایمان ہی کو دیا جا رہا ہے۔

اے ایمان والو! جب تم احرام کی حالت میں ہو، یعنی حج یا عمرے کے لئے اللہ کے دربار میں حاضری کا جب تم پورا ارادہ کر لو تو ان تمام آداب کی پابندی کرو جو احکم الحاکمین کے اعلیٰ دربار میں حاضر ہونے کے لئے لازمی قرار دیئے گئے کہ بعض چیزیں جو تمہارے لئے حلال تھیں انہیں احرام کے چند دنوں یا چند گھنٹوں کے لئے تم پر حرام کر دیا گیا ہے، ان ہی میں سے شکار بھی ہے کہ حالتِ احرام میں تمہارے لئے شکار کرنا، شکار کرنے والے کی مدد کرنا، شکار کو حلال سمجھنا، سب حرام ہے۔

حالت احرام میں شکار کی ممانعت سے متعلق، تفصیلی احکام، سورۂ مائدہ ہی کی آیات میں آ رہے ہیں، انشاء اللہ ہم اس موقع پر اس عنوان کو تفصیل سے بیان کریں گے۔

زیر گفتگو آیت کا اختتامی جملہ نہایت قابل غور ہے کہ اہلِ ایمان کو مذکورہ بالا ہدایات دینے کے بعد فرمایا گیا ''اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ'' اللہ جو چاہتا ہے، حکم فرماتا ہے۔

اے ایمان والو:۔ تم نے اطاعت و فرمانبرداری کا معاہدہ کیا ہے، بس تمہارا کام احکام کی تعمیل کرنا ہے، چون و چرا نہیں، یہ کیوں حلال ہے، یہ کیوں حرام، اللہ نے سود کیوں حرام کر دیا، شراب، جواء، رشوت کیوں حرام کی گئی، مردوں کے لئے سونا، ریشم کیوں حرام کیا گیا، احکامِ الٰہی میں ''کیوں'' اہلِ ایمان کو زیب نہیں دیتا، یہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں شکوک و شبہات کا اظہار ہے، ایمان کی کمزوری کی علامت ہے، اہلِ ایمان کے لئے تو بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ ہدایت ہے کہ ''قرآن کریم پانچ چیزوں پر مشتمل ہے حلال، حرام، محکم، متشابہ، اَمثال، پس تم حلال کو حلال جانو، اس کو اختیار کرو اور حرام کو حرام جانو، اس سے پرہیز کرو، محکم یعنی واضح احکام کی تعمیل کرو، متشابہ غیر واضح احکام پر یقین رکھو، ایمان لاؤ، مثالوں سے عبرت حاصل کرو'' کسی بھی حکم میں چون و چرا کی اجازت نہیں، دین کی جو بات عقل میں آ جائے، اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور جو سمجھ نہ آئے اس کو عقل کی کوتاہی اور کمزوری جانو، ایمان کو بچاؤ، چون و چرا سے ایمان میں کمزوری پیدا نہ ہونے دو۔

عام طور پر لوگوں کو جن باتوں کے متعلق، سوالات اور بحث و مباحثہ کا بہت شوق رہتا ہے، ان سب میں اہم ان کے نزدیک تقدیر کا مسئلہ ہے، ہم چاہتے ہیں کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد پیش کر دیں تا کہ کم از کم ہمارے قارئین تو اس عنوان پر گفتگو اور غیر ضروری سوال سے گریز کریں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''ایک مرتبہ ہم لوگ تقدیر کے عنوان پر گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے، ہماری باتیں سنیں تو آپ ﷺ کا چہرہ بوجہ غصہ سرخ ہو گیا، ایسا سرخ ''کَاَنَّمَا اُفْقِیَ فِیْ وَجْهِهٖ حَبُّ الرُّمَّانِ'' جیسے انار کے دانے آپ ﷺ کے چہرہ اقدس پر نچوڑ دیئے گئے ہوں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا، کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے کیا میں تمہاری طرف اسی کے ساتھ بھیجا گیا ہوں (یعنی اس مسئلے کے سوا، کوئی مسئلہ نہ رہا جس پر تم لوگ گفتگو کرو) تم سے پہلی قومیں اسی وقت ہلاک ہوئیں، جب وہ قضاؤ قدر کے مسئلہ پر بحث و مباحثہ کرنے لگیں، پس میں:

عَزَمْتُ عَلَیْكُمْ اَنْ لَّا تَنَازَعُوْا فِیْهِ

تمہیں قسم دیتا ہوں اور دوبارہ قسم دیتا ہوں کہ اس مسئلہ میں کبھی بحث و مباحثہ نہ کرنا۔ (ترمذی)

غرضیکہ مؤمن کا کمال یہ ہے اور ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ شریعت کے جملہ احکام پر بلا چون و چرا عمل کیا جائے اور جب بھی کسی مسئلے میں الجھن ہو اور باوجود کوشش کے سمجھ میں نہ آئے تو ''اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ'' پڑھ کر اطمینان حاصل کر لیا جائے کہ میں تو بندہ ہوں مالک نے جو چاہا حکم دیا، میرا کام صرف عمل ہے، عمل میں کمی نہ رہے، کوتاہی نہ رہے، اسی میں نجات ہے۔ اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۳۰

المائدہ: ۲ تا ۵

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ
وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ
فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ
تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ
اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّیَةُ وَ النَّطِیْحَةُ وَ مَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ
اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ ۫ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ
اَلْیَوْمَ یَىٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ؕ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ
لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ
مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ یَسْــٴَـلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ

لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (المائدہ:۲ تا۵)

اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو، اللہ کی نشانیوں کی اور نہ عزت والے مہینہ کی اور نہ حرم کو بھیجی ہوئی قربانیوں کی اور نہ جن کے گلے میں پٹے ڈالے گئے ہیں اور نہ ان کی جو قصد کئے ہوئے ہیں بیت الحرام کا طلب کرتے ہیں وہ اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا، اور جب احرام کھول چکو تو شکار کر سکتے ہو اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کا بغض بوجہ اس کے کہ انہوں نے روکا تھا تمہیں مسجد حرام سے اس پر کہ تم زیادتی کرو، اور ایک دوسرے کی مدد کرو، نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) میں اور باہم مدد نہ کرو، گناہ اور زیادتی پر اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے حرام کئے ہیں تم پر مُردار اور خون اور سوٴر کا گوشت اور جس پر وقتِ ذبح غیر خدا کا نام لیا جائے اور گلا گھونٹنے سے مرا ہوا، اور چوٹ سے مرا ہوا، اوپر سے نیچے گر کر مرا ہوا، اور سینگ لگنے سے مرا ہوا، اور جسے کسی درندے نے کھایا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے ذبح کر لیا ہو اور جو ذبح کیا گیا ہو، تھانوں پر اور (یہ بھی حرام ہے) کہ تم تقسیم کرو، جوئے کے تیروں سے، یہ سب نافرمانی کے کام ہیں، آج مایوس ہو گئے ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا، تمہارے دین سے پس نہ ڈرو تم ان سے اور ڈرو مجھ سے، آج میں نے مکمل کر دیا ہے، تمہارے لئے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین، پس جو مجبور ہو جائے بھوک میں، درآنحالیکہ نہ جھکنے والا ہو گناہ کی طرف، تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں آپ ﷺ سے کہ کیا کیا حلال کیا گیا ہے ان کے لئے آپ ﷺ فرما دیجئے، حلال کی گئی ہیں تمہارے لئے پاک چیزیں، اور (شکار) ان کا سکھایا ہے تم نے جنہیں شکاری جانوروں سے شکار پکڑنے کی تعلیم دیتے ہوئے، تم سکھاتے ہو انہیں (وہ طریقہ) جو سکھایا تمہیں اللہ نے تو کھاؤ اس میں سے جنہیں پکڑے رکھیں وہ تمہارے لئے اور لیا کرو اللہ کا نام اس جانور پر اور ڈرتے رہو، اللہ سے، بیشک اللہ بہت تیز ہے حساب لینے میں۔ آج حلال کر دی گئی ہیں تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں اور کھانا، ان لوگوں کا جنہیں دی گئی کتاب، حلال ہے تمہارے لئے اور تمہارا کھانا، حلال ہے ان کے لئے اور (حلال ہیں) پاکدامن مومن عورتیں اور پاکدامن عورتیں ان

لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب، تم سے پہلے جب دے دوتم انہیں مہران کے، پاکباز بنتے ہوئے، نہ بدکاری کرتے ہوئے اور نہ چوری چھپے آشنا بناتے ہوئے اور جوانکار کرتا ہے ایمان کا، تو بس ضائع ہو گیا، اس کا عمل اور وہ آخرت میں، نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

یہ سورۂ مائدہ کی چار آیات ہیں، پہلی آیت میں ہدایات دی جارہی ہیں کہ:

اے ایمان والو! تم شعائر اللہ، محترم مہینوں، ھدی، قلائد اور زائرین حرم کی بے حرمتی نہ کرو، تمہیں اجازت ہے کہ حالتِ احرام ختم ہو جانے کے بعد تم شکار کر سکتے ہو، کسی کو انتقاماً مسجد حرام سے روکنے کا تمہیں اختیار نہیں، تم آپس میں نیکی اور تقوی کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو، گناہ اور ظلم وزیادتی پر باہمی تعاون کی اجازت نہیں، ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو، ان احکام کی پابندی کرو، حکم عدولی کرو گے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے کہ نہ تو دنیا کی کسی تکلیف سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی قوت وطاقت عذاب الٰہی سے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔

شعائر اللہ کا احترام

شعیرہ، علامت یا نشانی کو کہا جاتا ہے، شعائر، علامات اور نشانیاں، کوئی بھی علامت یا نشانی اصل مقصود نہیں ہوتی لیکن ہر انسان کے لئے نہایت اہم ہوتی ہے کہ اسی کے ذریعہ مقصود، مطلوب، محبوب یا منزل تک پہنچا جاتا ہے مثلاً راستے پر لگے ہوئے نشانات، بورڈ مسافر کے لئے نہایت اہم ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر منزل تک پہنچنا ممکن نہیں، اسی لئے ان کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اور ان کی حفاظت بھی کی جاتی ہے، نیز یہ علامات ہی تعارف اور پہچان کا ذریعہ ہوتی ہیں، مثلاً علم، جھنڈا ہی ملک کی پہچان کا ذریعہ ہوتا ہے اپنے ملک کی کسی عمارت پر آپ کسی ملک کا جھنڈا دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ یہاں سے فلاں ملک کی سرحد شروع ہوگئی، اسی لئے اس علامت کی بڑی حفاظت کی جاتی اور اس کا بے حد احترام کیا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک محب الوطن اپنے جھنڈے کی حفاظت میں جان کی بازی تو لگا دیتا ہے لیکن اپنے جیتے جی اس کو نیچا نہیں ہونے دیتا، ہر شخص کے نزدیک اس کی ضرورت اور محبت کے مطابق نشانی کی اہمیت اور اس کا احترام ہوتا ہے، حالت سفر میں مسافر کے لئے راستہ کے بورڈ نہایت اہم ہوتے ہیں کیونکہ ان کے بغیر وہ اپنی منزل نہیں پا سکتا اور حالت جنگ میں سپاہی کے لئے اپنے ملک کا جھنڈا بے حد قابل احترام ہوتا ہے کہ دشمن اگر جھنڈے کی بے حرمتی کرتا ہے تو گویا پورے ملک اور قوم کی بے حرمتی ہے اور اگر دشمن جھنڈے پر قابض ہو جاتا ہے تو پورا ملک اور اس کی قوم آزادی سے محروم ہو جاتی ہے، شکست خوردہ ہو جاتی ہے، اسی لئے مجاہدین اسلام نے ہر دور میں اپنی جان کی بازی تک لگائی لیکن علمِ اسلام کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا، ان باتوں کو ذہن میں رکھئے، پھر شعائر اللہ، ان کی اہمیت اور احترام کا مطلب سمجھئے۔

شعائر اللہ، یعنی اللہ کی نشانیاں، ایسی تمام چیزیں ہیں جن کے دیکھنے سے مذہبی جذبات ابھرتے ہوں اور اللہ اور اس کے رسول سے نسبت ومحبت کا احساس بیدار ہوتا ہو، دین کے لئے ایثار وقربانی کا اضطراب پیدا ہوتا ہو، اللہ کی قدرت پر ایمان مزید قوی ہوتا ہو۔

"لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ" فرما کر واضح ہدایت دی جارہی ہے کہ اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، جبکہ ان کی تعظیم و احترام کو تقویٰ کی علامت قرار دیا گیا:

ذٰلِكَ ۗ وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ ۝ (الحج:٣٢)

حقیقت یہ ہے کہ جو ادب واحترام کرتا ہے، اللہ کی نشانیوں کا تو یہ (احترام) اس وجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے۔

یعنی شعائر اللہ کی تعظیم، مؤمن ہی کرے گا کہ اسی کے دل میں تقویٰ ہوسکتا ہے یا یوں کہئے کہ شعائر اللہ کی تعظیم ایمان وتقویٰ کی علامت ہے ایسے شخص کو مشرک یا بدعتی وغیرہ کہنا، نہ صرف جہالت بلکہ ایمان کے لئے خطرہ ہے، جہالت اس لئے کہ ایسے شخص کو مشرک یا بدعتی وہی کہہ سکتا ہے، جسے شرک اور تعظیم کا فرق معلوم نہ ہو کہ شرک تو اللہ کی ذات وصفات میں کسی کو، اس کا ساجھی یا ساتھی ٹھہرانا ہے، یا کسی کے لئے عبادات کا وہ طریقہ اختیار کرنا ہے جو معبود حقیقی ہی کے لئے مخصوص ہے، جیسے غیر اللہ کو سجدہ کرنا، جانور ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لینا، غیر اللہ کو حقیقتاً معاون و مددگار جاننا، جبکہ کسی کی تعظیم کرنا اور تعظیم کا طریقہ اختیار کرنا، اللہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے خود، قابلِ احترام لوگوں اور چیزوں کی تعظیم کا حکم دیا، جیسا کہ ابھی آپ نے پڑھا کہ شعائر اللہ کی تعظیم، علامتِ تقویٰ ہے، پس تعظیماً کسی کے لئے کھڑا ہونا، کسی کا ہاتھ چومنا، یا کسی کو دعاؤں کی قبولیت کے لئے، حاجت روائی کے لئے واسطہ و وسیلہ بنانا، یا کسی قابل احترام چیز مثلاً قرآن کریم، کعبہ وغیرہ کا بوسہ لینا، تعظیم ہے، شرک نہیں، پس تعظیم کرنے والے کو مشرک یا بدعتی قرار دینا جہالت ہے اور ایمان کے لئے خطرہ، اس لئے کہ مؤمن کو مشرک قرار دینا اور قرآن کریم کے واضح حکم کی تعمیل کو شرک و بدعت قرار دینا کفر ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس قسم کے فتوؤں سے پرہیز کیا جائے، اگر کسی کو یہ چیزیں خود پسند نہیں تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے لیکن عمل کرنے والوں پر فتویٰ لگانا اور انہیں عمل سے روکنا، امت میں انتشار وافتراق پیدا کرنا ہے جو شرعاً جرم ہے۔

قرآن کریم نے چند چیزوں کو شعائر اللہ قرار دے کر اشارہ فرما دیا کہ یہ چیزیں اور ان جیسی تمام چیزیں شعائر اللہ ہیں، ان کا احترام کیا کرو، مقام ابراہیم کو مصلیٰ قرار دیا گیا، صرف اس لئے کہ اس کا تعلق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے، جو اس حقیقت کو سمجھ لینے کے لئے کافی ہے کہ جن چیزوں کی نسبت، اللہ کے حبیب، افضل الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو، وہ یقیناً قابل احترام ہیں، ابراہیم علیہ السلام جس پتھر پر چند مرتبہ کھڑے ہوئے، تو وہ مصلیٰ قرار پایا، تو کیوں نہ وہ مقام "رَوۡضَةٌ مِّنۡ رِّيَاضِ الۡجَنَّةِ" ہو جس پر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم برسوں متواتر چلے اور کیوں نہ اس مقدس محراب میں سجدہ کرنے کو ذریعہ مقبولیت یقین کیا جائے، جس میں نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہزاروں سجدے کئے اور کیوں نہ اس روضہ مقدس کو رحمت باری کے نزول کا مرکز جانا جائے، جس میں رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم زندہ آرام فرما ہیں اور اپنے غلاموں کے حال کو ملاحظہ فرما رہے اور ان کی باتوں کو سماعت فرما رہے ہیں، غرضیکہ مقام ابراہیم کو مصلیٰ قرار دے کر دعوت دی گئی کہ میرے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف جس چیز کی بھی نسبت ہو جائے، وہ تمہارے لئے معظم ومحترم ہے، چاہے وہ انسان ہو، اس کا تعلق، حیوانات سے ہو، نباتات یا جمادات سے۔

صفاء و مروہ، مکہ کی دیگر پہاڑیوں کی طرح دو پہاڑیاں ہیں لیکن انہیں ''شعائر اللہ'' قرار دیا گیا جبکہ ان کا تعلق کسی نبی سے نہیں بلکہ نبی کی بیوی، حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے ہوا، وہ بھی صرف اتنا کہ وہ اس پر ایک مرتبہ اپنے بیٹے کے لئے پانی کی تلاش میں دوڑیں، نبی کی بیوی کو نبیہ نہیں، صرف ولیہ، اللہ کی نیک بندی کہا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ایک صالحہ بندی کی نسبت سے، یہ پہاڑیاں اس قدر قابل احترام ہو گئیں کہ قرآن کریم میں ان کا ذکر محفوظ کر دیا گیا، انہیں ''شعائر اللہ'' قرار دیا گیا، زائرین کعبہ کو ان کی سعی کا حکم دیا گیا کیا صرف اس لئے کہ ان پہاڑیوں کو عظمت بخشی جائے، یا اس لئے کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی ادا کی حفاظت کی جائے، نہیں کیونکہ ان دونوں باتوں میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ نظر آتا ہے اور نہ ہی دین کا، عقل و فہم کا تقاضا ہے کہ احکام الٰہی میں ایسی حکمت تلاش کی جائے، جس سے دین و دنیا کا فائدہ معلوم ہو، پس علماء کرام کو اس میں حکمت نظر آتی ہے اور یہ ہی حق ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام، صفا و مروہ کی تعظیم سے ان چیزوں کی تعظیم کی تعلیم حاصل کریں جن کی نسبت ان کے اسلاف، بزرگوں اور اولیاء کرام سے ہو اور ان حضرات کی اداؤں کو اپنائیں جو تقویٰ و پرہیز گاری کا پیکر اور اتباع سنت کا نمونہ تھے کہ یہ حضرات بلا شبہ ابراہیم علیہ السلام کی ایک امتیہ، ایک ولیہ سے افضل ہیں۔

بُدن، قربانی کے جانوروں کو شعائر اللہ قرار دیا گیا، صرف اس لئے کہ یہ جانور ہماری اتنی فرمانبرداری کرتے ہیں کہ اپنی جان تک پیش کر دیتے ہیں اور ہمارے لئے اللہ کے یہاں سے اجر و ثواب کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں، قیامت کے دن پل صراط پر یہی ہماری سواری ہوں گے، صرف اس لئے یہ ''شعائر اللہ'' قرار دیے گئے کہ ان کا احترام ہمارے لئے لازم ہو گیا، اس طرح کہ ہم ان کو پالیں، ان کی خدمت کریں، ان پر سواری نہ کریں، نہ ان پر بوجھ لادیں، نہ ان کے دودھ اور بالوں سے فائدہ حاصل کریں، یہ اس لئے نہیں کہ جانوروں کو عزت بخشنا مقصود ہے بلکہ صرف یہ دعوت دینا مقصود ہے کہ تمہاری فرمانبرداری کرنے والے جانور جب قابل احترام اور مستحق محبت ہیں، تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے بندے کس قدر معظم و محترم ہونے چاہئیں یہ فیصلہ تم خود کر لو اور اللہ کے ولیوں کا احترام کرو، اس طرح کہ ان سے نسبت قائم کرو، ان کے طریقوں کو اپناؤ، ان کی یاد کو اپنے دل میں بساؤ، اپنی قربانیوں اور دیگر اعمال کی قبولیت کے لئے، ان کو وسیلہ بناؤ، جیسے ہمارے ایک نبی حضرت زکریا علیہ السلام نے ہماری ایک ولیہ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس رکھے ہوئے پھلوں کو دیکھا، پوچھا، یہ تمہارے پاس کہاں سے آئے، جواب ملا، اللہ کی طرف سے، مریم پر اللہ کے اس لطف و کرم کو جان کر، نبی نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے، غور کیجئے، ان آیات میں:

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ (آل عمران: ۳۸)

وہیں (مریم کے پاس کھڑے ہوکر) دعا کی زکریا نے اپنے رب سے، عرض کی، اے میرے رب! عطا فرما مجھے، اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد، بے شک تو ہی سننے والا ہے، دعا کا۔

اللہ کی ایک محبوبہ کے پاس، اللہ کی قدرت کا کرشمہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد، دعا مانگی گئی تھی، کیوں نہ قبول ہوتی، قبول ہوئی، یحییٰ علیہ السلام جیسی مقدس اولاد دی گئی۔

اے ایمان والو! ''لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ'' اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، جملہ احکام الٰہی نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنن، عبادات کے طریقے، شرعی حدود اور سزائیں، ان کے علاوہ قرآن کریم، اولیاء کرام، علماء کرام، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تبرکات، مساجد و مزارات، غرضیکہ تمام دینی چیزیں، شعائر اللہ میں شامل ہیں، ان کو معمولی جاننا، ان کو مٹانا، ان کی بے حرمتی ہے، شرعی جرم ہے، پس وہ لوگ بڑے ظالم قرار پاتے ہیں جو ان نشانیوں کو مٹانا، دین کی خدمت سمجھتے ہیں، مبارک ہیں وہ ممالک اور ان کے حکام، جہاں شعائر اللہ کو شریعت کے مطابق قانونی تحفظ حاصل ہے اور قابل نفرت ہیں وہ جو ان مقدس نشانیوں کو مٹا چکے یا مٹانے کے درپے ہیں، کہاں گیا اسلامی تبلیغ کا پہلا مرکز'' دار ارقم''، کہاں ہے آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان پیدائش، کہاں گئے جنت البقیع میں مدفون جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدس مزارات، اسی قسم کے ہزاروں شعائر تھے، جو امت مسلمہ کی تاریخی یادگار تھے، عظیم ذخیرہ تھے، سب مٹا دیئے۔ ظالموں نے ''لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ'' کا حکم نظر انداز کیا، اللہ کے ارشاد کو پامال کیا اور اپنے وضع کردہ قانون کو قانون شریعت قرار دیا، کتنا بڑا ہے یہ ظلم، ''وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ'' وقت آئے گا کہ ظالم اپنے انجام کو پہنچیں گے۔

آیت زیر گفتگو میں، عام شعائر کی بے حرمتی کی ممانعت کے بعد چند شعائر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا اور ان کی بے حرمتی کی ممانعت کی گئی، ان کی بھی قدرے وضاحت ضروری ہے۔

الشهر الحرام

یہ چار مہینے ہیں رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم، تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں یہ بات موجود ہے کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، جبکہ ان میں گناہ کا وبال اور عذاب بھی زیادہ ہے، پچھلی شریعتوں میں ان چار مہینوں میں قتل وقتال بھی ممنوع تھا، ہماری شریعت میں ابتداً یہی حکم رہا، لیکن پھر جہاد کی اجازت دیدی گئی، ہاں حرمت و عظمت باقی ہے، قرآن کریم میں ان مہینوں کا ذکر موجود ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ
قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾
(التوبہ:۳۶)

بیشک مہینوں کی تعداد، اللہ کے نزدیک بارہ ماہ ہے کتاب الٰہی (لوح محفوظ) میں، جس دن سے اس نے پیدا فرمایا، آسمانوں اور زمین کو، ان میں سے چار عزت والے ہیں یہی دین قیم ہے، پس نہ ظلم کرو، ان مہینوں میں اپنے آپ پر (گناہ کرکے) اور جنگ کرو، تمام مشرکوں سے جس طرح وہ سب تم سے جنگ کرتے ہیں اور خوب جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

یعنی سال کے مہینوں کی تعداد بارہ ہے، جو لوح محفوظ میں موجود ہے، اس کے حساب کی ابتداء اس دن سے ہوئی ہے، جس دن سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا، یہ اللہ کے مقرر کردہ مہینے ہیں کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں، ان

میں سے چار مہینے خصوصی طور پر محترم اور معزز ہیں، لہٰذا ان میں خصوصیت کے ساتھ گناہوں اور برائیوں سے بچنا چاہئے، ہاں جہاد کی اجازت ہے، جو پچھلی شریعتوں میں نہ تھی کیونکہ کفار و مشرکین بھی اگر چہ ان مہینوں کا احترام کرتے تھے اور ان میں قتل و قتال سے باز رہتے تھے، لیکن انہوں نے زندگی کے دوسرے اصولوں کی طرح اس قانون الٰہی کو بھی بے اعتدالی، ہواوَ ہوس اور خودغرضی کی بھینٹ چڑھا رکھا تھا اور ان کا حال یہ تھا کہ اپنی ضرورت کے مطابق ان مہینوں میں رد و بدل کر لیتے تھے، مثلاً اگر انہیں محرم میں جنگ کرنا ہوتی، تو وہ محرم کو صفر قرار دے لیتے اور صفر کو مؤخر کر دیتے تھے کیونکہ ان کے لئے متواتر تین مہینے تک قتل و غارت سے رکا رہنا بہت دشوار تھا، جبکہ مسلمانوں کو تو اللہ کے حکم کے مطابق ان مہینوں کی حرمت کی پابندی کرنا تھی، اب اگر ان مہینوں میں جہاد حرام رکھا جاتا تو بددیانت دشمن کو تو خوب موقع ہاتھ آ جاتا، وہ اپنے مہینوں کو تبدیل کر لیتے اور مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کا صفایا کر دیتے، مسلمان حکمِ الٰہی کی پابندی کے باعث جواب دینا تو کیا، ان کی تلواروں تلے تڑپ بھی نہ پاتے، پس اللہ نے کرم فرمایا اور مسلمانوں کو ان مہینوں میں بھی جہاد کی اجازت دیدی، تاکہ وہ اپنا تحفظ بھی کر سکیں اور اگر ضرورت ہو تو حملہ آور بھی ہو سکیں۔

یہ اسلام کی حقانیت کا ثبوت ہے کہ اس نے ہمیں ایسے قوانینِ زندگی عطا فرمائے، جن پر کسی رد و بدل کے بغیر، ہر دور میں عمل ممکن ہے اسی قانون پر غور فرمایئے کہ اگر ''اشہر حرم'' میں جہاد ممنوع قرار دیدیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ اس زمانہ کے بددیانت دشمن سے نقصان کا اندیشہ رہتا، بلکہ اس دور میں تو یہ قانون قابل عمل ہی نہ رہتا کیونکہ آج کے دشمن کا تو کوئی اصول ہی نہیں، کوئی مذہب اور کوئی دین ہی نہیں، اسے تو جب بھی موقع ملتا ہے، حملہ کر دیتا ہے، بمباری کرنے لگتا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کسی وقت میں بھی جہاد پر پابندی نہ لگائی اور مسلمانوں کو ہر وقت دشمن کا مقابلہ کرنے، اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا موقع دیا، یہی حال اسلام کے دیگر قوانین کا ہے کہ وہ ہر دور، ہر مقام کے لئے قابل عمل ہیں، مسلمانوں کو نہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ہی تقاضائے وقت سے مجبور ہو کر حکم عدولی کی۔

ھدی اور قلائد

حرم مکہ میں قربان ہونے والے جانوروں کو ''ھدی'' کہا جاتا ہے اور بطور علامت ان کے گلوں میں جو ہار ڈال دیئے جاتے ہیں ''قلائد'' کہلاتے ہیں چونکہ یہ جانور، اللہ کی ملکیت قرار دے دیئے ہیں، لہٰذا یہ بھی ''شعائر اللہ'' اللہ کی نشانی بن گئے، پس تم ان کی بھی بے حرمتی نہ کرو۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ ﳓ (الحج:۳۶)

اور قربانی کے جانوروں کو، ہم نے بنایا ہے تمہارے لئے اللہ کی نشانیوں میں سے، تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے۔

پس تم ان کی بے حرمتی نہ کرو، یعنی ان کے ساتھ دیگر عام جانوروں جیسا برتاؤ نہ کرو، نہ تو ان کو حرم تک پہنچنے سے روکو، اور نہ ان پر سواری کرو، نہ اپنا بوجھ ان پر لادو، نہ ان کے بالوں سے فائدہ حاصل کرو، نہ ہی ان کا دودھ حاصل کرو، اب یہ اللہ کی امانت ہو چکے، اس کی نشانی بن چکے، ان کا احترام کرو، انہیں خوب کھلاؤ، پلاؤ، ان سے محبت کرو، جتنی ان کی خدمت کرو گے

اتنا ہی زیادہ ثواب پاؤ گے، غور فرمائیے، وہ جانور اور اس جانور کے گلے کا ہار تک قابل احترام ہے، جو اللہ کی عبادت اور اس رضا کے حصول کے لئے مخصوص کر دیا گیا، تو پھر کیا قباحت ہے ان چیزوں کو محترم و معظم سمجھنے میں، جن سے اہل ایمان کے قلوب میں عبادت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

زائرین حرم کا احترام

''وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ'' اہل ایمان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کی بھی بے حرمتی نہ کریں جو حج وعمرہ کی نیت سے بیت اللہ کا قصد کر رہے ہیں کہ اب وہ اللہ کی راہ کے مسافر اور اللہ کے گھر کے مہمان ہیں، وہ اللہ کی نشانی بن چکے ہیں، پس تمہارے ایمان کا مقتضٰی یہ ہے کہ تم ان کا احترام کرو، ان کو عزت ومحبت کی نظروں سے دیکھو، ان کے مقدر پر رشک کرو، ان سے اپنے لئے دعاؤں کی درخواست کرو، کہ اللہ ہمیں بھی اپنے گھر کی حاضری کے شرف سے نواز دے، اگر ضرورت ہو تو ان سے ہر ممکن تعاون کرو، یہ ذمہ داری عام مسلمانوں کی بھی ہے اور ان خاص مسلمانوں کی بھی جو قومی امور کے امین اور ان کی انجام دہی پر مامور ہیں، یعنی حکام کی۔

زائرین حرم، دنیا کے کسی ملک سے بھی اللہ کے گھر کی طرف روانہ ہو رہے ہوں، مسلمان حکام کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کے سفر اور حرمِ مقدس میں ان کے قیام وطعام کے سلسلے میں، وہ اپنے وسائل کے مطابق جو بھی سہولتیں فراہم کر سکتے ہوں کریں، بالخصوص وہ زائرینِ حرم جو مسلم ممالک کے باشندے ہیں اور اپنے ملکوں سے حج وعمرہ کا قصد کر رہے، زیادہ مستحق ہیں کہ ان کی حکومت ان کو خصوصی مراعات دے اور خصوصی اعزاز کے ساتھ انہیں ملک سے رخصت کیا جائے، پھر جب وہ حدودِ حرم میں پہنچیں تو خُدامِ حرمین کی ذمہ داری ہے کہ نہایت ہی عزت واحترام کے ساتھ ان کا استقبال کریں اور اللہ کے اِن مہمانوں کی ہر ممکن طریقے سے خدمت کریں، ان کی میزبانی کی ذمہ داری نہایت ہی احسن طریقہ سے پوری کریں۔

اس میں شک نہیں کہ بحمداللہ عامۃُ المسلمین، زائرین حرم کا احترام آج بھی کرتے ہیں، لیکن مسلم ممالک کے حکام نے جس طرح دیگر شرعی احکام کو پامال کیا ہوا ہے اور وہ جس طرح دیگر شعائر اللہ کی توہین کے مرتکب ہیں، اسی طرح انہیں اس واضح ہدایت کا بھی کوئی احساس نہیں یہی وجہ ہے کہ آج سوائے سفر حج وعمرہ کے باقی ہر قسم کے سفر کے لئے سہولتیں مہیا ہیں، اللہ کی راہ کا یہ مسافر جونہی اپنی مقدس منزل کا قصد کرتا ہے، اس کی آزمائش کا آغاز ہو جاتا ہے، سب سے پہلے اپنی حکومت سے اجازت، کرنسی کے حصول کا مرحلہ، پھر سعودی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کرنے کی مشقت سے واسطہ پڑتا ہے، ویزا کا حصول، بھیک مانگنے سے بھی زیادہ دشوار ہوتا ہے، مطلوبہ دستاویزات پیش کر دینے کے بعد بھی، جھڑکیاں اور دھکے کھانے پڑتے ہیں، جیسے تیسے یہ اپنا سفر پورا کر کے جدہ ایئرپورٹ پر پہنچتا ہے تو عشق ومحبت کے اس دیوانے، اللہ کے گھر کے متوالے کا استقبال، شاہی کارندے، جن حقارت بھری نظروں سے کرتے ہیں اور جو ذلت آمیز رویہ برتتے ہیں، اس کا اندازہ سوائے حاجی کے کسی کو نہیں ہو سکتا، لایعنی سوالات کے جوابات، پاسپورٹ چیک کرنیوالوں کی جہالت کا مظاہرہ، کسٹم والوں کی بدسلوکی، سامان کو تتر بتر کرنا اور اوراد وظائف تک کی کتابوں کو نہ صرف چھین لینا بلکہ نہایت بے ادبی کے ساتھ پھینک دینا، منٹوں کا کام گھنٹوں میں کرنا، ان سلطانی غلاموں کا شعار ہے، اس بدسلوکی کی وضاحت کے طور پر، اگر ہم اپنا ایک ذاتی

واقعہ پیش کردیں، تو غیر ضروری نہ ہوگا۔

سفرِ حج کے دوران جدہ ایئرپورٹ پر، اُخوتِ اسلام سے مجبور ہوکر، ایک نہایت ہی پریشان حال، یورپین مسافر سے میں اس کی خیریت پوچھ بیٹھا، یہ ایک جرمن نو مسلم تھا، جو پہلی ہی مرتبہ حج کے لئے اپنے اہل وعیال کے ساتھ بڑے جذبے سے آیا تھا۔ جونہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا، بس وہ بپھر پڑا، اور بولا ''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں تو شاید میں اسلام قبول ہی نہ کرتا، یا کم از کم یہاں آنے کی جسارت کبھی نہ کرتا، آخر کس نے ان جاہلوں کو اللہ کے گھر کا محافظ بنادیا ہے، یہ تو ظالم ہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کے خلاف آواز بلند کرنا اور ان سے نجات حاصل کرنا چاہئے۔'' میں نے اس سے اظہار محبت کیا، اس کی ہمت افزائی کی اور مزید حال معلوم کیا، تو اس نے بتایا، ''کہ میری تین سالہ بچی راستہ میں بیمار ہوگئی، اس وقت اسے، ڈاکٹر اور دوا کی سخت ضرورت ہے، میں ان ظالموں کی پانچ گھنٹے سے خوشامد کررہا ہوں کہ مجھے جلدی فارغ کردو لیکن کوئی سُنوائی نہیں، جناب! یہاں کا تو حال ہی عجیب ہے، میرے ملک کا ایئرپورٹ ہوتا، تو مجھے جہاز سے ہی سیدھا ہسپتال پہنچادیا جاتا۔'' بہرحال مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں نے کیا اور چند گھنٹے بعد اُسے اِس جیل سے رہائی دلانے میں کامیابی ہوئی، حرم شریف میں اس شخص سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی، تو پتہ چلا کہ اس کی بچی کا انتقال ہوگیا، ہمیں نہایت صدمہ ہوا اور دعا کی کہ اے اللہ! تو اپنے اس بندے کے ایمان کی حفاظت فرما، ان ظالموں کی بدسلوکی کے سبب اسے ایمان کی دولت سے محروم نہ کرنا۔

بہرحال ایئرپورٹ کے سخت مرحلے سے نجات کے بعد، حرمین شریفین میں قیام کے دوران معلمین، ہوٹل کے مالکان، ٹیکسیوں اور بسوں کے ڈرائیوروں وغیرہ کا رویہ بھی کچھ کم ہتک آمیز نہیں ہوتا، ہر ہر قدم پر ذلت وخواری کا سامنا رہتا ہے، یہ ظالم یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے گھر کے مہمان شاید ان کے در کے بھکاری ہیں، اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ کسی کو نصیب نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، وہ اللہ کے گھر کے اِن مہمانوں ہی کا صدقہ ہے معلمین کے ہزاروں خاندان، ان حجاج کرام کی دولت سے ہی عیش وعشرت کی زندگی بسر کررہے ہیں، پورے سعودیہ کی تجارت کا دارومدار انہی حاجیوں پر ہے، حکومت کا عزت ووقار انہی حاجیوں سے ہے لیکن یہ ظالم اللہ کے شعائر کو پامال کرتے نہیں تھکتے، سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ڈھیل ہے اور اب حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پکڑ کا وقت قریب تر ہے اور ''اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِيْدٌ'' رب کی پکڑ جب ہوتی ہے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہوسکتا، اللہ ان سے امت مسلمہ کو جلد نجات عطا فرمائے اور اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے حرم کی خدمت ایسے اہلِ ایمان کو سونپے جو اس کی ہدایت کے مطابق زائرین کا احترام کریں، ان کی میزبانی کا حق ادا کریں۔

زائرین حرم کے احترام کی ہدایت کے بعد اہل ایمان کو اجازت دی گئی کہ احرام کی پابندی ختم ہوجانے کے بعد تمہیں شکار کرنے کی اجازت ہے، پھر ایک اور اہم ہدایت جاری فرمائی ہے کہ ''کسی قوم سے ذاتی عداوت یا بغض کی وجہ سے تمہیں اختیار نہیں کہ تم اسے اللہ کے گھر کی حاضری سے روکو اور اس پر زیادتی کرو'' اس ہدایت کو بھی موجودہ دور میں سعودی تاجدار، جس طرح پامال کررہے ہیں وہ آپ کے علم میں ہوگا کہ جس کا وہ چاہتے ہیں، اللہ کے حرم میں داخلہ بند کردیتے ہیں، ہم ایسے بہت لوگوں کو جانتے ہیں جو ایک عرصہ دراز سے حرمینِ شریفین کی زیارت سے محروم ہیں، صرف اس جرم میں کہ ان سے حکومت

کے بعض مخصوص قوانین کی پابندی میں لاپرواہی یا کوتاہی ہو گئی تھی، علاوہ ازیں ایک عرصہ سے لیبیا کے مسلمان، عراق کے مسلمان اس پابندی کا شکار ہیں، وہ بھی اس لئے نہیں کہ ان کا کوئی سیاسی اختلاف سعودی حکومت سے ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ اُن غیر مسلموں کو اپنا آقا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، جن کی غلامی سعودی بادشاہ نے صرف اپنی سلطنت اور بادشاہت کے تحفظ کے لئے اختیار کر رکھی ہے، جو پوری امت مسلمہ کے لئے باعث شرم ہے۔

باہمی تعاون

اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک مستحکم، منظم، باعزت، بارعب اور باوقار قوم بنانا چاہتا ہے، جس کا ہر فرد اللہ کے رسول ﷺ کی قیادت میں اللہ کا سپاہی ہو، جو غیروں کے سہارے کے بغیر، اپنے قومی تشخص، اپنی امتیازی حیثیت کی حفاظت اور اللہ کی زمین پر، اللہ کے بندوں کو جبر و استبداد سے نجات دلانے اور امن وامان کا ماحول فراہم کرنے کی ذمہ داری پوری کرنے کا اہل ہو، جس کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی میں پیش آنے والے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت وقوت رکھتا ہو، اس میں بلا کا تحمل ہو، اس میں بلا کی قوت برداشت ہو، اس کا گزر پھولوں بھرے گلستانوں سے ہو یا پُر خار وادیوں سے، جنگوں کے مصائب وآلام ہوں یا ریگستانوں کے نشیب وفراز، کہیں اور کسی موقع پر وہ غیروں کا محتاج نظر نہ آئے، اس مقصد کے حصول کے لئے اسے کہیں ہمت وصبر کی تلقین کی گئی تو کہیں استقلال واستقامت کی تعلیم دی گئی، یہاں ایک اور نسخہ کیمیا عطا فرمایا جا رہا ہے اور وہ ہے "باہمی تعاون" واضح ہدایت ہے کہ:

اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو، جس کی بنیاد "بِرّ وتقویٰ" کو بناؤ کہ جب بھی تمہارے کسی مسلمان بھائی کو کسی "نیک کام" میں تمہارے تعاون کی ضرورت پیش آئے تو آگے بڑھو اور اسے جس قسم کا تعاون درکار ہو، اپنی استطاعت کے مطابق اسے فراہم کرو، لیکن اگر رنگ ونسل، لسانی یا صوبائی بنیادوں پر تم سے کوئی مدد کا طلب گار ہو تو تمہیں ممانعت کی جاتی ہے کہ ان بنیادوں پر ہرگز تعاون نہ کرنا کہ ایسے مقاصد میں تعاون، امتِ مسلمہ میں انتشار وافتراق، گروہ بندی اور فرقہ بندی پیدا کرنے کا باعث ہوگا جو ہدایتِ تعاون کے مقصد ہی کو ختم کر دیتا ہے کہ تعاون کی ہدایت کا مقصد تو امت مسلمہ میں یگانگت اور اتحاد واتفاق پیدا کرنا ہے، علاوہ ازیں اسلامی رشتہ کی بنیاد تو ایک رسول ﷺ کی غلامی اور ایک قرآن کے احکام کی پابندی ہے، اس میں رنگ ونسل یا صوبائیت ولسانیت کا کوئی لحاظ نہیں، دیکھو تمہارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں جو حیثیت ابوبکر، عمر، عثمان، علی کی ہے، وہی بلالِ حبشی، صہیبِ رومی، سلمانِ فارسی، زید بن ثابت کی ہے، رضی اللہ عنہم، نہ وہاں امیر وغریب میں فرق نظر آتا ہے اور نہ ہی آقا وغلام میں، نہ کالے اور گورے میں امتیاز ہے، نہ ہی عرب وعجم کا لحاظ، صرف لحاظ ہے تو "بِر وتقویٰ" کا، پس باہمی تعاون کی بنیاد "بِرِ وتقویٰ" کو بناؤ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ نَصَرَ قَوْمَهُ عَلٰى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كَالْبَعِيْرِ الَّذِىْ هَوٰى فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنْبِهٖ

جس نے اپنی قوم کی غیر حق پر مدد کی، تو وہ اس اونٹ کی طرح ہے جو گڑھے میں گر جائے اور دُم پکڑ کر کھینچا جائے۔ (ابوداؤد)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا، یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم):

مَا الْعَصَبِیَّۃُ قَالَ اَنْ تُعِیْنَ قَوْمَکَ عَلَی الظُّلْمِ

عصبیت کیا ہے؟ فرمایا، یہ کہ تم اپنی قوم کی ظلم پر مدد کرو۔ (ابوداؤد)

حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

خَیْرُکُمُ الْمُدَافِعُ عَنْ عَشِیْرَتِہٖ مَالَمْ یَاْثَمْ

تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خاندان کا دفاع کرے، جب تک کہ گناہ گار نہ ہو۔ (ابوداؤد)

یعنی اپنے خاندان سے تعاون اور اُس کی مدد اس وقت تک کرو، جب تک کہ وہ کسی برائی یا ظلم میں مبتلا نہ ہوں، جب ایسا ہو تو ان سے علیحدہ ہو جاؤ کہ برائیوں پر مدد کرنا، برائیوں میں شریک ہونا ہے، پس ''بِر وتقویٰ'' میں مدد کرو ''اِثم وعدوان'' میں نہیں۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّۃٍ وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِیَّۃً وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰی عَصَبِیَّۃٍ

وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت پھیلائے اور وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی بناء پر لڑے اور وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت پر مرے۔ (ابوداؤد)

عصبیت، صرف رنگ، نسل، زبان، صوبہ، یا وطن کی بنیاد پر رشتہ قائم کرنا، ان بنیادوں پر رشتہ کی دعوت دینے والا، یا ان بنیادوں پر حمایت کرنے والا اور دوسروں سے جنگ کرنے والا، ان بنیادوں کی حمایت کرتے ہوئے مرجانے والا شخص، آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اس قدر ناپسندیدہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے اپنے حلقہ غلامی سے خارج قرار دیا کیونکہ اس عصبیت کی لعنت ہی نے تو انسان کو انسان کا دشمن، قاتل، ظالم اور عزت وآبرو، جان ومال کا لٹیرا بنایا ہوا تھا کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دستگیری فرمائی اور سب کو اسلام کے رشتے میں جوڑ کر، ایک دوسرے کا، دوست، معاون ومددگار، اور عزت وآبرو، جان ومال کا محافظ بنا دیا، یہ رشتہ جتنا مستحکم ومنظم ہوا، اتنا ہی انسان کو امن اور سکون ملا، اتنا ہی وہ باعزت، باوقار بنا اب جو بھی امت مسلمہ میں عصبیت کا بیج بو کر، اسے انتشار اور افتراق میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ قوم کا مجرم ہے، اللہ کا اور اس کے رسول ﷺ کا مجرم ہے، اس لائق نہیں کہ اسے آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت میں پناہ نصیب ہو، ''لیس منا'' غلامو! وہ ہم میں سے نہیں، اس کو دور کردو اور اس سے دور رہو تا کہ اس کے شر سے محفوظ رہو۔

ایک موقع پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا قوم سے محبت کرنا، خاندان سے محبت کرنا، عصبیت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں:

وَلٰکِنْ مِّنَ الْعَصَبِیَّۃِ اَنْ یَّنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَہٗ عَلَی الظُّلْمِ

لیکن عصبیت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کی مدد، ظلم پر کرے۔ (ابوداؤد)

غرضیکہ اہل ایمان کو باہمی تعاون کی ہدایت کی گئی، اثم وعدوان، ظلم وستم اور تعصب کی بناء پر نہیں بلکہ صرف اور صرف، اسلامی اخوت اور برّ وتقویٰ کی بنیاد پر، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن کے ''باہمی تعاون'' کی خوبی پر قرآن گواہ ہوا ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کہ یہ آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں، ان حضرات کی باہمی مہربانی کی بنیاد، برّ وتقویٰ اور اسلامی اخوت ہی تھی، اسی لئے انہوں نے، اپنے اعزا واقرباء، دوست واحباب کو چھوڑا، اسلامی رشتہ کو خونی رشتوں پر ترجیح دی اور رنگ ونسل، لسانی وصوبائی امتیاز کے بغیر اُن غیروں کو اپنایا اور گلے لگایا جو مؤمن تھے، مسلم تھے اور اس طرح مختلف زبانیں بولنے والوں، مختلف رنگ ونسل کے لوگوں اور دور دراز صوبوں اور ملکوں میں بسنے والوں پر مشتمل ایک امت وجود میں آئی، ایسی امت جس کی نظیر ماضی کی تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔

''برّ وتقویٰ'' کی بنیاد پر، باہمی تعاون نے اہل ایمان کو ایک مضبوط اور بارعب قوم بنایا کہ قیصر وکسریٰ کی حکومتیں بھی ان کے سامنے سرنگوں نظر آئیں اور اقوام عالم نے ان کی عظمت، ان کی قوت کو تسلیم کیا، لیکن جس دور میں بھی اہلِ ایمان باہمی تعاون کی نعمت سے محروم ہوئے، یا ان کے تعاون کی بنیاد، بر وتقویٰ، نہ رہا وہ انتشار کا شکار ہوئے، ان میں افتراق پیدا ہوا حتیٰ کہ وہ باہم دست وگریباں نظر آنے لگے، وہ امن وسکون، عزت وآبرو کی زندگی سے محروم ہوگئے، جو کام دشمن کا تھا، وہ خود ہی آپس میں کرنے لگے، ان کی جان ومال، عزت وآبرو کے لٹیرے، انہی میں سے پیدا ہونے لگے، غربت، جہالت، بے روزگاری، جیسے مصائب نے ان کو دَر دَر کا بھکاری بنا دیا، حتیٰ کہ وہ اپنوں کے مقابلہ پر غیروں کو ترجیح دینے لگے، وہ اپنوں کی عداوت ودشمنی میں اتنے آگے بڑھے کہ غیروں کو ان پر ظلم وستم کی دعوت دینے لگے، انہوں نے اپنوں کے لئے، اپنے دروازے بند کئے اور غیروں کو اپنا سارا سرمایہ سونپ دیا اور اب امت مسلمہ کا حال یہ ہوگیا، بقول علامہ اقبال:

اک فغاں بے شرر سینے میں باقی رہ گئی　　سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی
کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے　　کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی
نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی　　وہ بندے فِقر تھا جن کا ہَلاک قیصر وکسریٰ
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات　　تو جھکا جب غیر کے آگے نہ مَن تیرا، نہ تن

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں　　پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں
محبت کا جنوں باقی نہیں ہے　　مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدے بے ذوق　　کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اے لا الٰہ کے وارث، باقی نہیں ہے تجھ میں　　گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے　　کھو گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

مسلماں فقر وسلطانی بہم کرد ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
ولیکن الاماں از عصر حاضر کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

عالم ہے فقط مؤمن جانباز کی میراث مؤمن نہیں جو صاحب لولاک نہیں
گر تو مے خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز یہی ہے رخت سفرمیر کارواں کے لئے
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے شمشیر وسناں اول، طاؤس و رباب آخر
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے روح کو تڑپا دے

اے ایمان والو! اللہ کا خوف کرو، اس سے ڈرتے رہو، ان ہدایات پر عمل کرو، دیکھو اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے، جب اس کا عذاب نازل ہوتا ہے تو تمہارے سارے وسائل، سارے سہارے بیکار ہو جاتے ہیں، کبھی طوفان بادوباراں تو کبھی زلزلہ، تمہاری حسین آبادیوں کو ڈھیر کر ڈالتے ہیں، تو کبھی وبائی اورنت نئے امراض سے تمہاری قوت وطاقت پامال کر دی جاتی ہے، کبھی جہالت وغربت سے تمہارا غرور وتکبر، خاک میں مل جاتا ہے، پس تمہاری عافیت اسی میں، خیریت اسی میں ہے، فلاح وبہبود کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ تم جس کے ہو، اسی کی بندگی اختیار کرو، اسی کے احکام کی تعمیل کرو، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، کوئی سہارا نہیں۔

آیئے، اب دوسری آیت مبارکہ کا مطالعہ کریں جس میں حرام جانوروں، ایک قسم کی حرام دولت کا ذکر ہے نیز شریعت اسلامیہ کے مکمل ہونے کا اعلان ہے اور اہل ایمان کے لئے دین اسلام، اختیار کرنے پر اپنی رضا کا مژدہ ہے، اس مؤمن کے لئے بخشش کی خوشخبری ہے، جس نے حالت اضطرار میں صرف جان بچانے کی غرض سے کوئی حرام غذا استعمال کر لی۔

حرام جانوروں اور ''اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ'' کی تشریح وتفصیل، گزشتہ اوراق میں، سورۂ بقر کی آیت نمبر ۱۷۲، ۱۷۳ کے ذیل میں بیان کی جا چکی ہے، نیز حالت اضطرار میں حرام غذا کے استعمال پر بھی گفتگو ہو چکی ہے، اگر ضرورت ہو تو ان مضامین کا دوبارہ مطالعہ کر لیا جائے، اب اس آیت مبارکہ کے تین موضوع باقی رہتے ہیں اکمال دین، اتمام نعمت، رضا بالاسلام، تو ان کی وضاحت پیش خدمت ہے۔

اکمال دین

اکمال دین کا ایمان افروز مژدہ سنانے سے پہلے، اللہ رب العزت جل مجدہ نے، اہلِ ایمان کو مطمئن کیا کہ اب تک

تمہارے دین کو جو خطرہ کفار سے تھا، وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے کیونکہ اب کافر، تمہیں بار بار آزمانے کے بعد تمہاری فتح و کامرانی، استقلال و استقامت اور شان و شوکت دیکھ لینے کے بعد، خوب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ تمہارا دین ان کی سازشوں اور لاکھ تدبیروں کے باوجود بھی نہ مٹا ہے نہ مٹ سکتا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۳۲ (توبہ:۳۲)

وہ (کافر) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں، اللہ کے نور (اسلام) کو اپنی پھونکوں سے اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچا دے اللہ اپنے نور (اسلام) کو، اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) کافر۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۸ (الصف:۸)

یہ (بیوقوف) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور (اسلام) کو اپنی پھونکوں سے اور اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا، چاہے کافر اس کو سخت ناپسند کریں۔

اسلام اللہ کا نور ہے، کفار اس نور کو بجھانے، مٹانے کی بہت کوششیں کر چکے اور چاہے مستقبل میں کتنی ہی سر توڑ کوششیں کر لیں، لیکن یہ دین نہ مٹا ہے نہ مٹ سکتا ہے کہ یہ مٹنے کے لئے نہیں آیا، پس:

اے ایمان والو! اپنی پیہم ناکامیوں، نامرادی اور ذلت و خواری کے بعد، کفار کے حوصلے پست ہو چکے ہیں، وہ مایوس ہو چکے ہیں لہٰذا تمہارے دلوں میں جو بھی تھوڑا بہت کافروں کا ڈر تھا اسے اب نکال دو، اطمینان سے، ہماری اطاعت اور ہمارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع و پیروی کرو، ہرگز کسی سے نہ ڈرو، تمہارا خالق، میں اللہ ہی ہوں، میں ہی تمہارا رب ہوں، میں ہی تمہارا ناصر و مددگار ہوں۔ میرے ہی حضور تمہیں حاضر ہونا ہے۔ پس صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝۱۳ (توبہ:۱۳)

اللہ ہی زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم (سچے) مومن ہو۔

وہ اللہ تو فیصلہ فرما چکا ہے کہ تمہارے دین کو اتنا کامل و مکمل کر دے گا کہ تمہیں زندگی کے کسی شعبہ میں، کسی دوسرے دین سے رہبری و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی، پس سنو اور ناز کرو کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔

اکمال دین کا مطلب، حضرت عبداللہ بن عباس و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ دینِ حق، شریعتِ اسلامیہ کے تمام فرائض و حدود اور احکام عبادات و معاملات مکمل کر دیئے گئے جو ہر دور اور ہر مقام کے اہلِ ایمان کے لئے قابلِ عمل اور کافی ہیں، ان میں حالات کی تبدیلی کے باوجود کسی تبدیلی یا کمی بیشی کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کے بعد کوئی نیا حکم نازل نہ ہوا جو چند آیات اس کے بعد نازل ہوئیں ان میں یا تو ترغیب و ترہیب ہے یا پہلے نازل شدہ احکام شرع کی تائید، ہاں آئمہ مجتہدین نے قرآن کریم کے بیان کردہ اصول اجتہاد کے مطابق نئے پیش آنے

والے حالات و واقعات کے مطابق، اپنے اجتہاد سے کچھ شرعی احکام بیان فرمائے لیکن یہ دین کامل میں کوئی اضافہ نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی ہی میں ان حضرات نے اجتہاد کیا، گویا ان کے بیان کردہ احکامِ شرعیہ، حقیقت میں قرآن وحدیث ہی کے احکام ہیں جن کو بوقت ضرورت وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا، ان کا اصل مآخذ قرآن وحدیث ہی رہا۔

دین، ایسے اصول زندگی کے مجموعہ کا نام ہے جن پر عمل کرنے والے کو پُرسکون، باعزت اور باوقار زندگی میسر آئے ہر دور میں انسان نے اپنی زندگی کے لئے خود اصول وقواعد وضع کیے لیکن انُ خود ساختہ اصولِ زندگی سے کبھی انسان کو وہ مقاصد حاصل نہ ہو سکے جن کے لئے ایک ضابطہ حیات مرتب کیا جاتا اور اس پر عمل کیا جاتا ہے جب کہ اللہ رب العزت جل مجدہ نے اپنے فضل وکرم سے ہر دور میں اپنے نبیوں اور رسولوں کو مبعوث فرمایا جو انسان کے لئے اس کے خالق کے عطا کردہ اصول زندگی لے کر آئے، پس جن خوش نصیبوں نے انبیاء کے پیغام ہدایت کو قبول کیا اور ان کی اتباع وپیروی کی وہ کامیاب وکامران ہوئے انہیں پُرسکون زندگی میسر آئی، انہیں عزت و وقار نصیب ہوا، گویا اللہ کا عطا کردہ دین ہر دور میں کامیابی وکامرانی کا ضامن رہا ہے جبکہ انسان کا اپنا وضع کردہ قانون ہمیشہ ناکام رہا ہے، ماضی میں بھی ناکام رہا، حال میں بھی ناکام ہے اور مستقبل میں بھی ناکام ہی رہے گا۔

اللہ کے عطا کردہ ادیانِ سابقہ، مخصوص اقوام اور امتوں کے لئے تھے اور وہ اپنے اپنے محدود دائرے کے لئے مکمل اور کافی تھے لیکن جو دین، احکامِ شرع نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے آپ ﷺ کے غلاموں کو دیئے گئے وہ وقتی نہیں مخصوص قوم کے لئے نہیں ان کا دائرہ محدود نہیں کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت عام ہے " قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا " کا اعلان قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے عام ہے لہٰذا آپ کا دین بھی عام ہے یعنی ہر دور کے انسانوں اور دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں کے لئے ہے، پس اس کے احکام اس نوعیت کے ہیں کہ کسی کے لئے، ان پر عمل کرنا، دشوار یا ناممکن نہ ہو عبادات سے متعلق احکام ہوں یا معاملات سے متعلق فرائض وحدود ہوں یا آداب، سب پر عمل آسان ہے کہ یہ دین " دینِ یُسر " ہے اور سب کے لئے ایک ہی جیسے احکام ہیں، ایشیاء کے لوگ ہوں، افریقہ، یورپ یا امریکہ کے اور سب ہی کی کامیابی وکامرانی ایک ہی دین کے احکام کی تعمیل پر موقوف ہے نیز یہ دین بنی نوع انسان کے جملہ فطری تقاضوں اور ضروریات کو پورا کرتا ہے لہٰذا اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ کے ارشاد سے اس پر تکمیل کی مہر لگا دی گئی جو ایک طرف تو اس دین کی عظمت کا اعلان ہے اور دوسری طرف اس کی حفاظت کا کہ اہل ایمان کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ وہ کسی ناقص دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر رہے جس کی وجہ سے انہیں اپنی کامیابی وکامرانی کے حصول میں کوئی شک وشبہ ہو بلکہ وہ ایک کامل دین کے پیروکار ہیں لہٰذا انہیں یقینِ کامل ہے کہ وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں ناکام ونامراد نہیں ہو سکتے، نیز اہل ایمان کے لئے یہ حقیقت باعث اطمینان ومسرت ہے کہ وہ جس دور میں ہیں اور جس مقام پر بھی سکونت پذیر ہیں ان کے لئے ان کا دین نیا نہیں وہی دین ہے جو ان کے اسلاف کا تھا، جو چودہ سو قبل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا، وہی دین بحفاظت نسل در نسل چلا آرہا ہے اب اس پر عمل تجربہ نہیں بلکہ کامیابی کی یقینی ضمانت ہے اہل ایمان مطمئن ہیں کہ اللہ نے اس دین کو مکمل کر دیا ہے۔ نہ ماضی میں اس میں کوئی تحریف ہوئی اور نہ ہی مستقبل میں اس میں کسی ردّ وبدل کا امکان ہے۔

اگر کسی دور میں دین میں تحریف کی کوشش کی بھی گئی، نبی کے غلاموں نے محرِّفین کی ایسی سرکوبی کی کہ ہمیشہ کے لئے فتنہ تحریف ختم ہو گیا، جس کی پہلی نظیر خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عمل میں ملتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد دین میں تحریف کی پہلی مرتبہ کوشش کی گئی تھی کہ بعض نو مسلم قبائل عرب نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا خلیفۃ الرسول نے انہیں مرتد قرار دیا اور صحابہ کرام کی مخالفت کے باوجود آپ نے منکرین زکوٰۃ سے جہاد کا حکم دیا تا کہ قیامت تک کوئی اس دین کامل کے کسی رکن کے انکار یا اس میں تحریف کی جرأت نہ کر سکے۔

بہر حال ہم خوش نصیب ہیں کہ دین کامل پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے وارث ہیں ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اپنے ان اسلاف، ان محسنوں کے شکر گزار رہیں، ان کو ہمیشہ خراج عقیدت و محبت پیش کرتے رہیں جنہوں نے ہر قسم کے مصائب و آلام کا مقابلہ کیا، بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکرائے، اس دین کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن دین پر آنچ تک نہ آنے دی انہوں نے جیسا اپنے بزرگوں سے لیا ویسا ہی ہمیں دے گئے، اللہ ان پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور ہم پر ان کے فیوض و برکات جاری فرمائے، نیز ہمیں انہی کی طرح دین پر عمل اور اس کی حفاظت کی ہمت و توفیق نصیب فرمائے آمین۔

کمال دین کا تقاضا ہے کہ ہم اسے ہر دور اور ہر مقام کے لئے قابل عمل سمجھیں اور اس پر عمل کو اپنے لئے فخر جانیں، ذریعہ عظمت و نجات جانیں، دشمنوں کی نقالی، ان کے در کے بھکاری بن کر اپنی عزت کو پامال نہ کریں، اس دین کامل کے نصیب ہو جانے کے بعد اہل ایمان کو نہ تو غیروں کے اصول زندگی اپنانے کی ضرورت باقی رہی اور نہ ہی خود اپنے لئے کوئی قانون یا دستور وضع کرنے کی احتیاج رہی۔ لیکن افسوس ہم نے اپنے آپ کو ایسے جھمیلوں میں پھنسا لیا، ایسی تکالیف میں مبتلا کر لیا، ایسی الجھنوں میں مبتلا کر لیا جس کے نہ ہم مکلّف تھے نہ اس کی ضرورت تھی۔ آج ہم جمہوری اور اشتراکی دساتیر سے خوشہ چینی میں مصروف ہیں، کبھی امریکی قانون کی نقالی کرتے ہیں تو کبھی برطانوی قانون کی، جب کہ ہمارے لئے قرآنی قانون پہلے ہی موجود ہے، ہم اپنے ممالک کے لئے دستور مرتب کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں، ہمارے قیمتی سرمایہ کا بیشتر حصہ دستور ساز اداروں کی نظر ہو رہا ہے لیکن اللہ اور اس کے رسول کے عطا کردہ دینِ کامل کو ہم نے غلافوں اور الماریوں میں بند کر رکھا ہے۔ انجام سامنے ہے کہ لاکھ کوششوں کے باوجود ہمیں سکون میسر نہیں، امن حاصل نہیں، ہماری عزت کو گھن لگ رہا ہے، ذلت و خواری، ضلالت و گمراہی کی راہوں میں ہم بھٹک رہے ہیں، تمام مسلم ممالک سیاسی انتشار و افتراق، معاشی بدحالی، معاشرتی تنزل کا شکار ہیں، صرف اس لئے کہ جو دینِ کامل ہماری فلاح و بہبود کا ضامن ہے، اسے ہم نے پس پشت ڈال دیا ہے:

محروم رہا دولت دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں، ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

یقین پیدا کر اے ناداں!یقین سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اتمامِ نعمت

اللہ ربُ العزت جل مجدہ نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا'' وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا '' اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔ یہ دعویٰ قرآن ہے جو برحق ہے۔ان بیشمار نعمتوں میں، اللہ کی عظیم نعمت، انسان کی ہدایت ورہبری کے لئے دین کا عطیہ اوراس کی تعلیم کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت ہے کہ اسی کے ذریعہ، انسانی اقدار کا پتہ چلا، زندگی کے اصول وضوابط ملے، خالق کی معرفت، مخلوق سے محبت کے طریقے نصیب ہوئے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تعلیم ملی، تہذیب وتمدن کا تعارف ہوا، حکومت، تجارت، سیاست کے اصول ملے، شرف انسانیت کے تحفظ اور بقاء کی ضمانت ملی، معراج انسانی کی راہ نظر آئی حتیٰ کہ اس نعمت کے ذریعہ روزمرہ کی زندگی کے اصول ملے کھانے، پینے، سونے، جاگنے، اٹھنے، بیٹھنے، ملنے جلنے، گفتگو کرنے تک کا سلیقہ حاصل ہوا، یہ نعمت وہ نعمت عظمیٰ ہے کہ اگر اللہ انسان کو اُس سے محروم رکھتا تو انسان، انسانی جسم، شکل وصورت کے باوجود، ذلیل وخوار ہوتا، جانوروں سے بدتر ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے اس نعمت کو نہ اپنایا، اس سے قصداً منہ موڑ لیا قرآن نے انہیں باوجود انسان ہونے کے جانوروں سے بدتر قرار دیا۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (اعراف:۱۷۹)

اور بیشک ہم نے پیدا کیے جہنم کے لئے بہت سے جن اور انسان، ان کے دل تو ہیں لیکن وہ (حق کو) سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ (حق کو) دیکھتے نہیں اوران کے کان تو ہیں لیکن وہ (حق کو) سنتے نہیں، وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، یہی لوگ تو غافل وبے خبر ہیں۔

غور فرمایا آپ نے یہ اشرفُ المخلوقات، آخرت میں جہنم کا ایندھن بنا اور دنیا میں جانوروں سے بدتر قرار پایا، صرف اس لئے کہ اس نے اپنے قلب، آنکھوں اور کانوں کو اللہ کی عظیم نعمت سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے استعمال نہ کیا بس وہ کھانے، پینے، خواہشات کی تکمیل میں مست رہا اور اپنی اصل ذمہ داری سے غافل وبے خبر رہا، پس اس کا جسم، شکل وصورت، انسانوں جیسی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے، نہ دنیا میں اس کی کوئی قدر وقیمت رہی اور نہ اللہ کے دربار میں اس کا کوئی مقام رہا، سورۂ فرقان میں انہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا:

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (الفرقان:۴۴)

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، نہیں ہیں یہ مگر جانوروں کی طرح

بلکہ یہ تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

''خودکردہ راچہ علاج'' انسان اشرفُ المخلوقات تھا، اللہ کا پیارا، اللہ کا محبوب تھا، بڑی قدر ومنزلت والا تھا، خالق نے اسی کی خاطر ومدارات کے لئے آسمان سجایا، زمین کو بچھایا، اس حسین کائنات کو پیدا فرمایا، اپنی نورانی مخلوق ملائکہ تک کو اس کی چاکری میں دیدیا اور اس پر سب سے بڑا کرم یہ کیا کہ دین عطا فرمایا، معلّمینِ دین حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا لیکن اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، اللہ کی اس عظیم نعمت کی قدر نہ کی، اسے پس پشت ڈال دیا، پس یہ کچھ نہ رہا، چوپایوں سے بدتر ہو گیا، جہنم اس کا ٹھکانہ بن گیا، قدر دانوں اور ناقدروں دونوں کے انجام کو ایک ہی آیت میں دیکھ لیجئے، فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ (محمد: ۱۲)

بیشک اللہ داخل فرمائے گا انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، باغات میں، رواں ہیں جن کے نیچے نہریں، اور جنہوں نے کفر کیا وہ تو عیش اڑا رہے ہیں اور کھاتے پیتے رہتے ہیں ڈنگروں کی طرح (ان میں انسانیت کا نام کی کوئی چیز نہیں) حالانکہ جہنم کی آگ ان کا ٹھکانہ ہے۔

پس وہ انسان بڑا ہی خوش نصیب ہے جس نے دین کی قدر کی، اسے اپنایا، اس پر عمل کیا، بالخصوص نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تو بڑے ہی مقدر والے ہیں کہ اللہ نے اپنی اس نعمت عظمٰی کا اِتمام ان پر فرمایا، ''**اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ** ''اس امت کا بڑا اعزاز ہے اسی کے سبب یہ امت، ''**خَیْرُ الْاُمَمْ**'' قرار دی گئی، تمام امتوں سے افضل واعلیٰ ہونا، ہم غلاموں کے لئے کتنا بڑا منصب ہے، اس پر ربِّ کریم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے، ہماری تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ہم نے اللہ کی اس نعمت کی قدر کی تو ہم قدر والے ہوئے اور جب ہم نے اس کی ناقدری کی تو ہم بے قدرے ہو گئے۔

اتمامِ نعمت کا مفہوم

یہ ہے کہ ہمیں اصول زندگی پر مشتمل جو کتاب عطا فرمائی، وہ ہر اعتبار سے تمام ومکمل ہے اور اس کی تشریح وتفصیل اور تعلیم کے اعتبار سے ہم میں جس نبی معظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا، وہ بھی ہر اعتبار سے تمام ومکمل ہے، پس اب قیامت تک نہ کسی کتاب کے نزول کی ضرورت باقی رہی اور نہ ہی کسی نبی کی بعثت کی گنجائش رہی، پس اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر اپنی نعمت عظمٰی کو تمام فرمایا، ہمیں وہ قرآن دیا جو کامل ومکمل ہے کہ اس کی ظاہری عبارت میں ایسی لذت رکھی کہ اس کے سننے یا پڑھنے سے کبھی دل نہیں اکتاتا اور یہ یقین مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ ''**لَا رَیْبَ فِیْهِ**'' اس حقیقت میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس کا ہر حرف منجانب اللہ ہے، اس کے مفہوم ومعانی پر غور کیا جائے تو اس کے احکام، انسان کی فطرت وضرورت کے عین مطابق ہیں، اس کے دلائل، لاجواب ہیں، اس کے شواہد واضح اور ظاہر ہیں، اس کے قوانین قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کی ضرورت کے لئے کافی ہیں، اس کے بیان کردہ واقعات عبرت ونصیحت کا ذریعہ ہیں، اس کی بیان کردہ امثال سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے، یہ علم کا ایسا گہرا سمندر ہے کہ اس کی تہ کو سوائے صاحب قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کوئی نہ پہنچ سکا اور نہ پہنچ سکتا ہے۔ تاہم جس نے بھی غوطہ لگایا، کچھ نہ کچھ پایا، اس کے نزول کا مقصد یہی ہے کہ ہم

اس کی قدر کریں، اپنی زندگی کو اس کے ذریعہ سدھاریں۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ

(البقرۃ:۲۳۱)

اور یاد رکھو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت، وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے۔

تمہیں یہ کتاب اسی لئے دی گئی ہے کہ تم اس سے نصیحت حاصل کرتے رہو، اس سے رہبری ورہنمائی حاصل کرو۔

بہر حال قرآن ہر اعتبار سے جامع، کامل ومکمل ہے لہٰذا اس کے نزول پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے نزول کی نعمت کو تمام فرمادیا، یہ اللہ کی آخری کتاب قرار پایا، جس کا متقضیٰ تھا کہ یہ ہمیشہ اپنی اصل حالت میں رہے کسی کو اس میں ردوبدل کی مجال نہ ہو، پس اس کے نازل فرمانے والے رب نے خود ہی اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ① (الحجر:۹)

بیشک ہم نے اتارا ہے قرآن کو اور بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

الحمدللہ، اللہ کی یہ نعمت تامہ، آج تک ہمارے پاس اپنی اصل حالت میں موجود ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گی، یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم اس کے وارث اور امین ہیں اس کا یہ حق ہے کہ ہم اس کو اپنائیں، اپنی زندگی اس کے مطابق گزاریں، ہم یہ حق ادا کررہے ہیں یا نہیں، اس کا ثبوت حالات سے حاصل کیجئے، اپنے اطوار وکردار سے حاصل کیجئے، اور خود فیصلہ کرلیجئے۔

نعمتِ نبوت

نیز اللہ کی نعمت تمام ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کتاب کی تعلیم وتبلیغ کے لئے اور اس کے احکام کے مطابق ہماری زندگی کو سنوارنے کے لئے جو نبی ہم میں مبعوث ہوا، وہ ہر اعتبار سے اتنا کامل ومکمل ہے کہ اس کے بعد انسان پر نعمت نبوت کو جاری رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی، پس اس نبی کی بعثت کے ساتھ اللہ کی یہ نعمت اپنی انتہا، اپنے تمام وکمال کو پہنچی اور یہ نبی کامل قیامت تک آنے والے انسانوں کا رہبر ورہنما قرار پایا، بنی نوع انسان کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑩ (النساء:۱۷۰)

اے لوگو! تحقیق آگیا ہے تمہارے پاس رسول حق کے ساتھ، تمہارے رب کی طرف سے، پس تم ایمان لاؤ یہی بہتر ہے تمہارے لئے اور اگر تم انکار کرو تو (سمجھ لو) کہ بیشک جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اللہ ہی کا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

یہی اعلان مزید تاکید کے ساتھ زبان رسالت سے کرایا گیا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ
يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (اعراف:۱۵۸)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام!) آپ فرمائیے، اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف، وہ اللہ جس کے لئے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی نہیں کوئی معبود سوائے اس کے وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے، جو خود ایمان لایا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر اور تم پیروی کرو اسی کی تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔

نبی انسان کی رہبری و راہنمائی کے لئے تشریف لاتا ہے، اب ایسا نبی مبعوث ہو چکا ہے جو قیامت تک کے انسانوں کا رہبر و راہنما ہے لہٰذا انسان پر نعمتِ نبوت کا اتمام ہوا، اب کسی نبی کی ضرورت باقی نہ رہی، پس یہ نبی خاتم الانبیاء قرار پایا، قیامت تک اسی کا عطا کردہ قانون نافذ رہے گا، وہی ناجی ہوگا جو اس کے دامن سے وابستہ ہوگا، جو اس کا تابعدار ہوگا وہی اللہ کا اطاعت گزار ہوگا، جس سے یہ راضی ہوگا، اسی سے اللہ راضی ہوگا، جس پر اس کی نظر کرم ہوگی، اسی پر اللہ کی رحمت سایہ فگن ہوگی، جس کے لئے یہ طلب مغفرت کرے گا اسی کو اللہ کی طرف سے مژدہ مغفرت ملے گا، جس کی یہ شفاعت کرے گا، اسی کو اللہ جہنم کی آگ سے آزاد کرے گا، اسی نبی معظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دامن سے، انسان کے سارے مراتب وابستہ ہیں، ان کا کلمہ پڑھنے والے ''خیر امم'' بنے، ان کی اتباع و پیروی کرنے والوں کو ''لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ'' کی ضمانت دی گئی، ان کے اشارۂ آبرو پر جان کی بازی لگا دینے والے، حیات جاودانی پاتے ہیں، ان کے دین کے خدام، ان کی وراثت کے حقدار قرار دیئے گئے، ان کے صحبت یافتہ اور جمالِ حسن آرا کا نظارہ کرنے والوں سے اللہ نے اپنی رضا کا اعلان فرمایا، انہیں مقامِ نبوت کے بعد انسانیت کا اعلیٰ ترین اعزاز بخشا گیا۔

ختم نبوت

نعمت نبوت کے اتمام کا مقتضیٰ یہی ہے کہ یہ نبی آخری نبی قرار پائیں، ان پر سلسلہ نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے، یہ وہ آخری اینٹ ہوں جس سے عمارت نبوت مکمل ہو جائے لہٰذا واضح اعلان فرمایا گیا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (احزاب:۴۰)

نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے باپ، تمہارے مردوں میں سے بلکہ وہ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ وصف ''ختم نبوت'' باتفاق امت، دین کے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے، جس کا منکر مرتد، واجب القتل ہے، جس کی نظیر، خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قائم فرمائی کہ آپ نے مسیلمہ کذاب اور اس کے ماننے والے مرتدین کا قتل عام کرایا تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناموسِ رسالت محفوظ ہو جائے۔

حضور علیہ السلام کا علم غیر متناہی

نعمت نبوت کے اتمام کا مقتضیٰ یہ بھی ہے کہ اس نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا علم عطا فرمایا جائے جو قیامت تک پیش آنے والے حالات و واقعات کا احاطہ کرے تا کہ یہ نبی امی اپنے غلاموں کو ایسے احکام وقوانین دے سکے جو ہر قسم کے حالات میں قابل عمل ہوں، پس اللہ عالم الغیب والشھادہ نے اس عظیم نبی کو اپنے خزانہ علم سے بلا واسطہ دولت علم سے نوازا اور خوب دیا، اتنا دیا کہ اس نے سارے عالم کو اپنے علم کے نور سے منور کر دیا اور کوئی علم والا، اس کے علم کی تہ کو نہ پا سکا نہ پا سکتا ہے، اتنا دیا کہ اس کی طرف عدم علم کی نسبت تک ممکن نہ رہی، درج ذیل آیت میں غور فرمایئے:

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ (النساء:۱۱۳)

اور اتاری ہے، اللہ نے آپ ﷺ پر کتاب اور حکمت اور سکھا دیا آپ ﷺ کو، جو کچھ بھی آپ ﷺ نہ جانتے تھے اور اللہ کا آپ ﷺ پر، بڑا فضل ہے۔

''وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' کے اعلانِ الٰہی کے بعد کون ہے جو اس تلمیذ رحمٰن کے وسعت علم کا اندازہ لگا سکے، کون ہے جو اس کی انتہا کو پہنچ سکے، کون ہے جو اس لامحدود علم کی تحدید کر سکے، اس علم کی وسعت کو، یا دینے والا جانتا ہے، یا لینے والا، یا سکھانے والے کو پتہ ہے، یا سیکھنے والے کو، ہمیں ہی نہیں بلکہ جبرئیل امین تک کو صرف اتنا پتہ ہے کہ ''فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى''۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اپنے اس علم وسیع کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا، ''آج میں نے اپنے رب عزوجل کی زیارت کی ہے، بڑی حسین اور پیاری صورت میں، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ہتھیلی، میرے دونوں کاندھوں کے درمیان رکھی، جس کی ٹھنڈک میں نے سینہ میں محسوس کی، ''فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ''، پھر میں نے جان لیا، جو کچھ آسمانوں میں تھا اور جو کچھ زمین میں تھا''، حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ کی شرح اشعۃ اللمعات میں، اس حدیث کے ذیل میں فرمایا،''پس دانستم ہر چہ در آسمانہا و ہر چہ در زمینہا بود، عبارتست از حصول تمامہ علوم جزوی وکلی واحاطہ آن''، یعنی پس جو چیز آسمانوں میں تھی اسے بھی میں نے جان لیا اور جو چیز زمین میں تھی اسے بھی میں نے جان لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام علوم جزوی وکلی مجھے حاصل ہو گئے اور میں نے ان کا احاطہ کر لیا'' علامہ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات جو آسمانوں میں تھی بلکہ ان کے اوپر بھی جو کچھ تھا اور جو کائنات، سات زمینوں میں تھی بلکہ ان کے نیچے بھی جو کچھ تھا، وہ میں نے جان لیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی تھی اور اسے آپ پر منکشف کیا تھا اور مجھ پر اللہ نے غیب کے دروازے کھول دیئے ہیں۔''

حضرت ابوزید عمرو بن اخطب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دن'' حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز فجر پڑھائی پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہمیں خطبہ ارشاد فرماتے رہے یہاں تک کہ نماز ظہر کا وقت ہو گیا، آپ ﷺ منبر سے اترے، نماز ظہر پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور خطبہ جاری فرمایا، یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا، آپ ﷺ منبر سے

اترے اور عصر کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر جلوہ افروز ہوکر خطبہ دینے لگے، حتیٰ کہ سورج غروب ہونے لگا،'' فَاَخْبَرَنَا بِمَا كَانَ وَ بِمَا هُوَ كَائِنٌ فَاَعْلَمُنَا اَحْفَظُنَا '' اس طویلِ خطبہ میں (جو صبح سے شام تک جاری رہا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں (ماکان) جو کچھ گزر چکا، کی بھی خبر دی اور (ماھو کائن) جو کچھ ہونے والا ہے، اس کی بھی خبر دی'' پس ہم میں سے بڑا عالم وہ ہے جسے یہ خطبہ زیادہ یاد ہے۔ (مسلم شریف)

اس حدیث شریف سے اندازہ لگائیے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت خطابت کا، کتنا طویل خطبہ ہوگا، یہ اور کیا کچھ اس میں بیان نہ کیا گیا ہوگا، یہ اسی کے بس کی بات ہے جس کو اللہ رب العزت نے دولتِ علم سے مالا مال کیا اور اس نے اسی نورِ علم سے اپنے غلاموں کے قلوب کو منور و روشن کردیا، جس پر قرآن گواہ ہے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۵۱)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول، تم میں سے، پڑھ کر سناتا ہے تمہیں، ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت، اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہ تھے۔

تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے انسان کو ایسی بیشمار چیزوں سے متعارف کرایا جن کو اس سے پہلے انسان جانتا ہی نہ تھا اور ایسی بیشمار چیزوں کی خبریں دیں جن کو انسان بعد میں جانے گا، بہر حال اللہ رب العزت جل مجدہ نے، اتمام نعمت کا یہ متقضیٰ پورا فرمایا کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو علم اولین و آخرین، ماکان و ما یکون سے نوازا تاکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے آپ ﷺ کی تعلیم مفید ہوسکے اور آپ ﷺ کے عطا کردہ قوانینِ حیات قابلِ عمل بن سکیں، پس حضرت علامہ امام بوصیری رحمتہ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق ہمارا ایمان ہے:

وَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

اے نبی رحمت! دنیا و آخرت آپ ﷺ ہی کی سخاوت سے ہے اور لوح و قلم کا علم آپ ﷺ ہی کے علم بیکراں کا ایک حصہ ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وہ دہن جس کی ہر بات وحی خدا
چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام
وہ زباں جس کو سب کُن کی کنجی کہیں
اس کی نافذ حکومت پہ لاکھوں سلام

حفاظتِ دین

نیز اتمامِ نعمت کا متقضیٰ تھا کہ قیامت تک آپ ﷺ کی تعلیمات کو باقی و ساری رکھا جائے، پس اللہ رب العزت

نے اپنے فضل وکرم سے اس تقاضے کو بھی پورا فرمایا کہ قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ خود لیا اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت واشاعت اور تبلیغ کے لئے وارثینِ علم نبوی کا ایسا سلسلہ جاری فرمایا جو تواتر کے ساتھ آج تک موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا، ان نفوسِ قدسیہ کو، اللہ نے اپنے نبی کی رفعتِ ذکر کی ذمہ داری سونپی، جسے پورا کرنے کا ان حضرات نے حق ادا کیا، ان نفوسِ قدسیہ نے وقت کے ظالموں اور جابروں کے مظالم سہے، استقلال واستقامت کے ساتھ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا، لیکن اللہ کے دین پر آنچ نہ آنے دی، تاریخِ صحابہ کا مطالعہ کیجئے کہ ان حضرات نے دین کی بقاء کے لئے کیسی کیسی مشقتیں برداشت کیں، میدان کربلا میں چمنستانِ نبوت کی پامالی پر غور کیجئے کہ صرف دین کی حفاظت کے لئے، کیسے کیسے مظالم سے دوچار ہونا پڑا، تابعین اور تبع تابعین کے حالات پر نظر ڈالئے کہ ان حضرات نے کیسی کیسی قربانیاں دے کر دین کی حفاظت کی، اسلاف کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دین کی تبلیغ واشاعت کا کام کسی دور میں آسان نہ رہا، لیکن اللہ کو اس دین کی حفاظت مقصود ہے، لہٰذا جنہیں وہ وارثِ انبیاء بناتا اور ان کے سپرد خدمت دین کی ذمہ داری فرماتا ہے، انہیں ایسی قوت برداشت اور ہمت بھی عطا فرمادیتا ہے جس سے وہ ہر قسم کی اذیتوں اور تکالیف کے باوجود اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے یہ حضرات آگے بڑھتے رہتے ہیں اور جانے والے، آنے والوں کو اس ذمہ داری کا وارث بناتے رہتے ہیں، یہی ہوتا رہا، یہی ہوتا رہے گا، دین باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا، اتمامِ نعمت ہو چکا اور اس نعمتِ تامہ کی حفاظت قیامت تک ہوتی رہے گی، فالحمد للہ رب العالمین۔

رضا بالاسلام

اہل ایمان کے لئے یہ ایمان افروز مژدہ ہے کہ "رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" یعنی اطاعت وفرمانبرداری کے جس ضابطہ کی پابندی کا انہوں نے رب سے وعدہ کیا ہے، وہ رب نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے، یا رب کریم اس ضابطہ، اس قانونِ حیات کو اختیار کرنے والوں سے راضی وخوش ہے گویا انہوں نے دین اسلام اختیار کرکے اپنی منزل کو پا لیا، کہ صرف یہی دین انسان کی کامیابی وکامرانی کا ضامن ہے، اس سے روگردانی کرنے والا نہایت ہی احمق ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ (البقرہ: ۱۳۰)

اور کون روگردانی کرسکتا ہے دین ابراہیم سے، بجز اس کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنا دیا ہو۔

یہی دین ہے، جس کی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اولاد کو ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ (البقرہ: ۱۳۲)

اور وصیت کی اس دین کی ابراہیم ویعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو اے میرے بچو! بیشک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین، سو ہرگز نہ مرنا، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

یہی دین ہے، جس کو بلا جبر واکراہ اختیار کر لینے والا، ایسے مضبوط حلقہ سے منسلک ہو جاتا ہے جو کبھی منقطع ہونے والا اور ٹوٹنے والا نہیں۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ۫ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ
بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝
(البقرہ:۲۵۶)

کوئی جبر نہیں دین میں، بے شک خوب واضح ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے، تو جو انکار کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ، تو اس نے پکڑ لیا، مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

یہی دین، اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹)

بیشک دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

یہی دین ہے، جس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کرنا، نہایت ہی حماقت ہے۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَیْهِ
یُرْجَعُوْنَ ۝ (آل عمران:۸۳)

کیا وہ اللہ کے دین کے سوا، (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں حالانکہ اسی کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے یا مجبوری سے، اور اسی کی طرف وہ سب لوٹائے جائیں گے۔

یہی دین ہے، جس کی صداقت وحقانیت، روشن و واضح دلائل سے ثابت ہے۔

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف:۴۰)

یہی دین قیم ہے لیکن بہت لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یہی دین ہے، جس کی تاریخ بڑی ہی قدیم ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَ مَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ
وَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ (شوریٰ:۱۳)

اس نے مقرر فرمایا تمہارے لئے وہی دین، جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو، اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ ﷺ کی طرف اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

یہی وہ دین ہے، جسے سارے ادیان پر غالب کرنے کے لئے، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى
بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝ (فتح:۲۸)

وہ (اللہ) ہی ہے جس نے بھیجا ہے، اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر، تا کہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اور (رسول کی صداقت پر) اللہ کی گواہی کافی ہے۔

یہی دین ہے، جس کے لئے حکم دیا گیا:

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ (المومن: ۱۴)

پس عبادت کرو اللہ کی، خالص کرتے ہوئے اس کے لئے دین کو، اگرچہ ناپسند کریں کافر۔

اے ایمان والو! یہی دین ہے، جسے میں نے تمہارے لئے پسند فرمایا ہے، پس اگر تم میرے پسندیدہ اور محبوب بندے بننا چاہتے ہو تو اس دین کامل کو اختیار کرو، اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرو، نیز اس کی اشاعت و تبلیغ کو اپنی اہم ذمہ داری جانو تا کہ تمہارے بعد آنے والی نسلیں اس کی وارث بنیں، جیسے تمہیں تمہارے اسلاف نے اس کا وارث بنایا۔

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ میں تین خوشخبریاں جمع ہیں، جو بلاشبہ اہل ایمان پر اللہ کا عظیم انعام ہے، اور ان کے لئے نہایت بلند اعزاز بھی، اسی لئے اس کے نزول کے لئے ایک نہایت ہی اہم موقع کا انتخاب فرمایا، دس ہجری ہے رحمت باری کے نزول کا خاص دن ''عرفہ، نو ذی الحجہ'' ہے، جمعہ کا بھی مبارک دن ہے، مبارک ساعت، عصر کے بعد کا وقت، مقام جبلِ رحمت ہے، جو عرفہ کے دن اللہ کی طرف سے نزول رحمت کا خاص مقام ہے، تقریباً ڈیڑھ لاکھ غلامانِ مصطفیٰ، پہلی اور آخری مرتبہ، اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، حج کے اہم ترین رکن وقوفِ عرفات میں مصروف ہیں، خوشی و مسرت کے ایسے عظیم موقع پر بندوں کو معبود حقیقی کی جانب سے کچھ نہ کچھ انعام ملنا ہی چاہئے تھا، پس اس کریم رب نے اپنے محتاج بندوں کو نوازا، انعام دیا اور ایسا انعام دیا جو صرف اس بارگاہ میں حاضر بندوں ہی کے لئے خاص نہ تھا، بلکہ قیامت تک آنے والوں کے لئے، مژدہ و خوشخبری بنا، باعث عظمت و رفعت ہوا، جس سے جملہ انبیاء و رسل علیہم السلام پر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت و سیادت پر مہرِ تصدیق ثبت فرمادی گئی اور آپ ﷺ کے صدقہ سے، امم سابقہ کے مقابلہ میں، اس امتِ مرحومہ کی خصوصی امتیازی شان کا واضح اعلان فرمایا گیا، پس اس نعمت الٰہیہ پر، رب کریم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔

ایک مرتبہ چند علمائے یہود امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں حاضر تھے، دورانِ گفتگو کہنے لگے کہ آپ کے قرآن میں ایک ایسی آیت موجود ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو ہم اس کے نزول کے دن کو اپنا سالانہ تہوار، عید کا دن مقرر کر لیتے، آپ نے پوچھا تم کس آیت کو اتنا اہم سمجھتے ہو، انہوں نے یہی آیت، ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا،'' ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس دن اور کہاں نازل ہوئی''، یعنی اللہ جل مجدہ نے تو پہلے ہی اس آیت کے نزول کے لئے سید الایام، جمعہ، یومِ نزولِ رحمت، عرفہ اور وقتِ قبولیت دعا، بعد عصر اور مقام مغفرت، عرفات کا انتخاب فرمایا، اب ہمیں اس آیت کے نزول پر جشن منانے کے لئے کسی دوسرے دن کو مقرر کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس جواب سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ واقعی یہ آیت مبارکہ، اللہ کا عظیم انعام ہے، جس

کے لئے اللہ نے خود عظیم موقع کا انتخاب فرمایا، نیز اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے لئے، کسی دن کا تعین اور اس پر شرعی طریقہ کے مطابق جشن منانا، اظہار مسرت کرنا، سنت الٰہیہ ہے، اللہ کو مطلوب اور پسند ہے، پس یہ تائید ہے، ہمارے ان اعمال کی جو اسلاف سے جاری ہیں، جن پر عمل کرنا، ہم باعثِ ثواب یقین کرتے ہیں، مثلاً عید میلاد النبی منانا، اولیاء کرام کا عرس کرنا، یہ تمام اعمال وہ بدعت حسنہ ہیں جن کا اجر و ثواب، کرنے والوں کو بھی ملتا ہے اور جاری کرنے والوں کو بھی قیامت تک ملتا رہے گا، جیسا کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کے راوی حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں:

مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهَا وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ

جو اسلام میں کسی اچھے طریقہ کو رائج کرے گا تو اسے رائج کرنے کا ثواب بھی ملے گا اور ان لوگوں کے عمل کرنے کا بھی جو اس کے بعد اس طریقے پر عمل کرتے رہیں گے، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی ہو اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس پر، اس کے رائج کرنے کا بھی گناہ ہوگا اور ان لوگوں کے عمل کا بھی گناہ ہوگا جو اس کے بعد عمل کرتے رہے، بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی ہو۔ (مسلم شریف)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حلال و حرام کا اختیار

آیات مذکورہ میں سے تیسری آیت پر توجہ کیجئے، جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحابہ کرام کے ایک سوال کا جواب دیا جا رہا ہے تا کہ قیامت تک آنے والے مؤمنین کے دلوں میں اگر اس قسم کا کوئی شبہ پیدا ہو، تو اس آیتِ مبارکہ پر غور کر کے وہ اپنا شبہ دور کر لیں، نیز اہل ایمان کو شکاری جانوروں سے شکار کرنے سے متعلق چند احکام دیئے جا رہے ہیں، جن کو گزشتہ اوراق میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، یہاں مختصراً ان کا اعادہ کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں حرام جانوروں میں سے صرف ایک ہی جانور ''خنزیر'' کا نام لیا گیا ہے، باقی حرام جانوروں کی قسمیں بیان کر دی گئی ہیں، مثلاً مختنقہ، موقوذہ، متردیہ، نطیحہ'' وغیرہ باقی تفصیلات، شارع علیہ السلام نے بیان فرمائیں اور آپ ﷺ نے جس جانور یا جس چیز کو حرام کر دیا وہ یقیناً حرام ہے اور جس کو آپ ﷺ نے حلال قرار دیا، وہ یقیناً حلال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر: ۷)

اور رسول مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں، تو رک جاؤ۔

نیز، اللہ رب العزت نے، اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جن اختیارات سے نوازا، ان میں آپ ﷺ کو، حلال و حرام کرنے کا بھی اختیار دیا گیا ہے، فرمایا گیا:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ

الْخَبٰٓىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (اعراف: ۱۵۷)

وہ نبی حکم دیتا ہے انہیں نیکی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں، اور اتارتا ہے، ان سے، ان کا بوجھ اور (کاٹتا ہے) وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے تھیں انہیں۔

چونکہ صحابہ کرام کو یقین تھا کہ حلال وحرام کا کلی اختیار، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، لہٰذا جب قرآن کریم نے حرام جانوروں کا اعلان فرمایا تو صحابہ نے حلال جانوروں کی تفصیل سے متعلق سوال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیا کہ یا رسول اللہ حرام جانوروں کا ذکر تو قرآن کریم نے کیا، اب آپ ﷺ ہمیں حلال جانوروں کی تفصیل بتائیے، اللہ نے اپنے پیارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا کہ آپ ﷺ تمام حلال جانوروں کی فہرست بیان کرنے کی مشقت نہ فرمائیے، بلکہ غلاموں کو ایک اصولی اور بنیادی قاعدہ بتا دیجئے تاکہ انہیں ہر حلال چیز پہنچاننے میں آسانی ہو جائے، ''اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' اے غلامو! تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال ہیں، یعنی جو چیز بھی بذات خود پاکیزہ ہو، نیز پاکیزہ ذرائع سے حاصل کی گئی ہو، وہ تمہارے لئے حلال ہے۔

علاوہ ازیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے تمہارے لئے ان حلال جانوروں کا شکار بھی حلال کیا ہے، جو حرام شکاری جانوروں کے ذریعہ کیا جائے، مثلاً کتا حرام ہے، لیکن اس کا کیا ہوا شکار حلال، شکرہ حرام ہے، لیکن اس کا کیا ہوا شکار حلال کر دیا گیا، ان جانوروں سے شکار جن شرائط کے ساتھ حلال ہوگا، وہ یہ ہیں، جانور عادتاً شکاری ہو جیسے کتا، باز وغیرہ، غیر شکاری نہ ہو، جیسے بلی وغیرہ جسے شکار کے لئے نہ تو استعمال کیا جاتا ہے، نہ ہی ایسے جانوروں کو شکار کی تربیت دی جا سکتی ہے، جانور تربیت دیا ہوا ہو، جس کی پہچان یہ ہے کہ وہ مالک کے اشارے کے بغیر شکار پر نہ لپکے، نیز شکار کی طرف دوڑتے ہوئے اگر اسکو واپس آنے کا اشارہ کیا جائے تو وہ واپس آ جائے، یعنی جانور اپنی مرضی سے شکار نہ کرے، مالک کے کنٹرول میں پوری طرح ہو، جانور مسلمان کا ہو، غیر مسلم کے شکاری جانور سے شکار کرنا جائز نہیں، جانور شکار کو زخمی کر کے مارے، دبا کر یا پھینک کر نہ مارے، جانور کو شکار کی طرف بسم اللہ، اللہ اکبر، کہہ کر چھوڑا گیا ہو، جانور شکار میں سے خود نہ کھائے، اگر جانور نے شکار کیا اور وہ شکاری کے پاس پہنچنے تک زندہ ہے تو اسے بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کرنا ضروری ہے، ورنہ حلال نہ ہوگا، ان شرائط میں سے، اگر کوئی شرط نہ پائی گئی تو جانور کا کیا ہوا شکار حلال نہیں۔

اے ایمان والو! اللہ نے اپنے فضل وکرم سے تمہارے لئے بہت سے جانوروں کو حلال کیا اور تمہارے ہی فائدے کے لئے چند کو حرام کیا، پس تم حلال وحرام میں امتیاز کرو، حرام سے بچتے رہو، بہانہ سازی اور مکاری سے حرام کو حلال نہ بناؤ۔ اچھی طرح سمجھ لو، کہ ہر ہر عمل کا تم سے حساب لیا جائے گا اور اللہ بہت ہی تیز حساب لینے والا ہے، لہٰذا اللہ سے ڈرتے رہو۔

آخری آیت میں اہلِ ایمان کے لئے ''اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' کا مژدہ دیا گیا، پھر اہل کتاب کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم بیان فرمایا گیا۔

الطیبٰت

اہل ایمان کو خوشخبری دی گئی کہ ''تمہارے لئے تمام طیبات حلال ہیں'' ہم گزشتہ صفحات پر طیبات کی وضاحت کر آئے ہیں، یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے حرام جانوروں اور حرام چیزوں کی مقدار بہت ہی کم رکھی ہے، صرف وہی جانور اور وہی چیزیں ہمارے لئے حرام کی گئیں جو کسی بھی اعتبار سے ہمارے لئے مضر ہو سکتی تھیں، یا تو صحت پر ان کا برا اثر ہوتا ہے اور یا وہ اخلاق و کردار کو متاثر کرتی ہیں، اور یا ان کے حرام نہ ہونے کی صورت میں معاشی و معاشرتی نقصانات اور معاشرے میں انتشار و افتراق کا خطرہ یقینی تھا، جبکہ طیبات کا میدان نہایت وسیع ہے، بیشمار جانور اور بیشمار چیزیں یہاں میسر ہیں، اس کے باوجود کسی کا ان سے استفادہ نہ کرنا اور حرام کی طرف نظر اٹھانا، بلاوجہ اپنے آپ کو دین و دنیا کے خسارے میں مبتلا کرنا ہے۔

اہل کتاب

اہل کتاب، وہ قومیں کہلاتی ہیں جو کسی بھی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتی ہیں، یعنی یہود و نصاریٰ، جو تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہیں، قرآنی اصطلاح کے مطابق وہ اہل کتاب ہیں، اپنی کتابوں میں ان کا تحریف کر دینا، یا کتابوں کی صراحت کے برعکس، ان کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت عزیر علیہ السلام کو، اللہ کا بیٹا قرار دینا، ان کی بدعملی ہے، اس کے باوجود بھی وہ اہل کتاب ہی قرار پائیں گے، جیسا کہ قرآن کریم نے، ان کی ان بدعملیوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی انہیں اہل کتاب فرمایا ''یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ'' کہ یہ لوگ اپنی کتابوں میں تحریف کے مجرم ہیں، یا فرمایا گیا ''وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ'' کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، کتابِ الٰہی میں تحریف اور اللہ کے بندوں، بالخصوص انبیاء کرام علیہم السلام کو، اللہ کی اولاد، بیٹا قرار دینے سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کے باوجود بھی انہیں اہل کتاب ہی قرار دیا، پس ان جرائم کے بعد وہ کتنے ہی، عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ میں مبتلا ہوں، وہ اس وقت تک اہل کتاب کہلائیں گے جب تک کہ وہ اپنی کتاب کے آسمانی ہونے کا واضح انکار نہ کریں

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے کہ ان کے کسی گورنر نے انہیں خط لکھا اور بتایا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پر ایمان رکھتے ہیں، اس کو پڑھتے ہیں اور اس کے حکم کے مطابق، ہفتہ کے دن کی تعظیم بھی کرتے ہیں لیکن قیامت پر ان کا ایمان نہیں، پس ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، حضرت امیر المؤمنین نے جواب دیا کہ وہ بہرحال اہلِ کتاب ہی ہیں، ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جس کا شرع نے حکم دیا ہے۔

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اہل کتاب، ہمیشہ اسلام اور مسلمان کے دشمن رہے ہیں اور آج تک دشمن ہیں، انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا، نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور میں اسلام کے خلاف ان کی سازشیں سب سے زیادہ مخدوش رہیں، جس کے نتیجہ میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ خیبر جیسے اہم غزوات پیش آئے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زہر دینے والی عورت بھی ایک یہودیہ ہی تھی، یہ یہودی تھے جنہوں نے آپ کو دھوکے سے کئی مرتبہ

جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ انہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے دائمی ذلت وخواری کا اعلان فرمایا:

وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِؕ (البقرہ:۶۱)

اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور غربت اور مستحق ہو گئے، غضب الٰہی کے۔

اور اسی لئے اہل ایمان کو خصوصی ہدایت کی گئی ہے کہ یہود ونصاریٰ کو اپنا مددگار نہ بناؤ، ارشاد ہوا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ ؔۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۵۱) (المائدہ:۵۱)

اے ایمان والو! نہ بناؤ، یہود اور نصاریٰ کو (اپنا) دوست (مددگار) وہ تو (بس) آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے انہیں دوست بنایا، تم میں سے، تو وہ انہی میں سے ہے، بیشک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

اہل کتاب کا ذبیحہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کو دوست بنانے، ان سے مدد حاصل کرنے کی ممانعت فرمائی، جس سے واضح ہے کہ یہ قومیں، نہ کبھی مسلمانوں کی بہی خواہ ہوئی ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں، پس قابلِ غور بات یہ ہے کہ مذکورہ صورتِ حال کے باوجود، شریعتِ مطہرہ نے یہود ونصاریٰ کے ذبیحہ کو اہل ایمان کے لئے حلال قرار دیا اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی اس کی کیا وجہ ہے۔

صحابہ کرام اور تابعین سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے، مفسرین نے اس کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہود ونصاریٰ کی مسلمانوں سے کھلی عداوت اور ان کے دین میں واضح تحریفات نیز ان کی کھلم کھلا بدعملیوں اور بدکرداریوں کے باوجود، یہ حقیقت قابل تسلیم ہے کہ ان کی شریعت میں آج تک ذبیحہ اور نکاح کے مسائل وہی ہیں جو ان کی اصل کتابوں میں موجود تھے اور وہ شریعت اسلامیہ کے عین مطابق ہیں، یعنی یہود ونصاریٰ کی شریعت میں بھی وہی ذبیحہ حلال سمجھا جاتا ہے جس پر بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے ورنہ وہ اس کو مردار اور حرام قرار دیتے ہیں، یہودی تو آج تک سختی سے اس قانون پر عمل کرتے ہیں لیکن نصاریٰ، عیسائی قابل اعتماد بالکل نہ رہے کیونکہ ان کے یہاں اب حلال وحرام میں عام طور پر امتیاز ختم ہو چکا ہے، اسی طرح یہود ونصاریٰ کے یہاں مسائل نکاح بھی اب تک اپنی اصل حالت پر موجود ہیں کہ جن عورتوں کو شریعت اسلامیہ حرام قرار دیتی ہے، وہ ان کے یہاں بھی حرام ہیں، اور جن عورتوں کو ہماری شریعت نے حلال قرار دیا ہے، وہ ان کی شریعت میں بھی حلال ہیں، نیز گواہوں اور مہر وغیرہ کے مسائل بھی ان کے یہاں ہمارے ہی مسائل کے مطابق ہیں، چونکہ ان مسائل پر ان کا عمل وحی الٰہی کی تعمیل میں ہے لہٰذا ان دونوں باتوں میں ان سے تعلق باقی رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی، جبکہ دیگر اقوام میں اولاً تو یہ مسائل موجود ہی نہیں اور اگر ہیں بھی تو وحی الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے، ان پر عمل نہیں ہے کہ وہ تو کسی آسمانی کتاب پر، قطعاً ایمان ہی نہیں رکھتے، ان کی شریعت خود ساختہ ہے، یہ اتفاقی صورت ہو سکتی ہے کہ ان کی خود ساختہ شریعت کا کوئی ضابطہ، اسلامی شریعت کے مطابق ہو گیا ہو، لہٰذا اس کو اپنانے کی اجازت اہلِ ایمان کو نہیں دی جا سکتی کہ جس شریعت کی

بنیاد وحی الٰہی نہیں، وہ شریعت ہی نہیں ہے، اس کا کوئی ضابطہ چاہے کتنا ہی اچھا ہو، قابلِ عمل نہیں ہوسکتا۔

اس میں ایک حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام دین یُسر ہے، اس کا عطا کردہ ضابطہ حیات عالمگیر اور دائمی ہے، عین ممکن تھا کہ کبھی مسلمانوں کو یہود ونصاریٰ کے ممالک میں رہائش پذیر ہونا پڑتا اور وہاں انہیں سوائے ان قوموں کے ذبیحہ کے کوئی دوسرا ذبیحہ میسر نہ آتا اور سوائے ان کی عورتوں کے دوسری عورتیں نہ مل پاتیں، پس اگر ان اقوام کا ذبیحہ اور عورتیں اہلِ ایمان کے لئے حلال نہ کئے جاتے تو وہ نہ صرف دشواری میں مبتلا ہوتے بلکہ ان کے لئے گناہ میں مبتلا ہو جانا بھی ممکن تھا، پس اللہ کریم نے کرم فرمایا اور اہل ایمان کو اس دشواری سے نجات مل گئی۔

بہر حال قرآن کریم نے اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا لیکن یہ رخصت بوقت ضرورت ہے کہ اگر اہلِ ایمان کا ذبیحہ میسر ہو تو اہل کتاب کا ذبیحہ استعمال کرنے کی کیا ضرورت رہی، بالخصوص ان کی عورتوں سے نکاح کی رخصت پر عمل کرنے میں تو نہایت ہی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ اگر مسلمان عام طور پر ان عورتوں سے ان کے حسن و جمال اور ان میں جنسی کشش کی بناء پر نکاح کرنے لگے تو نہ صرف اپنی عورتوں کی حق تلفی ہوگی بلکہ مسلم گھرانوں اور پورے معاشرے کو ایک خطرہ لاحق ہوگا کہ ان عورتوں کی وجہ سے مسلم گھرانوں کے مذہبی ماحول اور بچوں کی تربیت پر ضرور اثر ہوگا۔

علاوہ ازیں اس سے خاندانوں میں انتشار وافتراق پیدا ہونا بھی ممکن ہے، ہم اور آپ ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں جو یورپ وامریکہ میں قیام کے دوران، یہودی یا عیسائی عورت کے دامِ فریب میں مبتلا ہو گئے اور آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں، سب سے پہلے تو انہیں اپنے خاندان کو خیر باد کہنا پڑا کہ اس عورت کو نہ تو ان کے والدین نے قبول کیا اور نہ ہی دیگر افرادِ خاندان نے، پھر جب ان کی اولاد جوان ہوئی تو اس میں انہیں یہودیوں یا عیسائیوں جیسی بود وباش اور اطوار نظر آئے اور اب انہیں اپنی مذہبی تہذیب بھی رخصت ہوتی نظر آنے لگی، انہی مفاسد اور خرابیوں کے باعث جمہور صحابہ وتابعین اور ہمارے اسلاف نے ان عورتوں سے نکاح کو ہمیشہ مکروہ جانا اور جہاں تک ہو سکا، اہل ایمان کو اس سے روکا اور منع فرمایا۔

غور فرمایئے کہ خلیفہ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہے جو بلاشبہ "خیرُ القرون" بہترین زمانہ تھا اور صحابہ سے یہ توقع بھی نہ تھی کہ ان عورتوں سے نکاح کے باعث وہ کسی فساد میں مبتلا ہو جائیں گے، لیکن امیر المؤمنین کی نظر بڑی ہی دور بین تھیں، جن مقاصد کا اس وقت امکان بھی نہ تھا، وہ انہیں مستقبل میں یقینی طور پر نظر آئے، لہٰذا آپ نے ہمیشہ یہودیوں یا عیسائیوں کی عورتوں سے نکاح کی شدید مخالفت فرمائی، حضرت طلحہ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہما نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کر لیا آپ کو اطلاع ملی تو آپ سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ فوراً طلاق دے دو، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جب مدائن کے گورنر مقرر ہو کر وہاں پہنچے تو انہوں نے ایک یہودیہ سے نکاح کر لیا، حضرت فاروق اعظم کو اطلاع ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ فوراً طلاق دیدو، حضرت حذیفہ نے جواباً لکھا کہ کیا یہ عورت میرے لئے حرام ہے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں خط لکھا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہوتی، اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ ان عورتوں کے ذریعہ آپ لوگوں کے گھروں میں فحاشی وبدکاری داخل ہو جائے، نیز مجھے خطرہ

ہے کہ دوسرے مسلمان آپ کی اقتداء کریں گے اور اہلِ کتاب کی عورتوں سے محض ان کے حسن و جمال کی کشش کے باعث نکاح کرنے لگیں گے، اس صورت میں مسلمان عورتیں بڑی تکلیف میں مبتلا ہو جائیں گی، پس میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط پڑھتے ہی تم اس عورت کو طلاق دیدو۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کس قدر دوربیں ہے فاروقی نظر، آپ نے اس خطرے کا احساس اس دور میں ہی کر لیا تھا، جس دور کے مسلمان آج سے کہیں زیادہ محتاط و متقی تھے اور اس دور کے اہل کتاب بھی آج کے اہل کتاب سے کئی درجہ بہتر تھے، آج ایک طرف تو ہم خود اپنے مذہبی معاملات میں کمزور ہیں، دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کی موجودہ عورتیں، جس فحاشی، عیاشی اور بدکرداری میں مبتلا ہیں وہ ایک واضح اور کھلی حقیقت ہے، ان عورتوں کو اپنے گھروں کا مالک بنا دینا خود ہی اپنی دولت چور کے سپرد کر دینے کے مترادف ہے، لہٰذا

اے ایمان والو! اللہ رب العزت جل مجدہ نے اپنے فضل و کرم سے تمہیں جو رخصت دی ہے، اس کا استعمال عام نہ کرو، اہلِ کتاب کا ذبیحہ بلاشبہ تمہارے لئے حلال ہے لیکن جب مسلمان کا ذبیحہ میسر ہو تو ضرورت نہیں کہ تم ان قوموں کی دکانوں سے گوشت خریدو، اپنے بھائی کو مالی نقصان میں مبتلا کرو اور دشمن کو مالی فائدہ پہنچاؤ، نیز اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر کے، اپنی عورتوں کی حق تلفی نہ کرو، اپنے خاندان میں انتشار و اختلاف پیدا نہ کرو، اپنی تہذیب اور تمدن کا عظیم سرمایہ نہ لٹاؤ، آباؤ اجداد کی عطا کردہ مذہبی وراثت سے اپنی نسلوں کو محروم نہ کرو، اگر تم بحالت مجبوری ان عورتوں سے نکاح کرنا ہی چاہتے ہو تو بدکاری اور عیاشی سے بچنے کے لئے، ان میں سے نیک، پاکدامن عورتوں کو تلاش کرو، جیسے مسلمان عورتوں میں سے تم نیک اور پاکدامن کو پسند کرتے ہو اور جب تم ان سے نکاح کر لو تو بھی ان سے نہایت محتاط رہو کہ کہیں وہ تمہیں اور تمہاری اولاد کو، تمہارے دین سے محروم نہ کر دیں، اگر ایسا ہوا تو یہ دنیا و آخرت کا بڑا ہی نقصان ہوگا۔

پس راقم الحروف اپنے مسلمان بھائیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنی مسلمان عورتوں سے شادی کر کے، پُرسکون زندگی بسر کریں کہ اسی طرح ان کا دین و ایمان محفوظ رہ سکتا ہے اور اسی طرح وہ اچھی اولاد کے باپ بن سکتے ہیں کہ آج کے اہل کتاب صرف بطور دعویٰ، اہل کتاب ہیں، نہ انہیں اپنے دین کا علم ہے اور نہ ہی ان میں دین کی پابندی کا کوئی رواج ہے، اللہ ان سے ہر مسلمان بھائی کو محفوظ رکھے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَاَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَقَطُّ عَيْنِيْ

وَأَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ

كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ترجمہ

میری آنکھوں نے کبھی آپ سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا،
عورتوں نے آپ سے زیادہ کوئی صاحبِ جمال نہیں جنا۔ آپ
کو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے۔
جیسے آپ اپنی مرضی کے مطابق پیدا کئے گئے ہوں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۳۱

المائدہ: ٦ تا ٧

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ
مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً
فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ
عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَ
اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (المائدہ: ٦، ٧)

اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کے لئے تو (پہلے) دھولو اپنے چہرے اور اپنے بازو کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں پر اور دھولو اپنے پاؤں ٹخنوں تک اور اگر ہو تم جنبی تو (سارا بدن) پاک کرلو اور اگر ہو تم بیمار، یا سفر پر، یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت کے بعد، یا صحبت کی ہو تم نے

عورتوں سے، پھر نہ پاؤ تم پانی، تو تیمم کرو، پاک مٹی سے یعنی مسح کرلو اپنے چہروں اور اپنے بازوؤں پر اس سے، نہیں چاہتا اللہ کہ رکھے تم پر کوئی تنگی بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ خوب پاک صاف کرے تمہیں اور پوری کردے اپنی نعمت تم پر، تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو، اور یاد رکھو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے اور اس کے وعدے کو جو اس نے پختہ لیا تھا تم سے، جب کہا تھا تم نے، ہم نے سن لیا اور مان لیا اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ خوب جاننے والا ہے، جو کچھ سینوں میں ہے۔

سورۂ مائدہ آیت نمبر ۶ بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے، ''مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلٰوةُ و مفتاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ'' نماز جنت کی کنجی ہے اور نماز کی کنجی پاکی ہے، جگہ کی پاکی، کپڑوں کی پاکی، جسم کی پاکی، شریعت مطہرہ نے، جسم کی پاکی کے تین طریقے مقرر فرمائے ہیں، اس آیت مبارکہ میں تینوں طریقے مذکور ہیں وضو، غسل، تیمم، اس آیت کا موضوع یہی عنوانات ہیں، جن پر گفتگو سے قبل چند باتیں عرض کردینا ضروری ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا اہم ترین مقصد:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقاصد بعثت میں سے اہم ترین مقصد یہ ہے کہ آپ مرضی الٰہی کے مطابق قرآن کریم کی تشریح کریں اور امت کو اس کی قولی و عملی تعلیم دیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۵۱)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں، اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں، کتاب اور حکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہ تھے۔

واضح رہے کہ رسول، امت تک صرف پیغام الٰہی منتقل ہی نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا مفسر اور شارح ہوتا ہے، وہ امت کا معلم ہوتا ہے، اسی لئے ضروری ہوا کہ رسول کو ایسے کامل علم سے نوازا جائے کہ اس کی تعلیم میں کسی قسم کی کمی باقی نہ رہے اور نہ ہی کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہے، دنیا کا کوئی معلم، رسول کی تعلیم کو چیلنج نہ کر پائے اور صرف رسول ہی کی تعلیمات پر عمل، دنیا و آخرت کی کامیابی کا ضامن ہو، ایسا علم نہ تو دنیا کے معلمین دے سکتے ہیں اور نہ ہی دنیا کی کتابوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے، لہٰذا رسول کو نہ تو کسی کا شاگرد بنایا گیا اور نہ ہی حصول تعلیم کے لئے کتابوں کا محتاج رکھا گیا، وہ ظاہر بیں نظروں کے لئے ''امی'' ہی رہا لیکن معلمِ حقیقی وحدہ لاشریک نے اسے بلا واسطہ اپنے خزانہ علم سے اتنا مالا مال کردیا کہ اس کے علم کی کوئی حد اور کوئی انتہا نہ رہی، وہ ایسا معلم بنا جو ہر چیز کو جانتا ہے، ''وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمْ'' اور آپ کو سکھا دیا جو کچھ آپ نہ جانتے تھے، اسی حقیقت کا اعلان ہے اور ایسا معلم بنا جو ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے، ''وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ'' کا ارشاد اس پر گواہ ہے، وہ ایسا معلم بنا کہ اس کی تعلیم میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی، کیونکہ ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى'' کے مطابق رسول اپنی مرضی سے کچھ نہیں سکھاتا اس کی تعلیم کا ایک ایک حرف، اللہ کی رضا کے عین

مطابق ہوتا ہے، اسی لئے اس کی تعلیمات پر عمل، رضائے الٰہی کے حصول کا یقینی اور واحد ذریعہ ہے اور اسی لئے رسول کے احکام کو اپنانے کا حکم عام جاری فرمایا گیا۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (الحشر: ۷)

اور رسول، جو تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

رسول کی صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ رسول کی ادائیں بھی شریعت مطہرہ کا حصہ ہیں، رب کریم کے احکام پر اس کے رسول کریم کی اداؤں کے مطابق عمل کرو گے تو تمہارے اعمال مقبول ہوں گے کہ رسول ہی، معلمِ شریعت ہے، وہی پیکرِ شریعت ہے، اس کا علم اور اس کا عمل، تمہاری زندگی کو سنوارنے، سدھارنے کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب: ۲۱)

بیشک تمہاری رہنمائی کے لئے، اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے (یہ نمونہ) اس کے لئے ہے، جو امید رکھتا ہو، اللہ سے ملنے اور قیامت کے آنے کی اور بکثرت اللہ کو یاد کرتا ہو۔

اسی لئے آیت زیر گفتگو میں وضو، غسل، تیمم کا اجمالی حکم دیا گیا ہے، علاوہ ازیں جملہ احکام چاہے وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات یا حدود وتعزیرات کے شعبہ سے ہوں، ان میں اجمال ہے، ان کی تفصیلی تعلیم، درسگاہِ رسول سے ہی ملتی ہے تاکہ امت کے لئے شریعت پر عمل آسان ہو، نیز غلام ہمیشہ آقا کے محتاج رہیں، انہی کو اپنا رہبرو رہنما قائد تسلیم کریں، ہر حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کے ذہن میں آقا کا تصور موجود ہو، ان کے اعمال بوسیلہ رسول مقبول ہوں، تا ابد رسول کا نام باقی رہے ان کا ذکر بلند رہے، ''وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ'' کی حکمت پوری ہوتی رہے۔

احکامِ شرع کا اصل مقصد

احکامِ شرع میں مقصود ان کی ظاہری صورت نہیں بلکہ اصل مقصود اللہ اور رسول کی رضا کے لئے تعمیل ہے مثلاً کوئی شخص بڑی اچھی طرح نماز ادا کرتا ہے، لیکن طہارت کے بغیر، اس کی نماز مردود، بیکار اور ضائع ہے کہ نماز کی صورت تو موجود ہے لیکن حکم کی تعمیل نہیں تو چونکہ مقصود تعمیل ہے، لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ تعمیل کرنے والا، ہر حکم کی حکمت اور مصلحت کو جانے کہ روزے کا فلسفہ کیا ہے، حج کا حکم کیوں دیا گیا وغیرہ وغیرہ، ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں نہیں ہوا، بندوں کو زیب نہیں دیتا، عبدیت کا کمال تو یہ ہے کہ جو حکم ملے، اس پر عمل کیا جائے، اگر حکم کی حکمت سمجھ میں آجائے تو اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو نقصِ عقل اور اس کی محدود رسائی کو تسلیم کر لیا جائے، عمل میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو کمالِ عبدیت کی ایک مثال قرار دیا جا سکتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں ایک صحابی حاضر ہوئے جو سونے کی انگوٹھی پہنے تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے اتار کر

پھینک دیا اور فرمایا ''یَعْمَدُ اَحَدُکُمْ اِلٰی جَمْرَةٍ مِّنْ نَّارٍ فَیَجْعَلُھَا فِیْ یَدِہٖ'' تم آگ کی چنگاری پسند کرتے ہو اور اسے ہاتھ میں پہنے پھرتے ہو، (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تشریف لے جانے کے بعد) لوگوں نے ان صحابی سے کہا، اپنی انگوٹھی اٹھالو اور (فروخت کر کے) اس سے فائدہ حاصل کرلو، انہوں نے جواب دیا'' وَاللّٰہِ لَا اٰخُذُہٗ اَبَدًا وَقَدْ طَرَحَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ'' قسم خدا کی میں اسے ہرگز نہ لوں گا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینک دیا، (مسلم)

غور فرمایئے، کسی صحابی نے یہ سوال نہ کیا کہ سونا مرد کے لئے کیوں حرام ہے، اس کی کیا وجہ ہے، اس میں کیا حکمت ہے، حتیٰ کہ انگوٹھی کے مالک نے دوبارہ اس کو ہاتھ تک لگانے کی جرأت نہ کی، جبکہ جائز تھا کہ وہ کسی عورت کو دے دیتے یا اس کو بیچ دیتے کہ سونا عورتوں کی زینت ہے اور نفع بخش دولت ہے جس کا کاروبار ممنوع نہیں، پس مؤمن کا کمال عبدیت یہی ہے کہ وہ شریعت کی پابندی بلا چون وچرا کرے۔

آیت زیر گفتگو میں تیمم کو وضو یا غسل کا قائم مقام قرار دیا کہ اگر شرعی عذر کی بناء پر وضو یا غسل نہ کیا جا سکے تو جس طرح طہارت ان دونوں سے حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح تیمم سے طہارت حاصل ہو جائے گی، جبکہ نہ یہاں پانی ہے، نہ وضو یا غسل جیسا طریقہ ہے، مٹی ہے، جس پر صرف دو مرتبہ ہاتھ مار کر، منہ اور بازوؤں پر پھیر لینا ہے، واقعی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عمل سے پاکی کیسے حاصل ہوگئی، سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں کہ وضو اور غسل میں نہ تو پانی، طہارت کا ذریعہ ہے اور نہ ہی ان دونوں کا طریقہ، مؤثر تو حکم کی تعمیل ہے، پس تیمم میں بھی اصل، تعمیلِ حکم ہے اور اگر شریعت پر عمل کا دارومدار سمجھنے کو قرار دیدیا گیا کہ ہر حکم سمجھ میں آنا چاہئے ورنہ قابل عمل نہیں، تب تو سوالات کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ قائم ہو جائے گا، جس کا نتیجہ شریعت پر عمل سے محرومی ہوگا، مثلاً آدمی ناپاک کیوں ہوتا ہے، ڈکار آئے تو وضو نہیں ٹوٹتا، ریح خارج ہو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، عورت سے صحبت کر لی تو غسل فرض ہو گیا، کوئی گندگی جسم پر ہو تو صرف دھو دینا کافی ہوا، غسل کی ضرورت نہیں، وضو یا غسل کے مخصوص طریقے ہی سے پاکی کیوں حاصل ہوتی ہے، اسی قسم کے بیشمار لغو سوالات ہوتے رہیں گے، حکم کی تعمیل کبھی نہ ہوگی، پس اس اُلجھن اور محرومی سے نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ مؤمن یہ ایک بات سمجھ لے کہ مقصود، احکام کی مخصوص صورت نہیں یا مخصوص طریقہ نہیں بلکہ مقصود تعمیل ہے جو بندگی کا مقتضیٰ ہے، عبدیت کی علامت ہے، اسی پر جزاء و سزا کا دارومدار ہے۔

احکام شرع میں دشواری نہیں

بلاشبہ اللہ نے انسان کو اپنی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے پیدا فرمایا اور اس پر اپنے احکام کی تعمیل کی ذمہ داری عائد فرمائی، لیکن '' لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'' (اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر جتنی اس کی طاقت ہو) کے فرمان کے مطابق اس نے اپنے کرم سے انسان کو نوازا اور اطاعت وفرمانبرداری کے احکام میں اس کی قوت وطاقت کا لحاظ فرماتے ہوئے کوئی ایسا حکم نہ دیا، جس پر عمل کرنا، اس کے لئے دشوار ہو، وہ اپنے بندوں کو واضح طور پر یقین دلاتا ہے کہ ''یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ'' اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا، دین کے جتنے احکام ہیں، اگر آپ ان پر غور کریں تو ان میں آپ کو ''یُسر'' آسانی ہی آسانی نظر آئے گی، صرف ارکان اسلام پر ہی غور کر لیجئے، نماز، کس قدر اہم عبادت ہے، کسی حال میں معاف نہیں لیکن عورت کے لئے ماہواری کے ایام میں نماز معاف کر دی گئی،

اگر یہ سہولت نہ دی جاتی تو ہر ماہ، ہر عورت کو آٹھ، دس دن کی نمازیں قضاء کرنا ہوتیں، کس قدر دشواری ہوتی، اسی طرح مریض کو، بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے کی اجازت نہ ہوتی تو کتنے اللہ کے بندے اس عظیم فریضہ کی ادائیگی سے محروم رہتے، روزہ کے مخصوص احکام کی پابندی صرف صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے، ساری رات مؤمن اپنے عمل میں معمول کے مطابق آزاد ہے، پھر حالت روزہ میں بھی غسل کرنے، سونے، کاروبار کرنے کی ممانعت نہیں، غور کیجئے اگر ان کاموں کی بھی پابندی ہوتی، تو ہم کس قدر دشواری میں مبتلا ہو جاتے، زکوٰۃ کے احکام پر غور کیجئے، صاحب نصاب ہونے یعنی ایک معقول دولت کا مالک ہو جانے کے بعد یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، وہ اس وقت جب دولت پر سال گزر جائے جو دولت آتے ہی خرچ کر دی گئی، وہ جتنی بھی آئے اور جتنی بھی خرچ کی جائے، اس پر زکوٰۃ نہیں، قیمتی پتھر کتنے ہی ہوں، مکان کتنا ہی وسیع ہو، سواریاں کتنی ہی ہوں، کپڑے وغیرہ، گھر کا ساز و سامان، سب زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں، نیز سال میں ایک مرتبہ وہ بھی صرف چالیسواں حصہ فرض ہے، اللہ اکبر، اس سے زیادہ دین میں کیا سہولت چاہئے، حج، ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض نہ کیا گیا، اور جن پر فرض ہوا، ان پر بھی زندگی میں صرف ایک مرتبہ، ان دولت مند مسلمانوں پر فرض کیا گیا جن کے پاس، فراخی سے تمام ضروریات پوری کرنے کے بعد دولت بچے، اور وہ صحت مند بھی ہوں، سوچئے اگر یہ سہولت نہ ہوتی تو اللہ کے کتنے بندے ایک اہم فریضہ کی سعادت سے محروم ہی نہ رہتے بلکہ تارکین حج کی فہرست میں شامل ہو کر، عذاب میں مبتلا ہو جاتے، اسی طرح تمام احکامِ شرع کا حال ہے، سب آسان ہیں، کہیں دشواری نہیں، اس کے باوجود بھی، ہم پانچ وقت کی نماز کو دشوار سمجھیں یا دیگر احکام پر عمل کرنا ہمارے لئے مشکل ہو تو یہ ہماری بدنصیبی ہے، ہمارے ایمان کی کمزوری ہے، دین میں دشواری ہرگز نہیں، دین تو اتنا آسان ہے کہ اس سے زیادہ آسانی کی خواہش تو دین سے بالکل آزادی ہی کی خواہش ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ نے ہمیں کیوں نہ بالکل آزاد کر دیا، کسی حکم کی تعمیل کے ہم پابند نہ ہوتے، اطاعت و فرمانبرداری کی ہم پر قطعاً کوئی ذمہ داری ہی عائد نہ کی جاتی، تو پھر عبدیت کہاں رہتی اور جب عبدیت ہی نہ رہتی تو انسانیت کہاں ہوتی، پھر تو انسان جانوروں سے بدتر ہی ہوتا، اس شرافت سے ہی محروم ہو جاتا جو عبدیت اور انسانیت ہی کے باعث نصیب ہوئی ہے۔

بہرحال تمام احکامِ شرع آسان ہیں، وضو یا غسل کی جگہ تیمم کی رخصت بھی اسی سہولت کا ایک ثمر ہے کہ طہارت کے حصول کا ذریعہ وضو یا غسل ہے لیکن جب پانی نقصان دہ ہو یا میسر ہی نہ ہو، تب بھی تم ناپاکی کے بوجھ سے نجات حاصل کر سکتے ہو تمہیں سہولت دی جاتی ہے کہ تیمم کر لو کیونکہ ''مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ'' تمہارا کریم رب تمہیں تنگی و دشواری میں مبتلا کرنا پسند نہیں فرماتا، وہ تو تعمیل حکم چاہتا ہے، جس طرح وضو یا غسل کے احکام کی تعمیل کر کے تم طہارت حاصل کر لیتے اور مطمئن ہو جاتے ہو، اسی طرح عذر شرعی کی صورت میں تیمم کر کے طہارت حاصل کر لو اور بالکل مطمئن ہو جاؤ، رضائے رب کے لئے تم نے تعمیل حکم کر لی، تیمم سے تم جتنی بھی عبادت کرو گے، مقبول ہو گی، اس کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں، اس کا وہی اجر و ثواب پاؤ گے جو وضو یا غسل کے بعد کی جانے والی عبادت کا ملتا ہے، فالحمد للہ رب العالمین۔

ان چند اہم معروضات کے بعد، اب ہم آیت کے اصل موضوعات وضو، غسل اور تیمم پر مختصر گفتگو کرتے ہیں۔

وضو

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حدثِ اصغر، یعنی چھوٹی ناپاکی سے پاک ہونے کا ذریعہ وضو کو قرار دیا ہے پیشاب، پاخانہ کرنے، ریاح خارج ہونے، یا خون بہنے سے مؤمن ناپاک ہو جاتا ہے، جسے حدثِ اصغر کہتے ہیں، نماز کی ادائیگی، قرآن کریم چھونے کے لئے حدثِ اصغر سے پاک ہونا فرض ہے، جس کا ذریعہ وضو، بذات خود ایک عبادت ہے، جس کے بہت فوائد ہیں، اس سلسلے میں نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ تَوَضَّاءَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِهٖ

جس نے وضو کیا اور اچھی طرح کیا، اس کے جسم کے تمام گناہ بہہ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے کے گناہ بھی۔ (مسلم و بخاری)

اسی حدیث کی تشریح ایک دوسری حدیث ہے، جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

جب مسلمان وضو کرتا ہے اور اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ، وہ تمام گناہ ڈھل جاتے ہیں جن کا ارتکاب اس کی آنکھوں سے ہوا تھا اور جب کہنیوں کو پانی سے دھوتا ہے تو پانی کے آخری قطرے تک وہ تمام گناہ ڈھل جاتے ہیں جن کا ارتکاب اس نے ہاتھوں سے کیا تھا اور جب پیروں کو دھوتا ہے تو پانی کے آخری قطرے تک وہ تمام گناہ ڈھل جاتے ہیں جو اس کے پیروں نے کئے تھے، اب وضو سے فارغ ہو کر وہ (صغیرہ) گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

اس سے زیادہ مفصل حدیث وہ ہے جس کے راوی، حضرت عبداللہ صنابحی رضی اللہ عنہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

جب مؤمن وضو کرتا ہے اور کلی کرتا ہے تو اس کے منہ کے گناہ ڈھل جاتے ہیں اور جب ناک میں پانی ڈالتا ہے، تو ناک کے گناہ ڈھل جاتے ہیں اور جب چہرے کو دھوتا ہے تو چہرے کے گناہ ڈھلتے ہیں، یہاں تک کہ پلکوں کے نیچے کے بھی، اور جب ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھوں کے گناہ ڈھلتے ہیں، یہاں تک کہ ناخنوں کے اندر کے بھی اور مسح کرنے سے سر کے گناہ زائل ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ کانوں کے بھی اور جب پیروں کو دھوتا ہے تو پیروں کے گناہ ڈھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے کے بھی، پھر اس کا مسجد جانا اور نماز ادا کرنا، اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہوتا ہے۔ (مالک ونسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

تَبْلُغُ الْحِلْيَةُ مِنَ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ يَبْلُغُ الْوُضُوْءُ

مؤمن کے وضو کا پانی جہاں تک پہنچتا ہے، وہاں تک وہ زیور سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

یعنی اس کے اعضائے وضو ایسے ہی چمکنے لگتے ہیں، جیسے زیور پہننے سے چمکتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اِنَّ اُمَّتِیْ یُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ یُّطِیْلَ غُرَّتَهٗ فَلْیَفْعَلْ

بیشک میری امت قیامت میں اس حال میں بلائی جائے گی کہ ان کے چہرے وضو کے اثر سے چمکتے دمکتے ہوں گے، پس تم میں سے جو چاہے کہ اس کی پیشانی چمکتی ہو تو اسے ایسا ہی کرنا چاہئے (یعنی وضو کرتے رہنا چاہئے)۔ (بخاری و مسلم)

اس ارشاد کی وضاحت کیلئے درج ذیل حدیث ملاحظہ ہو، جس کے راوی بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دن قبرستان تشریف لے گئے، اور مدفونین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، اے مسلمانوں کے گھر میں رہنے والو تم پر سلام ہو، انشاء اللہ، ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں، میری خواہش ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھوں، وہاں موجود صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا ہم آپ ﷺ کے بھائی نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا، تم میرے صحابہ ہو، میرے بھائی تو وہ مؤمنین ہیں جو مستقبل میں آئیں گے، صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ، آپ ﷺ کے جو امتی بعد میں آئیں گے آپ ﷺ انہیں کس طرح پہچانیں گے، سرکار نے فرمایا، کیا وہ شخص جس کے پاس سفید پیشانی، سینہ اور سموں والے گھوڑے ہوں، اپنے گھوڑوں کو وہ سیاہ گھوڑوں کے درمیان نہ پہچان لے گا، صحابہ نے عرض کیا، بیشک یارسول اللہ ﷺ، پس آپ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن میرے امتیوں کے اعضاء وضو چمکتے ہوں گے، جن سے میں انہیں پہچانوں گا اور میں حوض کوثر پر ان کا منتظر ہوں گا۔ (مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَاتُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَیْرِ طُهُوْرٍ وَصَدَقَةٌ مِّنْ غُلُوْلٍ

بغیر وضو نماز قبول نہیں ہوتی اور مال حرام سے صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ (مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی اس حدیث کے بھی راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ تَوَضَّاءَ عَلٰی طُهْرٍ كُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ

جس نے وضو کے باوجود وضو کیا، اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ (ترمذی)

وضو کے فوائد و اثرات میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے واضح ہیں، نماز اور قرآن کریم چھونے کے لئے وضو کرنا فرض ہے ہی، اس کے علاوہ بھی تقویٰ و پرہیزگاری کا یہ تقاضا ہے کہ مؤمن ہر وقت باوضو رہے، نیز اگرچہ ایک وضو

سے کئی نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں، لیکن افضل یہی ہے کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کیا جائے، جیسا کہ حدیث شریف میں آپ نے پڑھا کہ "جس نے وضو کے باوجود، وضو کیا اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں" لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ پہلے وضو سے نماز ادا کی جا چکی ہو، وضو کے بعد کوئی عبادت کئے بغیر وضو کرنا مکروہ ہے، اگرچہ وضو، اعضاء کو ایک ایک مرتبہ دھو لینے سے بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ احادیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے کہ آپ نے اعضاء وضو کو ایک ایک مرتبہ بھی دھویا تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ اس طرح بھی وضو ہو جاتا ہے، اور آپ نے دو، دو مرتبہ بھی اعضائے وضو کو دھویا تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ اس طرح بھی وضو ہو جاتا ہے لیکن آپ اکثر تین، تین مرتبہ اعضائے وضو دھوتے تھے، تا کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ یہی افضل واعلیٰ طریقہ ہے، جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے، راوی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضو میں ہر عمل تین بار کیا اور فرمایا:

هٰذَا وُضُوْئِیْ وَوُضُوْءِ الْاَنْبِيَاءَ قَبْلِیْ وَوُضُوْءُ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ

یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے انبیاء کا اور یہی وضو تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا۔ (مشکوٰۃ)

یعنی افضل یہی ہے کہ سوائے سر کے مسح کے، تمام اعضاء کو تین، تین مرتبہ دھویا جائے کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ایسا ہی کرتے تھے اور آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ بھی یہی تھا، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ وضو کا حکم کوئی نیا حکم نہیں بلکہ دیگر اکثر شرعی احکام کی طرح یہ بھی ماضی کی شریعتوں میں موجود تھا۔

آیت زیر گفتگو میں صرف وضو کے فرائض بیان کئے گئے، جو چار ہیں منہ دھونا، کہنیوں سمیت ہاتھ دھونا، سر کا مسح کرنا اور ٹخنوں سمیت پیر دھونا، ان چاروں فرائض کو کیسے ادا کیا جائے گا، نیز وضو کا مکمل طریقہ کیا ہوگا اور اس سے متعلق احکام کیا ہیں؟ یہ سب باتیں جاننے کے لئے درسگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری ناگزیر ہے، پس معلم کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طریقہ بھی سکھایا اور اس سے متعلق ضروری احکام بھی بیان فرمائے، جس پر ہمیشہ سے امت کا عمل ہے اور ہمیشہ رہے گا، وضو کا طریقہ معروف ہے، چھوٹی چھوٹی کتابوں میں موجود ہے، بحمد اللہ مسلمانوں کے بچوں تک کو وضو کرنا آتا ہے، شاید ہی کوئی ایسا منحوس گھر ہو جس میں وضو نہ کیا جاتا ہو، اس لئے اس کا یہاں بیان کرنا ضروری نہیں، چند کتابوں کے نام پیش خدمت ہیں، اگر ضرورت ہو تو ان کا مطالعہ کر لیا جائے۔

ہمارا اسلام، بہار شریعت، قانون شریعت، فقہ اہلسنت۔

یہ کتابیں فقہی مسائل واحکام معلوم کرنے کے لئے نہایت اہم ہیں، ہر مسلمان کے گھر میں ان کا ہونا ضروری ہے، نہایت آسان اردو میں ہیں اور آسانی سے حاصل بھی کی جا سکتی ہیں، صرف شرط یہ ہے کہ دین کی اہمیت اور اس کو سیکھنے کا احساس اور شوق ہو، صرف یہ نہ کہا جائے کہ ہماری مسجد کے امام صاحب مسائل بیان نہیں کرتے، یہ کہہ کر آپ اللہ کے یہاں چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے، آپ کی اپنی ذمہ داری ہے کہ دین کا ضروری علم حاصل کریں اور اپنے اہل خانہ کے لئے اس کی تعلیم کا انتظام کریں، آج ہی یہ کتابیں حاصل کیجئے اور اپنی ذمہ داری پوری کیجئے۔

غُسل

اہل ایمان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جب وہ ''جنبی'' ہو جائیں تو پاکی حاصل کرلیں، غسل کرلیں، ''وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا'' اور اگر تم جنبی ہو تو پاکی حاصل کرو، غسل کا اجمالی حکم ہے، اس کی تفصیل اور مکمل احکام جاننے کے لئے، شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی درسگاہ موجود ہے، وہاں حاضری دیجئے، طریقہ غسل اور اس کے متعلق تمام احکام معلوم ہو جائیں گے۔

احتلام، یعنی خواب میں انزال ہو جانے یا بیوی سے جماع کرنے سے مسلمان ''جنبی'' ہو جاتا ہے، اس پر غسل کرنا فرض ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ عورت جب حیض یا نفاس سے فارغ ہو تو اس پر بھی غسل فرض ہے کہ غسل کے بغیر نہ نماز ادا کی جاسکتی ہے، نہ قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی اجازت ہے، نہ مرد حالت جنابت میں مسجد میں داخل ہو سکتا ہے، جس پر غسل فرض ہے، وہ ناپاک ضرور ہے لیکن نجس نہیں، یعنی اس کی ناپاکی ایسی ظاہری نہیں، جو نظر آئے یا اس سے کوئی دوسری چیز ناپاک ہو جائے مثلاً ناپاک آدمی، دوسرے پاک آدمی سے مصافحہ، معانقہ کر سکتا ہے، اس کی ناپاکی کی وجہ سے اس کا لباس، اس کا پسینہ، ناپاک نہیں ہوتا، یہ ناپاکی اور اس حالت میں غسل کا حکم، صرف تعمیل حکم اور احساس بندگی دلانے کے لئے ہے، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، غسل کا طریقہ اور اس کے دیگر احکام جاننے کے لئے، مذکورہ بالا کتابوں کا مطالعہ کیجئے، یہاں معلم کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں حالت جنابت میں تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات ہو گئی، آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور بیٹھ گئے، میں بھی بیٹھ گیا اور موقع پاتے ہی چپکے سے چلا گیا، اپنے مکان پر آیا، غسل کیا اور پھر سرکار کی خدمت میں حاضر ہو گیا، آپ ﷺ نے پوچھا، ابوہریرہ کہاں گئے تھے، میں نے سب بات بتا دی، آپ ﷺ نے فرمایا ''سبحان الله ان المؤمن لا ينجس''، سبحان اللہ، مؤمن ناپاک نہیں ہوتا، (بخاری شریف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتاً فِيْهِ صُوْرَةٌ وَّلَا كَلْبٌ وَّلَا جُنُبٌ

اس گھر میں (رحمت کے) فرشتے نہیں آتے، جس میں تصویر یا، کتا، یا جنبی ہوں۔ (نسائی شریف)

یعنی ''جنبی'' کو جس قدر ممکن ہو جلد غسل کر لینا اور پاک ہو جانا چاہئے اور اگر کسی وجہ سے غسل میں دیر کرنا پڑے، تو وضو کر لینا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ (مجھے رات کو غسل کی حاجت ہوئی تو کیا میں اسی وقت غسل کروں یا صبح کو) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ ثُمَّ نَمْ'' اپنی شرمگاہ کو دھولو، وضو کر لو اور سو جاؤ، (یعنی یہ ضروری نہیں کہ اسی وقت غسل کیا جائے، اگرچہ افضل ہے تاہم استنجا کر کے وضو کر لینا چاہئے)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام:

اِذَا كَانَ جُنُباً فَاَرَادَاَنْ يَّاْكُلَ اَوْ يَنَامَ تَوَضَّاءَ وُضُوْءَهٗ لِلصَّلٰوةِ

جنابت کی حالت میں، کھانا یا سونا چاہتے تو نماز جیسا وضو کرلیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ تَرَکَ مَوْضِعَ شَعْرَۃٍ مِنْ جَنَابَۃٍ لَمْ یَغْسِلْهَا فُعِلَ بِهَا کَذَا وَکَذَا مِنَ النَّارِ

جس نے غسل جنابت سے بال برابر جگہ چھوڑ دی اور اس کو نہ دھویا، اس پر جہنم کی آگ سے ایسا اور ایسا عذاب ہوگا۔ (ابوداؤد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اسی دن سے میں نے اپنے سر کے ساتھ دشمنی کرلی ہے کہ بال ذرا بھی بڑے نہیں ہونے دیتا اور آپ نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی، (ابوداؤد)

تیمم

تیمم، وضو اور غسل کا قائم مقام ہے، یعنی حالت حضر ہو یا سفر، پانی میسر نہ آئے یا پانی کے استعمال سے مرض کی تکلیف بڑھ جانے کا یقین ہو تو وضو یا غسل کی جگہ تیمم کی سہولت مہیا کردی گئی ہے، یہ شریعت اسلامیہ کے ان احکام میں سے ایک حکم ہے جو اس شریعت مطہرہ کے آسان ہونے کا ثبوت مہیا کرتے ہیں اور اللہ کی ان نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدقہ سے آپ کے غلاموں کے لئے خاص ہیں۔

تیمم کرنا، صرف دو صورتوں میں جائز ہے جب وضو یا غسل کے لئے حدود شہر سے باہر ایک میل تک پانی میسر نہ ہو، یا پانی تو دستیاب ہے لیکن وہ اس کے استعمال پر قادر نہ ہو، مثلاً پانی پر دشمن کا قبضہ ہے یا کسی درندے کا، یا کوئی مرض لاحق ہو جانے، یا مرض بڑھ جانے کا یقین ہے، یا پانی اتنا کم ہے کہ وضو کرلیا گیا تو پینے کے لئے باقی نہ رہے گا اور دور دور تک میسر بھی نہ آئے گا اور پیاس ناقابل برداشت ہوجائے گی۔

تیمم، وضو یا غسل کا مکمل بدل ہے، اس سے بلا کراہت اس وقت تک ہر عبادت کی جاسکتی ہے، جب تک پانی میسر نہ آئے یا اس کے استعمال پر قدرت نہ ہو۔

تیمم، کے لئے نیت شرط ہے، یعنی یہ ارادہ واضح ہو کہ وضو کے لئے تیمم کیا جارہا ہے، یا غسل کے لئے۔

تیمم، پاک مٹی سے اور ہر اس چیز سے جو مٹی کی جنس سے ہو، کیا جاسکتا ہے، چاہے وہ مٹی کسی پتھر یا کپڑے وغیرہ پر لگی ہو یا پہلے سے ہاتھوں پر لگی ہو، مٹی پر ہاتھ مارنا فرض ہے، منہ پر مٹی کا اثر ہونا ضروری نہیں، بہتر ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر انہیں جھاڑ لیا جائے تاکہ منہ اور ہاتھوں پر مٹی نہ لگے۔

تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دونوں ہاتھ مٹی پر مار کر، پورے چہرے پر پھیر لئے جائیں اور دوسری مرتبہ دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک، وضو کی جگہ تیمم ہو یا غسل کی جگہ دونوں صورتوں میں ایک ہی طریقہ ہے۔

تیمم کا وسیلہ

شریعت کے جملہ احکام، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دیئے گئے جبکہ بعض احکامِ شرع کا وسیلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بنے، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طفیل، حرمتِ شراب کی نعمت ملی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طفیل

رمضان کی راتوں میں بیویاں حلال ہوئیں اور تیمم کی عظیم نعمت اور سہولت، امت کی ماں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے وسیلہ سے ملی، جس کا واقعہ آپ نے خود ہی بیان فرمایا، فرماتی ہیں کہ:

ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمراہ ایک سفر میں تھے، جب قافلہ مقام بیداء یا ذات الجیش، پہنچا تو یہاں میرا ہار ٹوٹ کر گر گیا (میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا) آپ ﷺ یہ ہار تلاش کرنے کے لئے رُک گئے اور آپ ﷺ کے ساتھ پورا قافلہ رُک گیا، (بعض) صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ تم نہیں دیکھ رہے کہ (حضرت) عائشہ نے کیا کیا، سب کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ٹھہرا لیا اور یہ ایسی جگہ ہے، جہاں پانی نہیں اور نہ ہی ہمارے ساتھ پانی ہے (کہ لوگ وضو کر سکیں) یہ شکایت سن کر ابوبکر میرے پاس آئے اور اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میرے زانوں پر سر رکھے سو رہے تھے، حضرت ابوبکر نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا اور کہنے لگے کہ تم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اتنے لوگوں کو پریشان کیا ہے کہ ایسی جگہ رکنے پر مجبور کر دیا جہاں پانی نہیں ہے اور نہ ہی صحابہ کے پاس پانی ہے، پھر ابوبکر ناراض ہو کر جو کچھ ان کے دل میں آیا کہتے رہے اور وہ اپنے ہاتھ سے میری کوکھ میں چٹکیاں بھی لیتے رہے جبکہ میں ہل بھی نہ سکتی تھی کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میرے زانو پر آرام فرما رہے تھے (یہ ڈر تھا کہ آپ ﷺ کے آرام میں خلل نہ ہو) پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام (اور صحابہ) سوتے رہے اس حال میں کہ پانی بالکل نہ تھا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، (نماز فجر کے لئے پانی کی ضرورت پیش آئی، پس اللہ کو رحم آیا اور) اسی وقت آیت تیمم نازل ہوئی، (سب لوگ بیحد خوش ہوئے) اور اسید بن حضیر، جو نقباء میں سے ایک تھے کہنے لگے، "مَاهِيَ بِاَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَآ اٰلَ اَبِيْ بَكْرٍ" اے ابوبکر کی اولاد، یہ تمہاری پہلی برکت نہیں ہے، (یعنی تمہارے طفیل اللہ کی رحمت اور برکت تمہارے غلاموں پر برستی ہی رہتی ہے) حضرت ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ ہم نے اس اونٹ کو کھڑا کیا، جس پر میں سوار تھی، تو ہار اس کے نیچے سے نکلا، (مسلم شریف)

یہ واقعہ صرف نعمت تیمم ملنے کا سبب نہیں، بلکہ اس سے مزید کئی حقائق کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُم المؤمنین سے خصوصی محبت کہ آپ ﷺ نے ان کا ہار گم ہو جانے کے باعث یہاں رات کو مع اپنے غلاموں کے قیام فرمایا، اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت اور آپ ﷺ کا بے انتہا احترام کہ حضرت ابوبکر ان کی چٹکیاں لیتے رہے لیکن انہوں نے محض اس خوف سے حرکت تک نہ کی کہ محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم ان کے زانو پر آرام فرما تھے، باپ کا شادی کے بعد بھی بیٹی پر حقِ تربیت کہ ابوبکر نے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بیوی اور امت کی ماں کے عظیم منصب کے باوجود حضرت عائشہ کو بیٹی کی حیثیت سے تنبیہہ فرمائی، صحابۂ کرام کی کمال اطاعت کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم پر سب بلا تردد اپنی سواریوں سے اتر گئے، جبکہ اس قیام کا سبب بظاہر کوئی مذہبی معاملہ نہ تھا، نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسعت علم کا واضح ثبوت، جو ایسے لوگوں کو تو نظر نہ آ سکا جن کی عقلوں پر ضلالت و گمراہی کے پردے پڑے

ہوئے ہیں کہ اگر آپ ﷺ کو غیب کا علم ہوتا تو آپ ﷺ کیوں یہاں قیام کی تکلیف گوارا فرماتے، فوراً اونٹنی کے نیچے سے ہار اٹھا کر ام المؤمنین کو دے دیتے لیکن جن اہل ایمان کو فراست مؤمن حاصل ہے، جن کی عقلیں نور ایمان سے منور اور قلوب عشق ومحبت سے سرشار ہیں، انہوں نے اسی واقعہ سے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی وسعت کا اندازہ کیا اور اس کے چمکتے ہوئے ثبوت سے اپنے عقیدہ وایمان کو مزید مضبوط کیا، اس طرح کہ آپ کو علم ہوگیا تھا کہ یہی مقام ہے جہاں تیمم کا حکم نازل ہوگا، ہار کا گم ہونا، یہاں نزول کا بہانہ اور حکمت باری تعالیٰ کا سبب ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کو کچھ نہ کہا اور نہ ہی کسی پریشانی کا اظہار فرمایا بلکہ سکون سے سو گئے، جبکہ ابوبکر نے بیٹی کو ڈانٹا بھی اور پریشان بھی ہوئے کیونکہ حقیقت کا علم نہ تھا، ان کی نظر تو صرف واقعہ کے ظاہری سبب پر تھی، بہرحال سوچ ہے اپنی اپنی، کوئی سراب کو پانی سمجھ کر دھوکا کھاتا ہے، اور کوئی سراب کو پانی کی علامت سمجھ کر پانی تک پہنچنے کی راہ پالیتا ہے، آیت تیمم نازل ہونے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسید بن حضیر کو حکم دیا کہ اونٹنی کو کھڑا کرو، جونہی اونٹنی کھڑی ہوئی ہار چمکتا ہوا نظر آ گیا، آپ ﷺ کا یہ عمل اسی غلط فہمی کو دور کرنے اور اہل ایمان کو اس سے بچانے کے لئے تھا کہ آپ ﷺ کو ہار کا علم نہ تھا، آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ علم تو تھا لیکن علم عطا فرمانے والے کی حکمت اس کے ظاہر کرنے سے مانع تھی، اللہ ہدایت دے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، ہمیں لوگوں (پچھلی امتوں) پر تین وجوہ کی بناء پر فضیلت دی گئی ہے۔

جعلت صفوفنا كصفوف الملئكة وجعلت لنا الارض كلها مسجداً وجعلت تربتها لنا طهورا اذا لم نجد الماء

ہماری صفوں کو، ملائکہ کی صفوں کی طرح بنایا گیا، تمام روئے زمین کو ہماری سجدہ گاہ بنادیا گیا اور مٹی کو ہمارے لئے ذریعہ طہارت بنادیا گیا جبکہ ہم پانی نہ پائیں۔ (مسلم)

اے ایمان والو! اللہ رب العزت جل مجدہ نے، اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل تم پر جو احسانات کئے، ان سے فائدہ حاصل کرو اور اس کے شکرگزار بندے بننے کے لئے ہر حال میں ان نعمتوں کو یاد رکھو، جن سے اس رب کریم نے تمہیں نوازا، نیز یہ یاد رکھو کہ تم اس سے اطاعت وفرمانبرداری کا عہد وپیمان کر چکے ہو، کسی صورت میں بھی اس عہد سے روگردانی نہ ہونے پائے، اُسی سے ڈرتے رہو، وہ سب کے دلوں کا حال جاننے والا ہے، تم جو عمل کرتے ہو، اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو دلوں میں چھپائے رکھتے ہو، وہ اس سے بھی باخبر ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ (ابراہیم:۳۸)

اے ہمارے رب! یقیناً تو جانتا ہے جو ہم (دل میں) چھپائے ہوئے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور اللہ سے کوئی چیز چھپی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔

وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا محمد وعلى اله واصحابه اجمعين

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۳۲

المائدہ: ۸ تا ۱۰

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝ (المائدہ: ۸ تا ۱۰)

اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے انصاف کے ساتھ اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو، یہی زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے، اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے بیشک، اللہ خوب خبر رکھتا ہے اس کی جو تم کرتے ہو، وعدہ فرمایا اللہ نے ایمان والوں سے اور نیک کام کرنے والوں سے کہ ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہی لوگ دوزخی ہیں۔

اے ایمان والو! تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ تم ہر حال میں شاہد بالقسط اور عادل بنے رہو، شہادت بالقسط اور عدل کی ذمہ

داریاں بلاشبہ بہت بھاری ہیں کہ کبھی لالچ، تو کبھی خوف، تو کبھی تعلقات یا رشتہ داری کی پاسداری، تو کبھی کمزوروں کی ہمدردی اور کبھی جذبہ انتقام، جیسے عوامل شاہد وعادل کو ان عظیم ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے سے محروم کردیتے اور اللہ و رسول کی حکم عدولی کا مجرم بنادیتے ہیں، پس اللہ تمہیں ہدایت فرماتا ہے کہ جب تم پر یہ ذمہ داریاں عائد ہوں تو تم ''قوام'' رہنا، ڈٹے رہنا، ایسے کہ کسی قسم کی رکاوٹ تمہیں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے سے نہ روکنے پائے کہ یہی کمالِ ایمان، یہی تقویٰ ہے اور مؤمنین کاملین اور متقین پر اللہ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے ان کی مغفرت اور ان کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ فرمالیا ہے جبکہ کفار، نہ صرف انعام سے محروم ہیں بلکہ ان کا ٹھکانہ تو دوزخ ہے۔

شہادت بالقسط کی وضاحت، ہم سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۳۵ کے ذیل میں کرچکے ہیں یہاں، عدل کے متعلق چند باتیں عرض کرتے ہیں۔

عدل

عدل کے معنیٰ ہیں برابر برابر کرنا، یا افراط وتفریط کی درمیانی راہ اختیار کرنا، جسے اعتدال کہا جاتا ہے، شرعی اعتبار سے عدل انسانی کمالات کا سرچشمہ اور جملہ اخلاقی اقدار کا منبع ہے، اسی سے انسان خالق کا مقرب اور مخلوق کا محبوب بنتا ہے، یہی انسان کی دینوی فلاح و بہبود اور آخروی نجات کا ذریعہ ہے، یہ اللہ رب العزت جل مجدہ کی صفات عالیہ میں سے ایک صفت ہے، جسے اللہ نے، اپنی اشرف المخلوقات مخلوق انسان کی فطرت میں پنہاں کیا ہے، اسی لئے کوئی انسان بھی اس کی افادیت اور عظمت کا انکار نہیں کرتا بلکہ ظالم و جابر، چور اور لٹیرے تک اپنی بدعملیوں کو کسی نہ کسی طرح عدل کے حسین لباس میں لپیٹ کر، خوشنما بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن یہ صفتِ باری انہی خوش بختوں میں اجاگر ونمایاں ہوتی ہے، جو اپنی عبدیت کا اعتراف کرلیتے ہیں اور اللہ کے رسول کی غلامی اختیار کرکے، آدابِ عبدیت کی جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بالفاظ دیگر عدل ایک ایسا تارہ ہے، جو نور ایمان سے چمک حاصل کرتا ہے اور مؤمن پر جھلملانے لگتا ہے، کفر وشرک کی تاریکی اسے کبھی طلوع نہیں ہونے دیتی، پس غیر مؤمن سے عدل کی توقع ایسی ہی بے سود ہے، جیسے رات کی تاریکی میں سورج چمکنے کی امید، جبکہ انسانی فطرت کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ مؤمن ہوکر اپنے خالق کی صفت عدل کا مظہر بنتا کہ خالق نے اس کے ہر عضو کو اپنی اس صفت کی دلیل بنایا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝۷

(انفطار: ۷۔۶)

اے انسان! تجھے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں رکھا، (کہ تو باغی ہوگیا) جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تیرے (اعضاء کو) درست کیا، پھر تیرے (عناصر کو) معتدل بنایا۔

اے ایمان والو! اللہ نے تم پر بڑا احسان فرمایا کہ تمہیں نور ایمان سے نوازا، پس تم اپنے اندر پنہاں عدل کو چمکاؤ، ''اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى'' ہر حال میں عدل کرتے رہو، اس کی چمک سے تم رضائے الٰہی کی راہ پر گامزن ہوگے اور اپنے رب کا قرب حاصل کرسکو گے، والدین کی محبت، اعزاء کی قربت، امراء واغنیاء کی عزت، غریبوں سے ہمدردی وغمگساری،

اعداء کی دشمنی کے جذبات بھی تمہیں، عدل سے روگردانی پر آمادہ نہ کرنے پائیں کہ یہی خواہشات بسا اوقات، عدل کی چمک ماند کردیتی ہیں ''فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا'' تم ان خواہشات نفس کے سبب عدل کی روشنی سے محروم نہ ہونا، ورنہ راہ سے بھٹک جاؤ گے، منزل سے دور ہوجاؤ گے، دیکھو یہ ایسی عظیم خوبی ہے کہ اللہ رب العزت جل مجدہ اپنے پیارے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کومنصبِ نبوت کی جو ذمہ داریاں پوری کرنے کی ہدایت فرمارہا ہے، ان میں عدل اختیار کرنے کا حکم بھی موجود ہے، فرمایا گیا:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ۚ وَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ؕ﴿۱۵﴾

(الشوریٰ:۱۵)

پس اس دین کی طرف آپ دعوت دیتے رہئے اور ثابت قدم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے اور فرمایئے میں ہر اُس کتاب پر ایمان لایا جو اللہ نے نازل فرمائی اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں، اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں، کسی بحث وتکرار کی ضرورت نہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان، اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف (سب کو) پلٹنا ہے۔

آیت مبارکہ کے پر کشش انداز کے باعث ہم نے اس کو پورا نقل کیا ہے، جس کا مضمون قابل غور ہے، بالخصوص ''وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ'' کا جملہ قابل توجہ ہے کہ غیروں کے ساتھ بھی عدل کا حکم دیا جارہا ہے اور یہ حکم اس نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیا گیا، جو دنیا کو نظام عدل سے روشناس کرانے اور عدل کی برتری واضح کرنے کے لئے مبعوث فرمایا گیا، جس نے اپنے عدل کی قوت سے تکبر وغرور کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالا، مظلوموں کو ظلم واستبداد سے نجات دلائی، امیر و غریب کے فرق کو مٹایا، غلاموں پر آقاؤں کی برتری کا خاتمہ کیا، رنگ ونسل اور زبان کے امتیاز کو پامال کیا اور انسان کا سر اللہ کے دربار میں جھکا کر اسے ایک اللہ کے قانون پر عمل کی دعوت دی اور عزت وعظمت کا معیار صرف صالحیت اور تقویٰ کو قرار دیا، اسی عدل کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۵۸﴾

(النساء:۵۸)

بیشک اللہ تمہیں حکم فرماتا ہے کہ سپرد کردہ امانتوں کو ان کے اہل کے، اور جب بھی فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو انصاف سے، بیشک اللہ بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے، بیشک اللہ سب کچھ سننے والا، ہر چیز دیکھنے والا ہے۔

افراد کا عدل، ان امانتوں کی ادائیگی ہے جن کے وہ امین ہیں، یعنی بشمول اللہ و رسول کے ان حقوق کو ادا کرنا جن کے وہ ذمہ دار ہیں کہ ہر مؤمن اس عدل کا ذمہ دار ہے کہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل کرے، اپنے اہل و عیال، اہل خاندان اہل محلّہ، اہل شہر اور ہم وطنوں کا حق ادا کرے، وطنی اور قومی جو ذمہ داریاں اس پہ ہیں انہیں پورا کرے، حکام کی اطاعت وفرمانبرداری کرے، ملکی قوانین کی پابندی کرے اور حکام کا عدل یہ ہے کہ وہ اپنے مناصب کے اعتبار سے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں، عوام کی خدمت کریں، ان کی الجھنوں اور پریشانیوں میں ان سے تعاون کریں، ان کے قاضی اور حَکَم ان کے اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کریں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (النحل:۹۰)

بیشک اللہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں تم انصاف کرو اور بھلائی کرو اور اچھا سلوک کرو رشتہ داروں کے ساتھ۔

عدل صرف حکام کی ذمہ داری نہیں

یہ خیال کرنا کہ عدل صرف حکام کی ذمہ داری ہے، اپنی ذمہ داری سے فرار اختیار کرنا ہے، اسی کے سبب حکام و رعایا کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے، عوام، عدل کے حصول کے لئے مطالبات کرتے رہتے ہیں اور حکام عدل کرنے سے قاصر رہتے ہیں، اگر یہ جان لیا جائے کہ عدل کا نور ہر فرد کی اپنی ذات میں موجود ہے اور وہ اس کی چمک سے خود راہ تلاش کر سکتا ہے تو حکام و رعایا کے درمیان کوئی اختلاف، کوئی تناؤ باقی نہیں رہتا، ہر شخص کو اپنی ذمہ داری پوری کرنا اور عدل کی ابتداء اپنی ذات سے کرنا چاہئے، اس طرح کہ پہلے مؤمن ان حقوق کو ادا کرنے میں انصاف کرے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں کہ جو شخص ان حقوق کی ادائیگی کا عادی نہیں ہوتا وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں عدل نہیں کر سکتا، عدل کے اس ابتدائی مرحلہ میں ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ عدل کرے اور ذات کے ساتھ عدل کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام حقوق سے بری الذمہ ہو، جو اس پر عائد ہوتے ہیں، مثلاً طہارت و پاکیزگی، صفائی، ستھرائی، اچھا کھانا، پہننا، صحت و تندرستی کا خیال رکھنا، جسم کے ساتھ عدل ہے، بدکاریوں اور برائیوں سے بچنا، نفس کے ساتھ عدل ہے، بغض، کینہ، حسد وغیرہ سے دل کو صاف رکھنا، قلب کے ساتھ عدل ہے، اہل و عیال کو حسب استطاعت، کھلانا، پلانا، ان کی صحیح تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا، ان کے ساتھ عدل ہے، والدین، بھائی بہن کے حقوق ادا کرنا، دیگر رشتہ داروں سے تعلقات رکھنا، خاندان کے ساتھ عدل ہے، ایک اچھا شہری بننا، اچھائیوں میں لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا، برائیوں سے خود بچنا اور لوگوں کو بچنے کی تلقین کرنا، معاشرے کے ساتھ عدل ہے، اسی طرح تمام امور میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال اختیار کرنا، حق کا ساتھ دینا، یہ سب عدل ہی کی راہ ہے، جس پر چلنے کی اہل ایمان کو ہدایت کی جا رہی ہے۔

افراد کی بہ نسبت قائدین اور حکام عدل کے قدرے زیادہ ذمہ دار ہیں کیونکہ وہ قومی امور کے امین ہوتے ہیں۔ انہیں اللہ و رسول کے احکام کے مطابق ملک کی حفاظت اور قوم کی خدمت کی بھاری ذمہ داری پوری کرنی ہوتی ہے، قوم کا ہر فرد ان سے عدل و انصاف کی آس باندھے ان کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے، اگر وہ قوم کو مایوس کرتے ہیں تو نہ صرف ان کے

اقتدار کو خطرہ لاحق ہوتا ہے بلکہ پوری قوم بدامنی، افتراق وانتشار کا شکار ہو جاتی ہے، جس کی آگ ملک کے وقار کو بھسم کر ڈالتی ہے اور آزادی کے باوجود قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی نظر آنے لگتی ہے، وہ اپنے وسائل کو بروئے کار لانے کے بجائے دوسروں کے در کی بھکاری بن جاتی ہے، انجام کار، صرف قومی وقار ہی مجروح نہیں ہوتا بلکہ تہذیب وتمدن بھی رخصت ہوتا نظر آنے لگتا ہے، حتیٰ کہ دین سے محرومی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، ان حقائق پر غور فرمائیے، پھر اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالئے اور فیصلہ کیجئے کہ عدل وانصاف سے محرومی نے ہمیں ذلت وخواری کے کس قدر مخدوش مقام پر لا کھڑا کیا ہے جبکہ ہمارے ہی ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ اس عدل ہی کی بناء پر ہمارا آفتابِ اقبال، نصف النہار پر چمکا کرتا تھا۔

عدل سے روگردانی کے مرتکب، افراد ہوں یا ممالک وحکام ذلت وخواری ان کا مقدر بن جاتی ہے، حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

مَامِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ رَعِيَّةً يَمُوْتُ يَوْمَ يَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌ رَعِيَّتَهٗ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ

وہ بندہ جس کو اللہ کسی رعیت کا والی وحاکم بناتا ہے اور وہ اپنی رعیت کے ساتھ دھوکہ وفریب کرتا مرتا ہے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہ روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِيْ لَنْ تَنَا لَهُمَا شَفَاعَتِيْ اِمَامٌ ظَلُوْمٌ غَشُوْمٌ وَكُلُّ غَالٍ مَارِقٍ

دو گروہ ایسے ہیں جنہیں میری شفاعت نصیب نہ ہوگی وہ حاکم، جو ظالم اور خائن ہو اور ہر وہ شخص جو دھوکہ کرنے والا اور شرعی حدود کو توڑنے والا ہو۔ (ترمذی)

قرآنی عدل

قرآن نے جس عدل کا حکم دیا اور نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس نظام عدل کی قولی وعملی تعلیم دی، اس کی نظیر دنیا کے کسی قانون، کسی مذہب میں نہیں ملتی، اسلامی نظام عدل سے ظلم وستم، جبر واستبداد کا انسداد ہوتا ہے، لوٹ، مار، قتل وغارت کا خاتمہ ہوتا ہے، ہر قسم کے تعصبات کی بیخ کنی ہوتی ہے، ہوا وہوس، تکبر وغرور، چھوت چھات کے بت پاش پاش ہوتے ہیں، حق تلفی، خود غرضی، خود پسندی کا سدِ باب ہوتا ہے، سب کے لئے ایک حاکم، ایک قانون کی عملی صورت نظر آتی ہے، ہر کسی کو آزادی کی نعمت میسر آتی ہے، ہر ایک کا حق اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر، پہنچایا جاتا ہے، عزت وآبرو، جان ومال کے تحفظ کی ضمانت ملتی ہے، مظلوم کی فریاد رسی ہوتی ہے، ظالم کو عبرتناک سزا ملتی ہے، غرضیکہ اسلامی نظام عدل ایک ایسا گھنا درخت ہے، جس کے سایہ میں تڑپتے انسان کو سکون میسر آتا ہے، جس سے پورا معاشرہ امن وامان کا گہوارہ بن جاتا ہے، جس کی فضا میں راتیں بے خوف وخطر اور دن پر سکون گزرتے ہیں، جس سے انسانی تہذیب وتمدن پروان چڑھتی اور انسانیت عروج وترقی کی راہ پاتی ہے، جو دنیا کی فلاح وبہبود اور آخرت کی نجات کا ذریعہ ہے، یہی نظام عدل، اسلامی حکومت کے حدود کو تحفظ بخشتا ہے، امت مسلمہ کو باعزت، باوقار اور بارعب بناتا ہے، اسی سے دشمن خوف زدہ ہو کر اپنی سازشوں میں ناکام ہو جاتا ہے۔

داعیٔ عدل

آ یئے، عدل کی اہمیت وافادیت کا اندازہ، داعی عدل وانصاف، معلّم کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے چند واقعات سے کریں، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت سے پہلے ہی اس ماحول اور معاشرے میں عدل کا تعارف کرایا، جس میں عدل کا لفظ تو بولا جاتا تھا لیکن اس کی عملی صورت کا تصور تک نہ تھا، اس وقت عدل صرف اپنی اغراض کی تکمیل کا نام تھا، چاہے وہ ظلم وستم سے ہو یا غصب اور لوٹ مار سے، دوسروں کے حقوق کا تحفظ یا ان کا ادا کرنا عدل کے مفہوم تک میں شامل نہ تھا، ایسے ماحول میں وہ نبی جو انسان کو قیامت تک کے لئے ایک بے نظیر نظام عدل کی تعلیم دینے کے لئے آیا تھا، سب سے پہلے خود عدل کر کے دکھاتا ہے۔

یہ وہ وقت ہے جب قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور متحد ومنظم ہو کر محنت سے تعمیر کرنے والے اچانک اس مسئلہ پر دست بگریباں ہو گئے کہ حجر اسود نصب کرنے کا اعزاز کون حاصل کرے گا، چار پانچ دن مسلسل یہ اختلاف چلتا رہا، سخت کلامی بھی ہوئی، ہاتھا پائی کا مظاہرہ بھی ہوا، حتیٰ کہ تلواریں تان لی گئیں، اب خون کی ندیاں تو بہتی نظر آتی تھیں لیکن مسئلہ کا حل دور دور تک نہ تھا، بالآخر، اللہ نے اپنے گھر کو قتل وغارت سے بچانے اور حق، حق دار کو عطا فرمانے کے لئے کسی کے دل میں یہ بات ڈالی اور وہ چلایا، اے گروہ قریش! جھگڑا ختم کرو اور ''اسے اپنا حاکم بنالو جو کل سب سے پہلے، اس مسجد کے دروازے سے داخل ہو''، یہ بات ان کی عقل میں آ گئی اور سب صبح کا انتظار کرنے لگے اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی، ہر ایک تیزی سے، اس گھر کی طرف دوڑنے لگا، لیکن جو بھی مسجد کے دروازے میں داخل ہوا، اس نے اپنے سے اعلیٰ اخلاق، بلند کردار، عبداللہ کے یتیم ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنا استقبال کرتے پایا اور خوش ہو کر چلایا ''هٰذَا لَامِيْنُ رَضِيْنَا بِهٖ حَكَمًا هٰذَا مُحَمَّدٌ'' یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، یہ امین ہیں ہم سب ان کے فیصلے پر راضی ہیں، اب اللہ کے گھر کو آباد کرنے والے آقا صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ ہی کے گھر میں عدل وانصاف کا مظاہرہ فرماتے اور عدل کو متعارف کراتے ہیں، فرمایا ''هَلُمَّ اِلَيَّ ثَوْبًا'' مجھے ایک چادر دو، چادر پیش کی گئی، آپ ﷺ نے اس کو بچھایا اور اپنے دست مبارک سے، حجر اسود اس میں رکھا اور ہر قبیلہ کے، ایک ایک سردار کو بلایا اور فرمایا، سب مل کر چادر پکڑو، اور اس اعزاز میں میرے ساتھ شریک ہو جاؤ، حیرت وتعجب اور مسرت و خوشی کی ملی جلی کیفیت میں، سب نے چادر پکڑی اور حجر اسود کو اس مقام تک لے آئے، جہاں اسے نصب کرنا تھا، اب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے اپنے نورانی، مقدس ہاتھوں سے اٹھایا اور دیوار میں، مقررہ جگہ پر نصب فرما دیا، یہ پہلا موقع تھا جب عدل وانصاف سے ایک بڑی خون ریزی کا خطرہ ٹلا اور پوری قوم کو مسرت وشادمانی نصیب ہوئی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نضر کی بیٹی، ربیع نے ایک لڑکی کے دانت توڑ دیئے، ربیع کے گھر والوں نے لڑکی سے معافی مانگی لیکن اس نے معاف نہ کیا، انہوں نے معاوضہ کی پیشکش کی لیکن لڑکی کے گھر والوں نے اس کو بھی قبول نہ کیا، بالآخر مقدمہ، عدالت نبوی ﷺ میں پیش ہوا، آپ ﷺ نے فیصلہ فرمایا، اگر لڑکی کے گھر والے دیت، معاوضہ لینے پر تیار نہیں، تو ربیع کو قصاص دینا پڑے گا یعنی اس کے بھی اتنے ہی دانت توڑے جائیں گے، جتنے اس نے توڑے ہیں، حضرت انس کہتے ہیں، میں نے بڑی ہمت کر کے، آپ ﷺ سے گزارش کی یارسول اللہ ربیع ایک نہایت ہی باعزت اعلیٰ

قبیلہ کی بیٹی ہے، کیا اس کے دانت توڑے جائیں گے آپ ﷺ نے فرمایا،" کتاب اللہ القصاص "، اے انس! قصاص لینا، اللہ کا حکم ہے، حکم الٰہی سب کے لئے ایک ہے، مجرم، مجرم ہی ہے، چاہے کوئی معروف ومشہور اور باعزت شخص ہو یا کوئی عام آدمی، جس کا جو حق ہے وہی اسے دلانا عدل ہے، جب لڑکی کے خاندان والوں کو انصاف مل گیا اور انہوں نے عدل کی بالا دستی کو اپنے سامنے پالیا تو انہوں نے احسان کیا اور ربیع کو معاف کر دیا۔

فتح غزوۂ بدر کے بعد، گرفتار کفار میں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا حضرت عباس بھی موجود تھے، جنہیں اسی طرح باندھا گیا تھا جس طرح دوسرے قیدیوں کو باندھا گیا تھا اور جب قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں آزاد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو ایک عام آدمی کا فدیہ چار ہزار درہم مقرر ہوا، لیکن ان میں جو دولت مند تھے ان سے زیادہ رقم لینے کا فیصلہ ہوا، بعض صحابہ نے خیال کیا کہ حضرت عباس کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چچا ہونے کے ناطے، بغیر فدیہ آزاد کر دیا جائے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا، سب قیدیوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جائے اور عباس سے زیادہ رقم لی جائے کیونکہ وہ دولت مند ہیں۔

فتح مکہ کے بعد صرف طائف رہ گیا تھا، جس نے گردنِ تسلیم خم نہ کی تھی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کا محاصرہ کیا، لیکن چندروز بعد محاصرہ ختم کرنا پڑا، حضرت صخر رضی اللہ عنہ ایک دولت مند رئیس تھے، انہیں جب معلوم ہوا کہ سرکار نے محاصرہ ختم کر دیا ہے تو وہ خود آگے بڑھے اور طائف کا محاصرہ کر کے اہلِ طائف پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ اطاعت پر مجبور ہو گئے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب فتح طائف کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ بہت خوش ہوئے، اسی دوران مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور شکایت پیش کی کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے، آپ ﷺ نے صخر کو بلایا، معاملہ کی تحقیق فرمائی اور عدالت رسول ﷺ سے فاتح طائف کے خلاف فیصلہ صادر ہوا اور حکم ملا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچادو، ابھی ایک مقدمہ ختم ہی ہوا تھا کہ ان کے خلاف دوسرا مقدمہ دائر کیا گیا، بنو سلیم حاضر ہوئے اور عرض گزار ہوئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے، صخر نے ہمارے ایک چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا اب ہم اسلام قبول کر چکے ہیں، لہٰذا ہمارا چشمہ واپس ملنا چاہئے، سرکار نے پھر صخر کو طلب فرمایا اور ان کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا ارشاد ہوا جب کوئی قوم مشرف باسلام ہو جاتی ہے تو اپنے جان ومال کی مالک ہو جاتی ہے، لہٰذا بنو سلیم کا چشمہ واپس کیا جائے، صخر نے پیکرِ عدل وانصاف کا یہ فیصلہ بھی منظور فرمایا، ان دونوں فیصلوں کے بعد خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرۂ انور پر افسوس کے آثار نمایاں ہوئے کیونکہ صخر کو فتح طائف جیسے عظیم کارنامہ کا کوئی دنیاوی صلہ نہ مل سکا۔

یہ واقعات اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ اسلام کا نظام عدل اپنے غیروں، سب کے لئے یکساں ہے، ہر شخص کو اس کا حق دلانے کا ضامن ہے، کسی کی امارت، رشتہ داری، دینی خدمت یا کوئی بھی وجہ اس کے نفاذ میں حائل نہیں ہو سکتی، اب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد امت مسلمہ کے حقوق وامور کے محافظین کے چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

اعلانِ صدیق

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر رونق افروز ہوتے ہیں تو اپنے پہلے ہی خطبہ میں

اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بنیاد عدل کو قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں، ''اے لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ میں تم لوگوں میں زیادہ بہتر نہیں، اگر میں اچھا کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو، صدق امانت ہے، کذب خیانت ہے، انشاء اللہ تمہارا کمزور، میرے نزدیک قوی ہے، یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلا دوں اور تمہارا قوی، میرے نزدیک کمزور ہے، یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق دلا دوں''، پھر آپ نے فرمایا، ''وَاَطِيْعُوْنِیْ مَا اَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَلَا طَاعَةَ لِیْ عَلَيْكُمْ''اور میری فرمانبرداری کرو جبکہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کروں اور جب میں اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو تم پر بھی میری اطاعت نہیں۔

عدل فاروقی

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عدل ''عدل فاروقی'' کے عنوان سے معروف اور متعارف ہے، آپ کے بابِ عدل سے ایک واقعہ ملاحظہ ہو، آپ کے دورِ خلافت میں غسان کا بادشاہ جَبَلہ بن عَسفان، مشرف باسلام ہوتا ہے، اللہ کے گھر کا طواف کرنے، کعبۃ اللہ میں حاضر ہوتا ہے، دوران طواف ایک عرب بدو کا پیر اس کی چادر پر پڑ گیا، احکم الحاکمین کے دربار میں دنیا کے اس شہنشاہ کی رگِ تکبر پھڑک اٹھی، اس نے بدو کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ غریب کے کئی دانت باہر آ گئے، وہ دوڑا دوڑا عدالتِ فاروقی میں پہنچا اور مقدمہ دائر کر دیا، آپ نے بادشاہ کو طلب کیا، معاملہ کی تحقیق کی، بادشاہ نے جرم کا اعتراف کیا، آپ نے بدو کو اجازت دی کہ وہ بادشاہ کے منہ پر اتنے ہی زور سے تھپڑ مارے کہ اس کے بھی دانت نکل پڑیں، جبلہ نے واویلا مچانا شروع کیا اور کہا کہ آپ کے یہاں ایک دیہاتی اور ایک بادشاہ کے دانت برابر ہیں، امیر المؤمنین نے اس کو قرآن کا فیصلہ سنایا کہ'' بیشک جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا بدلہ آنکھ ہے اور ناک کا بدلہ ناک ہے اور کان کا بدلہ کان ہے اور دانت کا بدلہ دانت ہے اور ہر زخم کا قصاص لیا جائے گا'' اور آپ نے فرمایا کہ تحفظِ حقوق کے اعتبار سے اسلام امیر و غریب میں کوئی امتیاز نہیں کرتا، اسلامی قانون سب کے لئے ایک ہے، ایک جاہل بدو اور ایک شہنشاہ کے دانتوں میں کیا فرق ہو سکتا ہے، پس اے بادشاہ! تو نے اعترافِ جرم کر لیا ہے، لہٰذا اب تو قصاص کے لئے تیار ہو جا وہ اسلام تو قبول کر چکا تھا لیکن اب تک ایمان اس کے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکا تھا، لہٰذا اس نے سزا سے بچنے کے لئے بہانہ تلاش کیا اور بولا، اے امیر المؤمنین! مجھے ایک دن کی مہلت دی جائے، مہلت کی درخواست منظور ہوئی اور جَبَلَہ اس وقفہ سے فائدہ اٹھا کر غستان بھاگ گیا اور وہاں جا کر مرتد ہو گیا۔

کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہو جائے، اسلام کا قانون اٹل ہے، اس میں کسی سودے بازی کی گنجائش نہیں، اسلامی نظامِ عدل سب کے لئے ہے، مجرم چاہے مزدور و کسان ہو، غریب ہو، امیر و حاکم ہو، دولت مند ہو، اسلامی عدل مظلوم کو سہارا دیتا ہے، ظالم و مجرم کو سزا دیتا ہے، حقدار کو حق دلاتا ہے۔

قاضی، جج عدل و انصاف کا امین و ذمہ دار ہوتا ہے، اسی لئے اس کا منصب نہایت اہم اور نازک ہوتا ہے، جانبین میں سے کسی ایک جانب کی طرف اس کا ذرا بھی میلان، اس کے لئے اس عظیم منصب سے نااہلی کا سبب ہو سکتا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی معاملہ پر اختلاف ہوتا ہے، ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں، عدالت عالیہ سے امیر المؤمنین کی طلبی کا نوٹس جاری ہوتا ہے، وقت مقررہ پر پوری عدالت سربراہ مملکت کی حاضری کی منتظر ہے، مدعی ابی بن کعب پہلے سے موجود ہیں، امیر المؤمنین، بحیثیت مدعا علیہ، عجز و انکساری کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوتے ہیں، قاضی حضرت زید بن ثابت سے نہ رہا گیا، وہ امیر المؤمنین کی وجاہت سے مرعوب ہو گئے اور ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے، یہ ایک شرعی غلطی تھی کہ قاضی مدعا علیہ کا اس طرح احترام کرے، امیر المؤمنین نے قاضی صاحب کو فوراً احساس دلایا کہ آپ کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا، حضرت زید شرمندہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، ابی بن کعب کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کوئی گواہ نہ تھا، لہٰذا مدعا علیہ پر اپنے انکار کے ثبوت کے لئے قسم لازم آتی تھی، زید بن ثابت نے دوسری شرعی غلطی یہ کی کہ ابی بن کعب سے کہا کہ امیر المؤمنین کے منصب کا لحاظ کرتے ہوئے تم انہیں قسم پر مجبور نہ کرو اور اپنا دعویٰ واپس لے لو، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اپنا فیصلہ سناتے ہیں کہ زید، جب تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور سربراہ مملکت برابر نہیں تو تم اس منصب کے اہل نہیں ہو۔

عہد فاروقی ہی کا یہ واقعہ ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا، امیر المؤمنین نے انہی کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا، ان کا ایک لڑکا، محمد نامی گھڑ دوڑ کا بڑا شوقین تھا، ایک مصری نے اس کے ساتھ گھوڑا دوڑایا اور جیت گیا، فاتح مصر اور گورنر کا بیٹا، ایک عام آدمی سے ہارنا برداشت نہ کر سکا، اس نے مصری کو پکڑا، خوب مارا اور کہتا جاتا تھا ''خُذْهَا وَاَنَا ابْنُ الْاَكْرَمِيْنَ'' (مار کھاؤ، تم مجھے نہیں پہچانتے، میں بڑے معزز و مکرم آباؤ اجداد کی اولاد ہوں) غریب مصری مار کھانے کے بعد، مدینہ طیبہ حاضر ہوتا ہے، عدالت فاروقی پر دستک دیتا ہے، امیر المؤمنین اس کی فریاد سن کر مصر کے گورنر اور اس کے بیٹے کو طلب فرماتے ہیں، چند روز میں دونوں حاضر ہوتے ہیں، امیر المؤمنین اپنی گرجدار آواز میں پکارتے ہیں ''این المصری؟'' مصری کہاں ہے، آپ عمرو بن عاص کے بیٹے محمد سے پوچھتے ہیں، کیا تم اسے پہچانتے ہو، کیا یہ وہی شخص ہے جسے تم نے بیدردی سے مارا تھا، محمد اعتراف جرم کرتا ہے، عدل و انصاف کا پیکر مصری کو حکم دیتا ہے، ''فَاضْرِبْ بِهَا ابْنَ الْاَكْرَمِيْنَ'' یہ دُرّہ لو اور اس محترم آباؤ اجداد کی اولاد کو اسی طرح مارو، جس طرح اس نے تمہیں مارا تھا، بھرے دربار میں فاتح مصر اور گورنر کا بیٹا مار کھا رہا ہے، لیکن کسی کی مجال زدن نہیں، عدل فاروقی جوش پر ہے، آپ بار، بار فرما رہے ہیں، اے مصری! اور مار، خوب مار، جب مصری نے اپنا بدلہ پورا کر لیا اور کوڑا روک لیا تو امیر المؤمنین نے فاتح مصر کو طلب کیا اور مصری سے کہا اب ان کی بھی خبر لو کہ ان کے بیٹے نے تجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت اسی لئے کی تھی کہ اسے فاتح مصر اور گورنر مصر کا بیٹا ہونے پر ناز تھا، مصری عدل و انصاف کے اس عجیب و غریب منظر پر حیرت زدہ تھا، وہ بولا، اے امیر المؤمنین! جس نے مجھے مارا تھا میں اس سے بدلہ لے چکا، اس میں فاتح مصر کا کوئی قصور نہ تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عمرو ابن عاص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''یا عَمْرو! مَتٰى تَعَبَّدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا'' اے عمرو، تم نے لوگوں کو کب سے اپنا غلام سمجھ لیا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا ہے۔''

اللہ اکبر، اسلامی عدل کی فوقیت و برتری تو ملاحظہ ہو کہ اس کے مقابلہ پر کسی کی عزت، کسی کا منصب کچھ نہیں، مظلوم کو

اس کا حق ملنا چاہئے اور ظالم کو جرم کی پوری پوری سزا، جس قوم کو اس عدل وانصاف کی حکومت نصیب ہو، وہی قوم آزادی کا پورا پورا لطف پا سکتی ہے، اسے ہی عزت ووقار میسر آ سکتا ہے، اسی کے معاشرے میں باہمی الفت ومحبت نظر آ سکتی ہے، اسی عدل کے سایہ تلے بسنے والے، ایک دوسرے کی عزت وآبرو اور مال ودولت کے محافظ ہو سکتے ہیں، وہی امن وسکون کی نعمت پاتے ہیں، کہاں ہے آج یہ عدل، ہوا وہوس کے پرستاروں نے، دولت واقتدار کے متوالوں نے پوری انسانیت کو اس نعمت سے محروم کر دیا، اور جنہیں ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا، انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا، اب آزادی ایک سراب ہے جس سے پیاس نہیں بجھ سکتی، یہ ایک بے برگ وثمر درخت ہے، جس کے تلے تڑپتی ہوئی انسانیت کے لئے نہ سکون ہے نہ اطمینان۔

دیگر واقعات

عدل کی حکمرانی صرف خلافت راشدہ تک ہی محدود نہ رہی بلکہ اس کے بعد بھی اسلامی تاریخ میں اس کی چمک پائی جاتی ہے، خلافت عباسی کے دور کا ایک واقعہ بطور مثال ملاحظہ ہو۔

قاضی شُرَیح کی عدالت ہے، ایک غریب مظلوم عورت اپنی فریاد لے کر حاضر ہوتی ہے، عرض کرتی ہے، میری داد رسی فرمائیے، مجھ پر ظلم ہوا ہے، قاضی نے فوراً توجہ فرمائی، پوچھا کس نے ظلم کیا ہے، پتہ چلا، ظالم کوئی معمولی حیثیت کا شخص نہیں، امیر المؤمنین کا چچازاد بھائی، موسیٰ بن عیسٰی ہے، پوچھا گیا تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے، عرض گزار ہوئی، فرات کے کنارے میرے باپ کا ایک کھجور کا باغ تھا، جو اس کے مرنے کے بعد مجھے اور میرے بھائیوں کو ورثہ میں ملا تھا، شہزادہ موسیٰ نے میرے بھائیوں سے ان کا حصہ خرید لیا، مجھ سے بھی میرا حصہ خریدنا چاہا لیکن میں نے منع کر دیا، میرے انکار پر وہ سیخ پا ہو گیا، اس نے میرے باغ پر قبضہ کر لیا اور اس کی دیوار کو گرا کر ایسا کر دیا کہ میں اپنا حصہ پہچان بھی نہیں سکتی، قاضی شریح نے فوراً شہزادے کو حاضری کا حکم جاری کیا، جونہی یہ حکم موسیٰ کو ملا وہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا، پولیس افسر کو بلایا، اور حکم دیا ابھی قاضی شریح کے پاس جاؤ اور کہو کہ تم نے اچھا نہیں کیا کہ عام عورت کی شکایت سن کر میرے خلاف وارنٹ جاری کر دیئے، پولیس افسر نے عدالت میں حاضر ہو کر شہزادے کا پیغام سنایا، قاضی نے پولیس افسر اور اس کے ساتھی سپاہیوں کو جیل میں بند کر دینے کا حکم دیا، تعمیل حکم کی گئی، شہزادے کو اطلاع ملی، وہ خود جیل پہنچا اور اس نے پولیس افسر اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا، قاضی شریح کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا، قاضی شریح نے حکم دیا کہ ہمارے سفر بغداد کا انتظام کیا جائے تا کہ ہم خود خلیفہ کو اس واقعہ سے آگاہ کریں کیونکہ ہم نے خلیفہ سے اس منصب کی درخواست نہیں کی تھی بلکہ خلیفہ نے ہمیں یہ منصب دیا تھا اور اسی وقت ہم نے کہہ دیا تھا کہ ہم یہ منصب اس شرط کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ ہمارے احکام کی تعمیل ہوگی اور خلیفہ خود ہمارے عزت ووقار کا ضامن ہوگا۔

جب شہزادہ موسیٰ کو قاضی کے بغداد روانگی کا علم ہوا تو اسے معاملہ کی نزاکت کا احساس ہوا، وہ قاضی کے دربار میں حاضر ہوا، معافی کا طلب گار ہوا، قاضی نے کہا جب تک تم میرے حکم کی تعمیل نہیں کرو گے، میں بغداد جانے سے نہیں رک سکتا، شہزادے نے عدالت میں حاضری کا وعدہ کیا، وقت مقررہ پر عدالت لگی مظلوم عورت کو طلب کیا گیا، اس نے شہزادے کی موجودگی میں بلاخوف وخطر، اپنی شکایت پیش کی، شہزادے نے اعتراف جرم کیا، عدالت کا فیصلہ صادر ہوا کہ شہزادہ عورت کا

باغ واپس کرے اور جو دیوار گرائی ہے، اسے بنوایا جائے، مجرم نے سر تسلیم خم کیا، عورت خوش ہو کر، قاضی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس چلی گئی، اب قاضی نے کرسی عدالت سے اتر کر کہا" **السلام علیک ایها الامیر** "شہزادے کو اچانک اس تبدیلی پر حیرت ہوئی، قاضی نے کہا، میں آپ کا بحیثیت امیر پورا پورا احترام کرتا ہوں لیکن مظلوم کی دادرسی اور اس کے ساتھ انصاف کرنا، اللہ کے حکم کے مطابق میری ذمہ داری ہے، اس وقت آپ اور ایک عام عورت میرے لئے برابر ہیں، اب اللہ کے حکم کی تعمیل ہوگئی، عدل کی ذمہ داری پوری ہوگئی، اب میری ذمہ داری آپ کا احترام ہے، جسے میں پورا کر رہا ہوں، لہٰذا حیرت کی کوئی بات نہیں۔

سلطان محمود غزنوی، اپنے امراء ورفقاء کے ساتھ، اپنے دیوان میں جلوہ افروز ہیں، امور سلطنت پر گفتگو ہو رہی ہے کہ ایک عام غریب شخص واویلا کرتا دربار میں حاضر ہوتا ہے، سلطان اس کا حال دریافت فرماتے ہیں، وہ شکایت پیش کرتا ہے کہ ایک ترکی سپاہی نے اس کو جبراً گھر سے نکال دیا اور اس کی بیوی پر قبضہ کرلیا، محمود نے اس کی شکایت سن کر کہا، اب تو صبر سے کام لو، یہ رونا دھونا چھوڑو، گھر جاؤ، جب وہ سپاہی دوبارہ ایسا کرے تو مجھے اطلاع دینا، میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا اور صورت حال دیکھوں گا، سپاہی واپس چلا گیا اور تین دن بعد اسی طرح روتا چلاتا، دوبارہ حاضر ہوا، سلطان نے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور نہایت تیزی سے سپاہی کے گھر کی طرف گھوڑا دوڑا دیا، گھر کے قریب پہنچ کر گھر کا محاصرہ کرنے اور بتیاں بجھا دینے کا حکم دیا اور سپاہیوں کو ہدایت کی کہ جونہی مجرم باہر آئے، اس کو قتل کر دیا جائے کیونکہ یہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے، تھوڑی ہی دیر میں مجرم باہر آیا، ہدایت کے مطابق قتل کر دیا گیا، سلطان نے سجدہ شکر ادا کیا اور صاحب خانہ سے کچھ کھانے کے لئے مانگا، اس غریب نے خشک روٹی کے چند ٹکڑے اور پانی پیش کیا، سلطان نے کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا، کسی نے جرأت کی اور آگے بڑھ کر پوچھا اے بادشاہ! یہ سب کیا ہے کہ آپ نے اس طرح مجرم پر حملہ کیا، پھر کھانا طلب فرمایا۔ سلطان نے کہا مجھے کچھ ایسا خیال ہوا کہ کہیں یہ مجرم میرا کوئی بیٹا نہ ہو، لہٰذا میں نے بتیاں بجھا دینے کا حکم دیا تا کہ اسے دیکھ کر میرے عدل میں خلل یا تاخیر واقع نہ ہو، میں چاہتا ہوں کہ میرا انصاف نابینا اور بے رحم ہو، مظلوم کے لئے سہارا، ہو اور ظالم کے لئے اللہ کا عذاب اور سزا۔ اور میں نے کھانا اس لئے طلب کیا کہ جب سے اس شخص نے مجھے اپنی دکھ بھری داستان سنائی، میں نے کچھ نہ کھایا تھا، جونہی میری ذمہ داری پوری ہوئی مجھے سخت بھوک لگی اور میں کھانا مانگنے پر مجبور ہوگیا۔

ماضی قریب کی تاریخ ہند کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو، سلطان مراد نے مملکت خجند سے ایک ماہر تعمیر کی خدمات حاصل کیں تا کہ وہ ایک نہایت حسین وجمیل مسجد تعمیر کرے، تعمیری کام کا آغاز ہوا، جب مسجد مکمل ہوگئی تو سلطان بذات خود اس کے افتتاح کے لئے آیا، اس نے عمارت کو بغور دیکھا، اسے یہ عمارت پسند نہ آئی، معمار سے باز پرس ہوئی اور انجام کار، بطور سزا اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، یہ بے چارہ اسی حال میں روتا، چلاتا، خون میں لت پت عدالت میں پہنچا اور قاضی سے انصاف کا طلب گار ہوتے ہوئے بولا، اے قاضی! تو اللہ کے حکم کے نفاذ کا ذمہ دار ہے، آئین مصطفوی ﷺ کی حفاظت تیرا منصبی فرض ہے، دیکھ میرے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے، میں تیرے بادشاہ کا غلام تو نہیں جو میرے ساتھ ایسا کیا گیا، اللہ کے قرآن کے مطابق میرا فیصلہ کردو، قاضی نے معمار کی حالت زار دیکھی، فوراً بادشاہ کے خلاف وارنٹ جاری کر دیا اور اسے عدالت میں

حاضر ہو کر جواب دہی کا حکم دیا، بادشاہ یہ حکم سن کر خوفزدہ ہو گیا اور ایک مجرم کی طرح عدالت میں حاضر ہوا، عدالت عالیہ میں اس وقت ایک عجیب منظر ہے، ایک طرف ہاتھ کٹا معمار، مدعی کھڑا ہے تو اس کے مقابلے میں صاحب شوکت، مالکِ سلطنت بادشاہ مدعیٰ علیہ اور مجرم کی حیثیت میں موجود ہے، قاضی کے سوال کرنے پر بادشاہ اپنے جرم کا اعتراف بھی کر رہا ہے اور ندامت وشرمندگی کا اظہار بھی، قاضی بلا خوف وخطر، اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ صادر فرماتا ہے کہ تمہیں قصاص ادا کرنا ہوگا یعنی تمہارا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا، عدالت کی نظر میں غلام اور آزاد برابر ہیں، دونوں کے لئے اللہ کا ایک ہی حکم ہے، معمار کے بازو سے بہنے والا خون اتنا ہی سرخ ہے، جتنا بادشاہ کا خون سرخ ہے، بادشاہ حکم الٰہی کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرتا ہے، آستین سے ہاتھ نکال کر کھڑا ہے کہ کاٹ دیا جائے، معمار سے یہ منظر برداشت نہ ہو سکا، وہ خود ہی قرآن کریم کی آیت پڑھتا ہے، ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ'' اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے، پس اے قاضی! مجھے تمہاری عدالت سے عدل و انصاف مل گیا، اب میں اللہ کی رضا کے لئے احسان پر عمل کرتا اور بادشاہ کو معاف کرتا ہوں۔

علامہ اقبال نے بھی اس واقعہ کو اپنی کتاب ''اسرار ورموز'' میں بیان کیا، بطور نتیجہ انہوں نے دو شعر کہے وہ ملاحظہ ہوں۔

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوت آئین پیغمبر نگر

پیغمبری آئین کی سطوت وہیبت کا اندازہ کرو کہ ایک چیونٹی نے سلیمان پر کامیابی حاصل کر لی۔

پیش قرآن بندہ و مولیٰ یکے است
بوریا و مسند دیبا یکے است
حکم قرآن کے سامنے غلام و آقا ایک ہیں
بوریا نشین و تخت نشیں ایک ہیں

اے ایمان والو! ہر حال میں عدل کرو، کہ یہ مظلوم کا سہارا اور ظالم کے لئے عذاب الٰہی سے نجات کا ذریعہ ہے اسی سے افراد کے درمیان میل ومحبت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ایک منظم و باوقار قوم نمودار ہوتی ہے، اسی سے معاشرے میں احساس تحفظ پیدا ہوتا اور سکون وطمانیت کے شب وروز میسر آتے ہیں، اسی سے معاشی خوشحالی اور سیاسی ترقی نصیب ہوتی ہے، اسی سے ملک مستحکم ہوتا ہے، اسی سے دنیا وآخرت کی فلاح وبہبود وابستہ ہے۔

اے ایمان والو! اگر تم نے ہمارے احکام کی تعمیل کی اور ہمارے رسول کے عطا کردہ آئین کو اپنایا، تو تم سے ہمارا وعدہ ہے کہ ہم تمہاری مغفرت بھی کر دیں گے اور تمہیں اجر عظیم بھی عطا فرمائیں گے، جبکہ ہم نے باغیوں کو جہنم میں ڈال دینے کا فیصلہ کر لیا۔

''اللهم اجعلنا من المسلمين الصالحين و ادخلنا الجنه مع عبادك المتقين''

وَصَلَّى اللّٰهُ تعالى على خير خَلْقِه سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۳۳

المائدہ:۱۱

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (المائدہ:۱۱)

اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہوئی، جب پختہ ارادہ کر لیا تھا ایک قوم نے کہ بڑھائیں تمہاری طرف اپنے ہاتھ، تو اللہ نے روک دیا، ان کے ہاتھوں کو تم سے اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔

اے ایمان والو! ابتدائے اسلام کے اس دور کو یاد کرو، جب ہمارے رسول اور ان کے خلاف کفار کی سازشیں اپنے شباب پر تھیں، وہ کسی نہ کسی طرح دین حق کو مٹا دینا چاہتے تھے لیکن اللہ رب العزت جل مجدہ اس دین کی حفاظت و بقاء کا فیصلہ فرما چکا تھا۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبہ:۳۲،۳۳)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچا دے اللہ اپنے نور کو اگر چہ ناپسند کریں (اس کو) کافر، وہی (قادر مطلق) ہے، جس نے بھیجا اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر، تا کہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اگر چہ (یہ غلبہ) مشرکوں کو ناگوار گزرے۔

کفار نے بارہا اس نور کو بجھانے اور مٹانے کی کوششیں کیں مگر ہمیشہ وہ ناکام ونامراد ہی رہے، مکی دور میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ پر کیا کیا ظلم نہ ڈھائے گئے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں پھندا ڈال کر ان کی جان لینے کی کوششیں کی گئیں، حالت سجدہ ان کے سر مبارک پر پوری اوجھڑی کا بار ڈال دیا گیا، ان پر پتھر برسا کر متعدد بار انہیں زخمی کیا گیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مار مار کر بیہوش کر دیا گیا، حضرت خباب بن الارت کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا، یہاں تک کہ ان کی چربی سے کوئلے بجھ گئے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر مظالم کی داستان عام ہے، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو نہایت بیدردی سے شہید کیا گیا، ان کی اہلیہ حضرت سُمیہ رضی اللہ عنہا کے جسم مبارک کو چیر دیا گیا، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو اس قدر مارا جاتا تھا کہ وہ بیہوش ہو جاتے تھے، حضرت صُہیب رومی رضی اللہ عنہ کو ساری ساری رات مارا جاتا تھا، جب یہ ہجرت کرنے لگے تو ان کا سارا مال واسباب چھین لیا گیا، حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ کے گلے میں رسی باندھ کر گرم جلتی ریت پر گھسیٹا جاتا تھا، حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ پر اتنی مار پڑی کہ ان کی ہڈیاں تک دھکنے لگی تھیں، حضرت لبینہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر اپنے مسلمان ہونے سے قبل اتنا مارتے تھے کہ خود تھک جاتے تھے، حضرت زُنیرہ رضی اللہ عنہا کے دماغ پر ایسی ضربیں لگائی گئیں کہ وہ آنکھوں سے محروم ہو گئیں، حضرت نہدیہ، حضرت ام عُبیس بھی ایسے ہی مظالم کا شکار ہوتی رہیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جس دن اپنے اسلام کا اعلان کیا تو انہیں مار مار کر لہولہان کر دیا گیا، انہیں سوائے آبِ زمزم کے کچھ کھانے، پینے کو بھی میسر نہ تھا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو رسیوں سے جکڑ کر خوب پیٹا گیا، حضرت زبیر بن العوام کو چٹائی میں لپیٹ کر، ناک میں دھواں دیا جاتا، جس سے ان کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

غرضیکہ مکی دور کا کوئی دن، کوئی رات اہلِ ایمان کے لئے سکون واطمینان کا نہ تھا، بالآخر ان مظلوموں کو پہلے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ ہجرت کرنا پڑی، مکہ چھوڑ دینے کے بعد بھی کفار اپنی سازشوں سے باز نہ آئے، بار بار مدینہ پر حملہ آور ہوتے رہے اور ہر بار منہ کی کھاتے رہے، مدنی دور میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اہلِ ایمان کو یہودیوں اور منافقوں کی سازشوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زہر دیا گیا، ایک مرتبہ یہودیوں نے آپ پر پتھر لڑھکا کر آپ کی جان لینے کی کوشش کی، یہ یہودی اور منافقین متحد ہو کر مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کرنے اور انہیں آپس میں لڑانے کی کوششیں کرتے رہے، بعض غزوات کے موقع پر منافقین نے دھوکہ دے کر اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، پس:

اے ایمان والو! تم پر یہ اللہ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے تمہارے نبی اور تمہارے اسلاف کو دشمنوں کی ہر سازش سے محفوظ رکھا، اور بالآخر اپنے فیصلہ کے مطابق اُس نے اس دین کو ادیانِ عالَم پر غالب کر دکھایا، اسلام کا یہ سایہ دار درخت جس کے سایہ میں آج تم پناہ گزیں ہو، جس سے تمہاری عزت وآبرو وابستہ ہے، آسانی سے پروان نہیں چڑھا ہے، بلکہ ہر دور میں تمہارے اسلاف اُس کو

اپنے خون سے سیراب کرتے رہے ہیں، پس تم اس کی قدر بھی کرو اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس بھی بیدار رکھو، اس دین کے دشمن اگر ماضی میں تھے تو آج بھی کم نہیں، بلکہ آج کا دشمن زیادہ طاقتور ہے، زیادہ مکار ہے، تم اپنی تاریخ کو فراموش نہ کرو، اسلاف کی طرح اس نور کو ہر طوفان سے بچانے کی سعی سے ایک لمحہ کیلئے بھی غافل نہ ہونا، یہی سب سے بڑا تقویٰ ہے، اس تقویٰ کو حاصل کرنے کیلئے اللہ پر بھروسہ کر کے تم آگے بڑھتے رہو کہ اللہ پر بھروسہ، توکل ہی مؤمن کی شان ہے، اسی سے مؤمن کی ہمت افزائی ہوتی ہے، اسی سے مؤمن میں جرأت پیدا ہوتی ہے، یہی مؤمن کی عزت وعظمت کا ذریعہ ہے، اسی سے اہلِ ایمان بارعب و باوقار ہوتے ہیں، یہ توکل ہی ہے جو مؤمن کو استقلال واستقامت کا پہاڑ بنا دیتا ہے، یہ توکل نصرتِ الٰہی کا وسیلہ ہے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ (آل عمران:١٦٠)

اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد اور صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔

توکل کی اہمیت

توکل کے معنیٰ، ٹیک لگانا، سہارا لینا ہے، ہر معذور جس کا محتاج ہے، ہر کمزور کو جس کی ضرورت ہوتی ہے، بچہ والدین اور بڑوں کے سہارے کے بغیر پروان نہیں چڑھتا، بوڑھا، لاٹھی کے بغیر چل نہیں سکتا، اولاد کے سہارے کے بغیر اس کا گزارا نہیں ہوسکتا، کوئی انسان دوسرے انسان کے سہارے کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا، پس سہارا ہر کسی کی ضرورت ہے، لیکن یہ تمہارے مادی وسائل جن کے سہارے ہم زندگی بسر کرتے ہیں، عارضی ہیں، فانی ہیں، نہایت کمزور ہیں، حقیقی سہارا، قوی سہارا، ساتھ نہ چھوڑنے والا سہارا، اس کا ہے جو سب سہاروں کا سہارا ہے، جو سب سے قوی ہے، جو کسی سہارے کا محتاج نہیں، جس کے سہارے کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچا سکتا، جس کے سہارے پر ہی ساری کائنات کے نظام کا دارومدار ہے، انسان کے سہارے جب ساتھ چھوڑتے ہیں، تو وہ اسی کا سہارا لیتا ہے اور جو اس کا سہارا لے لیتا ہے، اسے پھر کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی، بس اسی کا سہارا کافی ہو جاتا ہے۔

وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۞ (الطلاق:٣)

اور جو (خوش نصیب) اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، تو اس کے لئے وہ کافی ہے بے شک اللہ اپنا کام پورا کرنے والا ہے، مقرر کر رکھا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ۔

جو اپنی کشتی دریا میں چھوڑ کر، اللہ کے سپرد کر دے، اللہ اس کا محافظ ہو جائے گا، اپنے فضل وکرم سے اسے کنارے لگانے کا ذمہ دار ہوگا، لیکن ملاح کے لئے چپو ہلاتے رہنا ضروری ہے کہ حرکت وعمل کے بعد انجام اللہ کے سپرد کر دینے کا نام توکل ہے، اسباب سے قطع نظر کر لینا، جدوجہد، محنت ومشقت سے بیزاری، بے عملی کا نام توکل نہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، ''اگر تم اللہ پر اسی طرح

بھروسہ کرو جیسے بھروسہ کرنے کا حق ہے تو تمہیں پرندوں کی طرح روزی دی جائے گی''۔''تغدوا خماصاً وتروح بطاناً''
صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص اونٹنی پر سوار ہو کر آیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہنے لگا، یا رسول اللہ! میں اپنی اونٹنی یہیں چھوڑے دیتا ہوں اور اس کی حفاظت کے لئے اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا اس کو باندھ دو اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ توکل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں، توکل، ہوا و حرص کو توڑ دینا ہے لیکن ظاہری کوشش تو وہ کسب ہے اور کسب، سنت ہے، یہ قلبی توکل کو مانع نہیں جبکہ بندہ اپنے دل میں یہ یقین کرے کہ بلاشبہ تقدیر اللہ ہی کی طرف سے ہے، پس توکل کا مقام قلب ہے، اللہ کی قدرت پر یقین رکھنا ہی توکل ہے، جس نے کسب کا انکار کیا، گویا اس نے سنت کا انکار کیا اور جس نے توکل کا انکار کیا، پس توکل کا مقام قلب ہے اللہ کی قدرت پر یقین رکھنا ہی توکل ہے، جس نے کسب کا انکار کیا گویا اس نے سنت کا انکار کیا، اس نے گویا ایمان کا انکار کیا، پس جب کوئی چیز، اسباب سے مشکل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا تعلق تقدیر الٰہی سے ہے اور کوئی کام سہل ہو جائے، تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ اللہ ہی کا فضل و کرم ہے لہٰذا تمام اعضاء اور ظاہری قوٰی کو، مادی وسائل و اسباب کے حصول میں کوشاں رکھنا چاہئے کہ یہ اللہ ہی کا حکم ہے اور باطن کو اللہ کے وعدہ سے مطمئن رکھنا اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

گر توکل میکنی درکار کن
کشت کن پس تکیہ برجبار کن

اگر تو، توکل کا دعویٰ کرتا ہے تو کام میں مشغول ہو جا، پہلے تخم ریزی کر پھر اللہ پر بھروسہ کر۔

رمزِ الکاسب حبیب اللہ شنو
از توکل در سبب کاہل مشو

اس حدیث میں جو رمز ہے، اسکو سن کہ محنت کرنے والا، اللہ کا دوست ہے، توکل کی وجہ سے اسباب حاصل کرنے میں سستی نہ کرو۔

سلف صالحین کا یہ قول بھی قابل غور ہے ''اِتَّجِرُوْا وَاکْتَسِبُوْا فَاِنَّکُمْ فِیْ زَمَانٍ اِذَا احْتَاجَ اَحَدُکُمْ کَانَ اَوَّلُ مایأ کُلُ دِیْنَہٗ'' کاروبار کرو اور رزق حلال کماؤ کیونکہ تم ایسے زمانہ میں ہو کہ جب کوئی شخص محتاج ہو جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے دین و ایمان کو بیچنا شروع کر دیتا ہے۔

غرضیکہ سستی، لاپرواہی، بے عملی یا بے کاری، توکل نہیں بلکہ عزم مصمم کے بعد پورے اعتماد کے ساتھ قدم اٹھا کر، کام کرنے کے بعد اس کا انجام اللہ کے سپرد کر دینے اور اس کی رضا پر راضی ہو جانے کا نام توکل ہے، جو کامیابی و کامرانی کی صورت میں انسان کو شکر پر آمادہ کرتا ہے اور ناکامی پر صبر کی ہمت پیدا کرتا ہے، قرآن کریم کی روشنی میں انبیاء کرام علیہم السلام کے توکل کی کیفیت پر غور کیجئے اور پھر اس کی افادیت کا اندازہ لگائیے۔

انبیاء کا توکل

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو للکارتے ہوئے، اپنے رب پر توکل کا اعلان فرما رہے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قوم کی ضلالت وگمراہی اور سرکشی کے باوجود، اس مردحق آگاہ کو اپنی کامیابی وکامرانی کا کیسا یقین محکم ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ (یونس: ۷۱)

اور (اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) انہیں سنایئے نوح علیہ السلام کی خبر جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر دشوار ہے تم پر میرا قیام اور میری نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے پس (سن لو) میں نے تو اللہ پر توکل کر لیا ہے پس تم بھی اپنے شریکوں سے مل کر کوئی متفقہ فیصلہ کر لو پھر تمہارا یہ فیصلہ تم پر مخفی نہ رہے، پھر کرو میرے ساتھ (جو چاہو) اور مجھے (بالکل مہلت نہ دو)،

حضرت ہود علیہ السلام، معبودانِ باطلہ کا اعلان کرتے ہوئے، قوم کو چیلنج کرتے ہوئے فرماتے ہیں "میرے خلاف جو بھی سازش کرنا چاہتے ہو، کرو، مجھے بالکل مہلت نہ دو" مجھے تمہاری کسی سازش کی پرواہ نہیں کیونکہ

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (ہود: ۵۶)

بلاشبہ میں نے بھروسہ کر لیا ہے اللہ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے کوئی جاندار بھی ایسا نہیں، مگر اللہ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے، بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت حق دی، بڑی ہی حکمت وتدبیر کے ساتھ انہیں نصیحت کی، لیکن ان ظالموں نے اپنے نبی کا مذاق اڑایا، پس انہوں نے فرمایا:

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝ (ہود: ۸۸)

میں تمہاری اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا، جہاں تک میرا بس ہے اور میری کامیابی کا دارومدار صرف اللہ کی امداد پر ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون کے مظالم میں گرفتار، اپنے وفا شعار، صحابہ کی تربیت کرتے ہوئے انہیں وہ پہلا اہم ترین اصول بتاتے ہیں، جس سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹتی ہیں، جبر واستبداد سے آزادی میسر آتی ہے اور فرعون جیسی طاغوتی قوت بھی سرنگوں ہو جاتی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (یونس: ۸۴، ۸۵، ۸۶)

اور موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اے میری قوم! اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو پس انہوں نے عرض کیا، اللہ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا، اے ہمارے رب! نہ بنا ہمیں فتنہ ظالم قوم کے لئے اور نجات دے ہمیں اپنی رحمت سے کافروں (کے ظلم وستم) سے۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بیٹوں کو مصر جانے کی اجازت دیتے ہوئے، ہدایت فرمائی کہ تم سب شہر میں ایک دروازہ سے داخل نہ ہونا بلکہ دو دو، تین تین ہو کر مختلف دروازوں سے داخل ہونا تاکہ حاسدین کے شر اور بد نظروں کی نظر سے محفوظ رہو، ویسے ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا کہ اسی کا حکم جاری ہوتا ہے، پس میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ

عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (یوسف: ۶۷)

اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے بھروسہ کرنے والوں کو۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی قوم کے مشرکانہ عمل سے برأت کا اظہار اور لاتعلقی کا اعلان کرنے کے بعد رب کے حضور عرض گزار ہوتے ہیں، اے رب! ہم سارے سہارے اور ظاہری اسباب و وسائل ختم کر دیتے ہیں اب ہمارا بھروسہ صرف تیری ہی ذات پر ہے، دنیا بھر سے منہ موڑ کر، اب ہم نے تیری طرف رخ کر لیا ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہمیں تیرے ہی حضور حاضر ہونا ہے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (الممتحنۃ: ۴)

اے ہمارے رب! ہم نے تجھ ہی پر بھروسہ کیا ہے اور تیری طرف رجوع کیا اور تیری طرف ہی ہمیں پلٹ کر آنا ہے۔

اب ملاحظہ ہوں چند آیات جن میں اللہ رب العزت اپنے پیارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہر حال میں توکل کی ہدایت فرماتا ہے تاکہ یہ خوبی اہلِ ایمان کے لئے اُن کے آقا ﷺ کی سنت قرار پائے اور ہر حال میں اس کو اپنانا، ان کیلئے محبوب و پسندیدہ بن جائے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران: ۱۵۹)

اور (اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) جب آپ ارادہ کر لیں تو پھر توکل کرو اللہ پر بے شک اللہ محبت کرتا ہے، توکل کرنے والوں سے۔

کسی کام کے آغاز سے قبل اس میں کامیابی و ناکامی کے اسباب و علل پر غور و فکر کر لینے کے بعد اس کی طرف قدم بڑھانے کا پختہ ارادہ کر لینے کو عزم کہا جاتا ہے، عزم کے مرحلے پر پہنچنے کے بعد تذبذب میں مبتلا ہونا، نبی کے شایان شان نہیں اور نہ ہی نبی کے غلاموں کو زیب دیتا ہے، عزم کے بعد توکل کی منزل آتی ہے، جس کی طرف نبی کو قدم بڑھانے کا حکم دیا گیا اور یہ طریقہ کار اختیار کرنے والوں کو اپنی محبت کا یقین دلایا گیا، تاکہ نبی کے غلام بھی نبی کی اتباع و پیروی کرتے ہوئے یہی طریقہ کار اختیار کریں، دیگر مقامات پر ارشاد ہوتا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖ٘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۲۹﴾ (توبہ:۱۲۹)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) اگر (کفار) آپ کی اطاعت سے منہ موڑیں، تو آپ فرما دیں، مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

وَهُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾ (الرعد:۳۰)

اور یہ کفار انکار کر رہے ہیں رحمٰن کا، (اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ فرمائیے وہی میرا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی طرف رجوع کئے ہوں۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّیْ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۖۗ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴿۱۰﴾ (الشوریٰ:۱۰)

اور جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد کر دو یہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۹﴾ (الملک:۲۹)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ فرما دیجئے، وہ (میرا خالق) بڑا ہی مہربان ہے، ہم اسی پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے، پس عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے۔

قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ؕ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾ (الزمر:۳۸)

فرما دیجئے مجھے اللہ ہی کافی ہے، صرف اسی پر بھروسہ کرتے ہیں بھروسہ کرنے والے۔

توکل کی تاکید

انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کے مطابق اہل ایمان کو بھی توکل کی ہدایت فرمائی گئی اور اسے مؤمنین کاملین کی علامات میں سے ایک علامت قرار دیا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾ۚۖ (انفال:۲)

صرف وہی سچے ایماندار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ کا تو کانپ اٹھتے ہیں انکے دل اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور صرف اپنے رب پر وہ بھروسہ کرتے ہیں۔

الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾ (نحل:۴۲)

جنہوں نے صبر کیا اور (مشکلات میں) اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (عنکبوت:۵۸،۵۹)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے انہیں ہم ٹھہرائیں گے جنت کے بالا خانوں میں، جاری ہوں گی جن کے نیچے نہریں، وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے کتنا اچھا صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا، (یہ وہ لوگ ہیں) جنہوں نے صبر کیا (ہر مصیبت پر) اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔

بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب اپنا سارا مال، اللہ کی راہ میں پیش کر دیا تو بعض لوگوں نے انہیں ملامت کی اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا، اب تم اپنی دوسری ذمہ داریاں کیسے پوری کرو گے، اس موقع پر اللہ رب العزت نے حضرت ابوبکر اور ان کے نقش قدم پر قیامت تک چلنے والوں کو مژدہ دیا کہ یہ دولت وثروت جس کی محبت میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے، فانی ہے، چند روزہ ہے، ہاں اہل ایمان کے لئے، اللہ پر توکل کرنے والوں کے لئے، اللہ کے پاس جو کچھ محفوظ ہے اس کا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، وہی باقی ہے، دائمی ہے۔

فَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (شوریٰ:۳۶)

پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے، یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ بہت عمدہ اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اسلام نے اہل ایمان کو زندگی کے جو اصول عطا فرمائے ہیں، ان میں توکل، صبر، شکر اور قناعت ان چمکدار تاروں کی طرح ہیں جو رات کی تاریکی میں بھی مسافر کو اس کی منزل کا پتہ دیتے رہتے ہیں، یہ زندگی جو ایک مسلسل سفر ہے، جس کے راستے میں کانٹے ہی کانٹے ہیں، طوفان ہی طوفان ہیں، اگر اس میں توکل، صبر، شکر اور قناعت کی چمک نہ ہو تو مسافر ساری عمر بھٹکتا ہی رہتا ہے، تاریکیوں میں ٹھوکریں ہی کھاتا رہتا ہے، جتنا آگے بڑھتا ہے، اتنا ہی منزل سے دور ہوتا ہے، وہ ہوا و ہوس کے مرض میں ایسا مبتلا ہوتا ہے کہ بالآخر اسے موت آ لیتی ہے جبکہ توکل کی چمک انسان میں آگے بڑھتے رہنے کی ہمت پیدا کرتی ہے، صبر طوفانوں سے ٹکرانے کی جرأت پیدا کرتا ہے، شکر اس کی راہ کے کانٹوں کو پھول بنا دیتا ہے اور قناعت سے سکون و اطمینان میسر آتا ہے، اب کامیابی و کامرانی اس مؤمن کا مقدر بنتی ہے اور خوشحالی اس کا نصیب ہوتی ہے، ہمیں اپنے تمام اسلاف کی زندگیوں میں اسی نور کی جھلک نظر آتی ہے، جس کی روشنی میں وہ آگے بڑھتے رہے، کامیاب و کامران زندگی بسر کر گئے، انہوں نے یقیناً اپنی منزل کو پالیا، پس اے ایمان والو! تم اگر چاہتے ہو کہ تمہیں خوشحالی نصیب ہو، تمہاری زندگی کے شب و روز پر امن اور پر سکون ہوں، تو تم بھی اپنے اسلاف کی طرح ان خوبیوں کو اپنا لو، زندگی پر لطف ہو جائے گی، کامیابی و کامرانی قدم بوس ہوگی، اللہ عمل کی توفیق دے، آمین بجاہ رحمۃ العالمین ﷺ۔

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مقالہ ۳۴

المائدہ:۳۵

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ (المائدہ:۳۵)

اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ اور جدوجہد کرو اس کی راہ میں تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اے ایمان والو! تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ ایمان کے ثمرات حاصل کرنے کے لئے تم تقویٰ حاصل کرو، قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو، ایمان وتقویٰ کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتے رہو، یہی تمہاری کامیابی وکامرانی کے ذرائع ہیں۔

ایمان، تقویٰ، وسیلہ، جہاد، ان میں بالترتیب ربط ہے، تعلق ہے کہ ایمان تخم ہے، بیج ہے۔ تقویٰ، ایمان کا ثمر ہے جو اعمال صالحہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایمان کے بغیر تقویٰ، اعمال صالحہ نہ انسان کی دنیاوی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں ان کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور تقویٰ بغیر وسیلہ کے حاصل نہیں ہوسکتا، وسیلہ چاہے اعمال کا ہو یا عاملین

صالحین کا ایمان، تقویٰ، وسیلہ کی حفاظت و بقاء کے لئے پیہم جدوجہد لازمی ہے یعنی اُن تمام چیزوں کے مقابلے میں نہایت استقلال و استقامت سے ڈٹ جانا ضروری ہے جو ان تینوں کے مخالف ہوں، چاہے وہ کفار و مشرکین ہوں یا ہواؤ ہوسِ نفس ہو، جب مؤمن تقویٰ، وسیلہ، جہاد کی خوبیاں پیدا کر لیتا اور ان سے آراستہ و پیراستہ ہو جاتا ہے تو کامیابی و کامرانی اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔

تقویٰ

مؤمن کا ہر حال میں، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل کرنا، تقویٰ کہلاتا ہے، جو بغیر ایمان کے قابل اعتبار نہیں یعنی وہ شخص متقی نہیں سمجھا جا سکتا، جس کا ایمان ہی نہ ہو کہ ایمان ہی درحقیقت وہ تخم ہے جس سے تقویٰ کا درخت اگتا ہے اور اسی پر عمل صالحہ کے پھل آتے ہیں، صرف نیکیوں سے تقویٰ حاصل نہیں ہوتا بغیر ایمان کے تقویٰ یا صالحیت تو درکنار، صحابیت بھی نصیب نہیں ہوتی جبکہ رسول کی نظر یا صحبت، اعمال صالحہ سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے کہ ایک لمحہ کی صحبت یا ایک نظر، تقویٰ کی اس انتہائی منزل پر پہنچا دیتی ہے جس پر برسہا برس عبادت کرنے والا نہیں پہنچ سکتا، بس شرط یہ ہے کہ یہ صحبت اسے نصیب ہو یا یہ نظر اس پر پڑے، جس کے قلب میں ایمان کی تخم ریزی ہو چکی ہو اور اگر ایمان نہیں تو نبی کی صحبت و نظر کیا، نبی کی نسل اور خون کا بھی اثر نہیں ہو سکتا، دیکھ لیجئے حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بیٹا کنعان تک کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکا، صرف مؤمن نہ ہونے کے سبب ''اہل'' سے خارج قرار دے دیا گیا اور عذاب الٰہی سے محفوظ نہ رہ سکا، قرآن کریم بتاتا ہے:

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۴۵﴾ (ہود: ۴۵)

اور پکارا نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب کو اور عرض کی میرے پروردگار! میرا بیٹا بھی تو میرے اہل سے ہے اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے۔

مادی و ظاہری اعتبار سے بیٹے سے زیادہ باپ کے قریب کون ہو سکتا ہے، باپ کی دولت، عزت، شہرت، سب کا وارث بیٹا ہی تو ہوتا ہے لیکن رشتوں کو پیدا کرنے والے کے نزدیک ایک ناپاک قطرۂ آب سے قائم ہونے والے رشتوں کی کوئی اہمیت و حیثیت نہیں، اصل رشتہ وہ ہے جو ایمان کے تخم سے قائم ہوتا ہے جہاں یہ رشتہ نہیں وہاں نہ عزت و شہرت میں شراکت ہے اور نہ دولت میں وراثت اور نہ ہی عذاب الٰہی سے نجات، حضرت نوح علیہ السلام کو یہی بتایا گیا:

قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۫ۖ فَلَا تَسْــٴَـلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۴۶﴾ (ہود: ۴۶)

اللہ نے فرمایا، اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں (کیونکہ) اس کے عمل اچھے نہیں، پس مجھ سے سوال نہ کرو، اس کے متعلق جس کا تمہیں علم نہیں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جانا۔

''عمل غیر صالح'' سے مراد، کنعان کا کفر ہے جیسا کہ علماء نے تصریح کی ہے کہ وہ کھلم کھلا نوح علیہ السلام کا مخالف

اور کافر تھا، پس ایمان نہ ہونے کے باعث اسے اہل سے خارج قرار دیا گیا، دیگر کفار کے ساتھ عذاب الٰہی میں مبتلا کیا گیا، نوح علیہ السلام کو اس سوال پر تنبیہ کی گئی اور قرآن کریم کے ذریعہ ہم تک اس حقیقت کو پہنچایا گیا'' کہ اللہ کے نزدیک صرف تخم ایمان ہی قابل اعتبار ہے، جس کے بغیر نہ صالحیت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ صحابیت'' اسی لئے قرآن کریم تقویٰ کی تاکید صرف اہل ایمان ہی کو کرتا ہے، سوائے ان چند مقامات کے جہاں'' یایھا الناس'' کے عام خطاب کے ساتھ'' اتقوا'' فرمایا گیا لیکن یہاں تقویٰ سے مراد اس کا ابتدائی مرحلہ، اس کی تخم ریزی، یعنی ایمان ہی ہے۔

تقویٰ کا پھل اعمال صالحہ ہیں، یا یوں کہیے کہ اعمال صالحہ ایسے پھول ہیں، جن سے تقویٰ کی مہک آتی ہے، ان کا رنگ متقی کے چہرے کو چمکا دیتا اور منور کر دیتا ہے جس سے تقویٰ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، پس اعمال صالحہ کے بغیر متقی ہونے کا دعویٰ، لایعنی اور بیکار ہے، نہ دنیا میں اس کا کوئی فائدہ اور نہ ہی آخرت میں اس کا کوئی اثر اور جس نے تقویٰ کا ثبوت اعمال صالحہ سے فراہم کیا، وہی دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی سے سرفراز ہوا۔

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (اعراف:۳۵)

پس جس نے تقویٰ اختیار کیا اور نیک بن گیا تو نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ (قیامت میں) غمگین ہوں گے۔

تقویٰ، اللہ کی مدد کا ذریعہ ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (البقرہ:۱۹۴)

اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو بیشک اللہ (کی مدد) پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

تقویٰ، آخرت کے لئے بہترین توشہ ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (البقرہ:۱۹۷)

اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پرہیز گاری ہے اور ڈرتے رہو، مجھ سے اے عقل م !

تقویٰ، قیامت کے دن بلندی و عظمت کا ذریعہ ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (البقرہ:۲۱۲)

مزین کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا حالانکہ پرہیز گاروں کی شان بلند ہوگی ان سے قیامت کے دن اور اللہ روزی، جسے چاہے، بے حساب دیتا ہے۔

تقویٰ، اللہ کی محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران:۷۶)

ہاں کیوں نہیں، جس نے پورا کیا اپنا وعدہ اور پرہیز گار بنا تو بیشک اللہ محبت کرتا ہے، پرہیز گاروں سے۔

تقویٰ، حصول جنت کا ذریعہ ہے کہ جنت صرف متقین کے لئے بنائی گئی ہے۔

وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿﴾ (آل عمران:۱۳۳)

اور دوڑو بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے، اور (دوڑو) جنت کی طرف، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لئے۔

تقویٰ، اختیار کرنے والوں کو آخرت میں بہترین ٹھکانہ نصیب ہوگا، جنت میں انہیں خصوصی انعامات اور میزبانی سے نوازا جائے گا۔

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿﴾ (النحل:۳۰۔۳۲)

اور پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے کہ وہ کیا ہے جو اتارا تمہارے رب نے، انہوں نے کہا خیر، جنہوں نے اچھے کام کئے، اس دنیا میں بھی ان کے لئے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بھی (ان کے لئے) بہتر ہے اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر، (ان کے لئے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں، جن میں وہ داخل ہوں گے، جاری ہوں گی ان کے نیچے نہریں، ان کے لئے وہاں ہر وہ چیز ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے یوں بدلہ دیتا ہے، اللہ پرہیزگاروں کو وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں، فرشتے کہتے ہیں سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں، ان (نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے۔

تقویٰ، ہی قیامت کے دن ذریعہ نجات ہوگا۔

وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿﴾ (الزمر:۶۱)

اور اللہ نجات دے گا متقیوں کو کامیابی کے ساتھ اور نہ چھوئے گی انہیں کوئی تکلیف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تقویٰ اور اعمال صالحہ سے زندگی کے تمام مراحل، سہل و آسان ہو جاتے ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۙ﴿﴾ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿﴾ (اللیل:۵۔۷)

پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) اپنا مال دیا، اور (اسی سے) ڈرتا رہا اور جس نے اچھی بات کی تصدیق کی
تو ہم آسان کردیں گے اس کے لئے آسان راہ۔

پس تقویٰ، کامیابی وکامرانی کے ذرائع میں سے ایک اہم ترین اور بنیادی ذریعہ ہے، جس کے حصول کے لئے ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق وسیلہ تلاش کرنا لازمی ہے۔

وسیلہ

وسیلہ کی تعریف کرتے ہوئے علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں ''هِيَ فِي الْاَصْلِ مَايُتَوَصَّلُ بِهٖ اِلَى الشَّيْئِ وَيُتَقَرَّبُ بِهٖ'' جس چیز سے کسی چیز تک رسائی حاصل کی جائے، نیز علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں، ''قَالَ الْجَوْهرِيُّ، اَلْوَسِيْلَةُ مَايُتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَى الْغَيْرِ'' امام لغت علامہ جوہری نے کہا کہ جس چیز سے غیر کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے۔

وسیلہ، انسان کی ضرورت ہے، جس کا ہر انسان محتاج ہے، بچہ اپنی تعلیم وتربیت کے لئے والدین کے وسیلہ کا محتاج ہے، مرد وعورت کو ایک دوسرے کا وسیلہ درکار ہے، ہر کمزور، طاقتور کے وسیلہ کا محتاج ہے، غریب امیر کا، امیر غریب کا وسیلہ ہے، حتیٰ کہ جانور انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے انسان کا وسیلہ ہیں، غرضیکہ قانونِ فطرت کے مطابق دنیا کے تمام معاملات کا دارومدار کسی نہ کسی طرح وسیلہ پر ہے، جبکہ ہر ضرورت کو پورا کرنے والا، حقیقتاً اللہ ہی ہے، بچہ کی پرورش کا وسیلہ بلاشبہ والدین ہیں لیکن حقیقت میں اس کی پرورش کرنے والا اللہ ہی ہے، غریب کی روزی کا وسیلہ دولت مند ہیں جبکہ حقیقت میں روزی دینے والا، اللہ ہی ہے، مرض سے نجات کا وسیلہ دوا اور ڈاکٹر ہے جبکہ حقیقت میں شفاء دینے والا اللہ ہی ہے وسیلہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی روح انسان کے جسم میں لیکن اس کے باوجود اللہ کی وحدانیت پر اس کا کوئی اثر نہیں، یعنی جو لوگ ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان وسائل کا سہارا لینے کے باوجود، اپنے دعویٰ میں سچے اور بلاشبہ مؤمن ہیں اور اسی لئے اہلِ ایمان کو خصوصی طور پر خطاب کرتے ہوئے وسیلہ اختیار کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ حکم دیا گیا ہے ''وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ'' اور رب کا قرب حاصل کرنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو۔

وسیلہ سنتِ الٰہیہ ہے

دنیاوی امور میں وسیلہ تلاش کر لینا، انسان کی جبلت اور فطرت ہے، جیسے نوزائیدہ بچہ، ماں کا دودھ حاصل کرنے کے لئے، رونے اور چلانے کو وسیلہ بنالیتا ہے لیکن اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے وسیلہ کا ناگزیر ہونا، محتاجِ بیان وتعارف تھا، جس کے لئے واضح حکم کی ضرورت تھی لہٰذا فرمایا گیا ''وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ'' قربِ الٰہی کے لئے وسیلہ تلاش کرو اور اس کی اہمیت کے اظہار کے لئے اللہ نے خود وسیلہ اختیار فرمایا، جو بلاشبہ وسیلہ کا محتاج نہیں، مثلاً انسان کی ہدایت کے لئے اپنے نبیوں کو وسیلہ بنایا، انبیاء ورسل کو اپنا پیغام پہنچانے کے لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا وسیلہ اختیار فرمایا، حتیٰ کہ اپنی قدرت کاملہ کے مظاہرہ کے موقع پر بھی وسیلہ اختیار فرمایا، مثلاً بلاشبہ اللہ قادر مطلق نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ سے بغیر باپ کے پیدا فرمایا لیکن اس عمل کی تکمیل کے لئے بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو وسیلہ بنایا جبکہ ''کن فیکون'' کی شان کا مالک، بلاواسطہ جبرئیل بھی اپنی قدرت کا مظاہرہ فرمانے پر یقیناً قادر تھا، قرآن کریم کی آیات ذیل پر غور فرمائیے اور وسیلہ کی

اہمیت کا اندازہ کیجئے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ (مریم:۱۶ تا ۱۹)

اور (اے حبیب ﷺ) بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہوگئی اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا، پس بنالیا، اس نے لوگوں کی طرف سے پردہ پھر ہم نے بھیجا، اس کی طرف اپنے جبرئیل کو پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں، مریم بولیں میں پناہ مانگتی ہوں رحمن کی تجھ سے، اگر تو پرہیزگار ہے، جبرئیل نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ میں عطا کروں تجھے ایک پاکیزہ فرزند۔

پس سنتِ الٰہیہ یہی ہے کہ مشیت وحکمت کی تکمیل کے لئے وسیلہ اختیار کیا جائے تاکہ بندے وسیلہ کی اہمیت کو جانیں، قربِ الٰہی کے لئے اس کو تلاش کریں اور مؤمنین ومؤحدین اسے نہ تو توحید کی ضد خیال کریں اور نہ ہی اس شائبہ میں مبتلا ہوں کہ اس سے عقیدۂ توحید مجروح یا ضعیف ہوتا ہے۔

وسیلہ سنتِ انبیاء ہے

وسیلہ سنتِ انبیاء کرام علیہم السلام ہے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگی کہ بروایت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بتایا کہ:

جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطاء ہوئی تو انہوں نے اس طرح دعا کی، "يَارَبِّ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لِمَاغَفَرْتَ لِيْ" اے رب میں تجھ سے بوسیلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف فرمادے، پس اللہ نے فرمایا، اے آدم! تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسے پہچانا حالانکہ میں نے انہیں ابھی پیدا بھی نہیں کیا، حضرت آدم نے عرض کی کیونکہ اے رب! جب تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور تو نے مجھ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو عرش کے پایوں پر، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا تھا پس میں نے جان لیا کہ تو نے جس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے وہ تجھ کو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہوگا، اللہ نے فرمایا اے آدم! تم نے سچ کہا وہ مجھے مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہیں اور کیونکہ تم نے ان کے وسیلہ سے سوال کیا ہے اس لئے میں نے تم کو بخش دیا اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔ (دلائل النبوۃ)

دیگر انبیاء کرام کے واقعات بھی ایسے موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے وسیلہ اختیار کیا، حتیٰ کہ میرے آقا ﷺ نے خود اپنے وسیلہ جلیلہ سے دعا مانگی، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں کہ:

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ، حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم رضی اللہ عنھا کا انتقال ہو گیا تو جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کی قبر کھودنے سے فارغ ہو گئے تو آپ ﷺ ان کی لحد میں داخل ہوئے اور لیٹ گئے اور یہ دعا کی، ''اللہ ہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے اور وہی زندہ ہے، جسے موت نہیں آئے گی، اے اللہ! تو میری ماں (چچی) کی مغفرت فرما، اُن کی حجت القا فرما، ان کی قبر کو وسیع کر''، ''بحق نبیک وَالْاَنْبِیَآءِ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِیْ فَاِنَّکَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْن'' اپنے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء کے وسیلہ سے کہ تو سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، پھر آپ ﷺ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور حضرت عباس و حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما کے ساتھ انہیں قبر میں اتارا۔ (وفاء الوفی)

نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں وسیلہ طلب کرنے کی تلقین فرمائی، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

جو شخص اپنے گھر سے نماز پڑھنے کے لئے نکلا اور اس نے یہ دعا کی، اے اللہ! تجھ پر سائلین کا جو حق ہے میں اس کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں اور میرے اس (نماز کے لئے) جانے کا جو حق ہے، میں اس کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کیونکہ میں بغیر اکڑنے اور اترانے اور بغیر دکھانے اور سنانے کے محض تیری ناراضگی کے ڈر اور تیری رضا کی طلب میں نکلا ہوں، پس میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے جہنم سے اپنی پناہ میں رکھنا اور میرے گناہوں کو بخش دینا اور بلاشبہ تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخشنے کا (پس جو شخص یہ دعا کرے گا) اللہ اس کی طرف متوجہ ہوگا اور ستر ہزار فرشتے، اس کے لئے استغفار کریں گے۔

(ابن ماجہ)

وسیلہ سنت صحابہ ہے

وسیلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی سنت ہے حضرت مالک الدار، جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے وزیر خوراک تھے، بیان کرتے ہیں کہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا، ایک شخص (حضرت بلال بن حارث مزنی) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضہ مبارکہ پر حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! اپنی امت کے لئے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ (قحط سے) ہلاک ہو رہے ہیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس شخص کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا کہ عمر کے پاس جاؤ اور ان کو میری طرف سے سلام کہو اور ان کو یہ خبر دو کہ تم پر یقیناً بارش ہوگی اور ان سے کہو کہ تم سوجھ بوجھ سے کام لو اس شخص نے جا کر حضرت عمر کو خبر دی، حضرت عمر نے کہا اے میرے رب! میں صرف اسی چیز کو ترک کرتا ہوں جس سے میں عاجز ہوں،

(البدایہ والنہایہ)

غرضیکہ وسیلہ، قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے، جس سے کمال تقویٰ حاصل ہوتا ہے، اللہ جل مجدہ نے اسے تلاش کرنے کا

حکم دیا، جس کے مطابق ہمیشہ اللہ کے بندوں نے اسے تلاش کیا اور اختیار کیا، علماء نے آداب دعا میں اس کو شمار کیا ہے، ''ویتوسل الی اللہ بانبیآئہٖ و الصالحین'' اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا وسیلہ پیش کیا جائے، یہ وسیلہ چاہے نیکیوں کا ہو یا نیکوں کا دنیا میں موجود شخصیات کا ہو، یا ان کا ہو جو دنیا میں نہ رہے، بہرحال مقبول ہے بشرطیکہ یقین کامل، عقیدت تامہ اور محبت صادقہ کے ساتھ ہو، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

کاش میری عقل ان لوگوں کے پاس ہوتی جو اولیاء اللہ سے استمداد اور ان کی امداد کا انکار کرتے ہیں۔ یہ اس کا کیا مطلب سمجھتے ہیں، جو کچھ ہم سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ دعا کرنے والا، اللہ کا محتاج ہے اور اللہ ہی سے دعا کرتا ہے اور اسی سے اپنی حاجت طلب کرتا ہے اور اللہ کے ولی کا وسیلہ پیش کرتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے اپنے اس بندۂ مکرم پر جو رحمت فرمائی اور اس پر جو لطف و کرم کیا ہے، اس کے وسیلہ سے میری حاجت کو پورا فرما کہ تو دینے والا کریم ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس اللہ کے ولی کو ندا کرتا ہے اور اس کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے کہ اے بندۂ خدا! اور اے اللہ کے ولی! میری شفاعت کیجئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میرا سوال اور میرا مطلوب مجھے عطا فرمائے اور میری حاجت بر لائے، سو مطلوب کو دینے والا اور حاجت کو پورا کرنے والا، صرف اللہ ہی ہے اور یہ بندہ درمیان میں صرف وسیلہ ہے جبکہ قادر، فاعل اور اشیاء میں تصرف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اولیاء اللہ، تو اللہ کے فعل، سطوت، قدرت اور غلبہ میں فانی و ہالک ہیں، ان کو نہ تو اب قبر میں افعال پر قدرت اور تصرف حاصل ہے اور نہ اس وقت قدرت اور تصرف حاصل تھا، جب وہ زندہ تھے۔ (اشعۃ اللمعات)

وسیلہ کا عنوان دیگر شرعی عنوانات کی طرح نہایت صاف ستھرا اور واضح ہے، ہاں جن لوگوں کو امت میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کی عادت ہے، انہوں نے بعض دیگر مسائل کی طرح اس مسئلہ کو بھی خاصا الجھا دیا ہے اور اس کے جواز کا عقیدہ رکھنے والوں کو مشرک تک کہہ دیا ہے اور وہ تمام قرآنی آیات و احادیث، اس کے عدم جواز میں پیش کر ڈالیں جو کفار و مشرکین کے لئے ہیں، جو بتوں کو وسیلہ بناتے اور شرک کرتے ہیں، ان جھمیلوں میں پڑنا اور ان حضرات کے اعتراضات کے جوابات دینا ہماری عادت نہیں ہم اپنے اسلاف کے عقائد کے پابند ہیں جو بلاشبہ قرآن و حدیث اور اجماع صحابہ سے ماخوذ ہیں اور حق ہیں، ان کے خلاف ہر عقیدہ باطل ہے۔ وسیلہ کے موضوع پر بھی ہم نے یہی طریقہ اختیار کیا اور جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کر دیا، یہی حق ہے، اور کافی ہے، اللہ عمل کی توفیق دے۔

منہ بھی دیکھا ہے کسی کے عفو کا
دیکھ لو عصیاں نہیں ہے یار ہم

جہاد

اہل ایمان کے لئے تیسری ہدایت ہے کہ'' وجاھدوا فی سبیلہ'' اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہو، محنت و مشقت اور منزل کے حصول کے لئے سعی اور کوشش کرنا، جہاد ہے۔ کفر و شرک کی تاریکی کو چیر کر طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے، خاردار

وادیوں سے گزرتے ہوئے، منزل کی طرف بڑھتے رہنا، جہاد ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ صرف میدان کارزار میں، کفار ومشرکین کے مقابلہ پر قوت وطاقت کے مظاہرے، نیزہ وتلوار کے جوہر دکھانے ہی کا نام نہیں بلکہ شمعِ اسلام کی حفاظت، دین کی بقاء کے لئے جو بھی محنت ومشقت کی جائے، جو بھی اقدام کیا جائے جہاد ہی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غزوات، صحابہ کے سرایا اور اہل ایمان کی کفار ومشرکین سے جنگیں بھی جہاد ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کفار ومشرکین کے مظالم سہنا، صحابہ کرام کا مصائب برداشت کرنا، ان پر صبر کرنا حتیٰ کہ ترکِ وطن پر مجبور ہونا بھی جہاد ہے، علاوہ ازیں دین کی پابندی میں محنت ومشقت کرنا بھی جہاد میں ہی شامل ہے، مؤمن جس نوعیت کا بھی جہاد کرتا ہے، اس میں سراسر اس کا اپنا ہی فائدہ ہوتا ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (عنکبوت:٦)

اور جو شخص کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے فائدے ہی کے لئے کوشاں ہے، بیشک اللہ تو غنی ہے تمام کائنات سے۔

جہاد کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ معاون ومددگار ہوتا ہے، اس طرح کہ ان کے لئے خاردار راہوں کو سہل وآسان بنا دیتا ہے اور انہیں منزل مقصود سے قریب کردیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (عنکبوت:٦٩)

اور جو مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لئے ہم ضرور دکھادیں گے انہیں اپنے راستے، اور بیشک اللہ ہر وقت محسنین کے ساتھ ہے۔

رب رحیم وکریم کی یہ نوازشات صرف ان لوگوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں جو ظاہری دشمنوں کے خلاف میدان جنگ میں برسرپیکار ہوتے ہیں بلکہ ان کے مستحق وہ مجاہد بھی ہیں جو ہمہ وقت، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا تلاش کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے نہایت خلوص کے ساتھ وہ اپنے نفس کی خواہشات اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرتے ہیں، جیسا کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا ہے" جاھدوا اھواء کم کما تجاھدون اعداء کم "جس طرح تم ظاہری دشمن کے خلاف جہاد کرتے ہو، اسی طرح تم اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف بھی جہاد کیا کرو، خواہشاتِ نفس کے خلاف جہاد ہی جہادِ اکبر قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ نہایت ہی دشوار گزار مرحلہ ہے، یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ اپنی راہ میں قدم اٹھانے والوں کی رہبری فرماتا ہے یعنی وہ راستہ دکھا دیتا ہے جو ان طالبان حق کو بآسانی منزل تک پہنچادے، جس کی صورت اس پرخار راہ میں پیش آنے والے مصائب وآلام پر صبر واستقامت ہوتی ہے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو صبر واستقامت کا ایسا پہاڑ بنا دیتا ہے کہ طوفان ان سے ٹکرا ٹکرا کر گزر جاتے ہیں، تاریکیاں خود بخود چھٹ جاتی ہیں اور انہیں اپنی منزل نظر آنے لگتی ہے، مغفرت ورحمت کی ان پر برسات برسنے لگتی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النحل:١١٠)

پھر بیشک آپ کے پروردگار کا معاملہ ان کے ساتھ، جنہوں نے ہجرت کی بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد، پھر جہاد بھی کیا اور (مصائب میں) صبر سے کام کیا بیشک آپ کا رب ان آزمائشوں کے بعد (ان کے لئے) بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

چند واقعات

تاریخ اسلام میں ایسے مجاہدین کے عبرت آموز واقعات آج بھی اہل ایمان کے لئے مشعل راہ ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے بطور نمونہ موجود ہیں، درج ذیل واقعات سے آپ بھی ایمان تازہ کیجئے، دین کی بقاء وتحفظ کے لئے کمر ہمت باندھئے اور ان خوش نصیبوں کی صف میں شامل ہو جایئے، جن کے لئے ہدایت کی راہیں کھلتی ہیں اور جن پر رحمت و مغفرت کی بوچھار ہوتی ہے، کامیابی و کامرانی جن کے قدم چومتی ہے، یہی ''محسنین'' ہیں، جنہیں ان کا رب اکیلا، بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا، ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ'' انہی کے حق میں فرمایا گیا، غور فرمایئے۔

حضرت عمار، ان کے والد یاسر، والدہ سُمَیّہ، کفار کے قبضہ میں ہیں، گرفتارِ مظالم وآلام ہیں، اسلام سے دستبردار ہو جانے کے لئے بدن کو نیزوں سے چھلنی کیا جارہا ہے لیکن کیا مجال کہ ان کی زبان پر لمحہ بھر کے لئے بھی کفر کا کوئی کلمہ آیا ہو، ابوجہل ظالم حضرت سمیہ کی دونوں ٹانگوں کو دو اونٹوں سے باندھتا ہے اور اونٹوں کو مختلف سمت میں دوڑا دیتا ہے، یہاں تک کہ چر کر جسم مبارک کے دو حصے ہو گئے یہ پہلی شہیدہ ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا، حضرت یاسر کی باری آئی، آپ کو بھی بڑی بیدردی سے شہید کیا گیا اور انہیں تاریخ اسلام میں دوسرے شہید کا مقام ملا پھر حضرت عمار کی باری آئی، اسلام چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، والد و والدہ کے لاشے سامنے تڑپ رہے تھے، بادلِ نخواستہ نہایت مجبوری کی حالت میں آپ نے کفر کے کلمات کہہ دیئے، لوگوں نے کہا عمار تو مرتد ہو گئے لیکن دل کا حال جاننے والے نے اعلان فرمایا'' كَلَّا، اِنَّ عَمَّارًا مُلِئَ اِيْمَانًا، مِنْ قَرْنِهٖ اِلٰى قَدَمِهٖ، وَ اخْتَلَطَ الْاِيْمَانُ بِلَحْمِهٖ وَدَمِهٖ'' ہرگز نہیں، عمار تو سر سے قدموں تک ایمان سے لبریز ہے، ایمان اس کے گوشت اور خون میں سرایت کئے ہوئے ہے اور جب عمار سے خود ان کا حال پوچھا گیا ''كَيْفَ وَجَدْتَ قَلْبَكَ'' عمار جب تم نے کلمہ کفر کہا اس وقت تمہارے قلب کی کیا حالت تھی، تو عرض گزار ہوئے ''مُطْمَئِنًّا بِالْاِيْمَانِ''، یارسول اللہ! میں اس وقت بھی ایمان پر مطمئن تھا، پس آقائے رحیم وکریم نے اپنے بے چین و بے تاب غلام کو مطمئن فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا'' فَاِنْ عَادُوْا لَكَ فَعُدْ لَهُمْ لِمَا قُلْتَ ''ان کے ظلم وستم سے نجات کے لئے تم نے جو کچھ کہا وہ بجا تھا۔ (تفسیر مظہری)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ایک اور ایمان افروز واقعہ ہمیں سناتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن حذیفہ رضی اللہ عنہ کو رومیوں نے گرفتار کرلیا، یہ امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی بات ہے، رومی انہیں گھسیٹے ہوئے اپنے سردار کے پاس لے گئے، اس نے آپ سے عیسائی دین قبول کرنے کا مطالبہ کیا، اپنی حکومت کا بڑا منصب دینے اور اپنی بیٹی کا رشتہ کردینے کا لالچ پیش کیا،'' آپ نے فرمایا'' لَوْ اَعْطَيْتَنِيْ جَمِيْعَ مَاتَمْلِكُ وَجَمِيْعَ مَاتَمْلِكُهُ الْعَرَبُ عَلٰى اَنْ اَرْجِعَ عَنْ دِيْنِ مُحَمَّدٍ طَرْفَةَ عَيْنٍ مَاقَبِلْتُ ''تو مجھے اپنی ساری دولت وجائیداد اور پورے عرب کی دولت، اس شرط

پروے کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کو چھوڑ دوں، تب بھی میں قبول نہ کروں گا" اس نے دھمکی دی کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا، آپ نے فرمایا مجھے کوئی خوف وغم نہیں، آپ کو سولی پر لٹکا دیا گیا تیر اندازوں کو حکم دیا گیا کہ تیروں سے ان کا بدن چھلنی کر دو، عاشق رسول کے مقدس جسم سے خون کے فوارے پھوٹنے لگے اور اس حال میں آپ سے دین چھوڑنے کا مطالبہ کیا گیا، آپ کا پائے استقلال واستقامت اب بھی حرکت میں نہ آیا تو ایک تانبے کی دیگ میں تیل کھولایا گیا اور آپ کی نظروں کے سامنے آپ کے ایک مسلمان بھائی کو اس میں ڈال دیا گیا، جس نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی اور پھر آپ سے مطالبہ ہوا کہ دین عیسوی قبول کر لو، ورنہ تمہارا بھی یہی انجام ہوگا، لیکن اس پیکر صبر وہمت کے چہرے پر ذرا بھی مایوسی کے آثار نظر نہ آنے پائے، بس اتنا ہوا کہ جب آپ کو کھولتی دیگ کی طرف کھینچ کر لے جایا گیا تو آنکھوں سے چند آنسو ٹپک پڑے، ظالم سمجھا کہ میرا ستم کام آ گیا، مجاہد کمزور پڑ گیا، اب میری لاج رہ جائے گی اور یہ میرا دین قبول کر لے گا، پس آپ کو واپس بلوایا گیا کہا گیا روتے کیوں ہو، ہماری بات مان لو آپ گویا ہوئے تو نے غلط سمجھا مجھے تیرے ظلم نے نہیں رلایا، میری آنکھیں تو اس افسوس سے اشکبار ہوئیں کہ آج رضائے الٰہی میں جس جان کا نذرانہ پیش کرنے کا موقع ہاتھ آیا ہے یہ ایک ہی جان ہے کاش میرے پاس اتنی جانیں ہوتیں جتنے میرے جسم پر بال ہیں تو میں اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سب کو اس عذاب میں ڈال دیتا، بادشاہ نے آپ کو قید کر دیا، کھانا پینا بند کر دیا، کئی دن بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد، خنزیر کا گوشت اور شراب پیش کیا گیا اس مرد مؤمن نے بھوک و پیاس کی شدت کے باوجود اس حرام کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، جب آپ سے نہ کھانے اور نہ پینے کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا، یہ دونوں چیزیں میرے لئے حرام ہیں لیکن شریعت مطہرہ نے حالت اضطرار میں ان کو حلال کیا ہے، پھر بھی انہیں استعمال نہیں کروں گا تاکہ تو اسے میرے ایمان کی کمزوری جان کر خوش نہ ہونے پائے، بالآخر ظلم وستم کا پتھر پاش پاش ہوتا ہے اور اس مرد مجاہد کی ہمت وقوت ایمانی غالب آتی ہے اور بادشاہ کا صرف اتنا مطالبہ رہ جاتا ہے کہ" احتراما میری پیشانی کو بوسہ دیدو" اللہ اکبر، اس موقع پر مرد مؤمن کی فراست کا بھی اندازہ کیجئے اور ہمت کا بھی، ظلم سے نجات کا موقع سامنے ہے لیکن اب بھی آپ ظالم کا احسان قبول کرنے اور اپنی جان بچانے کے لئے آمادہ نہیں بلکہ بادل نخواستہ اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے ایک شرط کے ساتھ آمادہ ہوتے ہیں،" کہ میں تیری پیشانی چومنے کے بدلے صرف اپنی آزادی پر راضی نہیں بلکہ میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی آزاد کرنا ہوگا" بادشاہ آمادہ ہو گیا آپ نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا خود بھی آزاد ہوئے اور اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی آزاد کرا کے، امیر المؤمنین کے دربار میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے، اے امیر المؤمنین میرے لئے بخشش کی دعا کیجئے، ایک کافر کی مرضی پوری کرنے اور اس کا احترام کرنے کا مجھ سے جرم سرزد ہو گیا لیکن میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے یہ جرم اپنے مسلمان بھائیوں کی رہائی کے لئے کیا، امیر المؤمنین خوش ہو کر فرماتے ہیں" حَقٌّ علی کُلِّ مُسلِمٍ ان یُقَبِّلَ رأسَ عبدِاللّٰہ بنِ حُذیفۃ، وانا ابداءُ، فقام، فقبّل رأسہٗ، رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا" ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ عبداللہ بن حذیفہ کا سر چومے اور ابتداء میں کرتا ہوں، پس امیر المؤمنین کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن حذیفہ کا سر چوما، (ابن کثیر)

اللہ کی راہ میں اہل ایمان کی یہی جدوجہد اور محنت مشقت تھی جس کے سبب اسلام آج تک بحمد اللہ اپنی اصلی حالت

میں موجود ہے چونکہ جدوجہد کا یہ سلسلہ جاری ہے، لہٰذا اسلام محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا لیکن

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو، جس کے بغیر اس تک رسائی ممکن نہیں، نیز اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے رہو کہ یہی اسلام کی بقاء کا ذریعہ ہے، پس تقویٰ، وسیلہ، جدوجہد ہی تمہاری دینی و دنیوی کامیابی و کامرانی کے ذرائع ہیں تم ضرور کامیاب ہو گے اگر تم نے اپنے اسلاف کی طرف ان ہدایات پر عمل کیا۔

اللهم اجلعنا من المفلحين بجاه رحمة للعلمين

وَصَلَّى اللّٰهُ تعالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مقالہ ۳۵

المائدہ:۵۱

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ
مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (المائدہ:۵۱)

اے ایمان والو! نہ بناؤ یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے دوست بنایا انہیں تم میں سے تو وہ انہی میں سے ہے، بے شک اللہ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔

اہلِ ایمان کو ہدایت کی جارہی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کو اپنا ولی، دوست، مددگار نہ بنائیں جس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ صرف آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، مسلمانوں کے کبھی وہ دوست ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں، جو ایمان والے اس واضح ہدایت کے برعکس یہود و نصاریٰ سے دوستی کا جرم کریں گے وہ دنیاوی طور پر انہیں میں سے شمار کئے جائیں گے یعنی وہ امتِ مسلمہ کے لئے قابلِ اعتبار و اعتماد نہ رہیں گے کہ دشمن سے ملنے والا دشمن ہی متصور ہوتا ہے، اور اخروی طور پر وہ ان ظالمین میں شمار ہوں گے، جنہوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کا جرم کیا، سنت الہیہ یہ ہے کہ وہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایات کے باوجود خواہشاتِ نفس یا حکمتوں

اور مصیبتوں کا شکار ہو جاتا ہے، وہ اللہ کی نصرت وحمایت سے محروم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لئے فسق وفجور کی دلدل میں پھنس جانا، اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۞ (اعراف: ۳۰)

ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دے دی اور ایک گروہ ہے کہ مقرر ہوگئی ان پر گمراہی (کیونکہ) انہوں نے بنا لیا شیطانوں کو اپنا دوست اللہ کو چھوڑ کر اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ (النحل: ۳۶)

پس ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ ایسے تھے جن پر گمراہی مسلط ہوگئی۔

اللہ کا اصول

اللہ رب العزت کا اصول یہ ہے کہ جس کے دل میں ہدایت کی طلب پیدا ہوتی ہے، اُسے ہدایت کی نعمت سے نواز دیا جاتا ہے یعنی جو اندھیرے سے نجات حاصل کرنے کے لئے روشنی حاصل کر لیتا ہے، اسے اپنا راستہ نظر آنے لگتا ہے اور وہ منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے لیکن جو روشنی حاصل کرنے کی سعی نہیں کرتا، وہ کبھی منزل مراد تک نہیں پہنچ پاتا، پس جو دانستہ حق کا انکار کرتا ہے اور پیغام ہدایات کو سننے اور سمجھنے کے باوجود بھی اس کا انکار کرتا رہتا ہے اسے گمراہ کر دیا جاتا ہے کہ ہدایت کوئی حقیر وارزاں چیز نہیں جسے بغیر طلب کے ہر کسی کی جھولی میں ڈال دیا جائے یہ تو وہ گوہر نایاب ہے جو بصد دشواری کے بعد انہی خوش نصیبوں کو عطا فرمایا جاتا ہے جن کے دلوں میں اس کی سچی طلب ہوتی ہے، جو واقعی اس کے متلاشی ہوتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۞ (الرعد: ۲۷)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ فرما دیجئے، بیشک اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف، اسے جو سچے دل سے رجوع کرتا ہے۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۞ (شوریٰ: ۱۳)

اور اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف اسے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

پس ہدایت کے حصول کے لئے سچے دل سے اس کی طلب شرط ہے کیونکہ یہ دنیا دار الاسباب ہے، یہاں کے لئے اللہ کی تمام نوازشات کا تعلق اسباب وعلل سے ہے، بندہ جب ایسے کام کرتا ہے جو اصول الٰہی کے مطابق اس کی نوازش وکرم کا سبب ہوں تو اس پر ضرور کرم فرمایا جاتا ہے اور اگر بندہ اسباب وعلل سے منہ موڑ لیتا اور لاپرواہ ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے انعامات سے محروم رہتا ہے اللہ نے انسان کو ہدایت کی نعمت سے نوازنے کا سبب، انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع وپیروی کو بنایا ہے، پس جو لوگ ان کے پیغام ہدایت پر صدق دل سے غور کرتے اور اپنے دلوں کو نور ایمان سے منور کر لیتے ہیں وہ کامیابی

وکامرانی کی راہ پر گامزن کر دیئے جاتے ہیں اور جن کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہوتی ہے، وہ محروم رکھے جاتے ہیں۔

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (الصف:۵)

یہ اصول الٰہی صرف ہدایت سے متعلق نہیں بلکہ اللہ کی تمام نعمتوں میں کارفرما ہے کہ کوئی نعمت بغیر سبب و وسیلہ عطا نہیں کی جاتی، اللہ نے انسان کے لئے بے شمار نعمتیں پیدا فرمائیں لیکن ان سے فائدہ حاصل کرنا انسان کے اپنے عمل پر موقوف رکھا، بچہ پیدا ہونے سے پہلے اس کے لئے ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی نہر جاری کر دی گئی، لیکن ماں کو بچے کی بھوک کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک بچہ خود دودھ نہیں مانگتا، جب بچہ روتا ہے تو اسے دودھ ملتا ہے، پانی کی نعمت سے پیاسا، اس وقت تک فائدہ حاصل نہیں کر پاتا جب تک وہ خود اس کی طرف نہ بڑھے، یہی تمام نعمتوں سے استفادہ کی صورت ہے، ہدایت بھی ایک عام نعمت ہے لیکن اس کے حصول کا ذریعہ و وسیلہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے بعد ان کے نائبین، دین کے مبلغین و معلمین، علماء و مشائخ ہیں، ہدایت اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک سچے دل سے اس کی تلاش نہ ہو اور ان حضرات کا پیغام قبول کر کے ان سے نسبت قائم نہ کر لی جائے، فیصلہ الٰہی واضح ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ (یونس:۹)

بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، ہدایت عطا فرمائے گا انہیں ان کا رب، ان کے ایمان کے باعث۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (النحل:۱۰۴)

بیشک وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے، اللہ کی آیتوں پر اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

ہدایت کی اہمیت

ہدایت یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کا نصیب ہو جانا، ایک ایسی عظیم نعمت ہے، جس پر انسان کی صرف دینی و دنیوی کامیابی و کامرانی کا دارومدار نہیں بلکہ انسان کی انسانیت اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے اعزاز کی بقاء کا بھی واحد ذریعہ یہ ہدایت ہے، ہدایت ہی سے انسان کو خالق کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اسی سے وہ رسول کے مقام اور اس کی عظمت کو پہچانتا ہے، ہدایت ہی سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی تعمیل کا جذبہ پیدا ہوتا اور توفیق نصیب ہوتی ہے، اسی سے انسان ظاہری اور باطنی غلاظتوں سے محفوظ رہتا ہے، ہدایت ہی کی طلب سب سے اہم دعا ہے، جس کی تعلیم قرآن کریم کی پہلی ہی صورت میں دی گئی'' اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ '' ہدایت ہی کا دریا بہانے کے لئے، رحمٰن و رحیم اللہ نے سلسلہ انبیاء و رسل جاری فرمایا اور ان پر اپنے صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں، سلسلہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد بھی ہدایت کا دریا

بہہ رہا ہے، جس کا ذمہ دار علماء اولیاء ومشائخ کو بنایا گیا۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۚۙ (انبیاء:۷۳)

اور ہم نے بنا دیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لئے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے اور ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ وہ نیک کام کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیا کریں اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۟ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ○ (السجدہ:۲۴)

اور بنایا ہم نے ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ رہبری کرتے رہتے ہمارے حکم سے جب تک وہ صابر رہے اور جب تک وہ ہماری آیتوں پر پختہ یقین رکھتے تھے۔

آیت زیر گفتگو میں اہل ایمان کو ہدایت کی گئی کہ یہود ونصاریٰ کو تم اپنا دوست نہ بناؤ اور اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ یہ تمہارے ازلی دشمن ہیں آپس میں شدید اختلاف اور ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود یہ ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں لیکن اہل ایمان کے کبھی بھی مددگار نہیں ہو سکتے، پس مسلمانوں کو ان کی دوستی کبھی راس نہیں آسکتی اور اگر مؤمن اس غلطی کا مرتکب ہوگا تو یہ ایک ناقابل تلافی جرم ہوگا، جس کا خمیازہ پوری ملت کو بھگتنا پڑے گا، اسی لئے قرآن کریم بار بار غیر مسلموں کو دوست بنانے اور ان پر اعتماد کرنے کی ممانعت فرماتا ہے، ہم اس عنوان پر گزشتہ اوراق میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں انہی میں سے چند باتوں کا اعادہ کرتے ہیں تاکہ قارئین کو تشنگی محسوس نہ ہو۔

موالات کی ممانعت

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر غیر مسلموں سے موالات کی ممانعت فرمائی ہے یعنی ان سے دوستی، ان پر اعتماد، ان کو اپنا ہم راز بنانے، مسلمانوں پر انہیں ترجیح دینے کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت کے مطابق کوئی غیر مسلم کبھی مسلمان کا دوست ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، اس کے برعکس وہ اپنے باہمی اختلافات کے باوجود ہمیشہ مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں۔

موالات چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی بہرصورت حرام ہے یعنی کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے ذاتی امور میں غیر مسلم کو اپنا دوست بنائے اور اس پر اتنا اعتماد کرے کہ اپنے خانگی، خاندانی راز تک اس پر ظاہر کر دے کیونکہ کسی نہ کسی دن یہی مار آستین اسے ڈس لے گا اور شدید نقصان پہنچائے گا اور نہ ہی یہ صورت جائز ہے کہ مسلم مملکت کے سربراہ مصلحتوں اور سیاسی حکمتوں کی بناء پر غیر مسلم حکام کو اپنے قومی وملکی معاملات میں اتنا قریب کریں کہ ان سے مشورے کرنے لگیں، اپنا اچھا برا حال ان پر ظاہر کر دیں، اپنی کمزوریاں تک انہیں بتا دیں، صرف ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے، جس کا مقصد اپنے اقتدار کی بقاء اور تحفظ کے سوا کچھ نہ ہو، یہ جرم پوری قوم کی عزت اور وقار کا سودا کر لینے کے مترادف ہے، جس کا بھیانک انجام جاننے کے لئے ماضی کی تاریخ کے اوراق پلٹنے کی ضرورت نہیں، ہمارا اپنا حال ہی کافی ہے کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج ہم غیر

مسلموں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، وہ ہماری سیاسی و معاشی پالیسیوں کے مالک ہیں، ہم ان کے در کے بھکاری بنے ہوئے ہیں، انہوں نے چند ٹکوں کی امداد کے عوض ہماری تہذیب و تمدن تک کو خرید لیا ہے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ہمارے مذہبی معاملات میں مداخلت کی بھی جرأت کر رہے ہیں، انہی کی کارستانیوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ممالک بدامنی، انتشار اور افتراق کا شکار ہیں، ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے جبکہ وہ خود ملت واحدہ ہیں، ان میں باہمی اتحاد ہے، وہ سیاسی طور پر منظم اور معاشی اعتبار سے مستحکم ہیں، ہم اس حقیقت سے پردہ کشائی پر معذرت خواہ ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے ان حکام کی کار فرمائیاں ہیں جو مسلم ہونے کے دعویدار تو ہیں لیکن ان میں اسلامی حمیت و غیرت کا دور دور تک پتہ نہیں، انہوں نے پوری قوم کا سودا، اس کے دشمنوں سے کر ڈالا اور انہیں احساس تک نہ ہوا کہ قوم کی حمیت و غیرت کا سودا کر رہے ہیں، کاش ہمیں طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، محمد بن قاسم جیسے قائدین میسر آتے تو آج ہمارے ممالک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

موالات کے علاوہ، غیر مسلموں کے ساتھ تعلق رکھنے اور اچھا برتاؤ کرنے کی اسلام نے جس قدر فراخی کے ساتھ اجازت دی ہے، اس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی، مثلاً ان کے ساتھ تجارت کرنے اور کاروبار کرنے کی پوری طرح اجازت ہے، غیر مسلم پڑوسی ہو تو بوقت ضرورت اس کی مدد کرنے، اس سے میل جول رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، غیر مسلموں کے تہواروں پر انہیں مبارکباد دینا جائز ہے، اگر دنیاوی ضرورت ہو تو انہیں تحفے تحائف دینا بھی جائز ہے، غیر مسلموں کو ملازم رکھنے یا ان کی ملازمت کرنے کی بھی اجازت ہے، اسی طرح غیر مسلم کی عزت و آبرو کی حفاظت بھی فرض ہے، غیر مسلموں سے اگر کوئی وعدہ کیا جائے تو اس کا پورا کرنا بھی اسی طرح لازمی ہے جس طرح کسی مسلمان بھائی سے وعدہ کر کے اس کا پورا کرنا ضروری ہے، غرضیکہ غیر مسلموں سے صرف موالات کی ممانعت ہے، مواسات و ہمدردی یا ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی ممانعت نہیں، اس عنوان پر ہمارا تفصیلی مضمون ہماری کتاب ''تبلیغی کتاب'' میں موجود ہے، قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

وصلّی اللّٰہُ تعالی علی خَیرِ خلقِہ سیّدِنا مُحمّدٍ وَّعلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحابِہٖ اَجمعِین

خاتمہ بالخیر کیلئے

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا قَبْلَ الْمَوْتِ

وَارْحَمْنَا عِنْدَ الْمَوْتِ

وَلَا تُعَذِّبْنَا بَعْدَ الْمَوْتِ

وَلَا تُحَاسِبْنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ

اِنَّكَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ط

اے اللہ موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما۔ اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما۔ اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا۔ اور قیامت کے روز ہمارا حساب نہ لینا۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مقالہ ۳۶

المائدہ: ۵۴ تا ۵۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (المائدہ: ۵۴ تا ۵۶)

اے ایمان والو! جو پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے، تو عنقریب لے آئے گا اللہ ایک ایسی قوم کہ محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے، جو نرم ہوں گے ایمان داروں کے لئے بہت سخت ہوں گے کافروں پر، جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں اور نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے، یہ اللہ کا فضل و کرم ہے نوازتا ہے اس سے جسے چاہتا ہے اور اللہ بڑی کشادہ رحمت والا،

سب کچھ جاننے والا ہے، تمہارا مددگار تو صرف اللہ اور اس کا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نماز ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور وہ بارگاہِ الٰہی میں جھکنے والے ہیں اور جس نے مددگار بنایا اللہ اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو، تو بلاشبہ اللہ ہی کا گروہ غالب آنے والا ہے۔

آیات مذکورہ بالا میں سے پہلی آیت میں اہلِ ایمان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگرچہ اس دین کی حفاظت و بقا کی ذمہ داری تم پر ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ تم ہی اس کے محافظ ہو، پس اگر تمہارے چند افراد یا تمہاری بڑی جماعت اس ذمہ داری کو پورا کرنے سے قاصر رہے، حتیٰ کہ انہوں نے اسلام ہی سے منہ موڑ لیا اور مرتد ہو گئے تو اللہ قادرِ مطلق کو ان کی کوئی پروا نہیں وہ اپنے دین کا خود محافظ ہے، وہ اس کی حفاظت کے لئے فوراً کوئی دوسری جماعت میدانِ عمل میں لے آئے گا، جو دین کی حفاظت و اشاعت کا فریضہ انجام دے گی کہ وہ جس سے چاہے، اپنے دین کی خدمت و حفاظت کا کام لے سکتا ہے، اے ایمان والو! تمہارے مرتد ہو جانے کی صورت میں تمہاری جگہ جو جماعت لائی جائے گی اور جسے دین کی حفاظت کا فریضہ سونپا جائے گا، اس کی پہلی صفت یہ ہوگی کہ اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے، دوسری صفت یہ ہوگی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے نرم ہوں گے اور کافروں کے مقابلے پر بہت سخت ہوں گے، تیسری صفت ان حضرات کی یہ ہوگی کہ یہ دینِ حق کی اشاعت و برتری کے لئے جہاد کرتے رہیں گے، ان کی چوتھی صفت یہ ہوگی کہ یہ دین کی پابندی اس کی خدمت و حفاظت پر کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے، ان صفات کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ انہیں قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔

يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ

اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے، یہ پہلی صفت ہے جو دین کے محافظین کی خصوصیت قرار دی جا رہی ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ خدمتِ دین کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں بلکہ یہ معاملہ محبت کا ہے، جس کو اللہ نے محبوب بنا لیا اور جو اللہ کا محب بن گیا وہی اس اہم کام کو انجام دے سکتا ہے، کہ جبر و اکراہ حکمتِ باری تعالیٰ کے خلاف ہے، ورنہ اس قادرِ مطلق کے لئے سب کو ایمان پر مجبور کر دینا کوئی مشکل نہ تھا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ (یونس:۹۹)

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو ایمان لے آتے جتنے لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب کیا آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں لوگوں کو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔

رشتۂ محبت، جبر و اکراہ سے مبرا اور پاک ہوتا ہے کہ نہ کوئی جبر سے کسی کی محبت حاصل کر سکتا ہے اور نہ کوئی کسی کو محبت کرنے پر مجبور کر سکتا ہے بلکہ محبت ایک غیر اختیاری احساس ہے جو محبت کے انعامات و نوازشات اور محبوب کے اعمال سے پیدا ہوتا ہے، اللہ اپنے بندے کو بیشمار انعامات سے نوازتا ہے اور بندہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے، پس نوازشات کی تخم ریزی اور اطاعت کی تخم خیزی شجرِ محبت کی صورت اختیار کر لیتی ہے، انعامات و نوازشات کی مسلسل برسات جن لوگوں کو میدان

محبت میں کھینچ لاتی ہے، انہیں ایک ایسی راہ دکھائی جاتی ہے جو محب ومحبوب کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیتی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (آل عمران:۱:۳۱)

(اے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ فرما دیجئے، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرنے لگو تو اللہ تم سے محبت فرمانے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

محبت کے مسافروں کے لئے محبوب کی اتباع و پیروی کی راہ سے زیادہ واضح راہ اور کونسی ہو سکتی ہے جس پر پہلے ہی سے شمع محبت روشن ہے، اس راہ پر گامزن ہونے والا نہ صرف شرفِ محبوبیت سے نوازا جاتا ہے بلکہ اس کے لئے مژدۂ مغفرت بھی ہے کہ محبوبین کو گناہوں کی غلاظت ونجاست میں ملوث ہونا زیب نہیں دیتا، جب مؤمن جبر واکراہ سے مبراء و پاک رشتہ محبت سے منسلک ہو جاتا ہے تو رضا کی اس منزل کو بھی پالیتا ہے جس میں محب ومحبوب دونوں ایک دوسرے سے راضی ہوتے ہیں اور محب راضی ہو کر اپنے انعامات سے مزید نوازتا اور محبوب راضی ہو کر اطاعت وفرمانبرداری کا مزید حق ادا کرتا ہے اور یہی عظیم کامیابی ہے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (المائدہ:۱۱۹)

راضی ہو گیا اللہ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

مؤمنین کی یہ صفت انہیں دین کی حفاظت واشاعت کا کما حقہ اہل بنا دیتی ہے کہ ان کی محبت دین کے معاملہ میں کسی رواداری کو برداشت نہیں کرتی، اب ان کا رشتہ صرف اسی سے رہ جاتا ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول کا رشتہ ہوتا ہے، ان میں وہ ہمت پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں دین کے خلاف اٹھنے والے ہر طوفان کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیتی ہے، وہ مصلحتوں اور حکمتوں سے آزاد ہو کر دین کی اشاعت کا فریضہ ادا کرتے ہیں، وہ مادی وسائل کو خاطر میں لائے بغیر خدمت دین کے لئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، وہ ایسی جماعت بن جاتے ہیں جو "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ" مسلمانوں کے ساتھ نرمی ومحبت کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں اور کفار ومشرکین کے لئے "اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" کافروں پر سختی ان کا شیوہ ہو جاتی ہے ان کی اسی خوبی کو دوسرے مقام پر قرآن کریم اس طرح بیان فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:۲۹)

اور جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر اور طاقتور ہیں آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔

دشمن کے مقابلہ پر اہل ایمان کی بہادری وقوت کا یہ عالم ہے کہ ان کا سر کٹ تو سکتا ہے لیکن جھک نہیں سکتا، یہ بکاؤ مال نہیں کہ دشمنان اسلام ان کو خرید لیں، یہ بزدل اور ڈرپوک نہیں کہ دشمن کے مظالم انہیں راہ عشق ومحبت سے برگشتہ کر سکیں، یہ تو فولاد کی ایسی چٹان ہیں کہ کوئی طوفان انہیں سر مو، سرکا نہیں سکتا جبکہ یہی لوگ اپنے دینی بھائیوں کے سامنے بڑے نرم، ان پر بڑے شفیق اور بڑے مہربان نظر آتے ہیں، نہایت عاجزی وانکساری سے باہم ملتے جلتے ہیں، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم

ان کی باہمی محبت و رأفت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالْحُمّٰى وَالسَّهَرِ

مسلمانوں کی مثال، باہمی محبت اور ایک دوسرے پر شفقت کرنے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم اگر اس کا کوئی عضو بیمار ہو جاتا ہے تو سارا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نیند کافور ہو جاتی ہے۔ (بخاری شریف)

نیز آپ ﷺ فرماتے ہیں:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا وَ شَبَّكَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ

مؤمن کا تعلق مؤمن کے ساتھ ایسا ہے جیسے دیوار کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کئے ہوتا ہے پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ملا دیا۔ (بخاری شریف)

ان کی باہمی محبت اور وابستگی کا یہ حال ہے کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو غیروں کی طرح آمنے سامنے سے نہیں گزر جاتے بلکہ اپنوں کی طرح ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، مصافحہ کرتے ہیں، خیریت دریافت کرتے ہیں۔

اِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ وَتَصَافَحَا وَحَمِدَا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَاهُ غُفِرَ لَهُمَا

جب دو مسلمان ملیں اور ایک دوسرے سے مصافحہ کریں اور اللہ کی تعریف کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں تو اللہ دونوں کو بخش دیتا ہے۔ (بخاری شریف)

حضرت عطا خراسانی راوی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اہل ایمان کے لئے باہمی محبت والفت کا نسخہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

تَصَافَحُوْا يَذْهَبِ الْغِلُّ وَتَهَادَوْا تَحَابُّوْا وَتَذْهَبِ الشَّحْنَاءُ

مصافحہ کیا کرو، دل کی کدورت جاتی رہے گی، تحفے دیا کرو تو محبت ہو جائے گی اور باہمی عداوت جاتی رہے گی۔ (بخاری شریف)

بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی بندہ مؤمن کامل نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (بخاری شریف)

پس باہمی الفت و محبت مؤمن کی شان ہے جس کو پیدا کرنے اور باقی رکھنے کی تاکید کی گئی جبکہ دشمن اور کفار کے ساتھ سختی سے پیش آنا، مؤمن کا وطیرہ ہے لیکن اس سختی کا مفہوم، دشمن پر ظلم کرنا یا اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنا ہرگز نہیں کہ

اسلام نہ تو کسی پر ظلم کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی بدسلوکی کی۔

اہلِ ایمان کی عادت

اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اہلِ ایمان کی عادت ہے جو دین کی بقاء کا ذریعہ ہے، جو مؤمن کو خواہشِ نفس کی زنجیروں سے آزاد کرتا ہے، ظلم وستم اور جبر واستبداد سے محفوظ رکھتا ہے تکبر وتعصب کے بتوں کو پاش پاش کرتا ہے، عجز وانکساری، ایثار وقربانی کا پیکر بناتا ہے، اہل ایمان میں ہمت وجرأت کا ایسا جوہر پیدا کر دیتا ہے کہ ان کے لئے دین کی پابندی، دین کی خدمت میں کوئی عار نہیں رہتی، ''وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ'' اور نہیں ڈرتے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے، اپنی تہذیب اپنانے اور اپنا تمدن اختیار کرنے میں انہیں نہ تو شرم آتی ہے، نہ وہ کسی کے طعنوں کی پرواہ کرتے ہیں، کوئی انہیں قدامت پسند کہے یا رجعت پسند، پروا نہیں، وہ جس راہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں، اس پر ہر طرح مطمئن ہیں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں، کسی کی ملامت انہیں ان کی راہ سے برگشتہ نہیں کر پاتی، یہ کیفیت تو نہایت ہی ضعیف الایمان لوگوں کی ہوتی ہے کہ وہ ماحول اور معاشرے سے متاثر ہو کر اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، انہیں دین کے شعائر اختیار کرنے، دین کے احکام پر عمل کرنے میں شرم آنے لگتی ہے، اس کیفیت کا مطالعہ آپ اُن مسلمانوں کی حالت میں کر سکتے ہیں جو غیر مسلم ممالک میں آباد ہیں، یا مغربی تہذیب کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں، جن کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ انہیں اپنا لباس پہننے میں شرم آتی ہے، داڑھی مونچھ رکھنے میں شرم آتی ہے، عورتوں کو پردہ کرنے، شرعی لباس پہننے میں شرم آتی ہے، کسی عام مقام پر نماز پڑھنے میں شرم آتی ہے، روزہ رکھنے میں شرم آتی ہے، حج وعمرہ کو جائیں تو احرام باندھنے میں شرم آتی ہے، قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں شرم آتی ہے، حلال غذا تلاش کرنے میں شرم آتی ہے اور تو اور بھائیوں کو ٹوپی تک پہننے میں شرم آتی ہے، یہاں تک کہ نماز کے لئے بھی ٹوپی پہننا گوارا نہیں، ہاں شرم نہیں آتی تو کلبوں میں ڈانس کرنے، شراب پینے میں شرم نہیں آتی، ساحل پر ننگا ہونے میں شرم نہیں آتی، سچ پوچھئے تو یہ شرم نہیں، بے شرمی، بے غیرتی ہے کہ اللہ کے احکام سے بغاوت کرنا ہی سب سے بڑی بے غیرتی ہے۔ ان ظالموں نے غیر مہذب معاشرے کو اپنا کر صرف اپنے آپ ہی کو ذلیل وخوار نہیں کیا، پوری امتِ مسلمہ کی ذلت وخواری کے یہ مجرم ہیں، سب مسلمانوں کو انہوں نے بدنام کیا ہے، کیا کیا جائے ایسے لوگوں کا کہ نہ تو انہیں امت سے [illegible] قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں اپنایا جا سکتا ہے، بس ان ظالموں سے دور رہ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ بس

اے ایمان والو! تم پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہو، آپس میں محبت کرتے رہو، اپنے بھائیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ جاری رکھو، دشمن کے لئے سخت بنے رہو، اللہ کی راہ میں محنت ومشقت جاری رکھو، دین کے معاملہ میں کسی کے لعن، طعن اور ملامت کی پرواہ نہ کرو کہ یہی اہل ایمان کی وہ خوبیاں ہیں جن سے رحیم وکریم، علیم وخبیر رب نے انہیں اپنے فضل وکرم سے نوازا ہے، پس تم ان خوبیوں کی، ان نعمتوں کی قدر کرو، ان کی حفاظت کرو، ان پر قائم رہو، کسی حال میں ان سے محروم نہ ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری محرومی تمہاری بربادی کا باعث بن جائے، اللہ تمہیں نیست ونابود کر کے اپنے دین کی حفاظت کی ذمہ داری تم سے بہتر لوگوں کو سونپ دے۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

خادمین دین اور محافظینِ دین کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے ہیں، دینی امور ہوں یا دنیاوی معاملات، ہر بات کو وہ اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق مل جل کر طے کر لیتے ہیں، اختلاف، افتراق سے گریز کرتے ہیں، اس باہمی نرمی سے اہل ایمان کے درمیان اتحاد پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک ایسی منظم و مستحکم قوم بن جاتے ہیں کہ دشمن ان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے بھی گھبراتا ہے، ان میں اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی امور، خود ہی نمٹا لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ کسی در کے بھکاری نہیں بنتے۔

دیگر کمالات کی طرح اس خوبی کا مرکز و منبع بھی نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات ہے، قرآن کریم شاہد ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ (آل عمران:۱۵۹)

پس اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم ہو گئے، اگر آپ تند مزاج، سخت دل ہوتے تو یہ لوگ، آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، پس آپ ان سے درگزر فرمائیے اور ان کے لئے بخشش طلب کرتے رہئے اور کام میں ان سے مشورہ کر لیا کیجئے۔

چونکہ اللہ کو اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قیادت میں، حق پرستوں کی ایک منظم و مضبوط جماعت بنانا مقصود تھی پس اس نے اپنے فضل و کرم سے اس عظیم قائد اور امیرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو نرم مزاج، نرم دل بنایا، جس کی ہمدردی، محبت بھرے کردار اور تعلیمات نے ایک انقلاب برپا کر دیا اور لوہے کی طرح سخت انسان بھی نرم پڑ گئے اور آپ کے دامن سے وابستہ ہو گئے، اگر آپ ترش مزاج، سخت دل ہوتے تو منظر اس کے بالکل برعکس ہوتا، کوئی آپ کے قریب نہ آتا کوئی جماعت وجود میں نہ آتی کہ انسان فطری طور پر نرمی پسند واقع ہوا ہے، وہ ہر نرم بات کو تسلیم کرتا اور نرم مزاج کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے، دیکھ لیجئے، بچہ، ماں باپ سے کس قدر محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے ہیں، نرم مزاج حاکم ہو یا قائد، وہ قوم کے دلوں کو موہ لیتا ہے اور قوم اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہے، آپ نے غزوات کے واقعات پڑھے ہیں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح صحابہ کرام نے اپنے آقا کے حکم پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا لیکن ترش مزاج حاکم و قائد کی اطاعت صرف اس وقت تک کی جاتی ہے جب تک لوگ اس کے ظلم و ستم سے ڈرتے ہیں، جونہی انہیں موقع ملتا ہے وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور ایسے شخص سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

اللہ، جبر و اکراہ کے ساتھ اپنے دین کو قبول کرانا نہیں چاہتا، جیسا کہ فرمایا "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" وہ دلوں میں دین کی محبت پیدا فرمانا چاہتا ہے، پس دین کے خادمین اور مبلغین پر یہ ذمہ داری عائد فرماتا ہے کہ وہ آپس میں نرمی کا برتاؤ اختیار کریں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت، مبلغین کی پہلی جماعت ہے، جنہوں نے نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بلاواسطہ فیض حاصل کیا، آپ ﷺ نے ان کی تربیت جس طرح کی اس کو قرآن کریم نے بیان کرتے ہوئے فرمایا "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ایسے ہمدرد ہو گئے کہ سب کی خوشیاں ایک اور سب کے غم ایک ہو

گئے، وہ جو اپنے لئے پسند کرتے وہی اپنے دوسرے بھائی کے لئے پسند کرتے، کمزوروں، غریبوں، یتیموں، بیواؤں، حاجت مندوں کی مدد کرنا ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی عزت وآبرو، مال ودولت کے محافظ تھے، نتیجتاً ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں ہر شخص بے خوف اور پُرسکون، شب وروز بسر کرتا تھا، نہ چوری کا ڈر تھا، نہ ڈاکوں کا، نہ بیٹیوں کی عزت کو خطرہ تھا، نہ بیٹوں کی جانوں کو۔

لیکن آہ، آج اسی نبی کا کلمہ پڑھنے والے اور انہیں صحابہ کی محبت کا دم بھرنے والے سکون واطمینان کی زندگی کے لئے تڑپ رہے ہیں کہ کون سا خطرہ ہے جو انہیں آج لاحق نہیں، بازاروں اور محلوں میں ان کی عزت وآبرو محفوظ نہیں، گھروں میں ان کی دولت محفوظ نہیں، دن میں وہ بے خوف ہو کر حصول معاش سے محروم ہیں، تو رات کو سکون کے لئے ترستے ہیں، یہ کیفیت کیوں ہے؟ صرف اور صرف اس لئے کہ قرآنی ارشاد کے مطابق وہ ''اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' نہ رہے باہمی نرمی اور محبت ان کے دلوں سے نکل گئی، پس ایک دوسرے کے دشمن بن گئے، کسی کو کسی پر اعتماد نہ رہا لیکن ہماری یہ کیفیت ہمارے ہی لئے مہلک ہے، دین کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ اگر ہم نے اپنی حالت کو سدھار کر اپنی ذمہ داری پوری نہ کی تو ہمارا نام ونشان مٹ جائے گا اور اللہ اپنے دین کی خدمت کی ذمہ داری ایسے لوگوں کو سونپ دے گا جو ہم سے بہتر ہوں گے اور جن میں قرآن کی مطلوبہ صفات پائی جائیں گی۔

اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

اہلِ ایمان کو کافروں پر سخت ہونا چاہئے یعنی دینی معاملات میں ان سے کسی قسم کی رواداری نہ برتی جائے اسی لئے ضروری ہے کہ ان کا اتنا احسان نہ لیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے دینی اور اندرونی معاملات میں مداخلت کی جرأت کرنے لگیں اور مسلمان ان سے مروت اور رواداری کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہوں، معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے ان کے قرض میں اپنے آپ کو جکڑ لینا، قانونی سہولت حاصل کرنے کے لئے ان کی تہذیب کو اپنا لینا، دنیاوی فوائد کے لئے ان کے رنگ میں رنگ جانا، ایک نہ ایک دن مسلمانوں کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ کافروں کی ہر بات کو تسلیم کریں اور ''اعزۃ علی الکٰفرین'' کی خوبی سے محروم ہو جائیں۔

اہل ایمان میں یہ خوبی کس طرح ہونی چاہئے اس کا نمونہ حاصل کرنے کے لئے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل ہماری تاریخ میں محفوظ ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ طبعی طور پر نہایت نرم مزاج نرم دل تھے لیکن وقت آنے پر انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مؤمن کی نرمی اپنے بھائیوں کے لئے ہوتی ہے، دین کے دشمنوں کے لئے نہیں، دشمن کے مقابلہ پر ''اشدآء علی الکفار'' اور ''اعزۃ علی الکفرین'' ہونا ہی مؤمن کی شان ہے، ملاحظہ ہو یہ شان اس نرم دل خلیفہ اول میں:

نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پردہ فرماتے ہی دشمنان دین نے اسلام اور مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر بغاوت کی ایک آگ بھڑکا دی، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلیحہ بن خویلد نے اپنے جھوٹے دعویٰ نبوت کی تحریک تیز کر دی اور سادہ لوح مسلمان ان کے گرد جمع ہونے لگے، ان کے علاوہ متعدد قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ ان حالات میں مکہ

ملت کی قیادت ونگرانی کی ذمہ داری، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر عائد ہوئی، آپ نے اپنی ذمہ داری کو جس ہمت، استقامت اور شجاعت کے ساتھ پورا کیا، اس کا اعتراف کرتے ہوئے اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد میرے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جن حالات کا مقابلہ کرنا پڑا اور جو صدمہ آپ کو پہنچا اگر وہ مضبوط پہاڑوں پر بھی پڑتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر واستقامت کا ایسا پیکر بنایا تھا کہ آپ نے تمام آفات ومصائب کا عزم وہمت سے مقابلہ کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔''

امڈتے ہوئے طوفان سے دین کو جو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا، اس پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نظر تھی لیکن اپنا فیصلہ کرنے سے قبل آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا کہ ان حالات کا مقابلہ کس طرح کیا جائے اور دین کی کس طرح حفاظت کی جائے، صحابہ کرام کا متفقہ فیصلہ تھا کہ حالات کی نزاکت کا تقاضا یہی ہے کہ اس وقت حکمت وتدبر سے کام لیا جائے اور باغیوں کے خلاف کوئی سخت اقدام نہ کیا جائے لیکن اللہ بیشمار رحمتیں نازل فرمائے حضور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر اور ہمارے قائدین وحکام کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق وہمت عطا فرمائے، آپ نے اپنوں کی مخالفت کے باوجود بھی ''اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ'' کی قرآنی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ایک مؤثر خطبہ دیا اور فرمایا:

'' جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد، نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دیئے ہوئے احکام اور قانون اسلام کا انکار کریں تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں، چاہے وہ میرے مقابلہ پر تمام جن وانس اور دنیا بھر کے شجر وحجر کو جمع کرلائیں اور میرا کوئی ساتھی نہ ہوتب بھی میں تنہا اس جہاد کو انجام دوں گا۔''

یہ فرما کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور جانے لگے اب صحابہ کرام کو اپنی اجتہادی غلطی کا احساس ہوا، سب نے آپ کو روکا اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا، تاریخ شاہد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے باغیوں کی خوب خوب سرکوبی ہوئی، نقصان کے باوجود اہل ایمان غالب رہے اور ہمیشہ کے لئے امتِ مسلمہ کو دین کی حفاظت کا ڈھنگ نصیب ہوگیا اور یہ حقیقت ثابت ہوگئی کہ اہل ایمان کی عزت، فلاح وبہبود کا ذریعہ، قرآنی اصول ''اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ'' پر ہی عمل کرنا ہے۔

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جہاد فی سبیل اللہ کا مطلب صرف تلوار سے جنگ کرتے رہنا ہی نہیں بلکہ اپنی اصلاح کرنا، اپنے اہل وعیال، اقرباء واحباب کی اصلاح کرنا، ہر حال میں دین پر عمل کرنا، دوسروں کو دین پر عمل کی دعوت دینا، برائیوں اور بروں کی مخالفت کرنا، برائیوں کو مٹانا، یا کم از کم دل سے برا جاننا، بُروں سے قطع تعلق کرنا، چاہے وہ اپنے ہوں یا غیر، یہ سب جہاد فی سبیلِ اللہ ہی ہے، جو مؤمن کی شان ہے، جس سے دین کی بقاء ہے، جو حفاظت واشاعتِ دین کا ذریعہ ہے، اس راہ کا ہر کانٹا پھول ہے، ہر تکلیف راحت ہے۔

مؤمن صرف میدان جنگ میں نہیں ہر حال اور ہر جگہ ہر وقت مجاہد نظر آتا ہے، وہ صرف تلوار سے ہی نہیں اپنے عمل سے بھی جہاد کرتا ہے، حرام کی دولت بآسانی حاصل کر لینے کی بجائے محنت ومشقت کے ساتھ حلال کی روزی کمانا بھی جہاد ہی

ہے رات کی نیند اور آرام قربان کر کے اللہ کے دربار میں سجدے کرنا اور رونا بھی جہاد ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دنیا کے عیش وعشرت کو چھوڑنا بھی جہاد ہے اور ایسے ہی مجاہدین پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور انہیں کو اللہ کی مدد او نصرت نصیب ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ (البقرہ:۲۱۸)

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور اللہ بڑا بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝
(التوبہ:۲۰۔۲۲)

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے بہت بڑا ہے (ان کا) درجہ اللہ کے یہاں اور یہی ہیں وہ جو کامیاب ہونے والے ہیں، خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغات کی کہ ان کے لئے ان میں دائمی نعمتیں ہوں گی، ہمیشہ رہنے والے ہیں وہ ان میں تا ابد، بیشک اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔

کامیابی و کامرانی کا یہ مژدہ ان مجاہدین کے لئے بھی ہے جو میدان کارزار میں اپنی تلواروں سے لڑتے ہیں واپس ہوتے ہیں تو غازی کہلاتے ہیں اور جانوں کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں تو شہید کہلا کر، حیات جاودانی پالیتے ہیں او کے لئے بھی ہے جن کی زندگی کا ہر لمحہ، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں بسر ہوتا ہے کہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ نے عبادات و اطاعت کو بھی جہاد قرار دیا۔

حج جہاد ہے اور عمرہ نفل (ابن ماجہ)

بوڑھے کا حج کرنا جہاد ہے (ابن ماجہ)

میری امت کا ترک دینا (عیش وعشرت ترک کرنا) جہاد فی سبیل اللہ ہے (بیہقی)

رزق حلال طلب کرنا جہاد ہے (کتاب مختار)

مشرکوں سے اپنے مال، جان اور زبان سے جہاد کرو (امام احمد)

عورت کا جہاد اپنے شوہر کی اطاعت ہے (طبرانی)

(مسلمان بھائی کے لئے) قبر کھودنا جہاد ہے، میت کو غسل دینا بھی جہاد ہے (دیلمی)

نمازیوں کی چادریں تلواریں ہیں (عبدالرزاق)

بہترین جہاد وہ کلمہ حق ہے جو ظالم بادشاہ (حاکم) کے سامنے کہا جائے (ترمذی شریف)

والدین کی خدمت کرنا جہاد ہے (طبرانی)

مؤمن دنیا میں اللہ کا سپاہی ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق جو عمل بھی کرتا ہے وہ دین کی بقاء کا ذریعہ ہوتا ہے اور اصل جہاد یا روح جہاد بقائے دین ہی ہے پس ہر مؤمن مجاہد ہے اور وہ اسی وقت تک باعزت و باوقار ہے جب تک مجاہد ہے جب وہ اپنی اس عظیم خوبی کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو ذلیل وخوار ہو جاتا ہے، نہ اپنوں کی نظروں میں اس کا کوئی مقام رہتا ہے اور نہ غیروں کے دلوں میں اس کی کوئی عزت باقی رہتی ہے، اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ جو دنیا کو پناہ دینے کا ذمہ دار تھا اب وہ خود در در پر بھیک مانگتا ہے لیکن اسے کہیں پناہ نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ محفوظ رکھے۔

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ

(اور وہ نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے) ملامت اگر کسی واقعی برائی پر اصلاح کی نیت سے کی جائے تو جائز ہے مثلاً کسی بے نمازی کو نماز نہ پڑھنے پر، کسی شرابی کو شراب پینے پر برا بھلا کہا جائے اور شرم دلائی جائے لیکن اگر ملامت کی بناء جلن، حسد ہو تو نیت میں بغض اور بڑی حرکت ہے۔ اسی طرح مذمت کرنے والا متعدد مہلک برائیوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کسی پر الزام لگاتا ہے، بہتان باندھتا، غیبت کرتا ہے، چغل خوری کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، یہ تمام رذائل ہیں جن کا ارتکاب مؤمن کو ذلیل وخوار کر دیتا ہے اور وہ خود ہی اپنی سلگائی آگ میں جلتا ہے۔

دین کے خادموں پر ملامت کا سلسلہ بہت قدیم ہے، عام لوگ علماء پر، مساجد کے منتظمین پر اور دیگر طریقوں سے دین کی خدمت کرنے والوں پر ملامت کرتے آئے ہیں، جس کے لئے انہیں شیطان اُکساتا ہے تاکہ دین کے کاموں میں رُکاوٹ پیدا ہو اور عجیب بات یہ ہے کہ ضعیف الایمان لوگ اس ملامت سے متاثر ہو کر شیطان کی حرکت کا شکار ہو جاتے ہیں اور خدمت دین سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں جبکہ انہی لوگوں کو دنیاوی معاملات میں چاہے کتنا ہی بُرا بھلا کہا جائے، ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا حالانکہ اہلِ ایمان کی خوبی یہ ہے کہ دین و دنیا کے معاملات میں لوگوں کی تنقید پر غور کریں، اپنی اصلاح کریں، اپنے آپ کو بہتر سے بہتر بنائیں اور بے خوف وخطر اپنا کام کرتے رہیں، اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہیں یہی مطلب ہے ''وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ'' کا یہ اہلِ ایمان کی خوبی اور خصوصیت ہے۔

اس سلسلے میں حضرت ابو عمرو رضی اللہ عنہ نے بڑی اچھی بات فرمائی آپ فرماتے ہیں کہ ''جس شخص کا علمی کمال، تقویٰ اور بہترین اخلاق ہر طرح ثابت ہو چکا ہو اس کے متعلق چند لوگوں کی بیہودہ باتیں اور الزام تراشی کس طرح قبول کی جا سکتی ہے جبکہ دنیا اس حقیقت کو بھی جانتی ہے کہ لوگوں نے اللہ کو بھی نہ چھوڑا تو پھر کسی اور کے لئے ان کی زبانیں کس طرح بند ہو سکتی ہیں''

حافظ ابن عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم بنی اسرائیل کے لوگ بہت پریشان کرتے تھے، طرح طرح کے ان پر الزام لگاتے، طرح طرح کی بیہودہ گوئی کرتے تھے، ایک دن آپ بہت پریشان ہوئے اور اللہ کے دربار میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے، اے میرے رب! میں تیرے دین کی خدمت کرتا ہوں،

لوگ مجھ پر ملامت کرتے ہیں یا اللہ! تو مجھے بنی اسرائیل کی بیہودہ گوئی سے نجات عطا فرما دے۔ جواب ملا، اے موسیٰ! میں نے اپنے لئے لوگوں کی زبانیں بند نہ کیں، تمہارے لئے کیسے کر دوں۔

پس کسی کی ملامت سے محفوظ رہنا کمال نہیں، ملامت کے سبب، اپنی ذمہ داریاں چھوڑ دینا کمال نہیں، کمال یہ ہے کہ اپنے کردار کی اصلاح کے ساتھ پوری طرح صبر وتحمل اور استقامت سے خدمتِ دین کا کام جاری رکھا جائے تا کہ شیطان اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر لوگوں نے تحریفِ قرآن، مخالفتِ حدیث تک کے الزامات لگائے، انہیں بدعتی کہا، حکام کو ان کی طرف سے بدظن کیا، غرضیکہ آپ کو دین کے کام سے روکنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن اس مرد مؤمن نے کسی کی پروانہ کی اور صبر وتحمل سے اپنا کام جاری رکھا، آپ فرماتے ہیں:

اِنْ يَّحْسُدُوْنِيْ فَاِنِّيْ غَيْرُ لَائِمِهِمْ قَبْلِيْ مِنَ النَّاسِ اَهْلُ الْفَضْلِ قَدْ حُسِدُوْا

فَدَامَ لِيْ وَلَهُمْ مَابِيْ وَمَابِهِمْ وَمَاتَ اَكْثَرُنَا غَيْظًا بِمَا يَحْسُدُ

اگر لوگ مجھ پر حسد کرتے ہیں تو انہیں ملامت کرنے والا نہیں، مجھ سے پہلے بھی عزت والوں پر لوگ حسد کرتے رہے۔ میرا اور ان کا ہمیشہ یہی طریقہ رہے گا اور ہم میں سے بہت لوگ حسد ہی کرتے کرتے مر گئے۔

اے ایمان والو:۔ اپنے ایمان کی حفاظت کرو کہ یہی تمہاری عزت وعظمت کا ذریعہ ہے، اسی سے تمہارے دلوں میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اسی کے سبب تم اللہ کے محبوب بنتے ہو، اسی سے باہمی نرمی، ہمدردی اور محبت پیدا ہوتی ہے، اسی کے باعث تم اللہ کے دشمنوں پر سخت نظر آتے ہو، اسی سے مجاہد بنتے ہو جو ایک عظیم منصب ہے، اسی سے خدمت دین کے ایسے جذبات بیدار ہوتے ہیں جو مخالفین کی لاکھ مخالفت اور ملامت کے باوجود بھی سرد نہیں پڑتے، یہ عظیم خوبیاں ہیں جو انہی کو نصیب ہوتی ہیں جنہیں اللہ اپنے فضل کے لئے منتخب فرما لیتا ہے، پس تم اللہ کے اس عطیہ کی قدر کرو، ان کی حفاظت کرو، ان میں اضافہ کی سعی کرتے رہو، یاد رکھو اگر تم ان صفاتِ حسنہ سے محروم ہو گئے تو کہیں کے نہ رہو گے، نقصان تمہارا ہی ہوگا، اللہ کے دین کا نہیں، اللہ تو قادر مطلق ہے، وہ تمہاری جگہ خدمت دین کا عظیم منصب جسے چاہے سونپ دے گا۔

اے ایمان والو:۔ خوب یاد رکھو، تمہارا مددگار، خیر خواہ، اللہ، رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کوئی نہیں، تم دَر دَر کی ٹھوکریں کھا کر ذلیل وخوار تو ہو سکتے ہو، غیروں کی مدد حاصل کر کے اپنا ضمیر بیچ سکتے ہو۔ ممکن ہے ایمان سے بھی محروم ہو جاؤ لیکن مسائل و مصائب سے نجات نہیں پا سکتے اور اہلِ ایمان میں جو بدعمل، بدکردار اور فاسق و فاجر لوگ تمہارے معاون و مددگار نہیں ہو سکتے وہ تمہارے ساتھ دھوکا کریں گے تمہیں اپنی ہوا و ہوس کا شکار بنائیں گے، ہاں تمہارے خیر خواہ صرف وہی مؤمن ہیں جو باعمل ہیں، نمازی ہیں، زکوٰۃ پابندی سے ادا کرتے ہیں، ہر حال میں ان کا سر اللہ کے دربار میں جھکا رہتا ہے۔ پس اے ایمان والو! قرآن نے تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا، تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم معاشی، معاشرتی، سیاسی، ملکی غرضیکہ زندگی کے ہر معاملہ میں، اللہ کو اپنا مددگار بناؤ، اس کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مددگار بناؤ، ان کو اپنی

زندگی کے لئے نمونہ بنالو، ان کا تعلیم کردہ طرز زندگی اختیار کرلو اور صالحین کو اپنا مددگار بناؤ، ان کے دامن سے وابستہ ہوکر زندگی کی خاردار راہ کو ان کی رہبری میں طے کرو پس تم منزل پالو گے، اب تم ''حزب اللہ'' اللہ کی جماعت قرار پاؤ گے اور یاد رکھو ہمیشہ اللہ کی جماعت ہی کامیاب و کامران ہوتی اور دشمن پر غالب رہتی ہے۔

آج امتِ مسلمہ اگر اپنے حال زار پر غور کرے اور اپنی ذلت وخواری کا سبب جاننے کی کوشش کرے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن کریم کے ارشاد کے برعکس ہم نے اپنا والی و مددگار انہیں بنایا جو خود درندے ہیں، انسان اور انسانیت کے دشمن ہیں جن کی نہ بود و باش انسانی ہے نہ طرزِ زندگی انسانی ہے، ہم ان کے در کے بھکاری بن گئے، انہوں نے ہمیں خرید لیا، چند ٹکوں کے عوض اپنا غلام بنالیا، ہماری تہذیب وتمدن تک کو ہم سے چھین لیا، ہم سے روحِ ایمان تک کھینچ لی، ہم نام کے مسلمان رہ گئے ''حزبُ الشیطٰن'' شیطان کی جماعت بن گئے جس کا مقدر ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں، کاش ہم قرآن کریم کی ان آیات پر غور کرکے اپنی حالت تبدیل کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہمارا کھویا ہوا مقام، ہمارا گمشدہ سرمایہ پھر ہمیں مل جائے، اللہ توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۳۷

المائدہ: ۵۷ تا ۵۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِذَا
نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

(المائدہ: ۵۷، ۵۸)

اے ایمان والو! مت بناؤ ان لوگوں کو جنہوں نے بنا رکھا ہے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل، ان سے جنہیں دی گئی کتاب، تم سے پہلے اور کفار سے (اپنا) دوست اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان دار ہو اور جب تم بلاتے ہو نماز کی طرف تو وہ بناتے ہیں اسے مذاق اور تماشہ، یہ (حماقت) اس لئے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو کچھ نہیں جانتے۔

احترامِ دین، دین کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے، جو شخص اپنے دین کا احترام نہیں کرتا اسے خارج از دین قرار دے دیا جاتا ہے، اسلام بلاشبہ دین حق ہے، دین الٰہی ہے "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" اسلام کے علاوہ دوسرا دین

اختیار کرنا قابل قبول نہیں ،ایسا شخص قیامت کے دن خسارے میں ہوگا۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

(آل عمران:۸۵)

اور جو تلاش کرے گا اسلام کے علاوہ کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے اور وہ قیامت کے دن نقصان والوں میں ہوگا۔

کیونکہ صرف اور صرف یہی دین مکمل ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ یہ دین زندگی کے ہر شعبہ کی رہنمائی کرتا ہے، پس کس طرح ممکن ہے کہ کوئی اپنا یا غیر اس دین کا مذاق اڑائے، تمسخر کرے اور اسے برداشت کرلیا جائے۔

کلمہ کافی نہیں

ایمان کی بقاء کے لئے صرف کلمہ پڑھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ احکام دین کو دل سے تسلیم کرنا اور ان کا احترام کرنا بھی لازمی ہے، شریعت کے احکام کی پابندی نہ کرنا مثلاً نماز نہ پڑھنا، روزہ نہ رکھنا، زکوٰۃ نہ ادا کرنا، گناہ ہے، ایسے شخص کو بدعمل یا زیادہ سے زیادہ فاسق وفاجر قرار دیا جاسکتا ہے کہ لیکن کسی حکم شرعی کو حقیر جاننا، اس کی توہین کرنا، مذاق اڑانا، ایمان سے محروم ہو جانا ہے اللہ محفوظ رکھے، مثلاً:

روزے کے متعلق کہنا یا خیال کرنا کہ یہ تو فاقہ ہے۔ جس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو وہ فاقہ کرے، نماز کے متعلق کہنا، کہ یہ وقت کا ضیاع ہے، حج کے لئے کہنا کہ دولت و وقت دونوں ضائع کرنا ہے، زکوٰۃ کو مسلمان ہونے کا ٹیکس قرار دینا، شرعی سزاؤں کو ظلم قرار دینا مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا، پردے کو عورتوں پر ظلم قرار دینا، نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں کی توہین کرنا، علماء دین کو حقیر جاننا، انہیں دین کا ٹھیکیدار، امت میں افتراق پیدا کرنے والا گروہ وغیرہ کہنا، غرضیکہ اس قسم کی تمام بیہودہ باتیں ایمان سے محروم کر دیتی ہیں جبکہ ایسے لوگ خود کو پکا مؤمن خیال کرتے رہتے ہیں، ہمارے دور کے مہلک امراض میں سے یہ ایک بدترین مرض ہے، جو دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ خاص طور پر اس کا شکار، ہمارے کالج، یونیورسٹیاں ہیں یا پھر اس وباء میں وہ لوگ مبتلا ہیں جنہیں یورپ وامریکہ کی ہوا و غذا نے، وہاں کے عیش وعشرت نے مفلوج کر ڈالا ہے، ان میں نہ سوچنے کی صلاحیت رہی اور نہ ہی سمجھنے کی۔ دین کے علم سے وہ واقف نہیں، علماء دین سے نفرت کرتے اور انہیں حقیر سمجھتے ہیں نتیجۃً دین کے متعلق جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں، چاہے ان کی بیہودہ گوئی دین سے ان کی محرومی ہی کا سبب کیوں نہ بن جائے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور ان کی ہرزہ سرائی سے بچائے۔

بہرحال اسلام جب اپنے ماننے والوں کو دین کے استہزاء اور مذاق کی اجازت نہیں دیتا، تو کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ اہل ایمان ان غیر مسلموں سے تعلق رکھیں جو ان کے دین کو ہنسی اور کھیل بناتے ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہیں، جن میں پیش پیش ہمیشہ یہودی اور عیسائی رہے ہیں، آج بھی یہی قومیں اسلام کے خلاف سازش کرتی رہتی ہیں، ابھی حال ہی کی بات ہے، افغانستان میں طالبان نے عورتوں کو پردہ کرنے اور گھروں میں رہنا کا حکم دیا تو غیر مسلم دنیا میں ایک طوفان آگیا، پورا میڈیا اس کے خلاف حرکت میں آگیا، مسلم ممالک میں جب بھی کسی کو پھانسی دی جاتی ہے، یا کوڑے لگائے جاتے ہیں تو اسلام کے

یہ دشمن آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، غرضیکہ دین کا مذاق اڑانے والے عام کفار ہوں یا عیسائی اور یہودی۔ اسلام ان سے علیحدگی کا حکم دیتا ہے تاکہ ان کے استہزاء کا اثر ہمارے اعمال اور ہمارے ذہنوں پر نہ پڑنے پائے۔ واضح حکم ہے کہ:

اے ایمان والو: تمہاری ایمانی غیرت وحمیت کا یہ تقاضا ہے کہ ان اہل کتاب اور کفار کو اپنا ولی، مددگار نہ بناؤ جو تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں، اسے حقیر جانتے ہیں بالخصوص ایسے احمقوں سے بچتے رہو، جو اذان سن کر ہنستے ہیں اور اسے ایک شور قرار دیتے ہیں۔

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۝

(انعام:۶۸)

اور جب دیکھے تو نہیں کہ بیہودہ بحثیں کررہے ہیں ہماری آیتوں میں تو منہ پھیر لے ان سے یہاں تک کہ وہ الجھنے لگیں کسی اور بات میں اور اگر بھلادے تجھے شیطان تو مت بیٹھو یاد آنے کے بعد ظالم قوموں کے ساتھ

واضح حکم ہے ان لوگوں سے علیحدگی کا، جو دین کا مذاق اڑاتے ہیں، اس میں کج بحثی کرتے ہیں، چاہے وہ اپنے ہوں یا غیر ہوں۔ ظالموں کی صحبت ظالم بنا دیتی ہے، مؤمن ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر، اپنی ملت کے لئے ایک ایسا ناسور بن جاتا ہے۔ جو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتا ہے۔

آیت زیر بحث میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اذان سن کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اسے ایک شور شرابہ کہتے ہیں لیکن اپنی گھنٹیوں اور سیٹیوں کی لایعنی آوازوں سے ان کے کان بند ہیں، ایسے لوگوں کی عبرت کے لئے ایک واقعہ پیش کرتا ہوں، جسے علامہ قرطبی نے بیان کیا، میں اسے ''ضیاء القرآن'' سے نقل کر رہا ہوں۔

مدینہ منورہ میں ایک نہایت ہی متصلب اور متعصب عیسائی تھا، اس خبیث نے اپنی عادت بنائی تھی کہ جب اذان ہوتی اور مؤذن ''اشهد ان محمد رسول الله'' کہتا ہے تو یہ ظالم کہتا ''حُرق الكاذبُ'' کہ جھوٹا جلایا جائے، (پس ایک دن غضب الٰہی جوش میں آیا اور ہوا یہ) کہ وہ ایک رات اپنے گھر میں مست پڑا سورہا تھا، گھر میں آگ بھڑک اٹھی، اسے بھاگنے کا موقع تک نہ ملا، اپنے خاندان سمیت جل کر راکھ ہوگیا (اللہ استہزاء دین سے محفوظ رکھے)

بہر حال اس سے زیادہ بے عزتی کی کوئی اور بات نہیں کہ مؤمن اپنے دین کی توہین کرے، اس کا مذاق اڑائے، یا ایسا کرنے والوں کو اپنا ولی اور مددگار جانے، غیرت ایمان تو یہ ہے، حکم قرآن تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے دور ہو جانے، ان سے تعلقات منقطع کرے، اللہ عمل کی توفیق دے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ



مَولاَیَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیبِکَ خَیرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ
مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ
وَالْفَرِیقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۳۸

المائدہ: ۸۷ تا ۸۹

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَ احْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

(المائدہ: ۸۷۔۸۹)

اے ایمان والو! نہ حرام کرو، پاکیزہ چیزوں کو جنہیں حلال فرمایا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور نہ حد سے بڑھو۔ بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اور کھاؤ اس سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ نے حلال اور پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم ایمان لائے ہو، نہ باز پرس کرے گا اللہ تم سے

تمہاری فضول قسموں پر لیکن باز پرس کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم پختہ کر چکے ہو، تو کفارہ یہ ہے کہ کھلایا جائے دس مسکینوں کو درمیانی قسم کا کھانا، جو تم کھلاتے ہو اپنے گھر والوں کو یا کپڑے پہنائے جائیں انہیں یا آزاد کیا جائے غلام اور جو نہ پائے تو وہ روزے رکھے تین دن کے، یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا، جب تم قسم اٹھاؤ اور حفاظت کیا کرو اپنی قسموں کی اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں تاکہ تم شکر ادا کرو۔

آیات بالا میں اہل ایمان کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو تم اپنے لئے حرام قرار نہ دیا کرو کہ یہ تقویٰ نہیں بلکہ تعدی ہے۔ حدود شرع سے تجاوز ہے تقویٰ تو اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کی مرضی کے مطابق اس دنیا کی چیزوں سے فائدہ حاصل کرنے کا نام ہے، متقین بلا شبہ اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں، جبکہ معتدین کو اللہ پسند نہیں فرماتا، نیز قسم کے متعلق شرعی احکام دیئے گئے ہیں جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں

رہبانیت یعنی ترک دنیا کا تصور نہایت قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے اور اس کو بڑی عبادت اور ایسے لوگوں کو بڑا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکالیف میں مبتلا کرتے اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے، کہ اس سے روح کی صفائی ہوتی ہے اور اس میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی عمل کو اہل یونان نے اشراقیت، عیسائیوں نے رہبانیت اور ہندوؤں نے جوگ کا نام دیا، یہ غلط تصور آج تک موجود ہے کہ سب سے زیادہ مذہبی اور مقدس شخص وہی ہے جو تارک الدنیا ہو، دنیا اور اس کی لذتوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو لیکن اسلام جو دین قیم ہے، واضح اعلان فرماتا ہے کہ "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" اللہ کسی جان پر اس کی قوت و وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، جسم کو تکلیف میں مبتلا کرنا، یا دوسروں کی حق تلفی کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں، اسلام رہبانیت نہیں، عبادت چاہتا ہے اور عبادت دنیا و مافیہا کو اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا نام ہے۔ یہی زہد ہے، یہی تقویٰ ہے، یہی قرب الٰہی اور رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کر لینا، رضائے الٰہی کا باعث ہرگز نہیں ہو سکتا، اسلام تو دین یسر ہے، اس میں تنگی و سختی کی گنجائش کہاں، فرمایا گیا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ: ۱۸۵)

اور اللہ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے اور نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری۔

اور میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ

بیشک یہ دین آسان ہے، جو شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

(نسائی)

ابتداء اسلام میں بعض صحابہ بھی عیسائیوں کے اثر، یا ذاتی رجحان کے سبب تجرد، ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، نبی رحمت ﷺ نے انہیں سختی سے روکا اور فرمایا کہ "میں ایسی شریعت لے کر نہیں آیا۔"

چند جلیل القدر صحابہ، جن میں حضرت ابوبکر و علی رضی اللہ عنہم بھی تھے، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے گھر میں جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ آئندہ ہم ہمیشہ روزہ رکھا کریں گے، ساری رات عبادت میں گزاریں گے، بستروں پر نہ سوئیں گے، گوشت، گھی وغیرہ نہ کھائیں گے، عورتوں اور خوشبو سے بالکل اجتناب کریں گے، اونی لباس پہنیں گے اور دنیا سے تعلق منقطع کرلیں گے، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حضرات کے ارادہ کا پتہ چلا تو آپ نے انہیں طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا:

> ''اے میرے صحابہ! تمہارے نفسوں کا بھی تم پر حق ہے، پس روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو، رات کو جاگ کر عبادت بھی کرو اور آرام سے سوؤ بھی، کیونکہ میں رات کو جاگتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، گوشت اور گھی بھی کھاتا ہوں اور اپنی ازواج سے مقاربت بھی کرتا ہوں، (یہ میرا طریقہ اور سنت ہے) جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ میری جماعت میں سے نہیں۔''

قُدامہ بن مظعون اور ان کے ایک ساتھی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! ہم میں سے ایک نے شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تو دونوں کام کرتا ہوں'' دونوں غلام شرمندہ ہوئے اور اپنے ارادہ سے توبہ کی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن میں روزہ رکھا کریں گے اور رات کو عبادت کیا کریں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خبر ہوئی، آپ ﷺ نے ان کو طلب فرمایا اور فرمایا ''اے عبداللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، بس مہینہ میں تین روزے رکھ لینا کافی ہے۔''

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ دن میں روزہ رکھتے تھے، رات بھر عبادت میں مصروف رہتے تھے، بیوی سے لاتعلق ہوگئے تھے، آپ ﷺ نے ان کو بلایا اور پوچھا، اے عثمان! کیا تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے ہو، عرض کرنے لگے: خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا ''میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان! اللہ سے ڈرو کہ تمہارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، پس روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔

آیت زیر بحث میں اسلام کا یہی اصول بتایا جارہا ہے کہ مومن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ یا تو دنیا اور اس کے عیش و عشرت میں ایسا مست اور مگن ہوجائے کہ اسے اپنی منزل کا پتہ تک نہ رہے اور یا وہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام سمجھ کر ان سے منہ موڑ لے، خود غیر ضروری جسمانی مشقت میں مبتلا ہو اور دوسروں کی حق تلفی کرے، مزید برآں اپنے اس فعل کو تقویٰ اور زہد خیال کرے، ہرگز نہیں، یہ نہ تقویٰ ہے اور نہ زہد، یہ رہبانیت ہے جو اپنی ذمہ داریوں سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، پس

اے ایمان والو! رب العزت جل مجدہ نے یہ ساری کائنات تمہارے ہی لئے پیدا فرمائی ہے۔ اس سے پورا پورا فائدہ حاصل

کرو۔ بس یہ خیال رکھو کہ اللہ کی عطا کردہ ہر چیز کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور ان کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق استعمال کرو۔ گویا اس دنیا کو دین کے ماتحت کرلو، دین جس چیز کے استعمال کی جس طرح اجازت دیتا ہے، اسی طرح استعمال کرو اور دین جس چیز سے تمہیں روکتا ہے اس سے رکے رہو، دور رہو۔ یہی تقویٰ ہے، یہی زہد ہے، یہی قرب الٰہی اور رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔

کیا تم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا جو تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ ان سے زیادہ عبادت گزار کون ہوسکتا ہے لیکن وہ تارک الدنیا نہ تھے، عابد و زاہد اور متقی تھے تو حاکم، تاجر بھی تھے، شوہر اور باپ بھی تھے غلاموں کے آقا بھی تھے اور ان کی خبرگیری کرنے والے بھی تھے، وہ دین کے کاموں میں بھی مصروف رہتے تھے تو اپنے ذاتی امور بھی انجام دیتے تھے، وہ نماز و عبادت کی دعوت دیتے، حفاظت دین کے لئے میدان جہاد میں لے جاتے تو انہیں آپس میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم بھی دیتے تھے، وہ خود ہر ایک کے مونس تھے، غمگسار تھے، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا، یتیموں، بیواؤں کی مدد کرنا ان کا شیوا تھا، طاقتور سے کمزور کا حق دلانا ان کے انصاف کی بنیاد تھی، کوئی مرتا تو وہ اس کا جنازہ قبر تک پہنچاتے نظر آتے ہیں، کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت فرماتے غرضیکہ انہوں نے دنیا یا اس کی ذمہ داریوں کو بھی نہ چھوڑا اور نہ ہی اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو اپنے لئے یا دوسروں کے لئے کبھی حرام قرار دیا، پس اگر تم متقی بننا چاہتے ہو تو امام المتقین صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلو کہ یہی واحد راستہ ہے جو تقویٰ کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

ریاض و مجاہدہ

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ صوفیائے کرام جو ریاض و مجاہدہ کرتے ہیں، وہ رُہبانیت ہی کی ایک صورت ہے تو پھر ان کا یہ عمل کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے، اس غلط فہمی کی بناء، یہ نہ سمجھنا ہے کہ حلال چیز کو حرام قرار دینے کا کیا مطلب ہے، پس اسی کو سمجھ لیجئے تو ریاض و مجاہدہ کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کی تین صورتیں ہیں، اول یہ کہ کسی حلال چیز کے متعلق یہ اعتقاد ہو کہ یہ حرام ہے اور اس کا استعمال گناہ ہے، یہ نہایت ہی خطرناک صورت ہے کہ اگر خود حرام کردہ چیز کا نص قطعی سے حلال ہونا ثابت ہے تو اس کو حرام یقین کرنے والا، دائرہ اسلام سے خارج ہوجائے گا اور قانونِ الٰہی کی مخالفت کے جرم میں کافر قرار پائے گا، مثلاً کوئی شخص نکاح نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ اس عمل کو جائز، حلال تسلیم نہیں کرتا، حرام جانتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی حلال کو قسم کے ذریعہ اپنے اوپر حرام کرلیا جائے لیکن اعتقاداً اس کو حلال ہی مانتا ہو مثلاً کسی نے قسم کھائی کہ وہ بکری کا گوشت نہیں کھائے گا جبکہ وہ بلاشک وشبہ یہ مانتا ہے کہ بکری کا گوشت حلال ہے۔ بلاضرورت ایسی قسم کھانا سخت گناہ ہے۔ اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کردینا چاہئے اور حلال سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی حلال چیز کو عادتاً یا مجبوراً استعمال نہ کیا جائے مثلاً کوئی مچھلی نہیں کھاتا، کیوں؟ بس پسند نہیں یا کوئی نکاح نہیں کرتا اس لئے کہ وہ اہل و عیال کی کفالت کا اہل نہیں۔ ان صورتوں میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ ثواب، اسی صورت میں ریاض و مجاہدہ کی صورت بھی شامل ہے کہ بعض صوفیاء کرام قلیل مدت یا طویل مدت کے لئے کسی حلال چیز کو ترک

کرتے ہیں، کسی روحانی بیماری کی وجہ سے یا روحانی تقویت کے حصول کے لئے یہ صورت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر، مریض کو کسی بیماری کی وجہ سے مرغی کا گوشت ترک کر دینے کی ہدایت کرے، چاہے کچھ مدت کے لئے یا ہمیشہ کے لئے پس یہ عمل جسمانی ڈاکٹر کی ہدایت پر ہو یا روحانی ڈاکٹر کی ہدایت پر اس پر عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اسی کو طبی اصطلاح میں پرہیز کہا جاتا ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں ریاض ومجاہدہ۔

احکامِ قسم

کسی گزشتہ واقعہ پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا، ''یمین غُموس'' ہے یہ گناہ کبیرہ ہے، دنیا وآخرت میں اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے، اگرچہ اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ لیکن اس سے توبہ کرنا اور استغفار کرنا لازم ہے جن لوگوں کو اس کی عادت ہو، انہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ہمیشہ کے لئے توبہ کر لینا چاہئے۔ اس قسم کو غُموس کہتے ہیں اس لئے کہ غُموس کے معنیٰ ڈبو دینے والا ہے، یہ قسم انسان کو گناہ اور وبال میں ڈبو دیتی ہے۔

کسی ایسے گزشتہ واقعہ پر قسم کھانا، جو اس کے خیال میں سچ ہو لیکن حقیقت میں جھوٹ ہو مثلاً کسی نے خالد کو بتایا کہ زاہد بیمار ہے، خالد نے قسم کھا کر دوسروں کو بتایا کہ زاہد بیمار ہے جبکہ خبر دینے والے نے جھوٹی خبر دی تھی، اس کو ''یمینِ لغو'' کہتے ہیں اس میں عادتاً قسم کا لفظ نکل جانا بھی شامل ہے، اس قسم پر نہ کفارہ ہے نہ گناہ لیکن اس کی عادت سے بچنے کی کوشش کی جائے کیونکہ عادت ہو جانے کی صورت میں پھر یہی قسم، یمین غُموس کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

قسم کی تیسری صورت یہ ہے کہ آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائے، اس کو ''یمین منعقدہ'' کہتے ہیں اس قسم کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے، اگر یہ قسم کسی اچھے کام کو چھوڑنے یا بُرا کام کرنے کے لئے کھائی گئی تو اس کا توڑنا واجب ہے، اس صورت میں کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا اور توبہ بھی کرنا ہوگی، مثلاً کسی نے نماز نہ پڑھنے کی قسم کھالی، یا چوری کرنے کی قسم کھالی۔

کفارۂ قسم یہ ہے کہ دس غریبوں کو کھانا کھلایا جائے دونوں وقت کا، یا کپڑا پہنایا جائے لیکن یہ کھانا اور کپڑا ایسا ہی ہو جو عام طور پر قسم کھانے والا خود کھاتا یا پہنتا ہے یا اگر غلام موجود ہے تو اسے آزاد کر دیا جائے اور اگر کوئی ان تینوں کاموں میں سے کوئی کام نہ کر سکے تو پھر تین روزے رکھے جو مسلسل ہوں یعنی درمیان میں ناغہ نہ کیا جائے، پس

اے ایمان والو! تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو، بات بات پر قسم نہ کھاؤ اگر سخت مجبوری ہو تو قسم کھاؤ جو سچی ہو اور اگر آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ہو تو ایسی مضبوط ہو کہ اسے توڑنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ مَا فِیْ جَمِیْعِ الْقُرْاٰنِ حَرْفًا

حَرْفًا وَّبِعَدَدِ كُلِّ حَرْفٍ اَلْفًا اَلْفًا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۳۹

المائدہ: ۹۰ تا ۹۳

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ لَیْسَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (المائدہ: ۹۰: ۹۳)

اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانیاں ہیں پس ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ، یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعے اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے

والے ہو، اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور محتاط رہو اور اگر تم نے رُوگردانی کی تو خوب جان لو کہ ہمارے رسول کا فرض تو بس پہنچا دینا ہے کھول کر نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، کوئی گناہ جو (اس حکم سے پہلے) وہ کھا پی چکے جب وہ پہلے بھی ڈرتے تھے اور ایمان رکھتے تھے اور نیک عمل کیا کرتے تھے پھر (ان احکام کے بعد بھی) ڈرتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں پھر بھی ڈرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں اور اللہ محبت کرتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے۔

آیاتِ مذکورہ میں خمر، میسر، اَنصاب اور اَزلام کی واضح حرمت کا اعلان فرمایا جارہا ہے، وجہ حرمت بتائی جارہی ہے اور قبلِ حرمت جو اہل ایمان ان عیوب میں مبتلا رہے، گناہ سے ان کا پاک وصاف ہونا بیان کیا گیا۔

عیوب بالا، جن کی حرمت کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایسے رذائل میں شمار کئے جاتے ہیں جن سے ہر مذہب اور قوم کے لوگ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر پاتے کہ ان نامکمل مذاہب میں ایسا کوئی قانون نہیں جو ان عیوب میں مبتلا ہونے سے روکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے ناکارہ قوانین وقتاً فوقتاً ضرور نافذ کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے حُکام اتنے دل عزیز نہیں کہ قوم ان کے کہنے پر عیاشی کے ان ذرائع سے باز آجائے۔ کسی زمانہ میں امریکہ و یورپ بالخصوص برطانیہ کی حکومتوں نے شراب اور جوئے سے نجات حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی، لوگوں کو ان عادات کے نقصانات سے باخبر کرنے کے لئے ذرائع نشر و اشاعت کو استعمال کیا، قوانین نافذ کئے، شراب بنانے، بیچنے اور پینے والوں کو سخت سزائیں دی گئیں، امریکہ نے تو تین سو افراد کو پھانسی پر لٹکا دیا، پانچ لاکھ سے زیادہ اشخاص کو قید و بند کی سزائیں دیں، غرضیکہ کروڑوں ڈالر کے اخراجات کے باوجود نتیجہ صفر رہا، مرض اتنا ہی بڑھتا گیا جتنا دبانے کی کوشش کی گئی۔ جب کوشش ہی نامکمل ہو، قوانین ہی نامکمل ہوں تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے، آج کل ہی دیکھ لیجئے، لوگوں کو سگریٹ سے بچانے کے لئے کیسی مضحکہ خیز کوشش کی جارہی ہے کہ سگریٹ کے اشتہارات ممنوع ہیں، سگریٹ کے پیکٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ یہ مضرِ صحت ہے لیکن نہ بنانے والوں پر پابندی، نہ فروخت کرنے والوں پر پابندی، خریدنے کی اتنی سہولت کہ خودکار مشینوں سے حاصل کرلی جاتی ہے، نتیجہ سامنے ہے کہ مغربی ممالک میں ۱۲ سال کی عمر سے سگریٹ پینا شروع کردی جاتی ہے اور یہ عمل لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں میں پایا جاتا ہے، مزید برآں اب حشیش و مروانہ اور دیگر منشیات کا ایک طوفان ہے جو روکے نہیں رک رہا، یہی حال جوئے کا ہے، بہت پابندیاں لگائیں گئیں۔ لیکن اس میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا اور ہر شخص تقریباً اس میں ملوث ہے حتیٰ کہ جوئے کے مراکز، کروڑوں کی لاٹریاں خود حکومت کی ضمانت پر اور زیر نگرانی جاری ہیں۔

ان بلاؤں نے امریکہ و یورپ کے امن و امان کو تہس نہس کر رکھا ہے، تہذیب کے علمبرداروں کے گلی کوچوں میں نہ کسی کی عزت محفوظ ہے، نہ دولت، جن ممالک کو افلاس زدہ، جہالت زدہ کہا جاتا ہے ان کی بہ نسبت قتل، لوٹ مار، ڈاکہ زنی کی وارداتیں کہیں زیادہ ان دولت مند ملکوں میں ہوتی ہیں، ایک ڈالر یا ایک گھڑی کے لئے لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے، گاڑیاں چوری نہیں ہوتیں لیکن گاڑی سے ٹیپ ریکارڈ چوری کرنے کے لئے پوری گاڑی کو تباہ کردیا جاتا ہے۔

بہر حال اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو اپنے ماننے والوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتا ہے، اس کے

عطا کردہ قوانین نہایت مکمل اور اٹل ہوتے ہیں اور چونکہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں، لہٰذا فطرت سلیمہ رکھنے والا انسان ان کو قبول کرنے کے لئے دوڑتا ہے اور ان کی پناہ میں آکر پُرسکون زندگی پالیتا ہے۔

حرمتِ شراب

اسلام نے انسانیت کی اصلاح اور سُدھار کا آغاز ایک ایسی قوم سے کیا جو اپنے دور کی سخت ترین اور بدترین قوم تھی، جس کی زینت، اس کے بدترین اعمال تھے، جس کی قوت و طاقت کی بنیاد ظلم وستم پر تھی جس کی خود ساختہ تہذیب کے ستون، شراب، میسر، اَنصاب اور اَزلام تھے، اس قوم سے اُس کی بدکاریوں اور بدکرداریوں کو یک دم چھڑا دینا، اس کی مزید بغاوت اور بربادی کا باعث ہوسکتا تھا، لہٰذا اسلام نے نہایت ہی حکمت اور تدبیر کے ساتھ ان جانور نما انسانوں کی اصلاح کی اور جو عادتیں ان کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھیں۔ ان سے نجات دلانے کے لئے بتدریج احکام دیئے۔

شراب اہلِ عرب کی ایسی عادت تھی جس کا چھوڑ دینا ان کے تصور میں نہ تھا، اس عادت میں ملوث ہونے کے لئے کسی خاص ماحول کی ضرورت پیش نہ آتی تھی بلکہ ہر ماں اپنے بچے کو پانی کی جگہ شراب پلاتی تھی اور اس طرح ہر شخص غیر شعوری طور پر شرابی بن جاتا تھا، نتیجتاً اس میں نہ حیا ہوتی تھی نہ شرم، نہ بڑے اور چھوٹے میں کوئی امتیاز ہوتا تھا، نہ کسی سے کسی کی دولت وعزت محفوظ ہوتی تھی، نہ ہمدردی ومحبت کا کوئی تصور ہوتا تھا کہ یہ سب شراب نوشی کے اثرات ہیں، یہ صورت حال کسی طرح بھی اسلام کے عطا کردہ مہذب معاشرے کے لئے قابل برداشت نہ تھی لیکن اس سے چھٹکارا بھی اتنا آسان نہ تھا، اسی لئے باوجود ناپسندیدگی کے اسلام نے اُسے ایک عرصہ دراز تک اپنے معاشرے میں برداشت کیا، بالآخر چار ہجری میں واضح اور قطعی اعلان کیا گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کو حرام قرار دیدیا گیا، اعلانِ حرمت سے قبل اگرچہ بعض صحابہ کرام اس سے اجتناب کرتے تھے لیکن دوسرے جو اس کے عادی تھے انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، تاہم وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارے پاکیزہ معاشرے کے لئے شراب نوشی بالکل موزوں نہیں، پس ایک دن حضرت عمر اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ ''یارسول اللہ! ہمیں شراب کے متعلق حکم شرعی بتایا جائے'' ''فَاِنَّهَا مُذْهِبَةٌ لِّلْعَقْلِ وَسُبْلَةٌ لِّلْمَالِ'' یہ عقل زائل کرنے والی اور مال ضائع کرنے والی ہے، پس وحی الٰہی نازل ہوئی اور جواب دیا گیا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (البقرہ:۲۱۹)

وہ آپ سے پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کی بابت، آپ فرمایئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

یہ حرمتِ شراب کے تدریجی عمل کا آغاز تھا، اس وحی کا اثر اکثر صحابہ پر ہوا، بعض نے شراب بالکل چھوڑ دی اور بعض نے کم کردی، چند دن بعد یہ واقعہ رونما ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے احباب کی دعوت کی اور حسب عادت کھانے کے بعد شراب پیش کی، خوب دور چلا، ابھی سب نشہ میں مست ہی تھے کہ نماز مغرب کا وقت آگیا، جماعت ہوئی، امام صاحب نے (جو ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے) سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ الکافرون کی تلاوت کی لَآ اَعْبُدُ

مَاتَعْبُدُوْنَ کی جگہ اَعْبُدُ مَاتَعْبُدُوْنَ پڑھ گئے، نماز کے بعد سب نے اپنی حالت پر افسوس کیا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ بھی بہت افسردہ ہوئے، پس وحی الٰہی نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(النساء:۴۳)

اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جبکہ تم نشہ کی حالت میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو تم کہتے ہو۔

یہ دوسرا حکم تھا جس کے بعد شراب کی محفلیں بہت کم جما کرتی تھیں، کیونکہ پانچ وقت کی نمازوں کی پابندی کے سبب موقع ہی کم ملتا تھا، تاہم شراب کے بازار ابھی ختم نہ ہوئے تھے، رات کی محفلوں کا سلسلہ جاری تھا جو ایسے وقت ختم کر دی جاتی تھیں کہ نشہ ختم ہو جائے اور نماز فجر ادا کی جا سکے، وہ صحابہ جن کے رگ و پے میں اسلام سرایت کر چکا تھا اور جو اسلام کے مزاج اور اس کی روح سے خوب واقف ہو گئے تھے، انہیں یقین تھا کہ اسلام میں شراب کی اجازت باقی نہیں رہے گی لیکن کب واضح حکم نازل ہوگا، اس کے انتظار میں وہ مضطرب تھے، بے چین تھے، بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی آہ و زاری کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں دعا کیا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا بَيَانًا شَافِعًا" اے اللہ شراب کے متعلق ہمیں واضح حکم عنایت فرما۔ اسی دوران شراب کی بعض محافل میں شدید جھگڑے ہوئے، مار پیٹ ہوئی، مسلمان بھائیوں نے ایک دوسرے کو [illegible] اور پھر ہوش آنے پر نادم و شرمندہ ہوئے، معافیاں مانگیں، وہ سب کچھ ہوتا رہا جو اسلامی معاشرے کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔

بالآخر جب وہ وقت آ گیا کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت و محبت کا جذبہ سرایت کر چکا، ان کا ایمان اتنا پختہ ہو گیا کہ وہ اپنی ہر خواہش کو ایمان کے تابع کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ گویا علم الٰہی کے مطابق اب وقت آ چکا تھا ان کی جبلت کے برعکس کسی حکم دینے کا، پس اللہ رب العزت جل مجدہ نے واضح حکم نازل فرمایا کہ:

اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور جوئے کے تیر سب نہایت ہی ناپاک، گھناؤنے [illegible] شیطانی [illegible] زیب نہیں دیتے۔ تمہاری دنیوی، اخروی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ تم ان سے بچو، ان [illegible] ذریعہ تمہارے معاشرے میں انتشار و فتنہ [illegible] پیدا کرتا ہے [illegible] عمارت قائم ہے تم سے سب [illegible] محروم رہو، پس تم ان بدعملیوں سے باز رہو۔

یہ واضح حکم نازل ہوا [illegible] کی گلی کوچوں میں پھر کر لوگوں کو جمع کر کے اللہ کا یہ حکم سنا دو [illegible] وقت کا انتظار تھا جونہی منادی کی آواز سنی لوگوں کا اس کے گرد ہجوم ہو گیا، حکم الٰہی سن کر ایک عجیب مستی طاری ہوئی، ہر شخص منادی بن گیا۔ دروازے کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر گھر گھر خبر پہنچانے لگے اور چند لمحہ بعد ہی مدینہ کی گلیوں میں شراب بہہ رہی، مٹکے توڑ دیئے گئے، ہاتھوں میں موجود جام پھینک دیئے، منہ سے شراب کا وہ قطرہ تک تھوک دیا گیا جو ابھی حلق سے نیچے نہیں گیا تھا، کلیاں کیں، غسل کئے، کپڑے بدلے، اب شراب کی مستی نہیں، ایمان کی مستی میں سب جھوم رہے تھے، گلی کوچوں میں نعرے تھے، سب ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے

تھے، چہرے مسرت وشادمانی سے چمک اٹھے تھے، دل شکرِ الٰہی میں جھکے جا رہے تھے، خوشی سے آنکھیں پُرنم تھیں، سر بسجود تھے، ایک عجب سماں تھا جو اہل ایمان کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کی کیفیت ظاہر کر رہا تھا۔ اطاعت شعاری کے اس مظاہرہ کی نظیر آج تک دنیا کی کسی قوم میں نہ پائی گئی اور نہ ہی پائی جا سکتی ہے، یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے اپنے ماننے والوں میں خوف خدا اور عشق رسول ﷺ کا وہ جذبہ پیدا کیا جس سے وہ اپنی خواہشات، عادات، اولاد، جان، مال غرضیکہ ہر چیز قربان کر دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور جب یہ جذبہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر مسلمان کی تہذیب اپنی تہذیب نہیں رہتی، وہ پھر بدکاریوں اور برائیوں کو اپنانے لگتا ہے اور اس فلاح و بہبود اور عزت و وقار سے محروم ہو جاتا ہے جس کا قرآن نے اس سے وعدہ کیا ہے۔

غور فرمایئے ایک دن وہ تھا کہ اہلِ مدینہ اپنے گھروں، اپنے بازاروں سے شراب کی لعنت کا خاتمہ کر رہے تھے اس کی حرمت پر خوشیاں منا رہے تھے لیکن ایک دور آج ہے کہ مسلمان ملکوں میں پھر شراب کا کاروبار ہو رہا ہے، دکانیں شراب کی خوبصورت بوتلوں سے سجی ہوئی ہیں، گھروں میں شراب کے جام چھلک رہے ہیں، کلب آباد ہیں، نشے میں مست، گلی کوچوں میں لوگ جھومتے پھر رہے ہیں، نتیجۃً ذلیل ہو رہے ہیں، خوار ہو رہے ہیں، اللہ رحم فرمائے اور اپنے عذاب سے محفوظ رکھے۔

وجوہِ حرمت

شراب وجوئے کی حرمت وممانعت کے اسباب بیان کرتے ہوئے بتایا جا رہا ہے کہ اس کا دنیوی نقصان تو یہ ہے کہ اس سے آپس میں عداوت ودشمنی اور بغض وکینہ پیدا ہوتا ہے جو روحِ اسلام ہی کے خلاف نہیں بلکہ انسانیت کے تقاضوں کے خلاف بھی ہے کہ انسانوں کی باہمی محبت وہمدردی ہی ان کے لئے ایک پُرسکون معاشرے کو جنم دیتی ہے، اسلامی احکام میں اس مقصد کے حصول کا بے حد خیال رکھا گیا ہے، اسلام تو انسان کو ایک دوسرے سے قریب تر رہنے، ایک دوسرے کے لئے ایثار و قربانی کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ شراب وجوا اس تعلیم کی نفی کرتا ہے، یہ اعمال انسان کو خود غرض بناتے اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے قتل وغارت، لوٹ مار پر آمادہ کرتے ہیں، ذرا ان ممالک کا حال دیکھئے جن میں شراب خانے اور جوئے خانے عام ہیں، کلبوں میں لوگ شراب پیتے، جوئے میں دولت ہارتے اور پھر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ مار پیٹ ہوتی ہے قتل تک نوبت آ جاتی ہے، شراب کے نشہ میں مست ہو جانے والوں کو اپنی حرکتوں کا احساس تک نہیں ہوتا، وہ کس کے ساتھ کیا کر رہا ہے، اس کو پتہ تک نہیں ہوتا، شرابی جب مارتا، پیٹتا، دندناتا، لڑکھڑاتا اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے تو بیوی بچے اس سے خوفزدہ ہوتے ہیں، وہ انہیں مارتا ہے، پیٹتا ہے، اس کی جوان بیٹیوں کی عزت تک اس سے محفوظ نہیں ہوتی، اس کی چیخ وپکار اہل محلہ تک کا سکون برباد کر دیتی ہے، یہی حال جواری کا ہے اگر وہ جیت جاتا ہے تو ہارنے والے سے خوفزدہ ہوتا ہے اور ہارتا ہے تو ناقابلِ برداشت نقصان، اسے غیظ وغضب میں مبتلا کر دیتا ہے، ہار ہو یا جیت دونوں صورتوں میں جھگڑے ہوتے ہیں، جواری دن رات جو دولت کماتا ہے، وہ منٹوں میں کھو بیٹھتا ہے، اپنے گھر کا ساز وسامان حتیٰ کہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کی عزت تک جوئے کی نذر کر دیتا ہے، ایسے تباہ کن اور گھناؤنے اعمال کی اجازت، اسلام کے پاکیزہ معاشرے میں کیسے دی جا سکتی ہے۔

اس کا دینی نقصان یہ ہے کہ ان اعمال میں مبتلا بدنصیب، اللہ کی یاد بالخصوص نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اللہ کا ذکر ہی

تو ہے جو مضطرب دلوں کو اطمینان وسکون بخشتا ہے، اور نماز ہی تو ہے جو مؤمن کو فحشاء ومنکر سے روکتی ہے، جو ان دونوں عبادتوں سے غافل ہو گیا، وہ نہ تو سکون وطمانیت کی زندگی پا سکتا ہے اور نہ ہی بدکاریوں اور برائیوں کی دلدل میں پھنسنے سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شرابی کا قلب اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ وہ دین کی بات تک سننا گوارا نہیں کرتا۔

اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کرو اور ناپاکی کے شیطانی کاموں سے اپنے آپ کو بچاؤ، تاکہ ذلت وخواری اور اللہ کے عذاب سے محفوظ رہ سکو، اگر تم نے ہمارے اس واضح حکم کو جو بوسیلہ رسول ﷺ تمہیں دیا گیا ہے تسلیم نہ کیا تو اس سے ہمارے رسول ﷺ کے منصب ومقام میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی کہ رسول ﷺ کی ذمہ داری تو ہمارے احکام کو تم تک پہنچا دینا ہی ہے جو کہ وہ پورا فرما رہے ہیں۔

رہی تمہاری یہ تشویش کہ تمہارے جو ساتھی اہلِ ایمان، اس حکم کے نزول سے قبل شراب میں مبتلا رہے اور اب وہ دنیا میں نہیں تو تم ان کے متعلق نہ تو پریشان ہو اور نہ ہی ان سے برتری کی غلط فہمی میں مبتلا ہو، ہمارے وہ بندے مؤمن تھے، انہوں نے ان تمام احکام کی تعمیل کی جو ان کی زندگی میں نازل ہو چکے تھے، وہ متقی تھے، انہوں نے عبادات کی پابندی بھی کی اور ان میں سے کچھ نے شہادت کا اعلیٰ مقام بھی پایا، جو حکم ان کی زندگی میں نہیں دیا گیا تھا وہ اس کے مکلف نہ تھے، لہٰذا وہ گناہ گار بھی نہیں، ان سے ان احکام کے متعلق کوئی سوال بھی نہ ہوگا، انہوں نے خوب نیکیاں کی ہیں اور اللہ نیکیاں کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، پس وہ اللہ کے محبوب وپسندیدہ بندے ہیں اب تم ان احکام کی پابندی کرو جو تکمیل دین تک تمہیں دیئے گئے تاکہ تم بھی محسنین میں شامل ہو کر اللہ کے محبوب بن سکو۔

احادیث اور شراب

قرآن کریم شراب کو رِجس اور اس کے پینے کو شیطانی عمل قرار دیتا ہے جس کی وضاحت کے لئے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

بروایت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلٰوةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحاً فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاِنْ عَادَلَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلٰوةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحاً فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاِنْ عَادَلَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلٰوةً اَرْبَعِيْنَ صَبَاحاً فَاِنْ عَادَ فِي الرَّابِعَةِ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلٰوةً اَرْبَعِيْنَ صَباحاً فَاِنْ تَابَ لَمْ يَتُبِ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَقَاهُ مِنْ نَّهرِ الْخِبالِ

جس نے شراب پی تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس روز کی نمازیں قبول نہ فرمائے گا پھر اگر توبہ کر لی تو اس کی توبہ قبول فرما لے گا، پھر اگر شراب پی تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہ فرمائے گا پھر اگر توبہ کر لی تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا پھر اگر اس نے شراب پی لی، تو اللہ اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہ فرمائے گا پھر اگر اس نے چوتھی مرتبہ شراب پی تو اللہ اس کی چالیس روز کی نمازیں قبول نہ فرمائے گا اور اگر توبہ کر لی تو توبہ بھی قبول نہ فرمائے گا اور اسے نہر خبال کا پانی پلائے گا۔ (ترمذی شریف)

اللہ بے حد بخشنے والا، توبہ قبول فرمانے والا ہے، بندہ گناہ کرتا رہتا اور بخشتا رہتا ہے لیکن بعض گناہ ایسے ہیں کہ جن کے بار بار کرنے سے دل اتنا سخت ہوجاتا ہے کہ اب بندہ زبان سے تو توبہ کرتا ہے لیکن اس کا دل گناہ پر نادم و شرمندہ نہیں ہوتا اور جس کا دل گناہ پر نادم و شرمندہ نہ ہو، اللہ اس کی توبہ قبول نہیں فرماتا، شراب نوشی کا گھناؤنا عمل تین مرتبہ قابل معافی ہے کہ ابھی شرابی کا دل گناہ پر نادم و شرمندہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جب وہ رو کر اللہ کے دربار میں توبہ کرتا ہے تو اس کا دل اس کا ساتھ دیتا ہے، نادم ہوتا ہے، شرمندہ ہوتا ہے، پس اللہ اس کی توبہ کو قبول فرمالیتا ہے لیکن جب چوتھی مرتبہ وہ اس بدعملی میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا قلب اس قدر سخت ہوجاتا ہے کہ شرابی احساسِ گناہ کے بعد روتا ہے، توبہ کرتا ہے لیکن دل اس کا ساتھ نہیں دیتا، پس دلوں کا حال جاننے والا اللہ اس کی توبہ کو قبول نہیں فرماتا اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ شخص اتنا بدنصیب ہوجاتا ہے کہ قیامت کے دن جب اسے پیاس لگے گی تو اسے ''نہر خبال'' سے پانی پلایا جائے گا یہ دوزخیوں کے لئے خون اور پیپ کی نہر ہوگی یعنی جو دنیا میں رجس پیتا رہا، قیامت میں بھی اسے وہ رجس ہی پلایا جائے گا، الامان والحفیظ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بروایت حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیان کیا کہ انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا:

يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنِّي اشْتَرَيْتُ خَمْرًا لِاَيْتَامٍ فِيْ حَجْرِيْ قَالَ اَهْرِقِ الْخَمْرَ وَاكْسِرِ الدِّنَانَ

اے اللہ کے نبی ﷺ! میں نے یتیم بچوں کے لئے جو میرے زیرِ پرورش ہیں شراب خریدی، فرمایا شراب کو بہادو اور مٹکوں کو توڑ دو۔ (ترمذی)

شریعت مطہرہ نے شراب پینے ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ قرآن کریم نے اسے ''رِجس'' قرار دے کر اس کی بیع و شراء، اس کے نقل و حمل، اس کے کارخانوں کی ملازمت غرضیکہ کسی بھی طرح اس سے ہر تعلق کو حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ دیگر احادیث میں واضح ہے۔ اس حدیث پر بھی غور فرمائیے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے یتیم بچوں کی ملکیت اس شراب کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا تھا جو انہوں نے اعلانِ حرمت سے قبل تجارت کے لئے خریدی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کو بھی بہانے کا حکم دیا، حتیٰ کہ اس کے برتن بھی توڑ دینے کا حکم دے دیا گیا۔

شراب کے برتنوں کو توڑنے کا حکم صرف اس وقت سے متعلق ہے جب شراب حرام ہوئی تھی، جس کا مقصد لوگوں میں مزید نفرت پیدا کرنا تھا، یہ برتن دیگر برتنوں کی طرح دھو کر استعمال کر لینا اب جائز ہے لیکن شراب کے خوبصورت برتنوں کو الماریوں میں سجانا جائز نہیں۔

ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ شراب کا تحفۃً کسی کو دینا، یا لینا بھی جائز نہیں، دیکھئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یتیم بچوں کی شراب بہادینے کا حکم دیا، کسی غیر مسلم کو تحفۃً دینے کی اجازت نہ دی، غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے لئے یہ مسئلہ نہایت قابلِ غور ہے کہ انہیں غیر مسلموں کے تہواروں، شادیوں وغیرہ پر تحفے دینا پڑتے ہیں اور ان مواقع پر لینا بھی پڑتے ہیں، اگر تحفہ دینا پڑے تو شراب کی بجائے کوئی دوسری چیز دے دی جائے اور اگر کوئی غیر مسلم تحفہ کے طور پر شراب دے تو یہ بتاتے ہوئے انکار کر دیا جائے کہ میرے مذہب میں یہ تحفہ قبول کرنا حرام ہے اگر نہ جانتے ہوئے تحفہ میں شراب کی

ہو تل آجائے تو وہ بھی کسی غیر مسلم کو دینا جائز نہیں اسے بہا دیا جائے۔

حضرت دیلم حمیری بیان کرتے ہیں کہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

اِنَّا بِاَرْضٍ بَارِدَةٍ وَنُعَالِجُ فِيْهَا عَمَلاً شَدِيْداً وَاِنَّا نَتَّخِذُ شَرَاباً مِّنْ هٰذَا الْقَمْحِ نَتَقَوّٰى بِهٖ عَلٰى اَعْمَالِنَا وَعَلٰى بَرْدِ بِلَادِنَا قَالَ هَلْ يُسْكِرُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاجْتَنِبُوْهُ قُلْتُ اِنَّ النَّاسَ غَيْرُ تَارِكِيْهِ قَالَ اِنْ لَّمْ يَتْرُكُوْهُ فَاقْتُلُوْهُمْ

ہم ایک ٹھنڈے مقام پر رہتے ہیں اور وہاں سخت کام کرتے ہیں اور ہم گیہوں سے شراب بناتے ہیں، جس سے اپنے کاموں اور اپنے ملک کی ٹھنڈک کے لئے قوت حاصل کرتے ہیں فرمایا، کیا وہ نشہ آور ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا اس سے بچو (وہ حرام ہے) میں نے عرض کیا لوگ اسے نہیں چھوڑیں گے فرمایا اگر وہ نہ چھوڑیں تو ان سے قتال کرو۔ (ابوداؤد)

حدیث مبارک قابل غور ہے کہ خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو سرد ممالک میں آباد ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس قدر سردی میں بغیر شراب کے زندہ رہنا ناممکن ہے۔ لہٰذا بطور دوا، یہاں شراب کا استعمال جائز ہے، استغفر اللہ العظیم۔ اگر واقعی کسی نے کسی بھی وجہ سے شراب کا استعمال جائز سمجھا اس کا ایمان گیا کیونکہ جس چیز کی بھی حرمت نص قطعی سے ثابت ہو اس کا جائز سمجھنا کفر ہے۔

صاحب شریعت ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ شراب چاہے بطور دوا استعمال کی جائے، سردی سے بچنے یا کسی دوسرے مرض کو دفع کرنے کے لئے یا حصول طاقت کے لئے بہرحال حرام ہے اور جو لوگ اس کی حرمت جان لینے کے باوجود بھی اس کو ترک نہ کریں ان سے قتال کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرلیں یا انہیں قتل کردیا جائے گا کیونکہ وہ مرتد ہو گئے۔

واضح رہے کہ شرابی کی سزا حرمت شراب کے دور میں اگرچہ متعین نہ تھی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے مجرم کو ذلیل وخوار کرنے کے لئے جوتے اور کوڑے مارنے کا حکم صادر فرمایا، خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک شرابی پیش کیا گیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین سے اس کی سزا کے متعلق مشورہ طلب کیا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت علی رضی اللہ عنہما نے اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا تجویز کی جس کو تمام صحابہ نے بالاتفاق منظور کیا، پس اجماع صحابہ کے مطابق شریعت مطہرہ نے شرابی کی سزا اسی (۸۰) کوڑے مقرر فرمادی۔

شراب چاہے، زیادہ پی جائے یا کم، سزا پوری ہی دی جائے گی، جیسا کہ قرآن کریم کے ارشاد "فَاجْتَنِبُوْهُ" سے ثابت ہے کہ اس سے بچو، چاہے کم ہو یا زیادہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی اسی کی وضاحت ہوتی ہے۔

غرضیکہ شراب حرام قطعی ہے، جس سے بچنا حکم الٰہی ہے اور اللہ کے احکام کی تعمیل ہی مؤمن کے لئے عزت وعظمت کا ذریعہ ہے۔ اسی سے اہل ایمان کو سکون واطمینان کی زندگی نصیب ہوتی ہے، اللہ ہمیں عمل کی توفیق دے، آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۴۰

المائدہ: ۹۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(المائدہ: ۹۴)

اے ایمان والو! ضرور آزمائے گا تمہیں اللہ کسی چیز کے ساتھ شکار سے پہنچ سکتے ہیں جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے تاکہ پہچان کرادے اللہ اس کی جو ڈرتا ہے اس سے بن دیکھے، پس جو شخص حد سے بڑھے گا اس کے بعد تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

مؤمن کا امتحان

کلمہ پڑھنے والا درحقیقت اللہ سے اپنی جان و مال کا سودا کر لیتا ہے کہ اب اس نے اپنا سب کچھ اللہ کو سونپ دیا اور اللہ اس سے وعدہ فرماتا ہے کہ بطور قیمت وہ اسے جنت عطا فرمائے گا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ:۱۱۱)

یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کیلئے جنت ہے۔

جو رب خالق بھی ہے اور مالکِ حقیقی بھی ہے وہی اپنے فضل وکرم سے اپنی ہی عطا کردہ جان ومال ہم سے خرید رہا ہے لیکن قیمت یعنی جنت عطا فرمانے سے پہلے وہ ہماری آزمائش فرماتا ہے کہ ہم اس قیمت کے واقعی اہل بھی ہیں یا نہیں کہ ہر خریدار قیمت ادا کرنے سے قبل مال کی جانچ پڑتال کا حق رکھتا ہے، نیز کسی بھی منزل کو حاصل کرنے سے قبل امتحان کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اس امتحان میں جو جس معیار کی کامیابی حاصل کرتا ہے، اسے اسی معیار کی منزل ملتی ہے، اللہ رب العزت مؤمنین کا امتحان لیتا ہے اور جو امتحان میں کامیاب ہوتا ہے اس کے لئے جنت کے درجات کا تعین کیا جاتا رہتا ہے، یہ امتحان کسی کو صالحیت کے مقام پر پہنچاتا ہے! تو اسے حیاتِ طیبہ سے نوازا جاتا ہے، تو کوئی اس امتحان کے ذریعہ مقامِ ولایت پاتا ہے تو اسے دنیا وآخرت کے خوف سے آزادی ملتی ہے، تو کوئی اپنی جان کی قربانی پیش کرکے اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے تو اسے شہادت کا بلند مرتبہ نصیب ہوتا ہے، ہر مؤمن کو کسی نہ کسی طرح امتحان کے مرحلہ سے گزرنا ہوتا ہے، قرآن کریم بتاتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (البقرہ:۱۵۵)

اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے مالوں میں اور جانوں اور پھلوں میں۔

جو خوش نصیب ان امتحانات میں کامیاب وکامران ہوتے ہیں وہی صابر کہلاتے ہیں، اللہ کا فضل وکرم ان کے شامل حال رہتا ہے، وہ ہر امتحان کے موقع پر اعتراف کرتے ہیں کہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ" بیشک ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ان ہی لوگوں کے لئے مژدہ ہے کہ ان کا رب انہیں طرح طرح سے نوازتا ہے، ان پر رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، منزل مراد انہی کے ہاتھ آتی ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ (کہف:۷)

بیشک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت، تا ہم انہیں آزمائیں گے کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔

حسین وجمیل خالق نے اس کائنات کو اپنے حُسن وجمال کا مظہر بنایا، اس دنیا کی ہر چیز حسین بھی ہے اور مفید بھی، کوئی چیز بیکار نہیں "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" اے ہمارے رب تو نے یہ سب بیکار پیدا نہیں فرمایا انسان، جانور، شجر، حجر، آگ، پانی، ہوا، تاریکی، روشنی، دن، رات، غرضیکہ ان تمام چیزوں سے ہی زمین کی زینت ہے، اگر پھول زینت ہیں تو کانٹے بھی زینت ہیں اگر جاندار زینت ہیں تو بے جان بھی زینت ہیں لیکن یہ سب "مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" آخرت کی کھیتی ہے،

اشرف المخلوقات انسان کے لئے ذریعہ ابتلاء وآزمائش ہے، رب دیکھتا ہے کہ کون اس دنیا کی زینت میں گم ہوکر اسے بھول جاتا ہے اور کون ہے جو ان حسین مناظر اور اَشیاء کو دیکھ کر سبحان اللہ، ماشاء اللہ کہتا اور رب کو یاد کرتا ہے، کامیاب وہی ہے جس نے ان دل لبھانے والی، نظروں کو خیرہ کرنے والی چیزوں کو رب کی مرضی کے مطابق استعمال کیا، جن چیزوں کے قریب جانے سے روک دیا گیا، ان کی کشش متأثر نہ کرسکی، جن چیزوں کے استعمال کی اجازت دی گئی، ان پر قناعت کی۔ یہی لوگ ہیں جو ''اَحْسَنُ عَمَلًا'' کے مصداق ہیں، جو امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں، جو اللہ کی رضا اور قرب کا بلند مرتبہ پاتے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًاؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُۙ ۝

(الملک: ۲)

جس نے پیدا کیا ہے، موت اور زندگی کو تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے اور وہی دائمی عزت والا، بہت بخشنے والا ہے۔

یہ موت وزندگی بھی امتحان ہے کہ جس نے موت کے خیال سے زندگی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے سانچہ میں ڈھال لیا وہ کامیاب وکامران ہوگیا اور جو زندگی کی رعنائیوں میں مست رہا، موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی اس نے کبھی مالک حقیقی کے دربار میں حاضری کا خوف نہ کیا، وہ ناکام ونامراد رہا۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْؕ

(انعام: ۱۶۶)

اور (اللہ) وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں (اپنا) خلیفہ بنایا اور بلند کیا تم میں بعض کو بعض پر درجوں میں تاکہ آزمائے تمہیں اس چیز میں جو اس نے تمہیں عطا کی۔

فرقِ مراتب اور فرقِ عطایا بھی آزمائش وامتحان کا ذریعہ ہے، یہ فرقِ مراتب چاہے دنیوی اعتبار سے ہو، یا اخروی اعتبار سے، بہرحال مالک نے باوجود قدرت کے سب کو ایک جیسا پیدا نہیں کیا، کوئی مالک ہے تو کوئی ملازم، کوئی امیر ہے تو کوئی غریب، کوئی عالم ہے تو کوئی جاہل، انسانوں کی اس تفریق میں یہی حکمت ہے کہ کون ہے جو اپنے بلند مراتب کے باوجود عجز و انکساری اختیار کرتا ہے اور کون ہے اپنی کم مائیگی پر صابر اور شاکر ہے کہ جس نے غرور وتکبر کیا، جو ناشکری و بےصبری کا شکار ہو گیا وہ ناکام ونامراد قرار پائے گا۔

غرضیکہ ابتلاء وآزمائش سنتِ الٰہیہ ہے۔ جنہوں نے خود کو بیچ دیا ہے ان کو آزمایا جاتا ہے تاکہ قیامت کے دن انہیں ان کی قیمت دی جائے، انہیں امتحان میں کامیابی کے مطابق انعامات سے نوازا جائے، دنیا وآخرت میں ان کے مراتب بلند کئے جائیں۔

آیت زیرِ گفتگو میں بھی ایک امتحان کا ذکر ہے، جو یہ ہے کہ:

اے ایمان والو! ہم تمہیں اس طرح بھی آزمائیں گے کہ جن جانوروں کا شکار تمہارے لئے جائز قرار دیا گیا، مخصوص حالت

اور مخصوص وقت میں وہ تمہارے لئے حرام ہوگا، جبکہ وہ جانور تمہارے آس پاس گھومتے ہوں گے تم ان کو مارنے کے لئے مضطرب ہوگے لیکن حکم الٰہی کی تعمیل میں ایسا نہ کرسکو گے اور کر بیٹھے تو تمہارا شمار معتدین، حکم الٰہی سے تجاوز کرنے والوں میں ہوگا، جس کی سزا صرف دردناک عذاب ہے۔

یہ کونسی حالت ہوگی اور کونسا وقت ہوگا، اس کا ذکر اگلی آیات میں کیا جارہا ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



مقالہ ۴۱

المائدہ: ۹۵ تا ۱۰۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ
كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا
سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ
الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ
الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا
فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا
تَكْتُمُوْنَ ۝ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (المائدہ:۹۵۔۱۰۰)

اے ایمان والو! نہ مارو شکار کو جب کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو اور جو قتل کرے شکار کو تم میں سے جان بوجھ کر تو اسکی جزاء یہ ہے کہ اسی قسم کا جانور دے، جو اس نے قتل کیا ہے فیصلہ کریں اس کا دو معتبر آدمی تم میں سے درآنحالیکہ یہ قربانی کعبہ میں پہنچنے والی ہو یا کفارہ ادا کرے وہ یہ کہ چند مسکینوں کو کھانا دے یا اس کے برابر روزے رکھے تا کہ چکھے سزا اپنے کام کی معاف فرما دیا اللہ تعالیٰ نے جو گزر چکا اور جو (اب) پھر گیا تو انتقام لے گا اللہ اُس سے اور اللہ غالب ہے بدلہ لینے والا، حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے دریائی شکار اور اس کا کھانا فائدہ اٹھاؤ تم اور دوسرے قافلہ (والے)، اور حرام کیا گیا ہے تم پر خشکی کا شکار جب تک تم احرام باندھے ہوئے ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم اکٹھے کئے جاؤ گے، بنایا ہے اللہ نے کعبہ کو جو عزت والا گھر ہے بقاء کا باعث لوگوں کے لئے نیز حرمت والے مہینوں کو اور حرم کی قربانی اور گلے میں پٹے پڑے ہوئے جانوروں کو تا کہ تم خوب جان لو کہ یقیناً اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے، اور خوب جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا اور اللہ تعالیٰ غفور ورحیم (بھی) ہے، نہیں (ہمارے) رسول ﷺ پر کوئی ذمہ داری سوائے پیغام پہنچانے کے اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو چھپا رہے ہو، آپ ﷺ فرما دیجئے نہیں برابر ہوسکتا، ناپاک اور پاک اگرچہ حیرت میں ڈال دے تجھے ناپاک کی کثرت پس ڈرتے رہو اللہ سے اے عقل والو! تا کہ تم نجات پا جاؤ۔

گزشتہ آیت میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے جس ابتلاء کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ:

اے ایمان والو! بحالت احرام تمہارے لئے شکار کرنا ممنوع ہے، شکار کے جانور تمہارے گرد منڈلا رہے ہوں، تمہیں ان کے گوشت و پوست کی ضرورت ہو، یا تم شکار کی عادت پوری کرنے کے لئے مضطرب ہو لیکن ایسا نہ کرنا کہ اب تم اللہ کے دربار میں حاضری کا ارادہ کر چکے ہو، احرام کی نیت کر چکے ہو، اب تمہارے لئے جو چیزیں حلال تھیں ان میں سے بہت سی حرام کر دی گئی ہیں، انہی میں سے یہ بھی ہے کہ پہلے تم جن جانوروں کا شکار کر سکتے تھے، اب نہیں کر سکتے۔ چاہے تم حرم میں داخل ہو چکے ہو یا نہ ہوئے ہو۔

حالتِ احرام

حالتِ احرام بھی مؤمن کے لئے بڑی عجیب حالت ہے۔ اس کی کیفیت کا اندازہ سوائے محرم کے اور کوئی نہیں کر سکتا، حج وعمرہ کا ارادہ کرنے والا، جب لبیک کی صدا بلند کرتا ہے تو وہ محرم ہو جاتا ہے اور اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب اس کا اس دنیا اور دنیا کی چیزوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، نہ اہل وعیال سے کوئی تعلق، نہ اعزاء و احباب سے کوئی تعلق، نہ تجارت و کاروبار سے کوئی واسطہ، اللہ کے گھر کا یہ مسافر، صرف اللہ کے در کا بھکاری بن جاتا ہے اور

اپنے عمل سے ظاہر کرتا ہے کہ میں جس کا ہو چکا ہوں، اس کے بلاوے پر، اس کے گھر جا رہا ہوں، اگر زندہ رہا تو پھر سارے تعلقات اور رابطے بحال ہوں گے ورنہ یہ دنیا جن کی ہے ان کو مبارک ہو، ہم جس کے ہیں، اس کی طرف چلے۔

حالتِ اِحرام، درحقیقت اِبتلاء وآزمائش کے میدان میں قدم رکھنے کا نام ہے کہ ربِ حقیقی دیکھنا چاہتا ہے کہ جسے ہمارا ہونے کا دعویٰ ہے اس کے لئے عام حالت میں جو چیزیں ممنوع تھیں ان سے تو وہ باز رہا، اب ہم اس پر کچھ مزید چیزیں ممنوع فرمارہے ہیں، کیا وہ ان سے بھی باز رہتا ہے اور ہماری مرضی کے مطابق زندگی کے چند شب وروز بسر کر پاتا ہے یا نہیں۔

حالتِ اِحرام میں، جن حلال چیزوں کو ممنوع وحرام قرار دیا گیا، آپ ان سے اندازہ کیجئے کہ یہ حالت اِبتلاء کی حالت کے سوا اور کیا ہے، مردوں کے لئے سلے کپڑے پہننا، ایسے جوتے یا چپل پہننا، جن سے پاؤں کی پشت کی ابھری ہوئی ہڈی چھپ جائے، سر یا چہرے کو سوتے میں یا جاگتے میں قصداً یا سہواً ڈھکنا، خوشبو لگانا یا کوئی خوشبودار بغیر پکی چیز کھانا، مثلاً الائچی، زعفران وغیرہ جسم کے کسی حصے کے بال کاٹنا یا اکھاڑنا، ناخن تراشنا، کسی سے جھگڑا یا ہاتھا پائی کرنا، بیوی سے صحبت کرنا، بوس وکنار یا شہوت کی باتیں کرنا، حرم کی گھاس یا درخت وغیرہ کاٹنا، خشکی کے جانور کا شکار کرنا یا شکار میں کسی کی مدد کرنا، (تفصیلی مسائل کے لئے''بہارِ شریعت'' کا مطالعہ کیجئے) یا اپنے امام صاحب سے معلوم کیجئے۔

حالتِ اِحرام میں کسی نے شکار کرلیا تو جرمانہ ادا کرنا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ جس جانور کا شکار کیا ہے اس کی قیمت کا اندازہ دو دیانت دار، تجربہ کار آدمیوں سے کرایا جائے پھر اس قیمت کا کوئی جانور مثلاً اونٹ، گائے، بکری خرید کر حدودِ حرم میں لائے اور ذبح کر کے غرباء میں تقسیم کردے، یا اس قیمت سے غلہ وغیرہ خرید کر غرباء میں تقسیم کرے اور ہر غریب کو صدقہ فطر کے مساوی دے، یا اندازہ لگائے کہ اس قیمت کا غلہ وغیرہ کتنے غرباء میں تقسیم کیا جا سکتا تھا، اس کے مطابق اتنے ہی دن کے روزے رکھے، مثلاً اگر اس رقم کا غلہ خرید کر، پونے دوسیر کے حساب سے غرباء کو تقسیم کیا جاتا تو دس غریبوں کا حصہ بنتا، پس دس روزے رکھ لے، غلہ کی تقسیم اور روزے رکھنے کے لئے حرم میں ہونا ضروری نہیں۔

موذی جانور مثلاً سانپ، بچھو، کوا، چیل، کاٹنے والا کتا اس حکم میں شامل نہیں، انہیں مارنا جائز ہے، کسی دوسرے کے لئے کئے ہوئے شکار کو ذبح کرنا بھی محرم کے لئے جائز نہیں، اگر کسی غیرمحرم نے حرم سے باہر شکار کیا، تو شکار کا گوشت کھانا محرم کے لئے جائز ہے، روزمرہ کے استعمال کے جانور مثلاً گائے، بکری، مرغی وغیرہ محرم ذبح بھی کرسکتا ہے اور کھا بھی سکتا ہے کہ یہ شکار نہیں محرم کے لئے مچھلی کا شکار بھی جائز ہے۔

قِیَاماً لِلنَّاسِ

محرم پر یہ خصوصی پابندیاں اس لئے عائد کی گئی ہیں کہ وہ اللہ کے دربار کا مسافر اور عازم ہے، جتنے عظیم دربار کا عزم کیا جاتا ہے اتنا ہی اس کے لئے اہتمام کیا جاتا ہے، اللہ کے گھر سے بڑا گھر، عظمت والا گھر اور کون سا ہوسکتا ہے کہ یہ''قِیَاماً لِلنَّاسِ''لوگوں کی بقاء کا ذریعہ ہے عام انسانوں کی بقاء کا ذریعہ ہے کہ جب تک کعبہ کا احترام کرنے والے موجود ہیں، کعبہ کا طواف ہورہا ہے، یہ عالم موجود ہے اور جس دن کعبہ کی حرمت ختم ہوئی طواف ختم ہوا، دنیا ختم کردی جائے گی، حضرت عطاء رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ اگر ایک سال کے لئے کعبہ خالی ہوجائے اس کا طواف نہ ہو تو دنیا کا وجود نہ رہے نیز یہ گھر، اہل

اسلام کے لئے ایسا عظیم مرکز ہے جس کے باعث ان میں نظم وضبط، یگانگت اور اتحاد اس طور پر موجود ہیں کہ کسی دوسری قوم میں اس کی نظیر نہیں، امت مسلمہ اپنے باہمی اختلافات کے باوجود حقیقتاً متحد ہے کہ ان کے دل ایک ہی مرکز کی طرف مائل ہیں، ان کے چہرے اسی مرکز کی طرف پھرے ہوئے ہیں، ان سب کی زندگی کی بڑی آرزو، اسی مرکز کا سفر ہے، یہی مرکز ان کے لباس کی تبدیلی کا سبب بنتا ہے، اسی دربار میں حاضری کے باعث وہ بہت سی حلال چیزوں کی حرمت کی مشقت کوخوشی خوشی برداشت کرتے ہیں، ایک جیسے لباس میں، امیر وغریب، بڑے چھوٹے، کالے گورے کا فرق مٹا کر بلا امتیاز وہ اس گھر کے گرد طواف کر کے عملی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہم اپنے ظاہری اختلاف کے باوجود، صرف اور صرف ایک اللہ کے ہیں، اللہ ہی کے لئے زندہ اور اللہ ہی کے لئے مرتے ہیں اور اسی کے دربار میں ہم سب کو حاضر ہونا ہے، آج اللہ کے لئے جس طرح ہم نے اپنے عیش وآرام اور بعض حلال چیزوں تک کو چھوڑ دیا ہے اسی طرح ہم اللہ کے لئے اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لئے تیار ہیں، اللہ کا یہی گھر ہے جس کی طرف توجہ کر کے اہل ایمان کو قلبی سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے اور یہی گھر ہے جس میں داخل ہونے والا خوش نصیب، دنیا کی الجھنوں سے امان پالیتا ہے ہر قسم کے غم اور خوف سے آزاد ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ دنیا والوں کے بنائے ہوئے قوانین سے بھی آزاد ہوتا ہے ''وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' کا قرآنی ارشاد، ہرغم زدہ، ہر مصیبت زدہ کے لئے پیغام راحت ورحمت بنتا ہے اور اسی گھر کے طفیل اللہ نے سال کے چند مہینوں کو (اشھر حرم) ایسا عظمت واحترام والا بنایا کہ ان میں جنگ وجدال سے بے خوف ہو کر ہر شخص، امن وامان کی لذت محسوس کر سکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے وہ قتل وغارت اور بدامنی کی زندگی سے متنفر ہو سکتا ہے، گویا یہ مہینے درحقیقت امن وامان کی تربیت، اس سے روشناس کرانے، اس کا عادی بنانے کے مہینے ہیں، جن کی حرمت وعظمت کی پابندی کرنے والے، خود بھی پرامن زندگی بسر کرنے کے عادی ہو سکتے ہیں اور ساری دنیا کو امن کا پیغام دے سکتے ہیں، یہی گھر ہے جس کی ہدی (قربانی کے جانور) اور قلائد (قربانی کے جانوروں کے ہار) تک پیغام امن دیتے ہیں کہ جن مسافروں کے ہدی اور قلائد دیکھے جاتے ہیں ان کی طرف کوئی بری نظر نہیں اٹھاتا، وہ بے خوف ہو کر سفر کرتے ہیں، انہیں نہ لٹیروں کا ڈر ہوتا ہے، نہ دشمن کا خوف۔

ہدی اور قلائد کی اہمیت اگرچہ اس زمانہ میں تھی جب لوگ دور دراز سے جنگلوں، پہاڑی علاقوں اور ریگستانوں کو پیدل، یا اونٹوں پر سوار ہو کر عبور کرتے ہوئے، اللہ کے گھر کی طرف سفر کرتے تھے۔ عام طور پر قافلوں کو لوٹ لیا جاتا تھا لیکن ہدی اور قلائد والے اس لوٹ مار سے محفوظ وماموں رہتے تھے، آج کل اگرچہ یہ صورت نہیں تاہم حالت احرام میں دیکھ کر محرم کو جس عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے وہ انہی کے ساتھ خاص ہے، غیر مسلم ممالک سے جو مسلمان حج وعمرہ کے لئے جاتے ہیں، ان کے لئے ہر قسم کی خصوصی رعایت موجود ہیں، ایئرپورٹ وغیرہ پر غیر مسلم بھی انہیں عزت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں، یہ ہے اللہ کا گھر ''قِيَامًا لِّلنَّاسِ''

اللہ رب العزت جل مجدہ نے اپنے گھر اور اس کے متعلقات کو ''قِيَامًا لِّلنَّاسِ'' ''لوگوں کے لئے ذریعہ امن وامان اور قیام وبقاء، اسی لئے بنایا ہے کہ لوگ اس کی قدرت کو جان لیں اور مان لیں کہ حقیقت میں ہر چیز کو جاننے والا اللہ ہی ہے، وہی مقلب القلوب ہے، جس سمت چاہتا ہے وہ لوگوں کے دلوں کو پھیر دیتا ہے، اس کے قوانین کی تاثیر کا مقابلہ، دنیا والوں

کے بنائے ہوئے قوانین سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اے ایمان والو! خوب جان لو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے، ان لوگوں کے لئے جو حکم عدولی کرتے ہیں، جو بغاوت کرتے ہیں جو تکبر و غرور میں مبتلا ہوتے ہیں اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، رحم فرمانے والا ہے، ان لوگوں کے لئے، جو اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں، اس کی اطاعت و فرمانبرداری ہی کو اپنی عظمت کا ذریعہ جانتے ہیں، جو انعامات الٰہیہ سے مالا مال ہونے کے باوجود اس کے رحم و کرم کے امیدوار رہتے ہیں ان کی گردنیں جھکی رہتی ہیں، رب کے دربار میں رونا، گڑگڑانا، ان کا شیوہ ہے پس جو بندے ہمارے ہیں انہیں یہی راہ اختیار کرنا زیب دیتا ہے تاکہ وہ ہمارے سخت عذاب سے محفوظ رہیں اور ہماری مغفرت اور رحم و کرم کے سایہ تلے انہیں پرسکون اور باعزت زندگی نصیب ہو۔ انہی ہدایات کے لئے ہم نے اپنے پیارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے اگر تم نے ان کی ہدایات کو اپنایا اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کی تو تمہارا ہی فائدہ ہوگا اور اگر تم نے روگردانی اختیار کی تو رسول ﷺ کے منصب و مقام میں کوئی فرق نہ پڑے گا کہ ان کی ذمہ داری تو صرف تمہیں ہدایات دینا اور اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اور انہوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کر دیا ہے۔

خبیث وطیب

آیات زیر گفتگو کی آخری آیت پر غور کیجئے، اللہ جل مجدہ بوسیلہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اہل ایمان کو ہدایت فرما رہا ہے، ''خبیث وطیب کو ایک جیسا نہ سمجھو اور نہ ہی خبیث کی تعجب خیز کثرت سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ خبیث، طیب سے بہتر ہے'' تم ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے سبب ''اُولی الالباب'' عقل والے ہو تمہیں ایسی غلط فہمی زیب نہیں دیتی۔ پس خبیث خواہ کتنا ہی حسین اور پرکشش کیوں نہ ہو اس سے بچو اور طیب کو باوجود دشواریوں کے اختیار کرو یہی تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی کا ذریعہ ہے۔

خبیث ہر وہ عقیدہ، عادت اور چیز ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کے لئے حرام و ممنوع قرار دیا جبکہ طیب وہ عقائد، عادات اور اشیاء ہیں جن کو اختیار و استعمال کرنے کا شریعت مطہرہ نے حکم دیا۔ عقیدۂ کفر و شرک خبیث ہے، عقیدہ توحید و رسالت طیب ہے، ظلم و ستم، جبر و استبداد، مکر و فریب، جھوٹ عادات خبیثہ ہیں، عدل و انصاف، صدق و امانت عادات طیبہ ہیں، شراب و جوا، سود، رشوت، حرام جانور خبیث ہیں، رزق حلال، حلال غذائیں طیب ہیں، اللہ جل مجدہ نے اپنے بندوں کے لئے خبائث کو حرام اور طیبات کو حلال کیا نیز اپنے پیارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اختیار دیا کہ وہ جن طیبات کو چاہیں اپنے غلاموں کے لئے حلال کر دیں اور جن خبائث کو چاہیں ان کے لئے حرام کر دیا۔

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷)

اور وہ (نبی امی) حلال کرتا ہے ان کے لئے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں۔

پس جو مرد و عورت خبائث کو اختیار کرتے ہیں وہ خبیث قرار پاتے ہیں اور جو طیبات کی پابندی کرتے ہیں وہ طیب کہلاتے ہیں، اللہ فرماتا ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ

لِلطَّيِّبٰتِ (النور:۲۶)

ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے، اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے ہیں، اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے، اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے ہیں۔

یہ ہے خبائث کی تاثیر کہ اشرف المخلوقات انسان کو خبیث بنا چھوڑا اور یہ ہے طیّبات کا اثر کہ اس سے انسان کے شرف کو مزید چار چاند لگ گئے تو خبیث وطیب ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں ایک دن آنے والا ہے جب اللہ خبیث کو طیب سے علیحدہ کر کے خبیثوں کو ان کے لئے آخری ٹھکانہ جہنم تک پہنچائے گا اور ان کا انجام نقصان وخسارہ ہوگا۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (الانفال:۳۷)

تاکہ الگ کر دے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھ دے سب ناپاکوں کو ایک دوسرے کے اوپر پھر اکٹھا کر دے ان سب کو پھر ڈال دے اس مجموعہ کو جہنم میں، یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔

خباثت، کفر وارتداد میں ملوث خبیثوں کے لئے دائمی ٹھکانہ جہنم ہوگا جب کہ بد عملی وبدکرداری، فسق وفجور کے عادی خُبثاء کو ان کے جرائم کے مطابق سزا بھگتنا ہوگی، تاہم خبیث چاہے کسی نوعیت کا ہو، خسارے اور نقصان ہی میں رہے گا۔

طیب ہر چیز کی قدر وقیمت کو بڑھاتا ہے جبکہ خُبث جس چیز میں بھی پایا جاتا ہے اس کو بے قدر وکم قیمت بنا دیتا ہے، اس حقیقت پر قرآن گواہ ہے، فرمایا گیا:

وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ (الاعراف:۵۸)

اور جو زمین عمدہ زرخیز ہے (کثرت سے) نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے نہیں نکلتی ہے اس سے (پیداوار) مگر قلیل، گھٹیا۔

زرخیز زمین کی قوت نمو کا اندازہ لگائیے کہ وہ اپنے اندر مدفون بیجوں میں سے ایک بیج بھی گلنے سڑنے نہیں دیتی، ایسی ہری بھری فصل اُگاتی ہے کہ کسان کو اس کی محنت کا پورا پورا پھل نصیب ہو جاتا ہے، اس کی ہریالی کو جو دیکھتا ہے اس کا دل خوش ہو جاتا ہے لیکن وہ زمین جس میں سیم وتھور کا خُبث ہوتا ہے اکثر بیجوں کو گلا سڑا دیتی ہے اس کی پیداوار نہایت ہی کم ہوتی ہے اور وہ بھی معیاری نہیں، پس'' کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خبیث وطیب ایک جیسے ہیں۔''

خبیث کی بے وقعتی کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ'' جب حُرمتِ شراب کا اعلان ہوا، صرف شراب نوشی ہی نہیں بلکہ شراب فروشی بھی ممنوع قرار دے دی گئی تو ایک صحابی جو شراب کے بڑے تاجر تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے، یارسول اللہ ﷺ، میرے پاس کچھ دولت ہے جو شراب کی تجارت سے میں نے حاصل کی تھی، اگر میں اسے کسی نیک کام میں خرچ کردوں تو کیا مجھے ثواب ملے گا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اگر تم اس سے حج

کرو یا اس کو جہاد پر خرچ کرو تو اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی قیمت نہ ہوگی کہ اللہ پاک ہے اور حلال کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں فرماتا'' ملاحظہ فرمایا آپ نے خبث کی کیا قدر و قیمت ہے، غور کریں وہ لوگ جو رشوت اور سود کی دولت سے حج کرتے ہیں، مساجد بناتے، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، صدقہ و خیرات اور قربانی کرتے ہیں اور اجر عظیم کے امیدوار ہوتے ہیں، ان لوگوں کو بھی سوچنا چاہئے جو رشوت خوروں، سود خوروں سے دینی اور مذہبی کاموں کے لئے چندہ مانگتے ہیں اور ان کا خبیث مال لے کر اٹھتے بیٹھتے جزاک اللہ کی رٹ لگائے ان کے لئے ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعا کرتے ہیں، اس خبیث دولت کو دینی کاموں میں صرف کرنے سے بہتر ہے کہ کاموں کو روک دیا جائے اور مالِ طیب کا انتظار کیا جائے، اللہ ضرور ایسا کوئی دروازہ کھول دے گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت پر آتے ہی اعلان فرمایا کہ جن لوگوں پر سابق امراء نے ناجائز ٹیکس لگا دیئے تھے وہ آج سے وصول نہیں کئے جائیں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ناجائز ٹیکسوں سے وصول شدہ جو دولت بیت المال میں موجود ہے وہ ٹیکس دہندگان کو واپس کی جائے، حکم کی تعمیل کی گئی، سرکاری خزانہ خالی ہوگیا، آمدنی محدود ہو گئی، مملکت کی معاشی حالت پُرخطر نظر آنے لگی، ایک صوبہ کے گورنر نے آپ کو خط لکھا اور معاشی بدحالی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ اب ہمارے لئے حکومت کا کاروبار چلانا حتیٰ کہ تنخواہیں ادا کرنا بھی مشکل ہو جائے گا، مردِ مؤمن عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے لکھا، کیا تم نے اللہ کا ارشاد فراموش کر دیا ہے کہ:

لَّا يَسۡتَوِي ٱلۡخَبِيثُ وَٱلطَّيِّبُ وَلَوۡ أَعۡجَبَكَ كَثۡرَةُ ٱلۡخَبِيثِۚ

تم سے پہلے ظلم و ستم کے ذریعہ جتنا خزانہ بھرا گیا تھا، وہ مال خبیث تھا، اب تم عدل وانصاف اختیار کرو اور کوئی فکر نہ کرو، ہماری حکومتی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے، اللہ مال طیب کے دروازے کھول دے گا، تاریخ گواہ ہے کہ چند ہی دن بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو وہ وقت نصیب ہوا کہ آپ اعلان کراتے تھے کہ بیت المال میں زکوٰۃ کی دولت بہت جمع ہوگئی ہے، جو مستحقِ زکوٰۃ ہو وہ لے سکتا ہے، لیکن زکوٰۃ دینے والے تو بہت تھے، لینے والے بمشکل ہی کوئی ملتا تھا، یہ تھی طیب کی برکت اور اسلامی اصولوں پر معاشی نظام قائم کرنے کا انجام۔

کثرت خبیث پر تعجب

خبیث، تعداد و مقدار میں زیادہ بھی ہوتا ہے، سہل الحصول ہوتا ہے اور بظاہر حسین و جمیل بھی نظر آتا ہے، طبعاً انسان اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس میں مبتلا ہو کر خبیث بن جاتا ہے، اس میلان طبع کو روکنے والی کوئی چیز نہیں سوائے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبہ، اللہ کے خوف اور رسول ﷺ کی محبت کے یعنی وہی لوگ اس سے بچتے دور اور محفوظ رہتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا احساس ہوتا ہے، جن پر اللہ کا خوف طاری ہوتا ہے اور جو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کرتے ہیں جبکہ ضعیف الایمان لوگ خبث کی ان خوبیوں کے سبب اس میں بہت جلد مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں پر خبثاء کی دولت، شان و شوکت اور آن بان کا جادو ایسا چلتا ہے کہ وہ اپنے مقام، اپنی حیثیت حتیٰ

کہ اپنے دین وایمان تک کوفراموش کردیتے اور خبثاء کی راہ کو اختیار کر لیتے ہیں، اللہ رب العزت جل مجدہ کا کرم ہے کہ اس نے اس دلدل میں پھنسنے سے پہلے ہی ہمیں آگاہ فرما دیا:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (توبہ:۵۵)

پس نہ تعجب میں ڈال دے تمہیں ان کا مال اور نہ ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ کہ عذاب دے ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں۔ (پ ۱۰، توبہ، ۵۵)

دوسرے مقام پر ان خبثاء کی کشش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ (منافقون:۴)

جب تم انہیں دیکھو تو ان کے جسم تمہیں بڑے خوشنما معلوم ہوں گے اور اگر وہ گفتگو کریں تو توجہ سے ان کی بات سنو گے (جبکہ درحقیقت) وہ (بیکار) لکڑیوں کی طرح ہیں جو دیوار کے ساتھ کھڑی کردی گئی ہیں۔

ان دونوں آیات کا مفہوم واضح ہے کہ کفار کے پاس دولت بھی ہوتی ہے، اولاد بھی ہوتی ہے وہ بظاہر چکنے چپڑے ہوتے ہیں، بڑے چرب زبان، شیریں بیان ہوتے ہیں لیکن خبیث ہیں جن کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ان کے خبث کی وجہ سے انہیں ایسی دلدل میں دھنسا دیا ہے جس سے نکلنا اب اُن کے بس میں نہیں اور ان کی جان اسی حال میں نکلے گی، پس تم ان کے ظاہر حال کو دیکھ کر تعجب نہ کرو، اپنے رب کی اس آگاہی کے بعد تم ان کی حقیقت کو سمجھو، اُن سے دور رہو، تم نے ایمان کی دولت پا کر حیات طیبہ کو اختیار کیا، پس اسی پر صابر وشاکر رہو۔

ان آیات میں اگر چہ کفار ومنافقین (غیر مسلموں) کا حال بیان کیا جا رہا ہے جو پیکرِ خبث ہیں لیکن جب مسلمان اس راہ کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ بھی خبث کی دلدل میں پھنس کر ایسا ہی خبیث بن جاتا ہے، دنیا کی ذلت وخواری اس کا مقدر بن جاتی ہے اور آخرت میں جرائم کی سزا اس کا نصیب ہوتی ہے، جسے بخشنے کے بعد ایمان کے صدقہ میں اسے چھٹکارا ملے گا۔ بہر حال خبیث کی کثرت میں جاذبیت ہے جو انسان کو اپنی طرف مائل کرتی ہے، پس

اے ایمان والو:۔ تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ تم ''کثرت خبیث'' پر تعجب نہ کرنا کہ اس کی حقیقت سراب سے زائد نہیں، تمہیں دولت ایمان میسر آ چکی ہے جس نے تمہیں عقل سلیم بخشی ہے، ''اُولِی الالباب'' بنادیا ہے، سراب کی طرف دوڑنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ اس دریا کی طرف بڑھو، جس کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی تمہیں پیاس کے اضطراب سے نجات دے وہ دریا، قرآن وحدیث ہے جس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر تم خبث کی گندگی وغلاظت سے محفوظ ہو سکتے اور طیب بن کر سکون وطمانینت عزت وآبرو کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔

ترقی زدگان کے لئے

قرآن کریم کی یہ ہدایت، ترقی زدہ لوگوں بالخصوص ان لوگوں کے لئے نہایت قابل غور ہے، جو مغربی ممالک میں آباد ہیں اور وہاں کی چمک دمک نے ان کی نظروں کو خیرہ کر دیا ہے، دینی تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے باعث انہیں ہر خبیث اچھا لگتا ہے، کثرتِ خبث پر صرف انہیں تعجب ہی نہیں ہوتا بلکہ خبث کو وہ تیزی سے اپنا کر خبیثوں میں شامل ہو رہے ہیں، ان جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں، لباس سے عاری ہو رہے ہیں، شراب میں مست ہیں، جوئے بازی اور سود خوری میں غرق ہو رہے ہیں، ان کا ایمان تک خطرے میں ہے کہ ذہنوں میں خبیث عقائد گھس رہے ہیں، کاش وہ مذہبی انداز پر نہ سہی دنیاوی انداز پر ہی سوچیں کہ جن خبیثوں سے وہ متاثر ہیں ان خبیثوں کی اپنی حالت کیا ہے، اللہ کی زمین کو گندا کرنے والے یہ خبیث، اس زندگی ہی میں اللہ کے عذاب میں مبتلا نظر آ رہے ہیں، منشیات اور جنسی شر ان کے سبب یہ مہلک امراض میں مبتلا ہیں۔ چوری، ڈکیتی، قتل و غارت ان کے معاشرے کا ایک حصہ ہے، جوئے بازی اور سود ان کے معاشی نظام کا جزو بن گئے ہیں، معاشرتی نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے کہ بھائی، بہن، شوہر، بیوی، والدین، اولاد تک کے درمیان کوئی رشتہ نہ رہا ان میں باہمی حقوق کا تو کوئی تصور ہی نہیں۔

للہ ان خبیثوں کی سفید چمڑی کو نہ دیکھئے، ان کی چرب زبانی کے فریب میں مبتلا نہ ہو جائیے، ان کی عمارتوں اور شہروں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہ ہو جائیے، آپ ''اُولِی الْاَلْبَاب'' ہیں، حقیقت پر غور کیجئے تو پردہ اٹھے گا اور پتہ چلے گا کہ یہ تو ''خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ'' ہیں، ان میں کوئی جان نہیں مردے ہیں یہ کسی کو زندگی کیا دے سکتے ہیں، اللہ خبیث کے فریب سے محفوظ رکھے اور حیات طیبہ عطا فرمائے (آمین)

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْن

درودِ شفاء

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ
طِبِّ الْقُلُوْبِ وَدَوَآئِھَا وَعَافِیَۃِ الْاَبْدَانِ وَشِفَآئِھَا
وَنُوْرِ الْاَبْصَارِ وَضِیَآئِھَا وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلِّمْ ط

اسی (80) سال کی عبادت کا ثواب

جمعہ کے دن جہاں نمازِ عصر پڑھی ہو اس جگہ اٹھنے سے پہلے اسی (80) مرتبہ یہ درود شریف پڑھنے سے اسی 80 سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور اسی 80 سال کی عبادت کا ثواب ملتا ہے۔ (فضائل درود)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ
النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا ط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۴۲

المائدہ:۱۰۱۔۱۰۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا
حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ
مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝ (مائدہ:۱۰۱۔۱۰۲)

اے ایمان والو! مت پوچھا کرو ایسی باتیں کہ اگر ظاہر ہو جائیں تمہارے لئے تو بُری لگیں تمہیں اور اگر پوچھو گے ان کے متعلق جبکہ اتر رہا ہے قرآن کریم تو ظاہر کر دی جائیں گی تمہارے لئے، معاف کر دیا ہے اللہ نے ان کو اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا حلم والا ہے، تحقیق پوچھا تھا ان کے متعلق ایک قوم نے تم سے پہلے پھر ہو گئے وہ ان احکام کا انکار کرنے والے۔

کثرتِ سوال کی مُمانعت

اسلام کا ابتدائی دور تھا، صحابہء کرام کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دین کی معلومات حاصل کریں اور ان کا ہر عمل، اللہ اور نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایت کے مطابق ہو لہٰذا وہ صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم سے بسا اوقات

سوالات کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات وہ ایسے سوال کر بیٹھتے تھے کہ جن کا جواب نہ صرف ان کے لئے بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لئے تکالیف و دشواری کا سبب بن سکتا تھا، مثلاً:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: "اے لوگو! تم پر حج فرض ہو گیا ہے، پس حج کیا کرو" ایک صحابی (اقرع بن حابس) نے سوال کیا "اَکُلَّ عَامٍ" یارسول اللہ ﷺ، کیا حج ہر سال فرض ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خاموش رہے، یہاں تک کہ سائل نے تین مرتبہ سوال کیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، "لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَ لَمَا اسْتَطَعْتُمْ" "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال ہی فرض ہو جاتا پھر فرمایا: "جن چیزوں کی تفصیل میں چھوڑ دیا کروں، تم ان کے متعلق سوال مت کیا کرو"، "فَاِنَّمَا هلک من قبلکم بکثرة سؤالهم" کیونکہ تم سے پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوئے کہ وہ انبیاء علیہم السلام سے بکثرت سوال کیا کرتے اور ان سے اختلاف کرتے تھے، لہٰذا جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اس پر بقدر استطاعت عمل کیا کرو اور جب میں کسی چیز سے روک دوں تو اس کو چھوڑ دیا کرو۔ (مسلم شریف)

یہی طریقہ قرآن کریم بناتا ہے کہ "مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" "رسول جو دیں لے لو اور جس سے روک دیں رک جاؤ، نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کثرت سوال سے اپنے غلاموں کو روکنے کے لئے ایک موقع پر ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ نے کچھ فرض مقرر کئے ہیں، انہیں ضائع نہ کرو، بعض چیزوں کو حرام کر دیا ہے ان کی پردہ دری نہ کرو اور بعض حدیں مقرر کر دی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو"، "وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَآءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا" اور بعض چیزوں کے متعلق دانستہ سکوت فرمایا ہے، ان کے متعلق بحث نہ کرو۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلاموں کے سوالات کے جوابات دیتے رہتے تھے کہ آپ ﷺ ایسے معلم ہیں جن کے علم کی کوئی حد و انتہاء نہیں، تاہم آپ ﷺ ان کی بال کی کھال نکالنے کی عادت کو پسند نہ فرماتے تھے اور ایسے سوالات سے آپ ﷺ کو الجھن ہوتی تھی، پس ایک دن آپ ﷺ نے صحابہ کو جمع فرما کر خطبہ دیا اور فرمایا "تَسْاَلُوْنِي الْيَوْمَ عَنْ شَيْءٍ اِلَّا بَيَّنْتُهُ لَكُمْ" "آج تم جس چیز کے متعلق مجھ سے سوال کرو گے وہ میں تمہیں بتا دوں گا، صحابہ کو آپ ﷺ کی ناگواری خاطر کا احساس ہو چکا تھا، لہٰذا سب دم بخود آنکھوں سے آنسو بہا رہے تھے، کسی میں سوال کرنے کی جرأت نہ تھی لیکن حضرت عبداللہ بن حذیفہ نے موقع غنیمت جانا۔ لوگ ان کے نسب کے متعلق چہ میگوئیاں کرتے رہتے تھے، انہوں نے چاہا کہ آج یہ بات واضح ہو جائے پس ہمت کی اور عرض کرنے لگے، "مَنْ اَبِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" "اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیک وسلم، میرا باپ کون ہے، اس سوال پر، خداداد علم وسیع کے مالک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو خاموش ہوئے اور نہ یہ فرمایا کہ کوئی شرعی مسئلہ پوچھو بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا "اَبُوْكَ حُذَيْفَةُ" "تمہارے باپ حذیفہ ہیں، عبداللہ بن حذیفہ کی ماں بھی موجود تھیں، بیٹے کا سوال سن کر کانپ گئیں اور کہنے لگیں کہ تجھ سے زیادہ نافرمان اولاد کوئی نہیں ہو سکتی اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی اور کو تیرا باپ بتا دیتے تو میں کس قدر رسواء ہو جاتی، حضرت عبداللہ کو اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے علم خداداد پر اتنا اعتماد تھا کہ کہنے لگے کہ "اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کسی حبشی غلام کا بیٹا بتاتے تو میں اسی پر یقین کرتا، اس دن

کے بعد حضرت عبداللہ بن حُذیفہ کے نسب کے متعلق لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔

بہر حال اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے غلاموں کے لایعنی اور غیر ضروری سوالات پسند نہ تھے، پس اللہ کریم نے ایسے سوالات کی ممانعت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میرے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسے سوالات مت کیا کرو، جن کے جوابات کے بعد تم پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ، دیکھو نزول وحی کا سلسلہ جاری ہے، کہیں تم سخت احکام میں مبتلا نہ کر دیئے جاؤ کیونکہ ماضی میں لوگ ایسے ہی سوالات کے باعث دشواریوں میں مبتلا کئے گئے۔ انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام سے سوالات کئے، اللہ کے احکام ان کے لئے سخت ہو گئے، پھر وہ ان کی تعمیل نہ کر سکے انکار اور فرار کی راہ اختیار کرنے لگے، پس بہتر یہی ہے کہ شرعی احکام جیسے دیئے جائیں، ان کی آسان ترین صورت پر پابندی کرو۔

واقعہ ذبح بقرہ

پچھلی امتوں میں سب سے زیادہ بنی اسرائیل اس کے عادی نظر آتے ہیں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طرح طرح کے بے تکے اور غیر ضروری سوالات کرتے رہتے تھے، اسی نوعیت کا ایک واقعہ "ذبح بقرہ" کا ہے، جو سورۂ بقرہ کی آیات ۶۷ تا ۷۳ میں مذکور ہے اور اس واقعہ ہی کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام "سورۂ بقرہ" رکھا گیا، ان آیات اور احادیث کی روشنی میں اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ

بنی اسرائیل میں ایک نہایت دولت مند بوڑھا تھا، جس کا ایک ہی بیٹا تھا، بوڑھے کے بھتیجے نے اس لڑکے کو قتل کر دیا تاکہ وہ اس کی دولت کا وارث قرار پائے، قاتل کا پتہ چلانے کی کوشش کی گئی لیکن پتہ نہ چل سکا، کچھ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض گزار ہوئے کہ آپ رب سے دعا کریں کہ ہمیں قاتل کا پتہ چل جائے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب سے دعا کی اور انہیں بتایا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک لوتھڑا مقتول پر مارو، پس اللہ کی قدرت سے مقتول زندہ ہو کر قاتل کا نام بتا دے گا، پہلے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا" کیا آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں، آپ نے فرمایا، اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں کے گروہ میں شامل ہوں، پھر وہ گائے کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرنے، وہ گائے کس عمر کی ہونی چاہئے، جواب ملا "لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ" بوڑھی ہو، نہ بچی، بلکہ درمیانی عمر کی ہو، گائے کا رنگ کیسا ہو، جواب ملا "صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ" خوب گہری زرد رنگ کی گائے ہو، جو دیکھنے والوں کے لئے فرحت بخش ہو، عام گائے ہو یا کوئی مخصوص اور عجیب و غریب، جس میں قاتل کا پتہ چلانے کا کوئی خاص اثر ہو جواب ملا "اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا" وہ گائے جس سے کام نہ کرایا گیا ہو، زمین میں ہل چلانے اور کھیتی میں پانی دینے کا، بے عیب اور بے داغ ہو۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان کے سوالات نے ان کے لئے ان کے کام کو کتنا دشوار بنا دیا، نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل سوالات نہ کرتے تو اتنی قیود میں مبتلا نہ ہوتے، جیسی بھی گائے ذبح کر دیتے، ان کا کام ہو جاتا۔

بہر حال وہ اس مخصوص گائے کی تلاش میں نکلے تو بسیار دشواریوں کے بعد انہیں پتہ چلا کہ فلاں جگہ ایسی گائے

موجود ہے، جس کا واقعہ یہ تھا کہ اُسی قوم میں ایک نیک غریب تھا، جس کے پاس صرف بچھیا تھی، جب یہ شخص مرنے لگا تو اس نے اللہ کے دربار میں عرض کی، مولا تو جانتا ہے کہ میرا ایک چھوٹا بچہ ہے، میں غریب ہوں، میرے پاس اپنے بچہ کے لئے اس بچھیا کے سوا کچھ نہیں، پس میں اسے تیری حفاظت میں دیتا ہوں، تو میرے بچے کو اس بچھیا سے ہی ایسی برکت عطا فرمانا کہ وہ ساری زندگی محنت ومشقت سے آزاد رہے، (اللہ اپنے نیک بندوں کی سنتا ہے، دل سے نکلی دعاؤں میں اثر ہوتا ہے)، یہ بچھیا جنگل میں پرورش پاتی رہی، بیٹا جوان ہوگیا، گائے بنی اسرائیل کی ضرورت کے عین مطابق تھی، وہ بڑی ہی تگ ودو کے بعد اس تک پہنچے تھے، انہوں نے اپنی ضرورت بتائی اور گائے کو خریدنا چاہا، اللہ کے دربار میں نیک بندے کی درخواست قبول ہوچکی تھی، لڑکے کی بوڑھی ماں نے کہا، اگر تمہیں گائے کی ضرورت ہے، تو لے لو، اس کو ذبح کرلو، اس کی کھال اتارو، اسے سونے سے بھرو، بس یہ سونا اس کی قیمت ہے، ایسا ہی کیا گیا، وہ جس کی شان "وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ" ہے جہاں سے چاہتا ہے رزق عطا فرمادیتا ہے، اس کے خزانے میں نہ کمی ہے نہ کمی ہوتی ہے، لڑکا مالا مال ہوگیا، باپ کی دعا کے طفیل ہمیشہ کے لئے کسب معاش سے آزاد ہوگیا، ادھر بنی اسرائیل کا کام بھی بن گیا، انہوں نے حکم الٰہی کی تعمیل کی، گائے ذبح کی، اس کا ایک لوتھڑا مقتول پر مارا، مقتول زندہ ہوا اور اپنے قاتل کا نام بتا کر دوبارہ مرگیا، تاہم بنی اسرائیل غیر ضروری سوالات کے سبب بڑے خسارے میں رہے کہ انہیں تعمیل حکم کے لئے بھاری رقم خرچ کرنا پڑی۔

اس خسارے کے باوجود بھی ان کی عادت ختم نہ ہوئی اور وہ اپنے نبی سے سوالات کرتے ہی رہے، حتیٰ کہ انہوں نے بڑی جرأت کی اور نوبت بایں جارسید کہ "فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً" انہوں نے ایک دن موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کرڈالا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھاؤ، انہیں اس دریدہ دہنی کی فوراً سزا ملی "فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ" تو ان کے ظلم کے سبب ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا کہ بجلی کی ایک کڑک نے انہیں جلا کر خاکستر کرڈالا (الامان والحفیظ)

بہر حال صحابہ کرام کو غیر ضروری سوالات کی عادت سے روکا گیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا گیا "عَفَا اللّٰهُ عنها" کہ اللہ نے انہیں معاف کردیا جو ماضی میں ایسا کرچکے ان سے کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا، یہ عظمت صحابہ کی حفاظت کا اہتمام ہے، قرآن کریم میں کئی بار یہ جملہ ایسے ہی مقامات پر آتا ہے جہاں صحابہ پر انگشت نمائی کا تھوڑا سا بھی امکان ہو کہ اللہ اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ پر تنقید اور انگشت نمائی کو پسند نہیں فرماتا۔

غیر ضروری سوالات

ہدایت مذکورہ اگرچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے مخصوص تھی کیونکہ اس وقت سلسلہ وحی جاری تھا، صاحب شریعت صلی اللہ علیہ اپنی حیات ظاہرہ میں رونق افروز تھے، سوالات کی کثرت سے یہ ممکن تھا کہ احکام سخت ہوجائیں، جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا تھا لیکن اب جبکہ سلسلہ وحی منقطع ہوچکا، باب نبوت ہمیشہ کے لئے بند ہوچکا، دین مکمل ہوچکا، عامتہ المسلمین کو اگرچہ علماء دین سے سوالات کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا، "فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" اگر تم نہیں جانتے تو علماء دین سے پوچھ لیا کرو لیکن غیر ضروری سوالات، جن سے نہ دین کا کوئی فائدہ ہو نہ دنیا کا، اب بھی کرنا مناسب نہیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا کیا نام تھا، حضرت آدم علیہ السلام کا قد کتنا تھا، ان کا رنگ کیسا

تھا، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول وعرض کتنا تھا، یہ فضول سوالات ہیں، جن میں ذہنوں کو الجھانے کا کوئی فائدہ نہیں، اپنا وقت بھی ضائع کرنا ہے اور علماء کا قیمتی وقت بھی ضائع کرنا ہے، بالخصوص جبکہ سوال کرنے والوں کو دیگر دینی معلومات کی ضرورت ہو، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کی گفتگو کے متعلق ارشاد فرمایا ''مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ'' مسلمان ہونے کی خوبی یہ ہے کہ آدمی غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔

مسلمان کو زیب یہی دیتا ہے کہ جب بھی اسے موقع ملے وہ دین سیکھنے، اپنی اور اپنے اہل خانہ کی اصلاح کی باتیں سیکھنے کی کوشش کرے، آج ہمیں بمشکل ہی علماء کی صحبت نصیب ہوتی ہے، اس کو بھی ہم غیر ضروری باتوں میں ضائع کر دیں، اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوسکتی ہے، ہمیں نہ کھانے پینے کے آداب آتے ہیں، نہ سونے جاگنے کا شرعی طریقہ معلوم ہے، نہ ایک دوسرے کے حقوق کا ہمیں پتہ ہے، ہم نہیں جانتے کہ اولاد پر والدین کے حقوق کیا ہیں، یا والدین کو اولاد کی تربیت کس طرح کرنا چاہئے، ہم نہیں جانتے کہ بحیثیت شوہر ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں، اور ایک اچھی بیوی پر گھر کی ذمہ داریاں کیا ہیں، ہمیں تو طہارت و پاکیزگی، وضو اور غسل کے سطحی مسائل تک نہیں معلوم، نماز روزہ اور دیگر عبادات کی ادائیگی کے صحیح طریقوں سے ہم واقف نہیں، کیا یہ تمام اہم عنوانات علماء سے گفتگو کے لئے کم ہیں، جو ہم پچھلی امتوں اور پچھلے انبیاء سے متعلق گفتگو میں اپنا وقت ضائع کر دیتے ہیں، عام لوگوں کو تو غیر ضروری کتابوں کے مطالعہ کی بھی اجازت نہیں، پس مناسب ہوگا کہ علماء کی صحبت کو غنیمت جان کر اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، جب آپ علماء کے پاس سے اٹھیں تو آپ کا ضمیر مطمئن ہو اور آپ کو احساس ہو کہ میں نے آج کچھ سیکھا ہے، ایسی باتیں مجھے معلوم ہوئی ہیں جو میں دوسروں کو بتا کر تبلیغ دین کا ثواب حاصل کر سکتا ہوں، جن سے میں اپنی اور اپنے اہل خانہ کی اصلاح کر سکتا ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ہے کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِّنَ الَّيْلِ خَيْرٌ مِّنْ اِحْيَاءِ هَا

رات کی ایک گھڑی میں علم کا پڑھنا پڑھانا رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔ (مشکوٰۃ)

جب آپ علماء کی صحبت میں ہوتے ہیں تو آپ کو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ضرور ضرور یہ عظمت حاصل ہوتی ہے لیکن اسی وقت جب آپ اس وقت کو غیر ضروری سوالات میں ضائع نہ کر رہے ہوں، بلکہ دین کی باتیں سیکھنے میں مصروف ہوں، اللہ توفیق دے، آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۴۳

المائدہ:۱۰۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ:۱۰۵)

اے ایمان والو! تم پر اپنی جانوں کی فکر لازمی ہے، نہیں نقصان پہنچا سکے گا تمہیں جو گمراہ ہوا جبکہ تم ہدایت یافتہ ہو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے تم سب کو پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جو تم (اس دنیا میں) کیا کرتے تھے۔

اے ایمان والو! اپنی فکر کرو، اپنے ایمان کو مضبوط کرو، اپنے اعمال کو درست کرو، علم وعمل سے اپنے آپ کو لیس کرلو، جب تم مسلح ہو جاؤ گے تو تمہیں نقصان پہنچانے کی کسی کو جرأت نہ ہوگی، اگر تم اپنی راہ پر مطمئن ہو، مضبوطی سے صراطِ مستقیم پر گامزن رہو، تو تمہیں کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، کوئی نہیں بھٹکا سکتا، دین کا پیغام پھیلاتے رہو، کفر وشرک، فسق وفجور، بدعات اور برائیوں کے خلاف جہاد کرتے رہو، پھر کوئی تمہاری دعوت قبول نہ کرے تو ہرگز غم زدہ نہ ہو، ایک دن سب ہی کو اللہ کے دربار میں حاضر ہونا اور اپنے کئے ہوئے اعمال کی جزاء وسزا پانا ہے، اس دن پتہ چل جائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون گمراہ تھا۔

اصلاحِ نفس:۔ اپنے ایمان کی حفاظت اور دوسروں کو دین کی دعوت دینے کے لئے اصلاحِ نفس لازمی ہے، یعنی ایمانیات و اعتقادات پر پوری طرح ایسا مطمئن ہونا کہ کوئی ان کے خلاف کتنے ہی دلائل پیش کر دے لیکن مؤمن کے ایمان و اعتقاد میں تذبذب نہ آنے پائے، گویا وہ ایسا پہاڑ بن جائے کہ کوئی طوفان اسے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے، اس کا عمل و کردار، ایک بے داغ سفید چادر کی طرح، صاف ستھرا ہو کہ اس پر کوئی انگشت نمائی نہ کر سکے، عبادات کی پابندی میں وہ اتنا محتاط ہو کہ کسی حال میں اس سے غافل نہ ہونے پائے، اب یہ مؤمن اللہ کا ایسا سپاہی ہو جاتا ہے، جس میں اپنے دین کی حفاظت کے ساتھ دین کی دعوت دینے اور اس کی اشاعت کرنے کی پوری پوری صلاحیت اور طاقت موجود ہوتی ہے، اب یہ کسی فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتا، کوئی اسے صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا، ایسے ہی مؤمنین کے لئے قرآنی مژدہ ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (آل عمران:۱۳۹)

اور نہ ہمت ہارو، اور نہ غم کرو اور تم ہی سر بلند رہو گے اگر تم مؤمن ہو۔

یہ مژدہ انہی مؤمنین کاملین کے لئے ہے جو اپنی اصلاح کر کے پوری طرح لیس ہو کر میدان میں آتے ہیں، یہ آگے بڑھتے رہتے ہیں اور انہیں غیبی ندا آتی رہتی ہے ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، کامیابی و کامرانی تمہارا مقدر بن چکی ہے، ان مؤمنین کی صف اول میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جو ایمانی قوت سے لیس ہو کر آگے بڑھتے رہے اور ہر دور میں کامیاب و کامران رہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دہکتے انگاروں پر، حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے پھانسی کے تختہ پر مسکراتے ہوئے، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے نیزہ سے اپنا جسم گھائل کرا کر، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ نے دو اونٹوں سے اپنا بدن چروا کر، مجاہدین بدر نے بے سرو سامانی کی حالت میں جو عظیم فتح حاصل کی، اس سے ثابت ہے کہ ایمان کی قوت دنیا کی ساری مادی قوتوں سے توانا ہے، جسے یہ نصیب ہو جائے دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بدر، خندق، حنین کے غزوات، یمامہ، قادسیہ، نہاوند اور کربلا کے معرکے محمد بن قاسم، طارق، غزنوی اور غوری کی فتوحات، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں، حضرات اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی دینی تحریکوں میں نہایت ناسازگار حالات کے باوجود کامیابیاں جن کے اثرات آج تک موجود ہیں اور قیامت تک رہیں گے، اسی اصلاحِ نفس اور کمالِ ایمان کا فیضان ہے، اعلان باری تعالیٰ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ (اعلیٰ:۱۴، ۱۵)

بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

قلب کو رذائل سے پاک و صاف کر لینا اور اسے اللہ کے ذکر کا عادی بنا دینا تزکیہ ہے، جس کا ظاہری اثر، عبادات کی پابندی ہے۔ جس کے بعد قلب انوارِ الٰہی کی تجلیات کا مرکز بن جاتا ہے اور جو قلب تجلیات باری کا مرکز بن گیا، کامیابی و کامرانی اس کا حصہ ہوتی ہے۔

وضاحت:۔ ''عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ'' کی ہدایت سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ صرف اپنے نفس کی اصلاح ہماری ذمہ داری قرار دی گئی، اس کے علاوہ ہمیں کسی سے کوئی سروکار نہیں، ہم پر کسی کی ذمہ داری نہیں، ہماری اولاد کچھ کرے، ہمارا کوئی واسطہ نہیں، ہمارے

معاشرے میں کتنی ہی برائیاں جنم لیتی رہیں ہمارا کوئی تعلق نہیں، ایسا بالکل نہیں بلکہ "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ" کی ہدایت اپنے نفس کی اصلاح کے ساتھ، اپنے ماحول کے ان تمام افراد کی اصلاح کو شامل ہے، جن کی اچھائی یا برائی سے متاثر ہوئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے، غور فرمائیے کیا ہم صالح اور متقی کہلائے جا سکتے ہیں، اگر ہمارے اہل خانہ دین سے دور ہوں، برائیوں میں مبتلا ہوں، اسی طرح کیا ہم ایسے معاشرے میں خود کو اور اپنی اولاد کو دین کی راہ پر گامزن رکھ سکتے ہیں، جو برائیوں اور بدکاریوں سے بھرا ہوا ہو، ہرگز ممکن نہیں، پس "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ" کے وسیع معنیٰ پر غور کیجئے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ "اَنْفُسَكُمْ" میں وہ نفوس شامل ہیں، جن سے ہمارا دینی رشتہ ہے، ان کی اصلاح حقیقتاً اپنی ہی اصلاح ہے، ان کی ہدایت حقیقتاً اپنی ہی ہدایت ہے، ان کی ضلالت و گمراہی حقیقتاً اپنی ہی ضلالت و گمراہی ہے، جب تک پورا معاشرہ پاک وصاف نہ ہو کوئی ایک فرد پاک وصاف نہیں ہوسکتا۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ" کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ تم اپنے واجبات شرعیہ کو ادا کرتے رہو، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اہم ترین واجبات ہیں جن کو قرآن کریم نے امت مسلمہ کی امتیازی خصوصیت قرار دیا ہے۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں بیان فرمایا کہ "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ" کے ارشاد سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا کہ تم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نہیں بلکہ سنو جو میں نے خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا، آپ نے فرمایا:

اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الْمُنْكَرَ وَلَمْ يُغَيِّرُوْهُ يُوْشِكُ اَنَّ اللّٰهَ اَنْ يَّعُمَّهُمْ بِعِقَابِهٖ

لوگ جب برائی کو دیکھیں اور اس کو درست نہ کریں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے عذاب میں مبتلا کردے۔ (ابن ماجہ)

نیز حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

مَنْ رَّاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ

جو تم میں سے برا کام دیکھے تو اسے ہاتھ سے روک دے اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو زبان سے روکے اگر اس کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو دل سے برا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔ (مسلم)

برائی کو مٹانا، برا جاننا، مؤمن کی ذمہ داری ہے، ہو سکے تو ہاتھ سے مٹائے یعنی برائی کرنے والے کو سزا دے، یہ حکام کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے سے برائی ختم کرنے کے لئے شرعی سزائیں نافذ کریں، زبان سے بُرائی کو بُرا کہنا اور اس کو روکنے کی کوشش کرنا، علماء اور جراُت مند مؤمن کا کام ہے، کمزور ترین ایمان رکھنے والوں یا جنہیں معاشرے اور حالات نے کمزور کردیا ہو، ان کی کم از کم اتنی ذمہ داری تو ہے کہ وہ بُرائی کو بُرا جانیں، بُروں سے قلبی طور پر نفرت کریں، ممکن ہو تو ان سے دوری اختیار کریں۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ارشاد فرماتے سنا:

مَا مِنْ رَّجُلٍ يَّكُوْنُ فِي قَوْمٍ يَّعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتُوْا

کسی قوم (قبیلہ یا خاندان) کا کوئی آدمی ان کے درمیان بُرائیوں میں مبتلا ہو اور وہ قدرت کے باوجود اس کی اصلاح نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو مرنے سے پہلے (دنیا ہی میں) عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ (ابوداؤد)

اے ایمان والو! اپنی اصلاح کرو اور اس ذمہ داری کو نہ بھولو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہاری خصوصیت ہے، پس تم اپنے اہل وعیال، اپنے خاندان اور معاشرے کی اصلاح کے بھی ذمہ دار ہو کہ جب تک معاشرہ بُرائیوں سے پاک نہیں ہوتا، محض چند افراد کی اصلاح سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے، وہ عزت ووقار نصیب نہیں ہو سکتا جو اصلاح نفس کا نتیجہ ہے، ہاں دین کا پیغام پہنچانے اور لوگوں میں اس کی تبلیغ کرنے کے باوجود بھی تمہاری توقع کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو تو تم ان کی فکر میں مبتلا نہ ہو، اپنا کام پوری دل جمعی کے ساتھ جاری رکھو، اللہ تمہارا حامی وناصر ہوگا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



مقالہ ۴۴

المائدہ:۱۰۶تا۱۰۸

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ
ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ
مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ
بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ
عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ
بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

(المائدہ:۱۰۶تا۱۰۸)

اے ایمان والو! آپس میں تمہاری گواہی جب آجائے کسی کو تم میں سے موت، وصیت کرتے وقت

(یہ ہے کہ) دو معتبر شخص تم میں سے ہوں، یا دو اور غیروں میں سے اگر تم سفر کر رہے ہو، زمین میں پھر پہنچے تمہیں موت کی مصیبت روکو ان دو گواہوں کو نماز کے بعد تو وہ قسم کھائیں اللہ کی اگر تمہیں شک پڑ جائے (ان الفاظ سے) کہ ہم نہ خریدیں گے اس قسم کے عوض کوئی مال اور اگرچہ قریبی رشتہ داری ہو اور ہم نہیں چھپائیں گے اللہ کی گواہی (اگر ہم ایسا کریں) تو یقیناً ہم اس وقت گناہ گاروں میں (شمار) ہوں گے پھر اگر پتہ چلے کہ وہ دونوں گواہ سزاوار ہوئے ہیں کسی گناہ کے تو دو اور کھڑے ہو جائیں ان کی جگہ ان میں سے جن کا حق ضائع کیا ہے، پہلے گواہوں نے اور قسم اٹھائیں اللہ کی کہ ہماری گواہی زیادہ ٹھیک ہے۔ ان دو کی گواہی سے اور ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا (اگر ہم ایسا کریں) تو بے شک اس وقت ہم ظالموں میں شمار ہوں گے، یہ طریقہ زیادہ قریب ہے کہ گواہ گواہی دیا کریں جیسا کہ چاہئے، یا خوف کریں اس بات کا کہ لوٹائی جائیں گی قسمیں (میت کے وارثوں کی طرف) ان کی قسموں کے بعد اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سنو اس کا حکم اور اللہ ہدایت نہیں دیتا فاسق قوم کو۔

ایک دشواری

بعض مفسرین کے خیال کے مطابق یہ تینوں آیتیں اعراب، نحوی ترکیب، معنیٰ اور مفہوم کے اعتبار سے مشکل ترین آیات ہیں، قُراء کے لئے ان کی تلاوت بہت مشکل اور علماء کے لئے ان کو سمجھانا بہت دشوار ہے، ہمارے لئے اس انداز پر ان آیات کا مفہوم پیش کرنا دشوار ہو رہا ہے جو ہم نے اپنی اس کتاب کے لئے مخصوص کر رکھا ہے، تاہم اگر اللہ کی مدد شامل حال ہو تو کوئی دشواری دشواری نہیں رہتی، پس ہم بوسیلہ جلیلہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام، اللہ سے توفیق طلب کرتے ہیں کہ ہم وہ انداز اختیار کر سکیں، جس سے ہمارے قارئین، آیت کا مفہوم بآسانی سمجھ لیں، وباللہ التوفیق وبہ نستعین بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔

عنوان آیات

وصیت پر گواہ مقرر کرنا اور ان سے گواہی لینے کا طریقہ ان آیات میں بیان کیا جا رہا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ وصیت کرنے والا، اگر اپنے اہل خانہ، اعزاء واقربا سے کہیں دور نہیں ہے تو وہ اپنے خاندان کے لوگوں ہی میں سے دو آدمیوں کو اپنی وصیت پر گواہ بنا دے۔ لیکن اگر وہ حالت سفر میں ہے اور اچانک بیمار ہوا، اسے خطرہ ہوا کہ یہ مرض موت کا سبب بن سکتا ہے۔ تو جو بھی ملے انہیں گواہ بنا دے، بس گواہ شرعی معیار کے ہونے ضروری ہیں قابل اعتبار، خوفِ خدا رکھنے والے، ہر معاملہ میں عدل وانصاف کرنے والے۔

گواہوں نے مردہ کے وارثوں کو وصیت پہنچائی اور وہ مطمئن ہو گئے تو اس صورت میں تو کسی قانون یا طریقہ کی ضرورت ہی نہ رہی لیکن اگر وارثوں کو وصیت پر اطمینان نہ ہوا اور انہیں شک ہوا کہ گواہوں نے مردہ کی وصیت میں کوئی کمی یا زیادتی کی ہے، تو اس کے لئے یہ طریقہ بتایا جا رہا ہے کہ

وارث ان گواہوں کی حکام سے شکایت کریں، حکام انہیں طلب کریں، انہیں کسی نماز کے وقت تک روکے رکھیں

(بہتر وقت عصر کا ہے) بعد نماز انہیں نمازیوں کے سامنے کھڑا کیا جائے اور ان سے قسم لی جائے کہ انہوں نے مردہ کی وصیت اس کے وارثوں کو بالکل صحیح، مردہ کی مرضی کے مطابق پہنچائی ہے، گواہ اس طرح قسم کھائیں کہ "اللہ کی قسم، ہم جو گواہی دے رہے ہیں، اس میں ہم نے دولت کے لالچ میں، کوئی کمی زیادتی نہیں کی اگر ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار ہوتا تب بھی ہم یہی گواہی دیتے، نہ ہی ہم اللہ کی گواہی کو چھپانے کا جرم کر رہے ہیں، اگر ہم ایسا کریں (تو ہم جانتے ہیں کہ) ہم گناہ گار ہوں گے۔"

جب گواہ یہ قسم کھالیں تو انہیں سچا تسلیم کرنا ہوگا، مقدمہ کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگا، انہیں باعزت بری کیا جائے گا اور ورثاء کو ان کی گواہی پر مطمئن ہونا ہوگا، پھر وہ ان پر کوئی الزام لگانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

اب اسی مقدمہ کی ایک امکانی صورت یہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد "کسی طرح وارثوں کو یہ پتہ چلا کہ گواہوں نے سزا سے بچنے کے لئے جھوٹی قسم کھائی تھی، پس وہ حاکم سے شکایت کریں، حاکم پھر ان دونوں گواہوں کو طلب کرے اور نماز کے بعد ان وارثوں میں سے دو کو کھڑا کرے، جنہوں نے گواہوں کی سچائی کا انکار کیا ہے، وہ اس طرح قسم کھائیں، اللہ کی قسم، ہم جو گواہی دے رہے ہیں، وہ پہلے دو گواہوں سے زیادہ سچی ہے، ہم شرعی حد سے تجاوز کرتے ہوئے کسی پر جھوٹا الزام نہیں لگا رہے، اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم ظالموں میں سے ہوں گے" اس کے بعد وہ ثابت کریں کہ انہوں نے کس طرح وصیت کے گواہوں کی قسم کا انکار کیا ہے، اب فیصلہ وارثوں کے حق میں ہوگا۔

بظاہر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ قسم سے مقدمہ ختم ہو جانے کے بعد دوبارہ وہی مقدمہ جاری کرنے اور پھر قسم سے فیصلہ دینے کی اجازت کیوں دی گئی تو اسی حکمت کو آخری آیت میں بیان کیا جا رہا ہے کہ اس طرح وصیت کے گواہوں کو جھوٹی قسم کھانے کی جرأت نہ ہوگی کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ بات ہماری قسم پر ختم نہیں ہو جائے گی، اگر ہم نے جھوٹی قسم کھالی اور بعد میں کسی وقت بھی میت کے وارثوں کو ہمارے جھوٹ کا پتہ چل گیا تو انہیں بھی قسم کا حق حاصل ہوگا اور پھر ہم عامۃ المسلمین کے سامنے ذلیل وخوار ہوں گے، قانون ہمیں سزا دے گا اور اللہ کے دربار میں بھی ہم آثمین اور مجرمین کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

یہ ہے وصیت پر گواہ مقرر کرنے اور بصورت شک، گواہوں سے گواہی لینے کے متعلق قرآنی قانون، جس کو اللہ رب العزت نے خصوصی طور پر اہلِ ایمان کو خطاب فرماتے ہوئے بواسطہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام قیامت تک کے لئے نازل فرمایا اور آخر میں خصوصی ہدایت فرمائی کہ

اے ایمان والو! زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو، اس کے تمام احکام کو غور سے سنو، اطاعت وفرمانبرداری کرو اور سچے مسلمانوں کی طرح، شریعت مطہرہ کی پابندی کرتے ہوئے زندگی کا لطف اٹھاؤ، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو بڑے ہی نقصان میں رہو گے، ایمان کی عظمت اور اسلام کی برکتوں سے محروم رہو گے۔ کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ فسق و فجور میں مبتلا لوگوں کو ہم کبھی منزلِ مراد تک نہیں پہنچاتے، وہ اپنے گناہوں کی تاریکی میں ٹھوکریں ہی کھاتے رہتے ہیں، ان کی زندگی میں نہ توازن رہتا ہے نہ اطمینان وسکون اور نہ ہی اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مؤمنین کی نظروں میں ان کی عزت رہتی ہے۔

خاص واقعہ

وہ خاص واقعہ بھی ملاحظہ ہو جو احکامِ مذکورہ کے نزول کا سبب بنا، اس سے آیات کا مفہوم مزید واضح ہو جائے گا۔

تمیم بن اوس داری اور عدی بن زید دونوں اس وقت عیسائی تھے، ہر سال بسلسلہ تجارت شام جایا کرتے تھے، حضرت بُدیل بن مریم، جو حضرت عمرو بن عاص کے غلام تھے، ایک مرتبہ مدینہ منورہ سے ان دونوں کے ساتھ تجارت کے لئے گئے، شام پہنچ کر بدیل بیمار ہو گئے اور اتنے بیمار ہوئے کہ انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا، انہوں نے اپنے سامان کی فہرست لکھ کر سامان میں رکھ دی اور تمیم وعدی کو وصیت کی کہ میرا یہ سامان تم میرے گھر پہنچا دینا، فہرست کا کوئی ذکر نہ کیا، بدیل کا انتقال ہو گیا دونوں گواہوں نے ان کا سامان اپنے پاس رکھ لیا، ایک دن سامان میں ان کی نظر ایک قیمتی خوبصورت پیالے پر پڑی جو چاندی کا تھا، سونے کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے، بدیل یہ پیالہ شام کے بادشاہ کو فروخت کرنا چاہتے تھے لیکن پہلے ہی وفات پا گئے، دونوں کی نیت خراب ہوئی، سوچا کسی کو کیا پتہ چلے گا، چھپی ہوئی فہرست کا تو انہیں وہم وگمان بھی نہ تھا، بس پیالہ اڑا لیا، باقی سامان مدینہ پہنچ کر ان کے گھر والوں کے سپرد کر دیا، جب سامان کھولا گیا تو فہرست بھی نکلی، جس میں چاندی کے ایک پیالہ کا بھی اندراج تھا، جو سامان میں موجود نہ تھا، چند ورثاء تمیم وعدی کے پاس آئے اور پوچھا کیا، بدیل نے اپنا کچھ سامان فروخت کیا تھا انہوں نے کہا نہیں، پوچھا کیا وہ بہت بیمار ہوئے تھے اور انہوں نے علاج کے لئے کوئی چیز فروخت کی تھی، جواب ملا نہیں، پوچھا کیا تم دونوں نے بدیل سے کوئی چیز خریدی تھی، کہا نہیں، تب انہوں نے کہا کہ ہم یہ سوالات تم سے اس لئے کر رہے ہیں کہ بدیل کے سامان میں ایک فہرست نکلی ہے، جس میں ایک چاندی کے پیالے کا بھی ذکر ہے جو اس میں موجود نہیں، آخر وہ کہاں گیا، ان دونوں نے بڑی صفائی سے کہا کہ ہم کچھ نہیں جانتے نہ ہمیں کسی فہرست کا علم اور نہ ہمیں یہ معلوم کہ کیا کیا سامان تھا، ہم نے تو بدیل کی وصیت کے مطابق اس کا سب سامان تمہارے سپرد کر دیا، ان ورثاء نے یہ مقدمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں پیش کیا، آپ ﷺ نے تمیم اور عدی کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ قسم کھاؤ انہوں نے مجمع عام میں قسم کھالی اور بری ہو گئے، ورثاء کو فیصلہ قبول کرنا پڑا اور یہ مقدمہ یہاں ختم ہوا۔

اب دوسرا مقدمہ شروع ہوتا ہے کہ بدیل کے ورثاء میں سے کوئی مکہ معظمہ گیا، انہوں نے وہاں ایک دولت مند شخص کے پاس بعینہٖ وہی چاندی کا پیالہ دیکھا جس کا فہرست میں ذکر تھا انہوں نے اس سے پوچھا کہ پیالہ بہت حسین ہے تم نے کہاں سے خریدا؟ اس شخص نے صاف بتا دیا کہ میں نے یہ پیالہ ایک ہزار درہم میں تمیم داری اور عدی سے خریدا ہے، بدیل کے ورثاء نے پھر سرکار کے دربار میں مقدمہ دائر کر دیا اور صورت حال بیان کرتے ہوئے گزارش کی کہ یا تو ہمیں پیالہ دلایا جائے، یا وہ رقم جو اس سے حاصل کی گئی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمیم وعدی کو طلب فرمایا اور بدیل کے ورثاء میں سے دو کو حکم دیا کہ اب تم قسم کھاؤ کہ جو پیالہ تم نے دیکھا وہ بدیل کا ہے اور تمیم وعدی نے جھوٹی قسم کھائی تھی، ان لوگوں نے قسم کھالی، تمیم وعدی پر جرم ثابت ہوا، انہیں پیالہ سے وصول شدہ رقم، بدیل کے ورثاء کو دینی پڑی۔

دین کامل

قرآن کریم کے ان احکام پر غور کیجئے تو یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے کہ بحمد اللہ ہمارا دین ایسا کامل ومکمل ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں اس سے رہنمائی حاصل نہ کی جا سکتی ہو، بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ یہ ایک ایسا نور ہے، جو مؤمن کو کسی لحہ تاریکی میں نہیں چھوڑتا، اب یہ مؤمن کا اپنا عمل ہے کہ وہ اس شمع نور کو چھوڑ کر تاریک راہوں میں بھٹکتا رہے

اور منزل سے دور ہوتا چلا جائے یا اس کو لے کر تاریکیوں کو چھانتا منزل مراد تک پہنچنے کی کامیاب سعی کرے، نیز احکام بالا پر غور کیجیے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ قرآنی احکام اہلِ ایمان کو صرف جرائم سے بچاتے نہیں بلکہ جرائم کا خاتمہ بھی کرتے ہیں، مثلاً گواہ کے قسم اٹھانے کا طریقہ آپ نے پڑھا، جس میں بتایا گیا کہ اس سے یہ حلف کسی نماز کے بعد، بالخصوص نماز عصر کے بعد نمازیوں کی موجودگی میں لیا جائے گا، جس میں حکمت یہ ہے کہ گواہ، مجمع کثیر سے مرعوب ہوکر جھوٹی قسم کھانے کی جرأت نہیں کرے گا، نیز ایک بڑی جماعت کے سامنے اس کی جو ذلت و خواری ہو رہی ہے، اس کے سبب وہ آئندہ ایسے جرم کی ہمت کبھی نہیں کرے گا، علاوہ ازیں جو لوگ اس ذلت و خواری کا مشاہدہ کر رہے ہیں، ان کو عبرت حاصل ہوگی اور وہ کبھی ایسے جرم کا تصور تک نہیں کریں گے، یہی حکمت شریعت مطہرہ کی دوسری سزائیں علی الاعلان نافذ کرنے میں ہے، مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا، زانی کو کوڑے مارنے کی سزا، عدالت کے کسی کمرے میں نہیں دی جائے گی بلکہ اس کے مقررہ وقت کا باقاعدہ ذرائع ابلاغِ عامہ سے اعلان کرایا جائے گا، لوگوں کو جمع کیا جائے گا، پھر حد جاری ہوگی۔

ان احکام میں یہ بھی بتایا گیا کہ گواہوں کی قسم کے بعد مقدمہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہوگا بلکہ کسی وقت بھی اگر ورثاء پر گواہوں کا جھوٹ ہونا، کھل گیا تو وہ دوبارہ مقدمہ کر سکتے ہیں اور پھر فیصلہ ورثاء میں سے دو کی قسم پر ہوگا، اس میں بھی یہ حکمت ہے کہ گواہوں اور مقدمہ کی کارروائی دیکھنے والوں کو یہ خوف رہے گا کہ یہ جرم بڑا ہی خطرناک ہے زندگی بھر کا روگ ہے، کسی وقت بھی راز کھل سکتا ہے اور ہمارے خلاف قسم اٹھا کر ہمیں ذلیل و خوار کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ایسے جرم میں ملوث نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

بحمد اللہ ہم نے ان مشکل احکام کو سہل انداز پر بیان کرنے کی کوشش کی، اللہ کرے ہم کامیاب قرار پائیں، اللہ ہمیں اپنے احکام کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ امت مسلمہ کی کامیابی و کامرانی، عزت و عظمت اسلام کے احکام پر عمل ہی میں مقدر ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

"استفادہ"

قرآنِ کریم، اس کی تفاسیر، کتبِ احادیث اور اُن کی شروح کے علاوہ، فقہ، سیرت و تاریخ وغیرہ کی انہی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، جو تمام ہی ہمعصر علماء و مصنفین کے لئے مرجع و ماٰ خذ اور منبعِ علم ہیں، جن کی فہرست تقریباً تمام کتابوں کے اختتام پر لکھ دی جاتی ہے۔ لہٰذا میں اس کے اِعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اِن اسلاف کے مراتب بلند فرمائے جنہوں نے ہمیں اس علمی ذخیرے کا وارث بنایا اور ہمیں اِس سے مستفیض ہونے کی صلاحیت و توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

فقیر سید سعادت علی قادری

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کہ

بوسیلہ جلیلہ معلم کامل ﷺ کتاب، ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا'' کی پہلی جلد پایہ تکمیل کو پہنچی، یہ طفیل ہے حضور غوث الاعظم الشیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا، صدقہ ہے میرے پیرو مرشد شیخ صوفی کفایت علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا، فیضان ہے اساتذہ کرام، غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی، حضرت مفتی عبدالحفیظ صاحب حقانی اور میرے والدِ گرامی مفتی سید مسعود علی صاحب قادری رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کا کہ فقیر راقم الحروف کو اس کتاب کی تالیف کا اعزاز نصیب ہوا۔ اللہ میری اس کاوش کو قبول فرمائے اور مقبول بنائے۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوں اپنے ان باوقار و معزز احباب کا جنہوں نے کتاب کو اپنے وقیع تبصروں سے نوازا۔

نیز میں شکریہ ادا کرتا ہوں حضرت علامہ افتخار علی چشتی جنہوں نے کتاب کے ابتدائی حصہ پر نظر ثانی فرمائی اور ان تمام احباب، مخلصین و مریدین کا ممنون ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں کسی بھی طرح میرا تعاون کیا۔

بالخصوص میں شکر گزار ہوں ضیاء القرآن پبلی کیشنز کے سربراہ، عزیزم صاحبزادہ محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب کا جنہوں نے کتاب کی طباعت پر خصوصی توجہ دی، اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر دے اور ادارے کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

میں گزارش کرتا ہوں، قارئین سے کہ دوران مطالعہ اس فقیر پر تقصیر کو اپنی دعاؤں سے نوازتے رہیں نیز میری کوتاہیوں کو میری کم علمی پر محمول کرتے ہوئے درگزر فرمائیں۔

فقیر سید سعادت علی قادری

10 جمادی الثانی 1421ھ

10 ستمبر 2000ء

